صدر متحدہ عرب جمہوریہ جمال عبدالناصر کا دورہ پاکستان

آنکھوں کا تارا۔
مستقبل کا سہارا

بچے والدین کی آنکھوں کا تارا اور مستقبل کا سہارا ہیں، کیونکہ آگے چل کر یہی قوم کے دست و بازو بنیں گے۔ ان کی صحت و توانائی اور صحیح تربیت پر ملک کی بہتری کا انحصار ہے۔ کیا مرد اور کیا عورتیں اب تو سب کو مل کر اپنے ملک کو عروج پر پہنچانا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر معالجوں اور دواساز اداروں پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ قوم کے ہر فرد کو امراض سے نجات دلانے میں پوری پوری کوشش کریں۔
ہمدرد اس فریضے کو ادا کرنے میں مقدور بھر کوشاں ہے۔ اس کے ماہرین جو قدیم تجربات اور جدید تحقیقات سے بہرہ ور ہیں، دن رات اسی دُھن میں لگے رہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ اور نئی نئی دوائیں کم سے کم قیمت پر مہیا کریں تاکہ ہر خاص و عام کو فائدہ پہنچے۔

ہمدرد دواخانے نے اپنے آپ کو نوعِ انسانی کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے تاکہ بہتر سے بہتر طبی سہولتیں میسر آسکیں۔

۔ یونانی طِب کے
علم بردار
اور دواساز

ماہِ نو

جلد ۱۳ | شمارہ ۵

مئی ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور | نائب مدیر: ظفر قریشی

مقالات:	نذرالاسلام: ایک آتشِ خاموش!	نسیم احمد	۶
	بابائے اردو	سید فیضی	۱۱
	میں انہیں نہیں جانتا تھا (پطرس مرحوم)	ابو سعید قریشی	۱۵
	"أ"	شان الحق حقی	۲۹
	اردو اور بنگالی کا مشترکہ ماخذ	ڈاکٹر محمد شہید اللہ	۳۲
	میر کی ایک عشقیہ تمثیل: "مور نامہ"	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۲۲
افسانے، فکاہیہ:	دل کی گہرائیوں میں (افسانہ)	انور	۳۸
	"جیون ندی کو بہنا ہے" (بنگلا افسانہ)	عبدالغفار چودھری: مترجمہ احمد سعدی	۴۲
	"ایک ہنگامہ پہ ....." (فکاہیہ)	اشرف صبوحی	۴۷
نظمیں:	سوزِ دروں	نذرالاسلام: مترجمہ یونس احمر	۹
	حمد	قیوم نظر	۲۷
	سیالوں کی بستی	شیر افضل جعفری	۲۷
	خنک شعلے	عبدالعزیز خالد	۲۸
	"روٹھا پیا مناؤں گی" (ملتانی سے)	ظہور نظر	۲۸
	پہلا قدم	شہزاد احمد	۳۵
غزلیں:	شاہد عشقی • مشفق خواجہ		۳۵، ۲۶
	وشوا ناتھ درد • ★		۵۳
فن:	صفی الدین احمد: ایک نقاش فطرت	جی۔ ایم۔ بوچہ	۳۶
ترقیات: (فیچر)	ایک اور پانچ	مصباح الحق	۵۷
سرورق:	سارس (رنگین)	عمل: سجاد	

چندہ سالانہ
پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ
ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی
آٹھ آنے

نذرالاسلام — ایک آتشِ خاموش

نسیم احمد

یہ کبھی سنا نہ گیا کہ آتش فشاں پہاڑ کا لاوا اُگلنے والا منہ ایک دم سے خاموش ہو جائے اور پھر اُس کے انگارے ہمیشہ کے لئے سکون کی سانس لینے لگیں۔ نذرل درحقیقت جب آج سے چالیس سال پہلے بنگال کے اُفق پر انقلاب اور بغاوت کے ولولہ آفریں ہنگامہ خیز نعرے بلند کرتا ہوا طلوع ہوا تھا تو وہ سراپا شعلۂ جوالہ تھا۔ اس کے قلم کی ہر جنبش میں آندھیاں چھپی ہوئی تھیں، اس کی نظموں کے ہر بول میں سرکش باغی کے دل کی دھڑکن تھی، اس کے ہونٹوں پر وہی نغمہ پرورش پاتا تھا جس میں زندگی کی شعلہ افشانیاں ہوتی تھیں۔ وہ اپنے مضطرب اور بے چین دل کے آتش فشاں سے بیس بائیس سال تک غلامی کے آہنی طوق کو پگھلاتا رہا اور پھر یکایک اس کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کی شعلہ بار زبان خاموش ہو گئی۔ اس کا انقلاب آفریں قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اس سانحۂ عظیم کو تقریباً بیس سال ہو گئے۔ جب سے اب تک اس کی فکر کا لاوا منجمد ہے اور اس کے خیالات کا بحر ذخار خاموش! بلا شبہ بصارت رہتے ہوئے بھی وہ اپنے وطن کی اُس آزادی کو نہ دیکھ سکا جس کی آرزو میں اس نے اپنا جگر خون کیا تھا اور جس کے حصول میں اس نے سالوں کے پیچھے جوانی کی کتنی بے چین راتیں گذار دی تھیں تاہم اُس کے جذبے کے پیچھے جو مقصد کام کر رہا تھا اس کی تکمیل ہو چکی تھی۔ وہ ان دنوں آتشِ خاموش ضرور ہے مگر اس کے انگارے پھول بن کر ہمیں بہار جاوداں سے ہمکنار کر چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی خاموشی کسی دن یکایک تکلم میں بدل جائے اور اس کی زندگی کے ساکت و جامد سمندر میں پھر طوفان آجائے!

نذرل کی شاعری تین خانوں میں بٹی ہوئی ہے — انقلابی، اسلامی اور رومانی۔ لیکن انقلابی شاعری کے دور میں بھی اس نے پان اسلامزم کا خواب دیکھا تھا۔ یہ زمانہ بھی وہی تھا جب پورے مشرقِ وسطیٰ میں انگریز چھا گئے تھے اور عربوں کی زمین پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف یورپ کا "مردِ بیمار" ترکی پہلی جنگِ عظیم میں شکست کھا کر آخری ہچکی لے رہا تھا لیکن اسی اثنا میں ترکی کے مردِ مجاہد مصطفےٰ کمال نے انگریزوں کو للکارا اور ان کے خلاف صف آرا ہوئے۔ اسی دور میں نذرل نے اسلامی مجاہدوں کے آہنی عزائم اور طوفانی حوصلوں کی مدح میں چند نظمیں لکھیں جن میں "مصطفےٰ کمال"، "انور پاشا"، "زغلول پاشا" بہت مشہور ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر بڑی آسانی سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں اسلامی برادری اور اخوت، محبت و مروت جوش و ولولہ اور جرأت و ہمت کی مشعلیں روشن تھیں۔ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو متحد و متفق دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر لکھا تھا۔

نظر نظر میں جل اٹھا چراغِ دینِ مصطفےٰ
کہ آنکھیں اپنی تو بھی وا، چراغ دل کا پھر جلا
سیاستِ کمال سے جہاں پہ ترک چھا گئے
وہ عزم ہائے پہلوی چراغِ نو جلا گئے
غلام قلبِ مصر تھا، نہ جوش تھا نہ ولولہ
مگر وہ مردِ حق نما[1] سیاہ داغ دھو گیا
حجاز بھی ہے صف شکن عرب ہے آج نعرہ زن
امان[2] بھی ہے پیش پیش اٹھائے پرچمِ وطن
مراکشی بھی خواب سے سحر کو چوم کر اُٹھے
کریم[3] ہو گئے   رہا مراکشی ہوئے

---

[1] زغلول پاشا

[2] امان اللہ خاں (سابق بادشاہ افغانستان)

[3] غازی عبدالکریم (مجاہد مراکش)

عراق بھی سنبھل گیا، رشید[1] اک نیا اٹھا
جواں ہے ارضِ پاک بھی پرانا شام ہے نیا
مگر دیارِ ہند کے ہے مُسلموں پہ کیوں خزاں
پڑے ہیں بے خبر ابھی نہ یہ خبر کہ ہیں کہاں
غرور ہے کہ کیا ہوا کبھی تھے ہم بھی حکمراں
مگر جو عزم ہو جواں تو جھک پڑے یہ آسماں[2]

اس نظم کے ذریعہ نذرل نے آج سے تقریباً تیس پینتیس سال پہلے غلام ہندوستان کے مسلمانوں کی حمیت کو جھنجھوڑا تھا۔ اس نے اسلامی دنیا کے ان مجاہدین کے ٹھوس ارادوں اور فولادی عزائم کے کارنامے بیان کئے تھے جنہوں نے اپنی گردنوں سے غلامی کے طوق کو پھینک دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے وطن کے مسلمان بھی درِ زنداں توڑ کر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے باہر نکل آئیں اور تلوار سونت لیں۔ اس کی نگاہ میں غلامی کی زندگی سراسر موت تھی۔

نذرل کی اسلامی نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے اسلامی دُنیا کی تحریکوں سے کما حقہٗ آگاہی تھی۔ وہ بار بار اپنے وطن کے مسلمانوں کے سامنے غازی مصطفےٰ کمال، غازی عبدالکریم، انور پاشا اور دیگر مجاہدین کے نام پیش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کے دلوں میں بھی آزادی کا آتش فشاں بھڑکے اور غلامی کا آہنی بندھن ایک ہی جھٹکے کے ساتھ پاش پاش ہو جائے۔ وہ مسلمانوں کے لئے غلامی کو خدا کی سب سے بڑی لعنت سمجھتا تھا۔

نذرل نے اسلامی نظموں کے علاوہ اسلامی گیت بھی لکھے ہیں۔ اور یہ گیت اتنے رسیلے سجیلے ہیں کہ گراموفون کمپنیوں نے ریکارڈ کروائے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ گیت بنگال کے گھروں میں اتنے مشہور اور مقبول تھے کہ بچہ بچہ کو ازبر ہو چکے تھے۔ ان گیتوں کی دُھنیں بھی اسی نے بنائی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نذرل عربی موسیقی کا بھی بڑا رسیا تھا۔ چنانچہ اس کی بنائی ہوئی بیشتر دُھنیں عربی دُھنوں سے ماخوذ ہیں۔ اس نے بنگالی گانوں میں قوالی کو بھی رائج کیا۔ ان گیتوں اور قوالیوں کی زبان بھی بڑی سہل اور آسان ہے خصوصاً ان میں اردو اور فارسی کے الفاظ کے علاوہ ان کی ترکیبیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ زبان کے معاملے میں نذرل کا اجتہاد نزاع کا سبب بنا۔ سنسکرت آمیز زبان لکھنے والے برہمنوں اور خود ٹیگور نے نذرل کی زبان کے خلاف آواز اٹھائی مگر اس نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی جنبش نہ کی۔ مثلاً اس کا یہ اسلامی گیت ملاحظہ ہو:

عید الضحیٰ چاند ہاشے ادئی　　ایلو آبار دوسرا عید
قربانی دے قربانی دے　　شنو خدار فرمان تاکید
(عید الضحیٰ کا چاند ہنس رہا ہے　　لے دوسری عید بھی آگئی
قربانی دے قربانی دے　　خدا تاکید سے سُن خدا کا یہ فرمان ہے)

یا پھر اس بند کو پڑھئے:-

توفیق داؤ خدا اسلامے　　مسلم جہاں پُون ہوک آباد
داؤ شئی ہارا نو سلطنت　　داؤ شئی باہو، شئی دل دراز
(اے خدا اسلام کو اتنی توفیق عطا کر　　کہ مسلم جہاں دوبارہ آباد ہو سکے
ہاری ہوئی سلطنت واپس کر دے　　وہی کس بل اور وہی کشادہ دل عطا کر)

نذرل نے جو نعتیں لکھی ہیں ان کی زبان بھی تھوڑی سی رد و بدل کے بعد بالکل اردو بن جاتی ہے۔ ان کی ایک نعت ملاحظہ ہو:

محمد مصطفےٰ صلی علیٰ　　تومی بادشاہ راؤ بادشاہ کملی والا
(کملی والے تم بادشاہوں کے بادشاہ ہو)
قیامتِ پیاسا امت لاگی　　دا تُرا ئے روبہ لاوئے طہورا پیالہ
(قیامت کے دن امت کو پیاس لگے گی　　تو تم طہور کا پیالہ لے کر کھڑے رہوگے)
جولی بے حشر دینے دادش رد بی　　نفسی نفسی کو بے شوکل نبی
(حشر کے دن بارہ آفتاب روشن ہونگے　　تب سارے نبی نفسی نفسی پکاریں گے)
مرحبا سید مکی مدنی العربی　　بادشاہ راؤ بادشاہ نبی دیر راجہ نبی
(تم بادشاہوں کے بادشاہ اور نبیوں کے راجہ ہو)

نذرل نے جس طرح بنگلہ شاعری میں صنفِ غزل کو رواج دیا اسی طرح اس نے اردو اور فارسی کے الفاظ بھی اس زبان میں بڑی آزادی کے ساتھ رائج کئے۔ اگرچہ اردو اور فارسی کے الفاظ بنگلہ کے متقدمین مسلمان شاعروں نے بھی اپنے کلام میں استعمال کئے تھے لیکن جب برہمنوں کا زور ہوا اور زبان سنسکرت آمیز بنائی جانے لگی تو مسلمان

[1] ہارون رشید (رشید گیلانی، عراق کی طرف اشارہ ہے)۔
[2] مترجمہ: یونس احمر۔

ادیب و شاعر بھی اسی زبان میں اپنے خیالات قلمبند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کہ کیقباد جیسے کٹر مسلمان شاعر نے بھی سنسکرت آمیز زبان استعمال کی۔ لیکن نذرل نے برہمنوں کی پروا نہ کی۔ یہ نہیں کہ نذرل کو مائیکل مدھوسودن یا ٹیگور جیسی زبان پر عبور حاصل نہ تھا۔ اس سلسلے میں اس کی مشہور نظم ودروہی (باغی) کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ نذرل تو درحقیقت اس زبان کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا جو مسلم سلاطینِ بنگال کے دور میں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی تھی۔

نذرل کو اردو اور فارسی پر عبور کامل تو نہ تھا لیکن اسے ان زبانوں سے کافی حد تک واقفیت ضرور تھی۔ جب وہ پہلی جنگِ عظیم میں شامل ہوا تو اُسے ان دونوں زبانوں کے جاننے والوں کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع ملا۔ فوج میں شمالی ہند کے سپاہیوں کی کثیر تعداد شامل تھی جو اردو بولتے تھے۔ نذرل کو بھی اردو سیکھنی پڑی۔ اس کے علاوہ وہ فارسی بھی کافی سیکھ چکا تھا جس کا زندہ ثبوت حافظ کی رباعیوں کے منظوم بنگلہ ترجمے ہیں جو اس نے براہ راست فارسی سے کئے۔ اس طرح اس نے دونوں زبانوں کے بہت سے الفاظ بھی سیکھ لئے۔

ایک طرف اردو اور فارسی زبانوں سے والہانہ محبت، دوسری طرف پان اسلامزم کے لئے جوش و خروش۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل میں مسلمانوں کی تنظیم اور احیائے ثانیہ کی آگ بھڑک اٹھی جو اپنے ساتھ اسلامی زبانوں کو اپنانے خصوصاً اردو کو بنگلا کے قریب تر لانے کا ذوق و شوق بھی لئے ہوئے تھی۔

نذرل کی شاعری کا بتدریج مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ آخری دور میں یعنی مفلوج ہونے سے پانچ چھ سال پہلے ہی سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ بنگال کے مسلمان بالخصوص اور پورے ہندوستان کے مسلمان بالعموم متحد نہ ہوئے تو سیاسی اور سماجی لحاظ سے ان کی حیثیت من حیث القوم ختم ہو جائے گی۔ اس کے ثبوت میں اس کی وہ نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں جو وقتاً فوقتاً "نوائیگ" بنگلہ روزنامہ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان ہی دنوں اس نے "مورو بھاسکر" یعنی "آفتابِ صحرا" نامی ایک کتاب بھی لکھی جس میں ولادتِ حضرت رسول اکرمؐ کی بڑی ہی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ نذرل کا ارادہ رسول اکرمؐ کی حیاتِ اقدس پر منظوم کتاب لکھنے کا تھا لیکن کتاب مکمل نہ ہو سکی کیونکہ وہ علیل ہو گیا اور اس کی تمام سرگرمیاں اس علالت کی نذر ہو کر گلدستۂ طاقِ نسیاں

بن گئیں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! "آفتابِ صحرا" نذرل کی آخری تصنیف ہے۔ اس میں اُس کا وہی اسلامی جوش و ولولہ اور اسلام سے وہی روحانی لگاؤ ہے جو اس کی دوسری اسلامی نظموں میں نظر آتا ہے۔ کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

صبح کے پنچھی بیدار ہو جا!
دیکھ خون کے دریا میں نہا کر عرب کا آفتاب طلوع ہوا ہے۔
تُو بھی نئی آن اور شان کے ساتھ بیدار ہو جا
اور اپنی بین اٹھا لے!
دیکھ تاریکیوں میں لپٹے ہوئے مینار سے مؤذن کی صدا بلند ہو رہی ہے!
جس کی آواز سُن کر سیارے، سورج، چاند اور آسمان کانپ اُٹھتے ہیں

سُن یہ کیسی صدا آ رہی ہے
"خَیرٌ مِّنَ النَّوم!"
تو بھی بیدار ہو جا اور دیکھ
مغرب میں بحیرۂ احمر کی موجیں لہو کی طرح سُرخ نظر آ رہی ہیں۔
اور جنوب میں بحیرۂ ہند کی لہروں نے چنگھاڑنا شروع کر دیا ہے
اور شمال میں ریگ کے ذرّے اُڑ اُڑ کر ناچ رہے ہیں اور گا رہے ہیں۔
"پیارے جاگو اور امرت کے گھونٹ پیو"

اگر نذرل فالج کا شکار نہ ہوتا تو ممکن تھا اس کی یہ کتاب بنگالی ادب کا شاہکار ہوتی۔ اس میں نہ صرف اس کی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر ہے بلکہ اس نے رسول کریمؐ کی حیاتِ اقدس کی جو تصویر کشی کی ہے وہ دلوں میں اتر جانے والی ہے۔ اس کے اندر اس کی رُوح کی آواز ہے، اس کے دل کی پکار ہے۔

درحقیقت مفلوج ہونے سے پہلے نذرل نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں نے متحد ہو کر آزادی حاصل کی اور وہ اُن بندھنوں سے آزاد ہو گئے جن کو توڑنے کے لئے وہ بائیس سال تک مسلسل بیباک اور نڈر بن کر انقلاب کے نعرے بلند کرتا رہا۔ نذرل پہلے بھی ایک انقلاب پسند اور مردِ مجاہد تھا اور آخری وقت تک اس کا یہی طرۂ امتیاز رہا۔ وہ داعیانِ انقلاب کی صف میں پیش پیش تھا اور ایک سپاہی کی حیثیت سے ہراول ہی

باقی صـ۵۲ پر

سوزِ دروں

قاضی نذرالاسلام
مترجمہ: یونس احمد

اپنے من کا اُس دن جس کو دے نہ سکی تھی بے بس پیار
آج وہی یاد آتا ہے مجھ کو ہر دم کیوں دیوانہ وار؟

آج مجھے یاد آتی ہیں اس کی بھولی بسری مدبھری باتیں
نیند محل میں جس نے سلایا چوم کے میری کالی آنکھیں

بھور سمے تک اس کے بوسے ان ہونٹوں پہ مچلتے تھے
ان بوسوں کے سوز و تپش سے داغ جگر کے جلتے تھے

بیتی باتیں آج وہی ان نینوں کو چھلکاتی ہیں
آج مرے پندار کی باتیں اپنے سر کو جھکاتی ہیں

جس کی جواں امیدیں میں نے پاؤں سے ٹھکرائی تھیں
آج اسی سے پیار ہے جس کی آشائیں جھٹلائی تھیں

آنکھوں سے نکلے تھے شرارے، پر یہ زباں خاموش رہی
کیا تھا رخصت اور پرے دل سے، من کی جوالا پھٹ نہ سکی

اُس کے دل میں دیکھ چکی تھی خار و خس رسوائی کے
کس کس در کی ٹھوکریں کھائیں، سب کچھ تھا معلوم مجھے

ہائے لیکن میں بھی اُس کو اپنے دل میں رکھ نہ سکی
کیسے کہوں معتوب بھکاری، راجہ تھا اور میں داسی!

چاہ میں میری راج بھکاری رستہ کھو کر آیا تھا
کیسے میں پہچانتی اس کو میرے لئے کیا لایا تھا

ٹھٹکی کچھ، پھر دور رہوئی، کشکول میں اُس کا لے نہ سکی!

اس نے مجھ سے پیار کیا تھا، اس نے میری پوجا کی تھی
چاروں اور اندھیارا تھا افسوس! نہ میں پہچان سکی

مجھ سے اس کا پیار تھا انمٹ، میں بھولی انجان رہی
اب تو اس کی چاہ کی باڑھ میرے من کے پار ہوئی!

میری محبت کچھ تو بتا روپوش تھی کون سے مسکن میں
راجہ آیا تھا جب ہولے ہولے اس ٹوٹے من میں

سوچ میں اب بھی اس کی گھنٹی ہولے ہولے جی اٹھتی ہے
اب بھی جس کو سُن کر میرے من میں ہوک سی اٹھتی ہے

پھول کے سنگ وہ کھیلتا آیا، بادل کے سنگ اڑتا جائے
جانے کس کو ڈھونڈ رہا ہے، ہاتھ بھی آ کر ہاتھ نہ آئے!

اس کو اگر میں پا بھی سکوں تو چاہت کے آثار کہاں
شام کا دیپک کہتا ہے اب اس کے من میں پیار کہاں

میرے من کے بھیڑے پٹ اس کارن شاید کھل نہ سکیں

اور کسی کی چاہ کا طوفاں تب اس من میں پلتا تھا
جبھی تو اپنی کٹیا میں آنے سے اس کو روکا تھا

چاہا تھا مجھ کو بھینچنا اکثر پریم کی شیتل چھاؤں میں
ڈر کر میں چھپ جاتی تھی، کانٹے تھے میری راہوں میں

کالی متوالی وہ آنکھیں دور سے اچھی لگتی تھیں

پاس جو آتیں بھوکی، بے کل اشکوں سے جل تھل آنکھیں ۔۔۔ روم روم کانپ اٹھتا، ہوتیں بے معنی اس کی باتیں
آہ مگر کیوں جاگ اٹھی ہے اس جیسی اب بھوک مری ۔۔۔ لمسِ حسیں کی چاہت کیوں ہے، دل میں کیوں ہے آگ لگی؟
سر کو رکھ کر گود میں اس کی من چاہے ہے رو نا آج ۔۔۔ من چاہے ہے رونا یا جیون سے ہاتھ ہی دھونا آج
آج مجھے معلوم ہوا ہے میری خوشی اور میرا سکوں ۔۔۔ میرے من مندر کا راجہ گیا ہے پا کر رازِ درون!
مان گئی ہیں ہار، خدارا اب بھی آ کر لے جاؤ! ۔۔۔ آؤ بسنتی روپ کے راجہ پیالہ تم اپنا دے جاؤ
آج مرا من چیخ رہا ہے دکھ کی ٹیسوں کے مارے ۔۔۔ دیکھ بھی جاؤ کوہِ گراں سے پھوٹ کے بہتے ہیں دھارے
تم ہو سچے، پتھر سے بھی خون کے دھارے بہتے ہیں ۔۔۔ برفیلے پربت شعلوں سے پگھلے بِنا کب رہتے ہیں

من میں اپنے آج اٹھا ہے جوار تمہاری چاہت کا
آج تو بندھن ٹوٹ گیا ہے، کھلا دوار محبت کا

آج آیا وہ میرا راجہ دل کے اس ویرانے میں ۔۔۔ آج زباں کو بول ملے ہیں، ہلچل ہے مے خانے میں
اب وہ سرہانے چپکے چپکے صبح سویرے کیوں آئے گا ۔۔۔ صبح سویرے کیوں آئے گا، نیند کا دیپ بجھائے گا؟
اب نہ کبھی وہ آئے گا راتوں کو میری کٹیا میں ۔۔۔ جھڑ طوفاں فریاد کریں گے جنگل میں اور صحرا میں
آج اگر وہ مل جاتا بچھ جاتی اس کے قدموں میں ۔۔۔ موتی میں لٹاتی اشکوں کے اور پھول بچھاتی راہوں میں
آنکھوں میں بٹھاتی دِوانے کو اور اس کے جل تھل نینوں کو ۔۔۔ بہتے کاجل کو پونچھتی میں ان رخساروں، ان ہونٹوں سے
آج نہ جانے ایسی کتنی پیاس ہے من میں آشا کی ۔۔۔ پریم کی، دکھ کی، گیتوں کی، سندرتا کی، البیلا شا کی
کس کو پتہ کس دیس میں اس نے دھونی آج رمائی ہے ۔۔۔ ہائے مگر کیوں اس نے مری آنکھوں سے ندی بہائی ہے
معلوم اگر ہو جائے کبھی میں اس سے محبت کرتی ہوں ۔۔۔ مرقد میں بھی مارے خوشیوں کے ہو جائے گا زندہ اسکا جنوں
گرجے گی صدا، ناچے گی ہوا، ساگر میں جوار آ جائے گا ۔۔۔ تھرّائیں گے کوہ و دشت و دمن، دنیا پہ اندھیرا چھائے گا
ہے مجھ کو یقیں وہ آئے گا اندھیاری کالی راتوں میں ۔۔۔ اور میرے لئے وہ روئے گا سب شہروں میں، صحراؤں میں

کہنا کھوج میں تیرے وہ قسمت کی ماری بھاگ چلی
اندھیارے میں کچھ ایسی کھوئی پھر لوٹ کے واپس آنہ سکی!

★

بابائے اردو

(جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب)

سید فیضی

وقت گزرتا جاتا ہے اور اس کی راہوں میں بچھے ہوئے کچھ انمٹ نقوش ابھرا ابھر کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں، تیز رو آندھیاں ہوں کہ طوفانی ہواؤں کے جھکڑ، کوئی چیز بھی انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ امتدادِ زمانہ کی دستبرد سے بے نیاز وہ اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ اور یوں اُن کے عمل کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو زندگی اُسی کا نام ہے۔ کسی بڑے مقصد سے وابستہ رہ کر دن رات اس کے حصول کی کوشش میں رہنا انسانی عظمت کی دلیل ہی نہیں بلکہ ایک اصول کی تبلیغ ہے جو بیک وقت زندگی پرور بھی ہوا کرتا ہے اور زندگی آفریں بھی۔ اسی سے انسان کی سیرت تشکیل پاتی ہے اور وہ ایک عہد آفریں شخصیت بن کر زندگی کے بکھرے ہوئے گیسوؤں میں شانہ کشی کرتا ہے۔ بابائے اردو کی شخصیت میں بھی یہی عناصر کارفرما رہے ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سرسید اور حالی کے بعد اگر کسی شخص نے زندگی کی صحیح قدروں کو ابھرنے کا اسلوب دیا ہے تو وہ صرف عبدالحق کی ذات تھی۔

کون جانتا تھا کہ ہاپوڑ (میرٹھ) میں پیدا ہونے والا یہ انسان ایک زندہ اصولِ زندگی بن کر صداقت کے شعور کو جگمگائیگا۔ ابھی اس ہونہار بروا نے زندگی کے انیسویں زینے پر ہی قدم رکھا تھا کہ سنہ ۱۸۸۹ء میں اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کے شوق نے ہاپوڑ کے اس جوہرِ قابل کو "مدرسۃ العلوم" علیگڈھ سے وابستہ کر دیا۔ یہاں سرسید کے فیضانِ صحبت اور شبلی و حالی کی نکھری نکھری تربیت سے اس کے جوہر چمک اٹھے۔ عبدالحق جس دامنِ تربیت کا پروردہ تھا، اُسی کے لمبے لمبے سایوں میں آگے بڑھتا گیا۔ وقت کی رفتار کو اُس نے بھی پہچانا، ابنائے زمانہ پر گہری نظریں ڈالیں، اِدھر اُدھر ماحول کا جائزہ لیا اور اپنے پیشروؤں کی طرح قوتِ عمل کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنے واسطے بھی ایک خاص دائرہ متعین کر لیا۔ اس دائرے میں رہتے ہوئے، انفرادی حیثیت سے اُس نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں، آج بڑی بڑی انجمنیں اور اجتماعی ادارے انہیں حیرت و استعجاب سے دیکھ رہے ہیں۔

"بابائے اردو" کا لفظ ہی آج ذہنوں میں وہ پیکر اُبھار دیتا ہے جس نے اپنی عمرِ عزیز اُردو زبان کے بقا و تحفظ میں صرف کر دی، اپنے آپ کو مٹا کر اُردو کو حیاتِ جاودانی بخشی، ذاتی آرام و راحت سے منہ موڑ کر ایک اصولِ زندگی کی تبلیغ کی اور اس طرح "وفاداری بشرطِ استواری" کو اصلِ ایماں بنا کے چھوڑا۔ اُردو کے ساتھ اتنا قریبی رشتہ آج تک شاید ہی کسی کو حاصل ہوسکا ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ اس سے بڑھ کر جذبۂ ایثار اور شانِ استقامت کی کوئی اور مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ عبدالحق کی خدمات ہماری قومی تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان و ادب کبھی اس کے احسانات کو فراموش نہیں کرسکتے۔ ستر سال پہلے وہ جس تڑپ کو لے کر اٹھا تھا، آج وہ تڑپ اُس کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے اور اس پیرانہ سالی میں بھی انہماک کا یہ عالم کہ مجال نہیں جبینِ سعی و عمل پر شکن تک نمودار ہو۔

بابائے اُردو کے علمی و ادبی کارناموں سے کون واقف نہیں۔ اُردو کے محاذ پر تنِ تنہا لڑنے والا یہ مجاہد کہاں کہاں نہیں گرجا اور وہ کونسے آلام و شدائد تھے جن کے مقابلے میں سینہ سپر نہیں ہوا۔ پچھلی نصف صدی کے اوراق الٹ کر دیکھئے تو اُردو کے بازار میں آپ کو صرف عبدالحق کی آوازیں گونجتی ہوئی سنائی دیں گی۔ ادبی شعور کا میدان ہو کہ علمی جستجو کا، لسانی مہارت کا اکھاڑہ ہو کہ فنی آگہی کا، اُردو زبان کو ہر کروٹ دلانے میں

اس کے ہاتھ شامل رہے ہیں۔ اگر وہ ان گزشتہ پچاس سالوں میں اُردو کو اپنے دامن میں پناہ نہ دیتا تو آج اُردو زبان ختم ہوجاتی اور اس طرح ملّت اسلامیہ کی تہذیب و ثقافت کا وہ نشان بھی کالعدم ہوجاتا جسے ہمارے اسلاف نے خونِ جگر دے دے کر پروان چڑھایا تھا۔ اُردو کا یہ عظیم محسن جہاں بھی رہا اور جس حیثیت میں بھی رہا، اُردو زبان بالواسطہ یا بلاواسطہ اُس کی ذاتِ گرامی سے ضرور متعلق رہی ہے۔ انجمن ترقی اُردو سے تو اُس کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ ساتھ آج کا نہیں ـــ پوری نصف صدی کا ساتھ ہے! ایک ایسے عہد کا ساتھ جو ایک طرف ایّام سرسیّد کا نغمہ خواں ہے تو دوسری طرف عصرِ حاضر کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ:

"انجمن ترقیٔ اُردو کی کہانی ـــ عزم واستقلال،
ہمت وہمدردی، خلوص وایثار کی کہانی ہے"!

تو ہمیں اسے تسلیم کرلینے میں چون وچرا کی گنجائش نہیں کیونکہ ان تمام فضائل کا بہترین آئینہ آج کی دنیا میں اگر کہیں مل سکتا ہے تو وہ صرف بابائے اُردو کی ذات ہے جو انجمن ترقیٔ اُردو سے علیحدہ کوئی دوسری چیز نہیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک مستقل ادارے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اُس نے وقت کی آواز کو سمجھا ہے، اُس کے تقاضوں پر غور کیا ہے اور پھر اپنا ایک مقصد قرار دے کر زندگی کو اُس کے حصول کی خاطر وقف کر ڈالا ہے۔ آج اُسے طوفانوں سے کھیلتے ہوئے نوے سال گزر چکے ہیں لیکن شاہراہِ حیات کا یہ طویل سفر بھی اس کی ہمتوں میں لچک نہ پیدا کر سکا۔ آج بھی وہ اسی طرح جواں عزم وجواں کار ہے اور اس کی زندگی وشخصیت کے مختلف پہلو بھی اسی جواں عزمی وجواں کاری سے ترکیب پائے ہوئے ہیں۔ ایک طرف اس کا علمی تبحر ہے جس سے انداز وبیان کی نزاکتیں ٹپکتی ہیں تو دوسری جانب طبیعت کی لطافت ہے جو مزاح کا رنگ لئے اس کی تحریر وتقریر سے نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ زندگی کے انہی روشن پہلوؤں سے کردار کا پتہ چلتا ہے، بچی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے اور انسان کی اس جبلّت کا راز کھلتا ہے جو اُسے عظمت کی منزلوں تک لے جاتی ہے بابائے اردو کی زندگی کو بھی اگر اُس کے علمی وادبی کارناموں سے علیحدہ کرکے دیکھا جائے تو پھر بھی اُس کی ذات میں وہ صفات یکجا دکھائی دیں گی جن کی وجہ سے وہ عام انسانی سطح سے بلندی پر ہی نظر آئے گا۔ اس کی وجہ سازگار ماحول ہے جس میں اس کی نشو ونما ہوئی۔ یہ ماحول زندگی کی قدروں سے شناسا اور انسانیت کے صحیح مفہوم سے واقف ماحول تھا۔

بابائے اُردو کی ذات میں بھی وہی انفرادیت نظر آتی ہے جو اُس کی علمی خدمات سے مترشح ہے بلند ہمتی اور سعیٔ پیہم سے خود بخود ایک ایسا کردار تشکیل پا جاتا ہے جس کی خوبیوں کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ بابائے اُردو کا کردار اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے کہیں جمالی صورت میں بزم آرائیاں کرتا دکھائی دیتا ہے اور کہیں جلالی شان سے ہنگامہ خیزیوں کا مرکز بنا ہوا نظر آتا ہے۔ دوستوں میں ریشم کی طرح نرم اور مخالفوں کے حق میں سنگِ گراں! بابائے اُردو کی یہ دو ایسی خصوصیتیں ہیں جو اس کی ساری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ گھریلو صحبتوں میں گفتگو کا یہ بہاریں انداز کہ مُنہ سے پھول جھڑتے ہوئے محسوس ہوں۔ فطرت اتنی لچکدار کہ شفقتوں کے بوجھ سے ہر سانچے میں ڈھل جائے۔ بوڑھوں میں بوڑھا! جوانوں میں جوان! بچوں میں بچہ! اور انہی کے فہم وطبیعت کے مطابق گفتگو کرکے اپنا ہم خیال بنالینا ـــ بابائے اُردو کا کمال نہیں تو اور کیا ہے۔ انسان دوستی کا یہ جذبہ تھا جو ہر حال مقدم رہا اور ظاہر ہے کہ یہ جذبہ اُس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک انسان کا اپنا اخلاقی نظریہ معیاری نہ ہو۔ بابائے اردو کے منجھے ہوئے اخلاق ایک خاص وسعت لئے ہوئے ہیں اور انہی میں اس کی صاف گوئی اور خودداری کو بھی بہت دخل ہے۔

بابائے اُردو نے ٹھوکریں کھا کھا کر اپنی زندگی میں جو تجربات حاصل کئے، وہ آج پوری طرح سے اعتماد ویقین کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔ انہیں ٹھیس پہنچانا بابائے اُردو کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ان تجربات کی توہین ہوئی یا اعتماد ویقین پر کوئی حرف آیا تو اس کی بوڑھی رگوں میں تیزابی جلن اور سیمابی تڑپ پیدا ہوجاتی ہے، بھویں تن جاتی ہیں اور قوتِ جلال کا یہ پیکر شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھتا ہے۔ لیکن ایسے حادثات اُس کی زندگی میں بہت کم آتے ہیں اور عام طور پر زندہ دلی اور ظرافت ہی ان کی فطرت کے مظاہر ہیں تحریر ہو یا تکلّم، ان کی زیرلب مسکراہٹیں ہر رنگ میں جامہ زیب

بابائے اردو

"وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاع آفتاب"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تمام زندگی اردو زبان و ادب کی گرانمایہ خدمات کے لئے وقف رہی ہے جس کے اعتراف میں قوم اس سال ان کی ۹۰ سالہ جوبلی منا رہی ہے

مطالعہ گاہ میں

قاضی نذرالاسلام

(جس کی آتشیں شخصیت انقلاب و اخوت اسلامی کی مستقل دعوت ہے)

نظر آتی ہیں۔ الٰہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں کے دو پروفیسر صاحبان
پاس بیٹھے اپنی اپنی یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اُردو کے گُن گا رہے
تھے کہ بابائے اُردو نے مسکراتے ہوئے فیصلہ کر دیا:

"الٰہ آباد یونیورسٹی اردو کا قبرستان ہے اور
لکھنؤ اس کا امام باڑہ۔"

اسی طرح انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں کسی کو مخاطب کرتے
ہوئے کہتے ہیں:

"میں نے لڑکپن میں حمایتِ اسلام کا بچپن دیکھا
تھا اور اب بڑھاپے میں اس کی جوانی کی بہاریں
دیکھ رہا ہوں۔ میں جوں جوں بڑھتا ہوں بوڑھا
ہوتا جاتا ہوں۔ یہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہے
جوان ہوتی جاتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ ظرافت کا یہ انداز کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ بابائے
اُردو کے لہجے میں رچا بسا ہوا معلوم ہوتا ہے ——— لیکن یہ سب کچھ
اس بڑے جذبے کے تحت پرورش پاتا ہے جو اس کی زندگی کا
حقیقی نصب العین ہے اور اسی کی لگن اسے عظیم سے عظیم تر بنائے
جا رہی ہے۔ آج بھی اُردو اس کی ذات کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مقصد
کی یہی دُھن، مستقل مزاجی اور امید کی شمع لئے مایوسی کے
اندھیروں کو دور کرتے رہنا، اُس کے نزدیک زندگی کی دلیل ہے۔
چنانچہ اسی نظریئے کو واضح کرتے ہوئے ایک خطبے میں طلباء سے
یوں مخاطب ہے:

"میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ
جوان رہیں۔ میری طرح بوڑھے نہ ہوں۔ اس دعا
کو کوئی معمولی یا ناممکن بات نہ سمجھیں، ہمیشہ
جوان رہنا ممکن ہے۔ بے شک جوانی لوٹ کر
نہیں آتی لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی قائم رکھنے
کے لئے کوئی بلند مقصد ہونا چاہئے۔ مقصد سے
زندگی بنتی ہے، بڑھتی ہے اور قائم بھی رہتی ہے۔
..... جوانی کوئی چوڑے چکلے سینہ، کسے ہوئے ڈنڈ
اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڑھاپا
سفید بالوں اور بگڑی کمر سے نہیں آتا۔ جوانی
ہمت و عزم سے ہوتی ہے۔ جوان وہ ہے جس
کا عزم جوان ہو۔ میں اپنی جوانی پھر واپس
لاؤں گا اور اس وقت تک نہ مروں گا جب تک
اردو یونیورسٹی نہ قائم کر لوں گا۔"

یہ ہے بابائے اردو کی وہ مجاہدانہ شان جس نے اُردو
زبان کو علمی و فکری حیثیت سے رواج دے کر ایک نئے دور کا آغاز
کیا۔ اُردو سے محبت اس کے لئے مذہبی عقیدہ بن چکی ہے اور شاید
اسی لئے اس کی آواز میں گونج بھی ہے اور گرج بھی۔ یہ اس کی
راسخ الاعتقادی کا ایک اور ثبوت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ
اپنے عزائم میں کامیابیوں سے دوچار نہ ہو ؎

زمانہ جب بھی لکھے گا زبان کی تاریخ
ترا خلوص، ترا نام جگمگائے گا

شعلہ و شبنم کا امتزاج ایک اتفاق ہے۔ اس لئے یہ
بہت نادر بھی ہے۔ کہاں شبنم کی روایتی خنک سرشتی اور کہاں شعلہ کی آتش
منشی لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شبنم سے شرارے پھوٹ نکلیں
اور پھلجھڑیوں کا سماں پیدا کر دیں۔ بابائے اُردو کو مبدء فیاض
سے کچھ ایسی ہی طبیعت عطا ہوئی ہے جو بیک وقت سرد بھی ہے
اور گرم بھی، سنجیدہ بھی ہے اور شوخ بھی۔ تشقہ بھی ہے اور باغ و
بہار بھی۔ سرسیّد کا معاصر، ان کا مداح، ان کا پیرو، ان کی یادگار،
ان کا ہم مزاج بھی ہے۔ وہی شان اعتبار، وہی زندہ دلی، وہی
متانت، وہی بذلہ سنجی، وہی سلیم الطبعی، وہی چلبلاپن۔ اس
لئے جونہی کوئی واقعہ اس کی طبیعت کو گرما دیتا ہے تو وہ
اپنی سنجیدگی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے۔ اور اپنی طبیعت کے وہ
جوہر آشکار کرتا ہے۔ جنہیں ہم براقی، چونچال پن اور شوخی
سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے تیور آناً فاناً بدل جاتے ہیں جیسے
وہ کوئی اور ہی انسان ہو۔ نہایت شوخ اور صاحبِ ذوق۔
اس کے دل و دماغ کی ایک ایک رگ تپ اٹھتی ہے، چمک
اٹھتی ہے۔ اور عجیب ہی تیز لَو دیتی ہے۔ جذبات کی شدت
جیسے اس کی طبیعت میں شعلے ہی شعلے، بجلیاں ہی بجلیاں
بھر دیتی ہے۔ اور اس سے پے در پے کوندے ہی کوندے
لپکنے لگ جاتے ہیں۔ اور پھر اس تڑپ، اس والہیت، اس

شوریدگی، اس ہیجان، اس تلاطم جذبات سے ان کے الفاظ بھی بھڑک بھڑک اٹھتے ہیں۔ جیسے ان کے دل و دماغ کے ساتھ ان کے نطق کو بھی آگ لگ گئی ہو۔ اس میں ایک شدید تیکھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ اُس پیغامبر کی طرح جو ویسے تو معتدل اور بردبار ہو۔ لیکن جب کوئی بات اس کے قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے تو پھر اس کا نطق تمام تر نطقِ آتشیں بن جاتا ہے۔ ان کی زبان ایک کٹیلی زبان بن جاتی ہے اور ان کے الفاظ نشتر، ہی نشتر جو خود بخود دل میں فرو ہو جاتے ہیں۔ ایسی بے تاب کیفیت درحقیقت انتہائی شدتِ احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان کے تمام وجود کو شعلہ زن کر دیتی ہے۔ یہیں سے ظرف کی بلندی و پستی کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ اگر طبیعت سلیم ہو تو اس سے ایک صحت مند قسم کا جلال پیدا ہوتا ہے۔ ایک بلند قسم کا غضبناک مگر شگفتہ مزاج۔ طبیعت ذرا بھی سبک ہو تو اس کا نتیجہ تضحیک، تمسخر اور چڑچڑے پن کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

بابائے اردو کی طبع بلند کو ہمیشہ بلند محرکات ہی مشتعل کر دیتے ہیں۔ اور ان کی حسن ظرافت ہمیشہ اسی مخصوص برّاقی ہی میں نمود پاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عوالم میں ان کے قوائے فکر و بیان پوری شدت سے کام کرتے ہیں۔ جس سے ان کی تحریر میں بھی غیر معمولی اٹھان پیدا ہو جاتی ہے۔ عام لمحات میں بھی ان کی طبعی شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ ایک ظرافت وہ ہے جو کسی فکا ہی موضوع کے سلسلہ میں برملا ظاہر ہوتی ہے یا دانستہ ظاہر کی جاتی ہے۔ اور دوسری وہ جو فطری خوش طبعی کے باعث آپ ہی آپ ایک لطیف بذلہ سنجی کی شکل میں جھلکتی ہے۔ وہی جسے جوش نے ایک جگہ "طبیعت کا چہکا" قرار دیا ہے۔ بابائے اردو کے یہاں یہ طبیعت کی لہر اور لطف بیان کی جھلک ہر کہیں نظر آتی ہے۔ اور بہت ہی کم ذوق شخص ہوگا جو اس سے محظوظ نہ ہو۔ اس سے اچھی، دلنشیں اور چہکتی بولتی تحریر کی ایک اچھی روایت ہاتھ آجاتی ہے۔ ایک دو جملے ملاحظہ ہوں:

" میں نے ... اپنے زمانے میں بڑے بڑے سقراط اور افلاطون بھی دیکھے ہیں۔ میٹھی زبان کے افلاطون، ڈنڈے مارنے والے افلاطون"۔

" اس (بنیادی جمہوریتوں کے) سلسلے میں ہمیں انگریزی پارلیمنٹ کی مثال ضرور یاد آئے گی لیکن تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ انگریز قوم ووٹ دیتی ہوئی پیدا نہیں ہوئی تھی"۔

اس بذلہ سنجی کا ایک بہت ہی شگفتہ نمونہ اُس چھوٹے سے مضمون میں نظر آتا ہے جو عرصہ ہوا "ماہِ نو"[1] میں "زعفران، ایک سچی حکایت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ خالص ذوق کی بات ہے۔ دل زندہ کی علامت۔ جو تحریر میں ایک خاص چٹخارہ پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ساری تحریر سپاٹ ہو کر رہ جائے۔ جہاں طبیعت میں سنجیدگی کا غلبہ ہوا تحریر کا مزا کرکرا ہوا۔ کیونکہ سنجیدگی اور کرارے پن میں منافات ہے۔ بابائے اردو کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے سادگی کو کرارے پن سے آمیز کیا ہے اس لئے جب وہ اُن غیر معمولی لمحات میں نہیں ہوتے۔ جو کسی ہیجان کے ساتھ آتے ہیں تو ان کی تحریر ایک منجھی ہوئی صاف ستھری نکھری وضع اختیار کر لیتی ہے جس میں شوخی بیان یا زیب داستان کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بڑی صفائی اور بے تکلفی سے کہتے ہیں۔ زباں آوری کی خواہش کہیں بھی لفاظی کی طرف نہیں لے جاتی۔ جیسے انہیں اس کا نہ علم ہو نہ احساس۔ ان کے اسلوب بیان کی امتیازی خصوصیت انتہائی بے ساختگی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کے فکر اور بیان میں کوئی فاصلہ نہیں، نہ ان میں فاصلہ پیدا ہونا ممکن ہے اور نہ وہ اس کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ خیال خود بخود بے کم و کاست عبارت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ بہت کم ادیب ہیں جنہیں کبھی یہ شوق نہ ہو کہ وہ نمود، شوخی، طمطراق، مبالغہ یا شاعری سے کام نہ لیں۔ وہ کوئی عالمانہ یا رعب انگیز لفظ یا ترکیب نہ برتیں جس سے ان کا احساس برتری تسکین پائے لیکن بابائے اردو پر یہ خواہش کبھی غلبہ نہیں پاتی۔ انہیں اپنے آپ پر قابو ہے۔ نہ ان میں کھوٹیں ہیں نہ کسمساہٹیں نہ الجھنیں۔ ان کے لئے جیسے بیان میں افراط و تفریط کا مسئلہ وجود ہی نہیں رکھتا۔ ان کی متوازن طبیعت اور ہمواریٔ بیان میں پہلے ہی سے ایک

[1] بابت جولائی ۱۹۴۸ء

باقی صفحہ ۵۶ پر

میں انہیں نہیں جانتا تھا

(پطرؔس کی یک رخی تصویر)

ابوسعید قریشی

"نیرنگ خیال" یا "کارواں" میں مضمون چھپا اور دھوم مچ گئی!

گورنمنٹ کالج میں لطیفہ ہوا۔ اور درسی کتابوں کی طرح چل نکلا!

نیازمندانِ پنجاب نے زہر خند کیا۔ اور "اہل زبان" کی محفلوں میں کہرام مچ گیا!

براڈکاسٹنگ ہاؤس (دِلّی) کے "آئیوری ٹاور" میں انگریزی کی ایک نئی کتاب پر تبصرے کا ایک جملہ اور اسمبلی چیمبرز زعفران زار بن گئے!

اقوامِ متحدہ میں ایک تقریر، اور انگریزی زبان کے بڑے بڑے مقرر دم بخود رہ گئے!

سٹیونسن اور گالزوردی کا ترجمہ، عصمت چغتائی کے فن کا جائزہ، ن۔م راشد کے نام خط.... اور مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ... یہ سب پطرؔس کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں انہیں نہیں جانتا تھا!

شاید اس لئے کہ میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم نہیں تھا، شاید اس لئے کہ وہ مجھ سے عمر میں بیس برس بڑے تھے، شاید اس لئے کہ آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام اسسٹنٹ اور ڈائرکٹر جنرل میں پہلی اور آخری سیڑھی کا فاصلہ تھا، شاید اس لئے کہ ان سے پہلے انٹرویو کے دوران انہیں اپنا سوال دہرانا پڑا، شاید اس لئے اُن کے چہرے پر کبھی تبحر آمیز تکبر اور کبھی شفقت آمیز تمسخر نظر آتا تھا ــــ اغلباً اس لئے کہ میں بھی خود کو اُن سے کم پلے کا ادیب نہیں سمجھتا تھا۔[1]

پطرؔس کی شخصیت کے بیسوں رُخ ہیں۔ کبھی شفیق اور ہر دلعزیز اُستاد، شاگرد جس کی پرستش کرتے ہیں۔ کبھی محفل آرا، بذلہ سنج، یادوں کے مضامین کا ہیرو ــــ مدبر، سیاستداں، افسر، فن کار، زباں داں، خوش گفتار.... ایکٹر، پروڈیوسر۔ ذوقِ سلیم کا مجسمہ، سخن فہم اور سخن گو، بہ یک وقت احباب کا عاشق اور معشوق ؎

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ مے!

زندگی کا رسیا اور موت سے متوحش....

پردہ اٹھتا ہے اور پردہ گرتا ہے۔ تالیاں پٹتی ہیں۔ پردہ پھر اٹھتا ہے۔ اور ہر بار وہ ایک نئے میک اَپ میں اسٹیج پر آتے ہیں۔ تماشائی اُن کا اصلی چہرہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ لیکن گرین روم میں اُن کا میک اَپ بدستور جاری ہے۔ اُنہیں ہر پارٹ ادا کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ اُن کا آخری پارٹ اقوامِ متحدہ کے اسٹیج پر نظر آتا ہے۔ اور تماشائی حسبِ معمول، تھوڑی دیر کو یہی سمجھ لیتے ہیں۔ کہ ان کا اصل کردار یہی تو تھا۔ یہی ہونا چاہئے! ــــ لیکن اب کے جو تالیاں گونجتی ہیں تو پردہ نہیں اٹھتا! کیا ہوا؟ شاید کسی نئے کردار کی تیاری ہے؟ لیکن فن کار گرین روم میں بے حس و حرکت پڑا ہے اور اُس کے پاس چہروں کا ایک۔ انبار لگا ہے۔ تالیاں پھر گونجتی ہیں کہ یہ بھی کوئی نیا بہروپ ہے۔ لیکن زندگی کا رسیا موت سے ہار چکا ہے۔ اور اس کے کمالات کا اعتراف رسائل کے خاص شماروں، سیاہ حاشیوں، تعزیتی پیغامات، یادوں اور "میں انہیں جانتا تھا" کے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور حسبِ دستور اُس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے اک ایک حرف، ایک ایک تحریر، ایک ایک خط کو یکجا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔

ان ملفوظات کی بھی وہی کیفیت ہے۔ ہر جملہ ایک نئی اور

---

[1]: مگر آپ کو روشناسِ خلق کون کرے، اور یہ یک رخی تصویر یا سلہوٹ کون پیش کرے! ویسے شرفِ تلمذ کی بنا پر مرحوم کی خاکہ کشی کا حق میرا تھا جو آپ نے چھین لیا ہے ــــ خاور

جداگانہ شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔ ہر بار ایک نیا چہرہ! لیکن نقاب میں کہیں کہیں کوئی دھاگہ چھوٹ بھی گیا ہے۔ اور اس کے پیچھے اصل چہرے کی جو جھلک نظر آتی ہے اس کو اس صد رنگ اداکار کی احتیاط بھی نہیں چھپا سکتی۔

دانش گاہِ پنجاب کا پروفیسر، براڈ کاسٹنگ کا اے۔ایس۔بی، اور ادب کا پطرس، احباب کے لئے صرف بخاری ہے۔ احمد شاہ بھی نہیں۔ شاید یہ بھی ایک نقاب ہے۔ لیکن نہایت ہی باریک جس کے پیچھے مصنف اور مکتوب نگار کے اصلی خدوخال جھلملا رہے ہیں۔ وضع احتیاط سے جن پر گھٹن کے آثار ہیں، درد و کرب ہے، بے چینی ہے اور تنہائی۔

"وارفتگیٔ جذبات" کے تحت ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جس کو تنہائی اور بڑھا دیتی ہے... ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا مجھے برہم کر دیتا ہے۔" بظاہر یہ انتشار لطیف ہے۔ اور ۱۹۲۱ء یعنی زمانۂ شباب کی تحریر ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ بخاری صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جو تنہائی ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں، خاص طور پر اُن کے خطوط میں ایک چینی خانہ ٹوٹا ہوا ملتا ہے۔ وہ پشاور کے رہنے والے تھے جہاں چینی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کو جوڑنے کا عام رواج ہے۔ پشاور کے کسی قہوہ خانے میں چلے جایئے۔ ایک ایک چائے دانی میں سو سو پیوند نظر آئیں گے۔ بخاری صاحب کی شخصیت کا یہ خاکہ بھی کچھ ایسے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ وہ ایک ایسا کوزہ ہے جس سے کبھی شراب ٹپکتی ہے اور کبھی آنسو!

"میرا نام بخاری ہے" کے عنوان سے بی۔ اے ہاشمی صاحب لکھتے ہیں"... ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی زندگی کو تمثیل کاری بنا لے۔ مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ زندگی کا وہی رُخ پیش کیا جائے جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی کا باعث ہو۔ بخاری صاحب کی زندگی کا فلسفہ اور شیوہ بھی یہی تھا۔ لیکن ان کے نیازمندوں میں دو تین شخص ایسے بھی تھے جن کے سامنے وہ دکھ سے رو دیئے ہوں۔ شاذ و نادر ہی سہی لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ چہکنے والا بخاری اپنے کسی نیازمند کے پاس آدھ آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھا رہا ہے۔"

بخاری صاحب کے خطوط بھی ایسے ہی خاموش آنسو ہیں جو ان کی تمامتر احتیاط کے باوجود پلکوں کے پیچھے چمک رہے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہونٹ اس لئے مسکراتے ہیں کہ دیکھنے والے کی توجہ آنکھوں سے ہٹ جائے۔ بخاری صاحب کی ہنسی بھی کچھ ایسی ہی ہنسی ہے۔[1] ان کی فن کارانہ صلاحیتوں نے انہیں یہ ملکہ عطا کیا تھا کہ ہنستے ہونٹوں کے ساتھ روتی آنکھیں بھی ہنستی نظر آتیں۔ اور ہنسی اور بھی جاذب توجہ بن جاتی۔ جذبات کا یہ روپ چھل کچھ انہیں کا حصّہ تھا۔ اِن آنسوؤں کے سوتے کہاں تھے؟ بخاری صاحب کے نیازمند اس باب میں کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ وہ لمحے جب بخاری صاحب آدھ آدھ گھنٹہ خاموش نظر آتے ہیں یا رو دیتے ہیں، اُن کی تفصیل ہاشمی صاحب یوں ٹال گئے ہیں:

محبت کے فسانے دیدہ و دل کی امانت ہیں
خیانت ہے زباں کو محرم اسرار کر لینا

"ہمیشہ چہکنے والے" بخاری صاحب کی یہ کہانی سننے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اس سے اُن کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ان کے نیازمند اس راز کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ لہٰذا اصرار لاحاصل ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ بخاری صاحب کی تنہائی چھپائے نہیں چھپتی۔

کیمبرج سے ایک خط میں لکھتے ہیں"... کیمبرج میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ جیسے کسی گھڑی ساز کی دکان میں سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں۔ اس بھونچال میں مَیں بھی دھیمے دھیمے چلا جا رہا تھا... اور دل پر ایک اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ یہ دنیا ہی نرالی ہے اور میں بے یار و مددگار۔ نہ ہم سخن نہ ہم خیال۔ گھر سے خط آتا ہے تو اپنی تنہائی کو اور بھی محسوس کرنے لگتا ہوں"۔ یہاں بخاری صاحب کا ایک شعر یاد آگیا ؎

ابھی قائم ہے محفل عاشقانِ محفل آرا کی
کہ اُن کی خانماں بربادیاں رونق ہیں صحرا کی

یہ محفل آرا" بخاری نہیں تو کون تھے۔ اور یہ اُن کے دوست ہی بتا سکتے ہیں کہ خانماں بربادیوں کا تذکرہ محض روائتی شاعری ہے یا کچھ اور بھی۔ لیکن بات رہی جا رہی ہے۔ یہ ماننے میں نہیں آسکتا کہ محض کیمبرج کی "نرالی دنیا" یا پھر بخاری صاحب کی "مشرقیت"

---

[1] شاید اسی لئے کسی نے ظرافت نگار (HUMOURIST) کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کے ہونٹ مسکراتے ہیں مگر آنکھ روتی ہے! مدیر

؎ دل ما محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے — دعوئی جمعیت احباب جائے خندہ ہے
غالب

اس تنہائی کا باعث تھی۔ بخاری صاحب جیسے باخبر شخص پر اس
بے خبری کا اطلاق کر کیمبرج آنے سے پہلے انہیں کیمبرج کی نرالی دنیا
کا کچھ علم نہیں تھا، کہ چھٹی کے دن وہاں ہُو کا عالم ہوتا ہے اور پھر
یکایک زلزلہ آجاتا ہے۔ اس قسم کی بے خبری اُن کی ذات پر بہتان
ہوگا۔ دراصل یہ وہی تنہائی ہے جس کا ہاشمی صاحب نے ذکر کیا ہے۔
یہ 'اداسی' وہی اداسی ہے۔ جانے وہ کون سے "ہم سخن" اور کس
"ہم زباں" کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ گھر سے خط آنے پر انہیں اپنی
تنہائی کا احساس اور بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ جانے گھر سے
اُن کی کیا مراد ہے؟ اور گھر کے ساتھ ان کی کون سی آرزوئیں، کون سی
حسرتیں وابستہ ہیں؟ اسی خط میں لکھتے ہیں "بعض لیکچروں میں تو یہ
کیفیت تھی کہ ہمہ تن گوش ہوں۔ لیکن وقت گزر جاتا ہے اور دماغ
کسی چیز پر قابو نہیں پاتا۔ خیالات میں ایک گونج سی ہے جس میں کچھ
معنی نہیں ڈال سکتا۔" اُن کی ساری زندگی ایک ایسی گونج تھی جس میں
معنی ڈالنے کی وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ اُن کے دل میں کیا کیا سودے
تھے۔ لیکن ان کی بے چین طبیعت نے اُنہیں کبھی ایک جگہ جم کر نہ
بیٹھنے دیا۔ اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لئے وہ آج ایک کام میں مگن
نظر آئے تو کل دوسرے میں، جیسے زندگی کا کوئی واضح مقصد اُن
کے سامنے نہیں تھا۔ اگر وہ تصنیف و تالیف کے اُن منصوبوں کو
عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوجاتے، جو اُن کے ذہن میں
تھے تو اُردو ادب کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ اور اس "اگر" کے ہزار
اشارے اُن کے خطوں میں ملتے ہیں۔ مگر اُن کی حقیقت محض
جذباتی لمحوں کی ہوکر رہ جاتی ہے۔ اور ہر بار وہ نقاب نظروں کے
سامنے آجاتا ہے۔ "چہکنے والا بخاری" جو زندگی کا وہی رخ پیش کرنا
چاہتا ہے (بقول ہاشمی صاحب) جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی
کا باعث ہو۔ اور اس مسلک میں بھی "اپنی بالیدگی" کا مقصد زیادہ
نمایاں نظر آتا ہے۔

لیکن نقاب بہرحال نقاب ہی ہوتا ہے۔ اور اُس کا ابھرا
ہوا تار چھپائے نہیں چھپتا۔ زبان و بیان کے مسئلوں سے انہیں
خاص دلچسپی تھی۔ اور پنجابی لوک شاعری کے خلوص سے وہ بے حد
متاثر تھے۔ اپنے ایک خط میں پنجابی ابیات کا مزہ لے رہے ہیں لیکن
ایک شعر پہ رُک جاتے ہیں۔ ایک لفظ کا مطلب پوچھتے ہیں۔ "وِنج"
معلوم نہیں کہ سالک صاحب نے اس کا کیا جواب دیا۔ جہاں
تک میں سمجھتا ہوں "وِنج" بہانے کو کہتے ہیں۔ شعر یوں ہے:

آگ بال کے دھوئیں دے وِنج رووّاں
لُکاواں دُکھ سجناں دے

("آگ جلاکر دھوئیں کے بہانے روتی ہوں اور یوں اپنے
ساجنوں کے دکھ چھپاتی ہوں۔)

بخاری صاحب آگ جلاکر، بلکہ جلتی آگ کو دیکھ کر روشنی
کے بہانے ہنس رہے ہیں۔ وہ کون سی آگ ہے، وہ کون سجن
ہیں وہ کون سے دکھ ہیں جنہیں وہ چھپانا چاہتے ہیں، یہ اُن
کے احباب ہی بتا سکتے ہیں۔

بخاری صاحب کی سب سے مانوس تصویر "مضامین پطرس"
کے سرورق پر چھپی تھی۔ ایک یک رخی سلہوٹ۔ آج وہ تصویر اُن
چہروں کی طرح نظر آتی ہے جو کاغذ اور گتے کے بنے ہوتے ہیں
اور جنہیں MASQUERADE قسم کی تمثیل کاری یا "جھاکیوں"
(سوانگ) میں پہنا جاتا ہے۔ یہ یک رخی تصویر جہاں اُن کی
انفرادیت اور جدت پسندی کا پتہ دیتی ہے وہاں اُن کی تنہائی کا
بھی احساس دلاتی ہے۔ سفید کاغذ پر ایک سیاہ خاکہ جس کے
نقوش غائب ہیں![1] اپنے جذبات کو، اپنی تنہائی کو اور اپنے
اصل چہرے کے چھپانے کا انہیں خاص سلیقہ تھا۔ اُن کی گردن
پر آپریشن کا نشان تھا۔ اور اُن کی وہ تصویریں بھی جو "یک رخی"
نہیں ہیں۔ اسی سلیقے کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں اکثر تصویریں
ایسی ہیں کہ ہاتھ گال پر ہے۔ غالباً اُس نشان کو چھپانے کے لئے۔
نہ جانے اپنی ظرافت سے وہ کون سا گھاؤ چھپا رہے تھے!

ظرافت بھی اُن کا ایک چہرہ ہے، تمثیل کاری ہے۔ اس
ضمن میں مار ملیچین نے لکھا ہے کہ "ہمہ دم مسکراتی اور پرمذاق
شخصیت کے پس پردہ وہ ایک سنجیدہ بخاری بھی تھے۔ وہ مزاح
کی نقاب اتار کر، ضرورت کے وقت انتہائی سنجیدہ بات کر سکتے
تھے اور کرتے تھے۔ مزاح کی نقاب تحفظ کے طور پر اکثر و بیشتر
ڈالے رہتے تھے۔" مار ملیچین نے اگر بخاری صاحب کے خط

۱؎ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا!

پڑھتے ہوتے، بلکہ ان خطوط کی بین السطور تحریر پڑھی ہوتی تو یوں
لکھا ہوتا کہ وہ اپنے المیہ چہرے پر ظرافت کا نقاب ڈالے رہتے تھے

یوسف ظفر سے روایت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بخاری
صاحب کی ایک محفل خاص میں میں بھی شریک تھا۔ محفل رات
گئے تک رہی۔ واپسی پر بخاری صاحب نے کہا کہ جن کے پاس
سواری کا انتظام نہیں انہیں میں گھر تک چھوڑ آؤں گا۔ آخر میری
باری آگئی۔ میں بخاری صاحب کے ساتھ سامنے کی سیٹ پر بیٹھا
تھا۔ کار بہاولپور روڈ پر جا رہی تھی اور سڑک سنسان تھی۔ معاً
میں نے کہا اگر اجازت ہو تو ایک ذاتی بات پوچھوں! جواب
ملا ہاں! ہاں! میں نے کہا آپ کے دل کی گہرائیوں میں ایسا
کونسا گھاؤ ہے۔ جسے آپ مزاح و ظرافت میں چھپانا چاہتے ہیں؟
یہ سن کر سٹیرنگ وہیل پر ان کا ہاتھ کانپا اور کار ڈول سی گئی۔
جیسے راستے میں کوئی رکاوٹ آگئی تھی۔ حالانکہ سڑک صاف
تھی۔ لیکن ایک کہنہ مشق اداکار کی طرح وہ فوراً سنبھل گئے
اور کہا تم بہت شریر ہو۔ کسی کے اندر اتنا گھسنے کی کوشش نہیں
کرنی چاہئے۔ اُن کی آواز میں درد بھی تھا، گلہ بھی، سرزنش بھی۔

یہ زخم شاید تنہائی کا زخم ہے۔ جس کو دور کرنے کے لئے وہ
محفلیں برپا کرتے ہیں، دوستوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، اُن کی بے رُخی
کی شکایت کرتے ہیں۔ گلے ہیں، شکوے ہیں، حسرتیں ہیں۔ لیکن ساتھ
ساتھ قہقہے بھی بلند کر رہے ہیں جیسے کوئی کسی عظیم الشان محل میں
جس کے باشندے کب کے رخصت ہو چکے ہوں، اکیلا ہنس رہا ہو۔
اور اپنی تنہائی کے احساس کو دور کرنے کے لئے ہنستا ہی چلا جائے!
اِن قہقہوں کی بازگشت سے ویرانی کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔
اور ان مکینوں کی یاد دلاتا ہے جن سے یہ دنیا آباد تھی یا آباد ہونی چاہئے
تھی۔ اُن حالات کا، موت کا اور خوف کا احساس ہوتا ہے جو اس ایوان
کو سُونا کر گئے۔

بخاری صاحب کی تندرستی ہمیشہ ویسی ہی رہی۔ چودھری ظفر اللہ
خاں لکھتے ہیں۔" بخاری صاحب زندگی کے ابتدائی دور ہی سے صحت
کی تشویشناک خرابی کا شکار ہو گئے تھے۔ اور عمر بھر یہ روگ پالتے رہے۔
جب وہ مسٹر فیلڈن کے ساتھ کام کر رہے تھے تو جسمانی لحاظ سے
بہت آزردہ اور شکستہ دل رہتے تھے۔ جب وہ مسٹر فیلڈن کی جگہ
آل انڈیا ریڈیو کے (شروع میں کنٹرولر) ڈائرکٹر جنرل بنائے گئے تو
انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس بات نے انہیں اس قابل
بنا دیا کہ اپنی تکلیف دہ بیماری کا مقابلہ کسی قدر اطمینان سے کر سکیں"۔
یعنی ایک تو جسمانی عارضہ، دوسرے نفسیاتی۔ اُن کے ایک روگ
کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہو کہ وہ ہمیشہ کمال کی جستجو میں رہے ثانوی
یا 'دم کش' کی حیثیت انہیں منظور نہیں تھی۔ اپنی اہمیت، قابلیت
اور صلاحیتوں کا انہیں بجا طور پر احساس تھا۔ اور کسی بھی اعلیٰ درجے
کے تمثیل کار کی طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ سب کی نظریں مجھ ہی پر ہوں۔
تماشائیوں میں اگر کسی کو اونگھ آگئی تو وہ برہم ہو گئے۔ اس کی ایک
وجہ اُن کا جسمانی عارضہ اور سرطان کا خوف (جس میں وہ ہمیشہ مبتلا
رہے) بھی تھا۔ ہاشمی صاحب کا خیال ہے کہ" اُن کی زندگی کے
آخری دس پندرہ سال میں اُنہیں (ہمیشہ) اس جان لیوا مرض کا
دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ضبط نے کبھی انہیں اجازت نہ دی کہ وہ اس
کو ظاہر کر سکیں۔ لیکن وہ انجام سے ہمیشہ خائف رہے"۔ لیکن اس
ضبط کے باوجود اُن کا خوف چھپائے نہیں چھپتا۔

جہاں تک بخاری صاحب کے بعض فاضل شاگردوں کے
نظریات سے پتہ چلتا ہے، بخاری صاحب ڈاکٹر رچرڈز کے مکتبۂ
تنقید سے بے حد متاثر تھے۔ اس نظریئے کی رو سے کسی مصنف
کی تحریر کو اس کی زندگی کے حالات سے علیحدہ رکھ کے پرکھا جاتا ہے،
لیکن شاید یہ ممکن نہیں۔ مصنف کی اپنی زندگی جیسے تیسے تحریر میں
ضرور عکس پذیر ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہوتی ہے
جس کی خاطر وہ تخلیق کا تمام درد و کرب برداشت کرتا ہے۔
۱۹۲۹ء کی ایک تحریر یوں تو انشا پردازی کا نمونہ ہے۔ لیکن
اس کا پہلا ہی جملہ اُس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا ذکر
چودھری ظفر اللہ خاں اور ہاشمی صاحب نے کیا ہے۔ بخاری صاحب
لکھتے ہیں "جب مرض بہت پُرانا ہو جائے۔ اور صحت یابی کی کوئی
امید نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ
جاتی ہیں کہ میز پر جو انگور کا خوشہ رکھا ہے۔ اُس کے چند دانے کھالئے"
اُن کے لطیفے بھی ایسے ہی چند دانے ہیں۔

خرابیٔ صحت اور موت کا ذکر اُن کے خطوں میں مختلف شکل
میں ملتا ہے۔ ۱۳ر اگست ۱۹۵۱ء کے ایک خط میں (جو مولانا سالک کے نام ہے)

اُن منصوبوں ذکر کرتے ہیں جو اُردو کی بدقسمتی سے مکمل نہ ہو سکے۔ اس ضمن میں کہتے ہیں "جب تک ہم لوگ زندہ ہیں یہ امر محال نہیں۔ موت راستے میں حائل ہو گئی تو کوئی اُسے پھاند نہیں سکتا۔" اور یکم جولائی ۱۹۵۸ء کے خط میں اس خوف کا اظہار کھلے بندوں کیا ہے:

"اپارٹمنٹ میں رہنا ہم تنہا پسندوں کے لیے ناممکن ہوگا۔ ایک پہاڑ سی عمارت، اُس میں درجنوں ڈبے۔ ہر ہمسایہ مقفل اور پراسرار۔ آٹومیٹک لفٹ میں پندرھویں منزل پر رہتا تھا۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ اگر ۱۵ نمبر کا بٹن دبانے کے بعد روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے تو یہ لفٹ کا مقفس، کمبخت۔ بے حس بلا تامل پندرھویں منزل تک چڑھتا چلا جائے گا۔ اور وہاں پہنچ کر اُس کا دروازہ کھل جائیگا۔ اور اسے اتنی بھی تمیز نہ ہوگی کہ جس نے بٹن دبایا تھا، محض ایک لاش ہے۔ دروازہ کھلنے پر باہر نہیں نکل سکتا۔ اِس خیال سے عجیب دحشت ہوتی ہے۔" اور اُن کے انجام کے پیشِ نظر ۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء کا خط المیہ پیشگوئی بن جاتا ہے۔ "موت زلیست کا علم نہیں۔ اگر آنا نصیب ہوا تو خوب باتیں ہوں گی۔"

تمثیل کار جب تھک جاتا ہے تو پردہ گرنے کی آرزو کرتا ہے۔ غمِ پنہاں اور غمِ زمانہ نے بخاری صاحب کو بھی تھکا دیا۔ مایرکین نے لکھا ہے کہ "اگر یہ صورتِ حال (سیاسی بحث مباحثہ۔ یو این میں ان کے خلاف محاذ اور ریشہ دوانیاں) پیدا نہ ہوتیں تو شاید وہ چھ ماہ سے دو سال تک زندہ رہ سکتے تھے لیکن جو کچھ ہوا وہ نہ ہوتا تب بھی زیادہ دن دنیا میں نہ رہتے۔ وہ اپنے ڈاکٹر سے اکثر یہ سوال کیا کرتے تھے کہ بتلایئے خدارا! بتلایئے کہ موت کب آئے گی؟"

یہ سوال اُن کے ذہن میں کب سے تھا۔ اس کا اندازہ دِلی کے زمانے کے ایک خط سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے سالک صاحب کو لکھا۔ بخاری صاحب کے کو ایک مَسّا نکل آیا تھا۔ یہ "خرخشہ" آخر پاک ہوا۔ لیکن وہ لکھتے ہیں کہ "جو مضغۂ گوشت کٹا تھا، اس کا معائنہ کر رہا ہوں۔ شبہ ہے سرطان نہ ہو۔ ڈاکٹر اس شبہے پر ہنستے ہیں۔" جو شخص عمر بھر اوروں پر ہنستا رہا ہو۔ اوروں کا اُس پر ہنسنا کتنا بڑا طنز ہے، المیہ ہے! "لیکن دودھ کا جلا ہوں۔ اس لئے احتیاط کر رہا ہوں۔" ان کی ظرافت بھی احتیاط تھی سان کا چھکنا دیدہ و دل کی اس امانت کو چھپانے کی سعی کے علاوہ، جس کا ہاشمی صاحب نے ذکر کیا ہے سرطان اور موت کے خوف کو بھی چھپانے کی سعی تھی۔

وہ شمعِ انجمن تھے۔ شمع کا شعلہ تو سب دیکھتے ہیں لیکن شعلے کے اندر جو تاریکی ہوتی ہے، اُن کے سینے کا جو داغ ہے اس کی طرف کم لوگوں کی توجہ جاتی ہے۔ ایک ہاشمی صاحب کو چھوڑ کر جو اپنے مختصر مضمون میں بہت کچھ کہہ گئے ہیں، ان کے باقی مداح روشنی کو دیکھ کر بچوں کی طرح تالیاں پیٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ آتش بازی چھوٹ رہی ہے اور لوگ باگ خوش ہیں۔ آتشباز کا دھیان کسی کو نہیں آتا کہ اس کے سینے کے اندر ایک فلیتہ سلگ رہا ہے۔

اس سے بخاری صاحب کو مظلوم یا شہید ثابت کرنا منظور نہیں۔ جو شخص سرطان کے اندیشے، موت کے خوف اور دل کی ویرانیوں پر قہقہے لگا سکتا ہے اُس کی بہادری سے کون انکار کر سکتا ہے؟ خیال آتا ہے تو صرف اتنا کہ اُن کے چارہ گر کیوں چپ ہیں۔

لیکن بخاری صاحب دوستوں سے ہمیشہ شاکی رہے۔ اُن کے حلقۂ احباب میں ایک سالک صاحب ہی ایسے نظر آتے ہیں جن کی وفاداری کا انہیں یقین ہے۔ مگر اُن کی حسرتیں چھپائے نہیں چھپتیں۔ سالک صاحب لکھتے ہیں کہ "بخاری مرحوم پاکستان آئے تو چند روز کراچی میں فروکش رہے۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے۔ کہئے کوئی نیا دوست بھی بنایا؟" یہ جملہ بظاہر کتنا سادہ لیکن در اصل کتنا پُرپیچ ہے! سالک صاحب کے نام اُن کے خطوط دوستی کا ایک مکمل باب ہیں جس میں احباب کی شکایت ایک مستقل عنوان بن کر ابھرتی ہے۔ "جب کبھی شہر جانا ہو اور دوستوں سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہئے گا۔ چند دن ہوئے میں نے امتیاز کو خط لکھا تھا۔ لیکن جواب سے حسبِ معمول محروم ہوں اور شاید محروم رہوں۔ یہ میری محرومی کا احساس اُن تک پہنچا دیجئے۔" مگر وہ اپنی محرومیوں کو چھپانا بھی جانتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک جملہ ہو جاتا ہے "کہ عشق کے کاروبار میں بسا اوقات اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔" حسرتوں کے باب میں بخاری صاحب کا ایک اور خط بھی قابلِ ذکر ہے۔ اخترؔ شیرانی کی مشہور نظم "او دیس سے آنے والے بتا" یاد آجاتی ہے۔ "کیا اب بھی رآوی کے اُس پار کوئل کی صدا سنائی دیتی ہے؟"

کیا اب بھی فالودے کا موسم قریب آرہا ہے؟ جب بیماری کے عالم میں بالکل خالی الذہن تھا تو شبابِ لاہور اور لاہورِ شباب کے کئی موقعے تھوڑی دیر کو دماغ میں جاگ اٹھے۔ دارالاشاعت کی بزم عشاق، دہلی مسلم ہوٹل میں وارفتگاں کا ہجوم.... تاثیر کی نیل پالی۔ جگر کی پُراسرار معصیتیں، صوفی کی پنجابی غزلیں.... اے کاش کوئی از سرِنو اِن اوراقِ پریشاں کا شیرازہ باندھ دے۔" اور حسرتوں کے اِس مزار پر حافظ کا کتبہ:

دوش در یادِ حریفاں بہ خرابات شدم
خم مے دیدم و خوں در دل و پا در گِل بود
بس بگشتم کہ بپرسم سببِ دردِ فراق
مفتی، عقل دریں مسئلہ لایعقل بود

یوں محسوس ہوتا ہے کہ مفتیٔ عقل نے اگر کچھ کہا بھی ہے تو اُس روحانی ساعت میں مکتوب نگار نے سنی اَن سنی کر دی ہے۔ شاید وہ اوراقِ پارینہ جن کی جزبندی کی حسرت اُنہیں "خوں در دل و پا در گل" بنا دیتی ہے کب سے بکھرے پڑے تھے کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اوراق بظاہر یکجا ہی نظر آتے ہیں لیکن اُن کو باندھنے والی ڈوری غائب ہوتی ہے۔ اور خود قاری کا سانس ہی انہیں منتشر کر دیتا ہے۔

دوستوں سے اُن کی مایوسی کا یہ عالم ہے کہ ایک کہانی درکار ہے۔ چنانچہ "پہلے خیال آیا کہ امتیاز سے پوچھوں۔ لیکن ان سے جواب کی توقع نہیں"۔ توقع اٹھ جانے کے بعد بھی اُن کے گلے بدستور ہیں۔ "امتیاز کو کیا ہوا۔ کبھی خط لکھنے کا نام نہیں لیتے۔ کئی مرتبہ میں نے پہل کی لیکن ہر بار تھک کر بیٹھ گیا۔ پھر چند اور احباب کی وساطت سے انہیں سلام بھیجتا رہا۔ وہ بھی قبول نہ ہوا تو اسے بھی ترک کر دیا"۔ اور امتیاز صاحب سے اُن کی شکایات بہت پرانی ہیں۔ "نومبر کے تیسرے ہفتے لاہور آنے کا ارادہ ہے۔ سنا ہے امتیاز لاہور آ گیا۔ نہ خط لکھتا ہے نہ ملتا ہے۔ دہلی سے شمال جنوب کو گذر جاتا ہے اور ہم سے نہیں ملتا"۔ لیکن دوست کی بے رخی کو فوراً ظرافت میں اڑا جاتے ہیں "جیسے عصمت بچائے پھرتا ہو۔ ملے تو ڈانٹیئے گا"۔ آخری جملے میں کتنی حسرت ہے!

دوستوں سے شکوے اُن کے خطوط میں جگہ جگہ نظر آتے! "یہاں میرے احباب تو بہت ہیں لیکن دہلی شہر نہیں صحرا ہے۔ فاصلے بہت ہیں، کچھ جسمانی کچھ روحانی"۔ سالک صاحب کو لکھتے ہیں "آپ کے سوا کسی اور صاحب کا خط اب تک نہیں آیا۔ صوفی، ہاشمی فیض، تاثیر سب نے مجھے دریابرد کر دیا..."۔ "میں کئی دلچسپ خط لکھتا۔ اگر دوستوں کے خط اس کے محرک ہوتے۔ بس تحریک ہی کا انتظار طبیعت کو رہا"۔ مگر ایک جگہ اپنی خاموشی کا بھی اعتراف ہے "جس کی سزا مجھے ملتی رہی۔ دوست بعید تر ہوتے گئے اور میری تنہائی بڑھتی گئی"۔ "احباب سے محض بے خبر ہوں"۔ آغا حمید کی شادی پر اُن کو تہنیت کا تار دیا۔ جواب نہ آیا"۔ حسرت صوفی، ہاشمی، عابد کسی نے خط نہیں لکھا"۔ "امتیاز کو میرا بہت بہت سلام اور پیار۔ کبھی صوفی ملیں تو اُن سے کہئے دو گھونٹ میری یاد میں بھی پی لیں۔ کمبخت کبھی خط لکھنے کے روادار نہیں۔ اور ہم ہیں کہ ہر رہگذر سے اُن کا ذکر فخر سے کرتے ہیں"۔

صوفی صاحب کے ذکر سے ان کا مضمون یاد آ گیا۔ پطرس بخاری مرحوم، جن دنوں قیامِ پاکستان کے بعد بخاری صاحب گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے، صوفی صاحب کو اردو کی تدریسِ شبانہ کے بارے میں ایک تجویز سوجھی۔ اور وہ فوراً پرنسپل کے گھر پہنچے۔ لیکن اُن دنوں پرنسپل کے مکان پر سرکاری کاغذات کا داخلہ ممنوع تھا۔ ایک آدھ بات کرنے کے بعد میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا تجویزی کلام سنانا شروع کیا"۔ اس ایک لفظ "جھجکتے" کی تکرار سے صوفی صاحب کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ پرنسپل لاکھ پرنسپل سہی لیکن دوست کو دوست سے بات کرنے میں جھجک کیسی؟ یہ بات قابل غور ہے۔ اس کا جواز خود بخاری صاحب ہی کے ایک خط میں ملتا ہے۔ خط دِلی کے زمانے کا ہے۔ مخاطب سالک صاحب۔ "جانتا ہوں کہ دس سال کا عرصہ اپنی طبیعت میں اور حالات میں کئی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے"۔ دوستوں کا ان سے گریز کہیں انہیں تبدیلیوں کا ردِعمل تو نہیں تھا؟ اور کیا یہی وجہ تو نہیں کہ وہ ایک جگہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ کہ "صراحیٔ مے ناب و سفینۂ غزل" کے سوا۔ اور کوئی رفیق نہیں جس کا بھروسہ کیا جا سکے۔

فیض صاحب نے بخاری صاحب کی زندگی کے مقصد کو ایک ہی جملے میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ "کہ گوہر مقصود گفتگو است"۔ ایک حد تک یہ بہت درست ہے لیکن کسی حد تک

اور کیوں؟ یہ جدا بحث ہے۔ بہرحال وہ بخاری صاحب کے بارے میں اپنی یادوں کا آغاز یوں کرتے ہیں۔ موضوع دوستی ہے۔ اور الفاظ خود بخاری صاحب کے ہیں:

"دوستی، تندہی اور مستعدی کا نام ہے یارو۔ محبت تو یونہی کہنے کی بات ہے۔ دیکھو تو میں تم میں سے ہر پاجی کو ہر روز ٹیلیفون کرتا ہوں! ہر ایک کو گھر پہنچاتا ہوں، اپنے گھر لاتا ہوں، کھلاتا ہوں، پلاتا ہوں، آدمی تنخواہ پٹرول پر اڑ جاتی ہے۔" یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ باتیں کس حد تک جتانے کی باتیں ہیں۔ دوستوں کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا' وصال محبوب کی تدبیریں، چارہ سازی اور چارہ گری .... مگر بخاری صاحب کے شکوے جاری ہیں۔ "مجھے تنخواہ دیتے ہیں آپ؟ یا آپ میری معشوقائیں ہیں؟ یا آپ کے ذہن مبارک سے حکمت و موعظت کے وہ لعل و گہر برستے ہیں کہ اس ہیچمداں کا دامن گنجہائے گراں مایہ سے بھر جائے ..." یہ تو فیض صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ باتیں بخاری صاحب نے کب اور کن حالات میں کہی تھیں۔ لیکن روایت فیض صاحب کی ہے۔ اس لئے ماننا ہی پڑتی ہے۔ لیکن دوستی کے باب میں یہ سب کچھ کہتے وقت وہ اُس احتیاط، اُس وضع داری، اُس نیازمندانہ اور مخلصانہ لہجے کو نظر انداز کر گئے ہیں جو اُن کے "سب سے قریبی دوست" سالک کے نام خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ اور جہاں وہ اپنے نام کے ساتھ "خاکسار" وغیرہ لکھتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مزاح نہیں، مذاق اور دل لگی نہیں بلکہ طنز ہے۔ اپنی برتری اور دوستوں کی بے مائگی کا اعلان ہے۔

ایسے میں دوستوں کا اُن سے دور بھاگنا۔ اور اُن کا دوستوں کا تعاقب کرنا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ بخاری صاحب بڑے پڑھے لکھے، طباع اور غیر معمولی طور پر ذہین بزرگ تھے، اور احباب سے بھی اُن کی ایسی ہی توقعات تھیں۔ لیکن اُن کے ایک شاگرد رشید کا کہنا ہے کہ احباب کے تمام علم و فضل کے باوجود اُن کی یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ چنانچہ اُن کی دوستی پر ایک مشفقانہ اور سرپرستانہ رنگ چڑھتا گیا، شاید غیر شعوری طور پر۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اُس تمام قرب کے باوجود جو اُنہیں دوستوں کی اتنی خاطرداری پر مجبور کرتا تھا، اُن کے درمیان ایک فاصلہ تھا جو بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ اپنے ایک صاحبزادے کی شادی پر جب وہ دلہن کو لیکر کراچی آئے تو اُن کے پُرانے دوستوں میں سے (جن میں سے تین اُس وقت کراچی میں موجود تھے) ایک بھی ریلوے اسٹیشن پر نہ آیا۔ بخاری صاحب نے پلیٹ فارم پر ایک نظر ڈالی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ سوائے ان کے تین چار پرانے ماتحتوں کے۔ جن میں سے اکثر نے انہیں آل انڈیا ریڈیو کے زمانے میں بس دور ہی سے دیکھا تھا۔ بہت دور سے! اور اب محض ان کے چھوٹے بھائی کی خوشنودی خاطر کے لئے ہار لے کر چلے آئے تھے۔

بخاری صاحب مسکرائے۔ وہی مشفقانہ، سرپرستانہ مسکراہٹ جو اُن کی شخصیت کا جزو ثانی تھی اور پھر اسباب کی جانچ پڑتال میں مصروف ہو گئے۔ تمثیل کار شاید اپنا وہی چہرہ ڈھونڈ رہا تھا جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی کا باعث ہوا کرتا تھا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ اُن تماشائیوں کو کیا ہوا جو میری اِک ایک ادا پر داد کے ڈونگرے برساتے تھے۔ تماشاگاہ سنسان کیوں پڑی ہے!

ایسے میں جب اُن کی اُداسی اور تنہائی کا خیال آتا ہے۔ اور ان اندیشوں کی طرف دھیان جاتا ہے جن سے وہ عمر بھر دوچار رہے۔ اور ساتھ ہی کانوں میں اُن کے قہقہے گونجتے ہیں تو "مضامین پطرس" کے مصنف کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے جس سے انہوں نے اپنے غم پنہاں کا مقابلہ کیا۔ اور آج کہ دنیائے ادب پطرس سے محروم ہو چکی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی رات کے اندھیرے میں کسی سنسان راستے سے اپنے خوف کو چھپانے کے لئے سیٹی بجاتا ہوا گزر گیا ہے۔

لیکن یہ بھی پطرس کی یک رخی تصویر ہے، محض خاکہ! اس کے خدوخال کو نمایاں کرنے کے لئے اردو ادب کی تاریخ اُن کے "نیازمندوں" کی منتظر ہے۔

★

میر کی ایک عشقیہ تمثیل: "مور نامہ"

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہوگا کہ شروع میں زبان تفصیل و تشریح کی متحمل نہ تھی اور بات زیادہ تر اشاروں اشاروں میں کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب حیات و کائنات کے مسائل پر غور و خوض کیا جانے لگا تو مجرد تصورات کو دلنشیں پیرایہ میں بیان کرنے کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے رموز و علامات اور تشبیہ و تمثیل سے مدد لی گئی چنانچہ دنیا کے تقریباً تمام ابتدائی قصے کہانیوں کا رنگ رمزیہ SYMBOLIC یا تمثیلی ALLEGORICAL ہے۔ رمز سے بات میں وسعت آتی ہے اور اس کی اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن تمثیل کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ زیادہ تر معقولات کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مجرد تصورات کا بیان عام طور پر غیر دلچسپ اور خشک ہوتا ہے، انہیں تمثیل کے ذریعہ مجسم اور متشخص کر دینے کے بعد عام فہم اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ تمثیل نگاری کے اجزا دنیا کی ہر زبان کے ادب میں کم و بیش ملتے ہیں، لیکن اس کی ابتدا مشرق کے ادب سے ہوئی۔ "پنچ تنتر" میں جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں اس کی اولیں مثال ہیں۔ جاتک، ہتوپدیش اور کتھا سرت ساگر میں بھی تمثیلی کہانیاں ملتی ہیں۔ عہد نامہ عتیق میں بھی بعض مقامات پر تمثیل کا انداز پایا جاتا ہے۔ انجیل میں از تاریخ کو ایک خوبصورت بیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یونانی زبان میں تمثیل کی عمدہ مثال افلاطون کی ری پبلک میں غار کی کہانی ہے۔ ہومر اور ہیریکلیتس نے بھی اپنی تحریروں میں تمثیل سے مدد لی ہے۔ اطالوی میں پلوٹارک کی LIFE OF CORIOLANUS اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ تمثیل کا سب سے پر زور شاعرانہ استعمال ڈانٹے نے کیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تصانیف میں بھی تمثیل نگاری خاصی مقبول رہی۔ آرنیس اور یوری ڈائیس کے قصے میں دراصل انسان کے اخلاقی احساس کو اپنے گناہوں کا احتساب کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ عشق کی جستجو کو تیرھویں صدی کی ایک فرانسیسی نظم "رومان ڈی لا روز" میں بڑی خوبی سے پیش کیا گیا۔ اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ انگریزی میں چاسر نے کیا تھا۔ قدیم انگریزی ادب میں مذہبی تمثیل کی قابل ذکر مثال ولیم لینگ لینڈ کی "VISION OF PIERS PLOWMAN" ہے۔ ادبی اور مذہبی تمثیل کی تفریق پر سب سے پہلے تھامس ایکویناس نے زور دیا۔ بعد کے زمانے میں سیاسی، سماجی یا ادبی طنز کے لئے بھی تمثیل سے کام لیا جانے لگا جیسے سوفٹ کی GULLIVER'S TRAVELS اور TALE OF A TUB" یا پوپ کی RAPE OF THE LOCK اور DUNCIAD لیکن یورپی ادب کی بہترین تمثیلیں بنین کی PILGRIM'S PROGRESS اور سپنسر کی FAERIF QUEEN تسلیم کی جاتی ہیں۔

عربی اور فارسی میں جو قصے تصنیف اور ترجمہ ہوئے، ان میں "کلیلہ و دمنہ" اور "الف لیلہ" میں تمثیل کے اجزا ملتے ہیں۔ "انوار سہیلی" منطق الطیر" اور "اخوان الصفا" کا انداز بھی تمثیلی ہے۔

اردو میں تمثیلیں ہندی اور فارسی سے لی گئی ہیں۔ فارسی سے مستعار تمثیلوں میں قصۂ حسن و دل سب سے اہم ہے، جسے مشہور دکنی شاعر

مشرق و مغرب میں مشہور تھا۔

وجہی کے تقریباً ڈھائی سو برس بعد تمثیل نگاری کی روایت اپنے اصلی رنگ میں محمد حسین آزاد کی تصنیف "نیرنگ خیال" (۱۸۸۰ء) میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح گویا وجہی سے آزاد تک کا درمیانی حصہ اردو تمثیل نگاری کی تاریخ میں ایک خلا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل ایسا نہیں۔ میر تقی میر کی مثنوی "مور نامہ" کے کرداروں کا غور سے

ؔ یہ مثنوی اسٹیٹ لائبریری رامپور کے مخطوطہ کلیات میر نمبر ۴۸۰۴ میں شامل ہے اور عبدالباری آسی کے مرتبہ نول کشور کا ایڈیشن میں نہیں۔ اس کا متن ڈاکٹر گیان چند جین نے رسالہ "اردو ادب" علی گڑھ (جون ۱۹۵۷ء) میں پیش کیا تھا، جہاں سے اسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کلیات میر کے نئے ایڈیشن مطبوعہ کراچی میں شائع کر دیا ہے۔

تجزیہ کیا جائے اور ان کی تمثیلی معنویت پر توجہ کی جائے تو دتھی اور آزاد کی گمشدہ درمیانی کڑی بآسانی متعین کی جا سکتی ہے۔

اس مثنوی کا قصہ بظاہر غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک رانی کا مور سے عشق کرنا اور اس پر جان دینا دکھایا گیا ہے۔ قصے کے مرکزی کردار راجا، رانی اور مور، ٹھیٹھ مقامی فضا کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہندستانی قصوں میں اس سے ملتے جلتے واقعات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً "پدماوت" میں سنبھل دیپ کے راجا گندھرو سین کی بیٹی پدماوتی ایک توتا "ہیرامن" پالتی ہے، جو اسے روز عشق و عاشقی کے قصے سناتا ہے۔ راجا اسے ہلاک کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے لیکن شہزادی اس کی جان بچانے کے لئے اسے گھر سے اڑا دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رانی اور مور کے عشق کا کوئی عوامی قصہ میرؔ تک کسی مقامی روایت کے ذریعے پہنچا ہو۔ مگر اس کا تحریری ثبوت نہیں۔ ممکن ہے یہ قصہ میرؔ ہی کی تخلیق ہو۔ بہرحال اس میں دو باتیں ایسی ضرور ہیں جنہیں میرؔ کی ذہنی افتاد سے خاص مناسبت ہے۔ ایک تو یہی عشق کی عالم گیر ہنگامہ آرائی یعنی انسان تو کیا چرند و پرند بھی عشق کے سودا زدہ ہیں۔ دوسرے کہانی کا دردانگیز اور الم ناک انجام جس میں عاشق و معشوق دونوں جان سے جاتے دکھائے گئے ہیں۔

قصے کا خلاصہ یہ ہے: ایک مور جنگل سے بستی میں آیا۔ یہاں کی رانی حسن و خوبی میں لاثانی تھی۔ مور اس کے دیدار کے لئے شاہی محل پہنچا۔ رانی کا سامنا ہوا تو مور حیرت کی تصویر بنا جہاں کھڑا تھا، وہیں کا وہیں رہ گیا۔ رانی نے ایک بے زبان پرندے کو اپنے حسن کا ایسا گرویدہ پایا تو وہ بھی اسے پیار دلار کرنے سے رہ نہ سکی اور مور وہیں محل میں رانی کے پاس خوش خوش رہنے لگا لیکن

مختلط رہنے سے بعد از چند روز ۔۔۔ شورِ بدنامی اٹھا اک سینہ سوز
کھل گئی غماز لوگوں کی زباں ۔۔۔ سب پہ ظاہر ہو گیا رازِ نہاں

راجا لوگوں کے لگانے بجھانے سے حسد کے انگاروں پر لوٹنے لگا اور مور کی جان کا لاگو ہو گیا۔ رانی نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو دل پتھر کر کے مور کو چوری چھپے محل سے نکال دیا:

حزن کے ساتھ اک حزیں آواز کی ۔۔۔ گرتے پڑتے دو قدم پرواز کی
دیر سر دیوار سے مارا کیا ۔۔۔ صبر سے ناچار پھر چارا کیا
پاس سے کچھ دور ہی رہنے لگا ۔۔۔ جورِ ہجرِ یار کے سہنے لگا

لیکن راجا تو اس کی جان کے درپے تھا۔ اس نے جگہ جگہ مور کی تلاش میں جاسوس دوڑائے۔ رانی تاسف سے اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ ادھر مور کا حال بھی درہم تھا۔ اس نے جنگل میں جا کر دانہ پانی ترک کر دیا اور صبا کے ہاتھوں رانی کو پیغام دینے لگا:

جا کے تو رانی سے کہیو واشگاف ۔۔۔ پھیکے خط کے حرف سامٹتا ہوں صاف
اب تلک جیتا تو ہوں پر زندگی ۔۔۔ دور تجھ سے ہو گئی شرمندگی
آنکھیں رہتی ہیں لگی تیری ہی اور ۔۔۔ کرتا ہوں اندھا سا میں فریاد و شور
اب کوئی اس راہ سے جاتا نہیں ۔۔۔ آ نکلتا ہے تو پھر آتا نہیں
شور کرتے کرتے پھاٹا ہے گلا ۔۔۔ اب جو نالے کرتا ہوں سو تلملا

جاسوس مور کا اتا پتا لے آئے کہ وہ اژدھوں کے ایک تیرہ و تار جنگل میں پناہ گزیں ہے۔ راجا نے فوراً فوج کشی کا حکم دیا اور خود مور کو ہلاک کرنے چلا۔ ادھر اس جگر سوختہ کے سوزِ دروں سے جنگل میں آگ لگ گئی اور سینکڑوں مار و اژدر اور شیر دکر گدن جل کر راکھ ہو گئے۔ مور بیچارہ بھی اس آگ میں جل مرا اور راجا کو فقط اس کا لاشہ ہاتھ آیا۔ غرض

پھر پڑی جو آگ سب لشکر جلا ۔۔۔ اور راجا کا بھی اودھر گھر جلا
یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر ۔۔۔ آتشِ غم سے جلا اس کا جگر
کیا لگی دل کو کہ رانی جل گئی ۔۔۔ خاک ہو کر خاک ہی میں رل گئی
عشق ہی کی ہیں یہ تازہ کاریاں ۔۔۔ عشق نے پردے میں جانیں ماریاں
عشق سے کیا میرؔ اتنی گفتگو ۔۔۔ خاک اڑا دی عشق نے ہر چار سو
طائر و طاؤس و حیوان اژدہے ۔۔۔ سب کھپے کیا عشق کی کوئی کہے
یہ فسانہ رہ گیا عالم کے بیچ ۔۔۔ بازماندہ ان کے ہیں سب غم کے بیچ

یہ مثنوی میرؔ کے دیوان پنجم میں شامل ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسے انہوں نے اپنی آخری عمر میں لکھنؤ میں لکھا ہوگا۔ بظاہر اس مثنوی کا قصہ غیر عقلی ہے لیکن ہمارے نزدیک میرؔ نے اسے تمثیل کے انداز پر نظم کیا ہے۔ اگر مثنوی کے مرکزی کرداروں کی معنویت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ راجا رانی اور مور محض نام ہی نام ہیں۔ میرؔ نے انہیں حسن و عشق کی بنیادی قوتوں کی رمز بنا کے پیش کیا ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

فتنہ در سر عشق کے یہ کام ہیں ۔۔۔ مور اژدر، رانی راجا نام ہیں
عشق ہے ہنگامہ سازِ شور و شر ۔۔۔ قصے قضیے عشق سے ہیں مختصر

مور دراصل عشق کی تجسیم ہے۔ رانی حسن اور راجا حسد کی
نمائندگی کرتا ہے۔ میر نے حسن و عشق کے سوز و ساز اور حسد و رقابت
کی آمیزش و پیکار کے ازلی فسانے کو ایک نئے پیرائے میں بیان
کرتے ہوئے عشق کی اہمیت و عظمت کے اسی مقدمے کو پھر دہرایا
ہے جسے وہ اپنی عشقیہ مثنویوں میں اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکے
تھے یعنی کائنات کی بنیادی قوت عشق ہے، یہاں زمین سے آسمان تک
عشق ہی عشق بھرا ہوا ہے، بوستانِ ناز کی بہار اور لیل و نہار کی
گردش، دنیا میں سبھی کچھ عشق ہی کے دم قدم سے ہے۔ زیرِ نظر
مثنوی کا آغاز بھی حسبِ معمول عشق کی تعریف سے ہوا ہے اور [illegible]
اس پر ۱۴ اشعار صرف کئے ہیں۔ البتہ ایک لحاظ سے یہ مثنوی میر کی
دوسری مثنویوں سے مختلف ہے یعنی اس سے پہلے میر عشق کی شورانگیزی
انسانوں میں دکھاتے تھے۔ اب وہ خاص طور سے یہ بتانا
چاہتے ہیں کہ ذی عقل تو کیا طیور و وحشی بھی اس کی ہنگامہ آرائی سے
نہیں بچ سکتے۔ مثنوی کے آغاز میں کہتے ہیں:

در حقیقت سب میں یاں ساری ہوئی — ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
چار سو ہنگامہ آرا عشق ہے — عشق کیا کہیے کہ کیا کیا عشق ہے
عشق زور آور سے سب ہیں ہرسناک — کشتے اس کے ہو گئے عالم سے پاک
کیا درندہ کیا چرندہ کیا پرند — دل ہے جن کے عشق ہے اُن کا کمند

ایک جگہ اور پھر عشق کے اسی پہلو کو پیش کیا ہے:

طائر و طاؤس و حیواں اژدھے — سب کھپے، کیا عشق کی کوئی کہے

پال ہارڈے کا بیان ہے کہ تمثیل میں مجازی سطح کے نیچے کوئی
نہ کوئی مقصد ضرور کارفرما رہتا ہے۔ میر نے بھی اپنی اس تمثیلی مثنوی میں
سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ کائنات کی بنیادی قوت عشق
ہے۔ یہ فقط انسانوں کی جاگیر نہیں، پرندے بھی اس کے شراروں سے اپنا
نشیمن پھونک سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو وہ مور کی شورشِ عشق کا ذکر کن
الفاظ میں کرتے ہیں:

دل لگی تو اک خدا کا ہے غضب — اس سے پہنچا ہے بہ لب پر روز و شب
دل گرفتہ، دل شکستہ، دل زدہ — ان نے مارے مرد کیا کارآمدہ
ہے گی یہ دل بستگی خانہ خراب — دربدر پھرنے کا کردیوے ہے باب
کیا اڑا ہے تجھے اے مشتِ پر — خاک سے لے کر گیا افلاک پر
واں سے ٹپکے دیکھئے کیوں کر تجھے — ساتھ آوارہ کرے کیدھر مجھے

راجا کے حسد اور بدگمانی کو بھی میر نے پوری کامیابی سے اجاگر
کیا ہے۔ کسی انسان کا پرندے کو اپنے پاس رکھنا اسے چاہنا ایسا جرم
نہیں کہ گردن زنی کی نوبت آئے۔ لیکن غیرتِ عشق کے بھی کچھ تقاضے
ہیں۔ رشک و رقابت اور عشق میں چولی دامن کا ساتھ ہے عشق دوسرے
کی شرکت کہاں گوارا کرتا ہے، خواہ وہ چرند و پرند ہی کیوں نہ ہوں۔
ملاحظہ ہو بدگمانی کے زور سے راجا کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور
معقول بات بھی اسے نامعقول معلوم ہوتی ہے:

کان راجا کے بھرے دشمن ہوا — بدگمان و بدبر و بدظن ہوا
کار ظنِ بد کھنچا اک طول کو — سمجھا نامعقول وہ معقول کو
آنا جانا گھر میں اب کا ہو چکا — پاس ربط و رابطہ سب ہو چکا
گھر میں لاتے ہیں کبھو تو گھیر کر — بات کہتا ہے تو منھ کو پھیر کر
راہ میں ہے یا کبھو پھر جائے ہے — پھر گیا تو دیر میں پھر آئے ہے

دشمنی کی بات ہی کچھ اور ہے — بے ترحم ہے نہ مطلق غور ہے
جانور کا اُنس کچھ ثابت نہیں — اُنس انساں کی سی یہ تہمت نہیں

اب رانی کا کردار ملاحظہ کیجئے۔ میر نے اسے بھی پوری چابکدستی
سے پیش کیا ہے۔ رانی کی خوبی اور خوبصورتی کا ایک عالم میں شور تھا۔
میر اگر کسی انسان کو رانی پر دیوانہ وار قربان ہوتے ہوئے دکھاتے تو
کوئی غیر معمولی بات نہ بنتی۔ کیونکہ انسان کا انسان پر فریفتہ ہونا کونسی
نئی اور چونکا دینے والی بات ہے۔ چنانچہ میر نے ایک پرندے کو رانی
پر والہ و شیدا ہوتے دکھا کر حسنِ انسانی کی غیر معمولی کشش کی طرف
اشارہ کیا ہے۔ وہ چونکہ قصے کا مقامی رنگ برقرار رکھنا چاہتے تھے،
انہوں نے پرندوں میں سے بھی مور کا انتخاب کیا تاکہ اس کے بال و پر
کی رنگینی و دلآویزی قصے کی رومانیت کا ساتھ دے سکے۔ حسن یوں تو
بے مہر اور سنگ دل ہوتا ہے لیکن اگر عشق صادق ہو تو اثر کئے بغیر
نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو مور کے اضطراب سے رانی کا دل کیسے پسیجتا ہے

اضطرابِ عشق نے تاثیر کی — دل دہی کرنے اٹھی دلگیر کی
پیار سے کہنے لگی مت ہو اُداس — پاس رہ میرے کروں گی میں بھی پاس
تو ہے وحشی اس قدر مانوس ہے — اُنس انساں کو نہ ہو افسوس ہے
پاس رہنے سے ترے ہے دل خوشی — ہے بلا اس بال و پر میں دلکشی

میر رانی کو عشق میں ثابت قدم جتانا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی

روایت کے مطابق یہ بھی ممکن تھا کہ رانی کو ستی ہوتے ہوئے دکھایا جائے۔ میر کو اس مرحلے کا شروع ہی سے احساس تھا۔ چنانچہ وہ مثنوی کے ابتدائی حصے میں اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

عاشق و معشوق رفتہ عشق کے　　یعنی دونوں سینہ تفتہ عشق کے
بھڑکے آتش عشق کی دونوں چلے　　ڈوبے دریا میں ہوں گو پانی تلے
یا جلا یا ایک ہندوستاں کے طور　　جا جلے ہے زن بھی اس بے جاں کے طور
جل چکے کو ہندی کہتے ہیں ستی　　ست بمعنی استقامت واقعی
آگ میں جا بیٹھے زن کا ظرف کیا　　عشق ہی کا جاذبہ دے ہے جلا

عورت کا خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہو جانا محبت کی انتہا ہے لیکن کسی عورت کا پرندے کے غم میں ستی ہونا انتہائی وابستگی اور وفاشعاری کی غیر معمولی مثال ہے۔ میر رانی کے مور پر قربان ہو جانے کی فضا تو پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ آخر میں اسے خاک سیاہ ہوتے دکھا کر کردار نگاری کے فرائض سے بطریقِ احسن سبک دوش ہو گئے:

یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر　　آتش غم سے جلا اس کا جگر
کھینچ آہِ سرد یہ کہنے لگی　　عشق کی بھی آگ کیا بہنے لگی
بن جلا کر بستیوں میں آ لگی　　پھیل کر یاں، دل جگر کو جا لگی
جمع کر خاشاک و خار و خس، شتاب　　جل گئی وے آگ، وہ بھی بس شتاب
کیا لگی دل کو کہ رانی جل گئی　　خاک ہو کر خاک ہی میں رل گئی

غرض قصے میں تمثیلی رنگ کو نبھانے اور عشق کو فتح مند ثابت کرنے میں میر کامیاب رہے ہیں۔

تمثیل نگاری کے جدید نظریہ کی رو سے اس قصے میں ایک کمزوری بھی ہے۔ تمثیل کی جدید تعریف کے مطابق اس میں اندرونی معنویت کے باوصف مجازی مطلب بھی منظم و مربوط ہونا چاہیئے۔ "مور نامہ" کا قصہ اس شرط پر پورا نہیں اترتا۔ ایک انسان سے مور کا عشق غیر عقلی بات ہے۔ لیکن یہ خامی مشرقی ادب کی ان تمام تمثیلوں میں ملتی ہے جن میں بعض کردار انسان ہیں اور بعض حیوان۔ مثلاً "شک شپ تتی" میں توتا ہی داستانوں کے پیرائے میں عقل کے رموز و نکات بیان کرتا ہے۔ "پدماوت" میں بھی فقط توتا غیر انسانی کردار ہے جو عقلِ سلیم کی تشکیل ہے اور راجا رتن سین (نفس) کو پدمنی یعنی عرفانِ حق کی طرف راغب کرتا ہے۔ اسی طرح "مور نامہ" میں مور، حیات و کائنات کے بنیادی جذبۂ عشق کی تجسیم ہے، جس کی تائید قصے کے واقعات اور انجام سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

مثنوی کا قصہ مختصر اور دلچسپ ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے تو شاید ہی میر کی کوئی دوسری مثنوی اس کو پہنچتی ہو۔ لیکن میر کا "شعر شور انگیز" والا انداز اس مثنوی میں نہیں ملتا۔ حالانکہ کہانی کا المیہ انجام میر کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہے اور اس میں درد انگیز اور پُرتاثیر اشعار نکلنے کے بڑے مواقع تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مثنوی کے اکثر بیانات طویل ہو گئے ہیں اور میر کا لب و لہجہ بجھا بجھا اور افسردہ معلوم ہوتا ہے جسے دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ بڑھاپے اور علالت کے باعث یا کسی دوسری وجہ سے میر اس مثنوی میں اپنی طبیعت کا پورا زور صرف کرنے اور نطق کا اعجاز دکھانے سے قاصر رہے ہیں۔

مضمون کے آخر میں جو کچھ کہا گیا ہے، خصوصاً "مور نامہ" کے بارے میں، اسے دیکھتے ہوئے قدرتی طور پر خیال پیدا ہوتا ہے کہ میر کے کلام کی مجموعی کیفیت کیا ہے۔ اور قارئین کے ذہن میں اس کا جو تصور بالعموم پایا جاتا ہے، وہ اصلیت سے کس قدر مطابقت رکھتا ہے۔

میر کی شخصیت، اس کی شاعری کی لَو جو پہلے ہی کافی تیز تھی۔ اب کچھ عرصہ سے اور بھی تیز ہو گئی ہے، اس کی زار نالی نے ایک دور کے دور کو مسحور کر دیا ہے:

خدا جانے کہا کیا میر نے دل میرا بھر آیا

اس کے بعد وارفتگیٔ شوق کا یہی تقاضا ہے کہ ہر لَے پہلے سے بلند تر ہو۔ اس میں اندیشہ صرف اتنا ہے کہ لَے بلند ہوتے ہوتے کہیں ضرورت سے زیادہ بلند نہ ہو جائے۔ اور دل اس سے زیادہ نہ بھر آئیں جتنا کہ شاعر کا فن اور اس کی صلاحیتیں اجازت دیتی ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لَے کی تیزی و شدت میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میر کے کلام پر بیش از بیش توجہ، اس کا مطالعہ، اس کی نمود، محاسن کی توضیح و تشریح، کلیات کے ایڈیشنوں کی اشاعت میں اہتمام بلیغ، پے در پے انتخابات، تازہ بہ تازہ نو بہ نو نقد و نظر اور نکتہ آفرینی یہ سب باتیں یا تو انتہائے شوق کی علامت ہیں یا کورانہ عقیدت کی آئینہ دار۔

جہاں تک تصویر کے روشن پہلو کا تعلق ہے یہ فی نفسہٖ اتنا روشن نہیں جتنا اسے ظاہر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس حد تک سب کو اتفاق ہے کہ میرؔ کا کلام یکساں نہیں اور یہ کہ بلندش نہایت بلند و پستش بغایت پست۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کلام کس قدر غیر یکساں ہے۔ اس میں آمد و آورد کا تناسب کیا ہے۔ آورد یعنی ناقص، پست، پر تصنع اشعار کی مقدار کتنی ہے اور میرؔ کے کلام نیز ذوق، لب و لہجہ، فکر و فن، اثر، وقار وغیرہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اور ہم اس کے دل و دماغ کے بارے میں مجموعی طور پر کیا تاثر لے کر اٹھتے ہیں۔ جس پیمانے سے ہم اسے جانچتے ہیں وہ بھی یکساں ہونا چاہیئے۔ یا ہم تمام شعرا کے صرف چیدہ اشعار کو شمع راہ بنائیں یا سارے کلام اور سالم غزلوں اور نظموں کو پیش نظر رکھیں۔ ہم میرؔ کا اندازہ صرف اس کے منتخب اشعار کی بنا پر کرتے رہے ہیں لیکن ناسخؔ و آتشؔ کے سلسلہ میں ایسا نہیں کرتے جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مولوی عبدالحق اور محمد حسن عسکری نے میرؔ کے کلام کے جو انتخابات کئے ہیں ان میں چند ہی غزلیں اور اشعار منتخب کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور معیار فن کی رو سے ان کا درجہ بھی زیادہ بلند نہیں۔ مکمل غزلوں سے نہ تو میرؔ کا دوسروں سے اعلیٰ تر فنی شعور اور گہرا تاثر ظاہر ہوتا ہے اور نہ اس کے کلام میں تکلفات کی کم بھرمار نظر آتی ہے۔ مثلاً:

تیر اس کی کمان سے نکلا جگرِ مرغ جان سے نکلا

نہ پایا دل ہوا روز سیہ سے جس کا جا لٹ پٹ
کسو کی زلف ڈھونڈی مو بہ مو کا کل کو سب لٹ لٹ

وغیرہ وغیرہ۔

کیا یہ میرؔ ہے — دردمندی اور زار نالی کا بادشاہ یا ناسخؔ لکھنؤ کی پر تکلف شاعری کا امام؟ اس کی بہترین غزلوں و۔ "الٹی ہو گئیں ....."، "جس سر کو غرور"..... اور "پتہ پتہ بوٹا بوٹا"۔ پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو ان میں وہ افسانوی میرؔ بالکل ناپید ہو جاتا ہے جسے ہم خدائے سخن قرار دیتے ہیں۔ میرؔ کے سلسلہ میں "نہایت بلند" پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ہم عقیدت کی رو میں بہت دور نکل گئے تو اس میں ادبی و تنقیدی قدروں کے درہم برہم ہو جانے کا شدید اندیشہ ہے۔ جو ناقدانہ شعور کی نشو و نما میں سدِ گراں ثابت ہوگا۔ میرؔ کے "تتبع" میں بھی کچھ کم اندیشے پنہاں نہیں۔ (مدیر)

غزل

شاہد عشقی

نقدِ دل و جاں چاہیے اس کی خاطر رہن جام کرو
میرؔ کے بادۂ کم خوردہ کو میخواروں میں عام کرو

قشقہ کھینچو، دیر میں بیٹھو، پیروی اصنام کرو
کیشِ برہمن کو اپناؤ، جرم وفا کو عام کرو

خواہ کوئی بہتان تراشو، یا عائد الزام کرو
ترکِ تعلق سے پہلے کچھ اور ہمیں بدنام کرو

سازِ شکستِ دل کی قیمت کون چکانے آئیگا
گیتوں کی دکّان بڑھاؤ، نغموں کو نیلام کرو

ایک خیالِ خام ہے مانا اس کی تمنا، اس کا شوق
عمرِ خضر میسر ہو تو صرفِ خیالِ خام کرو

نگری نگری پھرے مسافر بستی بستی چھانی خاک
ٹک اس زلف کے سائے میں بھی کوئی گھڑی آرام کرو

جن کے دم سے غربت میں بھی بزم تمنا روشن ہے
پیار اُن شہر کی ماہوشوں کو عشقیؔ نام بنام کرو

ماہِ نو، کراچی، مئی ۱۹۶۰ء

حمد

قیوم نظر

گھنٹیاں دور کہیں مندروں میں بجتی ہیں
جس طرح تتلیاں اُڑتی ہوں، چلی آتی ہیں
اَن گنت غنچوں کے کھلنے کی حسیں آوازیں
موسمِ گل کے چھناکے میں کوئی روک نہیں سکتا ہے
میرے گیتوں کو اگر بیڑیاں بھی پہنا دیں

میرے گیتوں کو نکل جانا ہے شہروں شہروں
شہر سے دور کبھی کہساروں میں گلزاروں میں
رقص کرتی ہے جہاں ہنستی ہوئی دوشیزہ
جس کا خوشبو میں بسا لہریں بناتا ہوا جسم
سرمدی نغمے کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے

میرے گیتوں کو جو مل جائے وہ دوشیزہ ہوا
جس نے جادو یہ جگایا ہے، تو تھم جانا ہے
اپنی ہستی کو مٹاتے ہوئے باصد آداب
اُس کی چوکھٹ سے لپٹ جانا ہے جس کی ضو سے
گھنٹیاں دور کہیں مندروں میں بجتی ہیں

سیالوں کی بستی

شیر افضل جعفری

یہ چونچال چونچال خوش حال گھوڑے
یہ پھرتیلے پھرتیلے بیلوں کے جوڑے
یہ شرمیلی شرمیلی دودھیل گائیں
کہ جو نور کی پاک نہریں بہائیں
یہ تالاب، یہ سرمئی رنگ منجھیں[۱]
جٹورے جنھیں اپنی لیلائیں سمجھیں
یہ راہٹ کا سرگم، یہ سورٹھ کی تانیں
کہ جن پر فدا ہوں گوتیوں کی جانیں
یہ مرغابیوں کی جواں تاب ڈاریں
یہ جھیلوں کی پریاں، یہ دریا کی ناریں
یہ سرسبز وادی یہ سرمست بیلے
کہ جن میں جوانی بہاروں سے کھیلے
یہ کھیتوں پہ سرشار جوبن کا عالم
یہ سرسوں پہ مٹیار جوگن کا عالم
یہ ہالی، یہ چرواہے، یہ جھنگ والے
یہ البیلے گبھرو، یہ مکھن کے پالے
یہ میدان میں شاہزوروں کے لوٹے
کہ جن کی رگوں میں چنہاں چڑھ کے بولے
یہ گاؤں، یہ بانکے سیالوں کی بستی
یہاں کنگ دیتی ہے کوثر کی مستی

---

[۱] بھینسیں

خنک شعلے

عبدالعزیز خالد

زندگی، دنیا، طلسم روز و شب
آخری زینوں پہ جن کے جاں بلب
چڑھ رہا ہوں قصہ خوانِ صبح و شام
السلام، اے مرکز جذبِ تمنا السلام
آنکھ حیراں ہے کہ خیمہ نصب تھا پہلے کہاں
ایک سناٹا ہے موسیقی کا مسکن ہے جہاں
راہرو آواز دیتا ہے کہاں ہے کارواں
آگ سی بھڑکا رہی ہے دل میں یادِ رفتگاں

آئے گا پھر نوجوانی کا وہ دورِ شادماں؟
کب یہ آئے گا، نہ آئے گا کہیں!
ان سمن زاروں میں افسونِ بہاراں اب بھی ہے
پھولوں کی بُو باس میں ہے خلدِ رنگینی نہاں
وہ خزاں آئی فسردہ سایوں کو تھامے ہوئے
ہوں مگر گرم سفر ظلمات کی آغوش میں
بجھ گئے ہیں سب چراغِ رہگذر میرے لئے
جو کبھی روشن نہیں ہوں گے نہیں!
(ماخوذ)

روٹھا پیا مناؤں گی

(اپنی طبعزاد ملتانی نظم سے)

ظہور نظر

چنن پیر کے میلے پر میں جاؤں گی
روٹھا پیا مناؤں گی
منت مان کے، ہاتھ باندھ کے، رو کے عرض سناؤں گی
جو مانگوں گی، پاؤں گی
جانے سے پہلے، سکھیوں من بسیوں کو بلواؤں گی
ساری رات جگاؤں گی
جھومر ڈالوں گی، دوہے گاؤں گی، رنگ جماؤں گی
ہار سنگار کراؤں گی
ساتھ چھاچھ کے بال دھوؤں گی، خس کا تیل لگاؤں گی
خوشبو میں بس جاؤں گی
اک اک زلف کو سوبل دوں گی، الجھا کے سلجھاؤں گی
ایسی مانگ بناؤں گی
بولا[1] بینسر، نتھ پہنوں گی، مہندی لال لگاؤں گی
سارے شوق مٹاؤں گی
پل پل بعد مساگ[1] ملوں گی، گھڑی گھڑی کجل لگاؤں گی
پھولی نہیں سماؤں گی
ڈالوں گی جو پی کے گلے میں دو باہیں لہراؤں گی
چوڑے سے بھرواؤں گی
مست حسیں، بے داغ، جیالا اونٹ تلاش کراؤں گی
اجرک[2] اسے اڑھاؤں گی
یوں پتوں جیسے پریتم کے درشن کرنے جاؤں گی
روہی[3] سیج بناؤں گی
نام نظر ہے جس شاعر کا ساتھ اسے لے جاؤں گی
اور دوہے سنواؤں گی
چنن پیر کے میلے پر میں جاؤں گی
روٹھا پیا مناؤں گی
منت مان کے، ہاتھ باندھ کے، رو کے عرض سناؤں گی
جو مانگوں گی، پاؤں گی

---

[1] دنداسہ۔ [2] عنابی رنگ کی پھولدار چادر [3] صحرا [4] پتّوں کا شہر

شان الحق حقی

اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین زبان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔۔ وزارت تعلیم کے زیر نگرانی ترقی اردو بورڈ ایک جامع لغت تالیف کر رہا ہے جو بڑی آکسفورڈ ڈکشنری کے نمونے پر ہوگی۔ یہاں حقی صاحب نے اپنے طور پر حرف ا کی تشریح نمونتاً پیش کی ہے۔ (مدیر)

ا ، (تلفظ اَلِف : فتح اول، کسرِ ل، سکونِ ف) مذکر۔

۱- اُر دُو، نیز جملہ عربی الاصل حروفِ تہجی کا پہلا حرف، اُصولِ کتابت میں تین قط کی کھڑی لکیر، نسخ میں ا یا ا ۔ نستعلیق میں اور دیگر تحریروں میں اِن شکلوں سے مماثل، طغریٰ میں کبھی مدوّر یا منحنی، اکثر ایک کھڑی لکیر سے شناخت ہوتا ہے؛ پہلے ہندسے " ۱ " کا مشابہ۔

ترتیب ابجد کا پہلا حرف؛ جمل میں عددِ واحد (۱)،

م- عدد جوڑنے کے دیکھیے ایک " ا " کی کمی ہے۔

مفرد کلمے کے شروع میں ہمیشہ متحرک اور صوتیات کی رو سے حرفِ صحیح یا صامت، آخر میں ہمیشہ اور درمیانِ کلمہ اکثر ساکن اور حرفِ علت یا صائتہ۔ استثنائی صورتیں: مآل، مآثر، لاأبالی، وغیرہ (عربی)، نیز فارسی و اردو مرکب الفاظ جیسے بےارادہ، دوآتشہ،

م فاتما مرے تئیں نہ تھا کچھ خیال
کہ آخر کو ہوئیگا مرے جی کا کال (سراج کلیات ص۲)

عربی میں الف فتح کے کھینچنے (اِشباع) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بالذات ساکن ہے۔ متحرک الف کو ہمزہ کہتے ہیں۔ اس پر جزم اور تشدید نہیں آتی۔

اردو املا میں اِعراب (= زیر، زبر، پیش) و دیگر حروفِ علت (و، ی) کے ساتھ مل کر درج ذیل دس مختلف علّتوں کے لیے مستعمل ہے:

اَ (مفتوح یا مع زبر م اَب)

اِ (مکسور، یا مع زیر م اِس)

اُ (مضموم یا مع پیش م اُن)

آ، ا (ممدودہ یا مع مد، برابر ہے دو الفوں کے، جیسے کبھی ا ا بھی لکھتے ہیں۔ م اامین = آمین؛ نیز آخر کلمہ حرف ماقبل سے مل کر یہی فائدہ رکھتا ہے م اچھا، بُرا)۔

اُو (مضموم مع واو مجہول م اوچھا)

اُو (مضموم مع واو معروف م اونچا)

اِی (مکسور مع یائے معروف م اِیکھ)

اے (مکسور مع یائے مجہول م ایک)

اَو (مفتوح مع واو ساکن م اَور)

اَے (مفتوح مع یائے ساکن م اَیسا)

(کبھی تنوین کے ساتھ حرفِ صحیح "ن" کی آواز شامل رکھتا ہے، (عربی کلمات کے ساتھ مخصوص) م: فوراً، حکماً، قطعاً، (مع دو زبر یا فتحتین)؛ نسلاً بعد نسلٍ (مع دو زیر یا کسرتین) کبھی اردو کے موضوعہ کلمات میں: م: اندازاً (شاذ، غلط العام)؛ ضمتین کے ساتھ بشکلِ ہمزہ م: لِکُلِّ داءٍ دواءٌ (اردو میں شاذ)۔

صوتیات کے لحاظ سے، جدید اردو تلفظ میں بعض حروف صحیحہ یعنی ح، ع، ل، ہ کے شروع میں آکر تین مزید علل پیدا کرتا ہے م (۱) اِحاطہ، اِحسان، اِحتیاط، اِعلان، اِعتنا، اِعتذار، لااِلٰہ، اِلی الآن، اِہانت (مکسور، مخفف، راجع بہ یائے مجہول) (۲) اُحد (مضموم مخفف راجع بہ واو مجہول)؛ اَہل، اَحسن، احقر، (مفتوح، راجع بہ یائے ساکن)۔ یہ املا کی مسلمہ و مذکورۂ بالا دس علّتوں سے زائد، مگر عام تلفظ میں موجود ہیں۔

بعض عربی الفاظ کی املا میں ساکت م: بالکل، بالفعل، بسم اللہ؛ رسم الخط، فوق البشر، علی العموم، علی الحساب کبھی ساقط مگر مفروض اور تلفظ میں موجود م زکوٰۃ، ھٰذا، طغریٰ (تلفظ زکات

ھاذا، طغرا) کبھی بعض حروف کے اوپر بشکل قصیر (عام خط سے چھوٹا، یا "نصفِ الف") اور الفِ مفتوحہ کا ہم آواز ہ: اعلیٰ، ادنیٰ، لیلیٰ، عیسیٰ، الٰہی، کبھی تشدید کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے اور حرف مشدّد کے ساتھ مفتوح۔ ہ: اللّٰہ، حتّٰی، متقّٰی، کہیں یائے تحتانی یا ہائے ہوّز کے نیچے نصف الف کی صورت میں تحریر ا ور یائے معروف کا ہم آواز ہ: اعلیٰ، علّیّین، ہٰذا نہ، اِلا آخرہ۔ کہیں زبر کی آواز کھنچ جانے (یعنی اِشباع) سے پیدا ہوگیا ہے ہ: پیرہن سے پیراہن، دامن سے دامان (فارسی) ابدالآباد سے ابد الآباد، ابجر سے ابجار (ع ابجر)، اچار سے آچار (اردو)۔ کبھی بعض الفاظ سے برائے اختصار یا بضرورتِ شعری ساقط ہ: اگر سے گر، امیر سے میر؛ کہیں مرورِ زمانہ سے معدوم ہوگیا ہے ہ: اکال سے کال (اردو)، اسوار سے سوار (فارسی)؛ خوانچہ سے خونچہ، پارچہ سے پرچہ (اردو)؛ کہیں وارد ہوگیا۔ ہ: جنّہ سے اَجنّہ (ع جنّہ)۔

انگریزی سے آئے ہوئے الفاظ کے شروع میں بھی رومن حرف (S = ایس) سے پہلے، مخارج و عادات لسانی کے اختلاف کی بنا پر وارد ہوگیا ہے، (عموماً بالکسر) ہ: اِسکول، اِشٹیشن، اِسٹیٹ (کیونکہ انگریزی وغیرہ کے بخلاف اردو میں کوئی کلمہ حرفِ ساکن سے شروع نہیں ہوتا)۔

اردو کے بہت سے الفاظ کے تلفظ اور املا دونوں میں آخر کلمہ ہ سے بدل گیا ہے ہ: پتہ، روپیہ، پتّہ، ہلّہ، مہینہ، مغلپورہ، لالہ جی؛ عوام کے تلفظ میں دو الفاظ کے درمیان کبھی اس کے ساتھ "ی" کی آواز شامل ہو جاتی ہے، مگر غیر فصیح ہ: بھول یائے، دیکھیاؤ۔ (بھول آئے، دیکھ آؤ)۔ از روئے تاریخ لسان، اس حرف کا بدل ہ، و، ی سے ہوتا رہا ہے۔

عربی میں ہمزہ سے موسوم (بعض الفاظ کے درمیان یا آخر حرف ء کی شکل میں تحریر۔ حروفِ علّت (ا، و، ی) نیز حروف "اتین" (= ا ت ی ن) میں شامل ہونے کے سبب عربی الاصل کلمات میں بکثرت موجود ہے۔ سہ حرفی مادوں میں گوناگوں تصرفات اور اشتقاق پیدا کرتا اور مختلف کلمات میں مختلف فائدے و معنی رکھتا ہے۔ اردو املا کا کثیر الاستعمال حرف اور بیک وقت حرفِ علّت و صحیح ہونے کے سبب اردو الفاظ میں مختلف مقامات پر اس کی معنوی حیثیت،

صرف و فوائد کا تمام و کمال احاطہ کرنا قریب المحال ہے منجملہ ان:

کلمے کے شروع میں

(۱) حرفِ مفتوح (اَ):

ہندی الفاظ میں، بطور سابقہ آکر، نفی کے معنی پیدا کرتا ہے ہ: اَمر، اَچھوت، اَٹل، اَلگ، اَکارت، اَمولا۔ اس لحاظ سے نا (از فارسی)، مالا، غیر، عدم (از عربی)، بلا، بے، بن، ان، نہ (ہندی) کا مقابل و مرادف ہے۔

عربی الفاظ میں علامت استفہام ہ: اَلستُ بربّکمُ (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) عربی کے کلمۂ تخصیصی (ال) کا حرف اوّل اور اکثر اسما میں ل کے ماقبل شامل ہ: القرآن، الناظر، الداعی، الجامعہ، اَلسّلامُ علیکم (حروفِ شمسی سے پہلے ل ساقط اور صرف ا کی آواز شامل ہوتی ہے)۔

از علامات جمع ہ: انجم، اَنفُس (بروزن اَفعُل)؛ اَنصار، اَحباب، اَغیار، اَسباب (بروزن اَفعال)؛ اَمثِلہ، اَجِنّہ، اَطِبّہ (افعِلہ)؛ از علاماتِ تفضیل ہ: اَکبر، اَکثر، اَنسب، اَفضل، اَشرف، اَکمل، اَتم: اَشدّ، اَہم۔ (اَفعل)؛ کلمۂ ندا "اے" کا اختصار ہ: اَماں، اَجی، اَرے، اَبے۔ (اے میاں، اے جی، اے رے، اے بے)

(۲) حرفِ مکسور (اِ):

بعض عربی اسما و افعال کی پہچان جو عربی صرف کے ابواب ثلاثی مزید فیہ و رباعی مزید فیہ (شاذ) سے تعلق رکھتے ہیں ہ: اِنکار، اِقرار، اِظہار، اِنصاف، نیز اِقامت، اِجازت، اِصابت، وغیرہ (از اِفعال)؛ اِہتمام، اِقتدار، اِفتراق، اِحتمال وغیرہ (از اِفتعال؛ اس وزن کے افعال عموماً متعدی ہوں گے)؛ اِنسداد، اِنحصار، اِنقلاب (از اِنفعال، اس وزن کے افعال اردو میں لازم اور متعدّی دونوں طرح مستعمل ہیں)؛ اِستیصال، اِستعمال وغیرہ، نیز اِستعانت، اِستفادہ، اِستعارہ وغیرہ (از اِستفعال)۔ بعض کلمات میں حاضر یا قریب کی علامت، (خصوصاً غائب یا بعید کے بالمقابل) ہ: اِن (اُن) اِس (اُس) اِتنا (اُتنا)۔ اِین (آں)، اِدھر (اُدھر) اِللّی لذی نہ اُللّی لذی؛ کبھی (ک کے ماقبل) علامتِ لعد ہ: اِکا، اِکائی، اِکہرا۔

وسطِ کلمہ میں:

حرفِ اتصال:

جبکہ کلمے کی تکرار ہو: سراسر، لبالب، رنگا رنگ (از فارسی) دیکھا دیکھی، مارا مار، چلا چل، دنادن، زور آزوری، مواموا، جھپا جھپ (اردو) بیان، بہتات، تنوع، تکمیل (انحصار و استیعاب) تسلسل و تواتر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، یا کبھی نقلِ صوت مر: جھنجھنا، نناژن، دنادن؛ کبھی بلا تکرار کلمہ مر: لگاتار، موسلا دھار، آنا ٹوٹ، دھینگا مشتی، لپاڈگی، اینچا تانی، اظہارِ شدّت، تواتر یا تقابل کے لئے؛ کبھی محض ترکیبِ لفظی کے لئے: جوانا مرگ، سوتیا داہ، موتیا بند۔

فعل متعدی کی لازمی علامت کبھی مصدر میں داخل ہوکر لازم کو متعدی کرتا ہے مر: چلنا سے چلانا، اُٹھنا سے اُٹھانا۔ نیز اُن تمام مصادر میں موجود جو بذاتہٖ متعدی ہیں۔ مر: دارنا، دھانا، تاڑنا، پکارنا۔

علامتِ فاعل، عربی الفاظ میں جو فاعل کے ہم وزن ہوں۔ مر: عاقل، عادی، خالق، صاحب، قائل، راوی، ماہر وغیرہ۔

آخرِ کلمہ:

علامتِ ندا مر: ناصحا، خداوندا!

مر: ظفر کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخش گنہگارا الٰہا (ظفر)

کبھی حسرت و تاسف کے لئے مر: واویلا، واحسرتا!

کبھی علامتِ فاعل بقاعدۂ فارسی مر: رسا، دانا، بینا، شنوا؛ نیز ہندی کھوتیا، دُھنیا، اَگوا۔

کبھی علامتِ تکبیر (بڑائی کے اظہار میں) مر: ٹھینا، ڈولا، اَدھنا، اَماٹا لا۔

مر: یہ کلغی لگائی ہے کہ کلغا، مکھی کیا کھی مکھا تھا۔

کبھی علامتِ تذکیر، نیز واحد مذکر کی عام علامت مر: بیٹا۔ بھینسا (اسما میں)؛ چھوٹا، بڑا، کالا، گورا (صفتِ مشبّہ میں)؛ اچھا، خاصا، اینڈا بینڈا، من بھاؤنا۔ (کلمۂ توصیفی میں)؛ چھپکا، چھالا، پیسا، جھگڑا (تذکیر سماعی میں) آیا، گیا، سویا، جاگا۔ (افعال معروف میں)؛ دیکھا بھالا، سمجھا بوجھا (افعال مجہول میں) اِن معنوں میں ی کا نقیض جو تانیث خصوصاً واحد مؤنث کی علامت ہے۔

کبھی علامتِ تانیث (بقاعدۂ سنسکرت) مر: ابلا، رادھا، جمنا، چمپا، سیتلا، بیسوا (ومن علاماتِ تانیث عربی) مر: لیلیٰ، علیا، نیز کلمۂ توصیفی مع مبالغہ مر: صغریٰ، سودا۔

کبھی تحقیر و طنز کے لئے مر: صفایا، بکھاڑا، کباڑا، دھنا، سسرا، میا، بھینا، گھرا (لمبی چوڑی تحریر) دھرنا (اسماء)؛ اچکا، چوٹا، اٹھائی گیرا، امکا ڈھمکا (وصف)۔

کبھی علامتِ تصغیر مر: بچیا، ٹکڑا، پھندنا، بالکا، بالما۔

کبھی اظہارِ کثرت کے لئے مر: بسا، خوشا، اصلا (فارسی)

کبھی علامتِ حاصل مصدر۔ جھگڑا، لپکا، کھٹکا، گھسا۔

بعض اعدادِ ترتیبی میں (آل کا متبادل) پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، چھٹا۔

مخفف اللّٰہ کا (خصوصاً سرناموں، نقشوں، تعویذوں وغیرہ پر تحریر)

وہ لکیر جو صیقل گر آئینے پر نقش کرتے تھے؛ (مجازاً) کوئی کھڑی یا سیدھی لکیر

مر: کبھی اٹھائی اور پیٹھ پر دو چار "ا" بنا دئے۔ (نیز دیکھئے الف، ہمزہ، علت، حروفِ تہجی۔)

(ع ۱:، از فنیقی "الف" از قدیم مصری "آوا" = بیل (نیز = پیشوا)۔ خطِ مصری میں اصل شکل ✕ بیل کی شبیہہ سے ماخوذ فنیقی میں ✕ یا ✕ رومن حروف A نیز سنسکرت अ و عبرانی ✕ کا ہم اصل ہے۔ عربی رسم الخط پہلے پہل عربوں کی آمد (۷۱۰ع) کے ساتھ سندھ میں پہنچا۔ قدیم ترین دستیاب کتبہ مورخہ ۱۳۹ھ مارچ ۱۹۶۰ء میں بھنبھور سے برآمد ہوا۔ فی الوقت یہ رسم الخط اردو، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری، بلوچی کے لئے بعض تصرفات کے ساتھ، مگر حرف ا بلا تصرف مستعمل ہے۔

مخففات مر: مثال: ع = عربی؛ ✕ = رک (رجوع کرو)۔

اردو اور بنگالی کا مشترکہ ماخذ

ڈاکٹر محمد شہید اللہ

لسانیات کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بنگالی اور اردو دونوں ہی آریائی زبانوں یعنی ہندیورپی یا ہند ایرانی خاندان السنہ کی شاخیں ہیں۔ فارسی بھی آریائی شاخ کی ایک کونپل ہے۔ اگر ان تمام شاخوں کی اصل تک پہنچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں دراصل ایک ہی بولی ہیں۔ مثلاً لفظ ما (بنگالی)، ماں (اردو) پا (بنگالی)، پاؤں (اردو) ہات (بنگالی) ہاتھ (اردو) سات، اور ان کے فارسی مرادفات مادر، پا، دست اور ہفت۔

ان الفاظ میں پا کے علاوہ بظاہر کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ لیکن اگر ہم اس قدیم آریائی زبان کی طرف رجوع کریں جس کا خاکہ اوستائی، قدیم ایرانی اور سنسکرت کے تقابلی مطالعہ سے تیار کیا گیا ہے، تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے ماخذ ایک ہی ہیں اور یہ الفاظ رفتہ رفتہ تلفظ میں تبدیلی سے رونما ہوئے ہیں۔ ذیل میں قدیم آریائی کے ساتھ ساتھ اوستائی، قدیم ایرانی اور سنسکرت کے مترادف الفاظ کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے ان کی ہم وضعی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

قدیم آریائی	اوستا	قدیم ایرانی	سنسکرت
ماتر، ماتا	ماتر، ماتا	ماتر، ماتا	ماتر، ماتا
پدا	پدا	پدا	پدا
زہستا	زستا	دستا	ہستا

ان الفاظ — ماتا، پدا، ہستا، سپتا سے ہیں درمیانی ہند آریائی یعنی پراکرت کے ما۔ پا۔ ہتھا۔ ستا کے ذریعے ان کے مترادف اردو، بنگالی الفاظ حاصل ہوئے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں نے سہولت کے خیال سے سنسکرت الفاظ ہی دئے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ قدیم پراکرت کے الفاظ ہیں۔ سنسکرت بہت سے مواقع پر قدیم پراکرت بولی کی نمائندگی کرتی ہے مگر تمام جگہ یہ کیفیت نہیں بعض موقعوں پر سنسکرت کے قدیم پراکرت سے الفاظ ادھار لئے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بنگالی اور اردو کا سلسلۂ نسب قدیم پراکرت سے ملتا ہے جو درمیانی ہند آریائی زبانوں کے واسطے سے ہم تک پہنچی۔ یہ وہ زبانیں ہیں جنہیں ہم کتابی پراکرتوں، پالی، پراکرت اور اپ بھرنش میں جلوہ گر پاتے ہیں۔

یہ امر کہ بنگالی اور اردو تمام تر سنسکرت سے ماخوذ نہیں ہیں، ان کے لغات کا امعانِ نظر سے مطالعہ کرنے پر بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ الفاظ لیجئے۔

بنگالی: تمی - بڑا - بھلا - باپ - دیکھے

اردو: تم - بڑا - بھلا - باپ - دیکھے

صاف ظاہر ہے کہ یہ لغات سنسکرت کے الفاظ تویام - بڑھت - بھدرا - پتا - ڈرسیاتی سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ محققانہ قیاس کی بنا پر مرتب کی ہوئی قدیم پراکرت کے اِن آریائی الفاظ سے ماخوذ ہیں؛ تسمے - وڈرا - بھدلا - پتا - باپڑا - درکستی - جنہوں نے درمیانی ہند آریائی میں تمہیں - وڈا - بھلا - باپا - دیکھئی کی شکل اختیار کر لی۔

ایک جملہ لیجئے؛

"تمی امر باپ کے ایک ٹا بھلا گھوڑا دیو"

(تم ہمارے باپ کو ایک (پوربی ہندی میں ایک ٹھو) بھلا گھوڑا دو)
صریحاً یہ جملہ سنسکرت کے اس جملے سے ماخوذ نہیں۔
"یُوَام اَسماسم پِتَرِکے اِیکم بَھدرمَ اسوَمُ داتا"
بلکہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ اس قدیم پراکرت سے ماخوذ ہے،
جس کا خاکہ ماہرین نے تیار کیا ہے۔
"تُسّمے اسماکارے باپراکترے ایکم بھدلم گھوٹاکم دیا تھا"
درمیانی ہند آریائی پراکرت میں اسے اس طرح ادا کیا جاتا:
"تُمّہی امہاکارے باپاکائے ایکم بھلم گھوڑم دیہا"
بعد کی درمیانی ہند آریائی بولی (اپ بھرنش) میں یہ جملہ یوں بدل
جاتا ہے:-

"تُمّہی امھارا باپا کا ایکا بھلا گھوڑ آ دیہا"
پرانی بنگالی میں اس کا ترجمہ یوں ہوگا:
"تُمّہی امھارا یاپا کا ایکا بھالا گھوڑا دیہا"

پرانی اردو۔ ہندی اس پرانی بنگالی سے زیادہ مختلف نہیں
ہوسکتی۔ خوش قسمتی سے پرانی بنگالی کے نمونے پرانے بودھی گیتوں
(۱۰۵۰-۱۶۷۵ء) میں مل جاتے ہیں جو ایک قدیم نیپالی مخطوطہ
میں محفوظ ہیں۔ مگر افسوس ہے پرانی اردو۔ ہندی بولی کا ایسا کوئی
پرانا محفوظ مخطوطہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ اس لئے پرانی بنگالی
کے متعلق ہم جس وثوق سے بات کرسکتے ہیں، پرانی اردو ہندی کے
متعلق نہیں کرسکتے۔

اردو اور بنگالی کی صوتیات بہت سی باتوں میں مماثل ہیں۔
مثلاً ان زبانوں میں سنسکرت کے برعکس کوئی بھی لفظ دو کٹھے ثقیل
حروف سے شروع نہیں ہوسکتا۔ یہ خصوصیت ان دونوں نے درمیانی
ہند آریائی سے حاصل کی ہے۔ چنانچہ جہاں قدیم پراکرت (سنسکرت)
میں لفظ تِرِینی نظر آتا ہے وہاں درمیانی ہند آریائی میں تینی ہے اور بنگالی و
اردو میں تین۔ اس طرح قدیم پراکرت (سنسکرت) میں کسورا (کسورا)
ہے تو درمیانی ہند آریائی اور بنگالی و اردو میں کھُر بمعنی استرا ہے۔ بنگالی
اور اردو دونوں اس لحاظ سے آپس میں ملتی جلتی ہیں کہ ان میں ڈھ اور ڈ
شروع الفاظ میں آتے ہیں۔ مثلاً ڈر۔ ڈھال وغیرہ۔ لیکن ڈھ اور ڈ
الفاظ کے اندر آتے ہیں مثلاً بنگالی برا اردو بڑا۔ بنگالی پڑو اردو
پڑھو۔ موجودہ بنگالی میں ڑھ بدل کر ڑ ہوگیا ہے۔ مثلاً درمیانی
بنگالی بوڑھا۔ بڑھے۔ موجودہ بنگالی بوڑا۔ بڑے۔ سنسکرت میں
ڑ اور ڑھ کوئی نہیں۔ بلکہ صرف ڈ اور ڈھ ہیں۔ اس سے ظاہر ہے
کہ جہاں تک صوتیات کا تعلق ہے بنگالی و اردو سنسکرت سے ماخوذ
نہیں ہوسکتیں۔ ویدی، پالی اور کتباتی پراکرتوں میں ڈھ اور ڑ کی
آوازیں موجود ہیں لیکن اردو اور بنگالی کی طرح یہ الفاظ کے شروع
میں نہیں آتیں۔ اگرچہ اردو قدیم پراکرت کے خاندان سے ہے مگر اس کا
تعلق نئی ہند آریائی زبانوں کے مرکزی گروہ سے ہے اور بنگالی کا پوربی
گروہ سے۔ اس لئے ان کے ذخیرۂ الفاظ اور صوریات (MORPHOLOGY)
میں لازماً فرق ہوگا۔ مثلاً بنگالی لفظ چکھو قدیم پراکرت اور سنسکرت میں
چکسو ہے۔ مگر اردو لفظ آنکھ قدیم پراکرت اور سنسکرت اکسی سے ماخوذ
ہے۔ بنگالی ماتھا قدیم پراکرت اور سنسکرت کا مستک ہے۔ اردو
میں اس کی جگہ سر مستعمل ہے جو قدیم پراکرت اور سنسکرت کے شیرہ
سے ماخوذ ہے لیکن اردو میں ماتھا کے معنی پیشانی ہیں۔ بنگالی چل قدیم
پراکرت اور سنسکرت میں چوڈا تھا مگر اردو میں بال ہے جو قدیم
قدیم پراکرت اور سنسکرت میں بالا تھا۔ صوریات میں اس قسم کے فرق نظر

آتے ہیں:

بنگالی گھر جیسے - گھر ٹھیکے - اردو: گھر سے - گھر میں۔

مستعار الفاظ میں بھی اکثر بنگالی اور اردو الفاظ ایک ہی ہیں جیسے (اردو، بنگالی) - بغل - بگل، ہزار، ہجار، مرغی - مرگی بعض مستعار الفاظ، خاص کر مذہبی مصطلحات، اردو اور بنگالی دونوں کے مسلمان بولنے والوں میں مشترک ہیں جیسے خدا - خالہ - نماج (نماز)۔ روجہ (روزہ) بہشتا (بہشت) - دوجخ (دوزخ)۔

بنگالی اور اردو کے مشترکہ الفاظ کی دو شقیں مقرر کی جا سکتی ہیں:

۱۔ دیسی الفاظ جو قدیم پراکرت سے مشتق و ماخوذ ہیں جیسے ما - باپ - تین - دیکھ۔

۲۔ غیر بولیوں سے مستعار الفاظ جیسے جامہ - رومال - جہاج (جہاز) - چاکر وغیرہ۔

شق نمبر ۲ کی ذیل میں ایسے الفاظ بھی لائے جا سکتے ہیں جو مسلمانوں میں عام اور مشترک ہیں جیسے خدا - بہشت - حلال حرام وغیرہ - اگر ان دونوں زبانوں کے مشترک الفاظ کی ایک مکمل فہرست مرتب کی جائے تو یہ اردو اور بنگلہ کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے بڑی مدد ہو سکتی ہے۔

ذیل میں دونوں کے ایسے مشترکہ الفاظ کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو قدیم پراکرت سے ماخوذ دیسی الفاظ کی ذیل میں آتے ہیں - ان کی تین ذیلی قسمیں مقرر کی جا سکتی ہیں۔

(۱) الفاظ جو بعینہٖ ایک ہیں جیسے پانچ۔ گھوڑا - چدر - چاند - تارہ - پھل - آم - کھا۔ چال - جا - دیکھ - مار - مر - کر وغیرہ۔

(۲) وہ الفاظ جن میں کچھ فرق ہے۔ اردو میں اکثر الفاظ کی ابتدائی حالت نظر آتی ہے جیسے:

اردو: بہن - ہاتھ - آٹھ - بارہ - آگ - کتا - گدھا - دو۔ بول - سونگھ - پڑھ۔

بنگالی: بون - ہات - آٹ - بارا - اگن - کُکر - گادھا۔ دوئی - بال - شونک - پڑ۔

(۳) ایسے الفاظ جو ماخذ میں مختلف ہیں - جیسے:

اردو: چیل - چڑیا - چیونٹا۔ لپکا - پھینک - کود - گبر۔

بنگالی: اِندُر - مکھی - پیپرا - راندھ۔ پھیل - لپھ - پڑ۔

نہ صرف صوتیات اور ذخیرۂ الفاظ بلکہ صوریات اور صرف میں بھی اردو اور بنگالی میں بہت کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔

فاعلی اور مفعولی حالتوں میں علامات فاعلی و مفعولی دونوں میں نہیں ہوتیں جیسے گھوڑا چلے - گھوڑا دیکھ - حالتِ ظرفی کے لئے جہاں بنگالی میں کے آتا ہے وہاں اردو میں کو آتا ہے - اور یہ دونوں قدیم پراکرت سے مشتق ہیں - مثلاً:

بنگالی: تمی بودھ کے دیو۔

اردو: تم بدھا کو دو۔

قدیم پراکرت: تسمے بدھا کرتے یا تھا۔

سنسکرت: یُوام بودھایا دتا۔

حالتِ اضافی کی کیفیت یہ ہے:

بنگالی	اردو	پراکرت	سنسکرت
امارا	میرا یعنی ہمارا	اسماکاریا	اسماکم
تمار	تمہارا	تسماکاریا	یوسماکم

اردو اور بنگالی میں گردان میں صیغہ غائب واحد حال میں جو حرفِ علت آ ے لگاتے ہیں مثلاً چلے - جائے، وہ قدیم پراکرت (نیز سنسکرت)

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

پہلا قدم

شہزاد احمد

کہاں چلے ہو، یہی روشنی کا جنگل ہے
سمے کے روپ میں لمحہ نہیں ہے مشعل ہے
ہوا کے پاؤں میں موسیقیوں کی چھاگل ہے
اسی نگر کی فضا خوشبوؤں سے بوجھل ہے
بسا ہوا کئی رنگوں میں ایک ہی پل ہے

یہ مرغزار ہمارے ہی خون کا پھل ہے

نئی امید نگاہوں میں مسکراتی رہے
یہ چاندنی اسی دنیا میں جگمگاتی رہے
ہوائے نغمگی اپنی طرف بلاتی رہے
نئے دیار نئے زندگی دکھاتی رہے
ہر ایک گام پہ منزل قریب آتی رہے

یہی امید مرے راستے کی مشعل ہے

جو کل گزر گیا اس کا ہمیں ملال نہیں
زمین کل کی طرح آج پائمال نہیں
وہ وقت آئے گا پھر اس کا احتمال نہیں
نہیں نہیں ہمیں ایسا کوئی خیال نہیں
یہ ایک عمر ہے شہزاد ایک سال نہیں

مگر یہ لمحۂ آخر نہیں ہے اوّل ہے

غزل

مشفق خواجہ

سمجھ رہا ہوں مقاماتِ عظمتِ آدم
میں آپ اپنا پرستار، آپ اپنا صنم

ترے فراقِ مسلسل نے لاج رکھ لی ہے
وگرنہ کھل گیا ہوتا یہ زندگی کا بھرم

چلو کہ اس سے ستم ہی کی التجا کر لیں
کہ مرگِ عشق ہے دورِ تغافلِ پیہم

درونِ مے کدہ کیا کیا رہے ہیں ہنگامے
جو گزرے ہیں پسِ دیوارِ میکدہ کبھی ہم

یہ ایک لمحہ جو منسوب تیرے ہجر سے ہے
اس ایک لمحے میں صدیاں گزار بیٹھے ہیں ہم

طلوعِ صبح بھی تیری ہی اک جھلک ہوگی
اسی خیال میں ہم نے گزار دی شبِ غم

وہ اک نگہ جو زمانے سے بے خبر کر دے
وہی نگاہ اگر دے گئی زمانے کا غم؟

یہ کم ہے کیا کہ ترا التفات گرمیِٔ بزم
یہ اور بات کہ محرومِ التفات ہیں ہم

حکایتِ غمِ دل مختصر ہی اچھی تھی
وضاحتوں سے تو یہ اور بھی ہوئی مبہم

فن:

صفی الدین احمد ـــ ایک نقاش فطرت

جی۔ ایم بوچر

دو سال ہوئے پانچ نوجوان نقاشوں ــ صفی الدین احمدؔ، مرتضیٰ بشیر، علی امام، احمد پرویزؔ اور انور جلال شمزا نے باہم مل کر لندن میں پاکستانی مصوروں کا ایک حلقہ قائم کیا۔ چنانچہ نومبر ۵۹ء میں ان کی تصاویر کی جو نمائش منعقد ہوئی وہ یورپ میں اپنی قسم کی پہلی نمائش تھی۔

ایک حلقہ کی حیثیت سے ـــ اور جہاں تک کسی گروہ کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اس کے کوئی یکساں رجحانات ہیں ـــ یہ کہنا بجا ہے کہ ان نقاشوں کا مطمح نظر پاکستان کی موجودہ زندگی کا، جیسی کہ وہ حقیقتہً ہے، مربوط مرتب عکس پیش کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہ تو دانستہ روایتی اوضاع و اسالیب کے احیا سے دلچسپی رکھتے ہیں، نہ پرانی یا نئی مغربی تصاویر کے طور و طریق یا مسائل کی نقالی کے قائل ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ چونکہ یہ ایک نوزائیدہ قوم کی حیثیت سے ثقافت کے میدان میں آگے بڑھنے کے لئے ابھی سرحد ہی پر کھڑے ہیں، اس لئے ان کے سامنے کوئی جچی تلی راہیں یا طور طریق نہیں ہیں۔ لہٰذا ان مصوروں کے کام کی طرف اس انداز سے رجوع کرنے سے ان پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ یہ تو ان فن کاروں کی جرأتِ کردار کی دلیل ہے کہ انہوں نے پٹے ہوئے آسان راستے چھوڑ کر ایک نئی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جس میں زیادہ کاوش کی ضرورت ہے۔ آخر یہ بات بھی تو اپنی جگہ ایک مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کہ جب تک فنکار غیر معمولی جد و جہد اور محنت و مشقت سے کام نہ لے اور تکلیف برداشت نہ کرے، اس کی شخصیت نشو و نما نہیں پا سکتی۔

یہ بات لندن میں مقیم پاکستانی نقاشوں میں سے کم از کم ایک ــ صفی الدین احمدؔ کے بارے میں بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ وہ ۳۸ برس ہوئے کلکتہ میں پیدا ہوا۔ اور کسی انسان کے راستے میں جو زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں اور پریشانیاں ہو سکتی ہیں وہ ان سب سے دوچار ہوا ہے۔ مثلاً اپنوں کی بے مہری کے سبب خاندان سے اخراج، ہم فنوں کی طرف سے بے پروائی، غریبی و محتاجی۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ ہولناک حادثے جن سے لوگ آزادی کے پُر آشوب زمانے میں دوچار ہوئے۔ اسکی زندگی کے موٹے موٹے واقعات یہ ہیں: ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ سکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس، کلکتہ سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۴۷ء میں ڈھاکہ کو ہجرت، ڈھاکہ گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس میں لیکچرار اِن گرافک آرٹ کی حیثیت سے تقرر۔ ۵۷ء سے یورپ، اور لندن میں بڑی سرگرمی سے مشق فن اور مطالعہ۔

دو سال قبل پاکستان کو واپس جاتے وقت صفی الدین نے نیو ویژن سنٹر گیلری، لندن میں اپنے سولہ نقوش اور کندہ کاری کے نمونوں کی نمائش کا اہتمام کیا جو بلاشبہ ان کی یورپ میں فنکارانہ زندگی کا منتہائے عروج تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مذکورہ گیلری تجریدی فن کو فروغ دینے ہی کے لئے مخصوص ہے۔ شاید یہ سن کر بعض لوگ خفا ہوں۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمیں مس اسٹین کی یہ تنبیہہ یاد رکھنی چاہئے کہ جو چیز بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتی ہے" ممکن ہے کچھ دیر بعد عجیب نہ رہے"۔ کیونکہ غور سے دیکھا جائے تو آخر تجریدی فن کار بھی تو اول اول تو روایتی نہج ہی پر چلتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا خوگر ہو کر ایسا انداز اختیار کرتا ہے جس میں قدرتی وضع و ہیئت کی پابندی برابر کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ صفی الدین کی تصاویر کا فطرت

صفی الدین احمد

(ایک نقاش فطرت)

(مضمون صفحہ ۳٦

''چلے صبحدم جال لے کر مچھیرے''
(کھدائی کا کام)

جال اور ناؤ : آفتاب صبح کی آغوش میں (نقاشی)

"تصویر خانہ ہے دنیا!"

★

گڑیاں یوں تو بچوں کا کھیل
اور دل بہلاوا ہیں مگر ان کے
بنانے میں بھی مہارت، ذوق،
خوش سلیقگی اور فنون لطیفہ
سے مناسبت ضروری ہے - یہ
ہماری ثقافت اور علاقائی طرز
بود و ماند کی عکاسی و نمائندگی
بھی کرتی ہیں -

★

(کراچی میں حال ہی میں
گڑیوں کی نمائش ہوئی جس
کے چند دلکش نمونے یہاں
پیش کئے جاتے ہیں)

کے ساتھ کوئی واسطہ ہی نہیں۔ بلکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ جیسا کہ فضل لوہانی نے تصاویر کی فہرست میں بیان کیا ہے۔ صفی الدین کی کندہ کاری اور تصاویر کا موضوع "سیلاب" ہے۔ وہ قدرتی حادثہ جو دو آبہ گنگا کی زندگی کا تقریباً مستقل عنصر رہا ہے۔ اور جس سے اپنے دیس کے کئی لوگوں کی طرح اس نے بھی بے انتہا نقصان اٹھایا ہے۔ جس بات میں وہ روش عام سے الگ ہو جاتا ہے وہ ہے زمانے سے چلتے ہوئے پانی، اس کے اتار چڑھاؤ، نیز نیچی سطح پر اُڑتے ہوئے بادلوں، امڈتے ہوئے سیلاب اور پانی میں غرق زمین کے ملے جلے، پیچیدہ تیور۔ ایسے نقوش سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے بے اختیار ہنری مُور کا یہ قول یاد آتا ہے کہ وہ "جو چیز بھی دیکھے اس میں کوئی صورت" ٹھیک لگائے دیکھ سکتا ہے۔ خواہ یہ چیز دیوار پر دھبہ ہو یا سیاہی کا چھینٹا یا محض ایک کنکر"۔ اگرچہ ان دونوں طریقوں کی بنیاد قدرت ہی کے بنیادی اوضاع پر ہے پھر بھی جس طور سے انہیں نبھایا جاتا ہے وہ ایک اور اعتبار سے بالکل جداگانہ ہیں۔ مُور پہلے ایک ہیولے کا تصور کرتا ہے اور پھر اسے جس قماش میں بھی چاہے سمو دیتا ہے۔ اس طرح وہ جو محاکات کام میں لاتا ہے اس کی تمثیلی وضع پہلے ہی سے تصور کئے ہوئے ہیولے اور اُس قماش سے جس پر اسے منطبق کیا جاتا ہے، ذو وجہین یعنی دوگونہ نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس صفی الدین کی محاکات کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جن قدرتی قوتوں کو پیش کرتا ہے انہیں خارجی منظر سے اخذ کر کے ہموار سطح پر خطوط اور اشکال میں منتقل کر دیتا ہے۔

ابھی میں نے صفی الدین کی تصاویر اور گرافک یعنی ٹھوس قماش کے کام میں امتیاز نہیں کیا۔ اور وہ خود بھی اس کا قائل نہیں۔ اس کے لئے دونوں صورتوں میں معاملہ ایک ہی ہے۔ جو بھی قماش، یعنی مادی ذریعۂ اظہار وہ اختیار کرے اس میں وضع، خطوط اور علاقیت برابر کام آتے ہیں۔ یہاں ممکن ہے کسی کو مجھ سے اختلاف ہو۔ میری رائے میں آج کل جنوبی ایشیا کے فنون لطیفہ مثلاً نقاشی میں جن خطوط، اوضاع اور رنگوں کا غلبہ معلوم ہوتا ہے ان میں اور ٹھوس قماش کے کاموں... مثلاً کندہ کاری اور کھدائی کے خطوط، اوضاع اور رنگوں کی انواع و اقسام میں خاص مناسبت پائی جاتی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ صفی الدین صرف پاکستان ہی میں ان ذرائع کے استعمال میں ایک اہم پیشرو کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ مغربی معیاروں کے مطابق بھی ایک استاد فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس ضمن میں اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہے کہ اس کا ٹھوس کام دو برس ہوئے سینٹ جارجز گیلری (لندن) رائل سوسائٹی آف پینٹرز، ایچرز، اینڈ انگریورز۔ لندن۔ انٹرنیشنل۔ ٹرائی اینیل آف اوریجنل کلرڈ گرافک آرٹ۔ گرینچن (سوئٹزرلینڈ) کے اور رائل اکاڈمی آف لندن جیسے مشہور و معروف ادارے اپنی نمائشوں کے لئے انتخاب کر چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں جو آخری بات میرے خیال میں جمالیاتی اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہے جس کا ذکر میں نے کسی اور موقع پر ان الفاظ میں کیا ہے۔

" مغربی آرٹ میں بنیادی تصور یہ ہے کہ کسی تصویر میں اندرونی تعمیری وحدت لازم ہے۔ علامات کی ذومعنی وضع کا ایک اندرونی تانا بانا اور باہمی نظم و ربط ہونا چاہیئے۔ اس کے برعکس اسلامی فنون کا روایتی پیرایہ یہ ہے کہ کسی فن پارے کے مختلف اجزا آپس میں بہت قریب تو لائے جاتے ہیں لیکن ان میں صوری وحدت پیدا نہیں کی جاتی۔ یوں لگتا ہے جیسے اجزا میں تقابل اور تنوع پیدا کرنے کی غرض سے ایسی ترکیبیں قصداً استعمال کی جاتی ہیں۔ چنانچہ گنبد ہمیشہ مینارے سے ملحق ہوتا ہے، متحد نہیں ہوتا۔ مغرب میں اندرونی فنی وحدت کا روایتی تصور ناظر کے لئے تخلیقی تشریح کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا ــــ اس کے برعکس اسلامی روایت یہ ہے کہ ناظر کی اِس شمولیت پر خاص زور دیا جائے۔ چنانچہ گانے میں آواز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں جیسا کہ مغرب میں ہے۔ بلکہ یہ بات سامع پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ اپنے تخیل سے اس کی کامل ادائیگی کا تصور کرے۔

اگر اس استدلال کو تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں اس کے نتیجہ کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ صفی الدین کی تصویر "جال۔ کشتی اور سورج" کا موازنہ اس کی کندہ کاری،

باقی صفحہ ۵۴ پر

افسانہ:

دل کی گہرائیوں میں

انور

جب دروازہ پر دستک ہوئی میں اپنے افسانے کا یہ ٹکڑا بلند آواز سے دہرا رہا تھا:

"کون میری زندگی کے افق پر چودھویں رات کے چاند کی طرح ابھر آیا ہے؟ کس نے میری کائنات کے تاریک ترین گوشوں کو روشن کر دیا ہے؟ کون میرے خیالات اور احساسات پر چھاتا چلا جا رہا ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟"

دروازہ کھلا آواز آئی۔

"میں ہوں شہناز"

میں نے قلم میز پر رکھ دیا اور مسکراتا ہوا شہناز کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ شہناز نے اپنا ہینڈ بیگ میز پر میرے قلم کے پاس رکھ دیا۔ اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا بڑبڑا رہے تھے آپ۔ دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتی رہی"

"نواز کی کہانی لکھ رہا ہوں۔ آپ بڑے رومانٹک موقع پر پہنچی ہیں"

"کیا رومانٹک موقع؟"

"نواز اپنی محبوبہ کو خط لکھ رہا ہے:

"— کون میری زندگی کے افق پر چودھویں رات کے چاند کی طرح ابھر آیا ہے۔ کس نے میری کائنات کے تاریک ترین گوشوں کو روشن کر دیا ہے کون میرے خیالات اور احساسات پر چھاتا چلا جا رہا ہے۔ کون ہے؟ کون ہے؟

آپ نے دروازہ کھول کر کہا۔ میں ہوں شہناز"

شہناز ہنسنے لگی اور بولی۔

"آپ کیوں رومانٹک افسانہ نگاری میں وقت ضائع کرتے ہیں؟ ہمیں بہت کام کرنا ہے"

شہناز میں اور مجھ میں جسموں کی جاذبیت کارفرما نہیں۔ جسموں کی جاذبیت تو بڑی خطرناک چیز ہے۔ جسموں کی جاذبیت تو ایک جال ہے جس میں سادہ لوح دل اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اور پھر تمام عمر کے لئے شادی کے پاگل خانے میں پڑے چیختے رہتے ہیں۔ شہناز اور مجھ کو تو صرف سوشل کاموں نے یکجا کر دیا ہے۔ جب کام ختم ہو جاتا ہے شہناز اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ اور میں اکیلا اپنے فلیٹ میں بیٹھا رومانٹک افسانے لکھتا رہتا ہوں۔

میں نسوانی حسن کی جاذبیت سے بےحد ڈرتا ہوں۔ اس لئے جب میں کسی لڑکی کو دور سے اپنی طرف آتے دیکھتا ہوں تو میرے منہ سے بے اختیار دعائیں نکلتی ہیں، یا باری تعالیٰ! یہ لڑکی بدصورت ہو۔ نہیں تو میں آفس سے لیٹ ہو جاؤں گا۔ یا باری تعالیٰ! تو ہی میری عزت اور میری صحت کا رکھوالا ہے۔ اور اگر وہ لڑکی بدصورت ثابت ہو تو مجھے بے تحاشا خوشی ہوتی ہے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں آوف ڈیوٹی (OFFDUTY) ہو گیا ہوں۔ جیسے اور بھی غم ہیں زمانہ میں محبت کے سوا۔ مثلاً قطار کو توڑ کر بھاری ہجوم کو چیرتے ہوئے بس پر سوار ہونا۔ یا چاقوؤں یا لاٹھیوں کی مدد سے میونسپلٹی کے نلکے سے پانی کی بالٹی لینا۔ قدرت نے اس دنیا میں خوبصورتی اور بدصورتی کا تناسب بہت چابکدستی سے رکھا ہے۔ حسن کے عالمی مقابلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں ایک سال میں صرف ایک عورت حسین ہوتی ہے باقی سب بدصورت۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور اس دنیا کی ہر عورت حسین ہوتی تو عورتوں اور مردوں کی مخلوط پارٹیوں میں کھانے کی میز پر عورتوں کے سامنے بیٹھے ہوئے مرد چھریوں سے اپنی انگلیاں کاٹ لیتے۔ حسن ایک جادو ہے جو جاگتوں کو سلا دیتا ہے اور زندوں کو مردہ کر دیتا ہے۔

شہناز نے پوچھا۔

"آپ نے وہ مضمون ختم کر دیا جس کا عنوان 'خلا' تھا؟"
میں نے جواب دیا۔
"نہیں۔ نواز کے ٹیلیفون نے ڈسٹرب کر دیا"
"دیکھئے ہم اپنی ذمہ داریوں کو نظرانداز کر رہے ہیں"
"میں جانتا ہوں۔ لیکن نواز کی باتیں اس قدر دلچسپ تھیں کہ میں یہ مضمون چھوڑ کر اس کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔"

"کونسی ایسی دلچسپ باتیں تھیں وہ؟" شہناز نے مطالبہ کیا

"نواز نے خوشخبری سنائی کہ اس کا دسواں بچہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گیا ہے۔ میں نے حیران ہو کر جواب دیا۔ تم نے پچھلے سال بھی ایک بچہ کے ورود مسعود کا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا ہاں۔ وہ ۱۹۵۹ء کا موڈل تھا۔ یہ ۱۹۶۰ء کا موڈل ہے۔ ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک میرے ہاں ہر سال جنوری میں ایک نیا موڈل وارد ہوتا ہے۔ اب یہ دسواں ۱۹۶۰ء کا موڈل ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ او بیوقوف! کچھ فیملی پلیننگ کا بھی خیال کر۔ خاندان کی صحت اور مسرت کے لئے خاندانی منصوبہ بندی نہایت ضروری ہے۔ وہ بولا۔ یار! میں فیملی پلیننگ کے حق میں نہیں۔ ہماری قوم کے لئے خاندانی منصوبہ بندی بہت نقصان دہ ہے۔ آخر ہمارے پاس یہی تو ایک انڈسٹری ہے جس میں ہمیں ایک بہت بلند مقام حاصل ہے۔ ہم کیوں اپنی یہ بین الاقوامی پوزیشن ضائع کریں۔ جب بڑے پیمانے پر ریزر بلیڈ بنانے کے لئے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں تو بڑے پیمانے پر بچے بنانے کے لئے بھی لائسنس جاری ہونے چاہئیں۔ نہیں تو آنے والی جنگ میں توپوں کو گھاس کون ڈالے گا؟ میں بڑی بدتمیزی لت ٹیلیفون پر ہنسنے لگا۔ اور چلایا: نواز مجھے آج معلوم ہوا کہ تم ایک عظیم فلسفی ہو۔ تم ایک بہت بڑے دماغ کے مالک ہو۔ میں حیران ہوں کہ اتنے بڑے دماغ کا بوجھ انسان کے کندھے کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ بوجھ تو کسی گدھے کے کندھوں پر ہونا چاہیئے۔"

شہناز چپ چاپ سنجیدہ بیٹھی رہی۔ جب شہناز کو کسی بات پر اعتراض ہو تو وہ چپ چاپ سنجیدہ بیٹھی رہتی ہے۔ اور اپنی ناک سکیڑ کر فضا میں تکتی رہتی ہے۔

"اور نواز کی اس محبوبہ کا کیا ہوا جس کو وہ اس قدر رومانٹک خط لکھا کرتا تھا؟"

"نواز کی محبوبہ ایک بہت زرخیز بیوی ثابت ہوئی۔ وہ نواز کی زندگی کے افق کو پھاند کر اس کے گھر میں آگھسی۔ اور اس کی کائنات کے تاریک ترین گوشوں کو ٹورچ لائٹ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان میں بچوں کے بیڈروم بنا دیئے۔ اور اب وہ نواز کے اعصاب پر اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ آج صبح اس نے مجھ سے ٹیلیفون پر وٹمین بی کومپلکس کی ایک درجن بوتلیں منگوائی ہیں"۔

"شہناز نے اپنی ناک سکیڑ لی اور بولی۔
"میں احتجاج کرتی ہوں۔ آپ صنف نازک کے بارہ میں توہین آمیز لہجے میں باتیں کر رہے ہیں۔"
میں نے کہا۔
"شہناز! تم ایک سوشل ورکر ہو۔ تمہیں جذبات سے کوئی سروکار نہیں۔"
"جی ہاں۔ میں سوشل ورکر ہوں لیکن میں دماغ کے ساتھ دل بھی رکھتی ہوں۔"

یکایک شہناز نے کردار کا ایک نیا زاویہ میرے سامنے رکھ دیا۔ یک بیک اس کے نگینے کا ایک اچھوتا پہلو نظروں کے سامنے آگیا۔ اور میں حیران رہ گیا۔

شہناز نے اپنی زندگی کے اس کمزور گوشے کو بڑے اہتمام سے چھپا رکھا تھا۔

اس کے دل میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی تڑپ تھی۔ اس کے دل میں مزدوروں اور کسانوں اور جھونپڑیوں اور گاؤں میں کام کرنے کی آگ تھی۔ اس لئے اس نے اپنے سینے سے اپنا دل نکال کر اس کی جگہ ایک اینٹ رکھ دی تھی۔ اینٹ تعمیر کا سمبل ہے۔ دل آگ میں پگھل جاتا ہے۔ اینٹ آگ میں پختہ ہوتی ہے۔ اینٹ آگ میں پختہ ہو کر چٹان بن جاتی ہے۔

ایک دن میں نے کہا۔
"شہناز! میں تمہارے سوشل کام کے جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم مردوں کے ساتھ کام کرنے کے بجائے عورتوں کی کسی سوشل ویلفیئر سوسائٹی کی ممبر بن جاؤ۔ غالباً عورتوں کے ماحول میں تم زیادہ آزادی سے کام کر سکو گی۔"
اس نے جواب دیا:

"مشورے کا شکریہ۔ لیکن ہماری عورتوں کی سوشل ویلفیئر سوسائٹیاں تو بے بی شو اور مینا بازار اور نرسنگ کی حدوں سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اور میری پیاس شبنم سے بجھنے والی نہیں۔ میری پیاس کے لئے بحرِ بے کراں چاہئیے۔"

"لیکن تمہیں مردوں کے ساتھ کام کرنے کے خطروں کا بھی احساس ہے تمہیں معلوم ہے کہ کبھی کبھی پُراسرار فضاؤں میں سے گھوڑے پہ سوار ایک نوجوان آتا ہے۔ اور لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔"

جی ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ کبھی کبھی پراسرار فضاؤں میں سے گھوڑے پر سوار ایک نوجوان آتا ہے اور لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ لیکن میں لڑکی نہیں ہوں۔"

"اور تم کیا ہو؟"

"میں ایک چٹان ہوں"

شہناز خوبصورت ہے لیکن وہ بدصورت نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ دکھتی ہے۔ اس کی خوبصورتی اس کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سوشل کام کرنے والی خاتون کو خوبصورت نہیں ہونا چاہئے۔ خوبصورت سوشل ورکر قافلے کو منزل تک پہنچانے کی بجائے خود اس کی منزل بن جاتی ہے۔ قافلے والے اپنی منزل بھول کر اور اپنا رختِ سفر رہزنوں کے حوالے کر کے اپنی حسین و جمیل رہنما کے آستانے پر سجدے کرنے لگتے ہیں۔ حسن خود ایک منزل ہے جو انسان کی حقیقی منزل کے راستے میں رکاوٹ بن کے بیٹھ جاتا ہے۔ شہناز خوبصورت ہے لیکن وہ بدصورت نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس دن جب شہناز اور میں پنجاب کے ایک گاؤں میں انجمن ترقی دیہات کے سالانہ جلسہ میں مدعو تھے۔ شہناز کو دیکھ کر میرے حسن کے احساس کو بڑی ٹھیس لگی۔ اور میں نے غصے میں کہا۔

"شہناز مجھے تمہارا گنوار لڑکیوں کی طرح باندھا ہوا بالوں کا جوڑا سخت ناپسند ہے اور تم نے یہ سبز کناری والی نیلی ساڑھی کیا پہنی ہے؟ کتنی بری لگتی ہے۔"

شہناز نے تنک کر کہا۔

"میں جنگ پر جا رہی ہوں۔ میں نے زرہ بکتر پہنا ہوا ہے۔"

"جنگ پر جا رہی ہو؟ زرہ بکتر پہنا ہوا ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا شہناز؟"

"میں جون اوف آرک ہوں"

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ شہناز بڑی ظالم ہے۔ بڑی سنگدل ہے۔ اس نے اس لڑکی کو جو اس کے جسم میں رہتی ہے۔ فولادی شکنجوں میں جکڑ کر بڑی بے رحمی سے مار ڈالا ہے۔ اور اب اس کی لاش پر کھڑی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔ میں کوئی معمولی لڑکی ہوں! میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔ میں جون آف آرک ہوں۔"

مجھے چپ دیکھ کر آخر جون اوف آرک نے کہا۔

"اور آپ میرے بالوں اور میرے لباس میں دلچسپی کیوں لینے لگ گئے ہیں؟

"میں نے اپنی آواز میں سنجیدگی اور وقار پیدا کر کے جواب دیا۔

"میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ مجھے بدصورتی سے نفرت ہے"۔

"شہناز چپ ہو گئی۔ میں بھی چپ ہو گیا۔

اس واقعہ کے دو ہفتے تک شہناز مجھے نہ ملی اور آج دو ہفتے کے بعد وہ میرے فلیٹ میں آئی تو میں نواز کی کہانی لکھ رہا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ لیکن میں نے اس کی طرف غور سے نہیں دیکھا۔ اور نہ اس کے آنے پر میں نے کسی غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا۔ جب وہ صوفے پر بیٹھ گئی تو میں نے بڑی بے پروائی اور بڑی بے حیائی سے نواز کی باتیں شروع کر دیں جیسے میرے پاس شہناز نہیں بیٹھی ہے، جیسے میں ایک چٹان کے پاس بیٹھا تھا، جیسے میرے پاس جون اوف آرک فولادی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ اور جب شہناز نے کہا۔ میں سوشل ورکر ہوں۔ لیکن میں دماغ کے ساتھ دل بھی رکھتی ہوں۔ تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اور میری نظریں اس پر منجمد ہو گئیں۔ شہناز ایک سنہری جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اور اس کے بالوں میں ایک گلاب کا پھول لگا ہوا تھا۔ اور اس کی دو چوٹیاں، اس کے سینے پر ناگنوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

شہناز نے کہا۔

"ایڈیٹر بڑی شدت سے آپ کے مضمون "خدا" کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ آپ کا مضمون موصول ہونے کی وجہ سے پرچہ لیٹ ہو گیا ہے۔ آج آپ کو یہ مضمون مکمل کرنا ہوگا"

میں نے جواب دیا۔
"آج یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکے گا۔ میں مشغول ہوں۔"
"آپ نوناز کی بیکار کہانی کو چھوڑ دیجئے۔ کوئی بڑا کام کیجئے۔"
"میں نوناز کی کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔"
"پھر کونسی اتنی بڑی مشغولیت ہے آپ کی؟"
"مجھے ایک گمشدہ لڑکی کی تلاش ہے۔"
شہناز نے جلدی سے میری طرف دیکھا۔ جیسے وہ گمشدہ لڑکی کے بارہ میں کچھ سوالات کرنا چاہتی ہو۔ لیکن اس نے مجھے گمشدہ لڑکی کے بارہ میں کوئی سوال نہ کیا۔ اور نظریں جھکا کر کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

پھر وہ بولی۔
"اچھا آپ گمشدہ لڑکیوں کو تلاش کریں۔ میں وہ مضمون لکھتی ہوں۔ مجھے چند لفظوں میں اپنا خدا کا نظریہ بتا دیں۔"
میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔
"خدا ایک غیر معمولی طاقت ہے جو چٹانوں کے سینوں میں دل پیدا کر دیتی ہے۔ خدا ایک بے پناہ قوت ہے جو انسانوں کے بالوں میں گلاب کے پھول اگا دیتی ہے۔"

شہناز چپ ہو گئی اور دیر تک چپ چاپ کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔
"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ایک چٹان کے سینے میں دل پیدا کر دیا ہے۔ کیا آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ نے میرے بالوں میں گلاب کا پھول اگا دیا ہے۔ کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ خدا ہیں؟"
میں نے جواب دیا:
"میں ایک خدا ہوں۔ میں آرٹ کی تخلیق کرتا ہوں۔ میں افسانوں کا خالق ہوں۔ میرے کردار میری مخلوق ہیں۔ میں چٹانوں کے سینوں میں دل پیدا کر سکتا ہوں۔ میں انسانوں کے بالوں میں گلاب کے پھول اگا سکتا ہوں۔"

"اور میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے اپنے بالوں میں گلاب کا پھول آپ کے لئے نہیں لگایا۔ میرے صحن میں ایک گلاب کا پودا ہے اور یہ پھول اس گلاب کے پودے کا پہلا پھول ہے۔ آج صبح میں نے اپنے صحن میں گلاب کا پہلا پھول دیکھا تو میں نے اس کو فرطِ مسرت سے چوم چوم لیا اور توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔"
"اور میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بالوں میں گلاب کے پھول کے ساتھ اور ناگنوں کی طرح چمکتی ہوئی دو چوٹیوں کے ساتھ اور سنہری جارجٹ کی ساڑھی کے ساتھ آپ بے حد حسین لگ رہی ہیں۔"
شہناز نے کسی قدر ترش ہو کر کہا۔
"آپ میرا وقت ضائع مت کیجئے۔ مجھے یہ مضمون مکمل کر کے بھیجنا ہے۔"
میں نے جان کر ترش لہجے میں جواب دیا۔
"آپ اپنا وقت ضائع مت کیجئے۔ اس مضمون کا خیال چھوڑ دیجئے۔ چپ چاپ میرے سامنے بیٹھی رہیئے۔ آرٹ کی تخلیق ہو رہی ہے۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ آپ میرا موڈل ہیں۔ اس دن جب آپ نیلی ساڑھی میں ملبوس میرے ساتھ پنجاب کے ایک گاؤں میں گئی تھیں، اس دن آپ شہناز تھیں۔ آج آپ ناز ہیں۔ صرف ناز سراپا ناز! شہناز تو مجھے روز ملتی ہے۔ ناز کو میں نے آج پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ گلاب کے پہلے پھول کی طرح۔ شہناز تو مجھے ہر روز مل جاتی ہے۔ مجھے نازی کی ضرورت ہے اور جب مجھے نازی کی تلاش ہو گی تو میں پکاروں گا نازی۔ نازی تم کہاں ہو نازی؟ آؤ ہم آرٹ کی تخلیق کریں۔"
شہناز ناراض ہو گئی۔ اس نے گلاب کا پھول بالوں سے نکال کر میرے پیروں کے پاس پھینک دیا۔ دونوں چوٹیوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کندھوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ اور اپنے دائیں بازو سے اپنے چہرے کو چھپا کر صوفے کی بیک پر لیٹ گئی۔
میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔
"اور جب تم کمسن کم سمجھ بچوں کی طرح روٹھ کر لیٹ جاؤ گی تو میں کہوں گا: نازو۔ نازو ماں بھی جاؤ نازو بے بی۔"
اور پھر غضب ہو گیا۔ شہناز بچوں کی طرح رونے لگی۔ میں گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شہناز بری طرح سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ میں اس کے پاس گیا۔ اس کے بازو کو اس کے چہرے سے اٹھایا۔ اور ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کے چہرے کو اپنے سامنے کر کے بولا۔
"شہناز! شہناز! تم تو ایک چٹان ہو۔ تم تو جون اوف آرک ہو۔ کبھی چٹانیں بھی پگھلتی ہیں؟ کبھی زرہ بکتر میں بھی زخم ہوتے ہیں؟ شہناز! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم نازی نہیں ہو۔ تم نازو نہیں ہو۔ تم شہناز ہو صرف شہناز۔"
شہناز نے میرا بازو جھٹک کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر زور زور سے رونے اور کراہنے لگی: "او میرے خدا! او میرے خدا!"

بنگلا افسانہ:

"جیون ندی کو بہنا ہے"

عبدالغفار چودھری
ترجمہ: احمد سعدی

ایک سہانی شام۔ تاریکی کے پردے پر ریلوے کے بعید سگنل کی سرخ روشنی یوں لگتی تھی جیسے کسی دوشیزہ کی پیشانی پر سیاہ بالوں کے سائے میں سرخ ٹیکہ جگمگا رہا ہو۔

نیل کھیت کی ریلوے کراسنگ سے گزرنے کے بعد ٹاؤن سروس بس دو منٹ کے لئے رکی۔ اس کے بائیں طرف اِدھر اُدھر جھکے ہوئے ٹیڑھے میڑھے بہت سے بارکیں اور دائیں طرف چند خوبصورت یک منزلہ مکانات تھے۔

بس کی لیڈیز سیٹ سے جوں ہی ممتا نیچے اُتری، اس کی معین سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ معین شرما سا گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا جس میں بہت ساری الم غلم چیزیں بھری ہوئی تھیں اور بائیں میں ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی، اخبار میں لپٹی ہوئی، جس میں چھوٹے بچے کا ایک جوڑی جوتا تھا۔ پھر بھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے ممتا، تم ڈھاکہ کب آئیں؟"

ممتا بھی قدرے پریشان دکھائی دی۔ اس کے بائیں پیر کے سینڈل کا اسٹراپ یکایک ٹوٹ گیا تھا، اس لئے اُسے لنگڑا کر چلنا پڑ رہا تھا، اس نے کھڑے کھڑے ہی جواب دیا "یہی کوئی ایک مہینہ ہوا، ہمارا یہاں تبادلہ ہوا ہے۔"

"بہت خوب۔ گھر شاید قریب ہی ہے؟"

"ہاں، ہاں۔ اس موڑ کے قریب ہی۔ کوارٹر ابھی نہیں ملا۔ اسلئے فی الحال ایک دوست کے یہاں قیام ہے۔"

"گھر کا نمبر؟"

"ستائیس کا ایک بائی اے ......"

اتنے میں بس اسٹارٹ ہوگئی۔ معین نے کہا "راستہ مجھے معلوم ہے، کسی دن آؤں گا، ریحان سے کہہ دو گی؟"

وہ لپک کر چلتی ہوئی بس پر چڑھ گیا اور ممتا حیران حیران نگاہوں سے تھوڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے چلتی بس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگی۔ اس وقت تک تاریکی کافی بڑھ گئی تھی اور سگنل کی سرخ روشنی اور بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

ممتا کو یاد آیا، معین کبھی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ تصویریں بنا رہا تھا، اس نے اس سے پوچھا تھا، کہو ممتا، تمہیں کون سا رنگ اچھا لگتا ہے؟"

ممتا کی عمر ان دنوں سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ سرخ ساڑی پہنے ہوئے تھی اور اس کے جُوڑے میں سرخ پھول لگا ہوا تھا، اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا تھا "لال"۔

معین قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا "عورتوں کی نظر بھی خوب ہے۔ جانتی ہو سرخی کا انجام سیاہی ہے؟" اس قول کو آزمانے کے لئے ایک دن ممتا نے صبح سویرے اُٹھ کر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا تھا۔ اور تھوڑی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک بڑے سے سیاہ دائرے میں تبدیل ہو گیا ہو۔ جب اس نے اپنی آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ اس کی نظر کا دھوکا تھا اور اس کی نگاہ کو یہ فریب معین نے ہی سکھایا تھا۔

سگنل کی سرخ روشنی کو پیچھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ نہیں، اپنے اس واہمہ کو وہ اب کوئی اہمیت نہیں دے گی۔

دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہی ریحان نے دروازہ کھول دیا۔

"آج اتنی دیر کیوں ہوئی؟" اس نے پوچھا۔

"بس اسٹاپ پر معین سے ملاقات ہوگئی تھی۔"

"معین؟" ریحان نے بھنویں سکیڑ کر کہا "آج کل وہ کیا کرتا ہے؟"

"یہ سب باتیں دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا، اس نے کہا ہے وہ کسی دن یہاں آئے گا۔"

ریحان خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آہستگی سے پوچھا

"تم نے آج اپنی شاگرد کو کون سا گانا سکھایا؟"

"منزل گیتی۔"

"کیسا گاتی ہے؟"

"برا نہیں، مگر اُسے کوئی شوق نہیں۔ شادی سے پہلے کسی اچھے لڑکے کی تلاش کے لئے یہ مشق ہو رہی ہے۔"

ریحان ہنسنے لگا: "سچ بتاؤ ممی! شادی سے پہلے تم نے گانا کیوں سیکھا تھا؟"

ممتا نے اپنی گردن کو ذرا سا خم کرتے ہوئے کہا "اس لئے کہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ آج میرا وہی شوق میرے کام آ رہا ہے۔"

ماں کو دیکھتے ہی اس کی چھوٹی بچی دوڑ کر اس کے قریب آ گئی اور بولی "ماں، ماں تم آ گئیں۔ بھوک لگی ہے۔"

ممتا نے پیار سے بچی کا گال تھپتھپا کر کہا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی کھانا پکاتی ہوں۔"

اس نے اپنے کپڑے تبدیل کئے اور ریحان کے قریب آ کر بولی "جب معین آئے گا تو تمہیں تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑے گا۔"

ریحان ہنسنے لگا "کیا بات ہے؟"

"اسے کہہ دینا تم ملازمت کرتے ہو۔ کوارٹر ملتے ہی اپنے دوست کا گھر خالی کر دو گے اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔" کہتے کہتے ممتا رک گئی پھر بولی "میں جو گانا سکھانے کا ٹیوشن کرتی ہوں، اس کا ذکر مت کرنا۔"

ریحان نے ایک طویل سانس لے کر کہا "بہت اچھا کہہ دوں گا۔"

اور ایک دن پھر بس اسٹاپ پر ہی اس کی معین سے ملاقات ہو گئی۔ وہ سفید بیجابی پہنے ہوئے تھا اور اس کے ہونٹوں سے سگریٹ چپکا ہوا تھا۔ وہ بس کا انتظار کر رہا تھا اور ممتا بھی اسی انتظار میں کھڑی تھی۔ معین کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم تو خوب آئے۔"

معین نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا "کام میں بے حد مصروف تھا، اس لئے نہ آ سکا۔ روز ہی سوچتا ہوں کہ ایک مرتبہ ہو آؤں۔ مگر اس وقت تم کہاں جا رہی ہو؟"

"ریڈیو اسٹیشن۔"

"تو گویا تمہارے گانوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے؟"

"درمیان میں تو یہ سلسلہ بالکل ہی بند ہو گیا تھا جب وہ یہاں تبدیل ہو کر آئے تو انہوں نے کہا۔۔۔۔"

معین نے کہا "سمجھ گیا۔ ریحان تو گانوں کا شیدائی ہے ہی۔"

ممتا نے سگنل کی طرف دیکھتے ہوئے سرخ روشنی تلاش کی، لیکن دن کے وقت یہ روشنی کہاں؟

معین نے کھڑے کھڑے سگریٹ ختم کر دیا اور پھر اس کا جلتا ہوا آخری ٹکڑا دور پھینکتے ہوئے بولا۔ "مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ رکشا میں ایک ساتھ چلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

ممتا نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر جواب دیا "نہیں، اعتراض کرنے کی عمر سے کیا میں آگے نہیں بڑھ چکی؟"

معین نے رکشا میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تمہاری عمر ہی کتنی ہے جو تم اس قسم کی باتیں کرتی ہو۔"

"عورت کی تیس سال عمر کیا کم ہوتی ہے؟"

معین نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ کوئی زیادہ نہیں۔ شاید تم نے بہت دنوں سے آئینہ میں اپنا چہرہ نہیں دیکھا۔"

"آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر عورتیں اپنے اَنا کی تسکین کرتی ہیں، یہ بات تم نے کبھی سنی ہے؟" ممتا یکایک ہنس پڑی۔

"یہ تم کیا کہتی ہو؟" معین نے چونک کر کہا۔ "ریحان اتنے ہی دنوں میں کیا اتنا بڑا ملحد ہو گیا ہے؟"

ممتا پھر ہنسنے لگی "نہیں، نہیں۔ میں ان کی بات نہیں کر رہی۔ یونہی مذاق کر رہی تھی اور تم کچھ اور سمجھ بیٹھے۔"

"میری نظروں کو تم دھوکا نہیں دے سکتیں۔" معین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج میں ورانٹی بوٹ پالش کے لیبل کا ڈیزائن بنا کر پیسہ کماتا ہوں، لیکن ایک دن انہیں ہاتھوں سے۔۔۔۔۔"

ممتا نے حسرت بھرے لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا "تم بوٹ پالش کے لیبل کا ڈیزائن بناتے ہو؟"

"جب تم نے کسی جھجک کے بغیر اپنی بات مجھے بتا دی ہے تو مجھے اپنی بات بغیر کسی جھجک کے بتا دینے میں تامل کیوں ہو؟ پہلے دن ہی اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے تمہارے سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا تھا، لیکن آج مجھے کوئی شرم یا جھجک محسوس نہیں ہو رہی۔"

"اسی لئے تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔"

"میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہا بلکہ تمہارا حجاب ختم کئے دے رہا ہوں۔" معین کی مسکراہٹ یکایک قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے

کہا یہ یاد کرو، ایک زمانے میں تم بناؤ سنگار کی کتنی دلدادہ تھیں، مردوں کی آنکھوں کے آئینے میں تم جگمگاتی رہتی تھیں۔ تم کہتی تھیں تمہیں ایک ایسے مرد کی تلاش ہے جو تمہاری آنکھوں کے آئینے میں جگمگاتا رہے۔ اور آج وہی تم ہو......"

معین یکایک رک گیا۔ پھر اس نے کہا "شاید اب تمہیں کسی کی آنکھوں میں اپنی تصویر دکھائی نہیں دیتی؟"

یکایک رکشا ایک جھٹکا کھا کر رک گیا۔ اس موڑ کے قریب ہی ریڈیو آفس تھا۔ جب ممتا اتر گئی تو معین نے کہا "میرا مکان لکھمی بازار میں ہے پرانے سینٹ گریگوری کالج کے قریب ہی نمبر بارہ۔ کسی دن ریحان کو ساتھ لے کر آؤ۔"

ممتا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اور ممتا آج جب گانے بیٹھی تو نہ جانے اسے کیا ہو گیا، بار بار اس کا گلا بھر آتا اور گلے کی جلن آنسو بن کر آنکھوں تلے اندھیرا کر دیتی بار بار اُسے خوف محسوس ہوتا، جیسے اس نے گانا بند کر دیا ہو، یہ تکلیف دہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا، اس نے ایسے گیت کا انتخاب کیا تھا کہ اس کے بول حلق میں اٹک اٹک جاتے تھے، بلکہ خاموش سر آواز کے دباؤ سے فریاد کرنا چاہتے تھے۔ پھر بھی وہ گیت گائے بغیر نہ رہ سکی "اے حسن والے! تیری دل موہ لینے والی رفاقت سے میرا جسم پاک ہو گیا ہے اور میرا دل خوشی کے خزانہ سے بھر گیا ہے۔"

خیالوں میں کھوئے ہوئے اُسے محسوس ہوا جیسے اس کی آواز کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہو، وہ حسین کہاں ہے، کہاں ہے؟ حسین تو کوئی بھی نہیں۔ نہ معین، نہ ریحان اور نہ وہ خود ہی حسن والوں کی رفاقت کی خواہش ہی نے تو ممتا کو اس طرح محتاج و تہیدست بنا رکھا ہے۔ پھر بھی کوئی حسین نہیں آیا، کسی نے اس کے حسن کی قدر نہیں کی۔ یہ بات وہ بہت دنوں سے بھولی ہوئی تھی اور دنیا کی دوسری دس عورتوں میں اس نے اپنا شمار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں تھا کہ ایک زمانہ میں وہ بھی خوبصورت تھی اور اب بھی کافی حسین ہے۔ معین اپنی نوعمری کے زمانے میں اُسے دیکھ کر تصویریں بنایا کرتا تھا، لاتعداد چہرے، ان گنت آنکھیں، بے شمار ہونٹ اس نے بنا ڈالے تھے، ریحان جیسا خوش پوش اور خوبصورت نوجوان بھی اُسے دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ غیر ارادی طور پر وہ معین سے دور ہوتی چلی گئی۔ معین کی تصویریں خوبصورت تھیں، مگر وہ خود خوبصورت نہیں تھا، اس کی زندگی خوبصورت نہیں تھی۔ بہت سارے پیچ و خم اور اُلجھاوے تھے اس میں۔ اس کے مقابلے میں ریحان شہزادہ دکھائی دیتا تھا، اسے دیکھ کر اُسے مسرت ہوتی تھی، اس کی آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھ کر اُسے راحت ملتی تھی۔ اس کے گھر کے سبھی لوگ حیران تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ دنیا میں اور بھی تو خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ ممتا جیسے اپنے وجود پر خود عاشق تھی۔ وہ ہر روز سینکڑوں مرتبہ سینکڑوں روپ میں خود کو سجاتی اور آئینے میں بیٹھی اپنی صورت دیکھتی رہتی۔ لوگوں کی باتیں سن کر وہ ہنس دیتی۔ وہ اپنے وجود پر کہاں عاشق تھی، وہ تو اپنی خوبصورتی پر مرمٹی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں ہر جگہ خوبصورتی کی چھاپ دیکھنا چاہتی تھی۔ شادی کے بعد اس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا۔ اب ریحان کی آنکھیں آئینہ بن گئی تھیں۔ وہ دن بھر میں تین بار تین طرح سے سج کر ریحان کے قریب آ کر بیٹھتی اور گلے سے گلا ملا کر گاتی "اے حسن والے...؟"

ایک سال بعد یہ طلسم ٹوٹ گیا، ممتا نے یکایک ایک دن ایسا محسوس کیا، جیسے ریحان کی آنکھوں میں اب وہ چراغ نہیں تھا، جو اسے دیکھتے ہی جل اٹھتا تھا۔ اور جب وہ اپنی چمکتی ہوئی آئینہ جیسی آنکھیں اوپر اٹھاتا تو اس میں ممتا ہو بہو اپنا عکس دیکھتی تھی، اس نے شوہر کے اور بھی قریب ہو کر پوچھا تھا "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

لیکن اس کی قربت بھی ریحان کے اندر حرارت پیدا نہ کر سکی۔ اس نے جواب دیا "کچھ نہیں"

اور ممتا یہ سوچ کر سخت پریشان ہو گئی کہ وہ ریحان کے سوئے ہوئے جذبات کو کس طرح بیدار کرے۔ اس کی ہر ایک ادا اس کا ہر ایک عمل، اس کا سجا ہوا ہر روپ اس کے جسم کے ہر پہلو کی طرح ریحان کے سامنے عیاں تھا۔ ریحان کے اندر آرزوؤں کا چراغ بجھ رہا تھا۔ ممتا نے سوچا تمام مردوں کو شاید ایک ہی چیز کا نشہ رہتا ہے۔ خوبصورتی کو لوٹ کر اپنی پیاس بجھانا آتا ہے، اس کی حفاظت کرنا نہیں آتا، لیکن ممتا اپنی دنیا میں اپنا شباب، اپنی زندگی، اپنا حسن قائم رکھنا چاہتی تھی۔ وہ ریحان کو دوسرے بیسیوں مردوں کی طرح دنیا کے بیسیوں آدمیوں میں کسی طرح بھی گم ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی، لیکن آخر وہی ریحان ان آدمیوں میں گم ہو کر رہا۔ کسی بات پر اس کی ملازمت جاتی رہی اور اُسے پھر اتنی اچھی نوکری نہیں ملی۔ اسے اپنا سجا یا ہوا ڈرائنگ روم اور آراستہ کی ہوئی چھوٹی سی خوبصورت دنیا کی تمام خوبصورتی اور سجاوٹ آہستہ آہستہ

ختم کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا بلند معیارِ زندگی صبح کی دھوپ میں نہا کر بستر سے اٹھنا اور شام کو حسین اور عطر بیز سماجی فضائیں روپ کہانی سننا، گانے کی دنیا میں محو رہنا، سبھی کچھ چھوڑ دینا پڑا۔ مفلسی اور تنگدستی کی وجہ سے ریحان اور بھی بے حس ہو گیا۔ وہ پھر کبھی خوبصورت نہ بن سکا۔ پہلے چھوٹی موٹی نوکری کر کے وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ اس کے بعد ڈھاکہ چلا آیا اور یہاں ممتا کے ٹیوشن ہی کا سہارا باقی رہ گیا۔

اتنے دنوں میں ایک بچہ کی ماں بن کر ممتا بھی بے حس ہو گئی تھی۔ پہلے پہل کچھ دنوں تک اُسے یہ سب بہت بُرا محسوس ہوا تھا۔ اُسے اپنا شوہر، اپنی بچی، سماج اور یہ دنیا سبھی کچھ بُرا محسوس ہوا۔ اس کے بعد وہ تجربات کے زخم کھا کر رفتہ رفتہ سب کچھ یوں بھول گئی کہ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ یادوں کے درد سے آزاد ہو کر اس نے پھر کبھی کتنی ہی بار گایا تھا "اے حسن والے . . . . " لیکن اتنے دنوں بعد معین نے پھر اسی درد کو جگا دیا تھا۔ اس کے دل میں آرزوؤں کے بجھتے ہوئے چراغ کی لَو اُکسا دی تھی۔ یہ درست ہے کہ ممتا نے بہت دنوں سے دوسروں کی آنکھوں میں اپنا عکس نہیں دیکھا تھا۔ نہیں، ریحان کی آنکھوں میں بھی نہیں اور معین نے جیسے اپنی آنکھوں میں اُسے وہی تصویر دکھا دی تھی۔

گانا ختم ہو گیا۔ گانا ختم نہیں ہوا بلکہ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں لے کر ممتا ماضی کے اندھیرے سے حال کی دنیا میں لوٹ آئی، اجرت کا چیک ملتے ہی اس نے اپنے حواس درست کئے، ابھی وہ گھر نہیں جائیگی۔ آج کے دو پروگراموں کا چیک کسی دوست کو دے کر نقد روپیہ لینا ہوگا۔ اس کے بعد نیو مارکٹ جائے گی۔ ریحان کے جسم پر درست کپڑے بالکل نہیں ہیں، اس کے لئے ایک ریڈی میڈ ہوائی شرٹ اور خود اپنے لئے ایک جوڑا سینڈل اسے اسی وقت خریدنا تھا، اس کے بعد وہ ریلوے کے سگنل کی سرخ روشنی جلنے کے وقت گھنے اندھیرے میں اس کی روشنی تیز ہونے سے پہلے ہی آج پھر زندگی کی خوبصورت آرزوؤں کے چراغ جلائے گی۔ اس سے بھی زیادہ روشن، اس سے بھی زیادہ جاذبِ نظر۔

خرید و فروخت کے بعد جوں ہی وہ اپنے گھر کے قریب آئی، اس کی بچی دوڑ کر "ماں، ماں" کہتی آئی۔

ممتا نے بچی کو گود میں اُٹھا لیا اور پوچھا "بابا کو تعلیٔے چھوبی ہے"؟

"بابا؟" چار سال کی بچی چند منٹ تک سوچتی رہی۔ اس کے بعد بولی "گھومنے گئے ہیں۔"

"گھومنے؟" ممتا کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔ ریحان تو گھومنے نہیں جاتا تھا اور گھومنے جاتا بھی تو کہاں جاتا؟ جو دن بھر گھر میں بیٹھا اخباروں میں "ضرورت ہے" کے کالم میں اسامی تلاش کرتا اور درخواست لکھتا رہتا، وہ کہاں چلا گیا؟ جہاں بھی گیا ہو، اس کے جلد ہی واپس آنے کی امید تھی۔ اس نے اپنے فکر آمیز خیالات کو جھٹک دیا اور اپنے متعلق سوچنے لگی۔

گھر میں ڈریسنگ ٹیبل نہیں تھا۔ نہ سہی۔ بکس سے بڑا سا آئینہ نکال کر ممتا پلنگ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی، معین نے جھوٹ نہیں کہا تھا تیس سال کی عمر ہونے کے باوجود اس کے جسم میں فربہی نہیں آئی تھی۔ عمر سے کوئی شکن نہیں پڑا تھا اور رنگ ذرا بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ اب بھی وہی پیلا رنگ تھا اور مخمور جوانی تھی، اس پر جب اس نے سرخ ٹیکہ لگایا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سگنل کی وہی گہرے سرخ رنگ کی روشنی ٹیکہ کی شکل میں اس کی پیشانی پر جگمگا رہی ہو۔

ریحان گھر میں داخل ہوتے ہی حیران ہو گیا، تھوڑی دیر تک حیرت سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے پوچھا: "تم کہیں جاؤ گی کیا؟"

"ہاں، تمہارے ساتھ گھومنے۔" ممتا خوشی سے کھل اٹھی، بچی کو اپنی پیٹھ کی طرف ہٹا کر قریب آئی اور بولی "یہ لو، اس پیکٹ کو کھول کر شرٹ پہن لو، استری کیا ہوا پتلون بکس میں ہے، میں نکال دیتی ہوں، بچی کا فراک میں بدل دیتی ہوں۔"

لیکن ریحان کے چہرے پر مسرت کی کوئی لکیر نہیں اُبھری، بلکہ اس پر ہلکی سی پشیمانی جھلک رہی تھی۔

ممتا کو دیکھ کر دکھ ہوا۔ اس نے کہا "تم اس طرح کیوں کھڑے ہو؟ گھومنے نہیں جاؤ گے کیا؟"

ریحان کچھ سہمے سہمے سے انداز میں ہنسا "جاؤں گا، لیکن آج میں نے تمہارے ساتھ ناانصافی کی ہے ممتا۔"

"کیا ناانصافی؟"

"تم نے اس دن معین سے جھوٹ بولنے کو کہا تھا، لیکن میں نہ کہہ سکا۔ سچی بات ہی کہہ آیا ہوں۔"

ممتا سیدھی کھڑی ہو گئی "معین تمہیں کہاں ملا؟"

"ورائٹی بوٹ پالش کے دفتر میں"۔ ریحان نے آہستہ آہستہ ممتا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، بولا "تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا ممتا! کئی دنوں سے

ملازمت کے چکر میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا، اخبار میں اشتہار دیکھ کر آج سویرے ڈرائٹی کے دفتر میں گیا تھا، انہیں خط و کتابت کرنے کے لئے ایک انگریزی داں مینیجر کی ضرورت ہے، اچھی تنخواہ دیں گے، اچھا خاصا کاروبار ہے ان کا۔ وہاں دیکھا معین بیٹھا ہوا ہے، وہ ان کو ڈیزائن بنا کر دیتا ہے۔ بے چارہ باپ، ماں کی بے وقوفی سے آرٹ اسکول میں داخل نہ ہو سکا۔ اب بوٹ پالش، سر کا تیل، خواب میں بشارت دی ہوئی دوا کے بکس اور شیشیوں کے لیبل کا ڈیزائن بنا کر پیسے کماتا ہے۔ میں ان دنوں بیکار ہوں۔ یہ جان کر اس نے ملازمت دلانے کے لئے میری بڑی سفارش کر دی ہے۔ ابھی میں وہیں سے تو آ رہا ہوں۔"

نہ جانے کیا سوچ کر ممتا کے سنجیدہ چہرے پر بشاشت آگئی، اُسے یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی کہ آج صبح کے اسی واقعہ کی وجہ سے شام کے وقت معین اس کے ساتھ اس طرح ملا تھا۔ وہ یقینی طور پر سمجھ چکا ہے کہ وہ نہ ایک سرے سے بہتر اور نہ کمتر بلکہ ایک ہی سطحِ زندگی پر اُتر آئے ہیں۔ اسی لئے ریحان کو اوٹ میں رکھ کر معین نے اس طرح بات کی تھی جیسے وہ حقیقتِ حال سے واقف ہے۔ اس نے اپنی حالت بھی بلا جھجک ظاہر کر دی تھی، حالانکہ پہلے دن جب معین کے ساتھ اسکی ملاقات ہوئی تھی، اور وہ ہاتھ میں تھیلی اور پیکٹ لئے ہوئے تھا وہ بھی شرمایا ہوا تھا۔

جب ممتا کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، وہ شوہر کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور بولی "تم نے سچ سچ بتا دیا، اچھا کیا۔ اس دن میری عقل خراب ہو گئی تھی، اسی لئے کہہ دیا تھا، ورنہ معین سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ریحان نے اطمینان کی سانس لی اور خوش ہو کر ممتا کے گالوں کو تھپتھپا کر پوچھا "ملازمت قبول کر کے میں نے اچھا کیا نا، کیا خیال ہے؟"

ممتا نے ایک چھوٹی بچی کی طرح سر ہلایا "ہاں، چلو، اب گھومنے جائیں۔"

"کہاں جاؤ گی؟"

"معین کے یہاں میں نے اس کے گھر کا پتہ حاصل کر لیا ہے۔"

دو منٹ قبل ممتا کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی لیکن اس وقت اسے ایسا لگا جیسے یہ جواب وہ پہلے سے تیار کر چکی تھی۔

معین گھر پر موجود تھا۔ بیوی، بچے اور بچیوں کے درمیان گھرا ہوا وہ خوش خوش کوئی کہانی سنا رہا تھا۔ ریحان اور ممتا کو دیکھ کر بولا "ارے آؤ، آؤ۔ زہے نصیب! نیلوفر ان کا استقبال کرو۔"

"مجھے دیکھ کر تو تمہیں استقبال کا خیال نہیں آیا" ممتا نے کہا۔

"ارے نہیں، نہیں۔ ان لوگوں سے پوچھ لو۔ ابھی ابھی تمہارے گانے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں، رکشا سے اترتے ہی ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر میں نے تمہارا گانا سنا۔ تمہاری آواز بھاری بھاری معلوم ہو رہی تھی، شاید تمہیں سردی لگ گئی ہے، دو گولی ایسپرو کھا لیتیں۔"

ممتا ہنسنے لگی اور معین کی بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "تم اپنی ڈاکٹری رہنے دو۔ میں تمہارے یہاں کیوں آئی ہوں، جانتے ہو؟ گھومنے نہیں۔"

"تو پھر؟"

دو تین بچوں کی ماں ڈھیلے ڈھالے جسم کی نیلوفر کو ممتا نے اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا "اسے دیکھنے آئی ہوں، بہت دنوں سے اسے دیکھنے کی خواہش تھی اور......"

نیلوفر نے شرما کر اس کی بات پر ٹوکتے ہوئے کہا "ٹھہریئے میں بتاتی ہوں۔"

ممتا چپ نہیں ہوئی۔ اس نے کہا "اور تمہاری بنائی ہوئی تصویریں دیکھوں گی، لاتعداد تصویریں، جنہیں دیکھ کر یہ احساس ہو کہ زندگی میں کتنے سارے انوکھے رنگ ہیں، زندگی کتنی خوبصورت ہے۔" اتنے دنوں میں یقیناً تم نے بہت ساری تصویریں بنائی ہوں گی۔"

معین نے چونک کر کہا "تصویریں؟"

ممتا نے سر ہلایا "ہاں تصویریں۔ بچپن میں تم کہا کرتے تھے نا، یاد نہیں، زندہ رہنے کے لئے خواہ میں کوئی کام کیوں نہ کر دوں، گھر میں بیٹھ کر بہت ساری تصویریں بناؤں گا۔ خوبصورت تصویریں، جنہیں دیکھ کر زندگی کی خوبصورتی کا احساس ہوگا۔"

معین چند لمحے سنجیدہ رہا۔ پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے کہا "ہاں، ہاں، یاد آیا، گھر میں بیٹھ کر میں نے ضرور تصویریں بنائی ہیں، لاتعداد تصویریں۔ واقعی بڑے انوکھے رنگ روپ ہیں ان کے، لیکن ان کا موضوع ذرا تبدیل ہو گیا ہے ممتا، آؤ دیکھو گی؟"

معین دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ممتا، نیلوفر اور ریحان تھے۔ چیل کے گھونسلے کی طرح چھوٹا سا کمرہ

باقی صفحہ ۵۴ پر

فکاہیہ

"ایک ہنگامہ پہ…!"

اشرف صبوحی

بہن جوں توں کر کے ریل کا سفر تمام ہوا اور ہم آگرے سے خیریت کے ساتھ دہلی میں خالہ جان کے گھر جا اترے۔ خالہ جان منتظر تھیں بھینچ بھینچ کر گلے ملیں، بلائیں لیں: یوسف کو پیار کیا اور دو چار باتیں کرنے کے بعد کہنے لگیں: "بیٹی رات بہت آ گئی ہے۔ کھانا تو تم نے رستے میں کھا لیا ہوگا۔ بھلا منہ جھٹلانے کا یہ کونسا وقت ہے، اب سو رہو۔ میاں شمن سے بھی میں نے کہہ دیا ہے وہ باہر اپنے خالو کے پاس آرام کریں گے۔ صبح اللہ خیر رکھے کھانا پینا جو چاہے سو کرنا۔ دلہن کو تمہارے دیکھنے کا بڑا چاؤ تھا۔ نیند کی دکھیا ہے۔ عشاء تک تو تمہاری راہ دیکھتی رہی اب یہ سارا دھندا تم ہی دونوں مل جل کر کروگی۔ میں تو گھر کا کوڑا ہوں۔ مجھ سے ہاتھ پاؤں ہلائے جلتے نہیں۔ لو جاؤ جہاں جی چاہے سو رہو۔ آرام تو مٹی زمین پر ملے گا۔ خوب پیر پسار کر سوؤ گی۔ ننھا بھی تمہارے پاس ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ تو ایک جھلنگے پر لیٹ کر خراٹے لینے لگیں، میں حق حیران۔ پرایا گھر، بیں انجان جس طرف دیکھتی ہوں پڑا ڈھیرا ہوا ہے۔ نہ کمر ٹکانے کا ٹھیک نہ بیٹھنے کی جگہ۔ بچہ الگ اونگھنے لگا۔ آخر رات تو کسی نہ کسی طرح بسر کرنی ہی تھی۔ دالان کے آگے بستر ڈال پڑ گئی۔ اور دل میں سوچتی رہی کہ یا اللہ کس عذاب میں آ گئی۔ دو چار دن رہنا ہے کیوں کر گزرے گی۔

آدھی رات کے بعد تو پہنچے ہی تھے۔ تین چار گھنٹے کروٹیں لیتے لیتے اور گزر گئے۔ صبح ہوئی تو بڑی پریشانی، بچے کے موت کے رات بھر کے بھرے ہوئے کپڑے۔ نہاؤں تو کپڑے بدلوں۔ حاجتی کی تلاش ہوئی، لوٹا نہیں ملتا۔ بڑی مشکل سے ایک بدھنی ملی۔ پانی بھرنے کے لئے کوئی آبخورہ نہیں۔ مٹکے کھلے ہوئے۔ ضرورت تھی، مٹکے کو الٹنا چاہا — بڑی گول تھی سنبھل نہ سکی۔ بھڑ سے گھڑ دنچی پر سے نیچے آ رہی۔ آواز جو ہوئی تو خالہ جان کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے دیکھ کر اور تو کچھ کہہ نہ سکیں صرف اتنا کہا "شاباش بیٹی شاباش! اچھا سگھڑاپا کرنے آئی ہو۔ دو پکے گول ہی توڑ دی"۔

میں چپ خطاوار تھی کیا کرتی۔ شرمندہ شرمندہ پاخانے گئی اور الٹے پاؤں چلی آئی۔ اول تو ڈیوڑھی میں پاخانہ۔ اندھیرا ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ دوسرے سڑاند ایسی کہ جی متلا گیا۔ اتنے میں خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ بچے عورتیں جاگ گئی تھیں۔ چھوٹے سے صحن میں کوئی بچے کو فراغت کرا رہی ہے تو کوئی منہ دھو رہی ہے۔ ایک طرف بھیڑا بندھا ہوا ہے۔ مرغیاں ہیں کہ یہاں ہگ گئیں وہاں جا کر بیٹ۔ غرض کیا بتاؤں کہ گھر کا کیا ہڈرا تھا۔ آج ہی شام کو گھوڑی چڑھنی تھی، مہمان آنے شروع ہو گئے۔ ڈولیاں تانگے اترنے لگے۔ ایک غل ایک شور۔ ڈولی والے کرائے کے لئے کواڑ توڑے ڈالتے ہیں۔ تانگے والے چیخ رہے ہیں لیکن کوئی نہیں سنتا۔ خالہ جان اپنے جھلنگے پر بیٹھی ہیں۔ پٹاری کھلی ہوئی ہے۔ پان پہ پان بن رہے ہیں۔ گویا ان کے کان میں آواز ہی نہیں جاتی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا "خالہ جان! کہاروں اور تانگے والوں کا کرایہ تو بھجوا دیجئے"۔ اس پر انہوں نے جھلا کر کہا۔ اِن جوانا مرگوں کو تو بھونکنے کی عادت ہے۔ ذرا چھری کے تلے دم نہیں لیتے۔ آتے دیر نہیں ہوتی کہ سر پر سوار ہیں۔ اے کریمن جا ذرا دلہن کو تو دیکھ وہ اٹھی ہوں تو کہہ دے کہ ڈولیوں کا کرایہ دے دیں۔

بھاوج سے ملنے کا مجھے بھی اشتیاق تھا۔ دوسرے یہ سمجھتی تھی کہ ہم عمر ہونے کے سبب دل بہل جائے گا۔ کریمن کے ساتھ میں بھی چلی۔ کوٹھے پر جا کر کیا دیکھتی ہوں کہ دس بجنے کو آئے ہیں۔ گرمی کا موسم ہے۔ تمام صحن میں دھوپ بھر گئی ہے اور دلہن بیوی پڑی سنا رہی ہیں۔ رات کو جو پان کھایا تھا وہ منہ میں ہے۔ باچھوں سے رال بہہ کر گلے شانے تکیے اور چادر تک آ گئی ہے۔ مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں — کریمن پڑوس کے ایک ٹھیلے والے کی بیوی ہے۔ شادی میں ہاتھ بٹانے کے لئے آئی ہوئی ہے اس نے پاس جا کر ہلکے سے کہا:

"بہو اٹھو نا دیکھو کیتا دن آگیا"۔

بہو نے ادہنہ کی اور کروٹ لے کر پھر سو گئیں۔ میں نے کہا لاؤ میں گدگدیاں کر کے اٹھاؤں۔ اسی بہانے سے جان پہچان بھی ہو جائیگی۔ یہ سوچ کر آگے بڑھی اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر دوپٹہ منہ سے ہٹایا ہی تھا کہ دلہن بھبک کر بولیں۔ "شغتل تو ہے کون؟ لو اور سنو میرے پلنگ پر کس مزے سے بیٹھی ہے۔ ایسی لات ماروں گی نیچے جا پڑے گی"۔

کریمن بولی "ہا بہو! یہ تو کسے شغتل بنا رہی ہے۔ جانے بھی ہے یہ کون ہے؟ رات آگرہ سے یہی تو آئی ہے"۔ بہو صاحبہ جھینپی جھینپی اٹھیں اور پاؤں لٹکا کر زمین پر بیٹھ گئیں۔ میں نے کہا "بھابی! پھر رات آئے گی سو رہنا۔ اب تو ہشیار ہو جاؤ۔ نیچے چلو خالہ جان پریشان ہیں۔ مہمانوں کا تانتا لگا ہوا ہے"۔

بہن آپ کہیں گی کہ ان کا کنبہ تو بڑا نامی گرامی ہے۔ یہ خالہ کیسی نکل آئیں جو نہ شریفوں میں نہ رذیلوں میں۔ روپیہ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے مگر ان کے ڈھنگوں پر کیا پھٹکی پڑ گئی۔ بڑی بات یہ ہے کہ اماں جان اور خالہ اماں دونوں سگی بہنیں دونوں نے ایک ہی پیٹ میں پاؤں پھیلائے دونوں مرزا اسفندیار بیگ بادشاہی میر شکار کی بیٹیاں۔ غدر کی ہلچل میں گھر برباد ہو گیا۔ سارے مردوں کو پھانسیاں مل گئیں۔ کوئی سر دھرا رہا نہیں۔ شہر میں امی جمی ہوئی تو نانی اماں نے جوان بیٹیوں کا سر ڈھانکنا چاہا۔ عورت ذات پھر مفلسی اور لاوارثی جتنی ان کے اختیار میں تھی چھان بین کی۔ لیکن صرف اوپر کی ٹیپ ٹاپ دیکھی۔ اصل کو دیکھا اور ڈھنگوں کو نہ دیکھا۔ سچ تو یہ ہے قسمت کا کوئی ساتھی نہیں۔ اماں جان کی شادی ان کے والد سے کر دی جو کسی مسجد میں بچے پڑھاتے تھے۔ مگر گھر کا چلن شریفانہ تھا۔ خالہ اماں کا بیاہ علی حسین خاں سے ہوا۔ اس وقت ان کے ہاں خاصی دولت تھی۔ نواب کہلاتے تھے۔ نانی اماں جہاں خوش تھیں کہ ایک بیٹی اگر ملا کو گئی تو دوسری کو تو خدا نے پروان چڑھا دیا۔ وہ بیچاری اگلے وقتوں کی بھولی بھالی بیوی یہ کیا جانتی تھیں کہ نباہ کے لئے چال چلن ہی اچھا ہونا چاہیئے دولت تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے جس طرح آتی ہے اسی طرح اڑ بھی جاتی ہے۔ دوسرے مرد جب تک خود نہیں کماتا اس کو باپ دادا کی کمائی کی قدر نہیں ہوتی۔ تو بہن ہم نے دیکھ لیا کہ ابا جان کا گھر مرتے دم تک بنا رہا آبرو میں آبرو اور روٹی میں روٹی۔ خالو ابا نے پہلے تو خوب گلچھرے اڑائے تین چار برس دن عید اور رات شب برات رہی۔ اس کے بعد جو نوبت آئی ہے تو اللہ دشمن کو نہ دکھائے۔ گھر کا زیور بکے۔ فاقے ہونے لگے۔ آخر پیٹ کی خاطر ڈھلیئے کا کام سیکھا اور اب میاں علیا ڈھلیئے کہلاتے ہیں۔

لیکن بہن یہاں تک بھی کچھ نہیں گیا تھا۔ پیشہ حبیب اللہ۔ اپنی محنت مزدوری کرتے تھے کوئی برا کام تو کرتے نہ تھے۔ غضب تو یہ ہوا کہ پیشے والوں میں رہ کر انہوں نے ساری خو خصلت بھی پیشے والوں ہی کی لے لیں۔ باپ دادا کی کوئی ادا نہ رہی۔ اور رہے کیوں کر دہی نتھو خیرا ان کے ہمجولی تھے۔ اسی قسم کے موئے لنگوٹی بندوں میں بیٹھک اٹھک تھی۔ انہیں کے ساتھ کھانا پینا یہاں تک کہ لڑکے لڑکیوں کے بیاہ بھی انہیں لوگوں میں ہوئے۔ اور اب انہیں نواب احمد حسین کا بیٹا کوئی نہیں جانتا۔ سب پشتینی ڈھلیا سمجھتے ہیں۔ سمجھیں کیوں نہیں۔ زبان ایسی پھوہڑ ہو گئی ہے کہ بغیر گالی بات نہیں کرتے۔ کپڑوں کی حالت دیکھو تو ٹھیٹھ ہتھوڑا مار۔ نہ بھلے مانسوں کی صورت رہی نہ سیرت۔ تعجب تو یہ ہے کہ خالہ جان کی بھی ساری عادتیں بدل گئیں۔ صرف ایک مٹھو سا بنی پلنگ پر بیٹھی رہنے اور پان چبا چبا کر در و دیوار پر پیک کی پچکاریاں مارنے کے پوری بہاروں کی چودھرن معلوم ہوتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ امیر بیگم کی بیٹی ہیں۔ گھر کیا ہے کباڑیئے کی دکان۔ اجڑی ہوئی سرائے۔ غضب خدا کا بچے کو گھوڑی چڑھا رہی ہیں۔ شادی ہو رہی ہے اور دالان میں ایک پھٹی ہوئی دری کے سوا جس پر منوں کوڑا پڑا ہوا ہے چاولوں کے دانے، روٹی کے ٹکڑے چپکے ہوئے ہیں۔ نہ فرش ہے نہ فروش۔ دیواریں کتنے چونے کے دھبوں سے مومی چھینٹ بنی ہوئی ہیں۔ رات کے کھانے کا پتیلا انگنائی میں قلابازیاں کھا رہا ہے۔ کتے چاٹ رہے ہیں۔

خیر بہن تھوڑی دیر میں دلہن بیوی لال جوڑا پہن بن سنور کر تشریف لائیں اور آتے ہی پیچھے سے میری کولی بھر لی "بھابی! تو نے سویرے سویرے مجھے کچی نیند سے اٹھا دیا اب بتا میں تیرا کیا درجہ کروں"۔ میں یک ڈک کہ سبحان اللہ کیا پاک زبان ہے اور کیسی بے تکلفی۔ غصہ تو بہت آیا مگر جھوٹ موٹ کی ہنستی صورت بنا کر کہا۔ "دلہن تم نے بھی تو مجھے گالیاں دے لیں"۔ وہ بولی "چلو ہم تم برابر ہو گئے"۔

"دلہن رات سے میرے تو منہ میں پھپھوندی لگ گئی ——
کس سے بات کرتی؟ خالہ جان کو فرصت نہیں اور دوسرا ایسا کوئی ہے

جو مجھے پوچھے"۔

"اے ہے! یہ موئی رذالیں بھی بولنے کے قابل ہیں۔ میں تو ان کے منہ پر جوتی بھی نہ ماروں"۔

میں نے دل میں کہا کہ غالباً یہ کسی اچھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ یہاں کا ڈھنگ دیکھ کر بد مزاج ہو گئی ہے۔ اس کا ناک نقشہ اور نازک جسم دیکھ کر مجھے یقین تھا کہ جیسی اس کی صورت اچھی ہے ایسی ہی اسکی تربیت بھی اچھی ہو گی۔ ہاں طبیعت میں چبلا پن ذرا ضرورت سے زیادہ ہے۔ بہو کو سسرال میں اتنا ہنسوڑ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ رائے قائم کر کے میں بولی۔" دلہن تم سے مل کر تو میرا جی خوش ہو گیا۔ ورنہ یہ شادی تو مجھے خفقان پیدا کر دیتی"۔

بھابی! یہ کوئی شادی ہے۔ کوڈوں کی برات اتر رہی ہے۔ قطب صاحب کی چھڑیوں کا میلا ہے"۔

میں نے یہ خیال کر کے کہ دلہن کے میکے والے معقول آدمی ہوں گے وہ آجائیں تو دو چار شریف صورتیں تو دکھائی دیں۔ پوچھا "دلہن، تمہارے ہاں سے ابھی تک شاید کوئی نہیں آیا۔ ان گو بہ کے چوتھوں کو دیکھتے دیکھتے تو گھن آنے لگی۔ مگر بوا بران تمہارا وہ آئیں گی تو بیٹھیں گی کہاں؟"

" اب آتی ہی ہوں گی۔ اور بھابی بیٹھنے کا کیا ہے۔ برادری میں بیٹھنے اٹھنے کی شکایت نہیں ہوا کرتی"۔

برادری کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں اسے کھولنا چاہتی تھی کہ اتنے میں" بھابی وہ آگئیں" کہتی ہوئی وہ دھبڑ دھبڑ کرتی ہوئی کوٹھے سے اتری۔ میں نے جو اوپر سے جھانکا تو دیکھتی کیا ہوں کہ ایک کالی بھینس چلی آتی ہے۔ موٹا موٹا سیتلا سے خراب چہرہ، چپٹی ناک، گردہ سے ہونٹ۔ ٹھوڑی لمبی۔ سر پر لال قند کا دوپٹہ جس میں اودی گوٹ۔ گلے میں بابرلیٹ کا روپہلی ٹھپہ لگا ہوا کرتہ۔ پانچ بچے ساتھ چھٹا پیٹ میں۔ ٹانگوں میں کالی چھینٹ کا پاجامہ۔ اُلٹی نوک کی جوتی۔ بیسیوں قسم کے ہاتھ پاؤں بازو گلے میں زیور مگر سب میلے اور گھسے ہوئے۔ ان کے بعد ایک اور بیگم اتریں۔ یہ ماشاءاللہ سے سورج مُکھی تھیں۔ گول رفیدہ سا چہرہ۔ تنگ پیشانی سکے پر ایک بڑا سامنہ کالے کالے دانت جیسے شریفے کے بیج۔ کرنجی آنکھیں، غدر پہلے کا سبز کاہی بنارسی دوپٹہ۔ ہر رنگ چرسیں پڑا سر پر۔ جاپانی ریشم کا بڑے بڑے بوٹوں والا کرتہ گلے میں۔ پشت پر چکنی اور میلی چوٹی کا پورا نشان۔ تنگ موری کا چوڑی دار گلبدن کا پاجامہ۔ ایک تین چار برس کی لڑکی نے ان کا پاجامہ اس خوبصورتی سے پکڑ رکھا تھا کہ آگے سے ناف کی ملگجی سلوٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔

ان کے پیچھے اور بھی اسی نمونے کی کئی بیویاں رونق افروز ہوئیں۔ انہیں دالان میں بٹھانے کے بعد دلہن بیگم نے بڑے ٹھک کر مجھے آواز دی۔" بھابی — اے بھابی کیا سو گئیں۔ ارے بی آؤ۔ میرے میکے والیوں سے تو ملو"۔

میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا کہ اے تیری قدرت یہ تو آوا کا آوا ہی ایسا ہے۔ دلہن بھی اسی دکان کی گجری ہیں مگر اتفاق سے ذرا رنگ روغن اچھا ہو گیا ہے۔ دلہن گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھیں اور میرا نیچے اترتے ہوئے دم فنا ہوا جاتا تھا کہ اس اثنا میں بچوں نے دنگا شروع کر دیا۔ ایک نے محلے میں پتھر پھینکے۔ دوسرے نے مٹکوں میں ہاتھ گھنگول دیئے۔ کسی نے کسی بچے کو مارا کسی نے کسی کو کاٹ کھایا۔ برف والے۔ لونگ چڑے والے کچالو والے بیٹھے ہیں۔ چاٹ اڑ رہی ہے ایک خنگرا خاصا آٹھ نو برس کا اپنی ماں سے کہہ رہا ہے کہ" لا سسری پیسہ دے برف کھاؤں گا"۔ اس نے ایک دو ہتڑ رسید کیا" جا اپنے کانڑے باوا سے مانگ"۔ وہ باہر ہو گا میری چھاتی پر کیوں چڑھا آتا ہے"۔ ایک لڑکے نے کسی بیٹھی ہوئی لڑکی پر کلی کر دی۔ اس کی ماں بولی۔" کیوں رے نامراد کیا ماتھے کی پھوٹ گئیں جو لونڈیا کو نہلا دیا"۔ اس نے تن کر جواب دیا۔" چپ رہ کتیا"۔ اور اپنی ماں سے کہا۔" دیکھتی ہے یہ کلی کی ماں مجھے نامراد کہہ رہی ہے"۔ ماں تنک کر کھڑی ہو گئی۔

" تھوتھنی مسل اپنے رہوں سہوں کی"۔

" اری شتا کہیں کی —— کچھ اور سنے گی میرے منہ سے! تو اور میرے رہوں سہوں کو پٹنے"!

" چپ بے شرم قطامہ"۔

اب کیا تھا کچھ ایک طرف ہو گئیں اور کچھ دوسری طرف سے بولیں۔ بہن ایسی خرافات بکی گئی کہ میں تو کانوں میں انگلیاں دیکر خدا کو یاد کرنے لگی۔

یہ بم چخ بڑی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ نفیری والوں نے دروازے

پر آکر شادیانے کی لَے نکالی۔ انگریزی باجے والوں نے باجہ شروع کیا۔ ادھر کسی نے باہر سے آواز دی کہ دولہا کی ماں کو بھیجو۔ خالہ جان جو گھبرا کر کھڑی ہوئیں تو پٹاری اُلٹ گئی۔ سارا کتھا، چونا، چھالیہ، زردہ ایک ہو گیا۔ ایک عورت نے دوسری کو دھکّا دیا وہ مٹکوں پر گری۔ ایک جو اٹھیں تو سر سے ٹکرا کر طوطے کا پنجرہ گرا۔ کتّے نے طوطے پر جھپٹا مارا۔ بھیسڑا کھل گیا۔ طوطے کی ٹیں ٹیں اور بھیڑے کی اچھل کود۔ چھوٹی کچی انگنائی میں کیچڑ۔ اللہ تیری پناہ۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔ تھوڑی دیر میں غل مچا کر دولہا کا گھوڑا آ گیا۔ دولہا میاں چلے۔ دھوپ چھاؤں کی اچکن۔ سرخ مشروع کا پاجامہ۔ لال تار بافی مُنڈا سا اس پر سہرا بندھا۔ پہلے ایک مردوا اُچک کر گھوڑے پر بیٹھا پھر دولہا کو چڑھا دیا۔ اس مردوئے کے پیچھے ایک عدد لڑکی کو بھی چڑھا دیا۔ دُبلا پتلا کسی تانگے کا ٹٹو اور یہ چھوٹے بڑے تین عدد۔ بیچارے کی کمر دوہری ہوئی جاتی تھی۔ اب گھوڑی چلی۔ آگے تاشے والوں کی برادری، پیچھے ایک ٹھگنے سے قد کا مردوا تھر کنے لگا غور سے جو دیکھا تو اس کے ہاتھ میں دو پیتل کے کٹورے تھے۔ انہیں ڈھول تاشے والوں کی لَے میں بجا رہا تھا۔ اس کے پیچھے انگریزی باجے والے۔ چھوٹی لال لال وردیاں پہنے اپنے اپنے باجے بجا رہے تھے۔ سب سے پیچھے دولہا کے گھوڑے کے منہ سے منہ ملائے نفیری والوں کی ٹولی تھی۔ خدا جانے نفیری بجانے میں کتنا زور لگانا پڑتا ہے کمبختوں کا چہرہ لال ہوا جاتا تھا۔ ایک جو سب سے آگے ذرا بنا ٹھنا سا تھا اس نگوڑے کی تو بُری گت تھی۔ گلے پھول کر کُپّا بن گئے تھے۔ آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ مُواد اُبھرا جاتا تھا۔

لوگ جھوم رہے تھے۔ نفیری والے کو بیلیں دے رہے تھے اور میں کوس رہی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ بپتا پھٹ۔ ڈھول ڈھماں ٹیں ٹیں اور پیں پیں دور ہوئی اور محلّے والوں کے کان ٹھنڈے ہوئے لیکن بہن آوازوں کا یہ طوفان۔ اور قیامت کا یہ ہنگامہ پورا غارت تھوڑی ہوا تھا۔ ذرا سی دیر کے لئے ٹل گیا تھا۔ کوئی گیارہ بجے جامع مسجد میں قدم شریف کو سلام کرا کے ٹھہرتے ٹھہراتے گشت لگاتے واپس آئے تو پھر وہی آفت تھی۔ اب کے تو باجے والوں نے اپنی جانیں ہی توڑ کر رکھ دیں۔ میں تو حیران تھی کہ نہ ان نگوڑوں کے ہاتھ ٹوٹتے ہیں نہ کان پھٹتے ہیں نہ ان کے باجوں پر بجلی گرتی ہے۔ نہ موؤں کا منہ تھکتا ہے۔ خیر یہ مصیبت تو ٹلی۔ اب غل ہوا کہ کھانا کھلاؤ۔ باہر کی تو مجھے خبر نہیں کہ وہاں کیا ہوا ہوگا۔ اندر کی کیفیت کیا سناؤں۔ نہ دیکھی تھی نہ سنی۔ آج تک خیال سے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔

دسترخوان کہاں تھا جو بچھایا جاتا۔ اور ہوتا بھی تو بچھتا کن کے آگے۔ ڈھور ڈانگروں کے آگے۔ بس یکایک خالو جان نے ڈیوڑھی پر آکر کہا: "ارے روٹی بھی کھاؤ گے یا گانے بجانے ہی سے پیٹ بھرو گے۔ بارہ بجنے کو آئے روٹی ٹکڑے کا ہوش نہیں۔ برادری والے سمدھیانے والے آخر سب ہی ہیں۔ ان کا بھی خیال نہیں۔"

اور تو سب ڈھولک میں لگے ہوئے تھے دلہن چھپا کے سے ڈیوڑھی پر پہنچیں اور بولیں۔ "اماں جان تو درد کے مارے اوندھی پڑی ہیں۔ انہیں تو دین دنیا کی خبر نہیں۔ سارے مہمان بلوں بلوں کر رہے ہیں۔ بچّے بھوکے سو رہے ان کی جوتی کی نوک سے۔ اب تم اتنی رات گئے پوچھنے آئے ہو تو جلدی بھیجو۔ لال روٹیاں بھی پکوائی ہیں نا۔ میرے والے تو لال روٹی کے سوا ٹکڑا انہیں توڑتے۔"

"لال روٹیاں نہ پکواتا تو میری ناک بھی منہ پر رہتی۔ ساری عمر برادری کی جوتیاں کون کھاتا۔"

"اچھا تو اب جلدی بھیجو۔ پھر ہمیں سہاگ گھوڑیاں گانی ہیں۔ ایک ڈھولکی کہیں سے منگا دو۔ جمیا والی اللہ ماری کی آواز کچھ جھوجھری سی ہے۔"

سالن کی دیگ اور دری میں لپٹی ہوئی روٹیاں آئیں۔ مٹّی کے ڈھوبروں میں سالن نکالا گیا۔ ایک ایک سفید اور ایک ایک لال روٹی آگے رکھی گئی۔ پانچ پانچ اپنا اپنا گروہ بنا کر بیٹھ گئیں اور لپڑ سپڑ کھانا شروع کیا۔ کوئی کہتی ہے کہ "موئی روٹی تو تانت ہے۔" کسی نے کہا کہ "بہو میرے پیالے میں تو ہڈیاں ہی ہڈیاں بھر دیں۔ نہ تار ہے نہ کوئی بوٹی۔" کوئی بولی۔ "اری ناک پکڑ کر غوطہ لگا۔" کسی بچّے نے بھوک کے مارے جلتی ہوئی ساری بوٹی منہ میں رکھ لی اور منہ کھول کر کہا۔ "آماں! آں۔" ماں نے اس کے منہ کے آگے ہاتھ لگا دیا۔ اور کہا۔ "ٹھور کیوں گیا تھا۔ تھوک دے!"

غرض اس ہڑبونگ میں کھانا ختم ہوا۔ پیالے اور روٹیوں کے ٹکڑے سمیٹے گئے۔ ایک عورت جو پیالے لے کر چلی تو اس کا پاؤں پھٹی ہوئی دری میں اُلجھا۔ پیالے ہاتھ سے چھوٹے اور برابر والی

عورت کے سر پر گرے۔ سالن کا لبدھڑا بالوں میں، چہرے پر اور ملانگے کے کپڑوں پر لتھڑ گیا اس کی چھینٹیں ایک دو کی آنکھوں میں جا پڑیں۔ غُل مچ گیا وہ کوسم کاٹا ہوا کہ سوئے ہوئے بچے جاگ اٹھے۔ اب کھانا کھا کر پالوں پر پلیں۔ چھلکے بھر بھر کر زردہ تھورا اور لپیٹ کر دیواروں پر پیک تھوکنی شروع کی۔ چھوٹا مکان مہانوں کی کثرت چاروں طرف پیک ہی پیک نظر آتی تھی۔ بہن وہ تو جب سے آئے تھے باہر تھے۔ خدا جانے ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ میں نے تو یہاں کا نہ پانی پیا نہ دانا کھایا۔ صبح کو یوسف سے چار آنے کی کچوریاں منگا کر دونوں ماں بیٹوں نے کھالی تھیں۔ دوپہر کو اپنے گھر کے پراٹھے اور کباب کھائے۔ کباب ذرا ذرا بُس تو گئے تھے۔ مگر یہاں کے کھانے سے پھر بھی اچھے تھے۔ جیتا رہے میرا یوسف پانی بھی وہ کہیں باہر ہی سے لاکر مجھے پلاتا رہا۔ رات کو بھی میں نے بازار کے کلیجی کے کبابوں پر گزارہ کیا۔ صبح کو ایک نے ایک کو جھنجوڑا۔ پھر غل غپاڑہ ہونے لگا۔ کچھ دیر سب نے مل کر برا بھلا گایا بجایا۔ گانا ہو چکا تو مہمان رخصت ہونے شروع ہوئے جو باقی رہے انہیں دوپہر کو رات کی بچی ہوئی روٹیاں اور سالن گرم کرکے کھلایا۔ چار وقت کے بعد خالہ جان کو سہاط ہوش آیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "بیٹی دیکھی تو نے ہمارے ہاں کی شادی۔ ہماری کیا اوقات ہے۔ کہنے کو مزدور ہیں۔ لیکن بچے کو ذرا سی گھوڑی چڑھانے میں سو روپے کے پھیر میں آگئے۔ پھر نام بھی کیسا ہوا ساری برادری سارا محلہ واہ واہ کر رہا ہے۔"

"خدا رکھے آگے کو کسی بڑی شادی میں آؤ گی تو بہار دیکھو گی۔ لال روٹی اور لیلین بادرچی کے ہاتھ کا سالن ایسا جوڑ ہے کہ دوسری جگہ نصیب نہیں۔ جو کھاتا ہے انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے۔ تو نے تو بیٹی خوب پیٹ بھر کے کھایا ہوگا۔ سچ کہیو کیسا تھا؟ رات کو بھی کھائیو۔ دلہن سے کہہ دوں گی وہ بچا کر رکھ دے گی۔"

اتنے میں ایک پڑوسن آگئی۔ خالہ جان تو اس سے باتوں میں لگیں اور میں نے یوسف کو بھیج چپکے سے انہیں بلایا۔ اور ان کے کان میں کہا کہ اب اگر اپنی اور میری زندگی چاہتے ہو تو آج ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔"

ان کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ بولے کہ خالہ اور خالہ کے گھر کو سلام میں نے جیسی حماقت کی اور تمہارا کہا نہ مانا اس کی سزا بھگتی۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ سبق بھی مل گیا کہ لڑکے لڑکی کا بیاہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔ اگر نانی اماں خالو جان کی دولت کے مقابلے میں ذاتی شرافت اور قابلیت کو مقدم سمجھتیں تو آج مرزا اسفندیار بیگ کے داماد اور علی حسین خاں کے بیٹے ڈھلیوں میں نہ ملے ہوئے ہوتے۔ خیر خدا کی مرضی۔ تم خاطر جمع رکھو۔ ریل کا وقت پوچھ آیا ہوں اور یہ دیکھو ٹکٹ بھی خرید لئے ہیں بس رات کو ریل میں اور صبح ہوتے اپنے گھر ہوں گے۔ ریل کا نام آتے ہی جیسے کالے سانپ نے پھنکار ماری۔ میرے پیٹ میں دھوئیں سے اٹھنے لگے مگر خالہ کے ہاں مہمان بن کر رہنے سے اب مجھے جہنم میں جانا بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ خالہ جان نے بہتیرا روکا خالو اتّا بگڑ گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہم سے آئندہ ملنے کی قسم کھالی۔ وہ ملیں نہ یا ملیں۔ ہم تو بہن شام ہوتے ہی تانگے میں سوار ہو اسٹیشن پہنچ گئے آج آگرہ آئے ہوئے آٹھواں دن ہے لیکن بہن ابھی تک اوسان درست نہیں!!

نذر الاسلام بقیہ ص۸

کی صفوں میں معرکہ آرا۔ اس نے حالات کے دھارے کا رُخ بدلنے کے لئے جان و دل کی بازی لگا دی اور اپنی آواز کی گھن گرج، اپنے بے پناہ جوش و خروش، اپنی بہادرانہ للکار، اپنے نعرۂ ھل من مبارز، اپنی طبعِ آتشیں سے اس نکراؤ و عملی جد و جہد کا ثبوت دیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ نذرل کی اہمیت محض یہ نہیں کہ اس نے حالات کا رخ موڑا بلکہ کس طرف موڑا۔ زبان، فکر اور موضوعات میں تبدیلی اور سنسکرت سے اسلامی زبانوں، خصوصاً اردو کی طرف رجوع درحقیقت زندگی کی تہوں میں ایک بنیادی انقلاب کا آئینہ دار تھا۔ یہ شعوری یا غیر شعوری طور پر، جو بھی سمجھ لیجئے، اقبال اور قائد اعظم کی نہج پر دو قومی تصور کی طرف رجوع تھا۔ وہ اسلامی احساس جو ہر فرزندِ توحید کی طبعِ ثانیہ بن چکا ہے۔ آخر کار ابھرا اور پورے زور سے ابھرا۔ ایک خوابیدہ کوہ آتش فشاں کا تند و تیز لاوا بن کر اور تمام میدانِ حیات پر چھا گیا۔ یہی احساس تھا جس نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں بھی ایک نیا شعور اور نئی لگن پیدا کر دی اور وہ تاریخ کے میدان میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اور اسے نذرل کی سب سے بڑی کامیابی سمجھنا چاہئے۔

لیکن اس کی کامیابی کی حد محض یہ نہیں۔ اس کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھتا ہے۔ ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ ایک حقیقی انقلابی، جو فکر اور جذبہ و احساس کا جامع ہو، کبھی وقتی ہنگاموں میں گم ہو کر نہیں رہ جاتا۔ اس کا یہ اثر دائمی ہوتا ہے، مسلسل ہوتا ہے وہ ملت کے دل و دماغ میں ہمیشہ کار فرما رہتا ہے۔ آج بھی اس شیدائی انقلاب، اس مردِ مجاہد کی آتشیں روح تمام افرادِ ملت کے سینوں میں شعلہ زن ہے خواہ وہ مشرقی پاکستان میں ہوں یا مغربی پاکستان میں۔ ہمارا موجودہ انقلاب کیا ہے؟ اقبال، نذرل اور قائد اعظم ہی کے جذبہ و جوش کا تازہ ترین مظہر اور قوم اب بھی ان سب کی آتشیں شخصیتوں ہی سے حرارت حاصل کرتے ہوئے میدان حیات میں نہایت سرگرمی اور تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نذرل جسمانی حیثیت سے لاکھ آتشِ خاموش سہی لیکن درحقیقت آتش خاموش نہیں، وہ ایک خوابیدہ کوہِ آتش فشاں ہے جو برابر اپنی بیداری اور بے پایاں حرارت کا ثبوت دے رہا ہے اور دیتا رہے گا۔

غزل

وشوا ناتھ درد

جو نہ گزری تھی وہم و گماں سے
اُن سے کبھی پڑی وہ زباں سے

سُن تو لی ہے مگر کیا بتاؤں
تم نے آواز دی کس جہاں سے

ایسی دوری نہ تھی دو دلوں میں
فاصلے آ گئے یہ کہاں سے

جس کا آغاز و انجام تم ہو
وہ کہانی سنو درمیاں سے

لاکھ پردوں میں تم تو نہاں تھے
ڈھونڈ لایا تمہیں میں کہاں سے

یہ تعلق نبھے گا کہاں تک
یہ تعلق تو ہے جسم و جاں سے

آنکھ جس کی بھی تم پر پڑی ہے
وہ ستارا گرا آسماں سے

اب تو گھٹنے لگا دم قفس میں
کس نے آواز دی آشیاں سے

جس جگہ زندگی تھک کے بیٹھے
میرا عزم سفر ہے وہاں سے

وہ جبیں کس جگہ اب جھکے گی
اٹھ گئی جو ترے آستاں سے

راز اپنا نہ تم رکھ سکے درد
اب شکایت ہی کیا رازداں سے

اردو اور بنگالی کا مشترکہ ماخذ بقیہ صفحہ ۳۴

کی تی اور پراکرت آ ای سے مشتق ہے۔

مثلاً: صیغۂ امر اردو اور بنگالی میں چل۔ جا وغیرہ (قدیم)

قدیم پراکرت اور سنسکرت	پراکرت	اردو
چلتی ۔ یاتی	چلئی۔ جئی	وہ چلتا ہے۔ وہ جاتا ہے

صیغۂ امر میں اردو اور بنگالی چل ۔ جا قدیم پراکرت اور سنسکرت چلا۔ یہی اور پراکرت چلا۔ جا سے ماخوذ ہیں۔ اردو اور بنگالی میں تانیث کے لاحقے ایک ہی ہیں جیسے مرغی ۔ مُرگی ۔ مہترانی ۔ دھوبنی (دھوبن) دونوں زبانوں میں مرکب الفاظ بھی ایک جیسے ہیں مثلاً ماں باپ ۔ رات دن۔ دوپہر۔ ریل گاڑی ۔ چوراہا ۔ (بنگالی چورستہ) وغیرہ۔ تکرار معنوی رکھنے والے الفاظ کا بھی یہی حال ہے جیسے آس پاس۔ ادلا بدلا (ادل بدل) بھات وات (بھات ماٹ) وغیرہ۔

اردو اور بنگالی دونوں میں جملہ کی بناوٹ یا ترکیب اس طرح ہوتی ہے۔ پہلے فاعل، پھر مفعول اور آخر میں فعل جیسے تمی آم کھاؤ۔ (تم آم کھاؤ۔)

اس طرح یہ بخوبی واضح کیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف بنگالی اور اردو بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی تمام ہند آریائی بولیاں جیسے ہندی، سندھی، گجراتی، مرہٹی، نیپالی وغیرہ قدیم پراکرت سے ماخوذ ہیں جن میں ہر جگہ علاقائی حالات و ظروف کے مطابق تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ﴿ (ترجمہ)

"ماہ نو" کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔
- مرسلہ مضامین نظم و نثر کی نقول اپنے پاس رکھئے ﴿

(ادارہ "ماہ نو" کراچی)

"جیون ندی کو بہنا ہے" بقیہ ص۴۶

تھا اور کمرے میں گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ نیلوفر نے اپنے ہاتھ کے قریب دیوار پر لگے ہوئے سوئچ کو دبا کر روشنی کر دی اور اس کے ساتھ ہی نگاہوں کے سامنے بہت سارے رنگ پھیل گئے، سیاہی پتی ہوئی ایک میز تھی، اس کے قریب ہی بغیر بازو کی ایک کرسی رکھی تھی۔ ہر طرف رنگ اور سیاہی اور برش اور کاغذ بکھرے ہوئے تھے اور دیوار سے ٹکی ہوئی کارڈ بورڈ کی بہت ساری تصویریں رکھی تھیں۔

معین نے بڑے پیار سے ایک تصویر پر ہاتھ رکھ کر کہا "غور سے دیکھو ممتا۔ اس لڑکی کے بال کتنے خوبصورت، لمبے، گھنے اور کالے ہیں۔ یہ مشہور خوشبودار کیش بہار تیل کی شیشی کا لیبل ہے۔ اور اس لڑکی کی طرف دیکھو۔ بنگال میں کتنی لڑکیاں اتنی خوبصورت اور صحت مند ہیں۔ بولو تو۔ تم سوچتی ہو گی۔ یہ میرے فن کا کمال ہے۔ لیکن نہیں، یہ بغدادی پیر کی خواب میں بشارت دی ہوئی دوا کے استعمال کا اثر ہے۔ یہ اسی کا اشتہار ہے۔ اور اس دوشیزہ کو دیکھ رہی ہو..." کہتے کہتے یکایک معین کو خیال آیا کہ ممتا کچھ بھی نہیں دیکھ رہی، وہ ایک سہ رنگی تصویر کی طرف بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی۔ معین نے پوچھا "کیا دیکھ رہی ہو ممتا؟"

ممتا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی "یہ تم نے کس کی تصویر بنائی ہے؟"

معین نے حیران ہو کر پوچھا "تم اسے نہیں پہچانتیں؟ —— جوڑے میں سرخ پھول، سرخ ساڑی پہنے ہوئے سولہ سال کی کسی دوشیزہ کی تصویر میں نے بنائی تھی؟ بہت دنوں سے یہ تصویر گھر میں پڑی ہوئی تھی، میں نے سوچا، اسے بھی کام میں لے آؤں۔"

ممتا نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں "لیکن اس کے ہاتھ میں جوتا پالش کا ایک بڑا سا ڈبہ کیوں دے دیا ہے! جوتا پالش کا ڈبہ میں نے کبھی پیار سے اپنے گالوں سے لگایا ہے کیا؟"

معین ہنسنے لگا "تم بھی کتنی بے وقوف ہو! اتنی دیر سے پھر تم کیا دیکھ رہی ہو؟ وہ بھی ایک اشتہار ہے۔ ورائٹی بوٹ پالش کا اشتہار۔ اگر یقین نہ آئے تو میرے نئے منیجر صاحب سے پوچھ لو۔ آج میں اسے منظور کرا کے لایا ہوں، کچھ روپیہ نقد ایڈوانس بھی لے آیا ہوں۔"

ممتا نے نہ جانے کیا سوچا اور پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی ❊

★

صفی الدین بقیہ ص۳۷

'سیلاب' سے کیا جائے۔ اس موازنہ کو زیادہ واضح بنانے کے لئے 'سیلاب کی گرفت' کو بھی پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ جو ان دونوں کے بین بین ہے۔ فن پارے میں بادبان کے تلے ایک چھوٹی سی کشتی کی لہراتی بل کھاتی اشکال ہیں۔ دوسرے میں یہی اشکال سیلاب سے دبے پچکے ہوئے درختوں کی کیفیت واضح کرنے کے کام آتی ہیں۔ اور تیسرے میں یہی اشکال پھر موجود ہیں لیکن اپنے فطری ممثل سے اور بھی زیادہ ہٹی ہوئی مگر ساتھ ہی ان میں یہ میلان پایا جاتا ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی الگ الگ ہو کر پھیل جائیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ہم اشیاء قدرت کی حقیقی وضع کے ساتھ بدیہی طور پر ملتی جلتی وضع و ہیئت سے جتنا بھی دور ہوتے جائیں گے۔ اتنی ہی تمثیل کو بحیثیت واحد شناخت کرنے میں دشواری ہو گی اور ناظر کو اس کا مفہوم اخذ کرنے کے لئے برابر اس میں حصہ لینا پڑے گا۔ اگر اس بات کو وسیع ترین ضمن میں دیکھا جائے تو کچھ عجیب نہیں کہ یہ ہر عظیم فن کی لازمی خصوصیت ہو۔ لیکن اگر اسے محدود ضمن میں دیکھا جائے تو اس میں غالباً اسلام کے روایتی فن کی مخصوص جوہریت کی ایک مخصوص جھلک یا ادا دکھائی دے گی ❊

آپ کے لخت جگر اعلیٰ تربیت کھلی ہوا
اور بہترین غذا کے مستحق ہیں۔
رسوئی بناسپتی جس میں حیاتین
اے اور ڈی شامل ہیں لذتِ طعام کے ساتھ ساتھ
توانائی بھی بخشتا ہے تاکہ قوم کے نونہال
مستقبل کو سنوارنے کے لئے انتھک
جدوجہد کرسکیں۔
صحت مند ہی کامران ہوتے ہیں
رسوئی
ہاتھ کے مس سے محفوظ
اصول حفظانِ صحت پر تیار کیا ہوا
وٹامن 'اے' اور 'ڈی' سے بھرپور
Rassoi
BANASPATI
تیار کردہ:-
مقبول کمپنی لمیٹڈ (مشہور "ایگل وناسپتی" کے بنانے والے) منگھوپیر روڈ - کراچی
واحد تقسیم کنندگان:-
آدم لمیٹڈ جوڑیا بازار - کراچی

"بابائے اردو" بقیہ صفحہ ۱۴

رشتہ موجود ہے جو کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اس کے لئے بہت ہی ضبط کی ضرورت ہے۔ اکثر ادیب اس ضبط کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اور جلد ہی کہیں نہ کہیں بہک جاتے ہیں۔ انہیں جو کچھ کہنا ہو اس سے زیادہ کہہ جاتے ہیں اور بہت بڑھا چڑھا کر۔ مولوی صاحب ہمیشہ نپی تلی بات کہتے ہیں مگر بہت ہی سلجھے، نکھرے ہوئے پیرائے میں۔ جس سے مطلب بھی ادا ہو جائے اور بیان کی دلکشی بھی قائم رہے۔ اسلوب کا مسئلہ ان کے لئے بہت ہی صاف اور سیدھا مسئلہ ہے۔ کوئی ٹیپ ٹاپ کوئی ہنگامہ آرائی نہیں۔ جو کچھ ہو آمد ہی آمد ہو۔ اور یہ کفایت شعاری حقیقتہً زیادہ بھرپور اور موثر ثابت ہوتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کی تحریر کتنی نکھری ہوئی، کتنی صاف ستھری اور پاکیزہ ہے۔ جیسے پہاڑ سے خود بخود پھوٹنے والا قدرتی سرچشمہ۔ جس سے دل کے کنول خود بخود کھل جائیں۔ اور ایک سکون، ایک فرحت، ایک ٹھنڈک سی محسوس ہو۔

مولوی صاحب بذاتِ خود ایک ادارہ، ایک دور، بلکہ کئی دوروں کا مجموعہ ہیں۔ ان کی خدمات گوناگوں اور ان کے اسلوب میں کتنی ہی باتیں یاد رکھنے، سینت سینت کر رکھنے اور قدر کرنے کے لائق ہیں۔ ان سب کا احاطہ ایک مختصر مضمون میں بہت دشوار ہے — چیساں در شیشۂ ساعت کنم ریگِ بیاباں را! — اس لئے یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ خدا مولوی صاحب کو اور بھی عمرِ دراز عطا کرے تاکہ وہ ملک و قوم اور زبان و ادب کی اور بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اور اپنی زندگی کے سب سے بڑے کام — اردو یونیورسٹی کے قیام۔ کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ثابت ہوں۔

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

ایک اور پانچ

مصباح الحق

"اگلے منصوبۂ ترقی میں جو مقاصد رکھے گئے ہیں وہ تب ہی حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم سخت محنت کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس کا تہیہ کرلیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی اس سر زمین پر آباد ہے اس کے مستقبل کو ماضی سے بہتر دیکھنے کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ وہ تیزی سے ترقی کی راہیں طے کرتا ہوا ممالک عالم میں ایک قابل فخر مقام پر پہنچ جائے۔ ان مقاصد کو صرف تندھی اور انتھک کوششوں ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے"

(فیلڈ مارشل محمد ایوب خان)

چھ نہیں، صرف پانچ ہوتے ہیں — وہ کیسے؟ آپ تو بالکل آلٹی گنگا بہا رہے ہیں — جی نہیں، گنگا بالکل ٹھیک بہ رہی ہے۔ صرف ایک لفظ کا ہیر پھیر ہے۔ ایک پانچ نہیں۔ ایک اور پانچ۔

بہت خوب! اب لگے ہاتھوں یہ بھی عقدہ کھل جائے کہ ایک پانچ کونسا ہے اور دوسرا پانچ کونسا۔

میرا مطلب ہے ہمارے پنج سالہ منصوبے۔ ایک تو وہ جو گذر چکا۔ اور دوسرا وہ جس کا اب ہم آغاز کر رہے ہیں۔ ایک ابتدا تھا دوسرا انتہا۔ اور ابتدا تو آپ جانیں ابتدا ہی ہوتی ہے۔ ابھی

پاکستان کو ابھرے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور ہر چیز کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ حالات کا رخ کیا ہونا چاہیئے۔ سب سے مقدم تو ہمارے یہاں زراعت ہی تھی۔ اس پر توجہ نہ دی جاتی تو اور کس بات پر دی جاتی۔ اور زراعت اور آبپاشی کا چولی دامن کا ساتھ
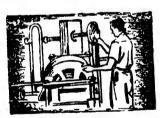
ٹھہرا۔ ہمارا زمانہ کلوں کا زمانہ، برق اور بھاپ کا زمانہ، طاقت کا زمانہ۔ پھر صنعتی ترقی، برقابی اور طاقت کے دوسرے ذریعوں پر زور نہ دیا جاتا تو اور کس چیز پر دیا جاتا۔ کھانے پینے کے ساتھ پہننا بھی لازم ٹھہرا۔ یعنی پارچات۔ جن کا شمار اشیائے صرف میں ہوتا ہے۔ ان سب روزمرہ کے کام میں آنے والی چیزوں کے لئے ہم کب تک دوسروں کے

دست نگر رہ سکتے ھیں - بے شک اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے - مگر یہ خالی دعوی ھی
بن کر نہ رہ جائے - قدرتی وسائل سب موجود سہی
مگر ان کو کام میں لانا تو ہمارا کام ٹھہرا -
کسی نے یونہی تو نہیں کہا :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہ حکایات لطیف تو آپ نے آگے بھی سنی ہوں گی - بیراج، برقابی طاقت کے منصوبے، کرنافلی میں کاغذ کے کارخانے، سوئی گیس - بندرگاہوں کی گودیاں - غرضیکہ کیا کیا کچھ - اور ان سب کا سرچشمہ — "پی آئی ڈی سی"، کا شاندار ادارہ - مگر صاحب ابتدا پھر ابتدا ہے - انقلابی حکومت نے آتے ہی ان سب کا نقشہ ھی اور کر دیا - اور اس کا نتیجہ ہے — ایک اور پانچ - یعنی ہمارا دوسرا پنج سالہ منصوبہ - زیادہ وسیع، زیادہ کثیر المقاصد اور زیادہ مہتم بالشان —

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید - ابھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس ہر جہتی منصوبے سے ہمارا ملک کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا - سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس منصوبے میں کوئی خیالی پلاؤ نہیں پکائے گئے - یہ بہت ھی حقیقت پسندانہ منصوبہ ہے - فکر و نظر اور حکمت و تدبیر کا شاہکار - اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس سے کوئی ڈرامائی اثر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی - جو بھی مقاصد ھیں بڑے ھی صاف سیدھے اور سچے تلے پیرائے میں پیش کئے گئے ھیں - یہ مقاصد کچھ آسان نہیں - ہر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کی ضرورت ہے - پہلے تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ترقی کی نہج و روش کیا ہو - ہماری بڑی بڑی ضروریات کیا ھیں - انہیں کس طرح پورا کیا جائے - ہمارے وسائل کیا ھیں - قدرتی اور انسانی دونوں - اگر ان دونوں میں ٹھیک ٹھیک تال میل پیدا ہوجائے تو پھر کیا چاہیئے - تب تو ہمارا ملک بڑی دلجمعی اور تیزی کے ساتھ اقتصادی و معاشری ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکے گا - اس سلسلہ میں یہ دیکھنا بھی لازم ہے کہ ہمارے فوری مقاصد کیا ہوں - ہمیں جیسے بھی بن بڑے اپنی زراعتی و صنعتی پیداوار کو بڑھانا چاہئے تاکہ ہماری ملکی دولت بڑھے، ہماری آمدنی میں اضافہ ہو اور ہم سب آسودہ و خوش حال ہوں -

یہ کون نہیں جانتا کہ ہمارا ملک ایک زراعتی ملک ہے - اس لئے ہمارا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں اور زمین سے کافی مقدار میں غلہ آگائیں - اس کے لئے حضرت نوح کے زمانے کے آلات اور طریقے قطعاً موزوں نہیں ہو سکتے - جدید زمانے میں جدید آلات سے کام لئے بغیر چارہ نہیں - لہذا ضرورت ہے کہ ہم اپنی زراعتی کو مشینی بنائیں، جدید ترقی یافتہ طریقوں سے کام لیں اور اپنی دوسری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے صنعت کو اس طرح فروغ دیں کہ اس سے زراعت کو بھی فائدہ ہو اور ملکی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں - اگر سوتی کپڑوں اور پٹ سن کی صنعتوں کی مقدار ایک تہائی یا اس سے زیادہ اور شکر سازی کی مقدار نصف کے قدر بڑھا دی جائے تو کیا کہنے - چھوٹے پیمانے کی دستکاریاں بڑی کام کی چیز ھیں - ان سے ملک ترقی بھی کرے گا اور لوگوں کو روزگار بھی ہاتھ آئے گا - صنعتوں کے سلسلہ میں ایسی سہولتوں پر زور دیا گیا ہے جن سے نجی سرمایہ لگانے والوں کو، خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، فائدہ بھی پہنچے اور ان کی پوری پوری حوصلہ افزائی بھی ہو - غذائی حیثیت سے خود کفیل ہونے کے لئے آئندہ پانچ سالوں میں پیداوار کی مقدار ۲۰ فیصدی یا اس سے زیادہ بڑھانے کی ضرورت ہے - اور زراعت یا اس سے متعلق

ہر میدان پر ہمہ گیر توجہ دی جائے ۔ مگر غذا زیادہ کرنے سے بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ تھوڑا حل ہو جائیگا ۔ اس لئے منصوبہ کا ایک اہم پہلو اس کی روک تھام ہے۔

اس منصوبے کا بنیادی پتھر بہت ھی عمدہ اور مضبوط ھے ۔ اپنے کام کی چیزیں زیادہ برامد کی جائیں اور باھر سے آنے والی چیزیں خود بنا کر جلدی جلدی خودکفیل ھو جائیں اور اپنا ذریعہ معاش خود پیدا کریں ۔ مزدوروں کو جن کی تعداد بڑھتی جا رھی ھے ، کام سے لگایا جائے ۔ قوم کی بھلائی اور خوشحالی، تعلیم، صحت اور رھائش کو ھر طرح بھتر بنانے پر موقوف ھے۔ ایسے کہ مدرسوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ جائے ۔ اعلیٰ کلیاتی تعلیم خصوصاً سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم خوب ترقی کرے ۔ چیدہ چیدہ صنعتوں میں ۵۰ فیصدی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں ۱۵ فیصدی اضافہ متوقع ھے۔ ملک کے کم خوش حال علاقوں کو مدد دینا اور انھیں معاشری خدمات بہم پہنچانا از بس ضروری ھے۔
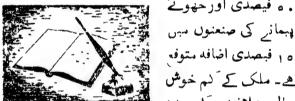
رھا اخراجات کا سوال تو یہ کچھ ایسی دشوار بات نہیں ۔ چوں عشق حرم باشد سہل است بیابان ما ۔ حکیم ملت رح نے بھی یہ نکتہ سمجھا دیا ھے کہ علم معیشت بھی زندگی ھی کا ایک جزو ھے۔ قوم کے دل میں لگن ھو تو وہ ھر بات کے لئے سروسامان پیدا کرسکتی ھے۔ اندازہ ھے کہ اس منصوبے پر ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۵ء تک کوئی ۱۹۰۰ کروڑ روپے لاگت آئے گی ۔ اس کے معنی ھیں پہلے منصوبے کے انتہائی اخراجات کے بالمقابل ترقیاتی اخراجات میں ۵۰ فی

صدی اضافہ ۔ اخراجات کچھ اندرونی اور کچھ بیرونی ذرائع سے پورے ھوں گے۔
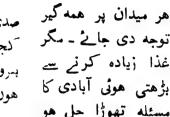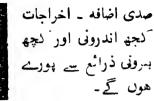
منصوبے کا مطمح نظر ۱۹۶۵ء تک قومی آمدنی میں ۲۰ فیصدی اضافہ ھے ۔ یہ ترقی‌پذیر اور خود کفیل معیشت کی طرف بہت بڑا قدم ھوگا ۔ ایسے کہ ۵۵ء کے مقابلے میں ۷۵ء تک آمدنی دوگنی اور ۸۵ء تک چارگنی ھو جائے گی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آبادی میں ۹ فیصدی ترقی ھوگی تو فی کس آمدنی میں کوئی ۱۰ فیصدی اضافہ ھوگا۔ حالانکہ پچھلے منصوبے میں تقریبا کوئی بھی اضافہ نہیں ھوا تھا ۔ لیجئے اس عظیم منصوبے کے مقاصد ایک ھی نظر میں دیکھئے :—

۱ ۔ قومی آمدنی میں ۲۰ فیصدی اضافہ ۔

۲ ۔ غلے کی پیداوار میں ۲۰ فیصدی سے زائد اضافہ ۔ اس کے لئے ضروری ھوگا کہ سیراب رقبہ میں ۱۵ لاکھ ایکڑ کا اضافہ ھو اور ۷ لاکھ ایکڑ زمین کو ترقی دی جائے۔

۳ ۔ بیرونی زر مبادلہ کی آمدنی کو ۲۰ فیصدی بڑھا کر فاضل ادائگیوں کے توازن کو پاکستان کے لئے بہتر بنایا جائے ۔

۴ ۔ بڑے پیمانے کی صنعتی پیداوار کو ۵۰ فیصدی سے زیادہ بڑھایا جائے ۔

۵ ۔ ۷۵ کروڑ روپے کے صرف سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دیا جائے ۔

۶ ۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے کم ترقی‌یافتہ علاقوں کی اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیزتر

کیا جائے ۔ مشرق پاکستان میں ترقیاتی کوششوں کو تقریباً ۱۴۰ فیصدی اور مغربی پاکستان میں اندازاً ۷۰ فیصدی بڑھایا جائے ۔

۷ ۔ ملک بھر میں دیہاتی ترقیاتی ادارہ کا جال پھیلا دیا جائے ۔

۸ ۔ نظام تعلیم کی از سر نو تنظیم اور توسیع ۔

۹ ۔ صحت کی مزید سہولتیں اور بیماریوں کا انسداد ۔

۱۰ ۔ رہائشی سہولتیں اور بہمرسانی آب کو ترقی دی جائے ۔

۱۱ ۔ روزگار کے مواقع مہیا کئے جائیں ۔

۱۲ ۔ مزدوروں کے حالات بہتر بنائے جائیں ۔

۱۳ ۔ خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام عمل میں لایا جائے ۔

اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ محض لمبے چوڑے منصوبے باندھ لینا کوئی بڑی بات نہیں ۔ اصل چیز تو ان منصوبوں کو کامیاب کرکے دکھانا ہے ۔ اور یہ مصمم ارادہ کہ ہم نے جس کام کا تہیہ کیا ہے اسے پورا کرکے رہیں گے ۔ یہ تمام تر ہماری ذاتی سعی و کوشش پر موقوف ہے ۔ صدر پاکستان نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ

”اتنا واضح کر دینے سے کہ اس منصوبہ سے کس طرح قومی دولت و خوش حالی کو بہتر بنایا جائے ۔ میں نے آپ کو صرف آدھی کہانی ہی سنائی ہے ۔ اگر آپ واقعی یہ تمام فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے زور بازو اور جد و جہد ہی سے کام لینا پڑے گا ۔ یہ ممکن نہیں کہ ہمیں یہ فوائد یونہی ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ہاتھ آجائیں ۔“

لہذا اس عظیم تجربہ کو کامیاب بنانے اور عروج و ترقی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہمیں اپنی بہترین کوشش وقف کر دینی چاہئے تاکہ ہمارا حال بھی بدرجہا بہتر ہو جائے اور مستقبل بھی کہیں زیادہ تابناک ہو ۔

★ ★ ★

ایک پھول کی طرح...
آپ کا رنگ روپ
روز بروز نکھرنے لگے گا!
اصل خوبصورتی کا انحصار صحت مند جلد پر ہے۔ رِکسونا صابن سے اپنی جلد
کی حفاظت کیجئے۔ رِکسونا میں قدرتی تیلوں کا ایک خاص مرکب کیڈل
شامل ہے، جو آپ کی جلد کے لئے بھی صحت بخش ہے۔ اور چہرے پر لطافت و
جاذبیت بھی پیدا کرتا ہے۔ رِکسونا میں پھولوں کی سی دلفریب خوشبو ہے
جو دیر تک آپ کی جلد پر قائم رہتی ہے اور آپ کو تر و تازہ رکھتی ہے۔
روزانہ رِکسونا صابن استعمال کیجئے۔ آپ کا رنگ روپ ایک پھول کی
طرح روز بروز نکھرنے لگے گا۔
اپنی جلد کی حفاظت
رِکسونا
صابن سے کیجئے
Rexona
BLENDED WITH CADYL
RP.19-193UD.

نوائے پاک

ملک میں ایک ایسے مجموعۂ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کرسکے اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سر زمین کی عظمت اور محبت سے رو شناس و سرشار کرسکے ۔ " نوائے پاک " میں ملک کے نامور شعرا کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں، گیت اور ترانے درج ہیں ۔ کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گرد پوش سے آراستہ ۔ " گیٹ اپ " بہت نفیس اور دیدہ زیب ۔

قیمت صرف دو روپئے

★

ہماری موسیقی

مسلمان حکمرانوں اور فن کاروں نے سرزمین پاک و ہند میں موسیقی کے فن کو زندہ رکھنے اور اس میں نئے نئے اسالیب اور آہنگ پیدا کرنے کے سلسلے میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ۔ اس کتاب میں اس کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ہندی موسیقی میں عربی اور عجمی اثرات نے کس کس طرح خوشگوار تبدیلیاں پیدا کیں اور تاریخ میں کن اہم مسلمان موسیقاروں اور فنکاروں کا نام محفوظ ہوچکا ہے، ان کا تعارف اور تاریخی پس منظر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

"ہماری موسیقی" میں ان مسلمان مشاہیر فن کا تذکرہ شامل ہے :

حضرت امیر خسرو ۔ سلطان حسین شرقی ۔ میاں تانسین ۔ نظام‌الدین مدھونائک

تان‌رس خاں ۔ مسیت خاں ۔ اور استاد جھنڈے خاں

خوبصورت مصور سرورق ۔ ۴۷ صفحات قیمت ۱۲ آنے

ملنے کا پتہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ — کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ ۔ کراچی — مدیر : رفیق خاور

ـ ائش ۵۵

دوق مطالعه

نئے دور میں ترقی تعلیم

(دراجی دونورسٹی اسے نئے ماحول مس)

مل کے معمار

نئی عمارت

معمل
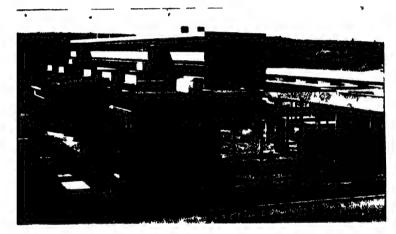
انقلاب پاکستان

احسن علوی

★ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاریخ پاکستان کا ایک نیا اور روشن ورق الٹا گیا اور ملک اپنے صحیح مؤقف کو پہچان گیا ۔ یہ کتاب اس عظیم‌الشان ، خاموش اور دور رس انقلاب کی تفسیر و تاریخ ہے۔ کتاب میں فاضل مصنف نے فلسفۂ انقلاب پر گفتگو کرتے ہوئے انقلاب پاکستان کے اسباب اور اس کے اصلاحی اقدامات کی بڑی جامع کیفیت پیش کی ہے جس سے اس کی روح کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

★ کتاب کا تعارف مولانا عبدالمجید ”سالک“ (مرحوم) کے قلم سے ہے (جو مرحوم کی آخری تحریر ہے) ۔ مولانائے مرحوم فرماتے ہیں :

> ”اس کتاب میں انقلاب پاکستان کا جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے یعنی اس کے جو وجوہ و اسباب اور متعلقات واضح کئے ہیں وہ ہر پاکستانی کے پیش نظر رہنے چاہئیں تاکہ ذہنوں میں تعمیری غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو اور سب مل‌جل کر اس مبارک رجحان کو جو اس انقلاب نے پیدا کیا ہے ، کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں مصروف ہوجائیں“

★ یہ کتاب عام قارئین ، مدارس کی لائبریریوں اور قومی اداروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

متعدد تصاویر سے مزین

نفیس کتابت و طباعت

قیمت ڈیڑھ روپیہ

(علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

خاص نمبر

یوم پاکستان

مارچ ۱۹۹۰ء

سنکارا کے روزانہ استعمال سے
روزے کو راحت بنائیے
بہت سے روزہ داروں کے لئے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی کیونکہ وہ پہلے ہی سنکارا کو آزما چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ تکان دور کرنے اور تازہ دم ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔
یوں تو سنکارا ہر موسم میں یکساں مفید اور صحت بخش ہے لیکن رمضان میں اس کا استعمال آپ کیلئے اور بھی ضروری ہے۔
سنکارا ایک مکمل اور متوازن ٹانک ہے جو نہ صرف آپ کو روزے میں دن بھر ہشاش بشاش رکھتا ہے بلکہ صحت کو مستقل فائدہ پہنچاتا ہے۔
رمضان المبارک میں سنکارا کے روزانہ استعمال سے ضروری قوت اور توانائی حاصل کیجئے اور روزے کو راحت بنائیے۔
Cinkara
سنکارا
حیاتین آمیز ٹانک
ترکیب استعمال
بوقت سحر
بوقت افطار
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

شمارہ ۳ جلد ۱۳

ماہِ نو

خاص نمبر مارچ ۱۹۶۰ء

بتقریب یومِ پاکستان

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

نیا دور:

عنوان		مصنف	صفحہ
پاکستان میں وضعِ نو		پروفیسر رشبروک ولیمز	۷
"شعروں کی قطار"	(جائزہ)	اللہ بخش یوسفی	۱۲
ایک اور آٹھ کروڑ		م - ج - احمد	۱۷
ستارۂ گیتی خرام	(نظم)	جمیل نقوی	۲۶
صبح در صبح	(نظم)	صہبا اختر	۲۹
"رہ نوردِ شوق"	(نظم)	رئیس امروہوی	۳۱
طلوعِ صبحِ روشن	(نظم)	حمایت علی شاعر	۳۳
خزاں سے بہار تک	(نظم)	بشیر فاروقی	۲۵
"اُمیدگاہِ انام"		شاہد جمیلی	۳۴
پاک سی حرفی	(نظم)	عاصمہ حسین	۳۷
طرحِ نو افگن		مسیح الزماں	۴۰

رائٹرز گلڈ:

عنوان	مصنف	صفحہ
پاکستانی ادیبوں کا منشورِ آزادی	فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں	۵۰
رودادِ چمن	قدرت اللہ شہاب	۵۱

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

خاص نمبر - فی کاپی: ایک روپیہ چار آنے

ادب:

عنوان		مصنف	صفحہ
مستقبل کی اردو		ڈاکٹر محمد صادق	۵۳
اقدار کا مسئلہ		ریاض احمد	۵۹
خراجِ آخریں	(محمود نظامی مرحوم)	ن۔ م۔ راشد، حفیظ ہوشیارپوری	۴۴–۴۷
"ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت"	(نظم)	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (آنجہانی)	۴۹

افسانے، ڈرامہ، فکاھیہ:

عنوان		مصنف	صفحہ
اصول کی بات		احمد ندیم قاسمی	۶۶
سناٹا		ابن سعید	۷۱
دوسرا کنارہ		غلام الثقلین نقوی	۷۵
"ستاروں کی چال"	(ڈرامہ)	انور عنایت اللہ	۸۲
آئینہ بی بی	(بنگلا لوک کہانی)	یونس احمر	۸۸
فریاد کی لے		دیوندر ستیارتھی	۹۲
واپسی		عنایت اللہ	۹۷
"موت آتی ہے پر نہیں آتی"	(فکاھیہ)	سعید احمد رفیق	۱۰۳

نظمیں:

عنوان	مصنف	صفحہ
ہڑپہ کا کتبہ	مجید امجد	۱۰۷
براق شاہیں	شیر افضل جعفری	۱۰۷

غزلیں:

شاعر		شاعر	صفحہ
ضمیر اظہر	★	قمر جمیل	۱۰۸
احمد ظفر	★	شہید الگجراتی	۱۰۹
مشتاق مبارک	★	جگن ناتھ آزاد	۱۱۰

فن:

عنوان	مصنف	صفحہ
دورِ انقلاب کا مرقع نگار ـــــ صادقین	حق نواز حیات	۱۱۱

تاریخ و آثار:

عنوان	مصنف	صفحہ
سلاطین بنگالہ خلجی دور	سید فیضی	۱۱۶
مشہد بالاکوٹ	عارف حجازی	۱۲۱

فیچر:

عنوان	مصنف	صفحہ
میری سُنو	سید آفاق حسین	۱۲۵

پاکستان میں وضعِ نو

پروفیسر رشبروک ولیمز

جس ملک نے حال ہی میں اپنی ایک علیحدہ قومیت کو ہیئت دی ہو اس کے موجودہ منظرِ سیاست پر گفتگو کرتے وقت کوئی بھی پختہ کار مبصر ہو گا وہ احتیاط و تامل برتے گا کیونکہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ کنکتہ چینی کا حق اگر وہ اس نئی مملکت کے عوام کے سپرد کر دے تو وہ زیادہ بہتر ہے۔ میرا خیال ہے اس خصوص میں یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ صادق آتی ہے جب مبصر کوئی انگریز ہو۔ میں اس وقت جس مملکت کا ذکر کر رہا ہوں وہ حال تک انگریزی راج میں رہی ہے۔

میں پاکستان ایک بار پھر آیا تھا یہاں کچھ پرانے دوستوں سے ملاقات رہی تو کچھ نئے شناسا بھی پیدا ہوئے آپ کے معاشرہ میں جس طرح تپاک اور اظہارِ تکریم کیا جاتا ہے میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس گرم جوشی اور تپاک سے مراسم ملاقات ادا ہوئے کہ شاید وہ رسمی نہ تھے ورنہ میزبان و مہمان کے رسمی رشتے سطحی ہی رہتے ہیں —— خلیق بالطبع ہونے کی بات جب ہی پیدا ہوتی ہے کہ عوائد رسمیہ سے ہٹ کر ہم آزادی سے مل جل سکیں۔ مجھے بھی یہ ترغیب ذہنی ہوئی کہ آپ سے رسمی تکلف سے بالا رہ کر ملوں جلوں — یہ ترغیب اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے ہم وطنوں میں سے جب بھی کوئی یہاں آتا ہے تو آپ حضرات اس سے مناسب تکریم سے پیش آتے ہیں۔

لیکن ایک چیز جو مجھے ہمیشہ ہی متاثر کرتی رہی ہے وہ آپ صاحبوں کی وہ قومی خصوصیت ہے جسے میں نے آپ میں ہمیشہ ممتاز بھی پایا اور مستحسن بھی، اور وہ یہ کہ آپ پاکستانی صاف گوئی کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ جب آپ کسی غیر ملکی کو اپنا دوست، ہمدرد اور بہی خواہ سمجھ لیں تو پھر اس سے اس بات کے بھی متوقع رہتے ہیں کہ وہ آپ سے صاف صاف کھری کھری باتیں کرے جو انہی کی صاف گوئی کی طرح ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں اور آپ دونوں ہی اس بات سے واقف ہیں کہ دنیا میں بہت سی اقوام و ملل —— جن میں بعض بڑی بھی ہیں —— اس بات کی خواہاں رہتی ہیں کہ کوئی غیر ملکی ان کے ہاں جو جو کچھ دیکھے اس کی تعریف کئے جائے اور اگر اس کی داد و تحسین میں کوئی شائبہ بھی (خواہ وہ کتنا ہی ملائم و مؤدبانہ کیوں نہ ہو) شامل ہو جائے تو اپنی گہری ناراضگی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتیں۔ وہ صاف گوئی کی خواہاں تو رہتی ہیں لیکن اگر کوئی رائے ذرا بھی ان کے اس اونچے اندازے سے جو وہ اپنے بارے میں لگا کے بیٹھی ہیں مختلف ہو جائے تو پھر وہ منہ پھلا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میں نے یہ بات پاکستان میں نہیں پائی بلکہ یہ دیکھا کہ یہاں لوگ نکتہ چینی کا خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ خامیاں گنوانے کی دعوت دیتے ہیں بشرطیکہ آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ کہنے والا آپ کا مخلص اور سچا بہی خواہ ہے۔

پاکستان کو ابھی آزاد ہیئت ملی بھی نہ تھی کہ میں سالہا سال سے آپ کا واقف تھا۔ اب اس چیز نے آپ کے اس مہمان پر یہ فرض بھی ڈال دیا کہ رائے دیتے وقت مکمل دیانت سے کام لے۔ آپ کے قومی مسائل کی بابت مجھے اس جذبہ کے علی الرغم کچھ کہنا ضروری ہو تا ہے۔ حصول آزادی کے بعد بھی مجھے اس ملک میں آنے کا کئی بار شرف حاصل ہوا ہے اور شخصی طور پر میں کئی باتوں سے متاثر ہوا ہوں۔ انگریز۔ پاکستانی دوستی کے باب میں اگر میں کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو اس کا بہترین ذریعہ یہی تاثرات ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں جن نکات کی طرف اشارہ کروں گا ان کو برطانیہ میں ابھی تک اچھی طرح سمجھا نہیں گیا ہے۔ اس لئے پاکستان کے حالیہ واقعات کے سلسلے میں وہاں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اہل پاکستان کو یہ شکوہ ہے کہ ان کے ملک میں جو حالات افق پر ابھرے ہیں، اور جو آپ کی تاریخ کا بہت بڑا موڑ ہیں، ان کا صحیح تخمینہ لگانے میں انگریز بالکل ناکام رہے ہیں۔

بہت سے انگریزوں اور پاکستانیوں میں رشتۂ مودت عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ ان شخصی روابط محبت سے قطع نظر دیسے بھی اہل برطانیہ میں پاکستانیوں کے لئے جذبہ محبت ضرور موجود ہے۔

اب اگر ان اسباب کا میں تجزیہ کرنے بیٹھوں تو اس مقالہ کے موضوع سے بہت دور جا پڑوں گا اس لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا۔ اس کی کچھ تو وجہ یہ بھی ہے کہ ہم انگریز روایتی طور پر ایسی قوموں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو اپنی مشکلات و آلام کو ضبط و تحمل سے برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی سعی کرتی رہتی ہیں اس جذبہ مودت کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انگریزوں کی طبیعت میں ایک عمومی جذبہ یہ ہوتا ہے کہ معاملاتِ حیات میں کھلاڑیوں کی "اسپرٹ" ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ادھر یہ بات بھی ہے کہ آپ لوگوں میں جو سپاہیانہ شجاعت اور کڑک پن ہے وہ ہمیں بہت بھاتا ہے۔ اسی طرح آپ کی خارجہ پالیسی میں ایک کھرا پن بھی ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ آپ لوگ سیاست میں غیر جانبداری کے نظریہ کو مہمل سمجھتے ہیں اور اس سیدھی سی بات کو جانتے ہیں کہ اگر کسی ملک کی کوئی اہمیت ہے تو اس کے دوست بھی ہوں گے اور دشمن بھی۔

اہلِ برطانیہ میں آپ لوگوں کے لئے جذبات گرم جوشی ضرور موجود ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہاں عام آدمی کچھ حیران بھی ہے کہ آپ کے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ پاکستان سے برطانیہ واپس آنے کے بعد مجھے جن چند چیزوں نے سب سے زیادہ متاثر بلکہ ملول کیا ہے، وہ غلط فہمی ہے جو یہاں پاکستان کے بارے میں انگریزوں میں پائی جاتی ہے اور یہ کہ پاکستان اپنے اُس نصب العین سے ہٹ گیا ہے جو اس کو وجود میں لایا تھا طالع آزما خود غرض لیڈروں نے اسے اپنی حرص کا شکار بنا لیا اور اب اس کے قدم تنزل کی راہ پر ہی اٹھ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسی بے بنیاد باتیں انگریزوں کے اعلیٰ طبقے میں نہیں سنی جاتیں اور نہ ان طبقوں ہی میں جو دونوں ممالک کے مابین تعلقات و روابط پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ پھر بھی ایسے خیالات ضرور سننے میں آئے اور ایسے لوگوں کی زبانی جن سے توقع تھی کہ وہ کچھ زیادہ ہی باخبر ہوں گے۔ اگر ان غلط باتوں اور غلط فہمیوں کی صحت نہ کی گئی تو کچھ وقت گزرنے پر وہ بڑی نقصان رساں ثابت ہوں گی اس صورتِ حال کا جو ہمت افزا پہلو ہے وہ نظر انداز نہیں ہونا چاہئے اصل کیفیت یہ ہے: اگر ایک دفعہ تمام حقائق سامنے آ جائیں تو ان کا ردِ عمل فوری اور سرگرم ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار نہیں کئی بار انگریز سامعین کے سامنے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات رکھی ہے کہ آپ کے ہاں جو انقلاب آیا ہے اس کا اصل مفہوم کیا ہے۔ مجھ سے کہا جاتا ہے۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ آپ کی باتیں سن کر ہمیں کس قدر اطمینان ہوا ہے ہمیں پہلے بھی یقین نہ تھا کہ پاکستان اس راہ پر گامزن ہو جائے گا جس پر مصر اور انڈونیشیا ہو چکے ہیں، مگر پارلیمنٹ ٹوٹنے اور مارشل لا لگنے سے ہم کو ایک ذہنی دھچکا ضرور لگا تھا۔

آپ کے ہاں جو حالیہ انقلاب آیا ہے اس کے مقاصد اور نوعیت کے باب میں جو غلط فہمیاں میرے اہلِ ملک میں پائی جاتی ہیں ان میں کئی کافی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں اپنی حد تک ان کے ازالہ کی جس قدر بھی کوشش کر سکتا ہوں اس سے دریغ نہیں کرتا بالخصوص دو وجوہ کی بنا پر۔ ایک یہ کہ میں مورخ ہوں، دوسرے، میں موجودہ نسل کے ان افراد میں سے ہوں جنہیں قائدِ اعظم محمد علی جناح؟ اور سر محمد اقبالؒ کو جاننے اور ان کی صفات و کمالات کے جاننے کا فخر حاصل رہا ہے؟ اس وجہ سے میں اپنے ان دیگر ہم قوموں کے مقابلہ پر، جن کا یہ پس منظر نہ ہو، زیادہ صاف اور واضح طور پر سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کی موجودہ حکومت کیا کرنے کی سعی کر رہی ہے۔

انگریزوں میں روایت پرستی کا جذبہ بڑا شدید ہوتا ہے اور جب ان کو یہ بتایا جائے کہ آپ کے انقلاب کا مقصد یہ رہا ہے کہ ان دو عظیم ہستیوں نے آپ کے لئے جو منہاج متعین کی تھی اس پر آپ کو دوبارہ چلانے کے لئے یہ انقلاب لایا گیا ہے تو یہ بات فوراً انگریزوں کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مگر اس بات سے انکار کرنا بھی بے وقوفی ہوگی کہ میرے ملک میں بہت سے بہی خواہانِ پاکستان کے گلوں میں جو پھانس سی چبھتی معلوم ہوتی ہے وہ دو باتوں کی وجہ سے ہے۔ ایک پارلیمان کا ٹوٹ جانا۔ دوسرے مارشل لا کا نفاذ۔ مگر جب میں یہ توضیح کرتا ہوں کہ یہ پارلیمان کس نوعیت کی تھی اور وہ کس طرح آپ کو کھا ڈال رہی تھی اور یہ مارشل لا کس طرح کام کر رہا ہے یعنی نظم و نسق

خلیفہ　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　عمل : عبدالرحمن چغتائی
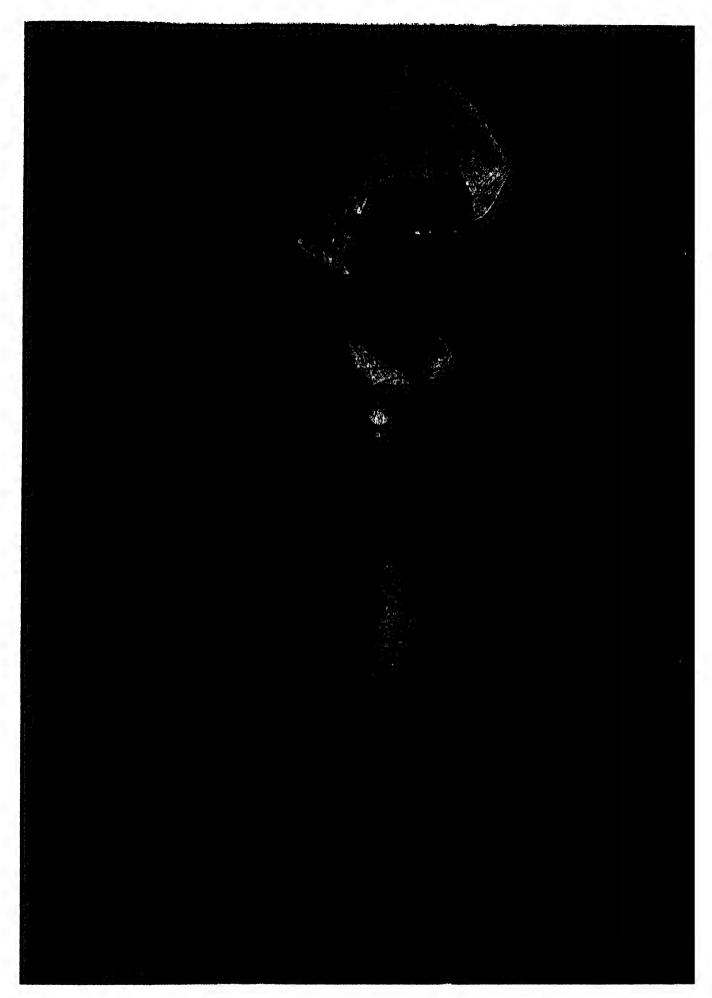
فوجی تحکم کے تلے نہیں کام کر رہا ہے بلکہ سول حکام کے تعاون کے ساتھ ملک کی بہتری و بہبودی کا سامان کر رہا ہے تو پھر سارا منظر ہی آنکھوں کے سامنے بدل جاتا ہے۔ آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم انگریز اس طرح کی حکومت کے خوگر ہیں جس کی بنیاد آزاد رائے عامہ پر ہو اور اس کا اظہار بالغوں کے خفیہ ووٹ کے ذریعہ کیا گیا ہو۔ اب جو حکومت بھی اس نمونہ کی نہ ہو ہم اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ہماری یہ افتادِ طبع کس طرح متشکل ہوئی ہے، اس کی جڑ تاریخ میں جا کر ملتی ہے۔ ہمیں ابھی تک کرامویل کے "میجر جنرلوں" کی یاد آتی ہے جنہوں نے شخصی آزادیوں پر کڑی چوکیاں بٹھا رکھی تھیں۔ ہم یہ بھی نہیں بھولتے کہ ان دونوں عالمی جنگوں کے دوران میں کیسے کیسے قاعدے قانون خود ہمارے ہاں لگائے گئے۔ پھر بھی ہمارے تصور پر جو چیز چھائی ہوئی ہے اور جسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، وہ ہے ہمارا نظام پارلیمانی جو بڑا ہی قدیم ہے۔

اس قدامت نے یہ فائدہ پہنچایا کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا رہا ہم حکمرانی کے نقائص دور کرتے چلے گئے اور اسے اپنی ضروریات کے مطابق بناتے چلے گئے۔ اور یہ کہ ان کی بنیاد پارلیمانی نظام سے بھی پرانی ہے یعنی شہریوں میں احساسِ فرض داری کی روایت، نیز مقامی انتظامات اور اداروں میں لوگوں کی رضاکارانہ و بلا معاوضہ خدمات۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگ رائے زنی کرتے وقت یہ اصل بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ دوسرے ممالک خاص کر ہم سے کم سیاسی عمر رکھنے والے ملک، ایک جدا کیفیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پس وہاں حکومت خواہ وفاقی ہو یا صوبائی، غلط رو اور بداعمال ہو جائے اور پارلیمان غیر نمائندہ ہو تو پھر کوئی علاج ہی باقی نہیں رہتا بجز اس کے کہ ہر چیز کو نئے سرے سے نیا کر کے پھر سے نظام کو جاری کیا جائے۔

کسی ملک میں دوسرے ملک کی نسبت معلومات کس حد تک پہنچتی رہتی ہیں، اس کا انحصار وقت پر ہوتا ہے اور یہ بالکل فطری ہے۔ اس لئے برطانیہ میں پاکستان کی بابت جس قدر بھی غلط فہمیاں ہیں ان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکتوبر ۵۸ء سے قبل کا پانچ سالہ دور لیجئے۔ گرمجوش سے گرمجوش ہمدردِ پاکستان کے دل میں بھی جذباتِ تشویش ضرور پائے جاتے تھے کہ آخر اس ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت نے قومیت کا جو شعلہ سینوں میں روشن کر دیا تھا اور ان کی قیادت نے مشکلات کو، جو باہر کی دنیا کے لئے ناقابلِ تسخیر دکھائی دیتی تھیں، جس طرح ختم کر دیا تھا، بالکل بجھ چکا ہے، کم از کم وقتی طور پر ہی سہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے ملک میں ریشہ دوانیوں، سازشوں، دھڑے بندیوں اور بدعالیوں نے سیاسی زندگی میں گہری جڑ پکڑ لی تھی جس نے آپ کے ملک کی ساکھ باہر بھی گرا دی اور اندر بھی سالمیت و استحکام کو متزلزل کر دیا۔ ادھر آپ کے جو بہترین کارآشنا سرکاری ملازم تھے ان کے حوصلے بھی پست ہو چکے تھے، صلاحیتیں مفلوج اور ان کا جوشِ عمل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آپ کی زندگی کے سبت سے جانے پہچانے اور ہر دلعزیز عوام قائدین مایوس ہو کر خدمتِ وطن سے ہی کنارہ کش ہو گئے تھے۔ عوام حوصلہ ہار بیٹھے۔ پس پردہ سازشوں نے روز روز انتظامیہ کا بدلنا ایک معمول بنا دیا تھا۔ ظاہر تھا کہ اہم و فوری اہمیت کے قومی مسائل پس پشت جا پڑے۔

اس ناگفتہ بہ حالت کا کچھ کچھ حال تو انگریزوں کے علم میں بھی آتا رہتا تھا۔ اس لئے جب اکتوبر میں یہاں انقلاب آیا تو جن لوگوں کو پاکستان کی بابت براہِ راست صحیح واقفیت نہیں تھی، ان میں قدرتی طور پر یہ رجحان ہوا کہ یہ انقلاب کسی بہتر اور نئے عہد کا آغاز نہیں ہے بلکہ نقطۂ عروج ہے زوال اور مفاسد کا۔ آپ کے ملک میں پچھلے چند سالوں میں جو نوبت پہنچ چکی تھی اسے دیکھ کر اگر کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا تھا تو غلطی متوقع تھی، اور میں نے جن عناصر کی طرف ابھی اشارہ کیا ہے ان کے ساتھ اس بات کو دیکھا جائے تو غلط فہمیوں میں اضافہ ہونا کچھ بیجا نہ تھا۔ چنانچہ برطانیہ میں وہ پیدا ہوئیں بلکہ اب تک بعض حلقوں میں موجود ہیں۔

آپ کے ہاں اس نئے دور میں جو چند نمایاں اچھے کام ہوئے ہیں ان میں بعض پر اظہارِ رائے کرنے میں لوگ محتاط و متامل بھی رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری اس روش نے آپ کو حیران بھی کیا ہوگا۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

مگر اس پوری بات پر روشنی پڑتی ہے۔

جس وقت مارشل لا کا قاعدہ ۱۹۵۸ء جاری ہوا تو اس وقت میں پاکستان میں موجود تھا اس لئے میں اس کے دور رس نتائج کی بابت خود معلومات فراہم کر سکتا تھا یعنی یہ کہ اس قاعدہ کے جاری ہونے سے مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی میں کیا انقلاب آئیگا اور کیا اصلاح ہوگی۔ جن لوگوں نے یہ قاعدہ مرتب کیا تھا اور جن پر اس کے چلانے کی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں ان میں چند حضرات سے اس کی بابت گفتگو کا بھی شرف مجھے حاصل ہوا۔ لہٰذا مجھے اچھی طرح یہ معلوم ہو سکا کہ اس قاعدہ کے اجرا کی اصل لِم کیا ہے اور آپ کے ملک کی ترقی میں یہ کس طرح ایک نقطۂ انقلاب ثابت ہو رہا ہے۔ میں نے اس کی وسعت کا بھی احاطہ کیا، مگر جب میں انگلستان واپس آیا تو دیکھا کہ نسبتاً چند ہی لوگ اصل بات سے پوری طرح واقف ہیں اور جو کچھ جانتے بھی تھے ان کا رجحان بھی نکتہ چینی کی طرف ہی تھا مثلاً یہ کہ اصلاحات اراضی پر وہ ناک بھوں چڑھاتے تھے یعنی یہ کہ "ہاریوں مزارعوں میں زمین بانٹ دینے" کا تصور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ علمی کتابوں میں دیئے ہوئے نظریوں اور اصول و قواعد کے نظریات سے وہ مطابق نہیں دکھائی دیتا تھا۔ یعنی ان کی نظریاتی تشفی نہیں ہوتی تھی حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ آپ کے ملک میں جو اصلاحات اراضی ہوئی ہیں وہ بڑی ممتاز و نمایاں خصوصیات کی حامل ہیں اور ان کو نافذ کرنا بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے اس سے پاکستان کا نظام اراضی ہی یکسر نہیں بدل جائے گا بلکہ آپ کے ہاں جو سیاسی مفاسد پیدا ہوگئے تھے ان کا سرچشمہ بھی بالکل بند ہو جائے گا۔ پاکستان کے اس انقلابی اقدام کو سمجھنے میں میرے ہم وطن بری طرح ناکام رہے ہیں۔ میرے پاکستانی احباب ہمارے اس رویہ پر ضرور متاسف ہوتے ہونگے — اور میرا خیال ہے کہ میں ان احباب کا شریک تاسف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں آپ کے ملک کی موجودہ کیفیت کو ہم انگریز اب آہستہ آہستہ سمجھتے جا رہے ہیں بالکل تازہ شہادت [illegible] ہے کہ پاکستان میں جو انگریز تجار بزنس کر رہے ہیں ان میں یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے کہ پاکستان میں اب انگریزوں کو اپنی تجارت میں مدد پہنچانے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک شخص نے مجھے ایک رسالہ لا کر دیا اس کا نام ہے "ACHIEVEMENT"۔ یہ بزنس اور صنعت کے مسائل سے مخصوص ہے۔ میں نے جس شمارہ کو دیکھا اس میں اس رسالہ کے اپنے نامہ نگار کے کچھ تاثرات چھاپے گئے تھے جو اس وقت پورے ایشیا کے سفر پر گیا ہوا تھا۔ وہ پاکستان بھی آیا اور یہاں کے انقلاب کو دیکھ کر اس نے بزنس کرنے والوں کے زاویۂ نظر سے بھی اس انقلاب کو دیکھا۔ اس مضمون پر موٹی سرخی دی گئی تھی؛ "برطانوی کمپنیوں کے لئے اب پاکستان میں روپیہ لگانا بکار آمد ہے"۔ اس مضمون میں درآمد کنندگان کی مشکلات کا بھی معقول نظر سے جائزہ لیا گیا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خراج تحسین بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس وقت پاکستان میں دور عمل ہے۔ کام کرنے کی ایک لگن ہے۔ "اور کچھ کرنے" کا انداز فکر کارفرما ہے۔ تجارت اور سیاست میں جو مفاسد پیدا ہوگئے تھے ان کا استیصال ہو چکا ہے۔ آخر میں اس نے یہ پیش بینی بھی کی ہے کہ صدر پاکستان جنرل (اب فیلڈ مارشل) محمد ایوب خان ملک میں ایک مستحکم معیشت پیدا کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے اس رائے کو ایک حرفِ بہت کے مصداق جانا ہے اور اندازہ لگایا ہے کہ پاکستان کی طرف اب جو برطانوی ہوا کا رخ رہے گا وہ کس نوعیت کا ہوگا۔ یہاں جو بزنس میں کام کر رہے ہیں، ان کی بابت یہ مشہور ہے کہ وہ بڑے باخبر ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ اب یہ لوگ جیسا محسوس کریں گے اور جانیں گے اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑے گا۔ پھر یہ باخبری اور حلقوں تک وسیع ہوگی اور ایک عمومی رائے تشکیل پائے گی۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اگر کوئی غیر پاکستانی آپ کی نئی حکومت پر یا ان چیزوں پر جو اس کے اقتدار میں آنے کا موجب ہیں، فیصلے صادر کرنے بیٹھ جائے تو یہ ایک نوع کی گستاخی ہوگی مگر جب خود میرے اہل ملک نے بارہا مجھ سے کہا کہ آجکل کے پاکستان اور اس انقلاب کی بابت لب کشائی کروں تو میں مجبور ہو گیا کہ ان کے سوالوں کا جواب تیار کروں۔ ایسے جوابات جو کچھ بھی [illegible] کر سکیں اور میرے سوال کنندگان کو [illegible]۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاکستانی احباب کو بھی یہ جواب پسند آئیں گے یا نہیں مگر اتنی بات عرض کروں گا۔ یہ جواب میرے مرتب کئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کا سرچشمہ وہ عظیم ہستی ہے جسے چند

بڑی اور پرانی عظیم پاکستانی ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے گا۔ میری مراد سر محمد اقبال سے ہے۔

اس سال (۵۹ء) جب میں اپنے وطن واپس آیا تو اقبال سوسائٹی کی طرف سے ایک دعوت صدارت ملی۔ یہ سوسائٹی ہر سال لندن میں اقبال کے یوم وفات پر جلسہ کیا کرتی ہے۔ میں نے اس موقع پر اقبال کی کتابوں کو ٹٹولا اور جو اوراق میری نظر سے گزرے ان میں مجھے ایسے مقامات مل گئے جن سے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس عظیم مفکر و شاعر کے تصور میں ایک اسلامی مملکت کا کیا خاکہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ اس مملکت کا تصور و نصب العین اس نے کیا طے کیا تھا۔ اقبال صرف اس بات پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا کہ اس کی اہمیت و ضرورت پیش کر دی یا اس کی مادی سرحدیں تک سمجھا دیں۔ اسے تو یہ خلش بھی تھی کہ اس مملکت کے خصائص کو بھی اپنے پیغام میں واضح کر دے۔ تاکہ جب اس مملکت کا قیام ہو اور اس کے کوئی معنی ہوں تو افراد ملت اور معاشرہ میں ان کے مقام و موقف کا تعین ہو جائے۔ اقبال کے اس تصور کو اس وقت بھی کوئی پاکستانی بھلا نہیں سکتا۔ اقبال نے بتایا ہے کہ اس مملکت کے آٹھ بنیادی اصول ہوں گے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ مملکت کا وجود دین وحدت کے پرستاروں سے عبارت ہو گا کیونکہ اس چیز کے بغیر اخوت انسانی پر مبنی کوئی بھی پالیسی یہ مملکت وضع نہیں کر سکیگی۔ دوسری بات اس نے یہ سمجھائی تھی کہ ایسے لوگ اس مملکت کی خدمت پر مامور ہوں جو اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر وطن کی خیر و فلاح کو مقدم رکھ سکیں۔ جب تک ایسی بے لوث سرشاری کام کرنے کی نہ ہو اور ایسے صالحین کام نہ کر رہے ہوں، اس وقت تک مملکت مستحکم نہیں ہوگی۔ تیسرا نکتہ یہ تھا کہ دستور عمل طے کیا جائے۔ یعنی یہ کہ پورے نظام مملکت اور عوام و خواص کا باہم رشتہ کن بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ چوتھا تصور یہ تھا کہ ایک معین و محسوس مرکز ثقل وجود میں لایا جائے یعنی ایک خطہ ارض جہاں ایسے لوگ بسے ہوئے ہوں جن کا عقیدہ ایک اسلامی مملکت میں سامان زیست و بود کا متلاشی ہو اور انہیں یہ آزادانہ حاصل ہوں۔ پانچواں نکتہ تصور و مقصد تھا۔ یعنی ایک ایسا نصب العین جس کی طرف مملکت اور افراد قوم دونوں ہی کو اپنے قوائے عمل راجع کرنے تھے۔ چھٹا مسئلہ تھا عناصر فطرت کی تسخیر، جس میں یہ تصور بھی مضمر تھا کہ قوم ہی نے تسخیر فطرت کو اپنا مخصوص مطالعہ و تجربہ بنا کر فتوحات حیات کی منزلیں طے کی ہیں ان کے ساتھ میل و جان عملی تعاون کیا جائے۔ ساتویں بات جو اقبال نے ہمیں سمجھائی یہ تھی کہ اس مملکت میں معاشری احساس اور جذبہ شہریت وجود میں لایا جائے۔ جب یہ احساس قوی ہو کر آگے بڑھے گا تو بڑی سطح پر قومی دائرہ میں قوم اپنی سود و بہبود کو متشکل کر سکے گی اور شہریوں میں یہ احساس ذمہ داری، قوم و ملک کو بنائیگا آخری بات، جو کسی بات سے کمتر اہمیت کی نہ تھی، خواتین ملت کے باب میں تھی۔ یعنی انہیں معاشرہ میں مناسب و معقول مواقع ترقی بخوبی فراہم کئے جائیں۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو کچھ ایسے ہی خیالات و اصول تھے جنہوں نے قائد اعظم کو تشکیل پاکستان کے اہم کام میں متاثر کیا۔ قوم بنانے کا وہ جذبہ جو اُن کے دست عمل میں آکر اپنا کام کر گیا اور پاکستان کے ابتدائی مراحل میں جو طلسماتی ترقی منظر پر آئی یہ سب اسی نصب العین کا فیضان اور قائد کی شخصیت کا طفیل تھا یعنی جس منزل پر پاکستان پہنچ گیا آج تک کوئی قوم نہ پہنچی تھی مگر قائد اعظم کی وفات کے بعد اور ان کے بہترین جانشین کی شہادت کے بعد منظر پر جو بھی ہستیاں آئیں بھیا بڑی چھوٹی ہستیاں تھیں اور یہ سب اصول ان کی راہ نمائی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوم میں وہ زوال در آیا جس نے گذشتہ اکتوبر کے انقلاب تک بہت ہی المناک صورت اختیار کر لی۔ میرا تصور یہ ہے کہ انقلاب جو اب آیا ہے قوم کو پھر ایک بار ان صالح اصولوں کی طرف موڑ رہا ہے اور ۴۷ - ۱۹۴۸ء میں جن حیرت انگیز مساعی نے پاکستان بنوا دیا تھا اور دنیا ششدر رہ گئی تھی اب ان عناصر کو پھر پالینے کی جستجو ہے۔ جب میرے اہل ملک آج کے پاکستان کے بارے میں اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اس کے بارے میں پوچھتے ہیں تو میں یہ سب کچھ کہہ ڈالتا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ قوم دوسرا جنم لے رہی ہے اور یہ قوم ان اسباب کو پھر دریافت کر رہی ہے جنہوں نے اسے عظمت دلائی تھی۔ اس وقت وہ اپنے تمام وسائل و قوائے عمل کو اس بات پر مرکوز کئے ہوئے ہے کہ اپنے محبوب وطن، قومی رہنماؤں کی قیادت میں ہمارا پیارا میدان پھر جیت لے۔ وہ میدان جس میں صحیح و حوصلہ مند قیادت کے موجود ہونے کے باعث وہ کئی سال سے بھٹک رہی تھی۔

"شمعوں کی قطار"

(دورِ انقلاب کا جائزہ)

اللہ بخش یوسفی

حدِ نگاہ تک شمعیں ہی شمعیں، مینار ہی مینار نئے
انقلابی حکومت کے قائم ہونے سے کر اب تک برابر نظر آتے
ہیں۔ ایک ہی جانب نہیں بلکہ میدانِ حیات میں ہر طرف
اور بقولِ غالب "چراغانِ دوالی" کی طرح "صف بصف" اور
یہ سلسلہ یہیں نہیں رک جاتا بلکہ شعر میں "گذرگاہِ خیال" تک
نئے شمعوں کے ان گنت جلوؤں سے پُرنور معلوم ہوتا ہے۔
اس مضمون میں آپ کو انہی "حسینانِ نور" کی جھلک دکھائی دیگی۔ (مدیر)

آج سے بیس برس پہلے جس مملکت کے حصول کے لئے ۱۹۴۰ء کی تاریخی قراردادِ پیش کی گئی تھی وہ سات ہی برس بعد قیامِ پاکستان پر منتج ہوئی۔ اس وقت دنیا کی آنکھیں اس سرزمین کی طرف لگی تھیں۔ اقوامِ عالم اس نوزائیدہ مملکت کے اقدامات کو دیکھ رہی تھیں۔ بہت دن گزرنے نہ پائے تھے کہ ہمارے "ملت" داعئ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس دورِ ابتلا میں ہمارے زعما اخلاص و نیک نیتی کا مظاہرہ کرتے، امانت و دیانت کے مجسمے بن کر قوم کو بامِ ترقی کی طرف لیجانے کی سعی کرتے۔ مگر افسوس! ایسا نہ ہوا۔ ملت کو ترقی کے بجائے تنزل کے راستہ پر ڈال دیا گیا۔ اور وہی افراد جن سے ملک و ملت کی امیدیں وابستہ تھیں ذاتی اغراض کی آبیاری کرنے لگے۔ رشوت خوری اور دوست پروری شروع ہوئی، مالدار کو مالدار تر بنا دیا گیا، ملازمین حکومت نے مال و زر جمع کرنے کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس طرح اخلاقی پستی کا یہ دردناک منظر دیکھنے میں آیا کہ نام نہاد قومی نمائندے بازیگروں کی طرح شعبدے دکھانے لگے۔

ملت فاقہ کشی پر مجبور ہو گئی۔ بیرونی ممالک میں وقار باقی نہ رہا۔ عوام مایوسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر جنرل محمد ایوب خاں کی شکل میں ایک مردِ مجاہد نمودار ہوا اور اس نے میدانِ عمل میں قدم رکھا۔ نام نہاد قومی حکمراں سرگشتہ و حیراں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

مارشل لاء کا نفاذ کچھ کم پریشان کن بات نہیں، زمانہ قریب میں کئی فوجی انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ لوگ ان سب کا طریقِ کار دیکھ چکے تھے۔ ان میں کیا کچھ نہ ہوا؛ گولیاں چلیں، قتل مقاتلے ہوئے، تختۂ دار پر لاشیں لٹکتی نظر آئیں اور مہینوں بلکہ سالوں ملک میں صحیح طور پر امن قائم نہ ہو سکا۔ ان حالات میں عوام کا خوف و ہراس کچھ بیجا بھی نہ تھا۔ جنرل محمد ایوب خاں کے الفاظ میں یہی خیال کیا جا سکتا تھا کہ "حکمرانوں کے ایک ٹولہ کی بجائے دوسرا ٹولہ برسرِ اقتدار آگیا تھا" لیکن غروبِ آفتاب کے ساتھ جب نجات دہندۂ وطن جنرل محمد ایوب خاں کے یہ الفاظ سنائی دئیے کہ:

> "ہمارا مقصد جمہوریت کو بحال کرنا ہے۔
> ایسی جمہوریت جسے ہمارے عوام سمجھ سکیں اور
> اس پر عمل پیرا ہو سکیں"

اور نفاذِ مارشل لاء کے بعد ایک گولی تک نہ چلی، خون کا ایک قطرہ تک نہ گرا، روزمرہ کے کاروبار میں کوئی فرق نہ آیا، ریل گاڑیاں، ڈاک و تار، آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ دکھائی نہ دی۔ جیسے کہ حسبِ معمول طلباء اور طالبات بھی بلا کسی ہچکچاہٹ یا خوف کے جوق در جوق درسگاہوں کی طرف گامزن نظر آئیں، تو عوام کے چہرے چمک اٹھے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے انہیں کی بہتری کے لئے ہو رہا ہے۔

پھر ۲۷ اکتوبر کو انقلابِ نو کی مستقل نوید آئی۔ اس دن جنرل محمد ایوب خاں نے اپنے گیارہ رفقاء یا وزراء کے ساتھ انقلابی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر محنت و استقلال سے فرائض کی ادائیگی شروع کر دی۔ اور جہاں سابقہ حکمراں "پہلے پانچ پھر تو دو" کے مقولہ پر عمل پیرا ہو کر نت نئی سکیمیں مرتب کرتے تھے وہاں انقلابی

سے عوام کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہاں اس انقلابی حکومت نے "پہلے تولو پھر بولو" کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا۔ اس نے ہر سکیم کو سوچ سمجھ کر عوام کے سامنے پیش کیا اور جلد سے جلد اسے عملی جامہ پہنا دینے کی سعی کی۔ چنانچہ گزشتہ سال کے واقعات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انقلابی حکومت نے کس حیرت انگیز طریقہ پر وہ کام کر دکھایا جو سابقہ حکومتیں دس گیارہ سال میں بھی سرانجام نہ دے سکی تھیں۔ مثلاً سمگلنگ کو دور گزشتہ میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ حکومت اس کی روک تھام کا کوئی بندوبست نہ کر سکی اور کرتی بھی کیسے جبکہ خود عمالِ حکومت اس کی پشت پناہی کر رہے تھے؛ نتیجہ یہ کہ باہر سے بلا محصول مال درآمد کیا جانے لگا تو اندر سے چوری چھپے ملکی ضروریات کی اشیاء برآمد ہونے لگیں۔ ملک میں ہر چیز کی کمی پیدا کر دی گئی۔ عوام چلا اٹھے لیکن صاحبانِ اقتدار کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ انقلابی حکومت نے اوّلین فرصت میں اس مرض کی تشخیص کی اور اس کا علاج سوچا۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سمندر نے سونا اگلنا شروع کیا۔ اور صرف کراچی میں پچیس من سے زائد سونا ملا۔ سرحدوں پر انتظامات ہوئے۔ رفتہ رفتہ ملک کو اس مصیبت سے نجات مل گئی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ چور بازاری کا دور دورہ تھا۔ تاجروں نے دل کھول کر عوام کو لوٹنا شروع کیا۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں کھانے پینے اور عام ضروریات زندگی کا مہیا ہونا مشکل ہو گیا حتیٰ کہ مریض مرتے مر گئے اور علاج کے لئے دوائی نہ خرید سکے۔ سمگلنگ بند ہوتے ہی حکومت نے اشیاء پر کنٹرول کیا تو چھپے ہوئے خزانے کھلنے لگے۔ بازار میں اشیاء کی ایسی بہتات ہوئی کہ دکانوں کو چھوڑ فٹ پاتھ پر ڈھیر لگائے جانے لگے اور قیمتوں میں ۳۰ سے ۴۰ فیصدی تک کمی نظر آنے لگی۔

سمگلنگ اور چور بازاری کرنے والوں نے جہاں آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹا وہاں حکومت کو اس آمدنی پر کوئی ٹیکس تک نہ دیا۔ انقلابی حکومت نے اعلان کر دیا کہ پوشیدہ دولت کو ظاہر کر دیا جائے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایسے لوگوں کی تمام ناجائز جمع کردہ دولت ضبط کر لی جاتی لیکن ایسا نہ ہوا۔ حکومت نے انتہائی نرمی سے کام لے کر اس کو ہاتھ نہ لگایا۔ صرف ایک حصہ بطور ٹیکس وصول کیا اور سات کروڑ روپے ترقیات عامہ کے کاموں پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ظاہر ہے کہ گزشتہ دور میں ملک کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اندرون ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ مالی مشکلات سدراہ ہو رہی تھیں۔ چنانچہ مالی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے اسے مستحکم کرنے کے ذرائع سوچے جانے لگے۔ زرمبادلہ کا بہت بڑا حصہ ان اشیاء کی خرید پر صرف ہو رہا تھا جو ملک میں پہنچ کر ہم دوسرے ممالک کو چوری چھپے بھیج رہے تھے۔ چور بازاری نے بھی مالیات کا توازن خراب کر رکھا تھا۔ اور زرمبادلہ کے بقایا کی کمی دوسرے ممالک میں ہماری ساکھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ حکومت نے ایک ایک کونہ چھان مارا۔ تجارت اور درآمد برآمد کے لئے نئے قواعد وضع کئے۔ ملک کی حالت سدھرنے لگی اور جہاں ستمبر ۱۹۵۸ء میں ہمارے زرمبادلہ کو ۱۱۲،۲۷ کروڑ بتایا گیا تھا وہاں انقلابی حکومت نے اپنی مستعدی سے اسے جون ۱۹۵۹ء میں ۱۴۰ کروڑ تک پہنچا دیا تھا۔

اس کے بعد ایک اور عمل تطہیر شروع ہوا یعنی سرکاری افسروں کی اصلاح۔ گزشتہ دور کے مصائب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں قومی صاحبانِ اقتدار کے ساتھ بہت سے سرکاری افسر بھی برابر کے شریک رہے۔ انقلابی حکومت ان سے بھی غافل نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ ان میں سے بعض نے تو مال و زر کو عزیز جانا اور بعض ایسے تھے جن میں کام چوری کی عادات راسخ ہو چکی تھی۔ چنانچہ حکومت کی مشین کی صفائی کے لئے ایک قانون نافذ کر دیا گیا اور اس کے تحت سکریننگ کمیٹیاں قائم کر دی گئیں۔ ان کمیٹیوں نے پوری طرح چھان بین کے بعد فیصلہ دیا تو بقول فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مفادِ ملت کے پیش نظر بہت سے ایسے افسروں کو نکالنا ضروری ہو گیا جنہیں کاروبار حکومت کا وسیع تجربہ تھا۔ چنانچہ جن افسروں کے خلاف اس طرح کارروائی ہوئی ان میں مرکزی حکومت کے افسران درجہ اوّل کے ۱۳۸، درجہ دوم کے ۲۲۱ اور ۱۳۰۳ دوسرے ملازمین تھے۔ پاکستان بھر میں ایسے افراد کی تعداد تین ہزار تھی جنہیں ملازمت سے برطرف کیا گیا۔ یا پنشن دے کر علیحدہ کیا گیا یا جن کے عہدوں میں کمی کر دی گئی۔

ساتھ ہی ساتھ تعمیر ملت کی طرف ٹھوس قدم اٹھائے گئے۔ جن میں اوّلین حیثیت زرعی اصلاحات کو حاصل ہے۔ پاکستان میں ابتدا ہی سے زرعی املاک چند ہزار نفوس کے قبضہ میں تھی۔ بڑے بڑے زمیندار سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ کسان بچارا پشت ہا پشت سے زمینداروں کے لئے

وہ اراضی سے سونا پیدا کرنے کے باوجود خود غریب و نادار رہا۔ اس کی کمائی ہوئی دولت زمیندار کے خزانہ کی زینت بنی اور اسے کسی وقت زمین پر مالکانہ حقوق حاصل نہ ہو سکے۔ انقلابی حکومت نے قائد اعظمؒ کے اس قول کو دہرایا کہ "کسان کی خوشحالی سے پاکستان کی خوشحالی بڑھے گی"۔ پھر دیکھا کہ زمیندار اپنی تمام املاک کو ضروریات ملک کے لئے استعمال بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دولت کے نشہ میں اس طرف توجہ ہی نہیں دی جس سے ہر سال لاکھوں ایکڑ اراضی بنجر ہو رہی تھی۔ بنا بریں تحقیقات کے لئے ۲۳ نومبر ۱۹۵۸ء کو ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے ۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس پر جنرل محمد ایوب خاں نے زرعی اصلاحات کا اعلان کر دیا۔ یہ زرعی دنیا میں ایک یادگار انقلاب تھا۔ اس کے باعث کوئی زمیندار پانچ سو (۵۰۰) ایکڑ نہری اور ایک ہزار ایکڑ بارانی زرعی اراضی سے زائد پر قبضہ نہ رکھ سکے گا۔ البتہ باغات وغیرہ کے لئے ڈیڑھ سو ایکڑ مزید رکھنے کی اجازت ہوگی۔ بقیہ اراضی حکومت اپنے قبضہ میں لے گی۔ وہ بھی مفت نہیں۔ ۲۵ سال میں بہ اقساط اس کی قیمت بھی ادا کر دے گی۔ قابض مزارعوں کو املاک کا مالک بنا دیا جائیگا اور دوسرے کسانوں میں جو اراضی تقسیم ہوگی وہ آسان قسطوں میں اس کی قیمت ادا کریں گے۔ اس فیصلہ کے مطابق مغربی پاکستان میں زمینداروں سے ۲۱۵۴۵۳۷ ایکڑ زمین حاصل ہوگی جس پر کوئی ۱۴۵۸۲۵ کسان آباد کئے جاسکیں گے۔ دوسرے کسانوں کو دوسرے علاقوں میں سرکاری املاک دی جائینگی اور ان کی سہولت کے لئے حکومت نے تقاوی قرضوں کے لئے تیس لاکھ روپے کی رقم بھی علیحدہ کر دی ہے۔ اس طرح صدیوں کے جکڑے ہوئے کسان زمینداروں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔

زرعی اصلاحات پر توجہ کرنے کے علاوہ نئی حکومت نے ملک کا ایک دوسرا اہم مسئلہ بھی اپنی عملی تحویل میں لے لیا۔ بے خانماں اشخاص کی آبادکاری۔ پاکستان کو ابتدا ہی سے مہاجرین کی آبادکاری کا نہایت اہم مسئلہ درپیش رہا ہے لیکن اس کا کوئی حل تلاش نہ کیا جاسکا۔ ہر دور نے برسرِ اقتدار آ کر اس کی اہمیت پر زور دیا۔ کوئی تحریر کوئی تقریر کوئی بیان ایسا نہ تھا جس میں اس کی اہمیت بیان نہ کی گئی ہو۔ بوقت ضرورت مہاجرین ہی کا نام استعمال کیا جاتا رہا۔ لیکن عملاً ان کی آبادکاری کی خاطر کوئی اقدام نہ ہوا۔ جو لوگ فٹ پاتھوں پر پڑے تھے وہ وہیں پڑے رہے اور جو جھونپڑوں میں مقیم تھے جھونپڑوں ہی میں رہے۔ اس طرح ان بے خانماں لوگوں نے وعدۂ فردا پر پورے گیارہ سال گذار دئے۔ انقلابی حکومت کے اراکین یہ حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ وہ اس دردناک منظر سے کیسے متاثر نہ ہوتے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اسی اہمیت کی نظر سے دیکھا جس سے اسے دیکھا جانا چاہئے تھا۔ بے خانماں آبادی کا جائزہ لیا گیا۔ پتہ چلا کہ صرف کراچی میں چھ لاکھ بے خانماں دن رات مصائب و آلام کی زندگی گذار رہے ہیں۔

کام کرنے کا تہیہ کر لیا جائے اور حقیقی طور پر کام کرنے کی نیت ہو تو کوئی مشکل نہیں رہتی۔ چنانچہ حکومت نے پہلے ہی اقدام میں چالیس ہزار کوارٹر تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جن پر تقریباً چھ کروڑ آڑتیس لاکھ لاگت آئے گی۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کس طرح لفٹننٹ جنرل محمد اعظم خاں کی زیرنگرانی پانچ ماہ کے مختصر عرصہ میں پندرہ ہزار کوارٹر کورنگی کی نئی بستی میں تیار ہو گئے جن میں مہاجرین کو آباد بھی کر دیا گیا ہے۔ آبادکاری کے سلسلہ میں ایسے ہی اقدامات پورے پاکستان میں کئے جارہے ہیں۔ یہ سب کام اپنی جگہ نہایت اہم تھے مگر صدر ایوب نے اعلان کیا تھا کہ وہ عوام کو ان کا حق یعنی جمہوریت حقیقی معنوں میں واپس دلائیں گے۔ چنانچہ ان کے اور ان کی حکومت کے جس طرح اور وعدے سچے ثابت ہوئے اسی طرح بحالیٔ جمہوریت کا وعدہ ایوبی بھی پورا ہو کر رہا کیونکہ خلوص عمل اور سعئ پیہم موجود تھی۔ ملک میں بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طریقۂ انتخاب میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہزار ڈیڑھ ہزار بالغ رائے دہندگان اپنے حلقہ میں اچھی طرح دیکھ بھال اور جان پہچان کے ایسے ہی افراد کو منتخب کریں گے جو ان کے مفاد کے نگراں بن سکیں۔ یہ ابتدائی جمہوریت ہوگی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں کے صدر مل کر تحصیل کونسل بنائیں گے۔ تحصیل والے مل کر ضلع اور ضلع والے اپنی اپنی کمشنری کی کونسلیں بنائیں گے۔ ملک بھر میں یہ انتخابات مکمل ہو چکے ہیں اور صدر پاکستان کے انتخاب کے بعد یکم مارچ ۱۹۶۰ء سے یہ بنیادی جمہوریتیں اپنا کام شروع کر دیں گی۔

انقلابی حکومت ملی اور ملکی ضروریات کے کسی بھی گوشہ سے بےخبر نہیں۔ اس نے بیک وقت ہر گوشے میں کام شروع کر دکھا ہے چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمارا "نظام تعلیم" انگریز کا مرتب کردہ ہے اور ہمارے مقاصد کے لئے مفید نہیں ہو سکتا، اس نے ایک تعلیمی کمیشن بھی مقرر

کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عدالتوں کا موجودہ طریقہ کار بہت تکلیف دہ ہے۔ انصاف جلدی حاصل نہیں ہو سکتا اور اخراجات ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک قانون کمیشن کا تقرر عمل میں آیا۔ مشرقی پاکستان میں زرعی اراضی کے محصولات کے سلسلہ میں مشکلات پیش آئیں تو وہاں کے لئے لگان کمیشن قائم کیا گیا۔ اسی طرح یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اناج اور دوسری اشیا کی پیداوار کو کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے "کمیشن برائے خوراک و زراعت" مرتب کیا گیا۔ سائنس کی ترقی، جہازرانی، پارچہ بافی، مشترکہ سرمایہ کے کاروبار کے قانون کی دیکھ بھال اور سنہری ریشہ یعنی پٹ سن کی پیداوار کے لئے علیحدہ علیحدہ کمیشن مقرر کئے گئے۔ دوسرا پانچسالہ منصوبہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ اقتصادی حالت کو سنبھالنے کے ذرائع سوچے گئے، ملک میں بیمہ کے کاروبار پر توجہ دی جا رہی ہے صنعتی معاملات پر حکومت کی توجہ مرکوز ہے۔ درآمد برآمد کرنے والوں کو سہولتیں دی جا رہی ہیں صحت عامہ کے نظام میں ردوبدل، ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد میں اضافہ، ادویات کے حصول میں سہولتیں۔ غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی زندگی دکھائی دے رہی ہے اور جمود کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔

ملکی و ملی ضروریات کے ساتھ انقلابی حکومت مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی معاملات کی طرف بھی پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ گزشتہ دور میں کس غلط طریقہ سے مذہب کے نام کو استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ کس طرح مذہب کے نام پر ذاتی اغراض پوری کی جاتی رہیں اور مسلمان روحِ اسلام سے دور ہوتے گئے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تاکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرے، اسلامی تعلیم کو ہمہ گیر شکل میں پیش کرے اور اس نے جو احسانات دنیا پر کئے ان کی تحقیقات کے پہلو بہ پہلو تاریخ اسلام، فلسفہ اور نظامِ قانون (فقہ) کے سلسلہ میں تحقیق و تجسس کی ہمت افزائی کرے۔

مزدور کا مسئلہ بہت ہی اہم اور حل طلب تھا۔ صدیوں سے مزدور کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے سرمایہ دار تو فائدہ اٹھا رہا تھا۔ لیکن اس محنت کش کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اُسے کسی وقت بھی پیٹ بھر کھانے کو روٹی یا بدن ڈھانکنے کو کپڑا میسر نہ ہوا نہ سر چھپانے کو جگہ ملی نہ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام ہوا۔ انقلابی حکومت نے مزدور کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کا اقدام کرتے ہوئے انہیں زندگی کی تمام سہولتیں مہیا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان مزدوروں سے کام لینے والوں کو ہدایت ہوئی کہ وہ ان سے برابر کا انسانی سلوک کریں، تمام بنیادی سہولتیں مہیا کریں، ان کے علاج معالجہ کا خیال رکھیں اور رفتہ رفتہ مزدوروں کے لئے رہائشی مکان بھی تعمیر کرنا شروع کر دیں۔ مالک و مزدور کے باہمی اختلافات کے لئے پہلی بار انقلابی حکومت نے صنعتی عدالتوں کے قیام کا فیصلہ کیا ہے جن میں جج کے ساتھ مالکوں اور مزدوروں کا ایک ایک نمائندہ ہوگا۔ اور ایک ایسا اہم قانون بھی نافذ کر دیا گیا ہے کہ جو بقول جنرل برکی اپنی قسم کا واحد ناقابلِ تقلید قانون کہا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے دارالسلطنت کا مسئلہ بھی قیام پاکستان کے وقت سے زیر بحث رہا ہے۔ ہر وزارت نے نیا دارالحکومت بنانے کے مسئلہ کو حل کرنے کی بے دلی کے ساتھ غیر منصوبہ بندی کی کوشش کی اور یہ کوششیں بھی سیاسی داؤں پیچ کا شکار رہیں مگر انقلابی حکومت نے اس مسئلہ کو دوٹوک حل کر دیا۔ اس کے لئے پہلے تو ایک کمیشن مقرر کیا اور کمیشن کی رپورٹ پر غور و فکر کے بعد دارالسلطنت کو راولپنڈی کے قریب پوٹھوہار میں تبدیل کرنے کا آخری فیصلہ بھی کیا۔ اور قبل اس کے کہ جدید دارالسلطنت تعمیر ہو عارضی طور پر مرکزی حکومت کے ایک اہم حصہ کو انقلابی سال ختم ہونے سے قبل راولپنڈی کو منتقل بھی کر دیا۔

ملک کی تعمیری و اصلاحی ترقی کی نئی نئی راہیں کھلتی جا رہی ہیں اور اس کے ساتھ ملک کی ادبی و ثقافتی زندگی بھی نئے دور میں ایک نئی روح اپنے تن میں (جو ناتواں ہو چکا تھا) بیدار ہوتی محسوس کر رہی ہے۔ ادب و ثقافت حساس و باشعور معاشرہ کی ذہنی رہنمائی اور اس کے احساسات اور رجحانات فکر و نظر کو صحیح راہوں پر قائم رکھنے اور انہیں صحت مندانہ نمو دینے کے لئے لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کوئی ملک بھی محض مادی وسائل کو آگے بڑھا کر مکمل نمونۂ معاشرت کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ادب و ثقافت کو کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملے، فنکاروں کی ہمت افزائی ہو اور ان کے لئے قوت لایموت میسر ہوتا ہے تاکہ وہ اظہار و نمو کے نئے نئے چراغ جلاتے اور صنم تراشتے رہیں۔

یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اس نئے دور کے خالقوں نے ہمارے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے طبقے کو بھی سہارا دیا ہے اور وہ جو اب تک معاشرہ کا وجود ہوتے ہوئے بھی یوسف گم گشتہ کی طرح تھے اب ان کی ذات اور صفات بھی کوئی کام کی چیز مانی گئی ہیں اور اس قافلہ کو بھی میر کارواں مل چکا ہے۔ وہی میر کارواں جس نے ملک کے دوسرے قافلوں کو بھی صحیح راہ پر ڈال دیا ہے۔ اب ملک میں قلم اور موقلم کے ان مجاہدین کو بھی مقام شرف و اعتنا میسر آ رہا ہے۔ ان کی مالی حالت بہتر بنانے اور مواقع ترقی پیدا کرنے کی سعی کی جا رہی ہے تاکہ نئے نئے وسائل نکال کر لوح و قلم کی پرورش کرنے والوں کی آسودگی کا سامان بھی بہم پہنچے اور ملک کا ادب و ثقافت معیار و مقدار کے باب میں بھی وقیع و ممتاز بن سکے۔ اس ضمن میں خصوصیت سے "رائٹرز گلڈ" کے قیام کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جبکہ برصغیر میں پہلی بار "ہم قلم" ایک راہ بمعنی الواقع "ہم قدم" ہوئے ہیں اور اپنی سود و بہبود کی راہ پر عملی شعور کے ساتھ گامزن ہوئے ہیں۔ ادھر رنگ و موقلم کے حامیوں نے بھی نئے دور کی روح کو محسوس کر کے اسے مقید کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور گرد و پیش کی دنیا نے انہیں یہ آگاہی دینی شروع کر دی ہے کہ زندگی کا اطلس فقط رنگ ہی نہیں ہے، اس سے بڑھ کر بہت کچھ ہے اور اس بہت کچھ کو انہوں نے محسوس کر کے اظہار کا جامہ بھی عطا کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ مثلاً حمید الرحمٰن (مشرقی پاکستان) اور صادقین (مغربی پاکستان) نے روح عصر کو اپنے کام میں داخل کر لیا ہے۔ صادقین نے "اسمگلر" کو ہمارے سامنے اپنی پوری "قامت قیامت" کے ساتھ لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور ہم سے کہا ہے کہ اس کو خوب پہچان لو۔ نقاشی کی چند نمائشیں جو حال ہی میں منعقد ہوئیں وہ فنکاروں کے نئے کاموں کو سامنے لانے میں کامیاب ثابت ہوئیں۔

ادب و ثقافت کے ان پہلوؤں کو ملک میں ہمت افزائی اور اعتنا کی روشنی مل رہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ بھاری بھرکم حقیقتیں بھی اپنا بھیانک منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ میرا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ملک میں آبادی کا اضافہ ہمارے وسائل کی کمر توڑنے کی حد تک پہنچ چکا ہے اور اگر ہم نے اپنی آبادی کو قابو میں نہ رکھا تو بڑے نقصان رساں نتائج پیدا ہوں گے۔ اور صدیوں تک خسارہ کا سامان پیدا کر دینے والے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔ اس پہلو پر خود صدر مملکت ہمارے عوام و خواص کی توجہ مبذول کرا چکے ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کچھ سمجھدار اور درد مند لوگوں نے شروع کی ہے۔ خیال ہے کہ ملک کا فہمیدہ طبقہ اس کی اہمیت و ماہیت کو سمجھ کر اپنے دوسرے کم سمجھ ہموطنوں کو بھی سمجھائے گا اور جہاں جہاں اس کی تربیت کا اہتمام ہو چکا ہے لوگ اس کی طرف رجوع کریں گے۔ اگر ہم نے اپنی آبادی کے مسئلہ پر قابو نہ پا لیا تو ملک بہت سے مصائب کا شکار ہو جائے گا اور دوسرے شعبوں میں جو بھی ترقی ہوگی اس کا توازن بگڑ جائے گا۔

آخر میں عوامی رجحان اور گرمجوشی کی تازہ ترین مثال کا ذکر کئے بغیر اس جائزہ کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ یوں تو اول دن سے ہی عوام نے اس دور کو اس کی برکتوں کے باعث لبیک کہا تھا مگر جیسے جیسے مسائل حل ہوتے جا رہے ہیں یا تکمیل کی منزل کے قریب آ رہے ہیں۔ اس دور کے ساتھ لوگوں کی گرویدگی اور شیفتگی اور بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ عوامی ردعمل، جوش و خروش اور تحسین کے جو مظاہرے "پاک جمہوریہ اسپیشل" کے سفر کے دوران جا بجا دیکھنے میں آئے وہ شاید برصغیر کی تاریخ میں بے نظیر کے علاوہ کسی لفظ سے تعبیر نہیں کئے جا سکتے۔ مغربی پاکستان میں اس اسپیشل کا پہلا سفر بخیر و خوبی ختم ہوا تو پھر مشرقی پاکستان میں بھی اس کا سفر حال ہی میں ختم ہوا۔ دونوں جگہ دورِ نو کے معمار کو دیکھنے اور اس کی سچی سچی، کام کی باتیں سننے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ان کا بے پناہ ہجوم ایک سیلاب آدم تھا کہ سب انتظاموں کے باوجود جوشِ عقیدت و مسرت میں بے قابو ہوا جاتا تھا۔ معمارِ دورِ نو نے خود عوام تک پہنچ کر ان کا دل جیت لیا سو یہی بات ہوئی کہ وہ آیا اور دلوں کے قلعے مسخر کر کے چلا گیا۔

اس اسپیشل کا سفر ایک بڑا با مقصد سفر تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے سوچا کہ زیادہ سے زیادہ افراد تک اس طرح بآسانی پہنچا جا سکتا ہے، ان کی مشکلات کو خود دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ دید اور شنید دونوں ذریعوں سے جب وہ عوام اور ان کی مشکلات کو جان لیں گے تو حلِ مسائل میں بڑی مدد ملے گی اور عوام کو ان کو دیکھنے کی مسرت کے علاوہ اس بات کا بھی احساس ہو جائے گا کہ اب ہماری مشکلات کو سننے والا اور فوراً ہی حل کے احکام جاری کر دینے والا بھی کوئی موجود ہے۔ اس کی عظمت اس کے کام کی عظمت ہے اور [illegible] معترف۔

ایک اور آٹھ کروڑ

م - ج - احمد

۱۴ دسمبر کی رات کراچی سے ایک قافلہ چلا جس نے ہزاروں برس کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔

اس قافلے میں کوئی دو سو آدمی تھے۔ قافلہ پہلے ۱۰۰۰ میل گھومتا ہوا پشاور پہنچا اور پھر ایک مہینے بعد ڈھاکے سے چل کر ۱۶۰۰ میل کا سفر طے کرتا ہوا راولپنڈی چلا گیا۔

اب اس قافلے میں آٹھ کروڑ آدمی شامل ہیں اور اسے صدیوں کا سفر طے کرنا ہے۔

جب یہ قافلہ چلا تو اس میں کوئی دو سو آدمی تھے جو تمام تہذیبوں، تمام نسلوں، تمام یقینوں اور تمام شبہات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس میں درجۂ سوم کے محنت کش تھے، باورچی، بیرے، صفائی کرنیوالے، مشینیں چلانے والے، ڈاک اور تار کے ملازمین تھے، فوٹو گرافر تھے، ٹائپسٹ، کلرک اور سٹینو گرافر تھے۔ اس میں درجۂ دوم کے چھوٹے چھوٹے بے چین، غمزدہ اور بڑے افسروں کی خوشامد کر کے ان سے نفرت کرنے والے معمولی افسر بھی تھے اور تیز، مضبوط، ہمچو من دیگرے نیست قسم کے بڑے افسر بھی جو انتظامی مشکلات کو چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں اور کبھی پیار سے کبھی گھُرکی سے۔ بڑے بڑے کام نکال لیتے ہیں اور پھر اپنے وفادار ماتحتوں کو بھول جاتے ہیں۔ صحافی تھے۔ آن بان والے نخریلے صحافی جو دنیا بھر کی سیاسی پیچیدگیوں سے اندرونی واقفیت رکھتے ہیں جو یک قلم اقوامِ متحدہ کی سیاست سے لے کر ایک تحصیلدار تک کی پالیسیوں پر ملحمیر میں حرفِ آخر لکھ دیا کرتے ہیں۔ تیز طرار، پڑھے لکھے چوکس مستعد اور اپنے اخباری آقاؤں کے خوف اور وفاداریوں میں مبتلا صحافی۔ اس قافلے میں ادیب بھی تھے، شرمیلے، بامحبت، خود پسند، طرحدار ادیب جو کسی کے نہیں ہو سکتے اور کسی کے بھی ہو سکتے ہیں۔ ادیب حیران حیران اور شوقین سے لگتے تھے اور ڈری ڈری نظروں سے افسروں اور صحافیوں کو دیکھ رہے تھے جو کام اور بے کام اِدھر سے اُدھر دوڑتے پھرتے تھے

اور جنہیں اس ٹرین میں ادیبوں کی موجودگی اسلئے مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی کہ یہ لوگ تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔

اور ان سب میں شامل اور سب سے الگ دو آدمی اور تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تھا خوش گمان اور دوسرے کا نام تھا بے یقین۔ خوش گمان اس ٹرین کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور ہر شخص کی بات غور سے سنتا تھا۔ بے یقین سخت بیزاری کے موڈ میں تھا۔ وہ ایک ایرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں اوپر کی نشست پر سخت بدمزگی کے عالم میں لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُسے اور بہت سی شکایتوں کے علاوہ ایک رنج یہ بھی تھا کہ اسے اوپر کی سیٹ ملی ہے اور اس کے ساتھ خصوصی طور پر کسی نوکر کا انتظام نہیں ہے۔ خوش گمان اس کے سامنے کی نشست پر لیٹا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ بے آرام ضرور تھا مگر اس کے چہرے پر کسی شکایت کے آثار نہیں تھے۔

گاڑی چلنے لگی۔ مستعد افسر اپنے اپنے ڈبوں میں آکر بیٹھ گئے۔ صحافیوں نے ٹائپ رائٹر سنبھالے اور خبریں مرتب کرنے لگے، ادیب اپنی نشستوں پر لیٹ کر کتابیں پڑھنے لگے۔

بے یقین لیٹے لیٹے بے چین ہو رہا تھا۔

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے؟“ اس نے خوش گمان سے پوچھا۔

”معلوم نہیں“ خوش گمان بولا ”کیوں ہو رہا ہے کا جواب تو میں بالکل نہیں دے سکتا اور کیا ہو رہا ہے یہ تم خود دیکھ لو“

”مثلاً میں کیا دیکھ لوں۔ لوگوں کو آتے جاتے چلتے پھرتے، باتیں کرتے، سوتے جاگتے دیکھ لوں یا کچھ اور بھی ہو رہا ہے۔ تم بڑے گاڈ دی آدمی ہو جی“ بے یقین بھنا گیا۔ خوش گمان بھی بھنا گیا مگر وہ کچھ نہ بولا۔ اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ کیا جواب دے۔

گاڑی چلنے لگی۔

اس گاڑی میں ایک آدمی ایک اکیلے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا، اس کے دو تین ساتھی الگ جا کر سو گئے تھے، وہ اکیلا بیٹھا سوچ رہا تھا۔

خوش گمان اور بے یقین دونوں الگ الگ سوچ رہے تھے۔

صبح سے ہنگامہ شروع ہو گیا۔

اکیلا آدمی ریل سے اترا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بہت سے لوگ بیٹھے تھے جو بولنے کے لئے بیتاب تھے۔ جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو پہلے چند آدمی مؤدب اور کچھ ہکلاتے ہوئے سے نظر آئے مگر پھر وہ فر فر بولنے لگے۔

"آپ نے یہ دورہ کیوں شروع کیا ہے؟"

"کیا آپ کو احساس کمتری ہو گیا ہے کہ مارشل لا لگا کر جمہوریت اور الکشن وغیرہ میں پڑ گئے ہیں؟"

"صدر گرزن ہاؤ کشمیر کا فیصلہ کیوں نہیں کراتے؟"

"ہمارے گاؤں سے سڑک کیوں نہیں گذرتی؟"

"آپ مارشل لا کب اٹھائیں گے؟"

"آپ مارشل لا کیوں اٹھا رہے ہیں؟ ابھی ہمیں دو چار فصلیں آرام سے کاٹنے دیجئے۔"

"جناب صدر"

"جناب صدر میری بات سنئے۔"

"مجھے بولنے دیجئے جناب صدر"

"جواب دیجئے۔ میری بات کا جواب دیجئے۔"

"جناب صدر"

"جناب صدر"

گاڑی چلتی رہی۔ پہلا دن، دوسرا دن، تیسرا دن۔ ہر روز وہ اکیلا آدمی کئی کئی بار ٹرین سے اترتا ہے اور کبھی سینکڑوں اور کبھی ہزاروں اور کبھی لاکھوں آدمیوں کے آگے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگتی ہیں۔

"قیمتیں چڑھ گئی ہیں۔"

"بے ایمانی اب بھی ہو رہی ہے۔"

"سیم اور تھور نے زمینوں کو بنجر بنا دیا ہے۔"

"ہم بھوکے ہیں، ہم ننگے ہیں۔"

"آپ جمہوریت واپس کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں۔ آپ خود کام کیجئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

غیر ملکی صحافی زیادہ مستعد ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس نہایت حساس مائیکروفون والے ٹیپ ریکارڈر ہیں۔ جہاں کوئی بولتا ہے وہ مائیکروفون اس کے آگے کر دیتے ہیں۔ بحثوں پر وہ ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے ہیں۔ تلخیوں پر انکے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ مقامی افسران روز بروز پریشان نظر آتے ہیں اور چپکے چپکے ٹرین کے ملاقاتیوں سے اپنے دکھڑے روتے ہیں۔

"اب دیکھئے وہاں وہ بالکل کھلے طور پر مجمع کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں اور سوال جواب کر رہے ہیں، بتائیے، اب ہم تو خوف کے مارے سوکھ رہے ہیں۔"

"اب دیکھئے وہ ادھر صفوں میں پہنچ گئے ہیں۔ بھئی ہماری بھی کیا نوکری ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔"

"نہیں صاحب، آپ لوگوں نے ہماری کوئی عزت نہیں رکھی اس شہر میں۔ نہ چلئے نہ کھانا۔ آخر حکومت تو ہمیں چلانی ہے۔ یہاں کے معززین ـــــ"

"معاف کیجئے، آپ لوگوں میں خوشامدی درباری لوگ موجود ہیں ورنہ انہیں مشورہ دیا جاتا کہ عوام ووام کوئی چیز نہیں۔ اصل میں معاملہ معززین سے رکھنا چاہیئے۔"

گاڑی چل رہی ہے۔ دو صحافی بدمزاج ہو رہے ہیں۔ ایک غصے کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔

"پاک جمہوریت۔ پاک جمہوریت۔ یار یہ کیا فراڈ ہے۔ ہم کس قصے میں پھنس گئے ہیں۔ یہ ملک دو سو برس پیچھے جا رہا ہے۔ اپنی جان کی قسم یہ سب فراڈ ہے۔ اس میں کچھ نہیں ہے پیارے۔ یہ حکومت چل ہی نہیں سکتی۔ ان کے کوئی اصول نہیں ہیں۔ سب فراڈ ہے یار۔"

"آہستہ بول یار آہستہ!"

"ارے چھوڑ بھی، لعنت بھیج آہستگی پر۔ یہاں آج سب کی پول کھل گئی ہے۔ سالے ہم پڑھے لکھے لوگوں کو یوں تو بیوقوف بنانا ٹھیک نہیں ہے نا۔"

"عجیب دورہ یار عجیب دورہ۔ آخر بات کیا ہوئی۔"

"بات کیا ہونی تھی۔ یہ بھی ویسے ہی ہیں یار۔ بس ذرا کھ

لیا نہیں بھی؟"

"آخر ہوا کیا؟"

"ابے تجھے نہیں معلوم جب سے گاڑی اس صوبے میں داخل ہوئی ہے پاکستانی مسلمانوں کے لئے شراب بند ہے، یہ سالے یوروپین اپنی اپنی پی رہے ہیں۔ ہم شہر سے لاکر بھی نہیں پی سکتے۔"

"تو یار بے پئے گذار دے نا۔ آخر قانون وانون ہوتا ہی ہے۔"

"کیوں گذار دوں۔ یہ کیا قانون ہے۔ یہ کوئی روشن خیالی ہے بھئی۔ ارے میں ایک آزاد شہری ہوں۔ میں پینی چاہتا ہوں میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، قانون کیا چیز ہے! کاہے کا قانون!"

"نہیں یار، یہ سب فراڈ ہے۔ اسی لئے یہ اسکیم، یہ حکومت، یہ ملک، یہ سب کچھ فراڈ ہے۔ سب فراڈ ہے۔ سب ــــ"

ٹرین چل رہی ہے۔

خوش گمان، بے یقین کے سامنے بیٹھا ہے۔ بے یقین ایک ذہین پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ خوش گمان سے حقارت آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"اچھا ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا اچھا ہو رہا ہے؟"

"ڈیولپمنٹ کا کام ہو رہا ہے۔ تعمیر نو کا کام ہو رہا ہے۔ یعنی شاید یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

"کیا تعمیر نو، کاہے کی تعمیر نو؟"

"تعمیر نو۔ تعمیر۔ قوم کی تعمیر۔ ملک کی تعمیر۔"

"کھوکھلی جاہلانہ باتیں مت کرو۔"

(خاموشی)

بے یقین کھڑا ہو جاتا ہے۔

"سنو۔ بکواس مت کرو۔ یہ جو زمینداری ختم ہوئی جس پر سب اتنی بغلیں بجا رہے ہیں، یہ اس لئے نہیں کہ عوام کو فائدہ پہنچے بلکہ اس لئے کہ زمینداروں کی کمر ٹوٹ جائے اور وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ خفیہ دولت جو نکلوائی تو صرف دھونس جمانے کے نتائج دیکھنے کے لئے۔ مہاجرین جو بسائے تو سیاسی استحکام اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے۔ افسر نکالے تو پرانی دشمنیوں اور ذاتی ناپسند کی بنا پر اور یہ پلان ولان جو ہے نہایت غیر دانشمندانہ ہے۔ اس میں کوئی بات کام کی نہیں ہے اور یہ جو نئی جمہوریت کا چکر ہے، تو یہ ہمیں باندھ کر معطل کر دینے کی ترکیب ہے۔ سمجھ گئے۔ یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا۔"

"کچھ بولو گے نہیں؟"

"نہیں"

قافلہ چل رہا ہے۔

ریت کے میدان گزر رہے ہیں اور پڑھے لکھے لوگ ڈائننگ کار میں تاش کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔

"وَن نو ٹرمپ۔"

"ٹو سپیڈز۔"

"یار، تم کس کنونیشن کے ماتحت کھیلتے ہو؟"

پاتھر لڑ رہے ہیں اور ریت کے میدان گزر رہے ہیں۔ لائن کے دو رویہ ہزاروں بھوکی آنکھیں اور پیاسی روحیں نعرے لگا رہی ہیں۔ زندہ باد۔ پائندہ باد۔ زندہ باد؟ یہ کس کو زندہ باد کہہ رہے ہیں؟ کیا اس اکیلے آدمی کو جو ایک اکیلے کمرے میں سفر کر رہا ہے۔ وہ ایک عام سا آدمی ہے جیسے سبھی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ لمبا قد تو بہتوں کا ہوتا ہے، اچھی صحت بھی بہتوں کی ہوتی ہے، خوبصورت بھی بہت ہوتے ہیں، طاقتور بھی ہزاروں گزر رہے ہیں۔ پھر یہ کیوں زندہ باد کہہ رہے ہیں؟ یہ لوگ، یہ عوام، یہ ان پڑھ جانور نعرے کیوں لگا رہے ہیں؟

بے یقین تلملا رہا ہے۔

خوش گمان شوق سے دیکھ رہا ہے۔

"زندہ باد!"

"پائندہ باد!"

"فائیو سپیڈز"

"ڈبلڈ"

"ری ڈبلڈ"

"زندہ باد!"

"میں نے تو پارٹنر تم سے کسی امید پر کال بڑھائی ہے۔ تم یار

اچھا کھیلتے ہو۔ اور مجھے یقین ہے تمہارے پاس پتے بھی ہوں گے۔"

"زندہ باد!"

"زندہ باد! پارٹنر زندہ باد!"

آٹھ کروڑ آدمی ایک پارٹنر کی کال بڑھا رہے ہیں۔ یہ کال ریت کے میدانوں اور سیم اور تھور سے مجروح زمینوں کے سینے چیر کر آرہی ہے۔ پارٹنر اپنی ہمت افزائی پر مسکراتا ہے مگر پھر اپنے پتے غور سے دیکھنے لگتا ہے۔

ڈرائنگ کا رمیں صحافی، ادیب، افسر اور غیر ملکی بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں ریت کے میدانوں سے دلچسپی نہیں۔ وہ باہر نہیں دیکھ رہے دیکھیں کیا۔ باہر بنجر زمینیں، تار کے کھمبے اور مویشی ہیں۔ پاکستانی کسان بھی تو مویشی ہوتا ہے نا؟ سو وہ مویشیوں کو کیا دیکھیں۔ وہ سگریٹ پی رہے ہیں، اور تاش کھیل رہے ہیں اور شکایتیں جمع کر رہے ہیں۔

"آج کی خبریں نہ لاہور پہنچیں نہ کراچی۔ یہ تار آپریٹر میرا دشمن معلوم ہوتا ہے سالا۔ تمہاری خبریں پہنچیں؟"

"پہنچیں۔ ایک ایک لفظ پہنچ گیا۔"

"پھر میرا معاملہ کیوں خراب ہوا؟"

"وائرلیس کا معاملہ ہے، گڑبڑ ہوگئی ہوگی۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں یار۔ پھر ایسی مشینیں لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کے جوتے ماروں گا آج۔"

"ہزاروں لفظ جا رہے ہیں۔ شاید دوپہر تک کلیر ہو جائے۔ دیکھو نا کام کتنا ہے۔"

"کبھئی تم بھی اب کوئی تعمیر نو والے وکیل ہو گئے ہو۔ ہر بات کی تشریح ضرور کرتے ہو۔"

"اور تم؟"

"چھوڑو یار۔" کوئی اور بولتا ہے۔ "مثبت بات مت کیا کرو۔ مزا منفی باتوں میں ہی آتا ہے۔ کال دو کال ——"

"یہ سالا شوربا آج پھر خراب ہے۔"

"کھمبی اور لاڈ۔ مرغی اور لاڈ۔ کیا یاد آتا ہے تام اور کل پانچ کورس کا کھانا ملتا ہے۔ امریکہ میں تو ——"

"ارے یہ پورا ملک ہی بوگس ہے۔ یہاں تو آدمی وقت عزت کے ساتھ گذار دے تو بہت ہے۔ اب آج دیکھا تم نے ہمارے لئے کیسی پرانی موٹریں آئی تھیں اور بس تو جیسے کھٹر کھٹر کر رہی تھی ہم دور سے ہی دیکھ کے بھاگے۔"

ملتان پر ایک لاکھ آدمی جلسے میں آئے۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انہوں نے اس دن کپڑے بھی بدلے تھے۔ معمولی مگر اجلے کپڑے۔ وہ صحت مند تھکے ہوئے لوگ اس اکیلے آدمی کی ہر بات خاموشی سے سن رہے تھے۔

بے یقین بہت خفا تھا۔

"یہ اتنے سارے لوگ کیوں اس قدر بے وقوف ہیں۔ یہ کیوں آئے ہیں؟ اتنے آدمی تو ساری پولیس، ساری بسیں، ساری گاڑیاں بھی جمع نہیں کر سکتیں ضرور یہ لوگ خود آئے ہیں اور اسی لئے یہ بیوقوف ہیں۔"

"کیوں؟" خوش گمان مسکرایا۔

"اسلئے کہ اس ملک میں پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور کل گیارہ آدمیوں کے ہاتھ میں سب اختیار آگیا ہے اور یہ لوگ خوش ہیں۔ کیا انہیں خوش ہونا چاہئے؟"

"تم ناخوش ہو؟"

"ہاں"

"اگر تم کو ناخوش ہونے کا حق ہے تو انہیں خوش ہونے کا حق بھی ہے۔ تمہارا ان کا ووٹ برابر کا ہے نا۔"

"تم جاہل آدمی ہو۔ جانتے ہو تم جاہل آدمی ہو۔"

"مگر یہ آٹھ کروڑ ہیں۔ یہ اکثریت میں ہیں۔ تم دس ہو یا بیس۔ تم کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کے شیشہ جہاں تمہیں کچھ نہیں کرنا تھا۔ تم دن بھر کی تھکن نفرت خیزی، تیزی طراری اور فقرے بازی سے دور کرتے ہو اور یہ راتوں کو بھی دنوں کے بوجھ اٹھائے بے خواب نیند یا سوتے ہیں۔ انہیں اچھے فقرے بولنے بھی نہیں آتے۔ انہیں تمسخر، استہزا، طنز کا کام بھی نہیں آتا۔ جانتے ہو تم کیا چاہتے ہو اور یہ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، ذرا بتاؤ تو۔"

"تم اپنی آگ میں جلتے رہنا چاہتے ہو۔ تمہارے اندر دعا ہی بے چینی کی آگ ہے اور یہ بڑی اچھی بات ہے، مگر تم اس کا استعمال

نہیں جانتے۔ تم جانتے ہو کہ کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اس میں محنت کرنی پڑتی ہے اور تم محنت نہیں کرنا چاہتے۔ تم کو ایک گز زمین ملے تو ہزار گز مانگو گے اور ہزار گز ملے تو دس ہزار گز مانگو گے۔ مگر نہ تم ایک پر کام کرو گے نہ دس پر، تم صرف باتیں کرو گے۔ باتیں دلچسپ اور تیز باتیں، تم کچھ بھی کر اونہہ، کہہ دینے میں جو خود لذتی کا چسکا ہے۔ وہ کام میں نہیں پڑتا۔"

"ہوں۔ تو ہم بات نہ کریں۔ اب بات پر بھی پابندی ہے؟"

"نہیں۔ تم باتیں بنائے جاؤ۔ یہ لوگ کام کئے جائیں گے۔ پھر تم مر جاؤ گے اور یہ لوگ بھی مر جائیں گے اور دوسرے لوگ آجائیں گے جن میں سے کچھ باتیں بنائیں گے اور کچھ کام کریں گے اور پھر——"

"ہوں۔ تو بھئی کام سے کیا مطلب ہے تمہارا۔ یہ نہروں و بہروں کا کام۔ پاور ہاؤس، چھوٹی بڑی صنعتیں، پل، مسجد، چاہ، تالاب، خیر کے اسباب چاہتے ہو تم۔ فصلیں اچھی ہو جائیں۔ خوراک میں خود مکتفی ہو جائیں ہم۔ ہے نا۔ یہی چاہتے ہو؟ کشمیر و کشمیر مل جائے۔ زرِ مبادلہ جمع ہونے لگے۔ بیلنس آف پے منٹ۔ بیلنس آف پیمنٹ پر مر رہے ہو۔ سڑکیں بناؤ گے، ریلیں زیادہ ہوں، اسٹیمر زیادہ ہوں، جیٹ چلنے لگیں، کاغذ عمدہ بنے، تعلیم عام ہو۔ یہی کام ہیں نا؟"

"اس وقت تو یہی کام ہیں۔"

"بس؟"

"بس۔"

"اور دل و دماغ کہاں جائیں؟"

"اپنی اپنی جگہ رہیں اور کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دو۔"

"ہوں! اور ان سب چکروں میں گیارہ آدمیوں کا چکر چل رہا ہے اور یہ ایک اکیلا آدمی جو چاہے کرے۔"

"کام بھی تو اس ایک اکیلے آدمی نے شروع کیا ہے اور اب تو پھر الکشن پارٹی چل پڑی ہے۔ الکشن لڑو نا تم۔ کونسل میں آؤ۔ ضلع میں آؤ۔ صوبے میں آؤ اور پھر مرکز میں آؤ اور پھر جو جی چاہے کرو۔ باقیوں کو اپنے ساتھ ملاؤ پھر جہاں جو چیز غلط سمجھو اسے رد کر دو۔"

"کیسے رد کر دو؟"

"اپنی اکثریت بنا کر۔ اپنی پچھتر فی صدی اکثریت سے تم نیا دستور بنا لینا۔"

"یار اب تم بچکانہ باتیں کرتے ہو۔"

اب تو فن کمان خطے میں آ جاتا ہے۔

"دیکھو میرے بے یقین بھائی! مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس لفظوں کی تنگی ہے۔ میں اور زبانیں نہیں جانتا۔ معلوم ان میں کیسے بات کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں دقت یہ ہے کہ مشکل تہ دار لفظ بہت کم ہیں اور ہم سادہ الفاظ بولتے ہیں۔ سادہ الفاظ پوچ اور گھٹیا معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً میں کہوں کہ ملک میں کام کی ضرورت ہے تو یہ بڑی سطحی اور بودی بات لگتی ہے اور تم اپنی آکسفورڈ اور کیمبرج اور ہارورڈ کی تعلیم یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ہو۔ تمہیں بڑے بڑے مقررین یاد آ جاتے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں تمہاری آنکھوں کے آگے ناچنے لگتی ہیں اور تم یہ بھولے رہتے ہو کہ تم کس سرزمین پر کھڑے ہو۔ تم یہ بھولے رہتے ہو کہ یہاں ایک مانچسٹر ایک شکاگو نہیں ہے یہاں تو ٹنڈو آدم اور قصور اور کوہاٹ ہے سنتھاہار و رانگاماٹی ہے۔

"تم امریکہ گئے ہو؟"

"گیا ہوں۔"

"تم نے امپائر اسٹیٹ بلڈنگ دیکھی ہے؟"

"دیکھی ہے۔"

"تم نے کولمبس کے ساتھ سفر کیا تھا؟"

"کیا مطلب! یہ کیا بکواس ہے؟"

"تم نہیں تھے نا اس کے ساتھ۔ بس تو تم نہیں جانو گے کہ کولمبس سے آئزن ہاور تک لوگوں کو کیا کچھ کرنا پڑا۔ تم تو تین ڈالر کی ایک کتاب خرید لو گے جس میں اسپوتنک دور میں عالمی سیاسی پیچیدگیوں کی قسمیں بتائی گئی ہوں اور وہ پڑھ کر تم غمزدہ ہو جاؤ گے کہ کاش اس ملک میں ان میں سے آدھی پیچیدگیاں ہی پیدا ہو جائیں تاکہ تمہاری شامیں اور ڈنر پارٹیاں اور کاک ٹیل پارٹیاں اچھی گذریں۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ پورا ملک گھنے جنگلوں سے بھرپور امریکہ کی طرح پڑا ہوا ہے جس میں آٹھ کروڑ کولمبس گھوم رہے ہیں اور تم ان سب آٹھ کروڑ کولمبسوں کے سر پر تسمہ پا کی طرح سوار ہو جانا چاہتے ہو کہ وہ جدھر جائیں تم ادھر کی طرف موڑ دو

میری بات مانوگے؟

"کہو، ماننا نہ ماننا تو میرے اختیار میں ہے"

"تم اپنے تسمے جیسے پاؤں ڈھیلے کر کے انگور کے کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر کاک ٹیل پیو اور کتابیں پڑھو — تم نے بارہ برس ایک تماشہ دیکھا۔ اب بارہ برس نہیں تو چار پانچ برس اور سہی۔ جو آدمی کام کرتا ہے وہ اپنے طریقے سے کرتا ہے دوسرے کے طریقے سے نہیں کرتا۔ تم ابھی ذرا ان پڑھ جانوروں کو آدمی بنا لینے دو، نہریں بہنے دو، پاور ہاؤس لگنے دو، صنعتیں جاری ہونے دو، تعلیم پھیلنے دو، مہاجروں کو بسنے دو، زمینداری ختم ہونے دو۔ تم آرام سے بیٹھو۔ جو کام کر رہے ہیں انہیں کام کرنے دو۔ پہلے گھر بننے دو، پھر گھر آراستہ کرنے کی باتیں کرنا۔ اس زمین پر بنیادیں ٹیڑھے ترچھے کھنچ گئی تھیں —— معاف کرنا میں ایک ملکی زبان میں بول رہا ہوں ——"

"بولے جاؤ۔ میں نہیں سن رہا!"

کوئی آدمی اکیلے آدمی کے ساتھ نہیں تھا اور ہوتا بھی تو اس کے ذہن کی تصویر کیسے لیتا؟ مگر خوش گمان نے ادب لپیٹے لپیٹے ایک کیمرہ بنایا اور اس طرف لگا دیا جدھر وہ اکیلا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک پردے پر اس کی تصویر ابھری۔ اس نے دیکھا کہ وہ اکیلا آدمی یا تو پڑھتا ہے یا سوچتا ہے، یا کام کرتا ہے یا سوال و جواب کرتا ہے۔ اس اکیلے آدمی کے سامنے آٹھ کروڑ چہرے ہیں جن میں سے کچھ پر نفرت اور حسد کے آثار ہیں اور کچھ خوشی سے تمتمائے ہوئے ہیں اور باقی بے رنگ، بے کیفیت چہرے جیسے اپنے تاثرات کے منتظر کھڑے ہیں اور انہیں جیسے جیسے تاثرات ملتے جاتے ہیں ان کا اظہار ہوتا جاتا ہے۔ وہ اس اکیلے آدمی کا کام دیکھ رہے ہیں اور وہ اکیلا آدمی کام کر رہا ہے۔ اس کے ذہن کے کئی خانے ہیں، کسی میں ماضی ہے، کسی میں حال، کسی میں مستقبل، کسی میں اسکیمیں، کسی میں تجزیے، کسی میں انتظامی پیچیدگیاں۔ وہ یہ صاف طور پر جانتا ہے کہ اس نے روایات کے خلاف بغاوت کی ہے اور لوگ روایات کے باغیوں سے بدکتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ایک عام آدمی ہے اور ایک نہ ایک دن مر جائے گا اور اگر وہ بغاوت نہ کرتا تو اسے چند لوگ ضرور روتے اور کوئی خوش نہ ہوتا مگر اب یا تو آٹھ کروڑ آدمی روئیں گے یا آٹھ کروڑ آدمی خوش ہوں گے۔ اور یہی آٹھ کروڑ نہیں بلکہ اگلے آٹھ کروڑ یا دس کروڑ اور ان سے اگلے آٹھ یا دس کروڑ اسے اچھے یا برے لفظوں سے یاد کریں گے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک سچائی بھی ہوتی ہے جو نہ کسی کے رونے سے فروغ پاتی ہے نہ کسی کے ہنسنے سے مٹ جاتی ہے۔ اور یہ کہ اسے اس سچائی کی تلاش کرنی ہے۔ وہ یہ سب جانتا ہے اور اسی لئے اپنے بے حد و بے حساب اختیارات کے باوجود انہیں جذبات سے مغلوب ہو کر استعمال نہیں کرتا۔ وہ کھلے اعتراض سنتا ہے اور ڈھکے چھپے مخالفوں سے بھی واقف ہے۔ خوشامدیں اس کے گرد حصار ڈالے جاتی ہیں۔ طنز و تشنیع اس کے گرد الاؤ جلائے ہوئے ہیں۔ اس کا ملک اسے دیکھ رہا ہے۔ دوسرے ملک اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے پیچھے تاریخ ہے۔ شاندار، ثروت والی، دولت مند تاریخ جہاں سے اسے سقراط، ارسطو، ڈیکارٹ، کانٹ، مارکس جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے سامنے بھی تاریخ ہے جس میں ہزاروں پلوٹارک، ہزاروں طبری، ہزاروں ملا بدایونی، ہزاروں گبن، ہزاروں ہٹی نظر آتے ہیں۔ وہ سقراط اور ارسطو کو بھلا سکتا ہے، مگر پلوٹارک، طبری اور بدایونی اور گبن کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا جو اس کے بعد اسکی تاریخ لکھیں گے، نہ وہ اس طاقت کو دھوکہ دے سکتا ہے جو اس سے بڑی بڑی طاقتوں کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے اور جس کا نام عرفِ عام میں خدا ہے۔ خدا جو ماضی، حال اور مستقبل کا نام ہے، جو فوجوں، جہازوں، بموں اور دلیلوں کو لمحہ بھر میں خاک کر دیتا ہے، جسے نہ ماننے والے بھی اس کے مختلف نام رکھتے رہتے ہیں اور ان ناموں کو اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ خدا، چانس — اتفاق، واہمہ، لاعلمی۔ وہ کچھ بھی ہو، وہ ہے اور یہ اکیلا آدمی جانتا ہے کہ وہ ہے۔ اور وہ اس کے آگے اپنی ایک ایک بات کا ذمہ دار ہے کیونکہ اب وہ آٹھ کروڑ آدمیوں سے متعلق ہے جو حال اور مستقبل کی امانت ہیں اور جن سے کھیلنے والوں کے انجام اچھے نہیں ہوئے۔ اس نے اپنی پشت پر آٹھ کروڑ آدمیوں کا بوجھ اٹھا لیا ہے اور ایک ایک قدم ناپ تول کر چل رہا ہے۔

خوش گمان، بے یقین کی طرف دیکھتا ہے جو آرام سے سو رہا ہے۔

اس کا سکن لحاف ایک طرف ہو گیا ہے۔ اس کی تسوے کی گھڑ بھی ہل گئی ہے، اس کا پارکر قلم اور اسپینگ دوروے کے مسائل "بائیں ہاتھ کو ایک خانے میں رکھے ہوئے ہیں۔ بیڑی کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی ہے جس سے گونا گوں فلسفوں کی جھلکیں آ رہی ہیں۔

"زندہ باد!"

"پائندہ باد!"

فرید پور میں ایک لاکھ آدمی جمع ہیں۔ سنتھا ہار میں پچاس ہزار۔ گوالندو کی بندرگاہ سے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی کشتیاں میری اینڈرسن اسٹیمر کے ساتھ ساتھ چل پڑی ہیں۔ ان میں مشعلیں جل رہی ہیں۔ بنگالی ماہی گیر اکیلے آدمی کو اچک اچک کر دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں۔ انہیں دلوں کے چراغ درکار ہیں اور دلوں کے چراغ اچھے بھات اور اچھے پٹ سن اور اچھے نیشکر سے جلتے ہیں۔ ایک وعدے ایک پیغام، ایک سیاسی داؤ، ایک نیشنل اسمبلی سے نہیں جلتے۔ ایک غزل سے نہیں جلتے۔ ایک افسانے سے نہیں جلتے۔ ان کا مخزن کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس اور پریس کلب نہیں ہے۔ نہ کالج ہے نہ یونیورسٹی۔ یہ چراغ معدے کی تہوں کے خلا پر کرنے سے جلیں گے۔ ان کے معدے میں چربی چاہئے جس کے لئے زرمبادلہ چاہئے۔ جس کے لئے سمگلنگ کم اور پیداوار زیادہ کرنی پڑے گی، جس کے لئے سیاسی استحکام ضروری ہے، جس کے لئے یہ اکیلا آدمی بہت دن منتظر رہا اور جس سے بے یقین خوش نہیں ہے کیونکہ اس کی کافی بدمزہ اور چائے ترش ہو گئی ہے اور ملک میں ترقیاتی منصوبے بنا کر ان پر عمل بھی کیا جا رہا ہے لیکن اخباروں میں چٹپٹے اداریے نہیں ہیں، سیاسی پارٹیوں کی لڑائیاں نہیں ہیں جن سے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں کی جِلا ہوتی تھی۔ نئے بے نام نشان لوگ اوپر چڑھ آئے ہیں اور کام کام پکارتے ہیں اور ایک آدمی پچاس برس کی عمر میں کام بتانے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

ٹرین جا رہی ہے۔

ٹرین بنگال کے سبزہ زاروں سے گذرتی ہے۔ پھر قافلہ اسٹیمر میں چلتا ہے، پھر ہوائی جہازوں میں اڑتا ہے۔ بے یقین کو یہاں بھی وہ نشست ملی جس کی کھڑکی جہاز کے پنکھے کے اوپر کھلتی تھی۔ بے یقین، چٹاگام سے ڈھاکہ تک ایک خوشنما منظر سے محروم ہے اور کھول رہا ہے اپنی نشست ایک چھٹ بھیئے صحافی نے دبالی ہے جس کی تنخواہ دو سو روپے ہے اور جو صرف بنگلہ جانتا ہے اور ایک موٹا بے استری کیا ہوا کوٹ پہنے ہوئے ہے اور برابر باتیں کئے جاتا ہے۔ اور بے یقین کی آمدنی اسے کھائے جاتی ہے۔ اس نے اپنی کتاب مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی ہے اور الفاظ خالی خولی اس کے آگے گھوم رہے ہیں کیونکہ اصل میں وہ اپنی خراب نشست سے جل رہا ہے اور اس صحافی کا دشمن بن گیا ہے۔

ہوائی جہاز اترتے ہیں اور لوگ موٹروں اور بسوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اسٹیمر چلنے لگتے ہیں۔ غیر ملکی لوگ حیران ہیں۔ وہ ایک ایک بات نوٹ کرتے ہیں، وہ منتظر ہیں کہ کوئی ان کو ... (CULTIVATE) کرنے آئے کوئی ان سے لجاجت آمیز گفتگو کرے اور ان کی "ہمدردیاں" حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک ایک لفظ کا ترجمہ سنتے ہیں، ایک ایک سوال اور ایک ایک جواب کا اقتباس لکھتے ہیں، وہ بڑے بڑے مجمعوں کو پریشان نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کہیں کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی شورش نہیں۔ یہ وہ ملک ہے جہاں سائمن واپس جاؤ، ڈیوک واپس جاؤ کے نعرے لگ چکے ہیں، جہاں زبان کے مسئلے پر گولیاں چلی ہیں، جہاں ایک فلیتہ بڑے بڑے پہاڑوں کو بھک سے اڑا دیتا ہے۔ یہاں سب لوگ اس سے خوش کیوں ہیں؟

"کیا یہ سب لوگ نامرد ہو گئے ہیں؟"

"نہیں، کام میں لگ گئے ہیں!"

اکیلا آدمی جذباتی باتیں نہیں کرتا۔ اس بات سے خوش گمان بھی خوش نہیں ہے۔ وہ سیدھی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ وہ کام کیلئے کہتا ہے۔ اس نے ایک نیا جمہوری تجربہ کیا ہے، وہ اس تجربے کی تبلیغ کر رہا ہے۔

تجربے اور ایجادیں اکیلے لوگ ہی کرتے ہیں اور ہر ایسے آدمی کو شروع میں ہی کشٹ اٹھانے پڑتے ہیں اور جو اس کے ساتھ ہوں انہیں طرح طرح کے الزام لگتے ہیں اور پھر یہ سب ختم ہو جاتا ہے اور تجربہ کامیاب ہو کر سب کی رگ و پے میں جاری ہو جاتا ہے۔ وہ دعوے جن کے لئے کوئی سولی پر چڑھا دیا گیا، وہ کتابیں جن کے لکھنے والوں

کو پتھر مارے گئے، وہ یونیورسٹی جس کے بنانے والے کا مدتوں مذاق اڑایا گیا، وہ سب آج جاری و ساری ہیں مگر معترضین آج بھی چولے بدل بدل کر چلے آرہے ہیں۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء تک کتنے بے یقین خوش گمان بن گئے — شاید لاکھوں کروڑوں۔

مگر بے یقین باقی رہے گا۔ بے یقین کا باقی رہنا ضروری ہے۔ یہ قافلہ خوش گمانوں کے لئے ہی نہیں ہے۔ بے یقینوں کے لئے بھی ہے ان کے بغیر خوش گمانی کا وجود نہیں رہ سکتا۔ اکیلے آدمی کو بھی بے یقین چاہئیں۔ اکیلا آدمی کمیٹیوں، قصبوں، شہروں میں کام کرتا رہے گا اور کافی ہاؤس میں اس پر اعتراض ہوتا رہے گا اور کھیت ہرے بھرے ہو جائیں گے اور مل بننے لگیں گے اور سڑکیں نکل آئیں گی اور زرمبادلہ بچنے لگے گا اور تعلیم عام ہو جائے گی اور اور کافی بدمزہ ہوتی رہے گی اور چائے تلخ۔ زندگی بہت گوناگوں چیز ہے۔

اکیلے آدمی! تم کام کرو۔ ہم اعتراض کریں گے۔ ہم تعریف بھی کریں۔ مگر ہم کو اعتراض میں مزہ آتا ہے اس طرح ہمارے دوست ہماری عزت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں دانشمند اور بے چین جاننا ہی پسند کرتے ہیں ورنہ وہ ہمیں پسند نہیں کرتے کیونکہ ہم "اسپوتنک دور کے سیاسی مسائل" کے طالبعلم ہیں اور ہمیں دہقانوں، مزدوروں، بیواؤں، یتیموں، محتاجوں سے دلچسپی اتنی ہی ہے کہ ہم ایک نظم کہہ دیں یا مضمون لکھ دیں یا اداریہ کھینچ دیں۔ ہم نہ ان میں سے ہیں نہ ان کے مسائل سے گتھے ہوئے ہیں۔ تم ان کے لئے کام کرو اور ہم تم پر اعتراض کریں گے۔ اعتراض انسان کی جبلت ہے اعتراض اور شکایت کے سوتے خشک ہو جائیں تو انسانی ارتقا ختم ہو جاتا ہے۔ تم کام کئے جاؤ، ہم باتیں بنائے جائیں گے۔ ہمیں نوکری دو گے تو وہ لے لیں گے، سیاحت کراؤ گے تو خوشی سے کریں گے، الکشن لڑواؤ گے تو خوشی سے لڑیں گے، ہم کو سب مراعات چاہئیں، ہم کو سب فوائد درکار ہیں، ہم کو سب وظیفے، نقدیاں، انعامات، سب کچھ چاہئے، وہ ہم ہر ایک سے لیتے رہے ہیں اور تم سے بھی لیں گے اور دو گے تب بھی باتیں بنائیں گے اور نہ دو گے تب بھی۔ ہم اپنا الگ کلچر رکھتے ہیں اور وہ ہے کافی ہاؤس کلچر۔ ہمارا کلچر ہمیں ٹھہر کر سوچنا اور کام کرنا نہیں سکھاتا۔ کام ہے بھی کہاں یعنی ہماری مرضی کا کام کیونکہ کام تو ہم اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً ہم سب صدر پاکستان ہونا چاہتے ہیں یا کم از کم محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائرکٹر ہونا چاہتے ہیں اور ہم میں سے جو کچھ بنتے جائیں ان کو برا بھلا کہنا چاہتے ہیں اور جو کوئی آدمی کوئی مثبت بات کرے اسے خوشامدی، ٹوڈی، جاہل، زمانہ ساز، خود غرض اور بہت عزیز ہوا تو مجبور، غریب، محتاط کہہ کر دل ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں منفی لہریں مثبت لہروں سے زیادہ جلد کھینچ لیتی ہیں۔

ہم بیس برس پہلے پاکستان کے نعروں سے بھی ایسے ہی دل برداشتہ تھے جیسے آج نئے پاکستان کے وجود سے ہیں۔ ہم اسوقت جناح اور لیاقت کا مذاق اڑاتے تھے اور ان پر صبح و شام اعتراض کرتے تھے۔ ہمیں اپنی کافی، اپنی چائے کے لئے ایندھن چاہیئے۔ اکیلے آدمی ہمارا ایندھن سب بڑے اور چھوٹے لوگ ہیں۔ ہم کنفیوشس کو ذرۂ بے مقدار سمجھتے ہیں۔ ہم گوتم بدھ کو گاؤدی ملائم آدمی کہتے ہیں۔ ہم نے مسیح کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔ ہم نے محمدؐ کے پتھر مارے تھے ہم نے بڑے بڑے فلسفیوں کو تاریک کوٹھڑیوں میں بند کرا دیا اور ان کی کتابیں تک جلا دیں ہم نے مارکس کو جلا وطن کر دیا۔ ہم ہر نئی بات سے بلکہ ہر بات سے چراغ پا ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ہم آئزن ہاور اور خروشیف، دونوں کو حقیر فقیر ناچیز سمجھتے ہیں۔ ہم تمہیں نہیں مانیں گے۔ ہم تمہیں مانیں تو ہماری کافی ٹھنڈی ہو جائے اور ہمارے دل و دماغ کھردری زمینوں کی طرح سوکھ جائیں۔ ہم اپنے گھروں میں بیرے اور خانساماں رکھنا چاہتے ہیں اور جب وہ مل جائیں تو ہم انہیں دال کھلا کر خود مرغی کھاتے ہیں۔ اور نہ ملیں تو دال کھا کھا کر پورے معاشرے، پوری دنیا کو گالیاں دیتے ہیں۔ تم جو چاہو کرو، ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تم کیوں کر رہے ہو؟ تم نے زمینداری ختم کر دی تو ہم نے اس میں کیڑے نکالے۔ تم ختم نہ کرتے تب بھی ہم کیڑے نکالتے۔ اب تم بنیادی جمہوریت کا تجربہ کر رہے ہو تو ہم اسے برا ہی کہیں گے جب وہ کامیاب ہو گیا تو ہم اس کے فوائد اٹھائیں گے اور پھر کسی اور بات کو برا کہیں گے۔ تم ٹرین چلاؤ تو ہم اس پر تمہارے ساتھ چلیں گے اور سیر کریں گے اور دن کو اچھے اچھے کھانے کھائیں گے

اور شام کو اعتراض کریں گے۔ یہ ہماری غلطی ہے، یہ ہمارا نقص ہے، یہ ہماری زندگی ہے۔ پلٹنوں کا فرق ہے تم کو کام سے ہم کو اعتراض کہ ہم اپنا اپنا کام کرتے ہیں

مغربی پاکستان کی ریتیلی ڈھری سہی اور مشرقی پاکستان کی سرسبز و شاداب اور نا قوں ماری زمین پر یہ قافلہ سولہ دن چلا اور اس میں کوئی پچاس لاکھ آدمی شریک ہوئے یعنی وہ جنہوں نے اکیلے آدمی کی تقریریں سنیں، اسے دیکھا اور اس سے سوال و جواب کئے۔ اور وہ جو اسے دیکھنے سرد راتوں میں بیل گاڑیوں اور چھوٹی کشتیوں میں اور پیدل پچاسیوں میل سے چل کر آئے اور پھر اسے نہ دیکھ سکے مگر پھر بھی ان کے تلووں کے کانٹے اور چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں اور طویل و عریض دریاؤں کی لہریں گواہ ہیں کہ ۔ اس قافلے میں ان کے دل شریک ہوئے۔ سو یہ سب کچھ پچھلے دو مہینے میں ہوا اور آٹھ کروڑ آدمیوں پہ پھیل گیا اور یہ سب اس لئے ہوا کہ ڈیڑھ برس سے اس ملک میں ایک نیا اور اکیلا آدمی کام کرنے اٹھ کھڑا ہوا ہے جس نے بہت سے مسائل حل کر دئے ہیں اور بہت سے مسائل حل کرنا چاہتا ہے۔

اور۔ اور اس اکیلے آدمی کو وہ یہ نیا نیا تجربہ کرتے بے خوف اور با اختیار جج بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں اور وہ ہیں؛

خدا اور مستقبل! خدا اور مستقبل!!

*

می نگارم معنیٔ جمہوریت ۔ تو منبی و حکومت نائبت
گر بچے بینی زدہ بیگشتہ ۔ لازم آید چارۂ سرگشتہ
پیش ما بہ لفظیں تن شہید ۔ لب ز حق بستن نیفزاید عدد
پس چہ موسیٰ دانش با فرعون گو ۔ بہ سنگال اے رستگاری باز جو
کہ بخشند یار ہتوانند برد ۔ کرسی اعزاز بتواند برد
(ز مثنوی ۔ ۲۰ ۱۹۵۲ء)

خزاں سے بہار تک

بشیر فاروق

یادِ ایام کہ تھا ذہنِ سیاست بیمار
یاد آیا میکدہ مفلوج تھا ہر جذبۂ کار
تھا کوئی گیسوئے سلسلئے قیادت کا اسیر
تھا کوئی صوبہ پرستی کی اداؤں کا شکار
کوئی منصب کے لئے بیچ رہا تھا غیرت
تھا کوئی لیلیٔ مخلوط نیابت پہ نثار
نعرۂ ملتِ پختون کسی کو مرغوب
بھول بیٹھا تھا کوئی ربط و اخوت کا شعار
جان دیتا تھا حریفانہ ادا پر کوئی
تھا کوئی اپنی وفاؤں کے سبب قابلِ دار
خونِ انسان کا انسان یہاں پیتا تھا
بندۂ جبر کو جینا بھی ہوا تھا دشوار
ملک و ملت کی وہ تقدیر بنے بیٹھے تھے
جن کا مسلک تھا، نہ ایماں تھا نہ کوئی کردار
ان کے افکار سے نالاں تھے سراسر جمہور
ان کے اطوار سے تھی ساری خدائی بیزار
خود اسی قصر کی بنیاد کے در پے تھے یہ لوگ
آہ جس قصر کے تھے قائد اعظمؒ معمار
ہم وہ ناداں کہ انہیں پیرِ مغاں سمجھے تھے
جو نہ میکش تھے نہ ساقی تھے نہ پیمانہ گسار
بانکپن چھین لیا عہد خزاں نے ہم سے
لوٹ لی بادِ مخالف نے گلستاں کی بہار
چشمِ افلاک سے حالات یہ دیکھے نہ گئے
اس سے دیکھا نہ گیا عظمتِ ملی کا فشار
ناگہاں قسمتِ اربابِ وطن جاگ اٹھی
کام آکر ہی رہی درد کے ماروں کی پکار
کشورِ پاک کی بدنام سیاست بدلی
شکر صد شکر کہ ناکام قیادت بدلی

سیارۂ گیتی خرام

جمیل نقوی

زمزمے سلطانیٔ جمہور کے گاتی ہوئی
یوں چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نشۂ جمہوریت میں ہر قدم پر جھومتی
میکشانِ حریت کو وجد میں لاتی ہوئی
راز بتلاتی ہوئی آزادیٔ جمہور کے
جذبۂ احساسِ خودداری کو گرماتی ہوئی
مضطرب کرتی ہوئی نخوت پسندوں کے ضمیر
شر پسندوں کے دلوں پر تیر برساتی ہوئی
اپنے اعمالِ گذشتہ سے ہوں خود ہی شرمسار
خودغرض شکلوں کو یوں آئینہ دکھلاتی ہوئی
سرکشوں کو سرنگوں کرتی دیا احساس پر
زعمِ باطل توڑتی فتنوں کو ٹھکراتی ہوئی
دشت و صحرا سے گذرتی بستیوں پہ ٹھیرتی
گلشنِ ملت کے ہر غنچہ کو مہکاتی ہوئی
لہلہاتی کھیتیوں کو بخشتی حسنِ دوام
وادیٔ مہران کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
پنجند کی نقرئی لہروں سے موتی رولتی
راوی و جہلم کی موجیں رقص میں لاتی ہوئی
سینۂ آبِ رواں پر ڈولتی مستانہ وار
سرزمینِ ریشۂ زریں کو لچکاتی ہوئی
چائے کے باغوں کے ڈھلوانوں کے زیر و بم کیساتھ
بھینی بھینی خوشبوؤں کو اور پھیلاتی ہوئی
دھان کے کھیتوں کی ہریالی پہ نظریں ڈالتی
سبز پرچم کے تقدس کی قسم کھاتی ہوئی
شاعرِ مشرق نے جس کے واسطے کی تھی دعا
ہاں! وہی نورِ بصیرت عام فرماتی ہوئی

اے نقیبِ حریت، اے داعیٔ امن و سلام
اے نفیرِ انقلاب، اے دشمنِ کہنہ نظام
اے نسیمِ جانفزا، اے کاشفِ رازِ چمن
اے صبا رفتار قاصد، اے سفیرِ تیز گام
اے سریع السیر پیکر، اے نشانِ اتحاد
اے امیدِ قوم، اے سیارۂ گیتی خرام
اے دلوں کو درس دیتی، عزم کا تنظیم کا
اے نشیدِ حریت، اے نعرۂ قلبِ عوام
کوہ پیما زلزلوں کا ہمہمہ تیرا سکوت
برق آسا ولولوں کو تیرے سینہ میں دوام
تجھ سے بینا دیدۂ تہذیب و چشمِ ارتقا
تو نے انساں کو سکھایا، زندگی کا احترام
تجھ سے باطل، اہلِ باطل کی ستم آرائیاں
تجھ سے برہم دشمنانِ ملک و ملت کا نظام
تیری ہیبت سے ہے زلفِ فکرِ کاذب منتشر
تجھ سے آساں اہلِ دانش پر جنوں کا اہتمام
تو نے ثابت کر دیا ہے باہزاراں انقلاب

یوں زمانہ تھام لیتا ہے مقدر کی زمام
تو نے گرمایا فسردہ دل جوانوں کا لہو
نوک پہ نغمہ بہ لب، شعلہ بجاں، آتش بجام
تیرے پرتو سے چراغاں اتحادِ شرق و غرب
تیرے جلووں سے فروزاں اعتبارِ صبح و شام
تیرے محور پر لچکتی ہے کمر اقتدار کی
تیرے مرکز پر سمٹتا ہے زمانہ کا نظام
تو ہے شکوہ سنجِ افتادِ جمودِ عصر سے
زندگی تیرا ترانہ، آگہی تیرا پیام
تو نے انساں پہ کئے ہیں فاش اسرارِ حیات
ہے ترا ایک اک نفس عہدِ عملِ انساں کے نام
تیرا مسلک اک نئی جمہوریت کی ابتدا
تیرا مقصد ملک میں اقدارِ صالح کا قیام
رہروِ درماندہ پا کے واسطے مہمیز ہے
تیرے نغموں میں حدی خوانوں کا سوز ناتمام

۳

ہم نے دیکھے ہیں زمانہ کے ہزاروں انقلاب
رہزنی کا جوشِ مستی، رہنمائی کا شباب
ہر طرف چھائی ہوئی تھی اک بھیانک تیرگی
زندگی تھی یا سرِ شب نیم دیوانہ کا خواب
مسکراتی تھی زلیخائی ہوسِ دنیا رہے
یوسفِ عصمت سربازار، رسوا، بے نقاب
لیلئِ احساسِ خودداری کا چہرہ خونچکاں
سینۂ آزادیِ جمہور زخموں سے خراب
بے کسی کی دھند میں لپٹے ہوئے ماہ و نجوم
بے بسی کی ظلمتوں میں بجھ رہا تھا آفتاب
سازشوں پہ نازشِ اربابِ حل و عقد کو
شاطری تھی مدرسوں میں جزوِ تعلیمی نصاب
تل رہا تھا علم میزانِ عیارِ جہل پر
ثانیِ آئینۂ دانش تھا ہر عزت مآب
غیرتِ احساس آغوشِ ہوس میں دم بخود
رقص فرما خلوتِ زاہد میں لیلائے شراب
دوڑتے پھرتے تھے طولِ عرضِ پاکستان میں
ایک امتِ بے پیمبر، کتنے مرسل بے کتاب
جن کا ہر وعدہ شرابی، ہر عمل بادِ ہوا
جیسے اک کوزہ میں طوفاں جیسے ساغر میں حباب
دستِ آہن تھا لبِ آزادیِ گفتار پہ
ہر ستم جائز ٹھہرتا تھا بنامِ سدِّ باب
کاغذی تھا پیرہن ہر پیکرِ تعمیر کا
ایک منصوبہ تھا ہر لفظِ شکایت کا جواب
طوطی و نقارخانہ کا سماں درپیش تھا
گھٹ کے رہ جاتی تھی ہونٹوں میں نوائے سینہ تاب
پانی پانی ہوگیا تھا اہلِ دانش کا لہو
اڑ چلی تھی غیرتِ قومی کی تلواروں کی آب
یک بیک گونجی فضاؤں میں صدائے مردِ حق
زندگی کے پاسبانو، زندگی سے اجتناب
جاگ بھی اٹھو کہ دورِ خود فراموشی گیا
تابکے یہ بے حسی، تا چند یہ غفلت، یہ خواب؟

۴

آؤ مل کر اک جہانِ تازہ تر پیدا کریں
بطنِ شب سے ایک تابندہ سحر پیدا کریں
جن کی تابانی سے روشن ہو فرازِ آسماں
سرزمینِ پاک سے شمس و قمر پیدا کریں
قلب کی گہرائیوں میں بھر کے سوز و سازِ عشق
اپنے نالوں میں قیامت کا اثر پیدا کریں
ڈس رہی ہے زندگی کو میکدہ کی تیرہ رات
جامِ مے چھلکائیں، انوارِ سحر پیدا کریں
بخش دیں جو غم نصیبوں کو تب و تابِ حیات
قلبِ افسردہ میں وہ برق و شرر پیدا کریں
جن کی نظریں جھانک سکتی ہوں ضمیرِ عصر میں

وہ خودی بیدار، مستقبل نگر پیدا کریں
جن کے اک ادنیٰ تبسم سے بہاریں جاگ اٹھیں
وہ چمن آرا و اربابِ نظر پیدا کریں
روحِ آزادی میں بھر دیں گرمیٔ تکمیلِ شوق
سوزِ دل پیدا کریں، سوزِ جگر پیدا کریں

آج پھر بیدار ہے چشمِ تقاضائے حیات
آج پھر حاصل ہے احساسِ غمِ دل کو ثبات
آج پھر دل میں چھلکتی ہے مئے حُبِّ وطن
آج پھر تقدیر نے تدبیر سے کھائی ہے مات
آج پھر دستِ تدبر میں ہے فطرت کی زمام
آج پھر بدلا نظر آتا ہے نظمِ کائنات
آج پھر نشو و نما کی قوتیں بیتاب ہیں
آج پھر گندم کے ہر خوشہ میں غلطاں ہے حیات
آج پھر کھیتوں کی ہریالی ہے فردوسِ نظر
آج پھر دہقاں ہے بے پروائے برقِ حادثات
آج پھر پھولوں کی شادابی سے روشن ہے چمن
آج پھر نغموں سے گونجا ہے جہانِ شش جہات
آج پھر محمود کے شانہ بہ شانہ ہے ایاز
آج پھر سرمایۂ انسانیت ہے حُسنِ ذات
آج پھر فرہاد کا تیشہ ہے سرگرمِ عمل
آج پھر پرویز ہے صیدِ زبونِ ممکنات
آج پھر بیدار ہے وہ نبض جو سکتے میں تھی
آج پھر ہشیار ہیں کہنہ مریضانِ سُبات
آج پھر جمہور کے سینوں کی دھڑکن ہے جواں
آج پھر فکر و عمل پر کھل گئی راہِ نجات
آج پھر فن کار کو آزادیٔ اظہار ہے
آج پھر کھل کر بیاں ہوتے ہیں دل کے واردات
آج پھر دستِ تظلم بستۂ قانون ہے
آج پھر مظلوم کی ہر جا سنی جاتی ہے بات

آج پھر نغمہ بلب، ہر حلقۂ زنجیرِ عدل
آج پھر انصاف کے پنجے میں ہے ظالم کی ذات
آج پھر گردش میں ہے پیمانۂ ادراک و عقل
آج پھر ممکن ہے آسانی سے حلِ مشکلات
آج پھر حقانیت سے ہے سرفراز و سربلند
سربسجدہ آج پھر کعبہ میں ہیں لات و منات
آج پھر دنیا کی نظروں میں بھرم رکھتے ہیں ہم
جانتے ہیں خوب دنیائے سیاست کے نکات
ہم نے کردار و عمل کے زور پر جیتے ہیں دل
آج سب تسلیم کرتے ہیں ہمارے واجبات
ہم بیاں کرتے ہیں اقوام و ملل کے روبرو
زندگی سے بھی حسین تر زندگی کے واقعات
نغمہ زن گلزار در گلزار اولادِ خلیل
نوحہ گر بازار در بازار نمرودی صفات

منزلِ صبحِ بہاراں پر نظر رکھتے ہیں ہم
ہر قدم پہلے قدم سے تیز تر رکھتے ہیں ہم
ہر تمنا جادہ پیما، ہر نفس منزل نشاں
رہ نوردِ شوق ہیں عزمِ سفر رکھتے ہیں ہم
وسعتِ کون و مکاں ہر آرزو پر تنگ ہے
منظرِ تازہ بعنوانِ دگر رکھتے ہیں ہم
روحِ آزادی نہیں پابندِ قصرِ زرنگار
مثلِ شاہیں شش جہت پیشِ نظر رکھتے ہیں ہم
گل بداماں ہیں بفیضِ لذتِ خود آگہی
پھول ہونٹوں پر تو سینوں میں شرر رکھتے ہیں ہم
جس کی نظریں دور رس جس کا سخن قند و نبات
اپنی محفل میں ایک ایسا دیدہ ور رکھتے ہیں ہم
جب قسم کھاتے ہیں مردانِ جری کے سامنے
ہاتھ اپنا قبضۂ شمشیر پر رکھتے ہیں ہم

☆

صبح در صبح

صہبا اختر

آبشارانہ ستاروں کے شرر کا روضیا بار جزیروں سے گذرتی ہوئی رات
کبھی کرنوں کے سمندر میں رواں اور کبھی چاند کے ساحل پہ ٹھہرتی ہوئی رات
میری محبوب کی زلفوں کی طرح خلوتِ آفاق میں چھُپ چھُپ کے مہکتی ہوئی رات
نکہتِ گل کی طرح نیلوفری کاہکشاؤں میں نشہ بن کے بکھرتی ہوئی رات
کبھی زہرہ کبھی دامانِ ثریا کبھی ناہید کے آنچل پہ جھپٹتی ہوئی رات
سینۂ مشتری و قلبِ عطارد میں تب و تابِ تمنا سے دھڑکتی ہوئی رات
ہر نفس نیلمیں آفاق کے ہر طاق میں اک شمع کی مانند پگھلتی ہوئی رات
نمِ شبنم کی طرح سرو و صنوبر پہ اُجالوں کے دریچوں سے برستی ہوئی رات
دُور تک انجمنِ خواب میں ہر سانس پہ کلیوں کے تبسم سے چھلکتی ہوئی رات
کبھی اک پھول کی پلکوں میں سمٹتی کبھی اک شاخ کی باہوں میں لچکتی ہوئی رات
چوڑیوں کی طرح بجتی کبھی اک شوخ کی پازیب کی مانند جھنکتی ہوئی رات
کوئی دیکھے تو ذرا انجم و مہتاب کے زینوں سے سوئے خاک اُترتی ہوئی رات
ہالۂ نور کبھی دائرۂ رقص کبھی سلسلۂ رنگ بدلتی ہوئی رات
نوعروسانہ نئی صبح کی آغوش میں خوگرمیٔ انفاس سے ڈھلتی ہوئی رات

صبحِ افسانہ و افسوں کا بکھرنے لگا ہر شہرِ صبا زاد پہ جادو جیسے
پاک جمہوریہ، مصروفِ سفر صندلی رمنوں میں خراماں کوئی آہو جیسے
اُفقِ نیلوفری پر رُخِ خورشیدِ درخشاں بھی ہوا رنگِ حیا سے گلنار
دیکھ کر عکسِ رُخِ غنچہ فروشانِ جواں سال و حسینانِ چنارو جیسے
صبحدم جاگ اُٹھے خوابِ سحرگاہی کے نشّوں میں کبھی آنکھ نہ ملنے والے
ناوک اندازِ شعاعوں کا ہر اک ناوکِ زرکار ہوا دل میں ترازو جیسے
دور تک پھیلے ہوئے سرد گھنے سبز درختوں کی تگ و تاز کا پُرکیف سماں
صورتِ باد، پریشان کسی ساحرۂ خواب کے بکھرے ہوئے گیسو جیسے
گاؤں گاؤں میں نئی دھوپ، نئی چھاؤں، نئے روپ کے ہنستے ہوئے سنگم ٹوٹے
قریۂ شہد لباں، کوئے نگاراں میں بیک وقت اُڑی ایک سی خوشبو جیسے
دم بہ دم غرفۂ آلام سے صد ماہ و خورشید کے رقاص اُجالوں کا طلوع
زیست افسردہ و مغموم و پریشان و ہراساں نہ رہی ہو کسی پہلو جیسے
جوق در جوق اٹھائے ہوئے محنت کے نشاں، زمزمہ کارانِ دل و جاں موجود
رسنِ جبر مہ و سال میں بستہ نہ رہے ہوں کسی مزدور کے بازو جیسے

دامنِ سندھ پہ راوی کے فسوں خیز تلاطم کے اٹھائے ہوئے بادل برسے
وہ چراغاں سا ہوا، قہقہے پھوٹے، وہ لب و عارض و رخسار کے کوندے لپکے
جھٹپٹے کا یہ سماں جیسے سرِ وادیٔ دل حسرت و امید کی شمعوں کا غبار
یہ کئی ریشمیں زلفوں میں نرم شام کئی آتشیں چہروں میں سحر کے تڑکے
یہ ہمہ رنگ زمیں جیسے کسی خواب کے اڑ رنگ کے بکھرے ہوئے رنگیں اوراق
یہ صنم زاد فضا جس کے فسوں کار تبسم کے اثر سے دلِ آذر دھڑکے
نشہ و شکر و سرور و مئے و مستی کی فضاؤں میں سرِ خاک پہ بارانِ نشاط
شاخ بر شاخ بہ ہر لغزشِ امواجِ صبا بادۂ شبنم کے کٹورے چھلکے
وہ ہمہ رقص ہمہ جذب ہواؤں کے لچکتے ہوئے خیموں کی طنابیں ٹوٹیں
وہ فضاؤں کے دھڑکتے ہوئے سینوں سے گھٹاؤں کے مہکتے ہوئے آنچل ڈھلکے
رات تو رات ہے زندانِ مہ و سال کی صبحوں کے دریچے بھی تھے جن سے محروم
ایک خورشید در آغوش تصور سے سرِ دامنِ احساس وہ شعلے بھڑکے
دیکھ کر قافلۂ عزم کی آغوش میں صد حلقہ بگوشانِ محبت کا ہجوم
خیر مقدم کے لئے وادیٔ مہران کے ذرّات میں سوئے ہوئے سورج چمکے

راوی راوی مرے احساس کے طوفان بہ بردشتِ مغیلاں مری آہوں کے خرام
اے مسافر وطنِ پاک کی راہوں کے تجھے مجھ سے رفیقانِ محبت کا سلام
اس مسافت میں ترے ساتھ رہیں مجھ سے وطن دوست فقیروں کی دعائیں بن کر
صبح در صبح شعاعوں کے حنا رنگ شرارے تو ستاروں کے دئے شام بہ شام
ارضِ مہران سے تا وادیٔ کاغان فروزاں ہیں ہر اک دستِ حنائی میں چراغ
صورتِ برق سجانے لگی بنگال کی ہر زلف کو مشاطۂ خورشید خرام
تیری آنکھوں میں ہمہ وقت وطن اور وطن زاد بہاروں کے تصور رقصاں
تیرے ہونٹوں پہ ہمہ وقت محبت کے تر و تازہ کنول گلشنِ جمہور کے نام
قصرِ عشرت کے فلک بوس منارے ترے تیشے کی ہر اک ضربِ گراں سے لرزاں
دشمنِ خاصۂ خاصانِ طرب کوش مبارک ہو بہر گام تجھے قربِ عوام
لیکن افلاک سے تا خاک یہ یارانِ مئے و کیف بھی اک خواب رہے گا جب تک
ان فسوں زاد و شفق کار بہاروں کو سرِ خاک نہ مل جائے دوام
جگمگا جائے نہ جب تک وطنِ پاک کا ہر گوشہ مسرت کی نئی کرنوں سے
دور ہو جائے نہ جب تک رُخِ ایام سے ماضی کی بکھیری ہوئی گردِ آلام
حرفِ آغاز ہے یہ پاک سفر اور ابھی دور بہت دور ہے اس کا انجام
اے مسافر ترا مقسوم نہ راحت نہ کسی سایۂ دیوارِ چمن میں آرام

"رہ نوردِ شوق"

رئیس امروہوی

پلا ساقیا! بادۂ حُسن و نور
مئے پاک و طاہر، شرابِ طہور

کہاں تک یہ جام و سبو کی سبیل؟ — پلا ساقیا! ساغرِ سلسبیل
ترے نام اے ساقیٔ دل نواز — درودِ عقیدت، سلامِ نیاز
فقط دادِ شوق و تمنّا نہ دے — جو پیماں کیا تھا تو پیمانہ دے
نہ کیوں بزم کی بزم ہو تاک میں — کہ یہ مے نہاں ہے رگِ تاک میں
نئے دور کا استعارا ہے یہ — نئی زندگی کا اشارا ہے یہ

نئی راہ؟ کہہ دورۂ انقلاب
نیا دور؟ یہ دورۂ کامیاب
ترقی کا پردہ کُشا دورِ نو
خوشا دورۂ نو، خوشا دورِ نو

نیا دور جو دورۂ نور ہے — عجب دورِ نو، چشمِ بد دُور ہے
شبِ ہجر آخر بسر ہو گئی — اٹھو سونے والو سحر ہو گئی
مبارک طلوعِ سحر کا سماں — اندھیروں کی اندھیر نگری کہاں
پئے محتسب کیوں نہ خود بے حساب — کہ ہے دَورِ مے، دورۂ انقلاب
وہی دولتِ جزو و کل لاکے دے — بضد خود ہے مُلّا کہ مِیں لاکے دے
گل دیگر از نخلِ مستی شگفت — یہ مفتی کا فتویٰ کہ جائز ہے مُفت
جو بے فیض ہے اس پہ جائز نہیں — قضا اس کی قاضی کو جائز نہیں
[illegible] انقلاب آج دے — کہ جو قلب و قالب کو معراج دے

جہاں منقلب تھا پئے انقلاب
مئے انقلابی، مئے انقلاب!

ارضِ پاک:

خُمِ غیر پر ہاتھ کب تک دراز؟
مئے خانۂ جاں! اُسے خانہ ساز!

اسی خُم اسی خاک سے عشق ہے — مجھے کشورِ پاک سے عشق ہے
یہی خاک ہے خاکۂ بزمِ جم — اسی خُم کے آگے مرا سر ہے خم

یہ سلمائے بنگال و پنجاب و سندھ — یہ دنیائے بنگال و پنجاب و سندھ

وہ بنگال، وہ مشرقی ارضِ پاک
وہ رنگین خطّہ وہ گلپوش خاک

ندی پر کنول جیسے پانی میں آگ — مچھیروں کے گیت اور لہروں کے راگ
کناروں پہ گھر کشتیوں پر جماؤ — وہ مانجھی، وہ موجیں، وہ چپّو، وہ ناؤ
وہ پانی میں بجتے ہوئے جل ترنگ — فضاؤں میں وہ بدلیاں رنگ رنگ
نظر کا فروغ اور دل کا فراغ — وہ دھانوں کے کھیت اور چائے کے باغ
وہ نانک سے بوٹے وہ سندر سے بن — خداداد گُل زار، خود رو چمن
ہر اک دن بہاروں کی فصلِ جواں — ہر اک رات، برکھا کی رُت کا سماں
سماں ایسا پیارا کہ جی لوٹ پوٹ — وہ دریا کی چادر، وہ سبزے کی گوٹ
کنول، پھول، برکھا کا بنگال دیس — جہاں آدمی زاد کا او رجھیس
وہ پشتوں کی غربت وہ نسلوں کے دُکھ — وہ روٹھا ہوا ان سے صدیوں کا سُکھ
نئی زندگی کی تمنا لئے — دلوں میں خدا جانے کیا کیا لئے
سفینوں کا رُخ ساحلوں کی طرف — رواں ہیں نئی منزلوں کی طرف

اُدھر ارضِ بنگالۂ دل نشیں
ادھر سندھ و جہلم کی یہ سرزمیں

یہ خطّہ، کراچی سے کاغان تک — یہ دنیا کہ خیبر سے بولان تک
خوشا مغربی پاک کی خاکِ پاک — شفق فام، آئینہ رو، تابناک
وہ آبادیاں جابجا پُر شکوہ — وہ دریا و بحر و بیابان و کوہ
ہوا پاک طینت، فضا خوش نہاد — کہیں حبس و خشکی کہیں برف و باد
کہیں دشت و کہسار، بنجر اُجاڑ — کہیں سبز و شاداب جنگل پہاڑ
مناظر کی جنّت کی شہزادیاں — وہ کشمیر کی لالہ رُخ وادیاں
کہیں غنچہ و گل، کہیں خار و سنگ — زمیں گونہ گونہ، فضا رنگ رنگ
زبانوں پہ سب کی یہ راوی کا قول — عجب سندھ و جہلم کا ہے ڈیل ڈول
کہیں آبِ جو کی طرح نرم رَو — سمندر کی صورت کہیں تیز رَو

روش منقسم اور مقسوم ایک
زبانیں کئی اور مفہوم ایک
عوام اس زمیں کے غیور و غریب
مگر اک نئی زندگی کے نقیب

جو مشرق سے مغرب ہم احساس ہے
بہت دور تاہم بہت پاس ہے

دورۂ صدرِ مملکت

جو ہیں منزلِ شوق کے شہسوار
وہی شہسوارانِ منزل شکار

جو ہیں جادۂ عزم کے یکہ تاز
وہی یکہ تازانِ جادہ طراز
جو ہیں عرصۂ جہد کے تیز تگ
وہی تیز رو، برق پا، گرم رَو
وہی شاطرانِ بساطِ سخن
بساطِ سخن پر ہیں یوں مہرہ زن

کہ ہے جس طرح سیل کی آبرو
تگ و تاز و رقص و کد و جستجو

اُسی طرح اہلِ حکومت کا طور
سدا ایک دورہ سدا ایک دَور
ہمیشہ اُمورِ ریاست میں غرق
مگر زیرِ ران ابلقِ سیل و برق
سفر ہو نہ کیوں حکمرانوں پہ فرض
کہ ہے طے شدہ معجزۂ طیِّ ارض
روانی، لطافت پسندوں کی خُو
سدا بہتے پانی سے آتی ہے بُو
ظفر کا وسیلہ سفر کے بغیر؟
نسیمِ سحر کی طرح نرم سیر!
کہاں پا بہ گل طالبِ جزو و کل؟
رواں اور دواں صورتِ بوئے گل

تجمیل فرمانِ سیروا فی الارض
سفر ہے روانِ ریاست پہ فرض

قیام اور حرکت میں رکھا ہے خاک
خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک
کرشمہ تھا احساس و ادراک کا
سفر مشرق و مغربِ پاک کا
ادھر مغربی پاک میں یہ نوید
کہ اے صدرِ ذی قدر، خوش آمدید!
اُدھر مشرقی پاک میں یہ کلام
کہ اے ناظمِ انقلاب، السلام!
صدارت کا دورہ اِدھر سے اُدھر
حقیقت میں جمہوریت کا سفر

"پاک جمہوریت"

اُمیدوں کی دنیا تقدس کی رو
چلی پاک جمہوریت کی ٹرین

ٹھہرتی، اٹھتی، گزرتی ہوئی
زمینوں کو بیدار کرتی ہوئی
قیام ایک مرکز پہ جیسے نظر
سفر جیسے موجِ نسیمِ سحر
اقامت کہ دل میں کوئی آرزو
روانی کہ جیسے کوئی آبِ جو

کراچی سے پہلے پہل وہ سفر
بنامِ خدا وندِ ہر خشک و تر
وہ بحر و بیاباں میں اس کا عبور
ہزاروں کے جمگھٹ وہ نزدیک و دور
وہ مزدور، وہ پیشہ ور، وہ کسان
نئی ہر جگہ خیر مقدم کی شان
عقیدت کی کیا کیا حسیں بافیاں؟
ترانے، غزل، زمزمے، کافیاں
وہ بنگال کی پیت رسم اور ریت
وہ دُھن پیار کی، پیارے پیارے وہ گیت
رہِ خیر مقدم میں فی الفور ناچ
وہ جشن اور جلسے وہ رقص اور ناچ
کراچی سے تا سلہٹ و چاٹ گام
عوامی ہجوم اور ہجومِ عوام
وہ مشرق کا مغرب سے یوں ارتباط
کہ لاہور و ڈھاکہ میں جشنِ نشاط

دلوں کا وہ باہم گریبن دین
خوشا پاک جمہوریت کی ٹرین

جہاں صدرِ ملت کے پہنچے قدم
گڑا تازہ جمہوریت کا علَم
ہر اک نقشِ پا رہنمائی کی چھاپ
وہ جمہور و جمہوریت کا ملاپ
دلوں میں فراخی دلوں کے بقدر
خوشا دورۂ صدر سے شرحِ صدر
حسد کی توانائیاں گھٹ گئیں
تعصب کی تاریکیاں چھٹ گئیں
جہالت کے جمگھٹ تھے کیا کیا، گئے!
شرارت کے آتش کدے بجھ گئے
جو تھے بد زباں اُن کے لب سِل گئے
عوام اپنے قائد سے گھل مل گئے

قرار آ گیا ناصبوری گئی
یہ دورہ کہ آپس کی دوری گئی

یہی میرِ ملت کا سب سے خطاب
بہن بھائیو! انقلاب انقلاب!

سُنو نغمۂ وحدت و اتحاد
کہو نظمِ جمہوریت زندہ باد
سُنو مژدۂ تازہ و نو تراش
کہو عزمِ جمہور پایندہ باش
نئی زندگی ہے جو حسبِ مراد
کہو زندہ باد اور سنو زندہ باد

یہی صدرِ ملت کا سب کو پیام
کہ اے مجمع ہائے خواص و عوام

بصد جذب و احساس آیا ہوں میں
بہت دور سے پاس آیا ہوں میں
اندھیرے دبے پاؤں جانے لگے
اُجالے وہ آئے وہ آنے لگے
جو راتیں کہ صدیوں سے تھیں بے چراغ
چراغاں سے اُن میں فروغ و فراغ
جو قیدی کہ صدیوں سے تھے قید و بند
وہ زنداں سے نکلے لگا کر کمند

طلوعِ صبحِ روشن

حمایت علی شاعر

اے صبحِ وطن ہم ترے سورج کی لگن میں
جلتے رہے شب بھر مہ و انجم کی طرح چُپ
سہتے رہے ہر ضربتِ سنگِ غمِ ایام
اشکِ سرِ مژگاں کے تلاطم کی طرح چُپ
کہتے رہے افسانۂ دل بادِ صبا سے
غنچوں کے دہن بستہ تکلّم کی طرح چُپ
تکتے رہے حسرت سے ہر اک ابرِ رواں کو
پھولوں کے خزاں دیدہ تبسم کی طرح چُپ

آدابِ غمِ عشق کا احساس کیا ہے
ہر حال میں اس دل نے ترا پاس کیا ہے

اے صبحِ وطن تو نے ہم آشفتہ سروں کو
گل ریز بھی دیکھا ہے شرر بار بھی دیکھا
فرہاد کی مانند کبھی تیشہ بکف بھی
مجنوں کی طرح خاکِ رہِ یار بھی دیکھا
سقراط کی مانند کبھی زہر بہ ساغر
عیسیٰ کی طرح زیبِ سرِ دار بھی دیکھا
منصور کی مانند کبھی کشتۂ حق بھی
ناکردہ گناہی کا سزاوار بھی دیکھا

تکریم کی ہر حال میں پندارِ جنوں کی
توہین نہ ہونے دی کبھی سوزِ دروں کی

اے صبحِ وطن تجھ کو یہ خورشید مبارک
لے آج کئے لیتے ہیں دامن کو رفو ہم
اب مل گئی ہر درد کو درماں سے فراغت
اب زخمِ جگر کو نہ رہی حاجتِ مرہم
اب پھولوں کی غم خوار ہیں سورج کی شعاعیں
اب ختم ہوئی کشمکشِ شعلہ و شبنم
اب مل گئے دل کو نئے عنوان جنوں کے
اب عشق کے ماروں کا ہے کچھ اور ہی عالم

مانندِ صبا اب ترے گلشن میں رہیں گے
خوشبو کی طرح پھولوں کے دامن میں رہیں گے

اجل اوجِ دار و رسن سے گری
وہ زنجیر کٹ چھٹ کے چمن سے گری
نہ پاؤں میں بیڑی نہ گردن میں طوق
نئے ولولے ہیں نیا ذوق شوق
جہنم تھا خود جن کا حکم شدید
وہ شدّاد ہیں اب جہنم رسید
نئے طوق و زنجیر ڈھالے گئے
جو بل تھے بل ان کے نکالے گئے
نئے کار فرما، زمانہ نیا
زمانہ نیا، کارخانہ نیا
نئے سر سے سارے بسائے گئے
جو بارے ہوئے تھے جتائے گئے

نسیمِ سحر مشک بار آگئی
ہر اک گاؤں میں پھر بہار آگئی

چھڑا نغمۂ نو چمن جاگ اٹھا
وطن دوست چونکیں، وطن جاگ اٹھا
جو ظالم تھے ترکِ وطن کر گئے
جو تھے سخت جاں ڈر سے مر مر گئے
اُمنگیں جوانوں میں بانٹی گئیں
زمینیں کسانوں میں بانٹی گئیں
یہ کیا ہو گیا بات کی بات میں؟
نیا دور دورہ ہے دیہات میں
جو ضدی تھے اب ضد پہ قائم کہاں
وہ مجرم کہاں وہ جرائم کہاں؟
اچانک جو دُنیا نے بدلی ہے جون
نہ اغوا نہ چوری نہ ڈاکہ نہ خون
مصیبت کے مارے سنبھلنے لگے
شرافت کے قانون چلنے لگے
شکار آج خود ہے شکاری پہ شیر
زبردست ہیں زیر دستوں سے زیر
اُڑو طائرو بال و پر کھل گئے
اُڑو قید خانے کے در کھل گئے
جوانو بڑھو روزِ عید آگیا
نظامِ جوان و جدید آگیا

بصیرت فزا، دل کشا، تابناک
خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک

عمل آفریں اعتقاد آفریں
جہاد آفریں، اجتہاد آفریں
محبت کا انعام، الفت کا مول
عوام اور قائد کا یہ میل جول
یہی خاص کر رہنما کا ہے کام
کہ یکتا ہو لیکن ہو یکے از عوام
یہی اصلِ جمہوریت ہے یہی
کہ جمہوریت کی صفت ہے یہی
فقط ضبطِ جمہور ربطِ عوام
نظام اور جمہوریت کا نظام
مسلسل ترقی، مسلسل عمل
یہی دورۂ صدر کا ماحصل
صفائی کی تنظیم، صحت کا عزم
زراعت کی اصلاح، صنعت کا عزم
مسائل میں جدّت پسندی نئی
وسائل کی شیرازہ بندی نئی
نئی زندگی قوم و جمہور کی
نئی شکل آئین و دستور کی
بھلا کنجِ عزلت میں رکھا ہے خاک
خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک

ترقی کا پردہ کشا دورِ نو
خوشا دورۂ نو خوشا دورِ نو!

"اُمیدگاہِ انام"[1]

شاہد جمیل

۱۴ر فروری سنہ ۱۹۶۰ء اور ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء بظاہر اتنے دور اور غیر متعلق! لیکن ان دونوں تاریخوں میں ایک گہرا تعلق ہے۔ تاریخیں دو ہیں مگران کی روح ایک ہے، واقعات دو ہیں مگران کا نتیجہ ایک ہے، عوام کی برتری اور حقیقی جمہوریت کا عروج۔ ۲۳ر مارچ وہ یادگار دن ہے جب ہم نے ایک دولتِ خداداد وجود میں لانے کا عزم کیا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء وہ دن ہے جب ہم نے اسے بناکر اس کے اندر قدم رکھا۔ اور ۱۴ر فروری ۱۹۶۰ء وہ مبارک دن ہے جب ہم حقیقی پاکستان، حقیقی آزادی، حقیقی جمہوریت کی عظیم الشان دنیا میں داخل ہوئے۔ ایک معاصر کے الفاظ میں یہ محض ایک دن نہیں بلکہ جمہوریت کے ایوان کا وہ بڑا دروازہ ہے جس میں داخل ہوکر پاکستان ہمیشہ کے لئے ایک جمہوری ملک بن گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا صفحہ ہے جہاں سے پاکستان میں صحیح معنوں میں ۸ کروڑ انسانوں کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ جب آٹھ کروڑ پاکستانی باشندوں نے اپنی خوشی اور مرضی سے بغیر کسی دباؤ اور ڈر کے پوری آزادی کے ساتھ اس ملک کے اعلیٰ ترین حاکم — صدر — کا انتخاب کیا۔

۲۳ر مارچ وہ مبارک دن ہے جسے "یوم پاکستان" ہونے کا شرف خاص ہے۔ ایک حقیقی معنوں میں یادگار تاریخ۔ انمٹ، ناقابل فراموش! کیونکہ اس دن ایک پوری قوم نے یک دل و یک زبان ہوکر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا، اس کا مطالبہ کیا تھا۔ آج ہم اس مبارک دن کو یاد کرتے ہوئے خوش ہیں کہ ۲۰ برس بعد ہی سہی ہم نے وہ حقیقی آزادی، وہ حقیقی پاکستان، وہ عوام کا مقدس پیدائشی حق، وہ سچی جمہوریت پھر پالی ہے جس نے اس تاریخی دن کو ہمارے دلوں کو گرمایا اور روحوں کو تڑپایا تھا اور جو ہمارا دلی منشا و مقصود تھا۔

۱۴ر فروری میں وہ سب کچھ شامل ہے جو ۲۳ر مارچ اور ۱۴ر اگست میں ہے کمل آزادی اور جمہوریت۔ لہٰذا ۱۴ر فروری ہماری تاریخ میں ایک اور سنگ میل، جمہوریت کی تاریخ میں ایک اور سنہری باب، ایک اور یادگار دن ہے۔ جب کہ ساری قوم نے بہ یک آواز مشرقی پاکستان سے لے کر مغربی پاکستان تک اپنے نجات دہندہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو صدر منتخب کیا۔ جو بلا شبہ ہمارے دوسرے قائداعظم ہیں۔ عوام کے اپنے ہر دلعزیز صدر اور محبوب رہنما۔ جن سے پاکستان کے روشن مستقبل اور قوم کی بہترین امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ انتخاب حقیقی معنوں میں ایک یادگار انتخاب ہے۔ جمہوریت کا نقطۂ عروج اور اس جمہوری روح کا منطقی نتیجہ جو سالہا سال کی جدو جہد کے بعد پاکستان کی شکل میں بروئے کار آئی تھیں۔

وہ سلسلہ جس کی ابتدائی کڑی ۲۳ر مارچ سنہ ۴۰ء تھی اس کی انتہائی کڑی ۱۴ر فروری سنہ ۱۹۶۰ء ہے۔ جب کہ عوام نے بالآخر وہ سربراہ، وہ حکومت پالی ہے۔ جو خالصتہً جمہوری ہے۔ اور یوں بیداریٔ جمہور کا فطری تقاضا آخر کار پورا ہو ہی گیا ہے۔

اگر جمہوریت کو دوبارہ زندہ کرنے کا شرف کسی فردِ واحد کو حاصل ہے تو وہ ہمارے محبوب و ہر دلعزیز سربراہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، کے سوا اور کوئی نہیں۔ جن کو حقیقی جمہوری احساس و جذبہ کے تحت ہی عوام نے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے اور یوں جمہوریت کا بول بالا کیا ہے۔ جن حالات کے تحت عوام سے اظہار رائے کے لئے کہا گیا، وہ اول تا آخر، مکمل طور پر، جمہوری لائحہ عمل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے صدر پاکستان اور ان کے رفقائے کار نے ملک و قوم کے سر سے بد دیانت سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کا کابوس اتارا، اس جبر و تشدد اور غاصبانہ جباری و قہاری کو دور کیا جو بقولِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب' کے مصداق "جمہوریت" کے

---

[1] جانتا ہوں کہ آج دنیا میں۔ ایک ہی ہے امیدگاہِ انام۔ غالب ۔(مدیر)

ظلم سے محدود ہے جنھا فرادی کی ہوس اقتدار کو دعوت نمود دے رہی تھیں۔ ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں ملت خود کو صحیح معنوں میں آزاد محسوس کرے اور اس کے تمام حقوق بحال کئے جائیں۔ اس کے بعد سنگینوں کی نوک پر نہیں بلکہ ایک خالص پاکستانی وضع کا جمہوری نظام قائم کر کے عوام کو موقع دیا گیا کہ وہ اپنے نمائندے آپ منتخب کریں پھر یہ احتیاط برتتے ہوئے کہ کوئی شخص اپنی ذمہ داریوں، آزادی رائے، اختیارات اور حقوق سے ناواقف نہ رہے، انہیں بیداری پیدا کرنے اور پوری طرح آگاہ کرنے کے لئے وسیع ترین پیمانے پر مطلع و باخبر کرنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ قائد قوم کا پیغام اور مقصود و منشاء تمام لوگوں کو پہنچ جائے۔ یہ پیغام کیا تھا؟۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک شہروں اور دیہاتوں میں ایک نرالی قسم کی ریل گاڑی میں صدر پاکستان کا سرد، ناخوشگوار موسم میں طول طویل سفر جس میں ملک کے ممتاز ادیب، ارباب فکر و نظر، ملکی و غیر ملکی اخبار نویس وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ لوگ دور دور سے خود بخود کھنچے چلے آتے تاکہ وہ صدر سے ملیں۔ اور صدر انہیں ایک بڑے پُر شکوہ انسان یا آقا و مولا کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام، پر خلوص انسان، ایک محب وطن، ایک سپاہی، ایک خادم، ایک مردِ باعمل، ایک خیر خواہ، ایک عام شہری کی حیثیت سے ملتے۔ وہ ان سے خود ملتے جلتے نہ کہ وہ انہیں ملنے آتے۔ اور وہ سب کے ساتھ بڑی ہی بے تکلفی سے بات چیت کرتے۔ ہمارے ملک کا غالب عنصر دیہات ہی میں تو رہتا ہے۔ ان پڑھ، سیدھے سادے، سیاسی داؤ پیچ سے ناواقف لوگ جو بڑے بڑے مسائل تو کیا اپنے گھر اور آس پاس کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں جانتے ان کو ملکی مسائل سے آگاہ کرنا، انہیں خود حل کرنے کی دعوت دینا، انہیں جگانا، ان میں جمہوریت کی روح پھونکنا، سب سے اہم اور مقدم بات یہی تھی۔ صرف اس کے بعد ہی ان کے سامنے یہ نہایت اہم قومی معاملہ پیش کرنا مناسب تھا کہ وہ موجودہ صدر کو قابل اعتبار اور لائق اختیار سمجھتے ہیں یا نہیں تاکہ وہ اسے سوچ سمجھ کر اپنا صدر منتخب کریں یہ نہیں کہ ان پر اوپر سے کوئی حاکم یا حکومت مسلط کر دی جائے جیسے وہ عوام نہیں بھیڑوں کا گلہ ہوں، بلکہ اپنے عوامی اختیارات اور سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اپنا حاکم آپ چنیں۔

یہ دونوں سفر کیا تھے؟ مغربی اور مشرقی پاکستان کے بیچوں بیچ، عین دل میں سے گزر تاکہ انہیں جگایا جائے، مکمل طور پر باخبر کیا جائے اور ـــ تو کشمیری زکام خود بروں آـــ کی دعوت دیتے ہوئے۔

جب یہ مقصد بوجہ احسن پورا ہو چکا اور جمہور، عام اس سے کہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی، معاملہ کی نوعیت سے پوری طرح واقف ہو چکے تو صدر کے انتخاب کی نوبت آئی اور یہ سب سے اہم معاملہ ان کے سامنے اظہار رائے کے لئے پیش کیا گیا۔ کوئی قید، کوئی پابندی کے بغیر۔ ورنہ تاریخ کے بے شمار واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ صدر عوام کی ذرا بھی پروا کئے بغیر ڈکٹیٹر کا رول اختیار کر لیتے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کہ صدر بھی حقیقی جمہوریت کی روح سے سرشار ہیں اور انہوں نے اپنے عظیم الشان دورے سے عوام میں یہی احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے تمام جمہور کی رائے سے صدر ہونا پسند کیا۔ یونین کمیٹیوں نے بالاتفاق ملک و قوم کے سب سے ہر دلعزیز رہنما، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ہی کو صدر منتخب کرنا پسند کیا لہٰذا وہ اب ایک باقاعدہ منتخب صدر ہی کی حیثیت سے اس منصب پر فائز ہو کر قوم کی دیگر بلند تر و جلیل تر مقاصد کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں جن میں سے ایک دستورِ جدید کی تشکیل ہے۔ وہ دستور جو پاکستان کے لئے بہترین و مناسب ترین آئین کا ضامن ہوگا۔

اظہار رائے کی یہ دعوت اپنی قسم کی پہلی چیز ہے خالص جمہوری، ورنہ دنیا میں ہونے کو کیا نہیں ہوتا رہا۔ بالخصوص جب فوجی ڈکٹیٹروں نے زبردستی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہو۔ اور پیرِ تسمہ پا کی طرح ہمیشہ قوم کے شانوں پر سوار ہو کر اس کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔ ہمارے یہاں بھی یہی کھیل بہ آسانی کھیلا جا سکتا تھا۔ اور کسی اظہار رائے کا تکلف کئے بغیر یہ امیر فوج مدت العمر ملک کا اعلیٰ ترین حاکم بھی رہ سکتا تھا۔ مگر یہ طرزِ عمل تمام تر غیر جمہوری ہوتا۔ اس لئے اس اہم فیصلے کے لئے قوم ہی سے رجوع کیا گیا اور اس کو مالک و مختار بنا دیا گیا۔

اس امیرِ جنود نے خادم قوم ہی کی حیثیت میں رہنا پسند کیا۔ انہوں نے کوئی بات ذاتی خواہش کی بناء پر نہیں کی بلکہ جو کچھ کیا قوم ہی کی رضا و منشاء سے کیا ہے۔ ان دونوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے۔ زور و زر یا عدل و انصاف؟ یہ سوال تھا جو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے سامنے تھا۔ اور انہوں نے ایک کھرے سپاہی کی طرح دوسری بات ہی کو ترجیح دی۔ جو ان کے مزاج اور خادم ملت کے کردار سے پوری طرح

ہم آہنگ ہے اور ان کی بلند شخصیت کے شایانِ شان ہیں۔

بے شک امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے پارٹی لیڈر عام انتخابات کے سلسلے میں دورے کیا کرتے ہیں لیکن ان دوروں کا مقصد تمام تر پروپگنڈا ہوتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح ہر ہما کو شیشہ میں اتار لیا جائے۔ ایک سپاہی کو ایسے طریقوں سے جبلی طور پر نفرت ہوتی ہے۔ اور یہ صدر پاکستان کی جمہور پرستی کے بالکل منافی تھے۔

عوام سے ملنے، ان کے ساتھ گھل مل کر بات چیت کرنے، ان سے قریب تر آنے، ان کو سمجھانے اور خود سمجھے جانے کی خواہش نے انہیں اتنے طویل سفروں کی زحمت گوارا کرنے پر آمادہ کیا۔ تاکہ ان کا پُر خلوص پیغام گھر گھر پہنچ جائے۔ وہ خود عوام تک پہنچے نہ کہ عوام ان تک۔ اور پھر اس دورے کا سب سے بڑا مقصد تھا عوام کی تعلیم، ان کی تربیت تاکہ وہ ملک کے مسائل اور صورت حالات کو سمجھیں اور سوچ سمجھکر قدم اٹھائیں خصوصاً صدر کے انتخاب میں۔ انہوں نے عوام کے دل میں گھر پیدا کر لیا۔ بلکہ وہ تو ان سفروں سے پہلے ہی ان کے دل میں گھر کر چکے تھے، ان کے چہیتے رہنما بن چکے تھے۔ اسلئے جو کچھ ان کے دلوں میں تھا وہی عملی طور پر بھی سامنے آیا

حقیقت یہ ہے کہ اعتماد کا ووٹ دیئے جانے سے پہلے ہی یہ اظہر من الشمس تھا کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہے۔ چنانچہ تمام لوگوں نے بالاتفاق اس دو مرے قائد اعظم کو اپنا صدر منتخب کیا۔ صرف ووٹ دینے کے سلسلہ میں جو آزادی یونین کمیٹیوں کو دی گئیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ عوام کے اظہار رائے کا بندوبست کرنے کے لئے ایک الیکشن کمیشن قائم کیا گیا، صدارتی بیلٹ کی نگرانی عدلیہ کے ایسے اراکین عالی کے سپرد کی گئی جن پر نہ حکومت کا اثر تھا نہ فوج کا۔ یعنی دونوں کے تسلط یا اثر سے آزاد اور آئین شناسی اور دیانت داری جن کی مسلم اور معلوم، اس لئے یہ کہنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی کہ اظہار رائے حکومت کے زیر اثر ہوا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے بے دھڑک عدم اعتماد کا ووٹ بھی دیا۔۔۔ رائے دیتے وقت پرچی ڈالنے والے کے سر پر کوئی تلوار نہیں لٹکتی تھی۔ نہ ظاہر نہ پنہاں۔ ایک طرف نیلا نشان اور دوسری طرف فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا عکس، جس کے حق میں وہ چاہے اپنی خوشی سے رائے دے دے۔ موصوف عوام کا دل تو پہلے ہی اپنے ہاتھوں میں لے چکے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا اقبال تھا اور ہم اپنی عقیدت کا خراج نذر کرنے کے لئے دل و جان سے مجبور۔ یہ موہنی جس میں پائی جائے اسے رائے لینے میں بھلا کیا دشواری ہو سکتی تھی۔

لہذا نتیجہ کے آثار پہلے ہی سے نمایاں تھے۔ اور یہی ہوا جس کی ساری پہلے توقع تھی، اس طرح جو بالکل جمہوری طور پر ظہور پذیر ہوا، اس کو غیر ملکی غیر جانبدار مبصروں نے بھی بہ حد تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور وہ پاکستان کے قائد کی غیر معمولی ہر دلعزیزی سے حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ یہ حقیقتاً ایسی بات ہے جو اقوام عالم میں نہ اپنی نظیر رکھتی ہے نہ مثال۔ وہ سماں دیکھنے کے لائق تھا جبکہ صدر پاکستان یعنی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے منتخب ہونے پر، ۱۷ فروری کو گھر گھر چراغاں ہوا اور پاکستان کے ہر ہر شہر و ہر ہر گاؤں کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں لوگوں نے خوشی سے خود بخود، اپنے ہی خرچ پر غریبوں، محتاجوں، بوڑھوں اور بچوں کو مفت کھانا کھلایا اور دل کھول کر مٹھائیاں بانٹیں۔ اس سے زیادہ ہر دلعزیزی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور پھر اس زندہ دل انسان کا پیار، محبت اور بلند حوصلگی بھی دیکھئے کہ اس نے قوم کے نام ایک نشری پیغام میں صاف صاف کہدیا کہ جن لوگوں نے اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا وہ بھی اس کے اپنے ہی ہیں۔ جس بنیاد پر ان کی شکایات قائم ہیں اس کو اور ان کی شکایات کو بھی دور کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

جیسا کہ اظہار رائے کے نتائج سے معلوم ہوا ہے سو فیصدی سے تھوڑی ہی کم تعداد نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے حق میں ووٹ دیئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب قوم اپنے پرخلوص، حرکی، زندہ دل، صاحب نظر اور جہاں دیدہ مدبر و قائد کی رہنمائی میں ایک اور نہایت اہم بالشان دور ترقی میں قدم رکھ رہی ہے۔ یہ انتخاب درحقیقت قوم کی طرف سے صدر منتخب کو پروانہ ہے کہ وہ دستور کے نہایت اہم کام پر توجہ دیں اور اس کی جلد از جلد تکمیل کریں۔ چنانچہ اب ہمارے منتخب صدر پاکستان اب ایک ایسے دستور کی تشکیل پر توجہ مرکوز کر سکیں گے جو ہمارے لئے ہر اعتبار سے موزوں و مناسب ہو۔

خدا اس بہی خواہ ملت اور ان کے رفقائے کار پر اس نئے سفر کی منزلیں آسان کرے اور قوم کو اپنے چنے ہوئے صدر کی رہنمائی میں نہایت برق رفتاری سے آگے بڑھنے کی توفیق و ہمت عطا کرے۔

ہمارے منتخب صدر عوام کے اپنے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان زندہ باد!

پاکستان زندہ باد!

عاصمہ حسین

ا- آیوب کا نام مُبارک ہو جس سے ہوئی وطن کی شان نئی
اٹھا سپہ سالار جری ایسا، ڈالی قوم کے جسم میں جان نئی
تعمیرِ حصارِ ملّت کی تدبیر ہوئی ہر آن نئی
ہر چار طرف اک غلغلہ ہے، گونج اٹھی ہے ایسی تان نئی

ب- "بنیادی جمہوریہ" کے خورشید کا جلوہ عام ہوا
نئی آب و تاب سے چمکا ہے، جمہور کی قسمت کا تارا
ہر ذرّہ فضائے ہستی کا، شمعوں کی طرح لَو دے اُٹھا
ہے کاہکشاں در کاہکشاں دُنیائے عوام کا نظّارا

پ- پاکستان کی پاک زمیں بارانِ کرم سے شاد ہوئی
ہر بستی، شرقِ مغرب کی ہر طور سے اب آزاد ہوئی
تقدیر مہاجروں کی جاگی، یوں غیب ہی سے امداد ہوئی
برسوں کی مصیبت کی ماری مخلوقِ خدا آباد ہوئی

ت- تاریکی کا دور گیا، عیّار سیاست دانوں کا
ظلمات کے بادل چھٹ بھی گئے اور زور مٹا طوفانوں کا
جھم جھم جمہور کے گھر چمکے اور نور بڑھا کاشانوں کا
تاریخ کے چہرے پر چھایا اب رنگ اور روپ افسانوں کا

ث- ثابت اور سیار سبھی تاثیروں میں ہم آہنگ ہوئے
اور قدر و قضا کے ہاتھوں میں طاؤس و رباب و چنگ ہوئے
یوں قوسِ قزح در قوسِ قزح آکاش پہ رنگ ہی رنگ ہوئے
نظّارگیانِ ارض و سما اس رنگِ فسوں سے دنگ ہوئے

ج- جامِ اصلاح کا دور میں ہے، اصلاحوں کے جام پہ جام آئے
ہر آن نئے دو آتشہ سے سرمستِ نشاط عوام آئے
ملّت کے جہاد میں بالآخر افواج کے ہات ہی کام آئے
نغمے صبح کے جلوے پہلو میں، ہر چند بہ وقت شام آئے

چ- چاک کیا دامانِ جفا، ہر قصرِ ستم کو چور کیا
جو داغ کہ دامنِ پاک پہ تھا، اس داغ کو آ کر دور کیا
ظلمت جو پرافشاں تھی ہر سو، اس ظلمت کو کافور کیا
پیراہنِ ملّت کو دھو کر پاکیزہ مثالِ طور کیا

ح- حائلِ رہ تھی جو مشکل جوں سلسلہ ہائے کوہِ گراں
اس مشکل کو یوں دور کیا، نے نام رہا باقی نہ نشاں
اس طرح چٹانیں گرد ہوئیں، اُڑتا نظر آئے جیسے دھواں
تھی برق ہی برق ادھر ہمّت، واں موجِ بلا طوفاں طوفاں

خ- خیرِ خلائق کے جویا، یہی شام و سحر ہے دل میں لگن
یہی نغمہ لبوں پر رات اور دن: "قربانِ وطن! قربانِ وطن!"
تعمیر و ترقی کے ارماں، ہوں کوہ کہ صحرا، دشت کہ بن
ہر دم اصلاح کی تدبیریں، پاکیزہ ہو کیونکر خاکِ چمن

د- داد و دہش کی دھوم مچی، یہ قدرِ سخن، یہ جود و سخا
ہر جوہرِ قابل کی تحسیں، یہ معجزہ ہائے لطف و عطا
یہ چشمہ کہ فرطِ شوق سے ہے اک بحرِ کرم، طوفان نما
یاں ریزشِ قطرۂ خونِ جگر، واں موج گہر دریا دریا

ر۔ راہنما ہے وہ ہستی ہنگامۂ دوراں کہئے جیسے
اک مردِ مجاہد شعلہ بجاں، اک محشرِ جولاں کہئے جیسے
وہ سیلِ روانِ بے باکی، اُمڈا ہوا طوفاں کہئے جیسے
وہ چارہ گرِ ملک و ملّت، ہر درد کا درماں کہئے جیسے

ز۔ زرعی اصلاحات نہ ہے! "اعجازِ اعجاز" کا غُل ہر سو
ہے ریزشِ عام بادہ دمے تھے لوگ جہاں بے جام و سبو
طوفانِ مے سرجوش خوشا! کاسوں میں جہاں تھا صرف لہو!
وہ کاہشِ تن، وہ زردیٔ رخ۔ یہ شانِ نمو، یہ سرخیٔ رو!

س۔ سندھ سے لے کر خیبر تک چلی پاک جمہوریہ ٹرین کیسی
دیکھی نہ سنی تھی دنیا نے کسی ملک میں اب تک ریل ایسی
پھر نیر کنول کے دیس میں بھی نگری نگری گردش ویسی
وہ دلوں کے بیچ عجیب سفر، کہاں شانِ تیسرا اس جیسی

ش۔ شوق ہے اس کا بے پایاں، ہر گام پہ اور ہی منزل ہے
جہاں نیل گگن ساگر سے ملے، کب اس کی نظر میں وہ ساحل ہے
جس میں ہے نہ منزل نے ساحل، وہ نگری اس ہی کا دل ہے
بجلی ہے کہ بادل بادل ہے، دیپک ہے کہ محفل محفل ہے

ص۔ صدر جسے خود ملّت نے آنکھوں پہ بٹھایا، دل میں رکھا
ہر معرکۂ دشوار طلب بے زور بازور زر سر جس نے کیا
اعجازِ محبت جس کے لئے افسونِ سیاست سے ہے سوا
مصروفِ تدبرات اور دن تا وضع کرے دستورِ نیا

ض۔ ضمیر میں جس کے سب کے لئے وہ بے اندازہ محبتیں ہیں
گویا ہر گوشے میں جس کے آباد ہزاروں جنّتیں ہیں
اس قائدِ اعظم ثانی کی تخئیل میں لاکھوں رفعتیں ہیں
وہی شوکتیں ہیں، وہی عظمتیں ہیں، وہی حشمتیں ہیں، وہی سطوتیں ہیں

ط۔ طریق نئے، افکار نئے، انداز نئے، اشغال نئے
سانچے میں خلوص کے ڈھالے ہوئے اقوال نئے، اعمال نئے
اوصاف نئے، اطوار نئے، اذکار نئے، احوال نئے
آفاق نئے، اعماق نئے، آکاش نئے، پاتال نئے

ظ۔ ظاہر و باطن یکساں ہیں، خاموش مگر خاموش نہیں
اسے وائے وہ پیکرِ آب و گِل جو پیکرِ آتش نوش نہیں
اے وائے وہ برق شعلہ بپا جو ابر میں غلغلہ کوش نہیں
اے وائے وہ شعلۂ جوالہ جو برق کے دوش بدوش نہیں

ع۔ عاصمہ شاعرہ برق نفس کیوں شمع صفت خاموش رہے
یہ دور، یہ بزم، یہ قدرِ سخن، پھر بھی نہ ترنّم کوش رہے
گر سحر ہے وہ، کیوں بزمِ جہاں محرومِ نوائے سروش رہے
یہ نطق سراپا برق رہے، یہ بزم سراپا جوش رہے

غ۔ غیب سے مردِ کار آیا اور ملّت کی تقدیر بنا
اٹھی نہ کوئی آواز کہیں اس طرح پلٹ ڈالی کایا
اک قطرۂ خوں بھی دامن پر اس پاک زمیں کے گر نہ سکا
اک دورِ وحشت خیز گیا، اک دورِ راحت خیز آیا

ف۔ فصلِ بہاراں آبھی چکی اور مہکی ہر ہر پھلواری
ہر یادل ہی ہریادل سے لہکی بہکی کیاری کیاری
کیا کامنی کامنی ہر شے ہے، کیا ہر صورت پیاری پیاری!
ہر بوٹا فرحِ دیبا کی طرح، ہر ڈالی ہے ناری ناری

ق۔ قمقمے نور کے روشن ہیں۔ یہ روشنیاں ہی روشنیاں
بادل کی قبا میں جھومتی ہیں کیا جل پریاں ہی جل پریاں
یہ نور کی مینائیں ہیں یا ہیں رس بھریاں ہی رس بھریاں
اور ترچھی ترچھی کرنوں سے یہ گل بیاں ہی گل بیاں

ک۔ کس کا فیض ہے یہ سارا، فیض فقط آتوب کا ہے
کس کا اعجاز ہے یہ سارا، اعجاز اسی محبوب کا ہے
یہ بھینی مہک یہ اجیارا، سب کس کا اسی ہی دودب کا ہے
ہے کس کی نظر کا سحر نہیں، یہ سحر اس پیکرِ خوب کا ہے

گ۔ گلوں کی موہنی رت آئی، کلیاں اُبھریں کنواری کنواری
اس پیاری رت میں ہر تتی من کو لاگے پیاری پیاری
کیا کامنی کامنی بوٹیاں ہیں کھیتوں سے اٹھیں ناری ناری
وہ پیراہن لاچہ لاچہ، شیشہ آنچل ساری ساری

ل۔ لشکرِ شوکت ہے اور دھاک ہے ساری دنیا پر
افواجِ پاک کی عظمت کے قائل سکانِ بحر و بر
آہنگِ رجز سے گونجتے ہیں اقصائے جہاں میں خشک اور تر
اک گام نشیبِ کراچی میں اک گام ہے تا اوجِ کشمر

صہبا دھوپ

م۔ محوِ سطوت و حشمت ہے اور اس کی ترقی بے پایاں
زینت وہ بابِ عالی ہیں، شہرت کے فسانوں کے عنواں
ابیات ابیات تجمل ہے، تمکین و حشم دیواں دیواں
ہے سلسلہ سلسلہ نشو و نما اور شانِ بقا دوراں دوراں

ن۔ نام ہے پاک دیار اس کا یہ مملکتِ ذی شان اپنی
دن رات نظاروں سے جس کے ہستی ہے سدا جوان اپنی
یہ دھرتی دھرتی اجلی سی یہ دھرتی سبز نشان اپنی
یہ دولتِ عرش نما اپنی، تعمیر بلند ایوان اپنی

و۔ وقت کی بات ہے اوجِ ملل، لو اپنے عروج کا وقت آیا
سمٹے تھے حدود میں ہم پہلے، اب اپنے خروج کا وقت آیا
ہوا طالع اخترِ سعد اپنا، کسرِ یا جوج کا وقت آیا
ہوئے برجِ اسد میں ہم داخل، ذیشان بروج کا وقت آیا

ہ۔ ہم پہ ہے ملک کی شان رکھنا اور صدر کی اپنے لاج رکھنا
جو کام ہو اوج و ترقی کا، اس کام سے ہر دم کاج رکھنا
اور محفلِ ہستی میں بڑھ کر ملت کے سر پہ تاج رکھنا
جو قوم و وطن کا پاس کرے، وہی صدر رکھنا وہی لاج رکھنا

ی۔ یارب! ہزاروں دعائیں مری اور میری ہزاروں امیدیں بھی
مرے دل میں ہزاروں سنہری محل اور ان کی سنہری کلیدیں بھی
مجھے پردۂ غیب سے شام و سحر جاں بخش ہزاروں نویدیں بھی
فیضانِ خدائے پاک سے ہیں مقسوم ہزاروں عیدیں بھی

"طرحِ نو افگن"

(بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی)

مسیح الزماں

ایک ایسی جمہوریت جسے لوگ سمجھ بھی سکیں اور چلا بھی سکیں۔ صدر پاکستان نے ابتدا ہی میں اسی کا تو وعدہ کیا تھا۔ اور بڑی مسرت کی بات ہے کہ انھوں نے اسے پورا بھی کر دکھایا۔ انقلابی حکومت کی پہلی سالگرہ کے موقع پر، ۲۷ر اکتوبر کو یہ اعلان جاری کر دیا گیا کہ ملک میں بنیادی جمہوریتیں قائم کی جائیں گی۔ ایک پانچ منزلہ نظام جس میں ہر ہر منزل پر عوام اور اربابِ نظم و نسق ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

آپ پوچھیں گے بنیادی جمہوریت کیا ہے؟ یہ بڑی سیدھی سادی بات ہے جس کے متعلق آپ آگے ہی کافی کچھ سن چکے ہوں گے۔ یہ ہے تو ایک سیاسی نظام لیکن ایسا جس میں زندگی کی اصلیتوں اور اعتدال کو پیش نظر رکھتے ہوئے تدریجی ارتقا پر زور دیا گیا ہے۔ جو پاکستان میں مارشل لا کے تحت نظم و نسق کی نمایاں خصوصیت رہا ہے۔ اس کی بنیاد اس احساس پر ہے کہ جمہوریت کے معنی ہیں اکثریت کی حکومت، اور ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ دیہات ہی میں آباد ہیں۔ لہٰذا حکومت انہی کی ہونی چاہئے اور انہی کے واسطے ہونی چاہئے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دیہات کے لوگ اکثر ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ ان پر برسوں ایک اجنبی حکومت کے استعمار کا سایہ رہا ہے اور حاکم لوگ بڑے بن کر گویا انجان ناسمجھ بچوں کی دیکھ بھال کرتے رہے ہیں اور پھر ان میں مدتوں جاگیرداری نظام کا دور دورہ بھی رہا ہے۔ اس لئے وہ حکومت چلانے کے فن سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ انہیں نہ اپنے آپ پر اعتماد ہے اور نہ وہ اتنی صلاحیت ہی رکھتے ہیں کہ ان فرائض کو انجام دیں جو ایک جمہوری نظام لازماً شہریوں پر عائد کرتا ہے۔ ان کے لئے ہر وقت اندیشہ ہے کہ کہیں چالاک سیاست داں یا شورش پھیلانے والے چرب زبان لوگ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے انہیں دھوکہ نہ دیں۔ اس لئے یہ بات اشد ضروری ہے کہ یہ سمجھایا جائے کہ حکومت ہے کیا۔ اس میں وہ کیا حصہ لے سکتے ہیں اور اسے چلانے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ پہلے نچلی سطحوں پر چھوٹے چھوٹے معاملوں میں حکومت کا کام چلائیں اور رفتہ رفتہ اتنا تجربہ حاصل کرلیں کہ وہ بعدہٗ اونچی سطح پر بڑے بڑے معاملات میں کاروبارِ حکومت کا اہتمام کر سکیں۔

اس نظام میں ایک اور بات بھی محسوس کی گئی ہے یہ کہ ملک کا سب سے تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ سرکاری نظم و نسق چلانے والوں پر مشتمل ہے۔ بالفاظ دیگر یہی لوگ ملک کا ذہین، دانشور طبقہ ہیں اور گزشتہ بارہ سال انہی کی بدولت حکومت کا نظم و نسق برقرار رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ نہ صرف روزمرہ کے انتظامی کاروبار کو چلانے کے لئے ملک کا سب سے اہم عنصر ہے بلکہ قوم کو اپنی لمبی میعاد کی پالیسیاں تیار کرنے میں بھی مدد دے سکتا ہے سچ پوچھئے تو موجودہ حکومت کی بلند نظری کا سب سے جرأت مندانہ پہلو یہی ہے کہ اس نے قومی زندگی میں نئی روح پھونکنے کے لئے اس عنصر کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اب ذرا اس نظام کی مجمل کیفیت سنئے۔ اس کے مطابق مختلف حلقوں، تحصیلوں، ضلعوں، ڈویژنوں اور دونوں صوبوں میں کونسلیں قائم کی گئی ہیں جن کا مقصد یہ ہو کہ امور عامہ کے متعلق بحث و مباحثہ ہو، فیصلے ہوں (انتظامی حیثیت سے سارے پاکستان کو اول تو دو صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور پھر یکے بعد دیگرے ڈویژن ہیں، ضلعے ہیں، تحصیلیں ہیں، دیہات ہیں)، اور پھر ان کو مواقع بہم پہنچائے گئے ہیں کہ وہ خود کو ترقی دیں، اور بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ ان ہی بنیادی حلقوں کا نام "یونین" ہے۔ جو دیہات میں "پنچایت" کہلائے گی اور شہروں میں "کونسل"۔ ان دونوں کے تقریباً ۱۰ منتخب ممبر ہوں گے اور

بلوچی رقص (تقریب شادی)

نیزہ بازی : بلوچیوں کا محبوب مشغلہ

میلہ میں نیزہ بازی کا مظاہرہ

پانچ نامزد جو سرکاری ملازم نہیں ہوں گے۔ جوں جوں کونسلوں کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے نامزد ممبروں کی تعداد کم اور منتخب ممبروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ضلعوں اور ڈویژنوں کی کونسلوں کے تمام غیر سرکاری ممبر حکومت کے نامزد ہوں گے۔ اور ۵۰ فیصدی نشستیں انہی کے لئے متعین ہوں گی اور باقی ۵۰ فیصدی سرکاری عہدہ داروں کے لئے۔ یونین پنچایتوں یا مقامی کونسلوں کی سطح سے اوپر تمام کونسلوں میں صدر ہمیشہ علاقے کا سرکاری افسر اعلیٰ ہی ہوگا۔

ممکن ہے یہ ادارے بحث مباحثہ کے اکھاڑے بن کر رہ جائیں۔ اور ذمہ داری منتشر ہو جائے۔ اس خطرے کی پیش بندی کے لئے تمام عاملانہ اختیارات صدر ہی کو سپرد کئے گئے ہیں۔ اور مشاورت کا کام اراکین کے سپرد ہے۔ امید ہے اس طرح صدر پوری آزادی سے اور مؤثر طور پر کام کر سکے گا۔

مزید تحفظ کے لئے ان جمہوری اداروں کو انتظامیہ کی مؤثر نگرانی کے تحت رکھا گیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر، کمشنر اور گورنر ماتحت کونسلوں اور پنچایتوں کے نگراں حاکم مقرر کئے گئے ہیں۔ انہیں بنیادی جمہوریتوں پر وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں تاکہ یہ ادارے ٹھیک طرح کام کرتے رہیں۔

بنیادی جمہوریت کے صدارتی حکم میں کونسلوں کے غیر سرکاری اراکین کی تین قسمیں مقرر کی گئی ہیں۔

منتخب اراکین وہ ہوں گے جو الیکشن جیت کر مقامی کونسلوں میں جگہ لیں۔ "نمائندہ" اراکین وہ ہوں گے جنہیں ارباب اختیار بلند تر سطح کے اداروں کے لئے چنیں اور "مقرر شدہ" اراکین وہ ہوں گے جنہیں نگراں حاکم مختلف سطحوں پر جن میں مقامی کونسل بھی شامل ہے، حصہ لینے کے لئے مقرر کرے۔ ان مقرر شدہ اراکین کو بالاتر کونسل کے سوا کوئی نہیں ہٹا سکتا۔

بنیادی جمہوریت میں اراکین کی حیثیت بعینہٖ ایسی نہیں ہوگی جیسے بے تنخواہ سرکاری ملازمین کی، وہ درحقیقت بالکل انتظامی مشینری کا جزو بن جائیں گے۔ ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے کسی صنعتی کارخانہ میں فورمین کی کہ وہ مزدوروں ہی میں شامل ہوتا ہے۔ اور وہ انہیں میں سے ترقی کر کے فورمین بنتا ہے۔ ادھر وہ منتظمین میں بھی شامل ہوتا ہے کیونکہ وہ مزدوروں پر نگرانی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ نیز وہ عزت جو اسے مزدوروں کی نظر میں حاصل ہوتی ہے، دونوں اپنے کاریگروں کا تعاون حاصل کرنے اور انتظامی پالیسی پر عملدرآمد کرانے میں اسے مدد دیتے ہیں۔ پھر ایک کاریگر کی حیثیت سے اس کا ذاتی تجربہ اور مزدوروں کے ساتھ ربط و تعلق اسے انتظامی پالیسی کی تشکیل میں بھی مدد دیتا ہے۔ لہذا ممکن ہے بنیادی جمہوریتوں کے اراکین ایک ایسا پل بن جائیں جو حکومت اور عوام کے درمیان ربط قائم رکھتا ہے۔

اگر بنیادی جمہوریت کے حکم نامے کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اختیارات کی تقسیم اور نمائندگی کی جو وضع اس میں متعین کی گئی ہے وہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ جوں جوں لوگوں کی خود پر حکومت کرنے کی صلاحیت اور انتظامی تجربہ بڑھتا جائے گا، ان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ مذکورہ حکم میں سرکاری اراکین کی آخری حد تو مقرر کی گئی ہے مگر غیر سرکاری اراکین کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔

صدر پاکستان نے ایک ایسی جمہوریت کا وعدہ کیا تھا، جسے لوگ سمجھ سکیں۔ اس بارے میں جو قانون وضع کیا گیا ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ رائے دہندہ اور اس کا منتخب نمائندہ ایک دوسرے کے سامنے رہیں گے۔ منتخب رکن کی سرگرمیوں کا علاقہ ووٹ دینے والے کے اس قدر قریب ہوگا کہ وہ اس کے وعدوں اور کارگزاری کا بخوبی اندازہ کر سکے گا۔ اس طرح ووٹر کو اپنے ووٹ کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی اور وہ یہ بھی سمجھ جائے گا کہ اسکے نمائندوں میں سب سے اہم کی جانچ پرکھ کیسے کی جائے۔

اس حکم کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ پہلی بار ایسا مضبوط سیاسی نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو دیہات اور صوبے کے صدر مقام میں ربط پیدا کرے۔ قبل ازیں یہ کیفیت تھی کہ انتظامیہ تو عوام تک پہنچ جاتی تھی مگر سیاسی نظام کا دیہات کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے موجودہ نظام نے اس خلا کو پُر کر دیا ہے جو برطانوی وضع کی جمہوریت میں باقی رہ گیا تھا۔ یہ نظام بالائی حصے میں تو جمہوری تھا لیکن اس سے نیچے تمام کا تمام بالکل بے سہارا تھا یعنی اس میں نیچے کے طبقوں کا باہمی تعاون مفقود تھا۔

اس لئے اس کی عمارت دھڑام سے نیچے آ رہی۔

نئے نظام نے حاکموں اور عوام کے درمیان ربط و تعلق کی نئی نئی راہیں وا کردی ہیں اور ساتھ ہی حکومت کے یکرخہ ہونے کی وجہ سے جو کمزوری پیدا ہوگئی تھی اس کو دور کرکے اس کی بنیاد مضبوط کردی ہے۔

آپ پوچھیں گے بنیادی جمہوریت کی اس نئی اسکیم اور معاشری ترقی کے منصوبوں میں کیا تعلق ہے جو کچھ عرصہ سے ملک میں نمو پاتے رہے ہیں؟ دونوں کا مدعا یہ ہے کہ جو اجتماعی مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں ان کے حصول میں عوام کو شریک کیا جائے۔ دونوں عوام کو کسی قدر ذمہ داری اور اختیار کو استعمال میں لانے اور زیریں سطح پر حکومت کے کچھ کام کرنے کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ دونوں معاشری بہبودی کے لئے مقامی وسائل کو، خواہ وہ انسانی ہوں یا مادی، کام میں لانے کے خواہاں ہیں۔ دونوں ملک کے آئندہ رہنماؤں کے لئے تربیت کا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ یہ دونوں دفتری سررشتوں پر اس امر کے لئے انحصار کرتے ہیں کہ ان کے واقف کار عمال مختلف سطحوں اور گوناگوں طریقوں سے عوام میں قیادت اور رہنمائی کی صلاحیت پیدا کریں۔ جہاں تک ان کی تنظیمی وضع ہیئت، اختیارات اور انتظامی لائحۂ عمل کا تعلق ہے۔ جمہوری خصوصیات دونوں میں بڑی شدت سے نمایاں ہیں۔

اس کے ساتھ ہی بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی کی تکنیک، طریق کار اور وسعت میں کچھ فرق بھی ہے۔ رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے لئے اجتماعی ترقی زیادہ تر ذہنی تربیت پر انحصار کرتی ہے اور ایسی اجتماعی اقدار سے جواز حاصل کرتی ہے جو پہلے ہی سے موجود ہوں یا انہیں پھر سے زندہ یا تخلیق کیا گیا ہو۔ اس کے برعکس بنیادی جمہوریت کی بنیاد عوام کی رضا و منشا پر ہے۔ جس کا اظہار اس کے نمائندے یا روشن خیال افراد کریں۔

اجتماعی ترقی کا دامن ایسی ضرورتوں سے وابستہ ہے جنہیں ہم حقیقتاً محسوس کریں۔ اس لئے کام تاخیر کے بغیر ممکن نہیں بنیادی جمہوریتوں کا کام اس نوعیت کا ہے کہ جو جو باتیں عوام کی بھلائی کے لئے ٹھیک معلوم ہوئیں ان پر فوراً فیصلے کئے اور لوگوں کو ان سے بہرہ ور کردیا گیا۔ جب تک بنیادی جمہوریتوں کے غیر سرکاری ارکان یہ اہلیت رکھتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورتوں اور خواہشوں کی نمائندگی کرسکیں معاشرے کی ان ضروریات سے باخبر ہونے میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوسکتا۔

مقامی حکومت کے کام کرنے والے حلقوں کا تعین خود قانون ہی نے کردیا ہے۔ لیکن اجتماعی ترقی کے عامل حلقے اس بات پر موقوف ہیں کہ معاشرہ کس درجہ ترقی یافتہ ہے، کس حد تک متحد ہوسکتا ہے اور ان مسائل کو جانچنے اور ان کو قبول کرنے پر تیار ہے یا نہیں جنہیں وہ اپنی بے خبری یا بے پروائی کے باعث محسوس نہیں کرسکا تھا۔ لہٰذا اجتماعی ترقی اپنا کام چلانے کے لئے ایک یا زیادہ گروہ، ذیلی گروہ یا دیہی جماعتیں چن لیتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مقصد کوئی خاص عارضی منصوبہ ہو یا بہت سے لمبی میعاد کے منصوبے ہوں۔

بنیادی جمہوریت کو اپنے سربراہ اسی طریقے سے چننے پڑتے ہیں اور ان وقفوں کے بعد جو اس قانون کے مطابق مقرر کئے جا چکے ہیں۔ لیکن اجتماعی ترقی کے ادارے سربراہوں کو پہچاننے، ان کی تربیت کرنے، چننے اور پوری طرح کام کا اہل بنانے کے لئے کئی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً سبھی لوگوں نے مل جل کر کسی کو خود ہی سربراہ مقرر کرلیا یا بآواز بلند کسی کی تائید کردی۔ یہاں تک کہ خفیہ پرچی کے ذریعہ بھی رائیں معلوم کرلی جاتی ہیں۔ "بنیادی جمہوریت" میں صدر کا منصب ضابطے قانون پر مبنی ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت اور اختیارات بھی زیادہ ہیں۔ چونکہ "اجتماعی ترقی" کے صدر کی پشت پر قانون و آئین کی ایسی کوئی قوت نہیں ہوتی اس لئے ممکن ہے کہ وہ اتنے اعتماد اور یقین کے ساتھ کام نہ کرسکے۔

غرض اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریت دراصل ایک ہی سلسلۂ ارتقاء کے دو مرحلے ہیں۔ ایک کا مقصد ہے کاموں کا جائزہ لینا، باضابطہ نہیں بلکہ آزمائشی۔ دوسرا بالکل منظم، باضابطہ اور مستحکم۔

لہٰذا ہم بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی میں طریق کار اور وسعت میں جو فرق محسوس کرتے ہیں وہ محض درجہ کا فرق

ہے، نوعیت کا فرق نہیں۔ بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی ایک ہی چیز کی زیادہ ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ جب بنیادی جمہوریتیں کام کرنے لگ جائیں گی تو دیہی ترقی کے کئے ہوئے کاموں یا جاری کاموں سے غیر متعلق نہ رہ سکیں گی بلکہ انہیں اپنائیں گی اور باقاعدہ اداروں کی صورت عطا کریں گی۔ یہ فرق نظری طور پر اہم نہیں اور عملی طور پر بڑے معمولی ہیں۔ لیکن ان کا دوبارہ بیان کرنا ضروری تھا تاکہ یہ حقیقت یاد رہے کہ" بنیادی جمہوریت ایک حرکی تصور ہے اور جوں جوں معاشرہ اپنی صلاحیتوں کو خود دیتا جائے گا لوگوں کا خود اعتمادی کی طرف قدم بڑھتا جائے گا، بنیادی جمہوریتوں کے جن جن درجوں پر جو بھی سربراہ ہیں' انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ہر مرحلہ پر کیا روش اختیار کریں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ایک طرف ترقیٔ دیہات کی تحریک اور اجتماعی ترقی اور دوسری طرف مقامی حکومت کی سرگرمیوں کے سلسلے ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ در اصل دنیا کے متعدد حصوں میں جو مطالعے کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاشرہ ترقی کرتے کرتے ایک خاص درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو جو کام یہ پہلے اپنی ترقی کے لئے خود بخود انجام دیتا رہا تھا وہ انہیں باقاعدہ اداروں کی شکل دینے کی ضرورت محسوس کرنے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کو مقامی حکومت اور اجتماعی ترقی میں تضاد نظر آیا ہے۔ جہاں مقامی حکومت نہایت کمزور ہو وہاں اجتماعی ترقی کامیاب رہتی ہے۔ پھر بھی اجتماعی ترقی کی کامیابی اور بقا کا دارومدار مقامی حکومت ہی کے استحکام پر ہوتا ہے کیونکہ اسے باقاعدہ مالی اور دوسری امداد اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تناقض یوں دور ہو جاتا ہے کہ ہم اجتماعی ترقی کو مؤثر مقامی حکومت کا زینہ خیال کریں۔ اس لئے یہ بات اجتماعی ترقی کا کام کرنے والوں کے لئے نہایت اہم ہو جاتی ہے کہ وہ مقامی حکومت کے لئے حمایت حاصل کرنے اور اس کو مضبوط بنانے کی کوششیں عمل میں لاتے جائیں۔

اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریتوں میں جو گہرا تعلق پایا جاتا ہے اس کا مشاہدہ ہندوستان میں کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے تین بہترین منصوبوں میں منصوبہ بنانے والے افسروں نے پنچایتوں اور امداد باہمی کی انجمنوں

سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

اسی طرح ایک افریقی تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اجتماعی ترقی کے کارکنوں کے بنائے ہوئے دارالمطالعہ ناکام ثابت ہوئے کیونکہ اجتماعی حکومت اور مقامی حکومت کے مابین تعاون کا فقدان تھا۔

بنیادی جمہوریت سے متعلق صدارتی حکم منتخب اداروں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور بنیادی جمہوریت کی حدود میں ان کی ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چونکہ بنیادی جمہوریت کے انتظامی یونٹوں کا پیمانہ بڑا ہے اس لئے ممکن ہے بنیادی جمہوریت کے سب سے نچلے درجہ کا انتظامی یونٹ ایک عام گاؤں سے بڑا ہو۔ لہذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقیٔ دیہات کے پروگرام کے تحت جو دیہی کونسلیں قائم کی گئی ہیں۔ یعنی زرعی و صنعتی ترقیٔ دیہات کے ادارے بڑی حد تک حسب معمول کام کرتے رہیں گے اور بلند تر سطحوں پر بنیادی جمہوریت کی اعانت کرتے رہیں گے۔ بہت اچھا ہو گا کہ اہل دیہات کو اس بنیادی ادارے اور اس کے نظام عمل کو غیر رسمی طور پر ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔ دیہات میں قانون کے ذریعہ زبردستی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش دیہی زندگی پر برا اثر ڈال سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ہو سکتا ہے کہ اس سے دیہات کے مختلف گروہوں میں دھڑے بندی اور بھی مضبوط ہو جائے۔ چنانچہ سر مالکم ڈارلنگ کی رپورٹ شاہد ہے کہ پنجاب کے ۵۰ فیصدی گاؤں ان کا شکار ہیں۔ اور ایک ایسے معاشرے میں جمہوریت اور انتخابات کی ترویج جس میں اخوت و یگانگت کے رشتے زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوئے کچھ عجب نہیں کہ رنگ میں بھنگ پیدا کریں۔ ترقیٔ دیہات کا پروگرام دیہاتیوں کی رضامندی سے کام کرنے" کی تعلیم دے گا۔ اور اس طرح انہیں تیار کرے گا کہ وہ بتدریج جمہوریت کو سمجھیں اور اسے اس طرح چلائیں کہ وہ سب کے لئے باعث تسلی ہو۔

لیکن چند وجوہ کی بنا پر اندیشہ ہے کہ اگر ادارہ جاتی تحفظات نہ ہوں یا پیدا نہ کئے جائیں تو اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریت میں رقابت اور کشمکش پیدا ہو جائے۔

چنانچہ اجتماعی ترقی کے پروگراموں سے متعلق اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ "سیلون، جزب الہند اور افریقہ کے برطانوی علاقہ میں اجتماعی ترقی کے افسروں اور ان لوگوں کے مابین جو حکومت کو استوار کرنے کے ذمہ دار ہیں، کچھ رقابت اور کشمکش پائی جاتی ہے۔" اس رقابت کا سبب یہ ہے کہ ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی کماحقہٗ توضیح نہیں کی گئی۔ بہت سارا کام جو ترقی دیہات کا ادارہ سرانجام دے رہا ہے، بنیادی جمہوریت اسے بھگتانے سے قاصر ہے لیکن اس کے علاوہ اور بہت سا کام ہے جسے بنیادی جمہوریت کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے لہٰذا یہ مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے ترقی دیہات کسی کام کو کرنے کی اہل ہو لیکن بنیادی جمہوریت یہ چاہتی ہو کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لے حالانکہ وہ اس کی اہل نہیں اور نہ اسے کرنے کی نیت ہی رکھتی ہے۔ لیکن بنیادی جمہوریت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے لے۔

یہ بھی امکان ہے کہ دونوں اداروں کے افسران معاشرے میں اپنا مرتبہ یا اقتدار بڑھانے کے لئے آپس میں ٹکرا نہ جائیں۔ اگر اس رقابت کی روک تھام نہ کی جائے تو ممکن ہے وہ ان کے دیگر اراکین میں بھی پھیل جائے۔ اور پھر اس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے۔

آخر میں ایک اور خطرہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے چونکہ بنیادی جمہوریت کو قانون کی تائید حاصل ہے، اس لئے ممکن ہے روایتی لیڈر اس کی طرف رجوع ہوں چنانچہ اقوام متحدہ کی مذکورہ بالا رپورٹ میں درج ہے کہ "ممکن ہے روایتی لیڈر اور مقامی سیاست داں اجتماعی ترقی کے پروگرام کی مخالفت کریں کیونکہ وہ اسے اپنی حیثیت کے لئے خطرناک خیال کرتے ہیں۔ شاید وہ یہ پسند نہ کریں کہ موجودہ حلقۂ اختیار سے باہر کچھ قائد خود بخود پیدا ہو جائیں۔"

ان کشیدگیوں کو دور کرنے کے لئے جو دیگر ممالک کے اجتماعی ترقیاتی پروگراموں اور مقامی حکومت میں پائی گئی ہیں، یہ ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ان اداروں کا ایک دوسرے کا ممد و معاون ہونا ظاہر ہو، نہ کہ یہ ایک دوسرے کے حریف رہیں۔ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ بنیادی جمہوریت اور انتظامیہ ترقی دیہات دونوں کے عملے کی نگرانی، تربیت اور رہنمائی کی ذمہ داری کو آپس میں مربوط کر دیا جائے۔ اس انتظام کے فوائد یہ ہیں کہ پروگرام کے عاملین، فرائض اور ذمہ داریوں کو متعین کر سکیں گے۔ جس سے نہ تو کام کی خواہ مخواہ تکرار ہوگی اور نہ وسائل ضائع جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی ہو جائے گی کہ لوگوں کا "اپنی مدد آپ" کا جذبہ کند نہیں ہوگا اور نہ گاؤں میں بےعملی کی خرابی پیدا ہوگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس بات کی ضمانت ہو جائے گی کہ دیہی کونسلیں اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے تحت جن منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں گی وہ بنیادی جمہوریت کے تحت برقرار رہیں گی۔ اس طرح اجتماعی ترقیاتی پروگرام "اپنی مدد آپ" کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ جس سے مقامی حکومت ایک موثر ادارہ بن جائے گی۔

علیٰ ہذا بنیادی جمہوریت ان اداروں اور قدروں کی محافظ بن جائے گی جو اجتماعی ترقی کے تحت بروئے کار آئیں گی۔

بنیادی جمہوریتوں اور دیہی ترقی کا عاملانہ نظم و ضبط ڈپٹی کمشنروں اور کمشنروں کے ہاتھ میں دے کر اس بات کو یقینی بنا دیا گیا ہے کہ یہ دونوں ادارے آپس میں پوری طرح مربوط ہو جائیں۔

اعلیٰ سطح پر ادارے قائم کرنے کے بنیادی جمہوریت ان سے بھی ان کی حیثیت کے مطابق اجتماعی ترقی کے لئے امداد حاصل کر لیتی ہے۔ مگر سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بنیادی جمہوریت ایک ایسے رابطہ کو ادارے کی شکل عطا کرتی ہے جو حکومت اور عوام کے مابین ہونا چاہئے اور جس کے لئے اب تک کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ نیز بنیادی جمہوریت ناظم کو رائے عامہ کی طرف اس طرح ملتفت کرتی ہے کہ یہ غیر متوقع ملاقاتیوں کے ساتھ اتفاقی ملاقاتیں، بعض منتخب دیہات میں جہاں آسانی سے پہنچا جا سکے، رعایا مدی کے دورے، یا بظاہر خود بخود منعقد ہونے والے جلسے،

جس کا ماتحت عہدہ داروں نے بندوبست کیا ہو، زیادہ تسلی بخش ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے رائے عامہ کو ایک خاص وقار حاصل ہوتا ہے۔ اور حکومت اور عوام میں خیالات اور معلومات کا برابر تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ حکومت نے ان جمہوری اداروں کی پرورش اور ترقی کے سلسلہ میں اپنے ملازمین ان کی ذہانت اور لیاقت پر بھی بڑی ہی خوش اعتمادی ظاہر کی ہے یہ ایک بالکل نیا کام ہے اور افسران کے انداز نظر میں تبدیلی کا متقاضی ہے۔ ایک شدید خرابی جو ان حالات میں پہلے ہی محسوس کی جاسکتی ہے اور جسے منتظمین کو پہلے ہی سے اپنے طور پر حل کرنا ہوگا، یہ ہے کہ رفاہ عامہ کے ساتھ ساتھ نظم وضبط کے تقاضے کیسے پورے کئے جائیں تاکہ دونوں کام بخوبی پورے ہوتے رہیں۔ نظم وضبط کا ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے ڈپٹی کمشنر کا فرض یہ ہے کہ مجرم کو قرار واقعی سزا دے، اس پر ذرا بھی رحم نہ کرے اور اس کے دل میں قانون کا ڈر پیدا کرے دوسری طرف رفاہ عامہ کا کفیل ہونے کی حیثیت سے لازم ہے کہ وہ مجرم کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے، اسے بنیادی حفاظت مہیا کرے، اسے بتائے کہ وہ کیسے اچھی زندگی بسر کرسکتا ہے اور اس طرح اسے مستقل طور پر بہتر بنا دے۔ یہ وہ انتہائی صورت حال ہے جو امکاناً پیدا ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ ان مسائل پر نمایاں روشنی ڈالتی ہے جن کا نئی انتظامیہ کو اُس وقت سامنا کرنا پڑے گا جب کہ بنیادی جمہوریتیں وجود میں آجائیں گی۔ درحقیقت نظم وضبط کا کام صرف باہر امن وحفاظت مہیا کرنا ہے اور اصلاحی کارکنوں کا اندرامن وحفاظت بہم پہنچانا ہے۔ ان دونوں کے میدان الگ الگ ہیں لیکن ان کی کوششیں ایک دوسرے کا کام پورا کرتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ افسر لوگ بے حد مصروف ہوتے ہیں، اور ڈپٹی کمشنر تو اور سب افسروں سے زیادہ مصروف ہوتے ہیں۔ اور بے حد گراں بار، اور جمہوریت ایسی چیز ہے جس کے لئے بڑا صبر وسکون اور دق کرنے والی باتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت بھی۔ لیسا اوقات جمہوری اداروں کے رہنماؤں کو اراکین کی پوچ پوچ باتیں اور فضول تقریریں بھی سننی پڑتی ہیں۔ اگر اکثریت کوئی فیصلہ کردے تو ان کا دل اتنا بڑا ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مرضی یا کھلی رائے کے خلاف اسے قبول کرلیں۔

ان اداروں کو چلانے کے لئے ضروری ہے کہ سرکاری افسروں کو ان کے کام کا پورا پورا وقوف ہو۔ اس مقصد کے لئے ترقی دیہات کی پاکستانی اکادمی سے بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس میں یہ تربیت دی جاسکتی ہے کہ حاکمانہ اختیار حاصل ہونے پر کس طرح کارگذاری کی جائے تاکہ جو لوگ ان کے زیر اختیار یا سربراہی میں کام کررہے ہوں ان میں اپنے آپ پر بھروسہ اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ اب تک ترقی دیہات کا پروگرام مغربی پاکستان کے ۲۵ فیصد سے کچھ کم رقبہ ہی پر حاوی رہا ہے۔ اگلے پانچ سالہ منصوبے کے ختم ہونے تک امید ہے یہ سارے صوبے پر حاوی ہوجائے گا۔ جن علاقوں میں ترقی دیہات کا سلسلہ نہیں پہنچ سکا تھا اور وہاں میدان خالی پڑا تھا، اب بنیادی جمہوریت نے خلا پورا کردیا ہے۔ ترقی دیہات اور بنیادی جمہوریت کے اس ربط باہمی کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ جہاں کئی علاقے ایسے ہوں گے جنہیں ترقی دیہات نے بنیادی جمہوریت کے لئے تیار کیا ہو وہاں جلد ہی ایسے علاقے بھی پیدا ہوجائیں گے جنہیں بنیادی جمہوریت ترقی دیہات کے لئے تیار کرے گی۔

لہٰذا یہ خیال کرنے کے لئے کافی وجہ موجود ہے کہ ترقی دیہات اور بنیادی جمہوریت ایک دوسرے کو تقویت بہم پہنچائیں گی اور ایک ایسے جمہوری پاکستان کی ترقی اور نشوونما کا باعث ہوں گی جو مضبوط اور تندرست ہو۔

(ترجمہ وتلخیص)

خراجِ آخریں

محمود نظامی
(مرحوم)

ن۔م۔ راشد

حفیظ ہوشیارپوری

ن۔م۔ راشد

گذشتہ ڈیڑھ برس میں میں نے کراچی اسٹیشن پر محمود نظامی کو تیز گام سے جب بھی رخصت کیا ہے گلے لگ کر رخصت کیا ہے۔ آج میں ابھی تیز گام سے اسے رخصت کرنے گیا تو اس نے ہاتھ تک نہیں ملایا مجھ سے بات تک نہیں کی۔ کسی سے بھی تو ہاتھ نہیں ملایا کسی سے بھی تو بات تک نہیں کی۔ حالانکہ آج کراچی اسٹیشن پر اس کے دوستوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ جو اسے لاہور رخصت کرنے آئے تھے۔ آج وہ کسی سے بغلگیر نہیں ہوا۔ اس نے کسی پر فقرہ نہیں کسا۔ کسی پہ پھبتی نہیں کسی۔ کل لاہور میں محمود نظامی کو سپردِ خاک کر دیا جائے گا اور اس کے مداح ہمیشہ کے لئے اس کی بذلہ سنجی اور سخن طرازی سے محروم ہو جائیں گے۔

ایسا دوست دار آدمی جس کو دوستوں کے بغیر چین نہیں پڑتا ہو۔ ایسا بذلہ سنج جس کی زبان سے فقروں کی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہوں ایسا بزم آرا جس کی موجودگی سے ہر محفل باغ و بہار بن جائے۔ ایسا مہمان نواز جس کے لئے زندگی کی سب سے بڑی لذت مہمان نوازی ہو!

یوں تو محمود نظامی سے وابستگی ایک زمانے سے چلی آتی تھی۔ اس زمانے سے جب ہم اور وہ لاہور کے دو مختلف کالجوں میں پڑھتے تھے لیکن ہمارے لئے فیضان کا سرچشمہ ایک ہی ذات تھی تاثیر مرحوم کی جن کی محفلوں میں سالہا سال شریک ہوتے رہے۔ لیکن نظامی کے ساتھ وہ ملاقات جو نیویارک میں ہوئی کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ میں نیویارک میں ابھی تازہ وارد تھا کہ چند ہی دنوں میں نظامی بھی کسی فیلوشپ پہ وہاں پہنچ گئے اور ہوٹل میں قیام کیا جس میں میں مقیم تھا۔ یہ ساتھ چند ہفتوں کا رہا۔ دن بھر تو ہم لوگ اپنے اپنے کام میں لگے رہتے لیکن شام کو ہماری محفل جمتی۔ اس محفل میں دو آدمیوں کی جلوت نے وہ خلوت مہیا کی کہ شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔ ان محفلوں میں دنیا جہان کی باتیں ہوتی تھیں۔ مذہب کی باتیں۔ سیاست کی۔ ادب کی۔ فن کی۔ فلسفے کی۔ معاشرتی مسائل کی۔ اپنے اپنے پیشے کی۔ امریکہ اور امریکنوں کی۔ نظامی نہایت ہلکے پھلکے انداز میں ایسی ایسی پتے کی باتیں کہہ جایا کرتے تھے کہ آدمی گھنٹوں سردھنتا رہ جاتا تھا۔ میں انہیں بہت سے امریکی گھروں میں لئے لئے پھرا وہ جہاں بھی گئے اپنے ذہن کی براقی کا پائدار نقش چھوڑ آئے۔

نظامی نے اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ براڈکاسٹر کی حیثیت سے گذارا۔ ریڈیو سے انہیں صحیح معنوں میں عشق تھا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ تنہا انہوں نے ریڈیو کے گوناگوں پروگراموں کے لئے جو مضامین یا بنیادی خیالات بہم پہنچائے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔ آج بھی ریڈیو کے اکثر پروگرام انکی اپج اور جدت طرازی کے ممنون ہیں۔

محمود نظامی کا سینتالیس برس کی عمر میں اس دنیا سے اٹھ جانا ہم سب کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ یہ عمر کی وہ منزل تھی جس میں ہم سب ان سے اور بھی پختہ تر اور وسیع تر کارناموں کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی تالیفات ان کے ذہن کے اصلی کمالات کی بہت کم نمائندگی کرتی تھیں۔ لیکن "نظر نامہ" ان میں یقیناً زندۂ جاوید تصنیف ثابت ہوگی۔ ایسے دلچسپ اور متنوع مشاہدات اردو میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

حفیظ ہوشیارپوری؛

"باغ و بہار انسان"

۱۳۷۹ھ

اب سے کوئی اٹھائیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں گورنمنٹ کالج میں تھا ایک دبلا پتلا شخص آیا اور اس نے اتنی تیزی سے کچھ کہا کہ میں صرف یہ لفظ سن سکا "اسلامیہ کالج" "تاثیر" میں نے کان کھڑے کئے اس نے فقرہ دہرایا تو معلوم ہوا کہ اسلامیہ کالج سے تاثیر صاحب نے "بزم فروغ اردو" کے جلسے میں بلایا ہے اور پیغام لانے والے ہیں محمود نظامی جو بزم فروغ اردو کے سکریٹری ہیں یہ تھی نظامی سے میری پہلی ملاقات اور لاہور میں میری ادبی زندگی کا آغاز۔ چند ہی روز میں مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں پہلی ہی ملاقات کے بعد ان کی بے تکلفی، بذلہ سنجی اور بے ریائی نے دل پر کچھ ایسے نقوش چھوڑے جو ہر نئی ملاقات کے بعد اور گہرے ہوتے گئے اور آج جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں یہ نقوش اور بھی ابھر آئے ہیں۔

"اسلامیہ کالج" "تاثیر" "بزم فروغ اردو" اور "نظامی" اس زمانے کی ادبی زندگی میں ہم معنی لفظ تھے۔ ادھر مصرع ثانی ان لفظوں سے مرتب تھا گورنمنٹ کالج "بخاری" "اردو مجلس" اور "آغا حمید" یہ چند لفظ اس زمانے کی ادبی زندگی کی ایک پوری داستان بیان کر رہے ہیں جن کے نہایت اہم کردار ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ نظامی ان دونوں محفلوں کی جان تھے۔ لیکن وہ تنقید سے زیادہ تخلیق کے ماہر تھے تنقید ان کے بس کی بات نہ تھی تنقید کا مفہوم ان کے نزدیک اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جو جی میں آیا منہ پر کہہ دیا۔

دوسری جنگ عظیم نے ہم دونوں کو آل انڈیا ریڈیو لاہور میں یکجا کر دیا اور یہیں نظامی کی ڈرامائی شخصیت اور جدت پسندی کے بہترین جوہر کھلے۔ ریڈیو کی فوری اور ہنگامی ضروریات کسی کا انتظار نہیں کرتیں نظامی کے چلبلے پن اور تیزی طبع نے اس میدان کو اپنے لئے جتنا کارآمد پایا اس سے زیادہ اپنے آپ کو اس کے لئے مفید ثابت کیا۔ ریڈیو میں آکر ہمیں سب سے پہلے اس بات کا احساس ہوا کہ آسان زبان لکھنا اور پھر تیزی کے ساتھ کتنا مشکل ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ نظامی کی زبان اور ان کے قلم نے ایک دوسرے سے کبھی ہار نہ مانی۔ اور یہ بات ان کی عام زندگی میں بھی نمایاں تھی۔

اس زمانے میں لاہور ریڈیو اسٹیشن کا ڈائرکٹر ایک ایسا سر پھرا انسان تھا جس کی دقت نظر اور مشکل پسندی ہمارے "سمند شوق" کے لئے تازیانہ کا کام دیتی موسیقی اور ڈرامے سے اس کی فطری دلچسپی اور اس کے انگریزی فارسی اور اردو ادب کے یکساں ذوق کی وجہ سے ہمیں نت نئی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ اور کبھی کبھی تو اس کی فہمائشیں سچ مچ تازیانے کی شکل اختیار کر لیتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے سب سے پہلا ٹاکس شڈول بنایا تو اس نے ایک ایک موضوع کو غور سے دیکھا چند موضوعات کی داد دی۔ سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ پھر ان سوالات کے جوابات کی تلاش کے لئے ایک ایسی بحث چھڑی جس سے موضوع فن اور ٹیکنیک کے اعتبار سے تحقیق اور جستجو کی نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ اس قسم کی بحثیں شروع شروع میں بڑی صبر آزما معلوم ہوتی تھیں لیکن ہوتے ہوتے ان میں ایسی جاذبیت اور کشش محسوس ہونے لگی کہ یہ نہ صرف ہمارے ریڈیائی مشاغل بلکہ ہماری عام ادبی سرگرمیوں کا بھی ایک لازمی جزو بن گئیں ایسے ڈائرکٹر کی ذہنی صلاحیتوں کا ساتھ دینا کسی فرد واحد کے بس کی بات نہ تھی۔ اور یوں بھی ریڈیو میں باہمی تعاون کی جتنی ضرورت ہوتی ہے شاید اور کہیں نہ ہو نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب نے مل کر ریڈیائی مسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ ان مسائل کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ ڈراما نگاری کے لوازمات۔ فیچروں اور دستاویزی پروگراموں کی ٹیکنیک۔ تقریروں کے موضوعات، ریڈیو کی زبان۔ اعلانات۔ شعر و موسیقی کا امتزاج۔ صوتی اثرات، مائکروفون اور اداکاروں کی صلاحیتیں۔ اسٹیشن ڈائرکٹر کے کمرے میں یا ان کے مکان پر ایک ایک مسئلے پر گھنٹوں بحثیں ہوتیں۔ ان بحثوں میں کون کون لوگ شامل ہوتے؟ پیرزادہ رفیع سید امتیاز علی تاج چراغ حسن حسرت صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ سید عابد علی عابد۔ پنڈت دینا ناتھ زتشی۔ آغا بشیر نظامی اور دوسرے حضرات۔

ہمیں حکم تھا کہ ہر روز نئے نئے خیالات اور اچھوتے موضوعات قلمبند کر کے لاؤ۔ حکم کی تعمیل آخر شوق میں بدل گئی شوق نے شغف کی صورت اختیار کی۔ اور شغف از خود رفتگی کی حد تک جا پہنچا کبھی صوتی اثرات کے تجربے ہو رہے ہیں۔ کبھی گانے کے لئے شعرا کے کلام کا انتخاب ہو رہا ہے۔ کبھی ایک موضوع پر فارسی، اردو

اردو کے اشعار جمع کئے جا رہے ہیں اور پھر اس بات پر گفتگو ہو رہی ہے کہ ان اشعار کو کس طرح ایک لڑی میں پرو دیا جائے۔ ادھر میز پر کاغذ جمع ہو رہے ہیں کہ اس کے لئے الگ اسٹاف نہ تھا۔ رات کو "ٹرانسمشن" چلانے کا یہ کام بھی ہمارے ہی سپرد تھا۔ ٹرانسمشن کے وقت نظامی کی عجیب حالت ہوتی دونوں ہاتھوں سے پتلون اوپر کو اٹھائے ہوئے اسٹوڈیو سے کنٹرول روم اور کنٹرول روم سے اسٹوڈیو کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ یہ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ راستے میں کس کس سے ٹکرائے۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ اپنے کام کو چھوڑ کر دوسروں کی امداد کے لئے بھی آ پہنچتے۔ ایک روز میں عورتوں کے پروگرام کی ریہرسل کرا رہا تھا۔ انہوں اتفاق سے لاؤڈ اسپیکر پر کچھ سنا، کھٹ سے میرے اسٹوڈیو میں آ دھمکے اور مائیکرو فون کی پوزیشن بدل کر واپس چلے گئے۔

ریڈیو کو نظامی نے بہت کچھ دیا لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ابتدائی تجربے ہیں جنہیں ٹیکنیک اور فن کے اعتبار سے ریڈیائی ڈرامے کا سنگ بنیاد کہنا چاہیئے۔ ان دنوں صوتی اثرات کے ریکارڈوں کا بہت کم رواج تھا۔ اسٹوڈیوں کے اندر نئے نئے صوتی اثرات کے تجربے کئے جاتے جن کا تعلق کسی خاص ڈرامے سے نہ ہوتا۔ اور بعض دفعہ ان صوتی اثرات کی کامیابی کو آزمانے کیلئے چھوٹے چھوٹے مسودے لکھے جاتے نشر کرنے کے لئے نہیں، محض تجربے کے لئے۔ اس طرح نظامی کی تن دہی اور ذہانت نے ہمارے موجودہ ریڈیائی ڈرامے کی بنیادیں استوار کیں۔ اس فن میں نظامی کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ریڈیو کو محض ایک ذریعہ معاش کے طور پر اختیار نہ کیا تھا بلکہ اپنی بھرپور شخصیت کے پورے اظہار کے لئے۔

زبان و قلم کی بے ساختگی اور روانی بڑی فراوانی کے ساتھ ان کے حصے میں آئی تھی۔ بولتے تو سننے والوں کے کان آنکھیں بن کر رہ جاتے لکھتے تو قلم سے "موقلم" کا کام لیتے۔ گفتگو کے وقت فوراً بھانپ جاتے کہ آپ ان سے کیا کہنے کو ہیں۔ ان کی آنکھوں کے گوشے سمٹ جاتے اور ہونٹوں پر لطف مسکراہٹ کے ساتھ خفیف سی حرکت کا احساس ہوتا جیسے وہ اس بات کا جواب ذہن میں دہرا رہے ہوں جو آپ ابھی ان سے کہنے نہیں پائے۔

انہیں رات دن کوئی نہ کوئی دھن لگی رہتی۔ طبیعت میں ایک قسم کی بیتابی اور بے چینی تھی کسی بات کا انتظار ان کے لئے دوبھر ہو جاتا۔ اس سیمابی طبیعت نے ان کے ساتھ کچھ لطیفے بھی وابستہ کر دئے ہیں۔ ایک روز ہم سب کو بخاری صاحب مرحوم کے ہاں جانا تھا۔ یہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی الیشور داس بلڈنگ (میکلوڈ روڈ) میں پہنچ گئے۔ اور اس زور سے انگلی رکھی کہ ملاقات کی گھنٹی کوئی ایک منٹ تک بجتی رہی آخر بخاری صاحب مرحوم باہر نکلے "گھر میں کوئی نہیں نوکر بازار گیا ہوا ہے بچے کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ دس منٹ پہلے چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی نہیں سوچتے کہ گھنٹی کی آواز سن لی گئی ہے لیکن سننے والا مصروف ہے اور آپ اس کے کام میں مخل ہو رہے ہیں" یہ فقرے سن کر جن میں پطرس کے مخصوص طنز کے ساتھ ساتھ بزرگانہ متانت بھی شامل تھی نظامی صاحب ایسے رفوچکر ہوئے کہ مدتوں انہیں شکل نہ دکھائی۔ دوسرے روز میں بخاری صاحب کے ہاں گیا تو گھنٹی کی تختی پر یہ لکھا تھا:

RE ERIEI AND PATIENT

دوسرے اسٹیشن ڈائرکٹر جن کا میں ذکر کر چکا ہوں آج ہمارے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ جب یہ اسٹیشن ڈائرکٹر تھے تو نظامی ان کی "دریافت" تھے۔ جب یہ ڈائرکٹر جنرل بنے تو نظامی ان کے دست راست بن کر آئے لیکن افسوس کہ موت کے آہنی پنجے نے انہیں قبل از وقت آن دبوچا۔ رشید احمد کا دایاں بازو شل ہو گیا۔ ایک ذہین اور محنتی رفیق کار اٹھ گیا۔ احباب کی محفل ایک مخلص دوست سے خالی ہو گئی۔

نظامی کی سیمابی طبیعت نے انہیں کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا کراچی آنے کے بعد زیادہ تر دورے پر رہے۔ ۹ فروری ۱۹۶۰ء کی صبح کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ ۱۲ فروری کی صبح کو دفتر آتے ہی میں نے اپنے ایک رفیق کار سے کہا میں نظامی صاحب سے ملنے جا رہا ہوں اس نے کچھ اور ہی خبر سنائی۔ میں نے جلدی میں کچھ لکھا اور کاغذ کا پرزہ میز کے ایک خانے میں ڈال دیا۔ آج جو یہ پرزہ اٹھا کر دیکھا تو یہ لکھا تھا:

اب محفل احباب میں تو ہے بھی نہیں بھی
اک عقدہ ہے گویا ترے مرنے کا یقیں بھی
(داہک)

آہ کیا کہئے بچارا ہم سے بھی تھا آشنا! (مدیر)

"ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ دآتجہانی، کے یہ چند فارسی اشعار دراصل ایک منظوم مراسلہ میں جو انہوں نے ۱۹۴۴ء میں استاذی حافظ محمود شیرانی مرحوم کو تحریر کیا تھا۔ اس وقت حافظ صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) (دریا گنج دہلی) میں مقیم تھے اور پنڈت کیفی ضلع لائل پور میں۔ ہمیں یہ یادگار اشعار حافظ محمود شیرانی مرحوم کے نواسے، جاوید محمود شیرانی صاحب نے عنایت فرمائے ہیں اور پنڈت کیفی کی ایک یادگار تحریر کے طور پر نذرِ قارئین ہیں:-

(مدیر)

مارنعِ یک التفات آمد گرفتم نازِ حسن — در نیازِ عشق ازمایاں چہ نقصاں دیدہ

یاد ایامے کہ از برقِ تبسم دائما — بزمِ یاراں رامثالِ طور رخشانیدہ

اے کہ حرفت بودہ در بزم ادب فردوسِ گوش — رُو چرا از شائقینِ خویش گردانیدہ

روزہا شد التجائے دوستاں از حد گزشت — پا مگر از جادۂ رنجیدگی نکشیدہ

اے سرت گردم نہ ایں باشد طریقِ دوستی — گفتہ باید آنچہ از یاراں قصورے دیدہ

رنجِ تست اے بندہ پرور رنجِ جملہ دوستاں

اے بُتِ طنازِ ما، از ما چرا رنجیدہ

پاکستانی ادیبوں کا منشور آزادی

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

★

مجھے یہ محسوس کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" آج ۳۱ رجنوری (۱۹۶۰ء) کو ڈھاکہ میں اپنی پہلی سالگرہ منا رہا ہے۔ پچھلے سال اسی تاریخ کو جب میں نے کراچی میں ادیبوں کے کنونشن کے ایک اجلاس میں شرکت کی تھی تو مجھے وہ کیفیت محسوس ہوئی "جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے" سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ میں اس وقت سے برابر آپ کی گلڈ کی رفتارِ ترقی کو بڑی گہری دلچسپی سے دیکھتا رہا ہوں اور یہ جان کر بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ آپ اہل قلم نے اپنی بہبود کے لئے جو تنظیم قائم کی ہے اس کی بنیاد بہت معقول و مستحکم اصولوں پر ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ جیسے اہلِ علم و دانش کو کچھ زیادہ سمجھانے کی تو ضرورت نہیں ہو سکتی مگر ایک عام قاری کی حیثیت سے اگر کچھ کہنے کی اجازت دی جائے تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنے آپ کو فکر و تصور میں بالکل آزاد، اظہار میں بے باک اور ماحول کی عکاسی میں بے دھڑک محسوس کریں۔ دیکھئے کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کوئی اندیشہ یا مصلحت کوشی آپ کی بُرّشِ طبع کو کند کر دے۔ میں والٹیئر کی مدح سے متاثر ہو کر یہ بھی کہہ دوں کہ آپ جو کچھ کہیں، ہو سکتا ہے کبھی مجھے اس سے اختلاف ہو، بلکہ کبھی اس پر میں احتجاج بھی کروں، لیکن جہاں تک آپ کے حقِ اظہار کا تعلق ہے میں ہمیشہ اس کے لئے سینہ سپر رہوں گا، بشرطیکہ اس کی زد یا ضرب خود ہمارے ملک کی بقا پر نہ پڑتی ہو۔

مجھے علم ہوا ہے کہ آپ نے کئی اہم کاموں کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ آپ حضرات پاکستانی زبانوں کے ایک دوسرے میں تراجم کرنے کے سلسلے کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز رکھیں خاص کر اردو اور بنگلہ سے ایک دوسرے میں تراجم۔

میں ملک میں تعلیم کی جو وضعِ نو قائم کرنا چاہتا ہوں وہ بھی آپ کے کاموں کے لئے ایک بڑا وسیع میدان مہیّا کرتی ہے۔ آپ اس سلسلے میں طلبا کے مختلف درجوں کے لئے ایسی نصابی کتب تحریر کر سکتے ہیں جو احساسِ وطنی پر مبنی ہوں۔ یہ بڑی اہمیت کا کام ہے اور مجھے یقین ہے کہ گلڈ اس کام کو ضرور اپنے اہتمام میں لے سکے گی۔

کاش میں ڈھاکہ میں کچھ زیادہ دیر ٹھہر سکتا اور آپ کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں شریک ہو سکتا مگر دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے ایسا کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے، مگر یقین رکھئے کہ میری بہترین تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

(محمد ایوب خاں)

روداد چمن

(پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک سال)

قدرت اللہ شہاب

آج کی صحبت میں میں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کا بنیادی تصور کیا ہے۔

جب پچھلے سال اسی دن گلڈ کے قیام نے عملی صورت اختیار کی تو ہم میں سے اکثر جن میں خود میں بھی شامل ہوں یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے بعد کیا ہوگا لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ ایک کے بعد دوسرا ادیب اپنے خوابوں کے شبستاں اور ایک کے بعد دوسرا انشاء پرداز اپنے سنہری رو پہلی محلوں سے نکل نکل کر باہر آتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب ایکسلسیر ہوٹل کراچی کے ایک کمرہ میں اکٹھے مل بیٹھ کر کچھ وقت گزارنے لگے جہاں گزشتہ ایک سال سے گلڈ کا مرکزی دفتر واقع ہے۔ اس کمرے کی کچھ نہ پوچھئے۔ اندھیرا اندھیرا سا۔ دم گھٹنے والا کمرہ جہاں ٹھنڈی چائے کی ایک ذرا سی پیالی بھی پینا چاہیں تو نہ جانے اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے۔ اور جہاں بیرے ہماری طرف بری طرح ناک بھوں چڑھا کر دیکھتے ہیں کیونکہ ہم نے ابھی تک اسے کرایہ دینے کا تکلف نہیں کیا اور نہ کچھ عرصے تک یہ زحمت گوارا کر سکیں گے۔ کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ ہم میں اتنی توفیق ہی نہیں!۔

ادھر باہر کی دنیا میں بھی ہم سے کچھ نیک سلوک نہیں ہوتا۔ ہوٹل میں ٹھنڈی چائے سے خاطر تواضع ہوتی ہے تو باہر کوئی سخت سرد مہری سے پیش آتا ہے۔ بعض ایسے بندگان خدا بھی ہیں جو ہوٹل کے بیروں کی طرح ہمیں نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ایسے بھی جو ہوٹل کے مالک کی طرح دعا مانگتے ہیں کہ ہمارا قصہ پاک ہو جائے تو وہ خوش ہو کر گھر گھر مٹھائی بانٹیں۔ اب کیا ضرورت ہے کہ میں اندر باہر یکساں سلوک بہ تلخ نوائی کا سلسلہ آگے بڑھاؤں۔ کیونکہ میں اس سے تلخ کام ہونے سے تو رہا۔ میں تو ان حالات و واقعات پر نظر ڈالنے سے دلی مسرت محسوس کرتا ہوں کہ جب سے ایک سال ہوا گلڈ کی باقاعدہ طور پر بنیاد رکھی گئی، ہوٹل ایکسلسیر کے اس چھوٹے سے کمرے میں کیا کچھ کارگزاری ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کو تفصیلات سے گراں بار نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا یقین جانئے گلڈ کی تہ میں جو تصور کارفرما تھا میں نے اسے اور اس کی خارجی ہیئت کو اسی طرح غیر محسوس مگر قطعی طور پر نشو و نما پاتے دیکھا ہے جس طرح کسی دوشیزہ کے گھنے گھنیرے لانبے لانبے چمکیلے گیسو۔ آج کوئی شخص خیبر سے لے کر کاکس بازار تک جائے تو محال ہے کہ آٹھ گھنٹوں کے اندر اندر کسی ایسے کمرے یا کٹیا یا چھوٹے سے گاؤں میں نہ جا نکلے جہاں کسی نے ہمارے گلڈ کا یہ بڑ یعنی قلم کی نشانی والا بلہ نہ لگا رکھا ہو اور آپ کا خیر مقدم کرنے کو تیار نہ ہو۔ اس باہمی رشتوں کے تانے بانے کو تیار ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ لیکن جہاں ایسے معاملات ہوں وہاں مدت کا سوال کچھ ایسا اہم نہیں۔ جو بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ بلہ لگاتے ہوں اور جو نہ لگاتے ہوں۔ وہ اسے محبت کی نظر سے دیکھیں نہ دیکھیں مگر اس کی برابر تعظیم کریں میں تو اس دن کو دیکھنے کا آرزومند ہوں جب کسٹم انسپکٹر آپ کا اسباب کھول کر نہ دیکھیں یا ٹکٹ چیکر آپ کا ٹکٹ دیکھنے پر اصرار نہ کریں کیونکہ آپ نے یہ بلہ لگا رکھا ہے جو قابل اعتبار ہونے کی علامت ہے۔ وہ دن جبکہ کوئی رعونت کیش دفتری فرعون آپ کو دنوں اور گھنٹوں زحمت کش کے انتظار نہیں رکھے گا اگر آپ ایسا ملاقاتی کارڈ بھیجیں گے جس پر یہ علامت موجود ہو جو اسے خود بخود آپ کی تعظیم کرنے پر مجبور کر دے۔ وہ دن جب یہ بلہ نفرت کی بجائے محبت حقارت کی بجائے تعظیم اور شک و شبہ کی بجائے اعتماد پیدا کرے۔

یہ ہے وہ نصبُ العین جس کو حاصل کرنے کے لئے میں گلڈ کے ایک ناچیز کارکن کی حیثیت سے جدوجہد کر رہا ہوں۔ لیکن اس سلسلہ میں آپ کو تین باتوں کی تنبیہہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

پہلی تنبیہہ تو میں خود اپنے آپ ہی کو کروں گا۔ یعنی ان لوگوں کو جو میری طرح گلڈ کے اراکین ہیں۔ ہمیں یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ گلڈ محض ایک ٹریڈ یونین ہے۔ یہ ایک تنظیمی جماعت ہے۔ ایسی جماعت نہیں جس کا کوئی مخصوص نظریہ ہو۔ گلڈ کا واحد نظریہ۔ اگر آپ مجھے اس اصطلاح کو برتنے کی اجازت دیں۔ ایک ہی ہے۔ فکر میں خلوص اور اس کو برتنے اور بروئے کار لانے میں حوصلہ اور آزادی سے کام لینا ـــــ اس کے علاوہ ہر کوئی اپنے دل کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص ادبی اور ذہنی سطح پر کچھ لکھتا ہے تو وہ ذاتی حیثیت سے لکھتا ہے۔ گلڈ کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں۔ خواہ اس ادارہ میں اس کا منصب یا درجہ کچھ بھی ہو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے تاکہ اس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

اب دوسری تنبیہہ کی طرف آیئے۔ اس کا تعلق دفتری چودھراہٹ کے ان طبقوں سے ہے جو یہ شبہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ ممکن ہے گلڈ سیاسی معنوں میں بائیں بازو یا دائیں بازو کا حامی ہو جائے۔ نہیں۔ گلڈ کوئی سیاسی ادارہ نہیں ہے اور گلڈ اسی صورت میں ایک سیاسی ادارہ بن سکتا ہے جب ہم لوگوں کا خاتمہ کر کے ہماری لاشوں پر چلا جائے۔ اس سے قطع نظر میں پوچھتا ہوں، دائیں طور پر بایاں ہونے یا بائیں طور پر دایاں ہونے میں کیا برائی ہے؟ ہر تخلیقی فن کار فطرتاً ناصبور ہوتا ہے۔ وہ لازماً اپنے گرد و پیش کی صورت حال سے مطمئن نہیں ہوتا کیونکہ اسے ہمیشہ ایک ناقابل حصول نصب العین کی تلاش رہتی ہے۔ تاوقتیکہ یہ ذہنی اضطراب کسی اندرونی یا بیرونی دباؤ یا ترغیب کے تحت تخریبی نہ بن جائے۔ ادب میں نہ کوئی دایاں ہے نہ بایاں۔ اس میں صرف ایک سمت ہے۔ صراط مستقیم۔ [illegible] دائیں یا بائیں کو دبانے کی ہر کوشش کا ایک ہی نتیجہ ہوگا۔ یہ کہ ا[illegible] کا رخ سیاسی دائیں بائیں کی طرف نہ ہو جائے۔ شاید ان میں سے ایک تلخ معلوم ہو اور دوسرا شیریں لیکن جہاں تک زندگی میں ایک خوشگوار توازن کا تعلق ہے یہ دونوں اس کے حق میں زہر ہیں۔

•

میری تیسری تنبیہہ ـــ یہ امیر لوگوں کے لئے ہے۔ ہمارا ملک ایسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے جن کے جسم اور جان آلِ زر کے ہجوم سے بھٹے پڑتے ہیں۔ ادھر ہم لوگ ادیبوں کی بھلائی کے لئے ایک بے نظیر منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے اہم کام کا بیڑا اٹھا رہے ہیں۔ اس کو اپنے ہی قومی وسائل سے کامیاب بنانا چاہتے ہیں کیونکہ بیرونی امداد کے لئے ہم دست سوال نہیں بڑھاتے۔ قبل ازیں ہمارے ہم وطن مالدار لوگوں نے فیاضی و مردم نوازی کے باب میں کیا کچھ نہیں کیا۔ ہم ادیبوں کے ساتھ نیک سلوک اور کار خیر ہے جو ان ارباب ثروت کی توجہ چاہتا ہے۔ مجھے ایک امیر آدمی کا قصہ یاد ہے۔ ان حضرت نے ایک فرانسیسی عطر کی بیس ہزار شیشیاں خریدی تھیں محض اس لئے کہ یہ ایک نازنین لڑکی کے جسم کو خوشبو میں بسانے کے کام آئیں۔ اور لڑکی بھی وہ جس کے ساتھ انہیں محبت نہ تھی، بلکہ محض ہوس تھی۔ میں ان صاحب کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ ہماری گلڈ پر اس سے آدھا بھی کرم فرمائیں تو سارا ملک اور زیادہ شاعری اور زیادہ نثر کی خوشبو میں رس بس کر مہک اٹھے گا۔

خواتین و حضرات: آیئے ہم سب مل کر دعا کریں کہ اگلے سال جب ہم گلڈ کی دوسری سالگرہ منائیں گے تو اس کے نئے سیکرٹری جنرل کو ان تنبیہوں کو دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آخر یہ کام کوئی ایسا خوشگوار بھی تو نہیں۔

★

مستقبل کی اردو

ڈاکٹر محمد صادق

زندہ زبانیں کبھی ایک سی نہیں رہتیں۔ ان میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نئے الفاظ، محاورات اور اسالیب بیان بنتے اور رواج پاتے ہیں اور پرانے بگڑتے اور مرتے چلے جاتے ہیں۔ تلفظ میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور معانی کا دائرہ وسیع یا تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گو امر اپنا راستہ بدلتی ہے۔ نئی چیزیں اور نئے خیالات اپنے نام ساتھ لاتے ہیں یا انہیں وضع کیا جاتا ہے۔ یہ اور کئی اور تبدیلیاں رفتہ رفتہ، نامعلوم طور پر معرضِ وجود میں آتی ہیں لیکن پر آشوب ادوار میں جب روایات کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے یا ایسے ادوار میں جب ایک مقابلۃً کم متمدن قوم کے ایک متمدن قوم سے سیاسی یا علمی روابط پیدا ہو جاتے ہیں، تو زبانیں نہایت سرعت سے بدلتی ہیں اور تحرک و اکتساب کا فطری عمل شعوری شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اردو زبان نے جو اثرات فارسی اور انگریزی سے قبول کئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو تبدیلیاں اس میں رونما ہوئی ہیں وہ اس کلیہ کی واضح شہادت ہیں۔

مستقبل کی اردو پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں ان اثرات کا محض اجمالاً ذکر کروں گا جو ایک مدت سے اس پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور جن کا عمل مستقبل میں بھی بعینہٖ اسی طرح جاری رہے گا۔ البتہ وہ لسانی تبدیلیاں جو تشکیلِ پاکستان سے معرضِ وقوع میں آئیں گی اور آ رہی ہیں، خصوصیت سے غور طلب ہیں۔ اور میں ان سے کسی حد تک مفصل بحث کروں گا۔

اردو زبان پر جو اثرات ایک عرصۂ دراز سے طاری ہو رہے ہیں، دو ہیں۔ اول فارسی زبان کا اثر جس کا آغاز اردو کی ابتدا سے ہم کنار ہے۔ اور دوسرا انگریزی کا اثر جو بالخصوص ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شروع ہوا۔ یہ دونوں اثرات مستقبل میں بھی بدستور جاری رہیں گے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی اور عربی سے ہماری موانست اس عقیدت کا نتیجہ ہے جو بحیثیت مسلمانوں کے ہمیں ان زبانوں سے ہے۔ یہ خیال بہت حد تک درست ہے۔ لیکن یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اول اول اردو، فارسی کے حریف کی حیثیت سے میدان میں آئی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا تو مسلمان فارسی سے بدظن ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے آجکل ہم انگریزی سے بدظن ہو رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا عام احساس ہو گیا کہ فارسی پرائی زبان ہے۔ اور ان کے دلوں میں اپنی زبان کو ترقی دینے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن اس تحریک کے بانی اور موئید، خانِ آرزو، مظہر، سودا، میر، اور میر درد، سب کے سب فارسی کے عالم تھے۔ لہٰذا جب وہ فارسی کی تہذیب و تربیت کی طرف ملتفت ہوئے۔ تو انہیں اردو کو مالا مال کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ نظر آیا۔ یہ کہ فارسی کے خیالات، الفاظ، محاورات اور تراکیب کو اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ سلسلہ آج تک برابر جاری ہے اور فارسی سے مواد مستعار لینا ہماری فطرتِ ثانیہ ہو گئی ہے۔ جب بھی ہم کسی نئے خیال یا علمی نکتہ سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم معاً فارسی اور عربی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ زبانیں مدت سے ہماری علمی ضروریات کی کفیل رہی ہیں اور رہتی رہیں گی۔

اکثر سننے میں آتا ہے کہ فارسی اور عربی کے مستعار الفاظ اور مرکبات ہماری بے مائیگی یا کم مائیگی پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ الفاظ اس لئے مستعار لئے گئے کہ ہمارے ہاں ان کے مرادف الفاظ نہ تھے لیکن کسی زبان کی تہی دامنی کا واحد علاج الفاظ کی درآمد نہیں ہے۔ قومیں اپنے ملکی مواد سے نئے الفاظ، تراکیب اور مرکبات تیار کر لیتی ہیں اور اس کی ایک اچھی مثال جرمن زبان ہے۔ جس فراخ دلی سے ہم فارسی اور عربی الفاظ اپنی زبان میں داخل کرتے ہیں۔ اس کی مثالیں اور زبانوں میں بہت کم ملیں گی۔ انگریزی زبان نے بھی اجنبی مواد کو بہ افراط اپنے آپ میں سمو لیا ہے۔

لیکن نہایت خوش اسلوبی سے۔ نیز انگریز دیسی مواد یعنی اینگلوسکسن کو حقارت سے نہیں دیکھتے۔ اس کے برعکس ہم دیسی مواد کو اسی ترحم آمیز یا نفرت آمیز نگاہ سے دیکھتے ہیں جس طرح ہم اپنے مفلس اقربا کو دیکھتے ہیں۔ اور انہیں درخور اعتنا خیال نہیں کرتے۔ مانا کہ فارسی اور عربی عنصر سے ہماری زبان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس بھاری بھرکم مالِ غنیمت کو بمشکل اپنے کندھوں پر اٹھا رہی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے زبان کے سیکھنے میں دشواریوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دیکھئے تخلیقِ الفاظ کے لئے فارسی کس خوش اسلوبی سے اپنے ذاتی ذرائع اور وسائل استعمال کرتی ہے۔ کیا "خوش بیں" اور "بدبیں" "قنوطی" اور "رجائی" سے زیادہ آسان اور موزوں الفاظ نہیں اور "دائرلیس" کے لئے "لاسلکی" استعمال کرنا کونسی دانش مندی ہے۔ جبکہ لفظ "تار" عرصۂ دراز سے ہمارے ہاں استعمال ہو رہا ہے؟ غالباً سب سے زیادہ کریہہ الصوت لفظ جو اردو میں ابھی ابھی داخل کیا گیا ہے "مندوبین" ہے۔ میری رائے میں ایسے اجنبی الفاظ کو داخلِ زبان کرنا اس کی خدمت نہیں بلکہ اس سے بدسلوکی کرنا ہے۔ بہر حال، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، فارسی اور عربی کے الفاظ اردو میں داخل ہوتے رہیں گے، جن کی وجہ سے وہ ادبی بوجھل بن جائے گی۔

پچھلے سو سال سے انگریزی اردو پر نہایت گہرے اثر ڈال رہی ہے۔ انگریزی الفاظ یا تو براہ راست مستعار لئے گئے ہیں یا ان کو تراجم کے ذریعہ داخلِ زبان کیا گیا ہے، یا ان کے معانی کے پیش نظر نئی اصطلاحات مرتب کی گئی ہیں۔ الفاظ اور تراکیب سے گزر کر انگریزی اثر جملوں کی ساخت اور اندازِ فکر تک پہنچ گیا ہے۔ افراط و تفریط سے بچنا ہر حالت میں مستحسن ہے لیکن اس تاثر پذیری میں کوئی قباحت نہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا کہ انگریزی کا یہ استیلا سیاسی غلبہ کی علامت ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اثر بالکل پہلے کی طرح جاری ہے۔ انگریزی سے استفادہ درحقیقت ایک اعلیٰ تمدن کی خوشہ چینی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک علوم و فنون اور عام تمدن میں یورپ ہم سے آگے ہے۔ انگریزی کا غلبہ بدستور قائم رہے گا۔ مستقبل کی اردو میں انگریزی عنصر نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

آیئے اب دیکھیں کہ تعمیر پاکستان کا اردو کی نشو و نما پر کیا اثر ہوگا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی فضا اردو کیلئے سازگار ثابت ہوگی قیام پاکستان سے پہلے اردو خطرے میں تھی۔ لیکن اب جب کہ اردو پاکستان کی ملکی زبان قرار دی جا چکی ہے اس کا مقام متعین اور مستحکم ہو گیا ہے اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے گی۔ میری رائے میں ۴۷ء ۱۹ کا انقلاب اردو میں مستقل اور دوررس تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ جن میں سے چند ایک کا ہمیں اس وقت سان گمان تک نہیں۔

اس انقلاب کا اردو زبان پر سب سے پہلا یہ اثر ہوا کہ اپنے سابقہ جنم بھوم[1] سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔ اردو دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ وہاں کی زبان بالاتفاق مستند خیال کی گئی اور ہم سب نے اس کا تتبع کیا۔ اب ہمارے اور ان شہروں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب یہ شہر ہمارے لئے شمع ہدایت نہیں رہیں گے۔ اردو والے گھر سے بے گھر ہو کر ہمارے ہاں ایک پناہ گزین[2] کی حیثیت سے آبسی ہے۔ اگرچہ ہم نے اس کا خیر مقدم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پھر بھی اس کی روایات کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ اب یہ شہر اس کی نشو و نما نہیں کر سکتے۔

اگر یہ تعلق منقطع نہ ہوتا پھر بھی اردو کا ہندوستان میں پنپنا دشوار تھا جس زور و شور سے ہندوستان میں ہندی کا پرچار ہو رہا ہے اور اسے ہندوستان کی عام زبان بنانے کے منصوبے ہو رہے ہیں، ان کے پیش نظر اردو کا مستقبل نہ صرف دھندلا بلکہ تاریک نظر آتا ہے یہ درست ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اردو سے بے حد وابستگی ہے

---

[1] اردو کی جنم بھوم کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ چنانچہ بعض سابق سندھ پنجاب اور سرحد کو اس کا ابتدائی گہوارہ خیال کرتے ہیں۔ گو ان میں عملاً مقامی بولیوں ہی کا رواج رہا ہے (مدیر)

[2] پناہ گزین کی بجائے "مہاجر" زیادہ موزوں ہوگا۔ اگرچہ یہ بھی ایک حد تک ہی صحیح ہے کیونکہ اردو پاکستانی علاقوں میں برابر بھی بولی اور لکھی جاتی ہے۔ پھر اردو ہندوستان میں بے خود رانی ہے۔ اور زبان و ادب کے سلسلہ میں سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ آئندہ اس ملک میں ان پر کیا گزرے گی۔ آگے چل کر مضمون نگار نے بھی اس کی بخوبی وضاحت کر دی ہے۔ (مدیر)

لیکن اقتصادی ضروریات کے سامنے محض جذبات کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ اردو کے پرستاروں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، نہ صرف ہندی پڑھنی پڑتی ہے بلکہ اس میں مہارت وہ مہارت کامیابی کے لئے ازبس ضروری ہے۔ ریڈیو، اخبارات، لین دین، تجارت، ان سب میں ہندی کو دخل ہے۔ ممکن ہے سن رسیدہ اصحاب اس ہندی پرستی کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی ادبی اور لسانی روایات کو برقرار رکھیں، لیکن نئی پود اسی فضا کو قبول کرے گی جس میں وہ سانس لے رہی ہے۔ ان کی زبان پر ہندی الفاظ چڑھ رہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب اردو انہیں اجنبی معلوم ہونے لگے گی۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ دہلی جس کی زبان فصاحت و بلاغت میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، اب ہندوستان کا دارالحکومت ہے۔ ہندوستان کا کونسا علاقہ ہے جس کے باشندے اب وہاں آباد نہیں؟ ان سب کے اختلاط سے دہلی کی زبان ایک معجونِ مرکب بنتی جارہی ہے جس میں غالب عنصر ہندی کا ہوگا۔ یہی حال لکھنؤ کا ہوگا۔ وہ روایات جنہیں لکھنؤ نے اب تک برقرار رکھا ہے، ہندی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی۔

جس طرح کوئی آبادکار یا مہاجر اپنے وطن مالوف سے علیحدہ ہو کر اپنے ماحول کو سازگار بنانے کے لئے اپنے نئے ہمسایوں سے رشتۂ مؤدت استوار کرتا ہے، اردو کو بھی بالکل ایسا ہی کرنا ہوگا۔ پاکستان میں اردو اپنی معیاری نفاست اور صفائی برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ اور اسے اپنے گرد و پیش کے حالات کو قبول کرنا پڑے گا۔ اور مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اس کی اصلی روایات کمزور ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن کہا جائے گا کیا پاکستان میں ایسے لوگ آباد نہیں جن کی مادری زبان اردو ہے؟ کیا وہ اس کی پاکیزگی کو برقرار نہ رکھ سکیں گے؟ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے۔ لیکن ان کی مساعی کامیاب نہ ہوں گی۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ملک کے مختلف حصوں میں منتشر ہیں۔ ان کے اردگرد، صبح و شام پنجابی، پشتو، بلوچی، سندھی بولی جاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خود ان کے اثرات سے مامون و محفوظ رہیں۔ لیکن ان کے بچے اور آئندہ نسلیں اپنے ماحول کے اثر سے نہ بچ سکیں گی۔ وہ یہاں کے بچوں سے گھل مل جائیں گی۔ اور رفتہ رفتہ تعلیم، کھیل کود، گلی کوچہ میں ان کے ہمجولیوں کے الفاظ ان کی زبان پر

چڑھ جائیں گے۔ یہ عمل بعد میں بھی جاری رہے گا۔ آپس کا میل جول، کاروباری معاملات، ملازمت، باہمی رشتہ داریاں، شادی بیاہ۔ ان سب کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے قریب تر آتے چلے جائیں گے۔ دریں حالات ناممکن ہے کہ ان کا لب و لہجہ اور زبان اپنی اصلی حالت برقرار رکھ سکے۔ ایک مہاجر نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان "اردو اور پنجابی کا سنگم" ہے، اس امر کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"....میری اولاد بھی خود کو ہمسایہ بچوں کی صحبت میں اجنبی محسوس کرتی تھی۔ میرے بچے ان کی باتیں نہ سمجھ سکتے تھے۔ آخر آہستہ آہستہ ان پر ہمسایہ بچوں کا رنگ چڑھنے لگا۔ اور وہ پنجابی بولنے کی کوشش کرنے لگے لیکن اس کوشش میں ان کی اپنی زبان خراب ہونے لگی۔ اب یہ حالت ہے کہ وہ گھر میں اردو میں باتیں کرتے کرتے لاشعوری طور پر اکثر ایک آدھ پنجابی کا لفظ بھی بول جاتے ہیں۔ انہیں بہتیرا سمجھایا جاتا ہے لیکن وہ بے بس نظر آتے ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آہستہ آہستہ ان کی زبان کیا صورت اختیار کرے گی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ چند برسوں میں وہ نہ اردو بولیں گے نہ پنجابی۔" میری رائے میں یہ اثر اتنا گہرا نہیں ہوگا جتنا کہ وہ خیال کیا جاتا ہے۔ اور آخر کار مستقل طور پر وہی الفاظ داخل زبان ہوں گے جن کی ضرورت ہے۔

ہماری بولیوں کا ایک اچھا خاصہ عنصر ایک اور طرح بھی اردو میں داخل ہو جائے گا۔ اور اس کا داخل ہونا ضروری بھی ہے۔ یہ کام ہمارے ناول نویس، افسانہ نگار اور مضمون نگار سرانجام دیں گے۔ ان لوگوں کے پیش نظر سرشار کی لکھنوی فضا یا نذیر احمد کے موضوعات اور کردار نہیں ہوں گے۔ ان کے پیش نظر پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگ اور ان کی زندگی ہوگی اور اپنی تصانیف کو مقامی رنگ دینے کے لئے انہیں ایک ایسی زبان استعمال کرنی پڑے گی جس میں مقامی رنگ کی جھلکیاں ہوں۔ ادب میں واقعیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگوں کی بول چال ہوبہو نقل کی جائے مگر ایسا ہو تو پنجابی زمیندار صرف پنجابی ہی میں گفتگو کرتا دکھائی دیا جائے گا۔ اور پٹھان پشتو میں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ افراد کا لب و لہجہ اور زبان قرینِ قیاس ہو۔ یا بظاہر صحیح معلوم ہو۔ یہ درست ہے کہ پاکستان کے لوگ اردو نہیں بولتے۔ لیکن اگر انہیں اردو بولتے دکھایا جاتا ہے تو یہ ازحد ضروری ہے کہ وہ لکھنؤ یا دہلی کے مخصوص محاورات استعمال نہ کریں ورنہ آپ پکار اٹھیں گے کہ یہ

یہ لوگ ہرگز پاکستانی نہیں۔ پس اپنے مضامین کو واقعیت کا رنگ دینے کے لئے مقامی رنگ آمیزی از حد ضروری ہے۔ یہ اصول دنیائے ادب میں ہر جگہ کام کرتا دکھائی دیتا ہے والٹر سکاٹ کی بہترین تصانیف وہی خیال کی جاتی ہیں جن کے افراد سکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں اور جن کی زبان میں وہاں کے مخصوص محاورات اور الفاظ کو دخل ہے۔ مکالے کی کامیابی یا واقعیت کا راز اسی امر میں مضمر ہے کہ افراد ایسی زبان میں گفتگو کریں جس کی ہم اُن سے توقع رکھتے ہیں اور یہاں سو فیصدی حقیقت نگاری کی ضرورت نہیں۔ ہر علاقے کے اپنے مخصوص محاورات، الفاظ اور جملے ہیں جنکے بامو قع استعمال سے مکالمہ قرینِ قیاس دکھائی دیتا ہے۔ یہ امر درحقیقت قیامِ پاکستان سے بہت پہلے سے جاری ہے اور ہمارے افسانہ نگاروں کی تصانیف میں مقامی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یہ مقامی رنگ جو پنجابی الفاظ اور ٹھیٹھ پنجابی محاورات کے ترجمے کی شکل میں ملتا ہے، ہمارے ادب میں دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ عنصر بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

دیکھئے ذیل کی نظم میں شیر افضل[1] جعفری نے خالص پنجابی ہوا کو کس خوش اسلوبی سے اردو میں سمویا ہے:-

الھڑ سوانیاں ہیں اٹھتی جوانیاں ہیں
چاندی کی گردنوں میں سونے کی گانیاں ہیں
چرخے کے ساتھ گاتی باجھ کی بانیاں ہیں
چڑھتی ہوئی ندی کی دل میں روانیاں ہیں
انداز سے گھماتی رنگیں مدھانیاں ہیں
آنکھوں میں گفتگو ہے کیا بے زبانیاں ہیں
یہ پاک باز ہیریں
بے تاج رانیاں ہیں

اگر یہ درست ہے کہ دہلی یا لکھنؤ کا مخصوص محاورہ اور وہاں کی عامیانہ زبان جسے انگریزی میں سلینگ کہتے ہیں ہماری سماجی زندگی سے بے جوڑ معلوم ہوگی تو آخرکار اس کا کیا حشر ہوگا؟ میری رائے میں وہ صرف کتابوں میں رہ جائے گی۔ لکھے پڑھے لوگ اس سے علمی طور پر آشنا ہوں گے۔ لیکن وہ اردو کی روزمرہ یا عام طور پر مستعمل زبان کا حصہ نہیں رہے گی۔

جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اس سے ظاہر ہے کہ قیامِ پاکستان اردو کے حق میں نیک فال ہے۔ اردو ہماری مادری زبان نہیں لیکن وہ ہماری ایک ملکی اور قومی زبان ہے۔ بدیں وجہ اسے تمام مقامی بولیوں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے اور رہے گی من حیث القوم ہم اسے کبھی اتنا قریب نہیں پائیں گے جتنا کہ مقامی بولیوں کو پاتے ہیں۔ لیکن مغربی علوم و فنون اس میں بدستور داخل ہوتے رہیں گے۔ جن کی وجہ سے اس کی وسعت اور اسلوب بیان میں لچک اور تنوع کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ پھر چونکہ ہماری زبان نے فارسی اور عربی سے رشتۂ عقیدت استوار کر رکھا ہے ان مطالب اور معانی کے اظہار کے لئے ہم ان زبانوں کے الفاظ داخلِ زبان کرتے چلے جائیں گے۔ نیز ہماری بولیوں کی قربت کی وجہ سے خاص کر پنجابی، سندھی اور پشتو الفاظ اس میں داخل ہوتے رہیں گے۔ یہ الفاظ بیشتر خاص خاص علاقوں تک محدود رہیں گے لیکن یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان میں سے بعض اپنی حدود سے باہر نکل کر عام طور پر اردو کا حصہ بن جائیں گے۔

علاوہ ازیں، جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں، اردو کی پرانی روایات دن بدن کمزور ہوتی چلی جائیں گی اس لئے یہ امر بالکل قرینِ قیاس ہے کہ اردو کے مخصوص لب و لہجہ اور تلفظ میں بھی فرق آ جائے گا۔ آجکل ہم دہلی یا لکھنؤ کے لب و لہجہ اور تلفظ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن جب ان شہروں کی روایات مٹ جائیں گی تو صحیح تلفظ کے لئے ہمیں ایک زندہ روایت کی بجائے لغات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ بدقسمتی سے ہماری لغات نہایت دقیانوسی اصولوں پر مرتب ہوتی ہیں۔ اور عام طور پر مروجہ تلفظ کی بجائے فارسی اور عربی کے قدیم تلفظ درج کر دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض حالتوں میں اہلِ زبان نے ان میں تصرف کیا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سوائے اس کے کہ تلفظ میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہو جائیں گی۔

---

[1] یہ ایک خالص پاکستانی رجحان ہے جس کا سلسلہ شیر افضل جعفری نے شاعری میں بہت آگے بڑھایا ہے۔ سید فیاض محمود، جنشش، سعید، غلام الثقلین نقوی اور کئی لکھنے والوں نے خصوصاً تحقیقاً ہم عصر نے اس رجحان کو نمایاں ترقی دی ہے۔

(مدیر)

اردو کی مسلمہ روایات سے انحراف کا ایک اور بھی سبب ہو سکتا ہے۔ یہ سبب نفسیاتی ہے۔ کل تک "اہلِ زبان" ہماری تحریر اور تقریر کو ہدف اشتہزا بناتے رہے۔ انہیں اپنے اہلِ زبان ہونے پر ناز تھا جس کی وجہ سے ان کے خلاف اندر ہی اندر ایک دبی ہوئی بغاوت اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اب چونکہ دہلی اور لکھنؤ کا عروج قصۂ پارینہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے مصنف ان قیود کو خاطر میں نہیں لاتے اور زبان کے آزادانہ استعمال پر مصر ہیں۔

میں اس کشاکش کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا جب عنقریب اہلِ زباں ہی نہ رہیں گے تو یہ کشمکش بھی دور ہو جائے گی۔[1]

ایک لحاظ سے اردو کی حیثیت بالکل نرالی ہے۔ وہ پاکستان کی سرکاری اور ادبی زبان ہے۔ لیکن وہ ملک کے کسی حصے میں بطور مادری زبان نہیں بولی جاتی۔ اسے بطور بدیسی زبان سیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی لیکن غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ایک ایسی کمزوری جس کا علاج نہیں۔ ہر زندہ زبان کا کہیں نہ کہیں بولا جانا ضروری ہے۔ اور اسی میں اس کے ارتقا کا راز مضمر ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ وہ تمام ملک کی مشترکہ زبان ہو۔ یا اس کے بیشتر حصہ میں بطور مادری زبان استعمال ہو۔ اس کے ارتقا کے لئے صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ کسی نہ کسی شہر۔ طبقہ یا گروہ کی مادری زبان ہو۔ اگر کسی جماعت کے افراد جن کی ایک مشترکہ زبان ہے ایک جگہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کی قوت تخلیق میں ان کا اجتماعی شعور بروئے کار آتا ہے۔ لیکن اگر انہیں منتشر کر دیا جائے تو ان کی اختراعی طاقتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ یہی حال آجکل اردو کا ہے۔ وہ پاکستان کے کسی حصے کی مادری زبان نہیں۔ اور اگرچہ اس کے بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ اس لئے ان کی قوتِ اختراع و ایجاد کام میں نہیں آسکتی۔ باقی رہی پاکستان کی اکثریت جو اس ملک کی مختلف بولیاں بطور مادری زبان استعمال کرتی ہے اور جس کے لئے اردو محض ایک بیرونی زبان ہے وہ اسے تخلیقی طور پر نہیں بلکہ تقلیدی استعمال کرتی ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ اہلِ زبان قواعد و ضوابط کی پابندی سے آزاد ہیں اور زبان میں من مانے تصرفات کرتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہ اشخاص جو کسی زبان کو بطور اجنبی زبان سیکھتے ہیں وہ اس کے قواعد سے سرمو تجاوز نہیں کرتے لیکن اہلِ زبان قواعد کی حدود میں رہتے ہوئے بھی اس میں نئی راہیں پیدا کر سکتے ہیں۔ جو بعد میں قواعد میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ وہ نئے الفاظ و محاورات بناتے ہیں جنہیں بعد میں خلعت قبول حاصل ہو جاتا ہے۔ بہرحال تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جب کوئی زبان مادری زبان کے مقام سے گر جاتی ہے تو اس کی ترقی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جب تک لاطینی روم کی زبان رہی وہ برتی اور ترقی کرتی رہی۔ لیکن جب حملہ آوروں نے روم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس کے بولنے والے باقی نہ رہے تو اس کا عروج بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد صدیوں تک لاطینی مذہب اور علوم و فنون کی زبان رہی اور خانقاہوں اور مدارس میں اس کی تحصیل کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وہ جہاں تھی وہیں رہی۔ یہ سچ ہے کہ قرون وسطیٰ میں اور اس کے بعد بھی، اس میں حسب ضرورت اضافے ہوئے تھے اور پرانے مواد کی ترتیب سے نئے الفاظ مرتب ہوئے لیکن یہ عمل سراسر مصنوعی تھا۔ یہی عمل اردو میں بھی جاری رہے گا۔ علمی ثقافتی اور سیاسی ضروریات کے پیش نظر نئے الفاظ اور اصطلاحیں وضع کی جائیں گی۔ اور معلوم ہوگا کہ زبان آگے بڑھ رہی ہے لیکن نہ تو اس کے قواعد میں تبدیلی ہوگی اور نہ اس میں نئی ضرب الامثال اور محاورات ہی پیدا ہوں گے۔ انگریزی اسالیب بیان سے متاثر ہو کر نئی تراکیب رواج پائیں گی۔ لیکن محاورہ، گرامر معانی اور تلفظ میں کوئی معتدبہ تبدیلی نہ ہوگی۔

اردو زبان کو جس خطرے کا سامنا ہے وہ یہ نہیں کہ وہ ایک مخلوط زبان بن جائے گی۔ کیا وہ اس وقت ایک مخلوط زبان نہیں؟ اور اگر عربی اور فارسی کے مستعار الفاظ اس کے وقار کے منافی نہیں تو دیسی بولیوں کے الفاظ اس کی قدر و منزلت کے کیسے منافی ہو سکتے ہیں؟ یہ خیال کہ ادھر سے ادھر سے دیسی بولیوں کے الفاظ کی بھرمار سے اردو ایک مخلوط زبان بن جائے گی، ایک بے بنیاد سی بات ہے۔ ہماری بولیوں کے الفاظ اردو میں ضرور داخل ہوں گے۔ لیکن

---

[1] محض لسانی اور محلی پہلو کے علاوہ اس کا ایک اور نہایت اہم پہلو بھی ہے۔ اور وہ محض صحت لفظی اور قواعد زبان سے آگے بڑھ کر ادبی، ذوقی اور تخلیقی امور پر توجہ ہے اس وقت قدیم و جدید نظاں میں سب سے نمایاں وجہ اختلاف یہی ہے۔ (مدیر)

پیدا ہوتا ہے۔ جہاں تک جملوں کی ساخت کا تعلق ہے ماہر لسانیات کا کہنا ہے کہ جب ہم کوئی اجنبی زبان سیکھتے ہیں تو اس اجنبی زبان کا نہیں بلکہ اپنی زبان کا نحو بلا تکلف برتتے چلے جاتے ہیں۔ اس کلیہ کی توضیح اس امر سے ہو سکتی ہے کہ جب ہم انگریزی بولتے ہیں یا لکھتے ہیں تو اپنی زبان کے الفاظ اس میں ہرگز داخل نہیں کرتے۔ لیکن اردو یا پنجابی بولتے وقت ہم انگریزی الفاظ بے تکان برتتے چلے جاتے ہیں یہی کلیہ اردو پر بھی صادق آتا ہے۔ اردو بولتے یا لکھتے وقت ہم حتی الوسع کوشش کریں گے کہ دیسی الفاظ اس میں داخل نہ ہوں۔ تاکہ بولیوں کے الفاظ پہلے پہل بچوں کی زبان پر چڑھ جائیں گے لیکن اس کا اندازہ ممکن ہے۔ علمی اور ادبی سطح پر اختراع و ایجاد کا سلسلہ بند نہیں ہوگا۔ قیاس کی بنا پر حسب ضرورت اصطلاحات اور مشتقات وضع ہوتے رہیں گے۔ یا انہیں عربی اور فارسی سے مستعار لیا جائے گا۔ نیز انگریزی کا اثر مدت تک باقی رہے گا اور انگریزی نحوی تراکیب و اسالیب داخل زبان ہوتے رہیں گے۔ لیکن میری رائے میں اس سلسلے میں جو کچھ انگریزی سے لینا تھا لے لیا گیا ہے، اور مستقبل میں کسی معتدبہ اضافے کی نہ توقع ہے اور نہ ضرورت ہی ہوگی۔

باقی رہا زبان کا قدرتی ارتقا یعنی تخلیق و اختراع، جذب و انجذاب، تحریک و اختیار کے وہ قدرتی وسائل جو کسی خاص طبقہ کی کوششوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ جنہیں کسی ملک کے باشندے من حیث القوم غیر شعوری طور سے پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً زبان کی ہیئت اور ساخت، محاورہ، صرف و نحو، تلفظ اور معانی، الفاظ میں تبدیلیاں اور دیگر تصرفات۔ اس میدان میں ترقی کے کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔ زبان کی قدرتی نشوونما جداگانہ تہذیب سے انہیں لوگوں کا حصہ رہا ہے جو اسے بحیثیت مادری زبان کے استعمال کرتے ہیں۔ اور چونکہ اردو ہماری مادری زبان نہیں اور نہ بن سکتی ہے، لہٰذا اس کی قدرتی نشوونما رک جائے گی۔ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ کسی زبان کے بولنے والے قواعد و ضوابط کی پابندی کے باوجود اس کے آزادانہ استعمال سے اس میں تبدیلیاں اور اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اردو کو تقلیداً استعمال کریں گے۔ لہٰذا اردو میں ہماری ارتقائی طاقتیں بروئے کار نہ آسکیں گی۔

جس طرح سماجی زندگی میں جمہور کی خوشنودی، ان سے عمدہ تعلقات و روابط کی خواہش اور ان کی ناراضگی یا دشمنی کا خوف وضع داری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح استاد کی تنبیہ و سرزنش، ہم عمروں کا ٹھٹھا مخول، بزرگوں کی حوصلہ افزائی زبان کے استعمال میں بے راہ روی کے مانع آتے رہیں۔

اوپر کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے:

اردو زبان نے ابھی ابھی ایک نئی منزل میں قدم رکھا ہے۔ اور اپنے حالاتِ گردوپیش سے متاثر ہو کر وہ نئے ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ اگرچہ یہ نقوش ابھی تک مبہم اور غیر متعین ہیں، اور عام طور سے ہمیں ان کا احساس بھی نہیں پھر بھی ان کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں وہ سطح زبان پر آہستہ آہستہ ابھر رہے ہیں اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، وہ اور واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

اردو کا رشتہ دہلی اور لکھنؤ سے منقطع ہو چکا ہے۔ کچھ ضروریات کی بنا پر اور کچھ غیر شعوری طور پر مقامی بولیوں کے خاص خاص الفاظ اردو میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ الفاظ عام طور پر ان اصطلاحات پر مشتمل ہوں گے جو خاص خاص علاقوں کی قدرتی ساخت، پس منظر، روایات، قدرتی اور صنعتی پیداوار، اشیائے خورد و نوش، لباس، رسوم اور عقاید سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالباً ان کا دائرۂ استعمال انہیں علاقوں تک محدود رہے گا۔ لیکن بالکل ممکن ہے کہ چند در چند وجوہات کی بنا پر ان میں سے کئی ایک اپنے محدود دائرہ استعمال سے باہر نکل کر زبان میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیں۔ تلفظ کے بارے میں ابھی تک دہلی اور لکھنؤ کا تتبع رہا ہے۔ اور اسے موجب افتخار خیال کیا جاتا تھا لیکن وہ دن دور نہیں جب بیاہ شادی اور باہمی میل جول کی وجہ سے ہمارے ہاں ایک مخلوط آبادی پیدا ہو جائے اس کے بعد اردو شاید ٹھیٹھ پنجابی، سندھی اور پشاوری لہجہ میں بولی جائے گی۔

اقدار کا مسئلہ

ریاض احمد

سب سے پہلے آپ کے سامنے اس امر کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ اس عنوان کے سلسلے میں جو کچھ اکابر علما نے لکھا ہے وہ سب کا سب اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔ اور نہ مجھے اس پر پوری طرح آگاہی حاصل ہے ان سطور کی نوعیت زیادہ تر ایک عامی کے ابتدائی تاثرات کی سی ہے۔

اقدار کا مسئلہ بنیادی طور پر اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ وہ یوں کہ سب سے پہلے ایک معاشرہ میں اخلاقی پابندیاں ہی ان اقدار کی نشاندہی کرتی ہیں جنھیں حاصل کرنے کی انسان سعی کرتا ہے۔ اقدار کا تعلق اس طرح براہ راست عمل سے قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ اس بات کو شاید اس طرح قبول نہ کریں کہ اقدار کو بالعموم ایک مجرد حقیقت کی حیثیت ہی سے پیش کیا جاتا ہے۔ عمل تو ایک انفرادی نوعیت کی چیز ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ مدارج حیات کے اختلاف کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ بلکہ اس میں یوں بھی آفاقیت شاید ممکن نہیں۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں کا عمل ایک خاص واقعہ کی رعایت سے ایک ہی انداز میں رونما ہو، اور قدر کے لئے۔ یہ ضروری نظر آتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیری ہو۔ اس کا اطلاق مختلف افراد اور مختلف مقامات پر ایک ہی طرح ہو سکے۔ اس لئے ایک خالصتاً علمی قدر رفتہ رفتہ تعمیم کے سانچوں میں ڈھلتی ڈھلتی بالآخر تجرید کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ حقیقت مطلقہ کے قرب کے لئے اسے عملی انفرادیت کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اقدار کے سلسلے میں اختلال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ قدر بنیادی طور پر اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ اخلاق ایک ایسی چیز ہے، جس کے متعلق بغاوت گویا ہر شخص کا حق ہے۔ آخر یہ کیوں ہو کہ ایک نام نہاد ضابطۂ اخلاق کی پابندی کے لئے شخصی آزادی، شخصی خواہشات اور شخصی خواہشات کو ترک کر دیا جائے۔ اخلاقیات کے علماء اس مسئلہ پر بہت پریشان رہے ہیں۔ آخر ان میں سے ایک نے بنیادی اخلاقی قدر کے لئے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ خوشی کا اصول دریافت کیا۔ اس زیادہ سے زیادہ میں پھر وہی قلیل سے قلیل بدقسمت جماعت بے نیل مطلق رہ جاتی ہے جسے اُس کا حق کوئی نہیں دلاتا۔ ایثار و قربانی بھی ایک قدر ہے۔ لیکن اس قدر کو اسی اصول کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ قربانی کے فارمولے میں کسی نے نہیں ڈھالا۔ ایک اتنی بڑی قدر سے آخر ایک اتنی بڑی تعداد کو محروم رکھنے میں کیا مصلحت تھی۔ ایک معمولی سی حقیر سی ہنگامی نوعیت کی چیز جسے آپ خوشی کہتے ہیں اس کے لئے ایک اتنی بڑی قدر جسے آپ ایثار کہتے ہیں۔ کیوں قربان کر دی جاتی ہے۔ ایک اور بات سوچئے۔ خوشی ایک قسم کا عملی نتیجہ ہے۔ ایثار ایک قسم کا سلبی مفروضہ ہے۔ ایک چیز حاصل ہوتی ہے۔ ایک چیز سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ جو کچھ تھا۔ یا جس کے ہونے کا امکان تھا، اسے بھی تلف کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر یہ ہوا کہ اقدار دو نوعیت کی ہیں ایک مثبت ایک منفی۔

مثبت اقدار کے حصول کے لئے جد و جہد کی جاتی ہے انہیں آپ اوامر کہہ لیجئے۔ منفی اقدار ایک قسم کی پابندی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ جو ہمیں بعض ایسی چیزوں سے محروم رہنے کی تلقین کرتی ہیں۔ جنہیں ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پابندی محض اس لئے لگائی جاتی ہے کہ بعض دوسرے لوگ ان چیزوں کے حصول سے محروم نہ رہ جائیں لیکن مثبت اقدار کی جد و جہد میں یہ تفاوت نہیں ملتا، کہ ایک حاصل کرے اور دوسرا کھو دے۔ اس طرح مثبت اقدار کا تفوق خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اور اس پر ہمیں یقیناً خوش ہونا چاہئے کہ آخر مثبت ہی نے فتح پائی۔ لیکن جو سوال ذہن میں کھٹکتا رہتا ہے وہ یہ ہے کہ منفی اقدار میں ایک سے چھین کر دوسرے کو دیا کیوں رہا رکھا جاتا ہے۔ ایک بڑی سطحی سی مثال لیجئے۔ ایک شخص کے پاس

دولت نہ ہے۔ دوسرا اس دولت میں سے ایک حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس حصے سے پہلے شخص کی محرومی کوئی اتنا بڑا المیہ نہیں بنتا۔ لیکن دوسرا شخص جو اس سے مستقلاً محروم رہتا ہے۔ اس کے حق میں یہ یقیناً ایک المیہ بن جاتا ہے۔ فقر و فاقہ اور حاجت کو کوئی معاشرہ روا نہیں رکھنا چاہتا۔ لیکن عملاً اقدار کی رعایت سے اسی کی تلقین کرتا ہے۔ یہاں ایک اور تصور کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ جو پھر ایک اور قدر سے منسلک ہے۔ یعنی حصول کے بعض ذرائع جائز ہوتے ہیں اور بعض ناجائز۔ پابندی جائز ذرائع پر نہیں ہے، صرف ناجائز ذرائع پر ہے۔ لیکن جائز و ناجائز کا اصول ہمیشہ یکساں نہیں رہتا ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اور اسی پہ بس نہیں۔ فرض کیجئے استحصال اگر جاگیردار کی طرف سے ہو تو ناجائز۔ اور اگر ایک وقت میں اسی استحصال کو کوئی باغی گروہ، عمل میں لائے تو مستحسن۔ دونوں ایک سے عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ دونوں اپنے طور پر استحصال کو جائز کہتے ہیں۔ دونوں کے حامی بھی نکل آتے ہیں۔ دونوں کے مخالف بھی نکل آتے ہیں۔ اقدار کا اختلال بدستور قائم رہتا ہے۔

یہ اختلال ظاہر ہے کہ عملی حالات ہی کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے، اگر عملی امکانات کو خارج کر دیا جائے اور پھر اقدار کا ایک نظام وضع کیا جائے تو شاید یہ مشکل باقی نہ رہے۔ اسی لئے اقدار اخلاقیات کی حدود سے نکل کر مابعد الطبعیات کے دائرہ عمل میں جا داخل ہوتی ہیں انسان، کائنات اور خالق کائنات کے باہمی رشتہ کے حوالے سے اقدار کے تعین کی کوشش میں صداقت مطلقہ کو نصب العین بنایا جاتا ہے۔ اور اسی صداقت مطلقہ سے خیرِ مطلق کا تصور اخذ کیا جاتا ہے۔ صداقت اور خیر اس مرحلے پر پہنچ کر عمل سے اپنا رشتہ منقطع کرنے پر مصر نظر آتی ہے اگر عمل کو درمیان سے نکال لیا جائے تو پھر صداقت یا خیر کس مصرف کی رہ جاتی ہیں۔ صرف ایک چیز باقی رہ جاتی ہے۔ صداقت اور حقیقت کا شعور ایک ایسی آگاہی، ایک ایسا اطمینان، ایک ایسی طمانیت بخشتی ہے جس کے سامنے عملی حصول اور بے حاصلی، بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اوامر اور نواہی کا ایک پورا نظام مذہب میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ اوامر کے سلسلے میں بشارتیں اور نواہی کے سلسلے میں

عذاب کا خوف بہ صراحت موجود ہے۔ ثواب و عذاب کا یہ وعدہ ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتا ہے جس پر یقین ایمان کی شرط اوّل ہے۔ لیکن اس عالم کا عملی تجربہ کسی کو بھی حاصل نہیں۔ اس طرح یہ عالم پھر ایک تجریدی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً اقبال نے بھی غالباً یہ کہا ہے کہ جنت و دوزخ مکان کے اس تصور سے ماورا ہیں جس سے ہم آشنا ہیں۔ یہ شاید محض مقاماتِ نفس ہیں۔ اس کے لئے اگر آپ سند چاہیں تو اس ارشاد باری سے استنباط کرنا جائز اور برمحل ہو گا جس میں اولیاء اللہ کی صفت "ولاخوفٌ علیہم ولا ہم یحزنون" ارشاد کی گئی ہے۔ اس استدلال کو اگر آپ قرینِ قیاس سمجھتے ہوں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عملی طور پر اقدار کے اختلال کو رفع کرنے کے لئے اقدار کی تجریدی حیثیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس تجریدی حیثیت میں ان کے نتائج جس عالم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ عالم خارجی اعمال کی رزمگاہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک داخلی، ذہنی، باطنی، یا نفسی کیفیات کا عالم ہے۔ جو شخص حق اور صداقت پر آگاہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے منفعت اور نقصان کے پیمانے بدل جاتے ہیں، موت و حیات کی حیثیت مٹ جاتی ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ موت اس کے لئے عین حیات بن جاتی ہے۔ کربلا کی سختیاں اس کے لئے بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ایک عارضی اور ہنگامی حیات کے لمحات اپنی کشش کھو دیتے ہیں ایک جاودانی حیات اپنی مسکراتی ہوئی فضائیں اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتی ہے۔ موت و حیات کا فرق مٹ جاتا ہے۔ قوت و صولت، جاہ و حشمت۔ دولت و ثروت، جاہ و مال، غربت و مسکنت۔ بیچارگی اور بے بسی کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں اور یوں ایک نئی قدر کا احساس انسانیت کو ارزانی ہوتا ہے۔ اس احساس کی نغمگی اور سرمدی سرور کو زندہ رکھنے کے جتن کئے جاتے ہیں۔ گویا ہم ایک ایسے مقام پر آ پہنچتے ہیں جہاں قدر کا معیار صرف احساس رہ جاتا ہے۔ قدر خارجی اور عملی حدود سے نکل کر خالصتاً ذہنی اور نفسی حدود میں داخل ہو جاتی ہے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس شخص کے ذہن میں بھی شاید یہی تصور تھا جس نے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ مسرت کے پیمانے سے اخلاقی قدر کو متعین کرنے کی کوشش کی تھی مسرت محض ایک نفسی کیفیت ہی تو ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس کیفیت کے حصول کے لئے جو اسباب ذمہ دار ہوتے ہیں انہیں خارجی اور عملی دنیا سے نکال کر ذہنی عوامل اور نتائج سے منسلک کیا جا سکتا ہے

یا نہیں۔ مذہب کا حوالہ اوپر آچکا ہے زمرۂ "لایحزنون" میں منسلک ہونے
والے شاید ذہنی عوامل اور نتائج ہی سے اپنی مسرتوں کو اخذ کرتے ہیں۔
مذہب کی اصطلاح میں آپ اسے روحانی مسرت اور اطمینان کہہ لیجئے۔
اس سارے تذکرے میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ عمل سے
نکل کر ذہن اور نفس کی دنیا میں آجائیں اور خارجی واقعات سے ہٹ
کر نفسی واردات پر توجہ کو مرتکز کرسکیں۔ لیکن اس کوشش میں ایک
چیز رہ ہی جاتی ہے۔ اسے آپ اصطلاحاً جمالی قدر کہہ لیجئے۔ مسرت کا
تعلق خواہش سے ہے یا خواہش کے حصول سے۔ عملی اندازہ کچھ
اس قسم کا ہے کہ مسرت خواہش کے حصول سے وابستہ ہے۔ دولت
پاکر خوشی ہوتی ہے۔ محبوب سے مل کر مسرت ہوتی ہے۔ لیکن دولت
پاکر کوئی مطمئن نہیں ہوتا۔ ۹۹ کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ اگر آپ اسے
صرف ایک مذاق یا لطیفہ سمجھتے ہیں تو یوں کہہ لیجئے کہ "ھل من مزید" کا داعی
بن بیٹھتا ہے۔ محبوب کو پالیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ بات نہیں
جو اس کے تصور میں تھی۔ یا کئی اور جھگڑے کھڑے ہوجاتے ہیں ایک
شاعر کا قول یہ ہے کہ ؎

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنار ما بکنار ما

دوسرے نے کہا ہے ؎

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

تیسرے نے لہجہ بدلا ؎

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

حصول اور تصرف میں اگر کوئی بات ہوتی تو تینوں شعر بے معنی
ہو کر رہ جاتے۔ کہانی یوں ہے کہ خواہش کرنے والے کو جب یہ قوت
مل گئی کہ وہ جس چیز کو چھولے وہی سونے کی ہوجائے تو اس کی ساری خوشی
مٹ گئی۔ اور جب بیمار شہنشاہ کو ایسے آدمی کی قمیص درکار ہوئی جو
خوش ہو تو، وہ آدمی جو خوش تھا، قمیص ہی نہ رکھتا تھا۔ گوتم بدھ کے
پاس جب غم کی ماری ہوئی عورت آئی تو اس نے نروان اس خیال
سے حاصل کیا کہ موت کا دکھ تو ہر کسی کا مقدر ہے۔ مسرت کی فراوانی اسے
تسکین نہ بخش سکتی تھی، دکھ کی ہمہ گیری اسے سکون عطا کرگئی۔ تو
پھر مسرت کو کہاں ڈھونڈیں۔

ایک شخص نے کہا کہ آرزو کو مٹادو۔ تم خوش ہوجاؤ گے۔
لیکن نفس نے اِبا کیا کہ مسرت کی تلاش تو مجھے ہے۔ اور میری مسرت
میری خواہش سے وابستہ ہے۔ جب خواہش مٹ گئی تو مسرت کو لے کر
کیا کروں گا۔ بودھ نے مسرت کو یوں سمجھا کہ جب آواگون کا چکر مٹ
جائے گا، تو مسرت ہی مسرت رہ جائے گی۔ آواگون کا چکر زندگی
کا چکر ہے۔ نروان مرگ محض ہے۔ نہ زندگی، نہ موہ، نہ مایا، نہ خوشی
نہ مسرت۔ اوامر و نواہی دونوں سلسلے یکسر منقطع۔ خلائے محض میں کسی
چیز کا بھی تصور ممکن نہیں۔ مسرت تو در کنار، اطمینان بھی اختیاری ہی
رہ جاتا ہے۔ توحید کے پرستاروں نے اس گتھی کو یوں سلجھایا کہ حقیقت
کبریٰ سے مکمل وصال عین مسرت ہے۔ ؎

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

یعنی نفس پھر ایک طرح سے بغاوت کر رہا ہے۔ اسے
اپنی خواہش اور اپنی خواہش کے مقصود کا احساس ہے۔ لیکن
اس کے ساتھ اسے اطمینان کی بھی تلاش ہے۔ اس تذبذب کا عذاب
بڑا ہی جاں کاہ ہوتا ہے۔ نہ یہ اوامر سے روگردانی ہے۔ نہ نواہی
کا ارتکاب۔ لیکن اس کے ساتھ وہ عذاب عظیم موجود ہے جسے کوئی
خارجی پیمانہ نہیں ماپ سکتا۔ یہ اقدار کا اختلال نہیں ہے نفس
کا اختلال ہے۔ جو اقدار کا ماخذ بھی ہے۔ اور محک بھی۔

بات الجھ چلی ہے۔ یہ قصہ جمالی اقدار کے تصور سے چلا تھا
اور یہاں جاکر ختم ہوا کہ خواہش اور اقدار کی جنگ میں ذہنی اختلال
کا شکار ہوجاتا ہے۔ اب نہ خواہش سے انکار ممکن ہے کہ فی الواقعہ
موجود ہوتی ہے۔ نہ اقدار سے انکار ممکن کہ ایک جبرِ مسلسل کا نام
ہے۔ جو باہر سے نفس پر عاید ہوتا ہے۔ اب تلاش اس امر کی
ہوئی کہ خواہش بھی رہے۔ اور اقدار کا جبر بھی باقی نہ رہے۔
ایک لمحے کے لئے رک جایئے۔ اور نفسیات کا وہ اصول
یاد کیجئے۔ جس کی رو سے اعمال کی اصل جبلت ہے۔ اعمال کی نہیں
بلکہ اعمال کے محرکات کی۔ عمل تو اضطراری بھی ہوتا ہے اور ارادی بھی۔

اضطراری عمل محرک اور عمل دونوں کے شعور سے غافل رہتا ہے۔
ارادی عمل دونوں پر آگاہ ہوتا ہے۔ جبلت محرک سے اغماض کرتی
ہے۔ لیکن عمل سے آگاہی تو ایک طرف رہی۔ عمل کے نشے میں مست
ہو جاتی ہے۔ جبر و اختیار کی بحث یہاں چھیڑنے کا محل نہیں ہے۔
لیکن جبلت جب تک محض جبر رہتی ہے۔ مثلاً حیوانی سطح پر تو وہ
عمل اور محرک، اور اس سے وابستہ کیف میں تمیز نہیں کرتی۔ جب
اختیار کی حدود میں مثلاً انسانی سطح پر داخل ہوتی ہے تو محرک
عمل اور کیف میں تمیز کرتی ہے۔ محرک کے عملی مقاصد اور نتائج
کو نظر انداز کرتی ہے۔ اور عمل کو مقصودِ خاطر بنا لیتی ہے کہ کیف و مستی
عمل کے ساتھ از خود وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک جذباتی یا شہوانی سطح پر
اس کی نوعیت کچھ ہوس یا خود غرضی کی سی ہوتی ہے۔ یعنی زیادہ سے
زیادہ تمتع کی تمنا۔ اسی تصور کو جب تجریدی کسوٹی پر کسا جاتا ہے،
تو اس کی صورت یوں بنتی ہے کہ کسی چیز سے خاص اس چیز کے لئے شغف
یا انہماک سے

جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
طائرک بلند بال، دانہ و دام سے گذر

اب قدر کے تصور سے محرک اور نتیجہ دونوں خارج ہوتے
ہیں۔ صرف قدرِ محض باقی رہ جاتی ہے۔ قدر کا یہ تصور مختلف سطحوں
پر مختلف روپ دھارتا ہے۔ مذہب میں جزا و سزا کے خیال
سے نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے، معبود کی خالص بے لوث
محبت کے لئے۔ فلسفہ میں تلاشِ حق و صداقت کے لئے۔ سائنس میں
نظریات کی تشکیل و تعمیر کے لئے، دنیوی معاملات میں مروجہ معاشری
اقدار کی سربلندی کے لئے، میدان جنگ میں بہادری کے جوہر کے لئے
یا شہادت کی جستجو کے لئے، لیکن ان سب مقامات پر نتائج پر نظر ہمیشہ
مرکوز رہتی ہے۔ لیکن ابھی ایک اور سطح باقی ہے، جس میں نتائج کی بھی
مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ یہ سطح جمالیاتی سطح ہے۔ جہاں محرکات کو صرف ان
کی جذباتی حیثیت ہی میں پہچانا جاتا ہے اور نتائج سے یکسر قطع نظر کر لیا
جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر دکھ یا مسرت مقصودِ خاطر نہیں رہتے۔ صرف
ان سے وابستہ احساس اور تاثر کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے۔ اس
دنیا میں جبلی عمل سے وابستہ سرشاری سب سے بڑی قدر بن جاتی
ہے۔ اسی سرشاری کو محرک اور نتیجہ سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے اور
پھر محض اسی کے حصول کو مطمحِ نظر بنا لیا جاتا ہے۔ جمالیاتی عمل میں
حصول اور تمتع بے معنی لفظ بن جاتے ہیں۔ حسی تجربات اور واردات
مقصود بالذات بن جاتے ہیں، جہاں دوسری سطحوں پر تعقل، ادراک
یا نتائج و عواقب عمل کے رخ کو معین اور منضبط کرتے ہیں وہاں
جمالیاتی عالم میں تخیل راہبری کرتا ہے۔ جب جمالیاتی اقدار کا مطمحِ
نظر صرف جسم ہو وہاں حسی تخیل اپنے کرشمے دکھاتا ہے۔ عمل کے لئے
نت نئی محرک صورتیں تخلیق کرتا ہے۔ جہاں جسم کے تقاضے ذرا دھیمے
پڑے اور خود نفسی کیفیتوں کا ادراک بڑھا وہاں وجدان آگے بڑھتا ہے۔
جذب و سرور، سوز و مستی اور ایک لگن جو کسی وقت جبلی سطح پر صرف عمل کے
تابع مہمل تھے، اب عین بن جاتے ہیں اور اس سارے عمل کا حاصل
کیا ہوتا ہے۔ صرف ایک احساس یا ایک جذبہ کی شمع کا فروغ۔ حسن
جبلی محرکات کا ذہنی بدل ہے۔

جمالیات کے مظاہر فنونِ لطیفہ ہیں۔ ان سے ہمیں پھر دو قدریں حاصل
ہوتی ہیں۔ ایک مثبت دوسری سلبی یا منفی۔ پہلی کا نام حسن یا عشق قرار
پاتا ہے۔ دوسری کو رندی کہہ لیجئے۔ ان معنوں میں کہ یہ نواہی کے ارتکاب
سے باز رکھتی ہے۔ جمالیات میں نواہی کی ذیل میں وہ تمام محرکات اور
عمل شامل ہو جاتے ہیں جن کا منبع و ماخذ یا جن کا مقصود جذبے یا احساس
کے علاوہ کچھ اور ہو سے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

جمالیات کے اس اصول کو اگر آپ صرف شعر و ادب اور افسانہ
و حکایات تک محدود رکھیں تو اس کی حیثیت سحر و افسوں کی رہ جاتی ہے
یعنی یہ محض ایک اضافی یا فراری چیز بن جاتی ہے۔ اور یوں حسن یا
عشق کی مثبت قدر بھی متزلزل ہونے لگتی ہے۔ لیکن جمالیات کے
یہ مظاہر تو محض درسگاہیں ہیں۔ اس حسن طبیعت کی تربیت کے لئے
طالبعلمانہ عشق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے کسی نے عجم کا حسنِ طبیعت،
عرب کا سوزِ دروں کہا تھا۔

آغاز میں قدر کو ضابطہ اخلاق کا مترادف قرار دیا گیا
تھا۔ اور مشکل یہ درپیش تھی کہ ضابطہ اخلاق اضافی یا ہنگامی حیثیت
کا حامل ہوتا ہے جس سے مستقل قدر اخذ نہیں کی جا سکتی۔ جمالیاتی
تربیت اگر اس مشکل کا کوئی حل سمجھا دے تو اس کی حیثیت قابلِ اعتنا

بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک تو وہ بات یاد کیجئے کہ جب موت کے دکھ کا مداوا موت کی ہمہ گیری میں نظر آیا تھا۔ اور دوسری یہ کہ خواہش مٹ جائے تو غم مٹ جاتا ہے۔ یعنی احساس اور جذبہ کی تہذیب میں کسی مستقل قدر کا سراغ مل سکتا ہے۔ اخلاق نے احساس اور جذبے کی تہذیب خارجی دباؤ کے ماتحت کرنی چاہی۔ لیکن نفسیات والوں نے بتایا کہ دباؤ سے ایک وقفہ کے بعد گویا لاوا پھٹ پڑتا ہے اور زلزلے نمودار ہوتے ہیں۔ جمالیات والوں نے یہ بتایا کہ احساس اور جذبے کی تہذیب اس کے اظہار میں ہے۔ اس پر قدغن لگانے سے وہ بھپرتا ہے۔ یا مکر کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اظہار سے جذبے میں نکھار، سجاوٹ اور سجل پن ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں وسعت اور ہمہ گیری بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایسا شعور جاگتا ہے۔ جو صرف اپنے جذبے ہی کو نہیں پہچانتا۔ دوسرے کے جذبے کا احترام بھی کرتا ہے۔ وہ جلب منفعت اور حصول و ہوس کی حدوں سے آگے نکل کر ایثار کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ سپردگی کا ایک ایسا عالم وجود میں آتا ہے کہ راضی برضا کی صحیح تصویر روشن ہو جاتی ہے۔

یہ مقام کچھ جینیت پرستی کا سا ہے۔ دلیل کمزور ہوئی جاتی ہے۔ منطق ناقص اور جذباتیت غالب۔ لیکن صرف ایک بات کا اندازہ کیجئے۔ ایک بھکاری کو دھتکار دینے سے اخلاق کا اصول مجروح نہیں ہوتا۔ بھیک مانگنا گناہ ہے۔ ایک ملزم کو سزا دینے پر اخلاق کا ضابطہ اصرار کرتا ہے۔ ایک بچے کے کان اینٹھنے سے اس کا مستقبل سنورتا ہے۔ لیکن بھیک مانگنا گناہ کیوں ہے۔ اقبال کہے گا۔ اس سے خودی کی نفی ہوتی ہے۔ ملزم کو سزا دینا کیوں ضروری ہے؟ اس لئے کہ اس کے جذبات نے دوسروں کے جذبات کی حدود کا احترام نہ کیا۔ بچے کے کان اس لئے اینٹھے گئے کہ اس کے نفس سے طغیان و سرکشی نکل جائے۔ لیکن جس نے فقیر کو دھتکار دیا اس نے فقیر کی خودی کی نفی ہی نہیں کی۔ اس کی خودی کی توہین کی ہے۔ جس نے ملزم کو سزا دی ہے۔ اس نے اسے انسانیت سے خارج اور شعور و احساس سے عاری سمجھا ہے۔ جس نے بچے کے کان اینٹھے ہیں اسے اس بات کا احساس نہیں کہ بچے کی انا بُری طرح مجروح ہوئی ہے۔ تذلیل دوسرے کے جذبے کی توہین۔ کسی کی انا کی شکست اخلاقیات میں جرم ہے۔ آپ اس کے ساتھ ایک بڑا سا "مگر" چپکا دیتے ہیں۔ جو بالکل بے معنی ہے۔ قدر کے احساس و شعور کا انداز بدل ڈالئے۔ خودی کو جمالی صفات سے ہمکنار ہونے دیجئے۔ اقدار کے مسئلے کا حل خود بخود نکل آئے گا۔ مانگنے والا کا گدایانہ لہجہ۔ روتا بسورتا بچہ۔ اور ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنے ہوئے انسان یقیناً کریہہ المنظر ہیں۔ اگر اس منظر کی کراہت کا احساس بیدار ہو جائے تو آخر کوئی کیوں اس منظر کو وجود میں آنے دے۔ آپ تصویروں میں ان غلاموں کو دیکھتے ہیں جن کی کھال کوڑوں کی مار سے ادھڑ گئی ہے تو آپ کی طبیعت اکراہ کرتی ہے لیکن آپ کو شاید اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ اسکول جانے سے انکار کرنے والا بچہ اسکول میں اپنے آپ کو بالکل اسی حالت میں دیکھتا ہے۔ علم اور تعلیم آخر ایسی بھیانک چیزیں تو نہیں ہیں۔ شوق ہو تو کوہکنی عین راحت نظر آنے لگتی ہے۔ اس ایک اتفاقیہ جملے سے معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ جمالیات کی رو سے قدر کی اصل و اساس شوق ہے۔ اسی کو پہلے کہیں حسن یا عشق کہا گیا تھا۔ گویا قدر کے احساس و شعور اور اس احساس و شعور کے بروئے کار لانے کے لئے اخلاقیات کے برعکس قوانین وضع کرنے اور ان قوانین کے منکرین پر حد جاری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قدر کو باہر سے ٹھونسا نہیں جاتا۔ قدر از خود نفس کی گہرائیوں میں جنم لیتی ہے۔

اس امر سے انکار کی مجال نہیں کہ سزا معاشری اصلاح و بہبود کے لئے ناگزیر بن جاتی ہے۔ صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ گناہ کا تصور فعل سے وابستہ نہیں۔ گناہ احساسِ قدر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جس طرح قدر مثبت یا منفی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح قدر کا تصور بھی مثبت یا منفی ہو سکتا ہے۔ سزا کا تصور اقدار کے منفی تصور سے وابستہ ہے۔ اقدار کا مثبت تصور نہ گناہ کا ذکر کرتا ہے نہ سزا کا۔ مذہب کے ابتدائی دور میں قدر کا مثبت احساس اس طرح فراواں ہوتا ہے کہ منفی احساس اور اس سے پیدا ہونے والے تعزیری احکام محض زیب قرطاس ہی رہ جاتے ہیں۔ قدر کا مثبت احساس فرائض کی بنیاد ہے۔ جب یہ احساس ارزانی ہو تو جرم و تعزیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرائض سے اغماض بے عملی کا نام ہے۔ بے عملی میں جرم کا ارتکاب ممکن ہی نہیں لیکن ابتدا میں مذہب صرف فرائض کی بجا آوری کا نام تھا۔ اور فرائض کی بجا آوری کے لئے ایک زبردست تحریک یا تحریص و ترغیب کا نام تھا۔ قرآن مجید کا سرمدی سرود جرم و تعزیر کا احساس نہیں دلاتا۔ وہ تو ایک بشارت ہے۔ اطمینان قلب اور سرشاری کی۔

فقہی نظام کی تشکیل اس وقت وجود میں آتی ہے، جب شوق مٹ جاتا ہے۔ قدر کا مثبت احساس باقی نہیں رہتا۔ طمانیت اور جذبۂ عمل کی سرشاری مٹ جاتی ہے۔ اس وقت انسان کا عمل جرم و تعزیر کے تصور سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ امانت جس کی تفویض کے لئے روحِ کائنات نے ہر چیز سے سوال کیا لیکن کسی کو اتنا یارا نہ تھا کہ اس بارِ امانت کو اٹھا لیتا بالآخر انسان کو تفویض ہوئی۔ یہ امانت شوق کی امانت تھی۔ علم اشیاء سے قدر کے مثبت احساس کی تشکیل ورنہ فرائض کی بجا آوری میں فرشتے کچھ کم تو نہ تھے۔ حیوان، نباتات، جمادات اور عالمِ علوی کی یہ مخلوق یعنی فرشتے انسان کے مقابلے میں صرف قدر کے احساس سے نابلد ہیں۔

مقام بندگی دیگر مقام عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی

جوں جوں جذبۂ عمل زوال پذیر ہوتا ہے۔ اقدار کا منفی احساس بڑھتا رہتا ہے جس معاشرہ میں تعزیر و جرم کی شرح سخت گیر ہوگی اس معاشرے میں قساوت قلبی اور خود معاشرے کے نام نہاد محافظوں کا اپنا ضمیر جرم کے احساس سے آزاد نہیں ہوتا۔ ذرا خیال تو کیجئے۔ معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا علمبردار انسان کی فلاح و بہبود کا عظیم ترین داعی۔ اپنے عمل، اپنے جذبے، اپنی دیانت اور اپنے خلق کی وجہ سے رحمۃ للعالمین کا لقب پاتا ہے۔ یہ بارگاہ جسے شاعر نے 'زعرش نازک تر' اور 'بعد از خدا بزرگ توئی' کے خطاب سے مخاطب کیا ہے، سراپا شفقت ہے۔ اس نے اسلام کو بزورِ شمشیر نہیں پھیلایا۔ اسلام تو اس کی شفقت، محبت، غریب نوازی۔ اور عفو و بخشش سے پھیلا تھا۔ مجرم بڑا شقی القلب انسان ہوتا ہے۔ وہ رحم کرنا نہیں جانتا۔ اگر وہ شقاوت قلبی کا اس حد تک شکار نہ ہوتا تو کبھی کسی کو قتل نہ کرتا کبھی کسی سے اس کا مال نہ چھینتا۔ کبھی کسی کو اس کے حق سے محروم نہ کرتا۔ معاشرہ جو سزا کے تعزیری یا امتناعی ضابطوں پر زور دیتا ہے اس کی رگوں میں جرم و گناہ اپنا زہر پھیلا چکے ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند اور تندرست معاشرہ میں سزا کا صرف اصلاحی مفہوم ہی قابل قبول ہو سکتا ہے۔ دراصل قدر کا احساس فعل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ محرک سے وابستہ ہوتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ الاعمال بالنیات اور اس سلسلے میں سورۂ کہف میں مذکور قصہ کو یاد کیجئے۔ رع 'کشتی مسکین و جان پاک و دیوار یتیم'۔

اس آئینے میں دیکھئے تو مکافاتِ عمل کا انداز ہی کچھ بدل جاتا ہے۔ کشتی کو عیب دار کرنا اور کسی بے گناہ کو قتل کر دینا بھی عین سعادت بن جاتے ہیں۔ قدر کے مثبت احساس سے جرم یا گناہ کا کوئی تصور وابستہ ہو ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ صرف جمالیات ہی میں نہیں مذہب میں بھی اس حقیقت کا شعور ملتا ہے کہ نتیجہ یا عملی امکانات کچھ ایسے اہم نہیں ہیں۔ کیفیت کا حصول مقصودِ خاطر ہے۔ کہیں اسے یوں بیان کرتے ہیں کہ اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ حسن نیت کے مقابلے میں اعمال کے اپنے عیب و صواب بے معنی بن جاتے ہیں کبھی اس بات کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

نیت کی صحت و سلامتی اور فیضان نظر کا مسئلہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک صاحب مدتوں کسی مرشد کی تلاش میں رہے۔ آخر مرشد ملا تو ایک کالا چور۔ وہ گھر سے اس نیت کے ساتھ نکلے تھے کہ جو بھی شخص سب سے پہلے سامنے آئے گا اسی کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔ رات کی تاریکی میں کوئی مردِ خود آگاہ تو نہ مل سکا، ملا تو ایک عادی مجرم۔ اس نے بھی پیچھا چھڑانے کے لئے کہا کہ اچھا دو رکعت نماز پڑھئے۔ ان دو رکعتوں میں دونوں کی قلب ماہیت ہو گئی۔ اور دونوں قطبیت کے مقام پر جا فائز ہوئے۔ بات کچھ ایسی انوکھی نہیں۔ ایک قسم کی جذباتی اور حسی چھوت نے ایک دوسرے کو یوں متاثر کیا کہ عمروں کی منزلیں لمحوں میں طے ہو گئیں، اسی لئے تو کہتے ہیں ؎

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

شعر و ادب یا فن کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جذبات کی تہذیب کرتے ہیں تو مطلب یہی ہے کہ وہ ایک حسی چھوت پیدا کرتے ہیں۔ اس چھوت سے جذبات اور احساسات میں لطافت اور شستگی پیدا ہوتی ہے یہ لطافت اور شستگی بعد میں غیر جمالی موثرات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور اس طرح قدر کا صرف شعور ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ قدر عملی طور پر بروئے کار آتی ہے۔

کسی نے کہا تھا کہ حسن کے مدارج نہیں ہوتے۔ حسن یا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، حسن گویا ایک قسم کی صداقت ہے۔ اب ایک بات یا سچ ہو گی یا جھوٹ ہو گی سچ کے مدارج نہیں ہوا کرتے۔
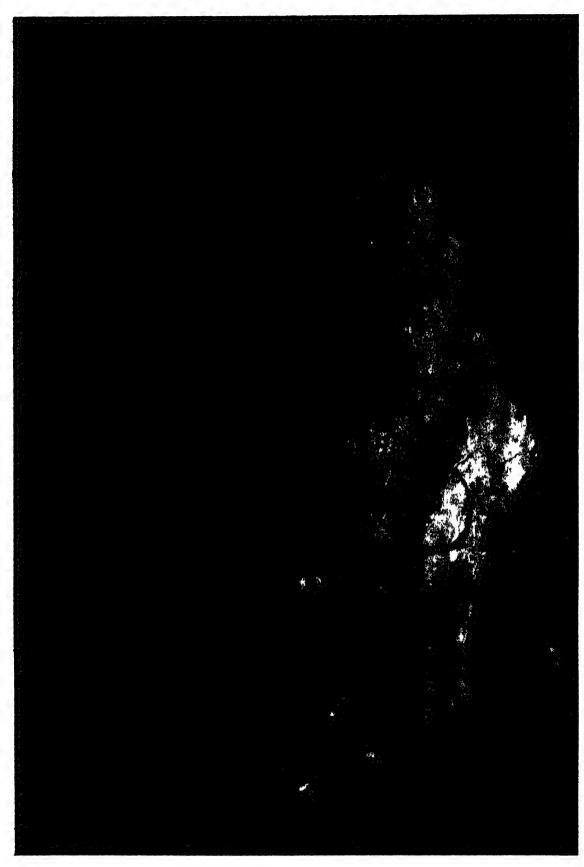
سورج مکھی　　　　عمل : حمیدالرحمان

سچ جھوٹ کا ملغوبہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی درجہ بندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ایک صورت ابھی باقی ہے۔ ایک بچہ سچ بولتا ہے کہ اس نے مٹھائی کھائی تھی۔ اور ایک وہ بھی انسان ہے جو سرِ دار پہنچ کر سچ بولتا ہے۔ پہلی بات کو آپ کوئی اہمیت نہیں دیتے، لیکن دوسری چیز کو اہمیت دیتے ہیں۔ مدارج کا ایک تصور اس طرح در آتا ہے۔ یہ درجہ بندی سچ کی اپنی نوعیت کے اعتبار سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس چیز کی نسبت سے متعین ہوتی ہے۔ جس سے سچ متعلق تھا۔ اس درجہ بندی کا معیار آخر کس طرح مقرر کیا جائے گا۔ بچے کے سچ کا تعلق ایک ایسی حاجت یا خواہش سے ہے۔ جو محض اس کی ذات تک محدود ہے۔ اس سے نہ کسی کا کچھ بگڑتا ہے نہ سنورتا ہے۔ نہ اس سے خود ذات یا نفس کو کوئی استحکام یا ارتقا حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا سچ خارجی دنیا میں کوئی انقلاب پیدا کرے یا نہ کرے۔ لیکن معنوی دنیا میں ایک عظیم آویزش، ایک عظیم انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے۔ دونوں میں فرق معنویت کا ہے۔ معنویت ایک خالصتاً ذہنی قدر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ سچ کی درجہ بندی ذہنی عمل کی عظمت سے وابستہ ہے۔

حیوان اور انسان میں فرق ذہنی عمل ہی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ انسان حصولِ مُراد کے لئے حیوان کی قوت سے کام لیتا ہے۔ اسے ہل میں جوتتا ہے۔ اس سے گاڑی کھچواتا ہے۔ لیکن آخر میں حیوان کو آپ خراجِ عقیدت پیش نہیں کرتے۔ صرف اس انسان کا ذکر کرتے ہیں جس نے حیوان کو اپنے کام کے لئے استعمال کیا۔ بھاپ میں ایک عظیم قوت مضمر تھی۔ ایک ذہنی عمل نے اس قوت کا راز دریافت کیا۔ قوت کو آپ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لیکن ذہنی عمل کے مصدر و منبع کو آپ نہیں بھول سکتے۔ چنانچہ قصہ کچھ یوں بنتا ہے کہ جب عاشق دریاؤں کو چیر کر، اور زندہ سانپ کے سہارے اپنی محبوبہ کے شبستانوں میں پہنچا تو محبوبہ نے کہا کاش تم نے اتنی محبت اپنے رب سے کی ہوتی۔ اور عاشق پر جب اس بات کی حقیقت روشن ہوئی تو وہ اَمَر ہو گیا۔ محبوبہ کی محبت کم سے کم ذہنی عمل کا تقاضا کرتی ہے معبودِ حقیقی سے محبت شعور کی معراج ہے۔ محبت کی نوعیت میں فرق نہیں آیا۔ لیکن ذہنی عمل کے اخراج سے اس کی سطح پست تر ہو گئی ــــ اُن دیکھے معبود کو پہچاننے کے لئے اور پھر اسے اپنی محبت کا مرجع و مقصود بنانے کے لئے ذہن کی جو جِلا درکار ہوتی ہے وہ جبلّی مقصود کو پہچاننے میں صرف نہیں کرنی پڑتی۔ اب جمالیاتی قدر میں مدارج کا تعین اس طرح ممکن ہو جاتا ہے کہ اگر قدر کا تعلق جبلّی حیوانی اور شہوانی سطح سے ہو تو اس میں عظمت یا بلندی پیدا نہیں ہوتی۔ جب یہی قدر ذہنی عوامل سے وابستہ ہو جاتی ہے تو اس میں ایک عظمت جھلکنے لگتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھئے تو ترفع کا عمل بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ جبلی اعمال کو ایک ذہنی عمل میں ڈھال لیتے ہیں۔

ذہنی عوامل کا ذکر آ گیا ہے تو لازماً پھر اخلاقیات ــــ یا مابعد الطبعیات کا ذکر چھڑ جائے گا۔ یعنی اگر جمالیاتی جذب و سرور بلند تر مقاصد خیر یا حقیقت مطلقہ سے وابستہ ہوں تو ان میں عظمت پیدا ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔ تو پھر جمالیات کی تو اپنی کوئی قدر باقی نہ رہی۔ بات شاید یوں ہے کہ جمالیاتی قدر بنیادی قدر ہے۔ اس کا تقاضہ ذہنی، جذباتی اور حسی خلوص ہے ؎

خوب و ناخوبِ عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

اقدار کی دنیا میں تصنع اور بناوٹ یا احتسابی غلط روی بہت عام ہیں۔ حیوان کو یہ مشکل درپیش نہیں ہوتی۔ انسان کو مسلسل اس کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے۔ جمالیاتی قدر کے ذریعے ہم جذبات اور احساسات میں ایک ایسی تہذیب۔ شائستگی اور شگفتگی پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ ہر اس چیز سے گریز کرتے ہیں جو غیر حسن ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس دنیا میں تصنع ممکن نہیں۔ آپ عشق کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اور اسی لئے شاید کہنے والے نے یہ کہا تھا۔ حسن میں مدارج نہیں ہوتے۔ حسن یا ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا۔ اور پھر اس سے بھی بڑی بات یہ کہ جمالیاتی قدر مقصود بالذات ہے یہ کسی دوسری قدر کی محتاج نہیں رہتی۔ نہ محرکات سے الجھتی ہے۔ نہ نتائج پر نظر رکھتی ہے۔ اپنے جذب و سرمستی اور ذوقِ عمل سے زندہ و پائندہ ہے ؎

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُم الکتاب ٭

(حلقۂ اربابِ ذوق۔ لاہور)

افسانہ :-

اُصول کی بات

احمد ندیم قاسمی

"میرے چند احباب نے یہ افسانہ سنا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ "اب تو ایسا نہیں ہوتا"
اور میں نے عرض کیا کہ "صدیوں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اگر آج ایسا نہیں ہوتا تو خدا کرے
آئندہ بھی ایسا نہ ہو"

یہ واقعہ میں نے اس لئے لکھ دیا ہے کہ ممکن ہے آپ اس افسانہ کی اشاعت سے جھجکیں۔ یہ
افسانہ زرعی اصلاحات سے پہلے کے حالات کا ایک دلگداز عکس ہے۔ اور آئندہ کے لئے ایک تنبیہ
بھی ہے اور ہماری حکومت کا نقطۂ نظر یقیناً یہی ہے"۔ (ندیم)

(بے شک "اب ایسا نہیں ہوتا" اور اس میں سارا زور 'اب' پر ہے موجودہ انقلاب کا
حقیقی مقصد تمام تر یہی ہے۔ مدیر)

★

"سو وہ تم ہو"۔ زمیندار نے عبداللہ کو سر سے پاؤں تک اور پھر پاؤں سے سر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی" عبداللہ نے خاکساری کے وہ تمام تاثرات چہرے پر بکھیر لئے جن کے بوتے پر اس نے اب تک اپنی جان سے ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔

"پر تم تو بوڑھے ہو" زمیندار نے جیسے اس پر تھوک دیا۔

عبداللہ ذرا دیر کے لئے بجھ گیا۔ پھر فوراً اپنی کمک کو پہنچا۔

"میری عمر تو سرکار یہی کوئی پانچ کم پچاس ہوگی"

"پانچ اوپر پچاس تو نہیں؟" زمیندار نے مسکرا کر بھری ہوئی چوپال پر نظریں دوڑائیں۔

"اوپر نیچے کا دھوکا تو ہو ہی جاتا ہے"

لوگ زور زور سے ہنسنے لگے اور زمیندار پچوان کی نے کو ایک مونچھ پر پھیرتا رہا۔ قہقہے رکے تو اس نے عبداللہ سے پوچھا۔

"جب تم پیدا ہوئے تھے تو ملکہ وکٹوریا کا راج تھا نا؟"

عبداللہ لوگوں کو ایک بار پھر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اس لئے فوراً بولا "جی یہ تو یاد نہیں، پر اتنا یاد ہے کہ ان دنوں ملکہ کا روپیہ چلتا تھا"

"اور سنو"۔ زمیندار نے سب سے جیسے داد طلب کی۔

"ملکہ کا روپیہ تو ابھی کل تک چل رہا تھا" یکایک زمیندار کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی اور وہ رقت سے بولا۔ "ہا۔ کیا روپیہ تھا! سچی چاندی تھی۔ یوں کھنکتا تھا جیسے کٹوری بج رہی ہو۔ ہا۔ کیسے کیسے زمانے تھے جو لد گئے۔ مجھے یاد ہے۔ خدا بخشے بابا نے خوش ہو کر کبھی کسی مزارعے کو ایک روپیہ دیا تو اس نے ان کی جوتیاں اٹھا کر چوم لیں۔ اور آج کسی کو دس روپے بھی دے دو تو وہ دس روپوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ دینے والے کے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے کہ شاید وہ دس روپے اور نکلے"۔

لوگ جو پہلے محظوظ ہو رہے تھے۔ سنجیدہ ہو گئے۔ پرلے کونے سے ایک آدمی بولا "اُس زمانے میں تو سرکار، ایک روپے

سے لٹھے کی چادر بن جاتی تھی۔ آج دس روپوں میں کھدر کی چادر بھی نہیں بنتی"

زمیندار نے پیچوان کی نے کو پلنگ کی پٹی پر پٹخ دیا۔ "تو کیا میں نے تم سے لٹھے اور کھدر کا بھاؤ پوچھا تھا؟ کیا کبھی تمہارے باپ نے بھی لٹھے کی چادر باندھی ہے؟"

سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں سوائے عبداللہ کے کوئی شخص زمیندار کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنی جوتیوں کی نوکوں یا تہمدوں کی تہوں کو درست کرنے لگے تھے۔ پھر جب اس سناٹے کو زمیندار کے پیچوان کی گڑگڑ نے توڑا تو سب نے ایک ساتھ زمیندار کی طرف دیکھا اور زمیندار نے جیسے سب سے پوچھا۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

کوئی آہستہ سے بولا۔ "ملکہ والے روپے کی بات ہو رہی تھی۔"

"ہاں۔ زمانے جو لد گئے" زمیندار نے ایک آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد پہلو بدل کر بولا۔ "کیوں بھئی سنا ہے وہ کرمے کی شادی پر تغلوں سے جو میراثی آئے ہیں وہ بلا کے شہنائی باز ہیں۔ ذرا انہیں بلاؤ تو چوپال پر۔ ایک چوکی ہو جائے۔"

ایک نوجوان بولا۔ "جی ان کے ساتھ تو بڑے اچھے گانے والے بھی ہیں۔"

"ان سے بھی کہہ دو۔" زمیندار نے حکم دیا۔ "شام کی نماز کے بعد ہم اکتارے پر بلھے کی کافیاں سنیں گے۔ گلے دھو کے آئیں۔"

"جی اچھا۔" اکٹھی بہت سی آوازیں آئیں۔

زمیندار بولا۔ "تم لوگوں نے سنا ہوگا یہ کرما پہلے مجرہ کرانے کی سوچ رہا تھا اور ملتان جا کر قدرو کنجری سے بات بھی کر آیا تھا۔"

"جی۔" کسی نے تائید کی۔

"میں نے اسے کہلوا بھیجا تھا کہ اگر مجرہ کرانا ہے تو پہلے چوپال پر آ جاؤ تا کہ یہاں میں تمہاری چمڑی اتار کر رکھ لوں اور باقی کو مجرہ کرانے بھیج دوں۔ سارے گاؤں کو سید کرنے چلا تھا بدبخت۔ ہم نے لڑکے کا بیاہ کیا تو صاحب ضلع کو بلوایا۔ کرما بیاہ کرے تو قدرو کنجری کو بلوائے! حرامزادہ۔"

لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ زمیندار ان کی باتیں سن نہیں رہا تھا مگر سمجھ ضرور رہا تھا۔ اسے معلوم کہ وہ اسی کی نیکی اور پرہیزگاری کی باتیں کر رہے ہیں۔ خود آسودگی کے جذبے سے اس نے رخ بدلا اور سامنے دیکھا۔ عبداللہ جہاں کچھ دیر پہلے آ کھڑا ہوا تھا، وہیں جما کھڑا تھا۔ اور اس کے ہاتھ جو زمیندار کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے جڑ گئے تھے، اب تک جڑے ہوئے تھے۔ البتہ اب ذرا سے ڈھیلے ہو گئے تھے اور اس کے ایک انگوٹھے کے ناخن پر ایک مکھی ساکت و صامت بیٹھی تھی۔

"تم اب تک یہیں کھڑے ہو؟" زمیندار نے یوں پوچھا جیسے وہ کچھ دیر کے لئے سو گیا تھا۔ عبداللہ نے جواب میں جڑے ہوئے ڈھیلے ہاتھوں کو پھر سے اکڑا لیا۔

"اولاد ہے؟" زمیندار نے پوچھا۔

"جی۔ ایک بیٹی ہے۔ ایک بیٹا بھی تھا بے چارہ۔ خدا نے لے لیا"

"کیسے مرا؟"

"جی دق سے۔"

"تو پھر تمہیں بھی دق ہو گی۔" زمیندار نے جیسے اس کے منہ پر دوبارہ تھوک دیا۔ عبداللہ اپنی آنکھوں میں ریت ڈالے چپ چاپ کھڑا رہا جیسے مرض کی تشخیص اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

زمیندار نے جیسے آخری فیصلہ سنانے سے پہلے پوچھا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"عبداللہ" وہ بولا۔

"تو پھر دلا کیوں بولا۔ نام کس نے پوچھا تھا؟"

عبداللہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"دیکھو بھئی دتے۔ میں زمینوں کو جتوا تا نہیں ہوں۔ میں تو انہیں کولھو میں پلوا تا ہوں۔ اور یہ کولھو چلانے کے لئے مجھے بڑے بڑے مضبوط بیلوں جیسے کسان چاہئیں۔" لوگوں کی ہنسی نے زمیندار کی بات کاٹ دی۔ وہ خود بھی ذرا سا مسکرایا۔ پھر بولا۔ "اور تم بڈھے آدمی ہو۔ بال کھچڑی ہو رہے ہیں۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ تم کیا ہل چلاؤ گے! اور پھر فرض کیا تم نے ہل چلایا۔ پر تم اکیلے آدمی ہو۔ بیمار پڑ گئے تو کھیتوں کی رکھوالی کون کرے گا؟ بیٹی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ بیوی ہے؟"

"جی، ہے"

"چلو یہ تو اچھا ہے۔ بیوی تو ہے۔ بیوی ہونی چاہئے — ہل چلاتی نہیں پر چلواتی تو ہے۔"

لوگ پھر ہنسے۔

"تو یوں کہو کہ تم تل تین تنگ ہو" زمیندار بولا۔ "لڑکا ہوتا تو شاید تمہارا کام بن جاتا۔ اور ہاں۔ تم نکالے کیوں گئے پہلی زمینوں سے؟"

"بس اتنی بات ہوئی سرکار" عبداللہ نے جڑے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو انگلیوں کی پوروں تک لاکر کہا۔

"میں نے کہا۔ چنا مہنگا جا رہا ہے۔ بولے۔ نکل جاؤ"

"نکالا تو ٹھیک نکالا" زمیندار نے ایک بھوں اچکائی "اب گھر میں ملک کے روپوں کی بات کروں اور کوئی تیسرا اور کھدر کا بھاؤ لے بیٹھے تو بتاؤ میں اس کے ساتھ کیا کروں گا؟ یہی کروں گا اور کیا کروں گا"

سب نے ایک دم ایک ساتھ پلٹ کر پرے کونے کی طرف دیکھا جہاں ایک آدمی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

پہلو بدل کر زمیندار نے سامنے اصطبل کی طرف دیکھا جس میں مشکی، کمیت اور سفید رنگ کے تین گھوڑے توبڑوں میں منہ ڈالے کھڑے تھے۔ "کیوں بھئی۔ اب ٹھیک ہے نا؟" اس نے سارے مجمع سے پوچھا۔ "تھانیدار کے گھوڑے کو ادھر بھینسوں کے پاس بندھوا رہا ہے۔ تمہی میں سے کسی نے کہا تھا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے"

کوئی بولا۔ "اچھا خاصا ہے تھانیدار کا گھوڑا۔ پر ان گھوڑوں کے سامنے تو گدھا سا لگنے لگتا ہے"

قہقہوں کے ایک دور کے بعد زمیندار گھوڑوں، تھانے داروں اور روئی کے نرخوں کی باتیں کرنے لگا اور کچھ دیر کے بعد زری سے تھپے ہوئے جوتے بڑی بے پروائی سے گھسیٹتا، چوپال سے اتر گیا۔ لوگ ایک دوسرے کے پاس کھسک آئے اور حقے گڑگڑانے لگے۔ اور عبداللہ اکیلا رہ گیا۔

وہ بہت اداس تھا۔ پہلے زمیندار نے اسے صرف اس لئے جواب دے دیا تھا کہ جب وہ شکار پر آیا تھا اور کھیتوں میں گھوڑے باندھے تھے تو عبداللہ نے ان کے لئے دانہ لاتے ہوئے بس اتنا کہہ دیا تھا کہ "آج کل چنا تو بہت اونچا جا رہا ہے سرکار" اس نے یونہی روا روی میں یہ بات کہہ دی تھی جیسے کوئی موسم کی خرابی کا ذکر کر دے۔ مگر زمیندار نے اس کا کچھ اور مطلب لیا۔ "یہ چنا۔ یہی چنا جو ہمارے گھوڑے کھا رہے ہیں؟"

"جی سرکار" عبداللہ نے کہا تھا۔

اور زمیندار نے پوچھا تھا "خوب سوچ کر بتاؤ۔ بہت مہنگا جا رہا ہے نا؟"

"جی ہاں۔ بہت ہی مہنگا" عبداللہ نے پھر کہا تھا۔

اور زمیندار نے اسے چابک مارتے ہوئے کہا تھا "نکل جاؤ یہاں سے نمک حرام کہیں کے۔ کتنے برسوں سے تم ہمارا دانہ کھا رہے ہو آج ہمارے گھوڑوں نے تمہارا دانہ کھایا تو دانے کے نرخ یاد آ گئے"

اور عبداللہ اس گھروندے سے نکل آیا تھا جس میں اس نے گیارہ برس گزارے تھے اور جب اسے لائل پور گئے ہوئے بیٹے کی چٹھی ملتی تھی کہ میں مزدوری کر کے اپنے علاج کے لئے روپیہ کما لیتا ہوں اور آپ لوگ زیادہ فکر نہ کریں تو وہ اسی گھروندے کے آنگن میں گنگھنیوں کا دیگچہ پکاتا تھا اور چڑیوں، کوؤں اور رلالیوں میں بانٹ دیتا تھا۔ اسی کے آس پاس کے پیڑوں میں اس نے اپنی بیٹی ماکھاں کے لئے جھولے ڈالے تھے اور جب وہ ہل چلاتا تھا اور اس کی بیوی بیگاں اسے روٹی اور چھاچھ پہنچانے آتی تھی۔ تو ماکھاں جھولا جھولتی تھی اور گاتی تھی:

ڈاچیاں کچیاں دے
ویر خیری آ دے
بابا میرا لسی پیوے
اماں میری لسی پیوے
ویر یاد آ دے
ڈاچیاں کچیاں دے
ویر خیری آ دے

اس وقت عبداللہ کا جی چاہا کہ اونچے اونچے سروں میں "ڈاچیاں کچیاں دے" گانے لگے اور ساتھ ساتھ رونے لگے اور جب لوگ اس سے وجہ پوچھیں تو انہیں بتائے کہ "میں نے عمر بھر اپنے ہاتھ کی حلال روزی کھائی ہے پر کل میں نے ایک گاؤں کی مسجد میں جا کر نماز کے بعد بھیک مانگی تھی اور جب میں بھیک مانگ رہا تھا تو میری غیرت میرے گلے میں چھریاں مار رہی تھی اور میری آنکھوں میں آنسو جلنے لگے تھے۔ پھر جب میں چار روٹیاں اور چار آنے لے کر بیوی

بیٹی کے پاس آیا تھا تو بیوی نے کہا تھا "کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے۔ پہلے تم خون پسینہ بیچ کر روٹی لیتے تھے۔ جھگڑا تو روٹی ہی کا ہے ماکھاں کے بابا۔ امام صاحب کو بھی آج اس مسجد میں روٹی نہ ملے تو کل کوئی دوسری مسجد ڈھونڈیں۔ اللہ اللہ کرو وہ جب ترس کھائے گا تو بدلہ چکا دیں گے۔ چار روٹیاں لائے ہو۔ آٹھ اپنے ہاتھ سے پکا کر اور گھی لگا کر فقیروں کو نہ کھلاؤں تو ڈائن ہو کر مروں"

"تو کیا ہم فقیر ہیں؟" ماکھاں نے پوچھا تھا۔

اور میں نے بیوی کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا جیسے وہ بولی تو میں مر جاؤں گا۔

عبداللہ اچانک اٹھا اور چوپال کے پچھواڑے کی طرف لپکا جہاں ایک کیکر کے نیچے وہ بیگاں اور ماکھاں کو بٹھا آیا تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ دونوں کیکر کے نیچے موجود نہیں ہیں۔ ذرا سا ٹھٹکا مگر پھر کیکر کے نیچے جا پہنچا اور اس کے تنے پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک آشیانوں کی طرف جاتی ہوئی چڑیوں کا ایک بہت بڑا غول کیکر پر اترا اور اس کی ہر شاخ پر گیندیں سی لٹک گئیں، عبداللہ کو زندگی میں پہلی بار چڑیوں کا شور بہت برا لگا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر کیکر کے تنے پر زور سے لات ماری اور سب گیندیں ایک ساتھ فضا میں اچھل کر غائب ہو گئیں۔ چڑیوں کے پروں کی جھپٹ میں آئے ہوئے کیکر کے پھولوں نے زمین پر ہلدی سی بکھیر دی تھی اور آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ایک گھنی بدلی میں سے نیزوں کی طرح نکلی پڑ رہی تھیں۔

عبداللہ چوپال کی طرف پلٹا تو سامنے سے اسے بیگاں آتی نظر آئی۔ اگر گلی میں سے ایک پنہاری نہ گزر رہی ہوتی تو وہ بیگاں کے پاس بھاگ کر پہنچ جاتا۔ پھر بھی وہ بظاہر تیز نہ چلتے ہوئے تیزی سے بیگاں کے پاس پہنچا مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے بیگاں ہی بولنے لگی "ادھر ڈیوڑھی میں ایک زنانہ کسان خانہ ہے۔ ہم اس میں چلی گئی ہیں۔ سب نوکرانیاں بھی وہیں سوتی ہیں بڑی اچھی لوگ ہیں ہمیں وہاں لے گئیں۔ پھر ہمیں چینی کی چائے پلائی۔ پھر اپنے اپنے دکھوں دردوں کی باتیں بھی ہوئیں۔ اس وقت ماکھاں ان کے ساتھ چائے کے برتن دھو رہی تھی میں نے کہا میں تمہاری خبر لے آؤں۔ تمہیں چائے ملی؟"

"مجھے تو ابھی حقہ بھی نہیں ملا" عبداللہ نے کہا "پھر تمہاری بات سن کر سمجھو چائے بھی پی لی۔ ویسے بیگاں! کام بنتا نظر نہیں آتا۔ زمیندار کے منشی کا پتہ لگاتا ہوں، وہ ملے تو اس کے پاؤں پکڑ لوں۔ تم بھی کسی نوکرانی سے زمیندارن کو کہلواؤ۔ کوسوں تک پھیلی ہوئی زمینیں ہیں۔ ایک آدھ بیگہ ہمیں مل جائے تو کیا بگڑ جائے گا ان بادشاہوں کا۔"

بیگاں وعدہ کر کے چلی گئی اور عبداللہ چوپال پہ آ گیا۔ لوگ اٹھ گئے تھے۔ صرف ایک طرف سائیں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ عبداللہ سیدھا اس کے پاس جا بیٹھا۔ سائیں نے حقہ اس کی طرف گھما دیا اور جب عبداللہ چند کش لگا چکا تو سائیں بولا "بڑا ہی برا زمانہ آ لگا ہے چاچا۔ پیٹ کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اب تم پکی عمر کے آدمی ہو۔ یہ تمہارے آرام سے کھٹولے پر بیٹھ کر حقہ پینے کے دن تھے مگر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہو دربدر کی۔ خدا اگر آدمی کا پیٹ نہ لگاتا تو کوئی ٹنٹا ہی نہ ہوتا۔ ذرا یہ پھاوڑا لیکر گھوڑوں کی لید تو سمیٹ لوں میں جا کر گودام سے تمہارے لئے کھٹیا نکال لاؤں۔"

عبداللہ چپکے سے پھاوڑا اٹھا کر اصطبل کی طرف چلا گیا اور سائیں چوپال سے اتر گیا۔ شام کے بعد ایک آدمی عبداللہ کے لئے کھانا لے آیا۔ ذرا دیر بعد چوپال پر گاؤں والوں کا ریلا سا آ گیا۔ اکٹھی چار پانچ لالٹینیں جلنے لگیں۔ مراثی بھی آ گئے اور ڈھولوں، شہنائیوں کو سر کرنے لگے۔ پھر جب زمیندار نے چوپال پر قدم رکھا تو بالکل وہ کیفیت چھا گئی جب سینما ہالوں میں فلم شروع ہونے سے پہلے بتیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ پہلے شہنائی والے نے اپنا کمال دکھایا۔ پھر گانے والوں نے بلھے کی کافیاں اور علی حیدر کے دوہے سنائے۔ آخر زمیندار نے دس روپے کا ایک نوٹ ایک ہاتھ میں اور دوسرا نوٹ دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر دونوں ہاتھ بلند کر دئے، شہنائی والا آگے بڑھا اور ایک نوٹ لیکر سلام کرتا ہوا الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ گانے والوں میں سے بھی ایک نے یہی کیا پھر سائیں نے آگے بڑھ کر فرش پر چادر بچھا دی۔ اور ایک دونی رکھ دی۔ ہر شخص جیب میں ہاتھ ڈالے اور ٹینٹ کھولے آگے بڑھا اور سب نے ایک ایک دونی چادر پر رکھ دی۔ عبداللہ کے لئے یہ سب باتیں نئی تھیں مگر دوسروں کی دیکھا دیکھی اٹھا اور مسجد سے بھیک میں ملی ہوئی چونی ٹینٹ سے کھول کر اور آگے بڑھ کر زمیندار کے قدموں میں چادر پہ ڈال دی اور ابھی وہ ایک دونی اٹھا لینے کی سوچ رہا تھا کہ زمیندار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا "اچھا تو تم دے گئے ہو" پھر وہ سب لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"بھئی لوگوں دیکھ رہے ہو اس بڈھے کو۔ تم سب نے ایک ایک دمڑی دی ہے اور اس نے یہ میرے سامنے جوتی لا کر رکھ دی ہے۔ یہ فرق ہے پرانے اور نئے زمانے میں۔ اسے کہتے ہیں وضعداری کہ روزگار رہے نہیں۔ زمینوں کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ابھی میرے مزارعوں میں شامل نہیں ہوا مگر اصول کی بات، اصول کی بات ہے اور اس نے جوتی کھول کے رکھ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کبھی پرانے لوگوں کو بہت پسند کرنے لگتا ہوں، نوجوان مزارعوں کو تو اتنا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ زمیندار کی جوتی سیدھی کیسے کی جاتی ہے۔ جاؤ بھئی ڈٹ کے بیٹھ جاؤ۔ کھانا دانا تو مل گیا نا تمہیں؟"

"مل گیا سرکار" دلا مارے خوشی کے کانپ رہا تھا "آپ کے بچے جئیں۔ آپ کی زمینیں پھلیں"۔

دونیوں کو گنا گیا اور انہیں برابر تقسیم کر کے شہنائی بجانے والے اور گویوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اور جب محفل برخاست ہو گئی اور چوپال میں صرف ایک دیا جلتا رہ گیا تو عبداللہ اٹھ کر اپنے کھٹولے پر آ بیٹھا۔ چوپال کے صحن کے ہر ایک کونے پر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور چاروں آدمی باری باری حقہ پی رہے تھے اور کھانس رہے تھے۔ عبداللہ کا جی چاہا کہ وہ ان کے پاس جا کر باتیں کرے مگر اتنے میں سائیں آ گیا اور اس کی پائنتی پر بیٹھ کر بولا "تمہاری بات تو کچھ ٹھیک ہوتی معلوم ہوتی ہے چاچا۔ تمہاری جوتی سکام کر گئی۔ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھتے ہیں سرکار۔ میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ وہ جس آدمی نے لٹھے اور کھدر کی بات کی تھی نا۔ اسے سرکار نے نکال دیا ہے۔ یوں سرکار کی خاص شکارگاہ والی زمینیں تمہیں ملنے والی ہیں۔ ایک تو ویسے ہی یہ زمینیں سونا اگلتی ہیں دوسرے مہینے میں دو بار نہیں تو ایک بار تو سرکار ضرور وہاں جاتے ہیں چھوٹی سی بنگلی بنی ہوئی ہے، وہاں ٹھہرتے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں۔ تمہیں یہ زمینیں مل جائیں تو سمجھو تمہارے دلدر دور ہو گئے۔ پرانے مزارعوں نے سنا کہ بنگلی کا علاقہ تمہیں مل رہا ہے تو وہ اب چوکی کے بعد سرکار کے پیچھے پڑ گئے کہ ہم پرانے خدمت گار ہیں۔ اور ان زمینوں پر ہمارا حق زیادہ ہے مگر سرکار نے ڈیوڑھی کے اندر جاتے ہوئے بڑے مزے کی بات کہی۔ بولے۔ شاید پہلے میں کچھ سوچتا مگر اب تو اصول کی بات ہے۔ تمہیں جلانے کے لئے یہ زمینیں ڈٹ کے ہی کو دوں گا۔ میں مٹھائی نہیں چھوڑوں گا چاچا"۔

عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائیں کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ اچانک سائیں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "نہیں چھوڑوں گا مٹھائی"۔ اور پھر چلا گیا۔

اور عبداللہ نے کھٹولے پر لیٹتے ہوئے اتنی لمبی انگڑائی لی کہ اس کے تمام جوڑوں میں سے پٹاخے چھوٹنے لگے۔ پھر اس نے کچھ پڑھ کر اپنے چاروں طرف چھو کی، جوتے کا ایک ٹبن کھول کر اپنے سینے پر چھو کی اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔

ذرا سویا تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے ہلا دیا۔ "کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ وہ سائیں تھا۔ پائنتی کی طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔

"دیکھو چاچا۔ بڑا ضروری کام ہے اس لئے تمہیں جگا دیا۔ وہ بنگلی والی زمین سرکار نے تمہارے نام کر دی تھی منشی سے بھی کہہ دیا تھا اور یہ بھی انتظام کر دیا تھا کہ صبح کو تم بیلوں کی ایک جوڑی بھی پسند کر لو۔ مگر اب معاملہ کچھ بگڑ گیا ہے۔ تم سے کچھ ہو سکتا ہے تو کر دو"۔

عبداللہ نے چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی اور سائیں کے قریب ہو کر بولا "کیا ہو گیا ہے ایک دم۔ تم بتاؤ تو سہی مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا"۔

سائیں آہستہ سے بولا "میں تمہیں لے چلتا ہوں ڈیوڑھی میں یوں کرو کہ تمہاری بیٹی ہے نا ماکھاں۔ اس کو سمجھا دو"۔

"کیا سمجھا دوں؟ وہ کیا کرے گی؟" عبداللہ نے پوچھا۔

اور سائیں بولا "ارے چاچا۔ اس کو سمجھا دو نا۔ اس سے کہہ دو کہ مان جائے۔ آدھی رات ہونے کو آئی ہے اور وہ اب تک نہیں مانی۔ نہ وہ مانتی ہے۔ نہ اس کی ماں اسے مناتی ہے۔ اب اگر تم بھی نہ منا سکو تو سرکار کہتے ہیں کہ اپنی راہ لو۔ اصول کی بات ہے!

•:•

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ رنگت، گال پہ لالی، آنکھیں بہت اداس
اے رانی تو جگ جگ جیوے ہاتھ میں لے مرے ہاتھ
اے راجہ میں آج تری، کل اور کسی کے ساتھ!
(دعائی)

سنّاٹا

(ایک افسانوی تاثر)

ابن سعید

پاکستانی ہوائی سروس — جو ہفتہ میں دو مرتبہ کراچی اور لندن کا سفر طے کرتی، پاکستان اور انگلستان کے درمیان ایک غیر مرئی پُل تھی۔ اور بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے کراچی کے اسٹاک ایکسچینج اور بازار کے گھٹتے بڑھتے نرخوں سے فائدہ اٹھا کر روپیہ پیدا کرلیا تھا۔ یا جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ جانے کے عادی تھے۔ یا پھر اس سفر کو طے کرنے کی خواہش میں اپنا ماضی اور حال سب فراموش کردینے پر ہی آمادہ ہوگئے تھے، ایسے بہت سے لوگ اس غیر مرئی، ان دیکھے پُل پر سے گزر کر کراچی سے لندن پہنچ جاتے۔ اور چلچلاتی دھوپ اور خاک سے لبریز ہواؤں اور جھونپڑیوں اور جدید اطالوی اور فرانسیسی وضع کے محلوں کی عجیب و غریب، پُراسرار، ناقابل فہم دنیا کو پیچھے چھوڑ کر لندن پہنچ جاتے۔ جہاں ایک قسم کی دائمی خنکی اور دھند کے مرغولوں میں لپٹی ہوئی ایک وسیع دنیا اُن کا استقبال کرتی۔ یہ غیر مرئی پُل دراصل اُن دو خلیجوں کے درمیان حائل تھا جس کا ذکر برسوں پہلے فاسٹر[1] نے اپنے ناول میں کیا تھا۔ اور اس پُل کو عبور کرنے کے لئے اب محض ایک ہوائی ٹکٹ کی قیمت درکار تھی۔

اور سید سخاوت حسین جن کی بیوی دائم المریض تھیں، بچوں کی تعلیم کا بہانہ کرکے کسی نہ کسی طور اس پُل کو عبور کرکے کراچی سے لندن چلے آئے تھے۔ اور اب پٹنی کے ایک کاٹیج نما مکان میں مقیم تھے۔

سید سخاوت حسین میں ممتاز کو اپنی پہلی ملاقات ہی میں ایک گہری دلچسپی محسوس ہونے لگی، سید صاحب انتہائی سرپرستانہ انداز میں کہنے لگے۔

"میاں صاحبزادے۔ بات یہ ہے کہ ساؤتھ کنسنگٹن پر جو وہ کمبخت جمشید ہے ہمیشہ اس کی دکان پر اور تو سب کچھ مل جاتا ہے۔ مگر یہ کمبخت پان نہیں ملتے ہیں"۔

پان اُن کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی، اور ان کے علاوہ اُن اَن گنت کلرکوں اور افسروں اور بے دیوان شاعروں اور غیر مطبوعہ کتابوں کے مصنفوں اور اُن کے گھروں کی بے گنتی عورتوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ جو لندن میں اپنی زندگیاں بِتا رہے تھے۔ وہ پان کی خاطر اُس ہوائی سروس کی تاریخوں کا بے تابی کے ساتھ انتظار کرتے۔ اور ہوا بازوں کی خوشامدیں کرتے۔

ہوائی سروس کی آمد کی خوشی میں سفارت خانے میں کام کرنے والے ادنیٰ درجے کے ملازمین کی بیویاں بھی آپس کی کدورتیں فراموش کرنے پر آمادہ ہوجاتیں۔ اور جب ہوائی سروس کا دن قریب ہوتا تو آپس میں ایک نئی محبت اور یگانگت کی بنا ڈال دیتیں۔ اور پھر پُرانی ملاقاتوں کی تجدید ہوتی۔ ایک دوسرے سے ملتے رہنے کی قسمیں کھائی جاتیں۔ فریئر روڈ اور پاکستان چوک اور ناظم آباد، پیر الٰہی بخش کالونی کی گلیوں کو یاد کیا جاتا اور پان کھانے اور کھلانے کا یہ سلسلہ کم از کم کچھ مدت کے لئے اُن کے آپس کے تعلقات میں ایک گرمی پیدا کردیتا۔

ممتاز نے سید سخاوت حسین کو ستانے کی غرض سے کہا۔

"آپ لوگ بھی خوب ہیں۔ ایک طرف تو خود ہی جلاوطن ہوکر یہاں چلے آتے ہیں اور پھر یہاں آن کر میلاد شریف منعقد کئے جاتے ہیں، محرم منایا جاتا ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں جمشید کی دکان سے خرید کر اگر لوبان کی خوشبو سے گھر کو معطر کرتے ہیں گیس کے چولھے پر سری پائے پکاتے ہیں۔ اور ہوائی جہاز پر آئے پانوں کو حسرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اسی دنیا میں برٹش میوزیم ہے۔ چلسی ہے، ہائیڈ پارک ہے۔

---

[1] ای۔ ایم فاسٹر: A PASSAGE TO INDIA

فلیٹ اسٹریٹ ہے، ٹاور ہے، سوہو ہے! — سفید فام عورتیں ہیں!

ممتاز نے ابھی اپنی بات ختم نہ کی تھی کہ سید سخاوت حسین کے کمرے میں ایکا ایکی سکینہ وارد ہوگئی۔ سکینہ ان کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ پچھلے پانچ سال میں لندن نے اس کی زندگی میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اپنے نیم دیہاتی قصبے سے نکل کر جہاں وہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد کراچی پہنچی تو اس کی عمر دس بارہ سال کی تھی۔ کراچی میں آکر پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک چھوٹے سے کابک نما مکان میں اُس نے جوانی کی ابتدائی منزلیں طے کیں اور اُسی نواح کے ایک پرائیویٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر سید سخاوت حسین کی قسمت نے زور مارا تو وہ لندن پہنچ گئی۔ یہاں تو اس کے لئے دنیا ہی اور تھی۔ اب وہ ایک ہوم سائنس کالج میں ڈپلوما کورس کر رہی تھی۔ اور آکسفورڈ اسٹریٹ اور کنسنگٹن میں کپڑے والوں کی دکان پر سیل کی منتظر رہتی اور ہفتے میں ایک مرتبہ ایک فورن لینگوئجز کلب میں اطالوی زبان سیکھنے کی غرض سے جاتی اور اپنے خالی اوقات میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرکے سات آٹھ پونڈ ہفتہ کما لیتی۔

سکینہ کے یوں ڈرامائی انداز میں سید سخاوت حسین کے کمرے میں داخل ہونے پر تمام دفتر کی فضا میں ایک لہری دوڑ گئی۔ جیسے وہ سب کلرک جو اس وسیع کمرے میں بیٹھے تھے ایک دوسرے سے ایک بے آواز لہجے میں کہہ رہے ہوں۔

"یہ سکینہ بھی بہت ولسی لڑکی ہے!" دفتر کی فضا میں ایک ہلچل پیدا کرکے سکینہ ایک بے ساختگی کے ساتھ سید سخاوت حسین کی میز پر اُچک کے بیٹھ گئی۔

"ابو!" اس نے اِٹھلا اِٹھلا کر کہا۔ "آپ نے اب تک شوکت میاں کو ٹیلیفون نہیں کیا۔" سید سخاوت حسین نے چھالیہ کی ڈلی چباتے ہوئے کہا۔ "کیا کریں بیٹا فرصت ہی نہیں ہوتی۔" پھر ممتاز سے مخاطب ہوکے کہنے لگے۔ "شوکت میاں بھی اپنے ہی قصبے کے رہنے والے ہیں۔ ہفتے میں دو بار نہیں تو ایک مرتبہ ضرور ہمارے لئے پان لے آتے ہیں، کبھی کبھار قوام بھی۔ پر وہ .... کسٹم والے بہت پریشان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، ان پانوں کے ذریعے بھی بیماری کے کیڑے ولایت میں آسکتے ہیں۔ ان کو پہلے دوائی سے دھوؤ، تب لے جانا ملے گا!"

سکینہ ایک لمحے کے لئے ممتاز کی شخصیت کا جائزہ لینے لگی۔ مگر پھر اُسی اٹھلاہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔ "بس ابو! آپ کو تو ہمارے کاموں کو ہی فرصت نہیں ہوتی۔ آپ نمبر بتا دیجئے ہم خود ہی فون کرلیں گے۔" پھر وہ بلا تعارف ہی ممتاز سے مخاطب ہوگئی۔ "آپ ہوائی سروس کے شوکت میاں کو جانتے ہیں؟"

ممتاز نے جھوٹ بول دیا۔ "ہاں تھوڑی بہت تو واقفیت ہے!"

"تو پھر آپ ہم کو اُن کے پاس لے چلئے۔ وہ ہمارے لئے کراچی سے ایک سوغات لے کر آئے ہیں۔"

ہوائی کمپنی کے دفتر کی طرف جاتے ہوئے ممتاز نے سوچا کہ نہ جانے لڑکی کونسی سوغات کی منتظر ہے! — وہ اب سکینہ کے قرب کو شدید طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اچانک سکینہ نے اٹھلا کر اس سے ایک سگریٹ مانگ لیا۔

"ابو کو مت بتایئے گا۔ مگر ہمیں سگریٹ پینا بہت پسند ہے۔" اس نے کہا۔

اُس کا سگریٹ پینے کا انداز کافی شوخ تھا۔ ممتاز نے سوچا کہ نہ جانے اس نے یہ سب طور کہاں پر سیکھے تھے۔ اس کو معاً خیال آگیا کہ کراچی اور لندن کے درمیان غیر مرئی پُل اس نوجوان تیکھی لڑکی کو پیر الٰہی بخش کالونی کی دُور افتادہ زندگی سے بہت زیادہ دُور لے آیا تھا۔ اور اگر اس پل پر سے گزر کر وہ دوبارہ کراچی جانے کا ارادہ کرے گی۔ تو نہ جانے کیا ہوگا!

وہ سوغات جس کے لئے سکینہ اس قدر بے تاب تھی۔ دراصل ایک ٹیپ ریکارڈر کا ٹیپ تھا جو کسی نے اس کے واسطے کراچی سے لندن بھیجا تھا۔ سکینہ نے ممتاز کو بتایا کہ اس فیتے پر بہت سے شاعروں کا مترنم کلام ریکارڈ کیا گیا تھا۔

اس سوغات کو پاتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک ہویدا ہوگئی۔ اس نے کہا۔ "مجھے ترنم سے پڑھے ہوئے کلام سے بے حد عشق ہے۔ اگر آپ ہمارے گھر آئیں تو آپ بھی اس کلام کو سن سکیں گے۔"

ممتاز نے کہا۔ "شاید میں آہی جاؤں، کیونکہ کل تو میں

یہاں سے چلا ہی جاؤں گا۔"

"کہاں؟" سکینہ نے بیتابی کے ساتھ پوچھا۔

"واپس"۔ ممتاز نے کہا۔ "رخصت اے بزم جہاں وغیرہ وغیرہ۔"

سکینہ مسکرا دی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اب ایک کھوئی کھوئی سی کیفیت تھی۔

پر جب وہ دوبارہ ممتاز سے سگریٹ مانگ کر سلگانے لگی تو یہ کیفیت اس کی غائب ہو گئی اور وہ دوبارہ وہی شوخ نوجوان لڑکی ہو گئی جس کے سگریٹ پینے کے انداز میں ایک عامیانہ سی جھلک تھی اور وہ اپنے مخصوص اترا ہٹ آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ "اچھا خدا حافظ — جاؤ تم بھی سدھارو!"

دن بھر ممتاز اپنے مختلف کاموں میں جتا رہا۔ وہ ایک عرصے سے یہاں لندن میں مقیم تھا اور اس کی زندگی بغیر کسی پروگرام کے گذرتی رہی تھی۔ مگر اب یہ چند آخری لمحے بہت قیمتی تھے قیمتی اور اہم — اور ان چند لمحوں کے اختتام پر اس کو معلوم تھا کہ وہ ہوائی جہاز کی نرم گدیلوں والی سیٹ میں دھنس جائے گا۔ اور چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنے والا ہوائی جہاز زمین کی مقناطیسی کشش کا مقابلہ شروع کر دے گا۔ اور وہ سوچے گا کہ نہ جانے سکینہ کی آنکھوں میں وہ ایک مدھم مدھم کھویا پن پیدا بھی ہوا تھا یا یہ اس کا محض واہمہ ہی تھا۔

جب ٹیوب اور بس سے مسلسل چالیس منٹ تک سفر کرنے کے بعد ممتاز پٹنی میں سکینہ کے بتلائے ہوئے بس سٹاپ پر اترا تو اس کو اس علاقہ کی مضافاتی فضا میں خواہ مخواہ ایک اداس کیفیت نظر آئی۔ مگر اس وقت اسے اس کیفیت پر زیادہ وقت صرف کرنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سکینہ کی بتائی ہوئی ہدایتوں کے بموجب دس منٹ میں سید سخاوت حسین کے مکان پر پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں فرش پر سکینہ اور اس کے ہم عمر تین چار اور لڑکے لڑکیاں بے تکلفی کے ساتھ نیم دراز تھے ان کے درمیان ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا جیسے وہ سب کے سب اس سائنسی ایجاد کے گہرے پرستار ہوں!

ممتاز کو دیکھ کر سکینہ اچھل پڑی اور اپنے مخصوص بے تکان طریقے پر باتیں کر کے اس کا اوروں سے تعارف کرانے لگی۔ "آپ ذرا دیر سے پہنچے اگر آپ مقررہ وقت پر آتے تو آپ کو کافی کے ساتھ وہی بڑے بھی کھانے کو ملتے اب کافی پر ہی قناعت کرنی ہوگی —! یہ زاہدہ ہے یہ قمر یہ ریحانہ — یہ شاہد — یہ محمود!

وہ تیزی کے ساتھ بول رہی تھی۔ جیسے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ دینا چاہتی ہو یا شاید وہ تیز تیز بول کر اپنی گھبراہٹ کی سی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو سکینہ بے تکلفی کے ساتھ اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی ٹیپ ریکارڈر کے پاس لے گئی —! "تکلف برطرف آپ بھی یہاں ہمارے ساتھ زمین پر بیٹھ جائیے" اور وہ پھر اپنے ساتھیوں کو ایسے دیکھنے لگی جیسے اپنی باتوں پر داد طلب کر رہی ہو۔ وہ قالین سے زمینی فرش پر گدیلوں کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔

اور سکینہ نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ دبا دیا اور ٹیپ میں مقید ایک اداس مترنم آواز نے ایک غزل پڑھنی شروع کر دی۔ رسمیہ انداز کے تپے تلے مصرعے غزل کی روایتی بندشیں پھر بھی ممتاز کو اس مترنم آواز کی اداس کیفیت متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ نجانے غزل کے اشعار یوں ترنم سے پڑھتے وقت شاعروں کا موڈ خواہ مخواہ کچھ اداس کیوں بن جاتا ہے۔ سکینہ متوقع انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔ جیسے وہ بھی یہی سوال اس سے کرنا چاہتی ہو! جب ممتاز نے سکینہ کی طرف دیکھا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگی۔ "یہ غزل تو نہ جانے کس کی ہے، مگر پڑھی ہمارے ایک عزیز نے ہے۔ اُن کی آواز میں بیحد ترنم ہے"

ٹیپ ریکارڈر کی مترنم اداس آواز ابھرتی گرتی رہی اور ممتاز کو اس ڈرائنگ روم سے قالین سے مزین فرش پر نیم دراز لڑکوں اور لڑکیوں سے پٹنی کی خاموش فضا سے ایک بیزاری سی محسوس ہونے لگی۔ ایک وحشت جیسے کوئی اَن جانا جذبہ اس کو ان سب چیزوں سے دور کھینچ کر لے جانے پر آمادہ تھا۔ نہ جانے اگر وہ اپنے کو اس جذبے کے بہاؤ پر چھوڑ دے تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

ڈرائنگ روم کی فضا میں ایک غزل کا اور شعر گونجا —

آنکھوں میں ترے جلوے لئے پھرتے ہیں ہم لوگ
ہم لوگ کہ رسوا سرِ بازار ہوئے ہیں

سکینہ ایک دم سے بھدے پن کے ساتھ ہنس پڑی۔ اس نے کہا "نہ جانے رسوا سرِ بازار کیسے ہوتے ہیں"۔ اور وہ ممتاز کے چہرے کو ایک طنزیہ طور پہ مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگی۔ اس کی سہیلی اس کے اس فقرے پہ ہنس پڑی۔ اور ممتاز کی بیزاری ایکدم سے اور بھی بڑھ گئی۔ اس نے کچکچا کر کہا: "آپ لوگ اردو شاعری کے بجائے کسی اور چیز میں دلچسپی کیوں نہیں لیتے۔ اس کے بجائے فلمی گانے سنیئے۔ وہ آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اور فلمی گیتوں کی آواز میں ترنم بھی شاعروں سے زیادہ ہوتا ہے"۔ وہ شاید کچھ اور بھی کہتا لیکن وہ پھر کسی اضطراری جذبے کے ماتحت چپ ہوگیا۔ سکینہ اور اس کے ساتھی اس کی بات پر برہم ہونے کے بجائے بے حیائی کے ساتھ ہنسنے لگے۔ اور پھر ٹیپ ریکارڈر پر کسی نے مجاز کی پرانی مانوس نظم "آوارہ" الاپنی شروع کردی وہ نظم جو آج سے بہت عرصہ پہلے ایک مستقل حزنیہ گونج بن کر بے گنتی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے تحت شعور میں سما گئی تھی۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
اے غم دل .....

پشنی کی خاموش مضافاتی فضا میں رات کافی ڈھل چکی تھی۔ باہر تاریکی میں ہلکی ہلکی بوندیاں پڑ رہی تھیں جن کی ٹپ ٹپ ایک مسلسل تھاپ کی طرح ایک مدہم مدہم آہٹ کی مانند کبھی کبھی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ممتاز کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی۔ وقت کا سمندر ایک سُرعت کے ساتھ ماضی کی جانب بہہ رہا تھا۔ اب چند لمحوں بعد رات بیت جائے گی اور سکینہ اور اس کے ساتھی، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ماضی کی طرف بہہ جائیں گے۔ اور ممتاز خود اس ان دیکھے غیر مرئی پل کے ذریعہ ایک اور دنیا میں پہنچ جائے گا۔

ممتاز کسی نہ معلوم غیر متعین جذبے کے ماتحت قالین پر سے اٹھ کھڑا ہوا سکینہ کھوئے کھوئے انداز میں اس کو دیکھنے لگی۔ اس نے سکینہ کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے مناسب الفاظ تلاش کرنا چاہے لیکن سکینہ کے اس کھوئے کھوئے انداز نے اس کے ذہن میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ ممتاز نے جیسے اپنے تحت شعور کے اندرون ترین گوشے میں کسی ہستی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "نہ جانے یہ سکینہ جو ایک عامیانہ انداز میں سگریٹ پی سکتی ہے۔ اٹھلا اٹھلا کر باتیں کر سکتی ہے۔ اور جو بے معنی اور بے مقصد قہقہے لگا کر اپنے اردگرد مجتمع لوگوں کو اپنے عامیانہ انداز کا ایک جزو بنا لیتی ہے۔ یہ کبھی کبھی یوں کھوسی کیوں جاتی ہے اس کی آنکھوں میں یہ ویرانی کیوں جھلک آتی ہے لیکن ممتاز کے تحت شعور نے اس کو کوئی بھی جواب نہ دیا۔ اور دوسرے لمحہ سکینہ کی آنکھوں کی چمک۔ اور خوشی عود کر آئی۔ بارش کی ٹپ ٹپ کے شور کے باوجود مجاز کی نظم کی موسیقی ممتاز کا تعاقب کر رہی تھی۔

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجڑی جانے کس کی گود میں جائے یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی اے غم دل . . .

ممتاز تیز تیز قدموں سے بس اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے اپنی برساتی کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ جیسے وہ یوں اس نظم کے تاثر کو اپنے تک پہنچنے سے روک دینا چاہتا ہو۔ مگر وہ مترنم آواز ہو بہو ویسے ہی گرتی ابھرتی رہی، اس کا پیچھا کرتی رہی۔ ممتاز نے سوچا کہ اب سکینہ ضرور اپنے کسی ساتھی سے پوچھے گی۔ "بھیا یہ سینے میں ہوک کیسے اٹھتی ہے!" اور وہ سب کے سب ایک عامیانہ انداز میں ہنس پڑیں گے۔ جیسے اس نے کوئی بہت ہی اسمارٹ فقرہ کس دیا ہو۔ اور ٹیپ ریکارڈر اپنا نغمہ بدل دیگا۔ راک اینڈ رول شروع ہو جائے گا۔ اور سکینہ اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ دے گی اور اپنے سڈول اور خوب صورت جسم، اپنی آنکھوں کی شوخ چمک کو اپنے تمام وجود کو راک اینڈ رال کے زیر و بم کے سپرد کردے گی اور وہ سفید فام لڑکی جس نے اسکفورڈ اسٹریٹ کی ایک بڑی اسٹور میں ممتاز سے بہت سی بیکار بہت سی فالتو باتیں کہی تھیں۔ وہ لڑکی اپنی کسی ساتھی شاپ اسسٹنٹ سے کہے گی۔ گریٹ روڈی! تم نے کبھی یہ محسوس کیا کہ یہ کالی رنگت والے خواہ مخواہ بات بات پر کیسے بے حد جذباتی بن جاتے ہیں وہ کالی رنگت والا نوجوان، جو اس روز ہماری اسٹور میں آیا تھا، وہ شاید اب اپنے وطن کی سرزمین پر پہنچ چکا ہوگا اور وہ سوچ رہا ہوگا کہ اگر وہ اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر یہاں کسی فرنگی عورت کے جال میں پھنس کے رہ جاتا تو کیا ہوتا۔ پُوئر فول! اور پھر وہ سفید فام لڑکی اور اس کی ساتھی شاپ اسسٹنٹ اور سکینہ اور سب لوگ اپنی اپنی میکانکی زندگیوں میں منہمک ہو کے رہ جائیں گے۔ اور پشنی کی فضائیں گونجتے گونجتے مجاز کی نظم کا ترنم آپ ہی آپ ایک بڑے سناٹے کا ایک حصہ بن کے رہ جائے گا!

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

،، تلاش عام ،،

دور انقلاب کا مرقع نگار — صادقین

ایک تصویر (روغنی تراشی کی تکنیک)

ملک کا بدترین دشمن: ،، اسمگلر ،، — (کردار اور کمتر کردار) (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۱۱۱)

،، بهار ،،
عمل : رضیه فیروز

،، خزان ،، عمل : طلعت

دوسرا کنارہ

غلام الثقلین نقوی

رحمتے نائن نے کہا "شاداں ماشاءاللہ جوان ہو چکی ہے۔"

سیداں اناج پھٹک رہی تھی۔ اس نے چھاج کو ایک جھٹکا دیا اور کہا "لڑکیاں جوان ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ تو نے کون سی نئی بات کی؟"

رحمتے نائن کھسیانی ہو کر یونہی ہنس دی۔ دوسرے لمحے اس نے سنجیدہ بنتے ہوئے کہا "چودھرائن! شاداں تو تیری چھوٹی بہن لگتی ہے۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو تیری جوانی یاد آجاتی ہے۔"

سیداں نے دھیمے سے کہا۔ کیسی باتیں کرتی ہو؟ گزرے دن کیوں یاد دلاتی ہو؟"

"نہیں..... میرا مطلب تھا..... شاداں تیری جوانی کی تصویر ہے۔ چنبے کی کلی کی طرح نازک۔ کنوار گندل ایسا لچکتا ہوا بدن۔ چودھرائن! تیری آنکھوں کا جادو پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔"

سیداں نے مسکرا کر کہا "رحمتے! تو نائن نہیں میراثن ہے۔ تجھے کسی کے منہ پر تعریف کرنا خوب آتا ہے۔" "تیرا نائی کہہ رہا تھا چودھری کرم دین تو افیم کی پینک میں مست ہے جس کے گھر میں جوان لڑکی ہو اسے بھلا نیند کیسے آسکتی ہے۔"

سیداں کا چہرہ یکدم اداس ہو گیا۔ اس چہرے پر چند لمحے ہنسی کی دھیمی سی بہار تھی اور یہ ہنسی اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ گزری ہوئی جوانی کا ایک لمحہ اپنی پوری آب و تاب سے زندہ ہو گیا تھا۔ بیس سال پہلے کی جوانی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی آتی تھی اور بیس سال کا گرد و غبار ڈھل کر مطلع نکھر آیا تھا۔ پھر بیس سال آنکھ جھپکنے میں گزر گئے تھے!

نائن نے کہا "نائی کہہ رہا تھا کہ اب شاداں بی بی کا بیاہ ہو جانا چاہیئے۔"

سیداں نے نائن کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈال کر کہا "ہوں! اب پتہ لگا تو میری جوانی کے گن کیوں گا رہی تھی؟ نائیوں کا اور کام ہی کیا ہے؟ تیرے نائی سے کہہ دینا تجھے اپنے لاگ، سے غرض ہے۔ فکر نہ کر شاداں کے بیاہ پر اتنا دوں گی کہ ساری عمر کسی سے نہ ملا ہو گا۔"

رحمتے نے خوش ہو کر پوری بتیسی نکال دی۔ پھر اس نے متانت کا لبادہ اوڑھتے ہوئے کہا "اس گھر سے جھولیاں بھر بھر کر لیا ہے بی بی! لینے دینے کے سر پر خاک۔ ایک بات پوچھوں؟"

"کہو۔"

"شاداں کا ناطہ کہاں طے کیا ہے؟"

"کہیں بھی نہیں۔"

"تیرا نائی کہہ رہا تھا کہ چوہدری شاہ دین کا لڑکا شریف....."

"دیکھا جائے گا۔" سیداں نے تھوڑا سا چڑ کر کہا۔

رحمتے نائن نے حوصلہ نہ ہارا "میں نے تیرے نائی سے کہا شریف کے لچھن اچھے نہیں۔" اور پھر کچھ دیر سوچ کر اس نے ایک تیر اور چھوڑا "چوہدری لال دین کا بیٹا سرفراز....." نائن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سیداں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا "سرفراز..... پر چوہدری تو اس گھر کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔ جب کبھی اسے نشے کی ترنگ سے ہوش آتا ہے تو وہ لال کے خاندان کی تباہی کی بات کرتا ہے۔" رحمتے نے محسوس کر لیا کہ چودھرائن اس رشتے پر خوش ہے۔ اس نے کہا "سنا ہے سرفراز نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو ایسا شریف لڑکا نہ مل سکے گا۔"

"ہاں..... ہاں..... پر چوہدری کو کون راضی کرے۔"

اور اس اثنا میں شاداں باہر سے آگئی۔ بکھری ہوئی دھوپ میں شاداں نودمیدہ کلی کی طرح تر و تازہ لگ رہی تھی۔ شاداں دیہات کی روایات کے برعکس دھان پان تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا اور نازک تھا البتہ اس کے گالوں کے عین درمیان سرخیوں کے نقطے تھے جنہیں دھوپ

نے تمازت بخش دی تھی۔ بال سیاہ تھے اور آنکھیں شبنم کے قطروں کی طرح جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ شاداں کی چال میں نئی نئی جوانی کا تازہ تازہ شعور تھا اور اس شعور میں غرور نہیں تھا لیکن بلوغت کی آمد آمد کا لوچ ضرور تھا اور ان دیکھی خوشبوؤں کے وہ لطیف سانس بھی تھے جو بہار کے آتے ہی فضاؤں میں رچ جاتے ہیں۔

وہ نائن کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر وہ آگے بڑھ کر وہاں آ گئی جہاں سیداں بیٹھی ہوئی تھی۔ نائن نے اپنی نظر اس کے چہرے پر گاڑ دی۔ یہ نظر سر سے پاؤں تک چیونٹی کی طرح رینگتی رہی۔ یہ نظر شاداں کے ایک ایک انگ کو ٹٹول رہی تھی۔ شاداں بے چین سی ہو گئی۔ اس کے گال تمتمائے اور سرخیوں کے نقطے پھیلے۔ کانوں کی لویں تپنے لگیں۔ آنکھیں جھک گئیں اور پلکوں نے ان پر سایہ کر لیا تو نائن نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "بالکل تیری تصویر ہے چودھرائن! تیری کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی اس نے" شاداں شرماتے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ کمرے کے اندر چلی گئی۔ سیداں نے چھاج ایک طرف رکھ کر نائن کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ پھر یہ نظریں اپنے آپ ہی کھو گئیں اور اپنے آپ میں کھوئی ہوئی نظریں اپنے آپ سے بھی بے نیاز ہو گئیں۔ ان کا رشتہ اپنے ماحول سے ٹوٹ گیا تو نائن نے اٹھتے ہوئے کہا "میں جاؤں بی بی؟" سیداں نے بے خیالی میں سر ہلا دیا۔ نائن اٹھ کر چلی گئی تو شاداں باہر آنگن میں آ گئی۔ اس نے سیداں سے پوچھا "ماں! یہ نائن کیا کہہ رہی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ یونہیں ادھر ادھر کی باتیں۔"

"باقی اناج میں پھٹک دوں ماں؟" شاداں نے کہا۔

"نہیں تو اپنا کام کر۔" شاداں چپکے سے اندر گئی اور سوئی دھاگے والی پٹاری اٹھا لائی اور ماں کے پاس بیٹھ کر ایک دوپٹے پر پھول بوٹے کاڑھنے لگی۔ دونوں ماں بیٹی خاموش تھیں اور دونوں کام کرتے کرتے کچھ سوچ رہی تھیں۔ دونوں کے سوچتے ہوئے چہروں اور کھوئی کھوئی آنکھوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ دونوں کی آنکھیں خواب دیکھنے کی عادی تھیں۔ آنگن میں دھوپ کھلی ہوئی تھی اور ایک کونے میں بکائن کا ایک درخت تھا جس پر نئے نئے پتے آئے ہوئے تھے اور ان میں پھدکتی ہوئی چڑیوں کا ایک جھنڈ تھا۔ یہ چڑیاں چہک کر اڑ رہی تھیں اور اڑ اڑ کر چہچہا رہی تھیں۔ بکائن کے نیچے پتوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ کے دھبے کانپ رہے تھے۔ سیداں نے آخری بار چھاج پھٹکا اور ایک چلبلاتی ہوئی نظر شاداں کے چہرے پر ڈالی اور اسے اپنا وجود شاداں کے جسم میں گھلتا ملتا محسوس ہوا۔ پھول کی خوشبو کی طرح جو نظر نہیں آتی لیکن فضا میں رس بس کر اپنا وجود بھی نہیں کھوتی۔ شاداں جوان تھی۔ کلی کی طرح نازک تھی اور سورج مکھی کے پھول کی طرح دھوپ اور چمک دمک کی طرف مائل تھی لیکن۔ پھول کی نزاکت اندھیروں میں کب پنپ سکتی ہے۔ اندھیرے..... اور دنیا میں اجالا کہاں ہے؟ اندھیرے..... سیداں کی آنکھیں اداس ہو گئیں اور ان کے کونوں سے اندھیرے کا ایک غبار لپکا اور دھوپ کملا کر رہ گئی!

ڈیوڑھی میں کوئی کھنکارا اور پھر ایک نحیف و نزار جسم نے کھلے آنگن میں ایک منحنی سے سائے کا اضافہ کر دیا۔ سیداں چونک کر بھاگی۔ سائے میں سرد کپکپاہٹیں تھیں۔ اس کی نگاہیں ایک انجانے خوف سے کانپیں۔

"ماں بیٹی میں کیا ملی بھگت ہو رہی تھی؟" شاداں بھی چونک گئی۔

"کچھ بھی نہیں۔ تو نے ہمیں کوئی بات کرتے ہوئے سنا چودھری؟" سیداں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ چودھری کھلکھلا کر ہنسا ہا ہا... ...آ..... آ..... آج تکئے میں بڑا مزا رہا۔" سیداں نے کوئی توجہ نہ دی۔ "سیداں"! چودھری نے اسے متوجہ کرنے کے لئے ذرا خشونت سے کہا "آج لالی کو تکئے میں بڑی جوتیاں پڑیں۔" سیداں کسمسا کر رہ گئی۔ اس کے حساس چہرے پر ناگواری کا ایک زخمی جذبہ ابھر کر چھا گیا اور ہونٹ زرد پڑ گئے۔ "ساری پنچایت نے اسے جھوٹا کیا۔ عدالت میں اگلی پیشی پر ساری برادری میرا ساتھ دے گی۔ پھر دیکھنا چودھری کرم دین کی زمانے بھر میں واہ واہ ہو گی۔ شاداں! جا اندر سے ایک کھاٹ تو اٹھا لا۔"

شاداں بادلِ ناخواستہ اٹھی اور کھاٹ اٹھا لائی۔ دھوپ میں چارپائی بچھ گئی تو چودھری نے اس پر بیٹھتے ہوئے کہا "تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی ہے۔ برادری نے ساتھ دیا تو لالی بوریا بستر باندھ کر گاؤں سے چلا جائے گا۔ ہا ہا ہا...... چودھری نے قہقہہ لگا اور یہ قہقہہ آہستہ آہستہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر خرخر کی آواز کے ساتھ گلے میں دم توڑ گیا۔ شاداں نے ایک کھیس تہہ کر کے چارپائی کے سرہانے پر رکھ دیا۔ چودھری نے ڈب سے چمڑے کی ایک تھیلی نکالی اور تھیلی میں سے ایک ڈبیا نکال کر اسے کھولا اور ایک گولی

زبان پہ رکھ کر آنکھیں میچ لیں اور آہستہ آہستہ کھیس پر سر رکھ کر دراز ہوگیا۔ پتلے دبلے جھریوں سے بھرے چہرے پر مسرت کی ایک ترنگ آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔

سیداں نے اناج اکٹھا کیا اور ایک گٹھڑی میں باندھ کر اندر رکھ دیا۔ شاداں مونڈھے پر بیٹھ کر پھول کاڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ سیداں نے ایک نظر چوہدری کے چہرے پر ڈالی اور دوسری شاداں کے چہرے پر اور اس کے پتلے پتلے زرد ہونٹ کسی خفیہ جذبے کے تحت کانپتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں نمی کا ایک غبار جمع ہو کر کپکپانے لگا۔ سیداں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ لیں۔ چوہدری نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں، پلکیں جھپکائیں اور تیز دھوپ سے بچنے کے لئے پگڑی کا پلو آنکھوں پر کر لیا۔

اب سیداں کی آنکھوں میں نمی کا غبار نہیں تھا۔ ایک تلخ نفرت تھی جو کچلے ہوئے سانپ کی طرح بل کھا رہی تھی۔ اس نے دھیمے سے کہا "شاداں! تیرا باپ اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے"۔

"کیوں ماں؟" شاداں نے حیران ہو کر کہا۔

"آج برادری اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ کل اس کے منہ پر جوتی بھی مار سکتی ہے"۔

"ماں!" شاداں کی حیرت چیخ میں بدل گئی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں شاداں! دنیا ہارے ہوئے کو پاؤں تلے روندتی ہے پر جیتنے والے کا سر بھی چپکے سے کاٹ لیتی ہے"۔

"پر ماں! ماموں لال نے بھی تو کبھی ہار نہ مانی"۔

"ہاں!" سیداں اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

سارا جھگڑا ایک کھیت پر تھا۔ یہ کھیت چوہدری لال کی ایک لاولد ماسی نے اس کے نام ہبہ کر دیا تھا۔ کرم دین بھی اس زمین کا اپنے آپ کو حقدار سمجھتا تھا۔ مدت سے مقدمہ چل رہا تھا چوہدری کرم دین، چوہدری شاہ دین کے پاس مقدمہ لڑنے کے لئے تین کھیت رہن رکھ چکا تھا۔ چوہدری لال کوئی بڑا زمیندار نہ تھا پر تھا بڑا جی دار۔ جھگڑے والے کھیت کی ساری آمدنی مقدمے کی نذر کر کے بڑے فخر سے کہتا "کنوئیں کی مٹی کنوئیں میں ہی لگ جایا کرتی ہے۔ اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟" پھر لال اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عار نہ سمجھتا۔ منہ اندھیرے کام میں جُتتا تو شام تک ہل کی ہتھی سے ہاتھ نہ اٹھاتا۔ پھر جب پیشی کی تاریخ آتی تو اجلے کپڑے پہن کر عدالت میں جاتا۔ پنچایت میں بیٹھتا تو اس کی پگڑی کا طرہ ڈھیلا نہ پڑتا۔ برادری کو اس کی یہ پر وقار ادائیں ایک آنکھ نہ بھاتیں۔ اس لئے چپکے چپکے ایک ایک کر کے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

چوہدری لال میکے کی طرف سے سیداں کا قریبی تھا۔ سیداں کے ماں باپ مر چکے تھے اور سگے بھائیوں میں سے کوئی جوانی نہ پا سکا تھا۔ جب لال اور کرم دین کی آپس میں صلح تھی تو لال سیداں کا بھائی بن کر عید، شبرات کے تہوار پر اس کے گھر کچھ نہ کچھ ضرور بھجواتا۔ یہی ایک دو روپے، شکر اور سویاں اور سیداں کو محسوس ہوتا رہتا کہ اس کے میکے زندہ ہیں اور وہ سسرال والوں کے ہاں بے سہارا نہیں اور اب یہ سہارا بھی چھن رہا تھا اور سیداں کو اس بات کا بے انتہا قلق تھا۔ یہ جذباتی اور روحانی رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ دو خاندانوں میں مخالفت کی خلیج پھیل رہی تھی اور اب شاداں جوان تھی اور لال کا لڑکا سرفراز دسویں کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اس رشتے کا بیج مدت سے سیداں کے دل میں پرورش پا رہا تھا اور اب ننھا سا شگوفہ جڑ سے کٹ رہا تھا۔

سیداں مضطرب ہو کر اندر چلی گئی۔ زیادہ دیر تک دھوپ میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اندر خنکی تھی اور اندھیرا۔ وہ دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی چارپائی پر نڈھال اور نیم جاں ہو کر گر پڑی۔ اندھیرے میں رچی ہوئی خنکی تیکھے اور تیز احساس کا ایک تیر بن کر اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ اس کا جسم سن سے بیدار ہوا اور جاگ کر لرز گیا۔ ایک جھرجھری سی آئی اور رواں رواں نوکِ خار کی طرح تن گیا۔ اس تھرتھری، اس چونکی ہوئی لرزش میں جہاں تسکین کے مرہم کی ٹھنڈک تھی وہاں ایک دلدوز کرب بھی تھا جیسے زندگی خارج ہو رہی ہو، حال ماضی کی طرف دوڑ رہا ہو اور مستقبل نے حال کی تلخیوں میں پناہ لے لی ہو۔ ایک عجیب سا احساس جس میں درد کی شدت بھی تھی اور اس درد میں لذت بھی تھی۔ صبح کے پھوٹتے ہوئے نور میں شام کے سائے بھی تھے اور شفق کی سرخیاں بھی رچ رہی تھیں اور ان میں سیداں کا ماضی بھی زندہ ہوگیا تھا اس نے چارپائی کی پٹی پر سر رکھ دیا۔

"سیداں!" یہ آواز اس کے دل میں اتر گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ فضا خالی تھی۔ نہ جانے یہ آواز کون سے کونے سے ابھری تھی۔

لیکن یہ آواز بڑی میٹھی اور پیاری تھی۔ اس نے بھولے ہوئے نغمے کے دوسرے آہنگ کو روح میں رچا لینے کے لئے آنکھیں بند کر لیں ــــ "سیداں!"

"ہاں ہاں!"

"ہو جا نالے کے اس پار اپنے باپ کو روٹی دے آ۔"

سیداں نے لسی کا مٹکا سر پر رکھا اور کھدر کے رومال میں مکی کی دو بڑی بڑی روٹیاں لپیٹ لیں۔ چپڑی ہوئی روٹیوں پر پسی ہوئی لال مرچ اور نمک تھا۔

گاؤں کے باہر دھوپ تھی اور بہار کی اس دھوپ میں ٹھنڈک بھی تھی اور تیز تلخی بھی اور پگڈنڈی دھوپ کی ایک بل کھاتی ہوئی لکیر تھی جس کے دونوں طرف جوبن پر آئے ہوئے کھیت تھے۔ اس کا باپ نالے کے پار والے کھیتوں میں تھا اور نالے کے دونوں طرف شیشم کے بڑے بڑے اور پرانے تناور درخت تھے۔ ان کے گھنے پتوں میں ہریالی تھی اور دھوپ کی تیز چمک اس ہریالی میں جذب ہو گئی تھی۔ نالہ سوکھا ہوا تھا اور نالے کے دونوں کنارے اونچے اونچے تھے۔ نالے کے اندر شیشم کا گھنا سایہ تھا اور اس گھنے سائے میں تاریک خنکیاں تھیں اور آسمان اس سائے میں چھپ گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر تیز دھوپ شبنم کے چند قطرے نثار کر گئی تھی۔ وہ نالے کے عین درمیان گھنے سائے میں کھڑی ہو گئی اور شبنم اڑنے لگی۔ ایک ڈالی کے پتے دھیرے دھیرے کپکپائے اور ہوا کا ایک چھوٹی موٹی جھونکا بڑی شوخی سے اس کی پیشانی کو چھو کر پتوں میں گم ہو گیا۔ سیداں اس شوخی پر مسکرا دی اور اس مسکراہٹ کی ایک شوخ کرن سے ایک ہیولیٰ ابھرا۔ اس ہیولے نے اس کی مسکراہٹ میں سے جھانک کر کہا "چنبے کی کلی!"

سیداں بانسری کے نغمے کی طرح تھرتھرائی۔

"چنبے کی کلی!" سیداں نے سوچا "کون چنبے کی کلی؟"

"تو!" ایک نغمے نے تھرتھرا کر کہا۔ اب سیداں چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی "میں!" اور اسے باپ کی بھوک یاد آ گئی۔ اس نے ایک قدم بڑھایا۔ دوسرے نے رک کر کہا "سیداں! دیکھو تو سہی یہ کون ہے جس نے تجھے بانسری کا گیت بن کر پکارا؟" اور سیداں نے شرمائی شرمائی نظریں اٹھائیں تو مسکراہٹ کے نقرئی غبار میں سے دلاور کا چہرہ چاند کی ایک کرن کی طرح ابھرا۔ اس چہرے پر شوخی تھی اور آنکھیں اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے سیداں کا راستہ کیوں روک لیا تھا؟ "وے! میرے رستے سے ہٹ جا۔ دیکھتا نہیں میں اپنے باپو کو روٹی دینے جا رہی ہوں۔" سیداں نے شوخی سے کہا اور دلاور نے رستہ چھوڑ کر اپنے دل سے کہا "سیداں! تیرا غصہ کتنا پیارا ہے!" اور سیداں نے نجانے کیسے اس کے دل کی سرگوشی کو سن لیا اور اس نے واقعی غصے میں آنا چاہا اور اس کا جی چاہا کہ لال انگارہ بن کر کہے "جا! بڑا آیا سیداں سے پیار کرنے والا!" اور اس نے دلاور پر آگ برساتی ہوئی ایک نظر کا بھرپور وار کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا "چنبے کی کلی!" اور سیداں پھر چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی اور نظریں جھکائے ہوئے دوسرے کنارے پر چڑھنے لگی ....

"ماں!" سیداں نے کوئی جواب نہ دیا "ماں!" سیداں نے آنکھیں کھول دیں۔ "تو سو گئی تھی کیا؟" شاداں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" سیداں نے ایک نیم وا خواب آلود نظر شاداں پر ڈالی "کیوں شاداں! تو مجھے اس طرح کیوں پکار رہی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں یونہیں گھبرا گئی تھی۔ دیکھو تو سہی گھر میں کتنا سناٹا ہے!"

سیداں کی آنکھوں کے کونے تر ہو گئے۔ اس نے دیوار کی طرف منہ کر کے انگلیوں سے آنسو پونچھ لئے۔ باہر چارپائی پر چوہدری کرم دین نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں نیند اور بیداری عرصے تک آنکھ مچولی کھیلتی رہیں۔ دیر بعد آنگن کو خالی پا کر چوہدری نے کہا "سیداں!" سیداں نے کوئی جواب نہ دیا تو چوہدری نے چڑ کر کہا "ماں بیٹی نے پھر کوئی کہانی چھیڑ دی؟"

"کون سی کہانی؟" سیداں نے بجھی بجھی آواز میں کہا "ماں اگر بیٹی سے بات نہ کرے تو کس سے کرے؟"

"خالی آنگن سے!" چوہدری نے اترتے ہوئے خمار کی ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ سیداں نے پھر کوئی جواب نہ دیا تو چوہدری نے کہا "اتنے میرے گھر کو خالی دیکھ کر......"

"کہو چوہدری! بات پوری کرتے کرتے کیوں رہ گئے؟" سیداں نے تھوڑا سا چمک کر کہا۔

چوہدری اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ مونچھوں کو درست کیا۔ سرہانے رکھی ہوئی پگڑی کو سر پر جما کر

کہا "سیداں! تو نے ایک لڑکی کو چن کر بڑا تیر مارا۔ لوگوں کے آنگن بھر گئے پر تیری کوکھ تو بنجر زمین کی طرح سوکھ گئی۔"

"چوہدری! تیری اس بات سے اب مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔" سیداں نے خشک آواز میں کہا۔

"دکھ کیوں ہو؟ میں نے سدا تیرا خیال رکھا۔ اب تک دسوں سوکنیں لا بٹھاتا پر...." سیداں نے چوہدری کی بات کاٹ کر کہا، "اب لے آنا۔ تجھے روکتا کون ہے؟" اس سے پہلے سیداں چوہدری کے اس جملے پر چپکے ہو کر رو پڑتی تھی۔ آج اس کی بات میں تیزی اور تندی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ نہیں تھا۔ نچڑا نچڑا چہرہ تنا ہوا تھا۔ البتہ آنکھوں میں دیئے جل رہے تھے۔ چوہدری نے جوتیاں پہنتے ہوئے کہا "سیداں! آج تو نے پہلی بار آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کی۔" سیداں خاموش رہ کر بدستور اسے تکتی رہی اور اس کی آنکھوں میں دیئے ٹمٹماتے رہے۔ چوہدری نے اٹھ کر دروازے کی راہ لی تو سیداں کی بجائے شاداں رکے ہوئے طوفان کی طرح پھٹ رہی۔ اس نے سسکیاں بھریں تو سیداں نے بڑے پیار سے کہا "تو کیوں رو رہی ہے شاداں"؟

"ماں!" شاداں نے سیداں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ سیداں طوفان میں گھرے ہوئے مضبوط درخت کی طرح پہلے تن کر رہی۔ پھر ایک تیز ریلا آیا اور درخت بے بس ہو کر ہل گیا، آنکھوں کے دیئے شوں شوں بجھ گئے۔ اس نے شاداں کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "بیٹی! جب تک تیری ماں زندہ ہے تجھے کس بات کا ڈر؟"

"مجھے تیرا خیال ہے ماں۔"

"میری تو بیت گئی تو...." سیداں بات پوری نہ کر سکی۔

"ماں! ایک بات پوچھوں؟" شاداں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"پوچھو!"

"تو نے بابا کے گھر میں کوئی سکھ نہ پایا پر تو نے یہ پہاڑ ایسے دن کیسے بتائے؟"

"بیت گئے شاداں!"

"پر اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔"

"نہیں.... نہیں...." سیداں نے ماں بنتے ہوئے کہا۔ "کسی کو کیا پتہ شاداں! کیا خبر! دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔"

کہنے کو تو سیداں یہ بات کہہ گئی پر اسے اپنی بات پر خود شک ہوا۔ کیا یہ سچ تھا؟ سیداں آج سے بیس سال پہلے اس گھر میں آئی تھی۔ اس دن کی یاد اب تک باقی تھی۔ آج اس دن کو یاد کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ اس دن سیداں نے تقدیر کے سامنے یوں سر جھکا دیا تھا جیسے وہ قصائی کی چھری تلے آنے والی بھیڑ ہو۔ پھر وہ دن لمبا ہو کر اس کی ساری زندگی پر چھا گیا تھا۔ آج تک وہ ایک دن نہ بدل سکا تھا۔ وہی ایک دن جو روپ بدل بدل کر آتا رہا۔ وہی ایک دن جو کسی چمکیلی دھوپ کے جلو میں آتا، کبھی بادل اور دھند میں لپٹا ہوا، کبھی اندھیرا بن جاتا اور کبھی اجالا۔ سیداں اس ایک دن کو بِتا بِتا کر زندہ تھی۔ نجانے کیوں؟

آنگن کی دھوپ سمٹ کر مشرق کی دیوار کے ساتھ لگ گئی تھی۔ دھوپ زرد تھی اور دیوار کے ساتھ لپٹ کر کانپ رہی تھی۔ سایہ گہرا ہو رہا تھا اور اس میں ٹھنڈک رچ رہی تھی۔ سیداں کے جسم پہ کپکپی کی ایک لہر آئی۔ اس نے کہا "شاداں بیٹی! اٹھ چولھا گرم کر۔ دیکھ تو سہی شام ہو رہی ہے۔" شاداں اٹھ کر چولھے کے پاس جا بیٹھی تو سیداں نے سوچا "یہ دن جو بار بار آتا ہے گزرتا کیوں نہیں؟"

"سیداں! تم ہر ڈوبتے ہوئے دن کے ساتھ، جب شام کے سائے گہرے ہوں گے، اپنے جی سے کہو گی یہ دن گزرتا کیوں نہیں؟"

"نہیں دلاور! دن گزر جائیں گے۔" سیداں نے روتے ہوئے کہا "اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"سیداں! سوچ لے میں تجھے چناب کے اس پار لے جاؤں گا۔ ابھی چناب میں طوفان نہیں پر چناب بپھر گیا تو تجھے کنارہ نہیں مل سکے گا۔"

"نہیں۔" سیداں نے کہا اور دلاور نے اس پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی اور پھر چناب میں طوفان آ گیا۔ پہاڑ جیسی لہریں کناروں کو توڑ کر نکل گئیں اور سیداں کو دوسرا کنارہ پھر کبھی نہ مل سکا۔

"اس میں میرا کیا دوش؟" سیداں نے زیر لب کہا۔

"دوش کس کا ہے؟" ایک آواز نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تقدیر کا۔" سیداں نے جواب دیا "سوہنی چناب کی موجوں سے لڑی پر اسے کنارہ نہ مل سکا۔"

"لیکن تو نے لڑے بغیر ہاسان لی سیداں۔ اب تو ہر روز چناب کی لہروں میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی ہے اور ابھر ابھر کر ڈوبتی ہے۔" سیداں نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے۔ وہ طوفان سے ڈر گئی تھی اور ابھی طوفان آیا بھی نہ تھا پر اس نے گھپ اندھیری رات میں طوفان کا شور سنا تھا۔ اس میں سوہنی کی چیخیں تھیں، ہیر کے بین تھے اور صاحباں کے دل کا درد تھا۔

"میں نے آج تک شکایت نہ کی۔ میں ہر غم کو چپکے چپکے سہتی رہی۔ میرے ہونٹوں پہ آہ تک نہ ابھری۔ میرا پیار میرے دل میں بیج کی طرح پھوٹا۔ میں نے کونپل کو پروان چڑھایا اور اسے کسی نے نہ دیکھا۔ پھر میں نے اسے اپنے ہاتھوں مسل دیا۔" سیداں کی سرگوشیاں ہونٹوں تک پہنچ گئیں تو شاداں نے حیران ہو کر پوچھا "ماں تو کس سے باتیں کر رہی تھی؟"

"کسی سے نہیں۔" سیداں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور پھر وہ اچانک چونک کر بولی "شاداں! دیکھ لڑے بغیر ہاسان جانے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔"

"ماں!" شاداں کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"آج پہلی بار میں نے تیرے باپ کی جلی کٹی باتوں کا جواب دیا۔ میں نے بیس سال اس گھر میں گذارے۔ میں نے ایک دن گزار کر یہی سمجھا کہ دوسرا دن میرا ساتھ دے گا پر وہ دن کبھی نہ آسکا۔"

"ماں! پھر اس میں کس کا دوش ہے؟"

"میرا۔"

"نہیں تقدیر کا۔"

"شاداں!" سیداں کی آواز میں غصے کی چمک تھی "آج رحمتے نائن کہہ رہی تھی تو میری جوانی کی تصویر ہے۔ دیکھ شاداں! میں نے تقدیر پر بھروسہ کیا پر اس نے میرا ساتھ نہ دیا۔ تو بھی اگر میرے راستے پر چلی تو تقدیر تیرا گلا گھونٹ دے گی۔"

سیداں کا غصہ گلوگیر ہو گیا۔ شاداں کے روپ میں اس نے اپنی بے بس جوانی کو دیکھا تو اس کا غصہ ابلتے پانی کی طرح اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑا۔ یہ جلتے بلتے آنسو آگ کے انگارے تھے۔ ان شعلوں نے ساری دنیا کو آگ لگا دی تھی۔ شاداں نے ماں کو روتے ہوئے دیکھا تو چولہا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ماں کے گلے میں بازو ڈال کر کہا "ماں! تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں شاداں! جا اپنا کام کر۔"

★

رحمتے نائن نے آنگن میں قدم رکھا تو سیداں نے جھٹ سے کہا "کیوں رحمتے! آج پھر کوئی نئی بات سوجھی ہے تجھے؟"

"نہیں تو بی بی!"

"پر تو دیکھتی ہے شاداں جوان ہو چکی ہے۔" سیداں کی مسکراہٹ میں طنز تھی۔

"ہاں بی بی..... تو نے کچھ سنا؟"

"نہیں تو.....؟"

"چوہدری لال کو مقدمے میں ہار ہو گئی۔"

"پھر کیا ہوا؟" سیداں نے مسکرا کر کہا "اس نے مقدمہ لڑا پر اپنے کھیت تو رہن نہ رکھے۔ ایک کھیت کے لئے تین کھیت رہن رکھ کر جیتنے والے کو کیا ملا؟"

"پر بی بی! گاؤں والے چوہدری لال کو ہار دے کر بہت خوش ہیں۔"

"آج ان کی باری ہے۔ کل چوہدری لال کی باری ہو گی۔"

"بی بی! شاداں کی بات کا کیا بنے گا؟"

"کیا بنے گا؟" سیداں کی لرزتی ہوئی آواز میں اچانک اٹھنے والی لہر کا جوش تھا "جب تک میں زندہ ہوں۔ شاداں کو کیا خطرہ ہے؟"

رحمتے نائن زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے ناخن سے زمین کریدتے ہوئے نظریں جھکا کر کہا "لوگ ایک اور بات بھی تو کہہ رہے ہیں!"

"کیا؟"

"کیسے کہوں بی بی؟"

"کہو"

"چوہدری اپنا بیاہ رچا رہا ہے اس کلموہی ڈائن سے..... شاہ دین کی سالی سے.....؟"

"سچ؟" سیداں نے مسکرا کر پوچھا۔ رحمتے نائن نے اس مسکراہٹ کو دیکھا، تو اس کا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا "بی بی..... بی بی.....؟"

"رحمتے!" سیداں کی آواز میں خوشی کی لرزشیں تھیں "تیرے منہ میں گھی شکر۔ ذرا ٹھہر تو!" اور سیداں تیر کی طرح مکان کے اندر گئی۔ ایک تھال میں گڑ کی بھیلیاں رکھ کر جھپاک سے آنگن میں آ گئی "لے رحمتے!

تیرا منہ تو میٹھا کرا دوں۔" رحمتے نائن نے احتجاج کے لئے منہ کھولا تو سیداں نے ہنستے ہنستے ایک بھیلی اس کے منہ سے چھوڑ دی" بی بی! کیا کر رہی ہو یہ بھی کوئی خوشی کی بات ہے؟" اور سیداں کے ہاتھ سے بھیلی خود بخود گر پڑی اس کی ہنسی اس کے گلے میں پھنس گئی تمتمایا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا اور آنکھوں کی غیر فطری آگ بجھ گئی رحمتے نائن نے مڑ کر دیکھا تو شاداں کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"شاداں! تو رو رہی ہے۔ تیرے ماموں لال کو مقدمہ ہار نا پڑا پر مرد اتنی چھوٹی سی بات کو کیا سمجھتے ہیں؟"

"نہیں ماں یہ بات نہیں"

"تیرا باپ دوسرا بیاہ کر رہا ہے تو کیا ہوا؟ مرد عورت کو سدا پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ جب چاہا بدل لیا۔"

"نہیں ماں، یہ بات بھی نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے شاداں؟"

"ماں!" شاداں کے آنسو بولنا چاہتے تھے لیکن بول نہ سکے لیکن شاداں چاہتی تھی کہ سیداں ان آنسوؤں کا لرزتا ہوا پیغام خود پڑھ لے "ماں" شاداں نے مایوس ہو کر کہا "وہ شریف ہے نا!" اور شاداں کا بھیگا ہوا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور گالوں پہ ٹپکے ہوئے آنسو بھی تمتما کر رہ گئے۔

"ہاں!" سیداں نے تڑپ کر کہا "ہاں کہو۔"

"نجانے کیوں، ماں!...... اس نے کئی بار میرا راستہ روک لیا...... میں نے منہ سے ایک لفظ نہ کہا...... میں کترا کر نکل جاتی رہی اور ماں! میں لاج کے مارے تجھ سے کچھ نہ کہہ سکی..... پر آج اس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھ دیا.... میں نے ڈر کر کہا تو کیا چاہتا ہے بول۔ میرا ہاتھ چھوڑ دے۔ میں اپنے بابا سے کہوں گی۔ اس نے ہنس کر کہا شاداں! تو تو اپنے گھڑے کی مچھلی ہے پر میں نے چاہا تھوڑا سا ہیر رانجھے کا کھیل بھی کھیل لوں۔ دیکھو شاداں! پیار کا رس تو میں اس وقت تیرے کانوں میں گھولوں گا جب تو گھونگٹ کاڑھے سر نہوڑائے اپنے پیتم کی راہ دیکھ رہی ہو گی..... آج..... پر ماں..... نجانے سرفراز کہاں سے آ گیا اس نے کہا شریفے گاؤں کی لڑکیوں پہ ہاتھ ڈالنا آسان نہیں شریفے نے میری کلائی چھوڑ دی اور پھر وہ دونوں لڑ پڑے.... ماں! میں بھاگ آئی...... سرفراز!...."

"سرفراز مرد ہے شاداں! تو فکر نہ کر۔"

"پر ماں! شریفے نے یہ کیوں کہا شاداں! تو تو اپنے گھڑے کی مچھلی ہے۔" سیداں کا بند بند غصے سے کانپ گیا اور پھٹ سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور چوہدری کرم دین ہاتھ میں حقہ لئے آنگن میں آ گیا۔ اس کا طرہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور منحنی سا جسم فخر اور جیت کے اظہار کے لئے تنا ہوا تھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا "چودھرائن! لال اگر ذرا سا غیرت مند ہو تو گاؤں سے منہ چھپا کر نکل جائے۔"

"چوہدری!" سیداں نے تن کر کہا "لال کو گاؤں سے نکلنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ مرد ہار جیت کی پروا نہیں کرتے پر تو اگر غیرت مند ہو تو گاؤں چھوڑ کر کہیں منہ چھپا لے۔ اب لوگ تیری عزت پر ہاتھ ڈالنے لگ گئے ہیں۔"

"سیداں!" کرم دین نے کہا "میری عزت سے کھیلنا آسان نہیں۔ وہ کون ہے جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا؟" "شاہ دین کے لڑکے شریف نے گلی میں شاداں کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے کہا شاداں! تو تو اپنے گھڑے کی مچھلی ہے۔" کرم دین نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چار پائی پہ بےدم ہو کر گر پڑا۔ اس کا طرہ خود بخود سرنگوں ہو گیا۔

"کیا کہا؟ شاہ دین کے لڑکے شریف نے؟ اسے اتنی بڑی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تو نے تین کھیت جو اس کے باپ کے پاس رکھ دیے ہیں۔"

کرم دین نے چار پائی پر لیٹ کر مری ہوئی آواز میں کہا "میں نے کھیت رہن رکھے سیداں! اپنی عزت رہن نہیں رکھی تھی۔ شاداں! ایک کھیس میرے سر کے نیچے رکھ دے۔" شاداں کھیس لے کر آئی تو کرم دین نے ایک نظر اس کے سراپے پہ ڈالی اور اس ایک نظر میں حسرت کی تلخیاں رچی ہوئی تھیں۔

"سیداں! کاش تو ایک بیٹا بھی جن لیتی۔ آج میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت کون کرتا؟"

"چوہدری!" سیداں نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا اور چوہدری نے حقے کی نے پر منہ رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

★

"سیداں بی بی!" رحمتے نائن نے کہا۔

"کہو آج کون سی نئی خبر لے کر آئی ہو؟" سیداں نے تلخی سے پوچھا۔

(باقی ص ۱۲۹ پر)

ڈرامہ:

"ستاروں کی چال"

انور عنایت اللہ

افراد

افضل:- ایک نوجوان۔ عمر تقریباً تیس سال۔

سیمیں:- افضل کی جوان بہن جو اس سے تقریباً تیرہ سال چھوٹی ہے

ظہیر:- ایک دولتمند نوجوان۔ عمر تقریباً چھتیس سال

صفیہ:- افضل کی منگیتر۔ عمر تقریباً پچیس سال۔

[افضل کے کمرہ سے پردہ اٹھتا ہے۔ اس فلیٹ میں صرف ایک کمرہ خاصا کشادہ ہے دائیں طرف لکڑی کی اسکرین لگا کر اس کے دو حصے کئے گئے ہیں جو حصہ نظروں سے اوجھل ہے وہ دونوں بھائی بہن کی خوابگاہ کا کام دیتا ہے۔ بقیہ حصہ کو ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بائیں طرف، ونگ میں اس فلیٹ کا صدر دروازہ ہے جو اندر سے بند ہے۔ اس سے ذرا پرے ایک کھڑکی جس پر ریشمی پردے پڑے ہیں۔ دروازوں پر بھی پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے بیچوں بیچ ایک اور دروازہ ہے جس کی دوسری طرف غالباً باورچی خانہ اور غسل خانہ ہے۔ کمرہ نسبتاً معقول فرنیچر سے سجایا گیا ہے۔ ایک طرف فٹ لائٹ کے قریب تپائی پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ سینٹر ٹیبل پر رسالے پڑے ہیں۔ ایک رسالہ صوفے پر کھلا پڑا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ریڈیو بھی کھلا ہوا ہے، دھیمی سی آواز ہے۔ پردہ اٹھنے پر اسٹیج خالی ہے۔ شام کا وقت۔ یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور کچھ دیر تک بجتی رہتی ہے۔ کوئی نہیں آتا۔ پھر خوابگاہ میں سے سیمیں تیزی سے اسٹیج پر آتی ہے حسین ناک نقشہ۔ صحت مند جسم۔ اس وقت صرف شلوار اور قمیص میں ہے۔ غالباً وہ اندر کپڑے بدل رہی تھی۔ دوپٹہ جلدی میں بھول آئی ہے۔ سر کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ میں کنگھی، وہ ریسیور اٹھاتی ہے]

سیمیں: ہیلو! مسٹر افضلز ریزیڈنس ہیئر۔ جی کون؟ ان کے اسٹینو! کتنی دیر لگے گی صاحب کو؟۔ اچھا، کیا نام بتایا آپ نے؟ مہربانی کر کے ذرا آہستہ فرمایئے۔ بشیر صاحب؟۔ جی؟۔ ظہیر صاحب؟ اچھا، دیکھئے صاحب کانفرنس سے فارغ ہوں تو ان سے کہئے گا میں باہر جا رہی ہوں، لیکن گھر پر ملازم رہے گا۔ جی شکریہ۔

(ریسیور رکھ دیتی ہے اور پھر کچھ سوچ کر ایک نمبر ملاتی ہے اس وقت گنگنا رہی ہے)

سیمیں: ہیلو! دیکھئے مجھے شاہد صاحب سے بات کرنی ہے۔ جی؟۔ کہیئے گا میں شمسی۔ بہتر۔ (وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر گنگنانے لگتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد) ہیلو! کون شاہد؟۔ سیمیں ہیئر۔ ارے بھئی بالکل تیار ہوں۔ ابھی تو صرف (دستی گھڑی دیکھ کر) چھ بجے ہیں شو تو ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا ہے۔ ہاں ہاں، پہنچ جاؤنگی یہ فون کس نے ریسیو کیا تھا؟۔ لینڈ لیڈی صاحبہ؟ عجیب شئے ہیں یہ بھی! جب بھی فون کرتی ہوں نام ضرور پوچھتی ہیں۔ دراصل میں نے فون اس لئے کیا تھا کہ تمہیں اخباروں کے بارے میں یاد دلاؤں۔ بھولنا نہیں، کل میرا سکول بند ہے دن بھر مکان ڈھونڈوں گی خدا حافظ! (ریسیور رکھ دیتی ہے۔ مڑ کر ریڈیو بند کر دیتی ہے اور تیزی سے خوابگاہ میں چلی جاتی ہے۔ جاتے ہوئے کنگھی کئے جاتی ہے۔ اسٹیج ایک بار پھر خالی ہے۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے۔

(سیمیں اندر ہی سے جواب دیتی ہے)

سیمیں : (چیخ کر) کون ؟ زمان خان ؟ ۔ دروازہ کھلا ہے ، حد ہو گئی بھئی ! اب آ رہے ہو ؟

(دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے اور صفیہ داخل ہوتی ہے۔ وہ دبلی پتلی نازک سی لڑکی ہے۔ یوں تو وہ عمر میں سیمیں سے بڑی ہے لیکن ایسی معلوم نہیں ہوتی۔ شکل صورت بھی سیمیں سے بہت اچھی ہے۔ اس وقت ہلکے گلابی رنگ کی سادہ ساڑی میں ملبوس۔ سر کے گھونگریالے بال شانوں تک کٹے ہوئے چہرہ پر ہلکا سا میک اپ)

صفیہ : (اندر آ کر) کہاں کی تیاری ہے سیمیں ؟ (پرس تپائی پر رکھ کر صوفہ پر بیٹھ جاتی ہے اور ایک باتصویر رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے)

سیمیں : (اندر سے) اوہ ! صفیہ باجی ؟ معاف کیجئے، میں نے زمان ہو گا۔ کمبخت دوپہر تک کی چھٹی لے کر گیا تھا۔ آپ بیٹھئے۔ بس میں ابھی آئی۔

صفیہ : کہاں کی تیاری ہے ؟ پکچر

سیمیں : جی ہاں، لاہور سے ایک سہیلی آئی ہوئی ہے

صفیہ : سہیلی ؟

سیمیں : (فوراً) جی ہاں (خوابگاہ سے باہر آ جاتی ہے اور باہر جانے کے لئے تیار ہے۔) آداب صفیہ باجی !

صفیہ : (بزرگانہ انداز میں) جیتی رہو بیٹیا ! (مسکرا کر) کونسی فلم ہے ؟ میں بھی چلوں تمہارے ساتھ ؟

سیمیں : (گھبرا کر) آپ ؟ ہاں ہاں کیوں نہیں ۔ لیکن ۔ آج پہلا دن ہے۔ ہم نے کئی دن ہوئے بکنگ کرا رکھی تھی (بیٹھ جاتی ہے)

صفیہ : (مسکرا کر) گھبراؤ نہیں سیمیں بیگم ! ہم نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا۔ ویسے ہم آپ کے ان "سہیلی صاحب" سے خوب واقف ہیں !۔

سیمیں : جی ! اوہ صفیہ باجی، آپ بھی ۔ !

صفیہ :۔ (فوراً) ارے بھئی، گھبراؤ نہیں ہم تو تمہارا ساتھ دینگے ہی (سنجیدگی سے) لیکن سیمیں ! تمہارے بھائی جان اس انتخاب سے سخت خفا ہیں۔

سیمیں : کیوں باجی ؟ کیا خرابی ہے شاہد میں ؟ بھائی جان نے اپنے لئے لڑکی خود ہی چنی۔ اب یہی حق وہ مجھ سے کیوں چھیننا چاہتے ہیں ؟

صفیہ : صرف اس لئے کہ ان کا خیال ہے تم ابھی ناتجربہ کار ہو اور یہ دنیا بے حد مکار ہے سیمیں۔

سیمیں : جی ہاں، جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں ! بھائی جان اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں مجھے یقین تھا وہ مجھے بھی اپنی پسند سے شادی کی اجازت دے دینگے لیکن اب لگتا ایسا ہے جیسے مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

صفیہ : (خشک لہجے میں) اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں ! (یوں کہتی ہے جیسے اس نے سیمیں کی بقیہ باتیں سنی ہی نہیں) وہ تو چار سال سے اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں !

سیمیں : چار سال ؟ منگنی کو چار سال ہو گئے ؟ ! (جیسے یہ کہنا چاہتی ہو کہ وقت کتنی تیزی سے گذر جاتا ہے)

صفیہ :۔ (آہستہ سے) ہاں، چار سال ! (مختصر سا وقفہ۔ دونوں خیالوں میں کھو جاتی ہیں)

سیمیں :۔ (آہستہ سے) میں جانتی ہوں آپ لوگوں کی شادی اب تک کیوں ملتوی ہوتی رہی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں۔ یہ چار سال آپ دونوں کے لئے کس قدر پہاڑ سے گذرے ہوں گے۔ اس کمبخت شہر میں دنیا کی ہر نعمت مل جاتی ہے۔ مگر نہیں ملتا تو گھر ہی نہیں ملتا۔ بھائی جان کو پچھلے مہینے اپنے گزیٹیڈ ہونے کی اتنی خوشی صرف اسی لئے ہوئی تھی کہ انہیں یقین تھا اب انہیں سرکاری گھر ضرور مل جائے گا۔ پھر بھی سنا ہے انہیں کئی مہینے انتظار کرنا ہوگا۔

صفیہ :۔ (خاصی بیزاری سے) کئی مہینے۔

سیمیں :۔ مجھے سخت شرمندگی ہے صفیہ باجی ! میری وجہ سے آپ لوگوں کی شادی کھٹے میں پڑ گئی ہے لیکن دیکھئے۔ شاید جلد ہی کوئی صورت نکل آئے۔

صفیہ :۔ (اکتا کر) کیا صورت نکل آئے گی ؟ میں نے سنا ہے شاہد بھی اب تک بے گھر ہی ہیں۔

سیمیں :۔ جی ہاں، لیکن ہم دونوں نے چھوٹے موٹے فلیٹ کی

کوشش شروع کر دی ہے۔ آجکل بہت سے گھر خالی ہو رہے ہیں۔ (یکایک گھڑی دیکھ کر) اف اوہ! چھ بج ہو گئے۔ (جلدی سے اٹھ کر) معاف کیجئے۔ شاید انتظار کر رہے ہوں گے۔ آپ کچھ دیر انتظار کر لیجئے گا۔ بھائی جان آ ہی رہے ہوں گے۔ ان کے کوئی دوست بھی آ رہے ہیں۔ کوئی ظہیر صاحب! اچھا خدا حافظ۔ صفیہ باجی! (تیزی سے پرس لے کر چلی جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد صفیہ ٹھنڈی سانس لیتی ہے۔ اٹھ کر ریڈیو تک جاتی ہے اور ایک اسٹیشن ٹیون اِن کرتی ہے۔ یکایک صدر دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ گھنٹی دوبارہ بجتی ہے وہ جا کر دروازہ کھولتی ہے۔ افضل داخل ہوتا ہے — سانولا رنگ، قبول صورت۔ سر کے بالوں سے پتہ چلتا ہے جیسے بہت جلد گنجا ہو جائے گا۔ سوٹ پہنے ہوئے ایک ہاتھ میں چرمی بیگ۔ دوسرے میں کئی تھیلیاں، چہرہ سے تھکا ہوا لگ رہا ہے)

افضل :۔ (صفیہ کو خلاف توقع دیکھ کر خوشی سے) اوہ! صفو؟ تم؟ کب آئیں؟

صفیہ :۔ ابھی ابھی آئی ہوں۔ (دروازہ بند کر کے مڑتی ہے۔ افضل کے ہاتھ سے اس کا بیگ لے لیتی ہے۔ وہ تھیلیاں ایک طرف میز پر رکھ دیتا ہے۔ دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

افضل :۔ سیمیں چلی گئی؟

صفیہ :۔ ابھی ابھی گئی ہے۔ تمہیں آج بہت دیر ہو گئی۔

افضل :۔ ہاں، آجکل کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ روز چھ بج جاتے ہیں۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میرا ارادہ آج رات کھانے کے بعد تمہارے یہاں جانے کا تھا۔

صفیہ :۔ چائے لے آؤں؟

افضل :۔ ہاں، سر میں سخت درد ہے۔ (پیشانی کو دائیں ہاتھ سے دباتا ہے) زمان کہاں ہے؟

صفیہ :۔ چھٹی لے کر گیا تھا، اب تک نہیں آیا۔ میرے خیال میں تم نہا لو تو تھکن دور ہو جائے گی میں اتنی دیر میں چائے بنا لوں گی (رک کر) سنا ہے کوئی ظہیر صاحب آنے والے ہیں

افضل :۔ ہاں چائے ان ہی کے ساتھ پی لیں گے۔ (گھڑی دیکھ کر) چھ بجے آنے کو کہا تھا۔ چھ بج ہو گئے۔

صفیہ :۔ کون ہیں یہ؟ میں نے تو کبھی تم سے ان کا نام نہیں سنا

افضل :۔ خاصا کام کا لڑکا ہے۔ ظہیر قادری نام ہے۔

صفیہ :۔ ظہیر قادری؟ وہی تو نہیں جن کی نئی کوٹھی پر رقص و سرود کی محفل جمی تھی، اور اس میں کئی فلم اسٹاروں نے حصہ لیا تھا! یاد نہیں تمہیں؟ پبلک نے گانا سننے کے لئے دھاوا بول دیا تھا؟ پولیس کو آنا پڑا تھا۔ اردو اخباروں میں تو بڑی تفصیلی خبریں آئی تھیں۔

افضل :۔ اچھا؟ اپنی مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ اخبار پڑھے مہینے ہو گئے۔

صفیہ :۔ تم کب سے جانتے ہو انہیں؟ سنا ہے لکھپتی ہے۔

افضل :۔ ہاں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کے والد امپورٹ لائسنسوں کے لئے ہمارے دفتر کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ لکھپتی بن گئے باپ مرے تو اکلوتے بیٹے کو کئی لاکھ کی جائداد مل گئی شہر میں چار تو نہایت عمدہ کوٹھیاں ہیں ان کی۔

صفیہ :۔ چار کوٹھیاں؟ تب تو برخوردار کے عیش ہوں گے۔

افضل :۔ مزے کرتا ہے (آہستہ سے) دراصل آج میں نے ایک خاص مقصد کے لئے بلایا ہے۔

صفیہ :۔ خاص مقصد کے لئے؟

افضل :۔ ہاں۔ (رازدارانہ لہجے میں) میں سیمیں کو اس سے ملانا چاہتا ہوں۔ بڑا اسمارٹ لڑکا ہے صفو۔

صفیہ :۔ (یکایک سب کچھ سمجھ کر) اوہ! تو یہ بات ہے، لیکن افضل سیمیں کو شاہد سے محبت ہے۔

افضل :۔ جانتا ہوں، اسی لئے تو سخت پریشان ہوں۔

صفیہ :۔ تمہیں شاہد سے کیا شکایت ہے؟

افضل :۔ سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس کے پاس رہنے کو علیحدہ گھر نہیں ہے۔ (اسے سمجھاتے ہوئے) اوہ صفو! یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ سیمیں کی شادی شاہد سے اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کے

پاس علیحدہ گھر نہ ہو وہ ایک جگہ پے ینگ گیسٹ کے طور پر رہتا ہے جہاں سب کنوارے ہی رہتے ہیں۔ وہاں سیمیں کیسے رہ سکے گی؟ میں چاہتا ہوں اب اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ آخر ہم دونوں کب تک صرف منگیتر ہی رہیں گے؟

صفیہ :۔ تو جناب نے اسی لئے آج ایسے نوجوان کو چائے پر بلایا ہے جو حسین ہے، دولتمند ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی ایک نہیں بلکہ چار نہایت عمدہ کوٹھیاں ہیں؟

افضل :۔ (خوش ہو کر) شاباش! اب دعا کرو میری اسکیم کامیاب ہو جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی سے اکتا گیا ہوں۔ منگنی کو چار سال ہو رہے ہیں اور شادی صرف اس لئے نہیں ہو سکتی کہ اس کمبخت ایک کمرہ کے فلیٹ میں جوان کنواری بہن بھی رہتی ہے۔ (یکایک فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ اٹھ کر ریسیور اٹھاتا ہے)

افضل :۔ ہیلو! افضل ہیر۔ کون؟ ظہیر صاحب؟ — ہاں بھئی — بس آ جاؤ کتنی دیر لگے گی؟ — بیس پچیس منٹ؟ بہت بہتر، ہاں۔ چوتھی منزل پر ہے۔ باہر میرے نام کی تختی لگی ہے۔ خدا حافظ! (ریسیور رکھ دیتا ہے) بس وہ آ ہی رہا ہے۔ (جھنجھلا کر) یہ سیمیں کہاں چلی گئی؟ اس کا تو اب گھر میں جی ہی نہیں لگتا۔ ظہیر بے حد مصروف آدمی ہے بڑی مشکل سے تو اس نے وقت نکالا ہے۔ نہ جانے پھر آئے یا نہ آئے مجھے تو اس لڑکی نے بہت ستا رکھا ہے۔

صفیہ ہو سکتا ہے سہیلی نے روک لیا ہو۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اس کے سامنے سیمیں کی ایسی تعریفیں کروں گی کہ وہ بغیر دیکھے ہی ریجھ جائے گا۔ مطمئن رہو۔

افضل :۔ اسے اب میں نے تو مہینے بھر سے تعریفیں کر کے اس کا اشتیاق بڑھا رکھا ہے۔ اسی لئے تو سخت کوفت ہو رہی ہے۔

صفیہ :۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ جا کر نہا لو۔ ہو سکتا ہے سیمیں لوٹ آئے۔ اور نہ بھی آئی تو میں معاملہ سنبھال لوں گی۔ تم نہانے میں خاصا وقت لیتے ہو کہیں وہ آ نہ جائے۔

افضل :۔ اب تو نیا خوالہ کے حوالے ہے (ٹھنڈی سانس لے کر) میں چلنے سے پہلے کچھ چیزیں لیتا آیا ہوں۔ (یہ کہہ کر وہ خوابگاہ میں چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد کچھ سوچ کر صفیہ اٹھتی ہے۔ غور سے خوابگاہ کی طرف دیکھتی ہے جیسے یہ یقین کر لینا چاہتی ہو کہ افضل اندر ہی ہے پھر چپکے سے ریسیور اٹھاتی ہے اور ایک نمبر ڈائل کرتی ہے۔ نظریں خوابگاہ ہی کی طرف ہیں)

صفیہ :۔ (آہستہ سے) ہیلو؟ کون تابندہ؟ صفیہ ہیر۔ سنو بھئی۔ آج رات کا پروگرام منسوخ۔ ہاں ہاں، ہے کچھ ایسی ہی بات۔ تم چاہو تو کل کی بکنگ کرا لینا بھئی، نہ سے آج ہی رہے۔ اس وقت نہیں بتا سکتی۔ کل کالج سے فون کر لوں گی۔ خدا حافظ۔ (یکایک افضل خوابگاہ سے باہر آتا ہے۔ اس وقت وہ بیدنگ گاؤن میں ہے نہانے جا رہا ہے)

افضل :۔ (دور ہی سے) کسے فون کر رہی تھیں؟

صفیہ :۔ (گھبرا کر) فون؟ (ریسیور اب تک ہاتھ میں ہے) ہاں، ایک سہیلی نے آج رات کھانے پر بلایا تھا۔ اسے بتا رہی تھی کہ آج وہاں نہ پہنچ سکوں گی۔ پتہ نہیں یہاں کتنی دیر ہو جائے۔

افضل :۔ (خوش ہو کر آگے بڑھتا ہے) تم نے بہت اچھا کیا صفو! ظہیر کے جانے کے بعد ہم چل کر کہیں باہر کھانا کھائیں گے۔ پھر وقت ملا تو پکچر دیکھیں گے۔ خدا کی قسم! زندگی اس قدر مار بڈ ہو گئی ہے کہ تم سے ہنسے بولے مہینوں ہو گئے۔ (صفیہ کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے اس پروگرام سے اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ افضل کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ صفیہ کے قریب جا کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام لیتا ہے اور غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا ہے)

افضل :۔ (آہستہ سے) بات کیا ہے صفو؟ آج کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہو (وہ خاموش رہتی ہے اور نظریں نیچی کر لیتی ہے) کیا مجھ سے خفا ہو؟ یہ سچ ہے کہ پچھلے دنوں میں نے تمہیں نگلکٹ کیا لیکن صفو کیا تمہیں یقین نہیں کہ میں تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں؟ میرا بس چلتا تو خدا کی قسم! آج سے چار سال پہلے تم سے منگنی کی بجائے شادی کر لیتا۔

صفیہ :۔ (اٹھ کر) لیکن کیا کروں، رہنے کو مکان سب مکان؟

تب نا۔

افضل :۔ (حیرت سے) صفو؟

صفیہ :۔ ہاں افضل! اگر تم واقعی مجھے دیوانہ وار چاہتے تو جناب افضل حسین
شمسی آج میں تمہاری بیوی ہوتی، کہ ایک منگیتر نہیں۔ خیر
چھوڑو ان فضول سی باتوں کو۔ جاؤ نہالو۔ اب ظہیر صاحب
آ ہی رہے ہوں گے۔

افضل :۔ (ہچکچا کر) مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم نے مجھے غلط سمجھا
(بے چینی سے) کمبخت ظہیر کو بھی آج ہی آنا ہے۔

صفیہ :۔ ظہیر کو گالیاں نہ دو۔ اب تو وہی تمہاری مشکل آسان
کر سکتا ہے۔

افضل :۔ تمہیں آج میرے ساتھ باہر چلنا ہو گا صفو! تم سے تفصیلی
باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

صفیہ :۔ اچھا بابا، چلیں گے۔ تم جا کر نہا تو لو۔ خاصا وقت لگاتے ہو۔
اب وہ آ ہی رہا ہو گا۔

(افضل کو زبردستی بھیج دیتی ہے۔ اس کے بعد ریڈیو آن کرتی
ہے، ٹھنڈی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور اس کی
پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ پس منظر میں دھیمی
اداس موسیقی۔ یکایک گھنٹی بجتی ہے۔ وہ چونک کر آنکھ
کھولتی ہے اور غور سے سنتی ہے۔ باہر کوئی ہے۔ وہ اٹھ کر
دروازہ کھولتی ہے)

صفیہ :۔ تشریف لائیے۔ (ظہیر داخل ہوتا ہے۔ خاصا خوش شکل
نوجوان ہے۔ گورا رنگ، بھولا چہرہ، قیمتی نفیس سوٹ
پہنے ہوئے آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک)

ظہیر :۔ (اندر آ کر) معاف کیجئے۔ افضل صاحب ہیں؟ مجھے ظہیر
کہتے ہیں۔

صفیہ :۔ جی ہاں، آپ تشریف رکھئے (غور سے اس کا جائزہ لیتی
ہے۔ ظہیر شکریہ کہہ کر آگے بڑھتا ہے اور صوفے پر بیٹھنے
کے بعد کوٹ کے بٹن کھولتا ہے) وہ ابھی ابھی دفتر سے
آئے ہیں، منہ ہاتھ دھو رہے ہیں۔ سگریٹ لیجئے۔ (تپائی
پر سے سگریٹ کیس اٹھا کر اس کے حوالے کرتی ہے۔ وہ
شکریہ کہہ کر لیتا ہے اور جیب سے لائٹر نکال کر سلگاتا ہے)

یہ بتائیے، آپ چائے پئیں گے یا کافی؟

ظہیر :۔ جی تکلف کی ضرورت نہیں۔ ۔۔ میں ۔۔

صفیہ :۔ (فوراً) جی نہیں، تکلف کاہے کا۔ چائے کا وقت ہے۔
تو کافی ٹھیک رہے گی نا؟

ظہیر :۔ جی ہاں۔

صفیہ :۔ (اٹھ کر) معاف کیجئے، میں ابھی آئی۔ (چلی جاتی ہے۔
اس کے بعد افضل غور سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے۔
پھر ایک رسالہ اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دیتا ہے،
اس دوران میں ریڈیو پر کوئی تقریر شروع ہو جاتی ہے۔
صفیہ چند لمحوں کے بعد لوٹ آتی ہے اور آتے ہوئے
ریڈیو بند کر دیتی ہے۔ وہ قریب ہی دوسرے صوفے پر
بیٹھ جاتی ہے)

صفیہ :۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے افضل آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔

ظہیر :۔ اچھا! نوازش ان کی۔ میں نے بھی ان کی زبانی آپ کی
اتنی بہت سی تعریف سنی ہے کہ (ہچکچاتے ہوئے) یعنی
مجھے ملاقات کا خاصا اشتیاق تھا۔

صفیہ :۔ (دلچسپی سے) اچھا!

ظہیر :۔ (فوراً) جی ہاں۔ میرا خیال ہے وہ آپ کو بہت چاہتے
ہیں۔ (یکایک صفیہ کچھ سوچتی ہے اور غور سے اسے
دیکھنے لگتی ہے)

ظہیر :۔ (اسے خاموش دیکھ کر) معاف کیجئے، آپ نے میری
صاف گوئی کا برا تو نہیں مانا۔

صفیہ :۔ جی نہیں، میں خود بے حد صاف گو ہوں۔ سوچ رہی تھی
آپ کو کہاں دیکھا ہے۔

ظہیر :۔ جی، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے
ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ غالباً کسی جلسے ولسے میں۔

صفیہ :۔ جی نہیں، میرے کالج کے اوقات مجھے نامعقول
ہیں۔ اسی لئے میں برسوں سے کسی جلسے میں نہیں گئی۔

ظہیر :۔ کچھ عجیب بات ہے سیمیں صاحبہ! مجھے یقین ہے
۔۔ یعنی ۔۔ ہم ضرور مل چکے ہیں!

(صفیہ سیمیں کے نام پر چونکتی ہے۔ اب سمجھ میں آ جاتا ہے کہ

ظہیر اسے سیمیں سمجھے ہوئے ہے)

ظہیر :- ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کالج میں رہے ہوں۔ آپ کس کالج میں تھیں؟

صفیہ :- (فوراً) معاف کیجئے ظہیر صاحب! میں سیمیں نہیں، صفیہ ہوں، صفیہ کلیم! افضل میرے منگیتر ہیں (ظہیر کے چہرہ پر بالکل ہونقوں کا سا رنگ ہے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہا ہے)

ظہیر :- (حیرت سے) یعنی آپ؟ حیرت ہے! (ہنس کر) بھئی کمال ہو گیا۔ معاف کیجئے۔ افضل صاحب نے اپنی بہن کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اور سیمیں کی جو تصویر میں نے ذہن میں بنائی تھی، وہ آپ پر بالکل پوری اترتی ہے یعنی اعلیٰ تعلیم یافتہ حسین۔ معاف کیجئے (رک کر) کیا نام بتایا آپ نے؟ صفیہ کلیم؟ (کچھ سوچ کر) پاکستان کے قیام سے پہلے آپ کہاں تھیں؟

صفیہ :- ناگپور میں۔ بچپن وہیں گذرا۔ کیا آپ کا تعلق بھی سی پی سے ہے؟ (یوں کہتی ہے جیسے اسے بھی کچھ یاد آ رہا ہے)

ظہیر :- جی ہاں، بالکل۔

صفیہ :- اوہ! (رک کر) آپ کے والد صاحب کا نام منشی — یعنی — معاف کیجئے مسٹر قدیر خاں تو نہیں تھا؟

ظہیر :- (فوراً) جی ہاں، خلاصی لائنز میں رہتے تھے ہم۔ ہمارے پڑوس میں ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے۔ ہومیوپیتھک — کلیم الدین صاحب نام تھا ان کا۔ عجیب اتفاق ہے (خوشی سے) ان کی ایک لڑکی تھی، ننھی سی صفن نام یعنی معاف کیجئے۔ صفیہ بانو!

صفیہ :- (خوشی سے فوراً) جی ہاں جی ہاں۔ بالکل ٹھیک یاد آیا آپ کو۔ صفیہ میں ہی ہوں! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظرّو آپ ہیں۔ منشی — معاف کیجئے۔ چچا قدیر کے اکلوتے صاحبزادے! (خوشی سے اٹھ کر اس کے قریب اسی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) دنیا واقعی کتنی مختصر ہو گئی ہے ظہیر صاحب۔

ظہیر :- یہ لیجئے۔ ظہیر صاحب۔ یعنی ہم تو ظرّو ہوا کرتے تھے صفیہ صاحبہ۔

صفیہ :- صفیہ صاحبہ؟؟؟ (دونوں ایک ساتھ ہنستے ہیں)

ظہیر : اچھا بھئی، صفن ہی سہی۔ تمہیں وہ مہاراج باغ کی شامیں یاد ہیں جب ہم بندروں کا منہ چڑایا کرتے تھے؟

صفیہ :- جی ہاں، کیسے بھول سکتی ہوں! یہ دیکھو (بلاؤز کی آستین ہٹا کر ایک زخم کا نشان دکھاتی ہے) — یہ دیکھو، ایک بندر نے نوچ لیا تھا۔

ظہیر : میں نے پتھر برسائے تھے۔ اور پھر چوکیدار نے پکڑ کر میری ٹھکائی بھی کی تھی۔ (ہنس کر) آج خوب ملاقات ہوئی، میں نے تو یہاں آ کر اپنے تمام بچپن کے دوستوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ تمہیں بھی برسوں ڈھونڈتا رہا۔ چچا کیسے ہیں؟ اور وہ تمہاری چھوٹی بہن — کیا نام تھا اس کا؟ — رضیہ؟

صفیہ :- ابا کا تو ۱۹۴۸ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ امی میرے ساتھ رہتی ہیں۔ رضیہ اس سال بی اے کا امتحان دے گی۔ چچا قدیر — (یکایک رک کر) مجھے ابھی ابھی افضل نے بتایا کہ چچا قدیر کا انتقال ہو گیا۔

ظہیر :- ہاں صفن! اب چار سال سے سارا کاروبار میں نے سنبھال رکھا ہے۔ (اشتیاق سے) چچی کیسی ہیں؟ خیریت سے تو ہیں نا؟ اماں کے مرنے کے بعد کتنا خیال رکھتی تھیں وہ میرا! کہاں رہتی ہو تم؟

صفیہ :- پاکستان چوک میں ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ رضیہ، رفیعہ اور حفیہ بھی اب بڑی ہو گئی ہیں۔ حفیہ کو تو تم نے بھلایا نہ ہو گا۔ ارے وہی ننھی سی گڑیا جسے تم پیٹھ پر لادے لادے پھرتے تھے!

ظہیر :- (پیار سے) میں نے اپنے عزیز دوستوں کو کبھی نہیں بھلایا منی!

صفیہ : (چونک کر) منی —؟ (ظہیر پیار سے اسے دیکھ رہا ہے)

ظہیر :- (آہستہ سے) ہاں، تم مجھے چنّے پکارا کرتی تھیں منی۔ بھول گئیں؟ دادی اکثر کہا کرتیں: یہ چنّے منّی کی جوڑی کتنی اچھی ہے! (کچھ سوچ کر) چلو منی، دادی سے مل آئیں۔

صفیہ :- دادی؟ وہ بھی یہیں ہیں!

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر)

"آئینہ بی بی"

یونس احمد

مشرقی پاکستان کی سوندھی سوندھی مٹیوں اور قوس قزحی فضاؤں میں ان گنت لوک گیت اور لوک کہانیاں روپوش ہیں۔ ان کہانیوں اور گیتوں میں بنگال کے صحیح رنگ روپ ملتے ہیں۔ ان میں ملاحوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں، چرواہوں کے دلرس نغمے ہیں۔ ان کے اندر اُن کنواری ناریوں کے جذبات کی دبی ہوئی چنگاریاں ہیں جو پنگھٹ کنارے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہیں۔ بارہ ماشی گیت، اساڑھ میں ندیوں نالوں کا شور، جاڑے کی ماتمی شامیں، بھادوں کی چاندنی راتیں، بسنت میں رنگ برنگ کے پھولوں پر بھونروں کی وارفتگی — ان موسموں کی مختلف کیفیتوں کا اندازہ لگانا ہو تو ان منظوم لوک کہانیوں کو پڑھئے جن کے خالق کاشتکار اور ملاح ہیں۔ گاؤں دیہات کے اِن اَن پڑھ شاعروں نے زندگی کے ہر پہلو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں لفظوں کے جال نہیں بنتے۔ اِن کی زبان سیدھی سادی مگر پُر اثر ہے۔ وہ رمزیت اور اشاریت سے گریز کرتے ہیں۔

"آئینہ بی بی" بھی مشرقی پاکستان کی نہایت پُر اثر لوک کہانی ہے۔ اس میں عشق و محبت کی دل سوزی و دل گرفتگی ہے، گاؤں کی گوری کا حسنِ ضیا پاش عشق کی چشمِ نیم باز کو خیرہ کر رہا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن گیتوں کی پھوار بن رہی ہے۔ سہمی سہمی ہوئی عطر بیز سانسیں کھیتوں میں دھان کے خوشوں کو بہا رہی ہیں۔ گاؤں کے نوجوان کاشت کار محمود نے آئینہ بی بی کے چندن جیسے روپ کو دیکھا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا

دیس میں اپنے سندر سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے روپ کے آگے سب ہے لیکن دھول

محمود کا جذبۂ عشق آئینہ بی بی کے حسنِ معصوم کو تپا گیا۔ وہ ندی کنارے دم بخود نگاہیں نیچی کئے کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ شرم کے مارے شفق زار بن گیا۔ وہ نوجوان کے سامنے سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن قدم سو سو من کے ہو گئے۔

محمود بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ اس کی ماں نے دکھ جھیل کر اسے پالا پوسا اور بڑا کیا۔ سولہ سال کی عمر ہوئی تو اس نے ہل بیل سنبھال لئے۔ کاشت کاری شروع کر دی۔ شب و روز کی محنتوں کا پھل جلد ہی مل گیا۔ دھان کے خوشے سر اٹھانے لگے۔ ہواؤں میں بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ بیٹے کی محنت کا پھل ماں کو سرور و کیف دے گیا۔ اس نے پیر صاحب کی درگاہ میں منت مانی تھی۔ منت پوری ہو گئی۔ اس کی کٹیا کے در و بام جھوم اٹھے اور یک بارگی دعاؤں کے لئے اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے،

مرے پُتر کو آہنی کاٹھ دے
یہاں سورما کی طرح وہ جئے!

محمود سچ مچ گبرو جوان تھا۔ اس کے انگ انگ سے شجاعت و مردانگی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ گاؤں کی گوریاں اسے دیکھتیں اور کٹ کٹ جاتیں۔ مگر:

کاٹے نہیں کٹتے ہیں دن جیٹھ مہینے کے
اور آنکھیں جھپکتے ہی ہو جاتی ہے پربھات

محمود کو کسی کل چین نہیں۔ نہ جانے یہ کیسی چبھن ہے۔ اسے کسی پہلو آرام نہیں ملتا۔ ایک انجانا سا درد ہے جس کے باعث اس کا من بیکل ہو رہا ہے۔ اب کھیت میں اس کا جی نہیں لگتا۔ اب ہل بیل اسے خوشی نہیں دیتے۔ اتنے میں

"آم پاکے، جام پاکے کاگا بولے را"

اور "کاگا" کی کائیں کائیں دم بھر کے لئے امید بندھا جاتی ہے کہ اس

هرن عمل : سجاد
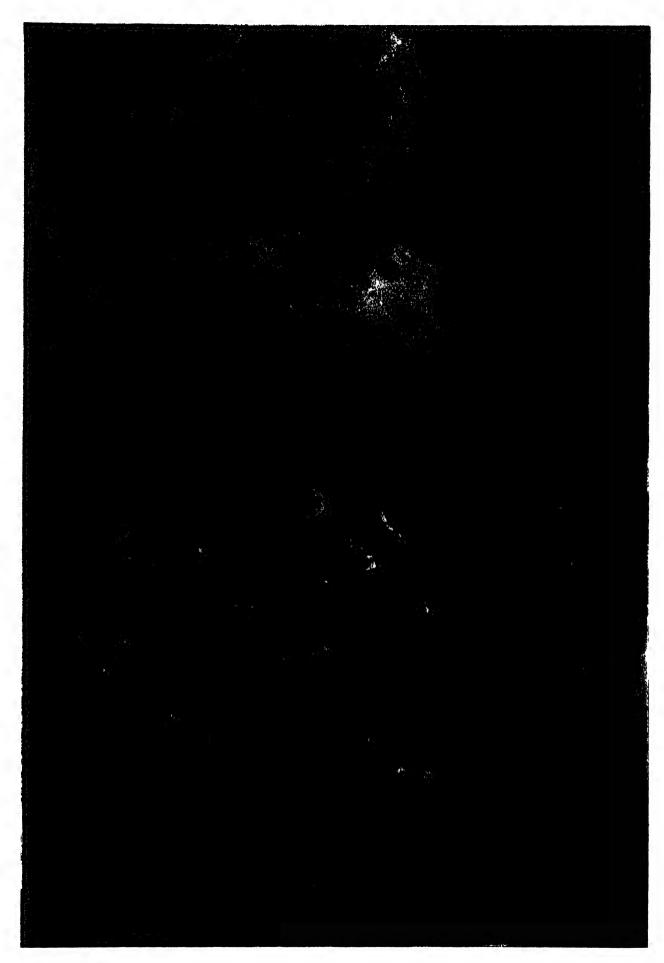
کی کٹیا میں ضرور کوئی مہمان آنے والا ہے۔ لیکن اس کی کٹیا میں کوئی نہیں آیا۔ اس کی ماں کی امیدیں بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوئیں حالانکہ:

اسی مہینے گھر ہیں بناتے بن کے سارے پنچھیوں نے
بھونہ آئی ہائے لیکن بھاگ جلی کی کٹیا میں!

اب اساڑھ کا مہینہ بھی آگیا۔ میگھ رانی کی سواری دور دور تک جانے لگی۔ سوکھی ندیاں جل تھل بن گئیں۔ گاؤں کے نوجوان کمائی کے لئے دور دیس جانے لگے۔ جدھر آنکھیں اٹھتی ہیں بادبان اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ محمود نے بھی دور دیس جانے کا قصد کیا۔ بھلا ماں کا دل کیسے مانتا۔ اس نے بیٹے کی منت سماجت کی۔ اسے بہلایا پھسلایا مگر وہ نہ مانا۔ ماں کی آنکھوں میں اساڑھ کے بادل سما گئے۔ محمود رخصت ہونے لگا۔ آسمان کالی بدلیوں سے ڈھک گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کی ناؤ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ چھ ماہ جدائی میں بیت گئے مگر محمود کا کچھ پتہ نہ چلا۔

محمود کی ناؤ ایک انجانے دیس کے کنارے آکر رکی۔ اس نے ندی کنارے اُگے ہوئے درخت کی جڑ سے اپنی ناؤ کو باندھا۔ وہ گاؤں کے اندر داخل ہوا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس کی نگاہ ایک کٹیا پہ پڑی؛ چوکھٹ پر ایک بڈھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ بڈھے نے محمود کو بلایا اور اس سے اپنی کیفیت بیان کرنے لگا۔ اتنے میں آئینہ بی بی ندی سے گاگر بھر کر آگئی۔ اس نے ایک اجنبی جوان کو دروازے پہ دیکھا تو:

شرم کے مارے لال ہوا منہ، تھر تھر کانپے گات[1]
جانا چاہا پر نہیں اٹھے کنیا کے دو پات[2]

محمود، آئینہ بی بی کے روپ رنگ کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ایسا بے پناہ حسن اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر کے کالے کالے بال پاؤں کو چھو رہے تھے، آنکھوں میں کٹاری تھی۔ جسم کے انگ انگ میں جادو سمایا ہوا تھا اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا:

دیس میں اپنے سندر سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے روپ کے آگے سب ہے لیکن دھول

۱۔ گات۔ جسم ۲۔ پات۔ پاؤں بنگلا میں پاؤں کو پا کہتے ہیں۔

محمود نے بڈھے سے جب اپنا تعارف کرایا اور ماں باپ کے نام بتائے تو اس کی آنکھیں رو پڑیں۔ بڈھے نے کہا۔ "زمانہ ہوا جب میں اور تمہارے باپ دوست تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے ہائے۔" محمود کو اپنے باپ کے بارے میں بہت سی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے بڈھے کو سلام کیا اور مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک اس کی نگاہیں آئینہ بی بی کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔ پھر وہ رخصت ہو گیا اور اس کی ناؤ پورب دیس کی سمت بہنے لگی۔

محمود کی روانگی کے بعد آئینہ بی بی کی کیفیت دگرگوں ہونے لگی۔ اب اس کی آنکھیں کسی چت چور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اب اس نے اپنے من میں محبت کا دیپ جلتا ہوا محسوس کیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ شام ہوتی اور کٹیا میں چراغ جلانا بھول جاتی۔ ندی کنارے پنیاں بھرن کو جاتی مگر آنکھیں کسی اور کو تلاش کرتیں اور دل ہی دل میں کہتی جاتی:۔

اپنے نگر میں کس نگری سے بہہ کر آئی نیّا رے
کس نے من میں تیر چلایا، بول ذرا پُروَیا رے؟
کون بھلا بوجھے گا پیارے اپنے من کو روگ ہے کیا
جینا ایسا روگ ہے بندھو[1] جس کی نہیں ہے کوئی دوا

۱۔ دوست

لیکن محمود ناؤ لے کر آگے بڑھتا گیا۔ اب پورب سے بہہ کر آنے والی ہوائیں اس کے من میں کانٹے چبھونے لگیں۔ اس کا جی بیکل ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی اسے چین نہ آیا۔ آئینہ بی بی اس کے سامنے اس طرح کھڑی تھی جیسے آسمان کی گود میں تنہا ایک تارہ جگمگا رہا ہو۔ تین ماہ اس طرح بیت گئے۔ وہ پھر آئینہ کے گاؤں میں واپس آگیا۔ اس نے جتنے مال و اسباب خریدے تھے سب منہ مانگے دام میں بیچ دیئے۔ اس کا من آئینہ سے ملنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مگر جب کٹیا کے اندر داخل ہوا تو وہاں آدمی تھا نہ آدم زاد۔۔ اس کے احساسات و جذبات میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ وہاں سے مایوس و نامراد لوٹ گیا۔ کتنے گاؤں گھوم گھوم کر اس نے آئینہ کی تلاش کی مگر لاحاصل۔ اب وہ اپنی جھولی پھیلا کر گھر گھر جانے لگا۔ کہیں سے اس کو بھیک مل جاتی۔ کوئی اسے گالیاں دیتا۔ کسی نے اس کو اچکا اور لفنگا کہا۔

کسی نے پاگل اور دیوانہ گردانا۔ اس طرح تین گاؤں کے اس نے پھیرے لگا دیئے۔

جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو محمود نے دوسرے گاؤں کا راستہ لیا۔ اس وقت گاؤں کی جھونپڑیوں سے دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے۔ وہ تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے رات اسی کے نیچے بسر کرنے کی ٹھانی۔

صبح ہوئی تو اس نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔ وہ جھولی پھیلا کر بھیک مانگتے مانگتے ایک دروازہ کے پاس آیا کہ اس کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی۔ جھولی ہاتھ سے گر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ محمود نے کہا:۔

"یہ روپ دھارن میں نے تمہارے لئے کیا ہے پیاری!
تمہاری تلاش و جستجو میں نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا، کتنے گاؤں کی خاک چھانی۔
یہ سلسلۂ لامتناہی چھ مہینے سے جاری تھا۔
جس نے مجھے اس روپ میں دیکھا پاگل سمجھا۔
پیاری میں چاول اور پیسے کی بھیک نہیں مانگتا ہوں۔
میں تو تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں۔
میں تو تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں، چلو اپنے دیس لوٹ چلیں۔"

آئینہ نے روتے روتے جواب دیا ـــــ

"ظالم باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے، یہ ماموں کا گھر ہے۔
چھ ماہ سے میں بھی آنکھوں سے گنگا بہا رہی ہوں
جہاں جی چاہے مجھے لے چلو پیارے!
پریت سے بڑھ کر اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔
پریت ہی تو رتن ہے، پریت ہی دھن اور گلے کا ہار ہے۔"

ماموں کے لڑکے سے آئینہ کی نسبت طے پائی تھی لیکن وہ محمود کے ساتھ فرار ہوگئی اور اس کے گھر میں آکر اس نے محمود سے شادی کرلی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ محمود جب کبھی بازار جاتا آئینہ اس سے فرمائش کرتی ـــــ

"پیارے تم میرے لئے کنگھی ضرور لانا ـــــ اور ہاں نتھ اور آسمانی رنگ کی ساڑھی بھی!
میں یہ ساری پہن کر ندی کنارے جاؤں گی اور تم مجھے دیکھ کر مسکراؤ گے۔
پیارے خوشبودار تیل لانا بھی نہ بھولو۔"

خوشی اور مسرت کے یہ دن مختصر ثابت ہوئے۔ محمود نے پھر دور دیس جانے کی ٹھانی۔ اساڑھ کے اس مہینے میں وہ دور دیس جاکر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا چاہتا تھا۔ آئینہ کو جب معلوم ہوا تو اس کی آنکھوں تلے تاریکی چھا گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی زندگی کا سورج گہنا گیا ہے۔ وہ اداس ہوگئی۔ اس کا دل بھر آیا اور اسی عالم بے قراری میں وہ محمود سے مخاطب ہوئی:۔

"پیارے مجھے چھوڑ کر تم دور دیس نہ جاؤ۔
تمہارے بنا یہ پہاڑ سے دن کیسے کاٹوں گی۔
جوانی کے دنوں میں شوہر تو پھولوں پر بھونرا جیسا ہوتا ہے۔
پیارے نہ جاؤ!
دیکھو ندی کیسا شور مچا رہی ہے،
میں اپنی اس بھری جوانی کو کیسے سنبھال کر رکھوں گی؟
میرے پاس نہ تو سونا ہے۔ نہ چاندی ہے اور نہ پیتل،
دل میں بس ایک آس ہے تمہاری، اسے نہ توڑو!"

لیکن محمود نہ مانا اور اپنے دوستوں کو لے کر دور دیس روانہ ہوگیا۔ چند ہی دنوں کے بعد یہی دوست واپس آگئے اور آئینہ کو اطلاع دی کہ ناؤ ڈوب جانے کی وجہ سے محمود بھی زندہ نہ بچ سکا۔ اس خبر کو سن کر آئینہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پاگل ہوگئی اور گھر سے نکل گئی۔ کسی طرح وہ ندی کنارے آئی تھی کہ ایک خانہ بدوشوں کی ناؤ کنارے آگئی۔ اس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان عورتوں سے اس نے اپنی حالت زار بیان کی۔ اس کی روداد غم سن کر وہ اس حد تک متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اس کو اپنی ناؤ میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اس کے علاوہ ان خانہ بدوش عورتوں نے محمود کی تلاش میں آئینہ کی مدد بھی کی لیکن "چاند محل" نہ ملا۔ مسلسل تلاش و جستجو کے بعد آئینہ مایوس نہ ہوئی۔ تین سال تک امیدوں کا گھروندا بنتا اور بگڑتا رہا۔ یکایک ایک دن چرواہے کی زبانی معلوم ہوا کہ جہاں ندی ختم ہو جاتی ہے وہیں "چاند محل" ہے۔ اور اس "چاند محل" میں ایک دلہن شام سے چراغ جلاتی ہے۔ یہ سن کر

آئینہ بی بی خانہ بدوش ناری کا لباس پہن کر باہر نکلی۔ اس نے جُوڑا بھی ویسا ہی باندھا۔ گلے میں تعویذ گنڈے تھے اور سر پہ بوجھ۔

ندی پار کرکے آئینہ ٹھیک "چاند محل" کے قریب پہنچ گئی۔

درخت اسی طرح سرسبز تھے اور ان کی شاخوں میں پرندوں نے آشیانے بنا رکھے تھے۔ یہیں آس کا عیش کدہ تھا۔ جہاں اس نے کتنی حسین راتیں گزاری تھیں۔ اس نے جلدی جلدی "چاند محل" میں داخل ہونا چاہا مگر پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آج تین سال کے بعد وہ اپنے گھر آئی ہے۔ آج وہ اپنے "چت چور" سے ملے گی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ساڑھی کے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھا۔ صحن میں مہندی کا درخت اسی انداز سے کھڑا نظر آیا۔ یہ مہندی کا درخت آئینہ نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس "چاند محل" کے در و دیوار میں اس کے کتنے سپنے سانس لے رہے ہیں، اس کی تمناؤں کے کتنے دیپ جل رہے ہیں مگر اس "چاند محل" پر آج اس کا اختیار نہیں۔ محمود یعنی اس کے چت چور نے دوسری شادی رچالی ہے اور اب اس گھر پر اس کی نئی بیاہتا کا راج ہے۔

اس کی ساس اسے پہچان نہ سکی، اس نے پوچھا:-

اے لڑکی کون ہے تو؟ کہاں سے آ رہی ہے؟ اس طرح نہ رو"

اور آئینہ نے جواب دیا:

کیا بتاؤں میں کون ہوں ـــ ہاں اتنا یاد ہے

کہ جب میں روتی تھی تو تم تڑپ اٹھتی تھیں اور اپنے

آنچل سے میرے آنسو پونچھتی تھیں

مگر اب میری ڈھارس بندھانے والا بھی کوئی نہیں۔"

ساس نے پوچھا۔

"تو کیا تم واقعی آئینہ ہو جس کے غم میں روتے روتے میری آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی ہے۔ آؤ میرے پاس آؤ اب تم اپنی دکھی ماں کو چھوڑ کر نہ جاؤ۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی مگر آئینہ نے خون کا گھونٹ پی کر جواب دیا۔ "نہیں میں اس گھر میں نہیں آؤں گی ہرگز نہیں۔ اب میں یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں رہ سکتی۔" اور اتنا کہہ کر آئینہ ناؤ میں بیٹھ گئی اور اس نے دل ہی دل میں کہا!

نِکھ پکھیرو چاند محل کے تم سے اتنا کہتی ہوں
اس کو میرے آنے کی سُن گُن تک نہ ہو پائے
میری من کی آشا کیلئے، اتنی سی بس آشا ہے
سکھی رہے چت چور سجن وا من میرا اور کیا چاہے

آئینہ بی بی کی ناؤ چل پڑی ـــ بہت دور ـــ یہاں تک کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور جب محمود گھر واپس آیا اور اسے معلوم ہوا کہ آئینہ اسے تلاش کرتے کرتے چاند محل تک آئی تھی اور کسی نے اسے روکا تک نہیں تو اس کا ذہن مفلوج ہو گیا۔ وہ گھر سے نکل گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

★

شمعوں کی قطار

بقیہ صفحہ ۱۶

صدرِ پاکستان اور وزراء نئے دارالحکومت میں منتقل ہو چکے ہیں۔ اس متنوع اور حیرت انگیز کامیابی پر صدرِ مملکت پاکستان، انکے رفقاء، حکام اور باشندگانِ پاکستان جس قدر بھی اظہارِ مسرت کریں کم ہے۔ گزشتہ دس گیارہ سالہ مصائب و آلام سے نجات دینے پر ملک جس قدر بھی فخر و ناز کرے بجا ہے۔ اور گزشتہ یکسالہ کارہائے نمایاں کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ انقلابی حکومت پاکستان کے مستقبل کو اپنے انقلابی کارناموں سے اور بھی چار چاند لگائے گی۔ دنیا میں پاکستان سربلند ہو گا، اس کے باشندے صحیح معنوں میں آزادی سے ہمکنار ہو کر فخر سے اپنا سر بلند رکھ سکیں گے۔ اور جب صدرِ پاکستان کے وعدہ کے مطابق آئین کمیشن بھی اپنا کام شروع کر دے گا، جس کا اعلان کیا جا چکا ہے، اور انقلابی حکومت کی سرپرستی میں "جدید آئین" مرتب ہو جائے گا، تو یقین ہے کہ دنیا کی بہت سی حکومتیں اسی طرح اس پر رشک کریں گی جس طرح ہمارے بلا خون بہائے فوجی انقلاب پر رشک کیا جا رہا ہے۔

پاکستان پائندہ باد!

فریاد کی لے

دیوندر ستیارتھی

کمرے میں بک شیلف کے پیچھے گرد کی تہوں میں لپٹی، دیوار کے سہارے کھڑی کی ہوئی "رُدر وینا" پڑی تھی جس پر مکڑی نے جالا تن رکھا تھا۔ نیلی روشنی میں ڈوبے ہوئے کمرے میں ستار بجتا رہا اور میری روح کی جھیل میں نیل کنول کھلتا چلا گیا۔

پھر سجاد بھائی نے عیسیٰ فاروقی کی بات چھیڑ دی جس کی موت کے بعد ہی وہ یہ ستار خرید پائے تھے۔ عیسیٰ فاروقی کی زندگی ہی میں وہ یہ ستار کیوں نہ خرید سکے، یہ سوال میرے ذہن میں رہ رہ کر خلش کرتا تھا۔

"دیکھا آپ نے میرا ستار کتنا بھیگ کے بولتا ہے"، سجاد بھائی مسکرا کر بولے "بڑے ٹھاٹھ کا ستار ہے۔ دوہرے ٹھاٹھ کا۔ ابھی پچھلے دنوں پانچ چھ طربیں ٹوٹ گئی تھیں۔ خود ہی بیٹھ کر لگاؤں گا کسی روز۔ پھر دیکھئے اور بھی سُر میں بجے گا۔"

بک شیلف میں کتابیں بالکل سجا کر نہیں رکھی گئی تھیں۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ان پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ بک شیلف پر رکھے ہوئے گلدان کے پھول بھی مرجھا چکے تھے۔ ان کی پتیوں پر بھی گرد جمی ہوئی تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ سجاد کے ستار کی بھی ایک کہانی ہے جس پر گرد کی موٹی تہیں جمی ہوئی ہیں۔

نیلے بلب والے ٹیبل لیمپ کا شیڈ بھی نیلے رنگ کا تھا۔ اور اس شیڈ پر جمی ہوئی گرد کی تہہ اس بات کی ضمانت تھی کہ سجاد بہت دنوں بعد اس کمرے میں آئے ہیں۔

ستار پر سجاد بھائی کا نغمہ بہت دور نکل گیا تھا۔ اور میں مناسب مقامات پر داد دیتا رہا۔ نیلی روشنی میں سجاد کا سانولا چہرہ بڑا ہی پیارا لگنے لگا۔ اس وقت مجھے امیر خسرو کی یاد آئی جنہوں نے رُدر وینا میں ضروری تبدیلیاں کر کے ستار ایجاد کرتے ہوئے نغمہ کو آواز دی تھی۔

میں نے کہا "سجاد بھائی، یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ موسیقی کے موجودہ ساز صدیوں میں جا کر مکمل ہوئے ہیں۔ پہلے وقتوں میں تو یہ ساز بہت ہی سادہ رہے ہوں گے۔ اب ستار ہی کو لو۔ پہلے کسی پرانے راگ کے رسیلے ایک لرزتے ہوئے تار کو جھنجھناتے ہوئے سن کر رُدر وینا، وچتر وینا اور سرسوتی وینا جیسے ساز ایجاد کئے ہوں گے۔ پھر صدہا سال بعد امیر خسرو نے ستار کو ایجاد کرتے ہوئے یہ سوال دہرایا کہ روپ رنگ کے جادو کو اب کس سحر کا انتظار ہے۔"

"میں نے تو اسے بہت دنوں سے ہاتھ ہی نہیں لگایا!" سجاد بھائی کہتے چلے گئے، "ویسے وہ بھی اسی عیسیٰ فاروقی سے لی تھی۔ الاپ کرنا ہو تو یہی وینا ٹھیک ہے۔ لیکن گت کا مزا تو ستار کے بغیر کہاں؟"

سجاد نے ستار کی اتنی تعریف کر ڈالی کہ مجھے کہنا پڑا "ستار تو بہت دیکھے ہیں۔ مگر ویسے اس میں ایسی کیا بات ہے؟" وہ بولے "اتنا بھیگ کے بولتا، کیا یہ معمولی بات ہے؟"

اس خیال سے کہ وہ برا نہ مان جائیں، میں نے یہ شکایت بالکل نہ کی کہ کمرے میں جگہ جگہ گرد کیوں جمی ہے اور وہ صفائی کی طرف سے استغنے بے پروا کیوں ہیں۔ بک شیلف پر رکھا ہوا الارم والا ٹائم پیس بھی تو اسی کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اس گھر کو ابھی تک بسانے والی نصیب نہیں ہوئی۔

ستار پر سجاد کو پورا اعتماد تھا۔ ان کی انگلیاں خوب چلتی رہیں اور لمبے ریاض کی سوگند کھاتی چلی گئیں۔

میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "تو گھر آباد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں؟"

"ارے یہ بھی کر لیں گے ایک نہ ایک دن" انہوں نے ستار کی کھونٹی
کستے ہوئے کہا "لیکن کیا یہ اتنا ہی ضروری ہے؟" اور پھر وہ قہقہہ لگا کر
بولے "بس میں کوئی ثروت نسا مل ہی جائے گی"۔
ثروت کی بات میں مجھے اجنبیت نظر نہیں آئی میں اور بھی
تن کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ثروت کا قصہ پیچھے ہوگا پہلے ستار کی کہانی
کے کواڑ کھولو۔

"اس کی کہانی کے کواڑ کھلوا کر کیا کرو گے" سجاد جیسے سپنے
میں بول رہے ہوں، اور انہوں نے دوسرا نغمہ چھیڑ دیا۔ جیسے سنتے
سنتے میرے تخیل میں دو پہلے ستونوں اور سنہرے کنگوروں والے محرابوں
والا مرمریں منڈپ گھوم گیا۔ ستار کے سر رگ رگ میں اتر رہے تھے۔
میں نے کہا "واہ واہ! سچا سُر تو قدم قدم پر دیئے جلاتا ہے۔
قدم قدم پہ دیپ آرتی اتارتا ہے"۔

"باتیں پیچھے ہوں گی۔ پہلے ستار سنو" سجاد نغمہ کی لے
بڑھانے چلے اور میں اپنے سر کو کرسی کی پشت پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔
لے ثروت کا آنچل تھام کر آگے بڑھتی گئی۔ نغمہ ساز کی بند آنکھیں
نغمے کے پاتال میں اترتی گئیں اور میری نگاہیں راگ کی وسعتوں میں
تیرتی چلی گئیں۔ یکایک میرے منہ سے نکل گیا "بہتے پانی میں ہاتھ
ڈالنا تو ہر لڑکی کو پسند ہوتا ہے لیکن ستار میں شاید ہر لڑکی رس
نہیں لے سکتی۔ ایک بات بتاؤ۔ کبھی ثروت کو بھی تم نے ستار سنایا ہے؟"

"اس کی بات چھوڑو" سجاد نے جیسے ٹالنا چاہا۔ "اسے
اتنی سمجھ ہی کہاں تھی۔ ایک بار ٹیپ ریکارڈ پر اس نے میرے ستار
کے دو تین بول ضرور محفوظ کر لئے تھے۔ اب کون جانے وہ بول
اس نے اب تک سنبھال کر رکھ چھوڑے ہیں اور انہیں کبھی کبھی
سن لیتی ہے یا اس نے وہ نغمے مٹا کر کسی دوسرے گیت کے بول
بھر لئے ہوں۔ ٹیپ ریکارڈ کی بات تو ایسی ہی ہے۔ چھوڑئیے!"
انہوں نے "چھوڑئیے" کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ ثروت
کی کہانی کو بھی گرد کی موٹی تہہ کے نیچے دبا کر رکھنا چاہتے ہوں۔

"تو کیا تم ستار سکھانے جایا کرتے تھے؟" میں نے کہا
"خیر اسے چھوڑو۔ پہلے ستار کی کہانی سناؤ"۔

"تم نے پہلے بھی کسی ساز کی کہانی سنی ہے؟" سجاد نے
مسکرا کر کہا "عیسیٰ فاروقی یہ ستار اس لئے نہیں بیچنا تھا کہ یہ آکے

یہاں مرمت کے لئے آیا تھا اور جس کا یہ ستار تھا وہ سات برس سے
اسے لینے نہیں آئی تھی"۔ پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ گنگنانے لگا۔

"گوری سوئے سیج پر، مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہو دیس

مجھے یہ محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ سجاد کی ستار کی کہانی بہت
مزیدار ہوگی۔ ستار بجانے اور اسکی تیاری سے بھی کہیں زیادہ مزیدار۔
اور میرے تصور میں ستار کے موجد، امیر خسرو کا وہ دوہا جیسے
گھنگھروؤں کی جھنکار بن کر گونج اٹھا۔

خسرو کے اس دوہے میں سانجھ کی جو منظر کشی کی گئی تھی،
وہ کسی جدید مصور کی دلکش تصویر کی طرح سامنے ابھری۔ جیسے ہمارے
اور خسرو کے دور میں چند گھڑیوں کا فاصلہ بھی نہ رہ گیا ہو۔

"یہ ستار کسی نے مرمت کے لئے عیسیٰ فاروقی کی دوکان پر
بھیجا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھ لیا۔

"ثروت کی ماں نے" سجاد مسکرائے۔

مجھے بڑی گدگدی سی ہوئی۔ کیونکہ میں نہ جانتا تھا کہ یوں یکدم
کہانی کا دامن ثروت سے جا ملے گا۔ میں نے کہا "کمرے میں صفائی کا
انتظام کرو۔ ثروت کبھی بھولی بھٹکی یہاں آنکلی تو کیا کہے گی؟"

خالص لکھنوی وضع کے کرتے پاجامے میں سجاد کی شخصیت
نیلے بلب کی نیلی روشنی میں اور بھی جاذب نظر معلوم ہو رہی تھی۔
ثروت کا ذکر سن کر وہ شرما گئے۔ "چھوڑو۔ کیا وہ اب تک میرے
لئے یونہی بیٹھی ہوگی؟" انہوں نے بات ٹالنی چاہی۔ جیسے وہ اب تک
اپنے تصور میں اپنے ارمانوں کی اس کہانی کی گونج سن رہے ہوں
جو انہوں نے ثروت کے سامنے بیان کی تھی۔

"کیا ثروت اپنے چہرے پر پاؤڈر کی موٹی تہہ جمایا کرتی تھی؟
اور یہ بھی بتاؤ اس کا دلپسند شعر کونسا تھا؟" میں نے سجاد کا کندھا
جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"اسے تو بس ایک ہی شعر پسند تھا ؎

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے"

سجاد گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"اور ثروت کی ماں خسرو کا دوہا گاتی ہوگی" میں نے

سنجیدگی سے کہا۔

"خسرو کا وہ دوہا تو ہر کسی کو پسند آئے گا"

سجاد نے بتایا کہ جب وہ ثروت کو ستار سکھانے جاتے تو ماں بیٹی میں یہ بحث چل پڑتی کہ ستار سیکھنے کے لئے بڑے ٹھاٹھ کا ستار ہونا چاہئے یا معمولی سا۔ ثروت کہتی "میں تو تمہارے والے ٹھاٹھ کے ستار پر ہی نیا سبق لوں گی" اس کی امی تھی کہ اس بات کے لئے مطلق راضی نہ ہوتی۔ اس کا سبھاؤ نہ بدلنا تھا نہ بدلا۔ وہ تو ثروت کی یہ بات سن کر ہمیشہ چونک پڑتی اور جھنجلا کر کہتی "تمہیں کب سے سمجھا رہی ہوں۔ اپنے ستار کو تو میں کسی کو بھی ہاتھ نہ لگانے دوں گی۔ دیکھتی نہیں، میں نے تو کبھی عیسٰی فاروق پر بھی اتنا بھروسہ نہیں کیا کہ اسے مرمت کے لئے اس کی دوکان پر بھیج دوں۔ ہمیشہ اس کو یہاں آکر کھونٹی وغیرہ لگانی پڑتی ہے۔ چاہے اسے راضی کرنے کے لئے مجھے کتنی بار بھی اس کی دوکان پر جانا پڑے"

میں نے کہا "تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ثروت اپنے چہرے پہ اداسی کی ہلکی سی تہہ جماتے وقت بھی وہی فریاد کی کوئی تے نہیں ہے، والا شعر گنگناتی ہوگی۔ اور دیکھتی ہوگی کہ ایک لہراتی ہوئی زلف اس کے دائیں گال کو چھوتی۔ جیسے یہ سچ مچ کسی فریاد کی لے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا ثروت کو بھی نیلے بلب کی نیلی روشنی پسند تھی؟ ستار بجاتے وقت اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ نرم پڑ جاتا ہوگا۔ اور وہ تو ہمیشہ پلکیں جھکا کر ستار بجانا پسند کرتی ہوگی اور اس کا انداز یقیناً ایک مشرقی لڑکی کا انداز ہوگا"

سجاد نے بتایا کہ اس کی امی کسی کے دل کو ٹھیس تو نہیں لگانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ستار کی مرمت کے سلسلے میں اسے عیسٰی فاروق پر ذرا بھی اعتماد کیوں نہیں تھا۔ جب ثروت اپنی بالکونی میں سج دھج کر بیٹھتی اور ستار بجاتی یوں معلوم ہوتا کہ وہ عمر رفتہ کو آواز دے رہی ہے۔ ویسے اسے ستار بجاتے سنتا تو عیسٰی فاروق کو بھی پسند تھا۔ سارے شہر میں اس کے ستار کی دھوم تھی۔ اور بڑے بڑے موسیقار تہہ دل سے یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح بیگم اشفاق کا ستار ان کے ہاتھ لگ جائے۔

"لیکن یہ راز کسی کو بھلا کیسے معلوم ہوتا" سجاد مسکرا کر بولے "یہ بات تو ثروت کے ابا جان بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ ستار بیگم نے خریدا تھا یا وہ کسی کے تحفے کی یادگار تھی جسے وہ اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھی"

میں نے کہا "تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ میرا تو خیال ہے یہ ستار کسی زمانے میں خود عیسٰی فاروق نے ہی بیگم اشفاق کی نذر کیا ہوگا!"

"تم نے کیسے بوجھ لیا؟" سجاد الاؤ میں سوکھے پتے ڈالنے کے انداز میں بولے "ثروت کے ابا جان سے یہ بات آج تک پوشیدہ رکھی گئی کہ بیگم کی اٹھتی جوانی میں عیسٰی فاروق نے اسے دے ڈالا۔ شاید بیگم ستار کی مرمت کے بہانے اسے اپنے یہاں بلا کر ان دنوں کی یاد تازہ کر لیتی تھی"

"یہ بات ثروت کو تو ضرور معلوم ہوگی"

"بالکل نہیں"

"اب آجکل بیگم اشفاق اور ثروت کہاں ہیں؟"

"کوئی نہیں جانتا"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"عیسٰی فاروق کو مرنے سے پہلے سات سال تک یہ راز معلوم نہ ہو سکا"

"یعنی بیگم ستار کو مرمت کے لئے عیسٰی فاروق کی دکان پر بھیجنے کو تو راضی ہو گئی تھیں۔ پھر اس کی سدھ بدھ لینے کا خیال بھی چھوڑ دیا۔ ایسا کیونکر ہوا؟ اس سے پہلے تو وہ کبھی ایک گھڑی کیلئے اس ستار کو اپنے سے جدا نہیں کرتی تھی"

سجاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ ہی شعر گنگنانے لگا......

"پہلے یہ بتاؤ" تمہارے پاس یہ ستار آئے کتنا عرصہ ہوا؟"

"تین سال"

"تو گویا دس سال سے بیگم ثروت اس شہر سے غائب ہیں؟"

سجاد نے نرم اور مدھم آواز میں کہا "مجھے یقین ہے ثروت کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہوگی"

"وہ کیسے؟"

"اس نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کرے گی تو مجھ سے ورنہ ساری عمر......"

"آخر شادی میں رکاوٹ کیا تھی؟"

"بیگم نہیں مانتی تھی۔ حالانکہ ثروت کے ابا جان نے کہہ دیا تھا کہ اگر ثروت یہی چاہتی ہے تو کیا مضائقہ ہے۔"

"تو پھر کیا رکاوٹ تھی؟"

"کیا بتاؤں۔ اس روز سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پہلے میری ٹیوشن چھوٹ گئی پھر میرے لئے ثروت کو گھڑی پل کیلئے دیکھنا بھی محال ہو گیا۔ بیگم نے یہ شہر چھوڑ دیا۔ نہیں نہیں یہ ملک ہی چھوڑ دیا۔"

"یعنی وہ اپنے خاوند اور بیٹی کے ساتھ کہیں باہر چلی گئیں؟"

"جی ہاں"

"اور جاتے ہوئے یہ ستار عیسٰی فاروق کے پاس کیوں چھوڑ گئیں؟"

"اب یہی تو نکتے کی بات ہے"

"عیسٰی فاروق نے تمہیں کچھ تو بتایا ہوگا۔"

"وہ تو یہی کہتا رہا کہ بیگم ضرور آئیں گی ایک دن اور اسکے کئی بلکہ کئی بار اصرار کرنے پر بھی اس کی مرمت کی جائے گی۔"

"اور وہ لوٹ کر نہ آئیں۔"

"جیسے سات برس بیتے ویسے ہی تین برس اور بیت گئے۔ اور آج تک نہ وہ آئیں نہ ثروت۔ وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ انہیں میری یاد بھی ضرور آتی ہوگی۔"

"کیا تمہاری خاطر ہی بیگم اور ثروت نے یہ ملک چھوڑ دیا"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے" سجاد نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "لیکن ایسا کیوں ہوا، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ آخر انہیں ملک چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ چاہتے تو یہاں رہتے ہوئے بھی مجھ سے قطع تعلق کر سکتے تھے۔"

سجاد کے جسم میں تھرتھری سی پیدا ہوئی۔ بولے "بیگم کے لئے عیسٰی فاروق کے دل میں محبت کی آگ ضرور سلگتی تھی۔ یہ بات مجھ سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ جب وہ اس کی دکان پر یہ درخواست کرنے آتی کہ وہ اس کے گھر پر جا کر اس کے ستار کی نئی کھونٹی لگا آئے تو وہ کچھ اس طرح مسکراتی اور پھر آنسو بہاتی کہ عیسٰی پہلے تو یہی رٹ لگاتا رہتا کہ دیکھئے بیگم ہم دوکان کھول کر بیٹھے ہیں تو کوئی ہمیں اتنا بے ایمان کیوں سمجھے کہ اپنا ستار مرمت کے لئے ہماری دکان پر نہ بھیج سکے۔ وہ بہت جھنجھلاتا لیکن دھیرے دھیرے بیگم کی مسکراہٹ اور پھر اس کے آنسو اس کے منہ سے یہ لفظ نکلوا کر ہی چھوڑتے "اچھا بیگم صاحبہ میں آ جاؤں گا۔"

میں سمجھ گیا۔ عیسٰی فاروق سے بیگم اشفاق کو واقعی محبت تھی۔ مگر ثروت کو حاصل کرنے کے لئے تم نے عیسٰی فاروق سے مدد کیوں نہ لی؟

"عیسٰی فاروق کی تو وہ بات تھی کہ اندھے کے ہاتھ پر بیگم نے سونے کی مہر رکھ دی اور اندھا یہی کہتا چلا گیا کہ یہ تو کھوٹا سکہ ہے"

"تو اب ثروت کا کیا بنے گا؟"

"وہ تو ایک روز میری ہو کر ہی رہے گی۔ وہ ضرور آئے گی"

"خیر یہ بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ یہ ستار تمہیں کیسے ملا؟"

"جب تک عیسٰی فاروق زندہ رہا اس ستار کو بیچنے سے برابر انکار کرتا رہا۔ کیا بتاؤں یہ ستار اس کی دکان میں فرش پر دیوار کے ساتھ پڑا رہتا، گرد سے اٹا ہوا۔ میں جب بھی اس کی دکان پر جاتا، وہ میرے دل کی بات سمجھ کر کہتا "دیکھو مجھ سے امانت میں خیانت کرنے کی کبھی کوئی بات نہ کرنا۔ میں وہ ستار بالکل نہیں بیچ سکتا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے بیگم آئیں گی اور آ کر کہیں گی میرا ستار کہاں ہے؟" اور اس وقت وجد میں آ کر وہ خسرو کا دوہا الاپتا۔ اور جب اس کی زندگی کی سانجھ اتر آئی تو وہ جاتا ہوا اپنے بیٹے سے کہہ گیا کہ وہ بیگم اشفاق کا ستار بالکل نہ بیچے۔

میں نے آنکھوں میں شرارت بھر کر کہا "اور عیسٰی فاروق کے مرنے کے بعد تمہارا داؤ چل گیا۔"

"جی ہاں۔ آخر میں نے عیسٰی فاروق کے بیٹے کو راضی کر ہی لیا کہ وہ میرے لئے اس ستار کی مرمت کر ڈالے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کی تونبی ٹوٹ گئی تھی۔ اور اتنی بڑی تونبی کہیں بھی نہیں ملتی تھی۔"

"پھر یہ تونبی کہاں سے ملی؟"

"یہ ایک نیگرو لڑکی سے ہاتھ لگی جو میری زرد رو نیا ریجھ گئی تھی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ وائی ڈبلیو سی اے میں رہتی تھی اور ایک روز عیسیٰ فاروق کی دوکان پر اپنے وائلن کی مرمت کرانے آنکلی۔ میں وہاں بیٹھا تھا اس نے وہ ٹوٹا ہوا ستار دیکھا اور باتوں باتوں میں بتایا کہ اسی کے بیانٹر کی ایک فالتو تونبی اس کے پاس پڑی ہے۔ عیسیٰ فاروق کے لڑکے نے اس سے میرا تعارف کرا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ زرد وینا بجانے میں میرا شہر بھر میں جواب نہیں"۔

"تو وہ تمہاری تعریف سن کر تم پر فریفتہ ہو گئی!"

"وہ تو چاہتی تھی کہ مجھ سے شادی کر لے"

"اور تم نہ مانے؟"

"میں نے ٹھیک کیا اور جہاں بھی ثروت رہتی ہے اس نے بھی ٹھیک ہی کیا ہو گا۔ اس نے تو میری خاطر خوبصورت سے خوبصورت لڑکے کا ہاتھ جھٹک دیا ہو گا۔ اب میری مشکل یہ ہے کہ وہ نیگرو لڑکی میرے ستار پر ہی نہیں، خود ستار نواز پر ہی ریجھ گئی ہے۔ اسے لاکھ ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں وہ مانتی ہی نہیں۔ کبھی تو ثروت میرے پاس آئے ہی گی"۔

"تو پھر وہ اب تک تمہارے پاس آئی کیوں نہیں؟"

"اسے بھی کسی کی موت کا انتظار ہو گا نا جیسے اس ستار کو میرے پاس چلے آنے سے پہلے عیسیٰ فاروق کی موت کا انتظار تھا"۔

میں نے کہا "یہ تو ظلم ہے کہ تم اپنی محبوبہ کے لئے اس کی ماں کی وفات کا خیال کرو"۔

سجاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں وہ بہت مجبور ہیں۔

کمرے کے کونے میں گرد سے اٹی ہوئی وینا پڑی تھی اور ایک شیلف پر رکھے ہوئے گلدان میں مرجھائے ہوئے پھولوں پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی نیلے بلب والے ٹیبل لیمپ کے نیلے شیڈ پر بھی گرد کی تہہ ہمارا منہ چڑا رہی تھی۔

سجاد بولے "ثروت آ تو جائے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ کر یوں ستار بجاؤں گا جیسے ماضی کے کانوں میں سُر کے جھمکے اور ماتھے پر سُر کے چاند کا ٹیکہ لگانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہو، وہ خود دیکھ لے گی کہ میں نے اس کے لئے محبت کے پھولوں کو مرجھانے نہیں دیا"۔

میں نے ہنس کر کہا "وعدہ کرو کہ تم ثروت کی یاد میں کمرے کی صفائی کا خیال رکھا کرو گے۔ اتنی گرد تو ٹھیک نہیں"۔

"گرد سے کیسے بچا جائے"؟ سجاد نے جھنجھلا کر کہا۔ "کئی کئی دن تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔ کسی نہ کسی گھر رات گزارنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور میں وہیں رہ جاتا ہوں"۔

"جب گھر میں کوئی سہاگن نہ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔

"ہو نہ ہو۔ تمہارا یہ ستار تو ہے جسے میں ثروت کی امی کی طرح کبھی اپنے سے الگ نہیں کرتا۔ ساڑھے تین سو روپے ادا کرنے پڑے تھے عیسیٰ فاروق کے بیٹے کو پانچ قسطوں میں۔ دن بھر موسیقی سکھاتا ہوں۔ ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی آتی ہے لیکن ثروت کا چہرہ نہیں بھولتا۔ اسی طرح جس طرح عیسیٰ فاروق کو بیگم اشفاق کا چہرہ نہیں بھولتا تھا۔ وہ سات برس اس نے کس کس طرح تڑپ تڑپ کر گزار دیئے، کوئی مجھ سے پوچھے"۔

میں نے کہا "تو تم ہمیشہ اس ستار کو اٹھائے اٹھائے پھرتے ہو؟"

سجاد بولے "کیا بتاؤں رات کو سوتے میں اٹھ کر پاس پڑے ستار کو ٹٹول کے دیکھ لیتا ہوں کہ کوئی اسے لے تو نہیں گیا!"

اور تھوڑی خاموشی کے بعد گرد سے اٹی ہوئی زرد وینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جیسے زرد وینا سے امیر خسرو نے ستار بنایا ویسے ہی اللہ میاں نے بیگم اشفاق کی بیٹی ثروت کو پیدا کیا۔ ایک دن آئے گی آنے والی آ کے رہے گی۔ آخر فریاد کی بھی لَے ہے!" اور پھر وہ تھوڑی خاموشی کے بعد بولے "اس نیگرو لڑکی کو ایک نہ ایک روز یہ وینا دینی ہی ہو گی"۔

اور وہ ستار پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولے "آؤ میں تمہیں ثروت کی یادوں کے شبستان میں لے چلوں۔ تم اسے دیکھ کر خود بخود خسرو کا وہ دوہا گنگنانے لگ جاؤ گے"۔

اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی اور سجاد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

وہ نیگرو لڑکی اندر آئی اور لجاتی ہوئی بولی "میری وہ زرد وینا کہاں ہے"۔

(باقی صفحہ ... پر)

افسانہ

واپسی

عنایت اللہ

اس کی آنکھ کھل گئی۔

اکتوبر کی آخری رات کی خنک ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی کے باریک ریشمی پردوں سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے اس کے تھکے ہارے اعصاب اور سوچ بچار کے مارے دل و دماغ کو سہلا رہے تھے۔ اس نے انگڑائی لی اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چاند کوٹھی سے ذرا ہی دور شیشم کے پیڑ کی اوٹ میں اونگھ رہا تھا اور کمرہ تھکی ہوئی چاندنی کی کرنوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ چاند کے سامنے شیشم کی جھومتی ہوئی شاخیں کمرے میں چاندنی کی لہریں پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی تپائی سے گھڑی اٹھا کر چاند کی روشنی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اس کے بستر سے اٹھنے میں تو ابھی چار پانچ گھنٹے باقی تھے۔ اس نے گھڑی رکھ کر ایک بار پھر شیشم کی گھنی شاخوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ اس نے گزشتہ نو برس میں کئی چاندنی راتیں کراچی جا کر ہاکس بے، کلفٹن اور سینڈز پٹ میں گزاری تھیں۔ یہی چاند ہوتا تھا۔ اور یہی چاندنی لیکن اس نے اس میں یہ روح افزا دلکشی نہیں دیکھی تھی جو وہ آج کی سحر دیکھ رہا تھا۔ اس نے چاند کو اتنی غور سے دیکھا ہی کب تھا۔ شاید اس لئے کہ سمندر کے کنارے ٹھنڈی ریت پر وہ اپنی کار سے ذرا دور وسکی کے نشے میں نت نئی ناظورہ کے پہلو میں بدمست بیٹھا ہوتا تھا اور چاند بادلوں کی اوٹ میں کبھی چھپتا کبھی اوٹ سے جھانکتا، سمندر کی لہروں کی اوٹ میں چھپ جاتا تھا۔ راوی میں چاندنی رات میں، اس نے چاند کو کبھی نہیں دیکھا تھا حالانکہ وہاں دو چاند ہوتے تھے۔ ایک آسمان کی وسعت میں اور دوسرا راوی کی لہروں پہ تیرتا ہوا۔ لیکن اس کی نگاہیں دائیں طرف دختر رز اور بائیں طرف دختر ناز آفریں میں الجھی رہتی تھیں۔

اس نے زندگی کی ان گنت راتیں کھلی فضا میں کھلی ہوئی چاندنی میں گزاری تھیں لیکن چاندنی میں یہ نکھار نہ تھا جو وہ آج دیکھ رہا تھا۔ تھکا تھکا سا چاند اسے کچھ یاد دلا رہا تھا۔ حسن کی یہ تھکن یا تھکن کا یہ حسن وہ پہلی بار نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہی حسن ــــ اس نے غیر ارادی طور پر سر بائیں طرف کیا۔ اس کے پلنگ کے ساتھ لگے ہوئے پلنگ پہ زاہدہ سو رہی تھی۔ چاندنی میں اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کی عجیب خوبصورتی اس شہزادی کی تصویر پیش کر رہی تھی جو شہزادے کے انتظار میں سو گئی ہے۔ اس نے زاہدہ سے نظریں ہٹا کر پھر چاند کی طرف دیکھا۔ چاندنی کی لہروں میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا اور اس میں سے ایک یاد ابھری جو لہروں پہ تیرنے لگی۔

گیارہ برس پہلے کی ایسی ہی ایک رات تھی جب زاہدہ ہر نئی نویلی دلہن کی طرح اس کے کمرۂ عروسی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ رات بھر اسے دیکھتا رہا تھا۔ منتظر عشق نے جانے کتنے سجدے بکھیر دیئے تھے۔ جنہیں حسن نے اپنی نظروں نظروں میں چرا کر حجاب کے پھولوں میں چھپا لیا تھا اور اس سہانی رات نے آج ہی کی طرح ایک سحر کو جنم دیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ صبح کے چار بج رہے تھے جب اس نے زاہدہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر دیکھا تھا۔ اس معصوم کمسن اور شباب سے دہکتے ہوئے چہرے پر ایسی ہی تھکن تھی جیسی وہ آج، گیارہ سال بعد صبح کے اس چاند میں دیکھ رہا تھا۔ اس صبح زاہدہ کی پلکیں جھکی جھکی تھیں۔

آج اسے اس چاند میں وہ گیارہ برس پہلے والی زاہدہ نظر آئی اور وہ رات جس کے انتظار میں اس نے تیس برس گزار دیئے تھے۔ آج بھی وہی زاہدہ تھی۔ گیارہ برس پہلے کی طرح۔ پچھلے گیارہ برس اس نے تمام راتیں اسی پلنگ پہ گزاری تھیں لیکن اس قرب میں اب کتنی دوری پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے درمیان ایک

خلیج حائل ہو گئی تھی جو گذشتہ چند برسوں سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی فرق صرف یہ تھا کہ برسوں پہلے یہاں اتنے قیمتی پلنگ نہیں تھے۔ سستی سی قسم کے دو نواڑی پلنگ تھے۔ ایک وہ جو اُس نے شادی سے پہلے ایک ماہ پہلے صرف پچیس روپوں میں خریدا تھا اور مزدور کی اجرت بچانے کے لئے خود ہی سر پہ اٹھا لایا تھا۔ دوسرا زاہدہ کے جہیز کا تھا جو اس کے ماں باپ نے قلیل سی آمدنی میں سے اٹھارہ روپوں میں خریدا تھا۔ گیارہ برس پہلے یہ محل نما دو منزلہ کوٹھی نہیں تھی، لاہور کے ایک کونے میں گھٹیا سا مکان تھا جس کے گھٹیا پن میں بھی ایک دلگداز سکون تھا۔ اُس وقت اُس کی چھوٹی سی کریانے اور سگریٹوں کی ایک دکان تھی، لاہور سے کراچی تک پھیلا ہوا زمین دوز کاروبار نہیں تھا۔ گیارہ برس پہلے وہ کبھی کبھی نماز پڑھ لیا کرتا تھا، اسے کبھی "حج" کی نہیں سوجھی تھی۔ اب ان دو پلنگوں کے درمیان تین "حج"، ہزاروں تولے سونا اور پورا جزیرۂ عرب آ گیا تھا!

اُس نے ایک بار پھر زاہدہ کی طرف دیکھا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہ آئی حالانکہ رات سوچتے سوچتے اسے ایک بج گیا تھا۔ غالباً ڈیڑھ بجے اس کی آنکھ لگی ہو گی۔ ابھی چار ہی بجے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور نیند بھی غائب ہو گئی۔ روزمرہ کے معمول کے مطابق اس کی آنکھ ساڑھے آٹھ بجے کھلنی چاہئے تھی۔ وہ دوسری کروٹ سے سو گیا۔ آنکھیں بند کیں مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں کھل کر شیشم کی ڈالیوں پہ جھولتے ہوئے چاند کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے جھنجھلا کر کروٹ بدل لی۔ اُس طرف اُسے زاہدہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ اکتا کر پیٹھ کے بل ہو گیا۔ اور چھت میں لٹکتے ہوئے پنکھے کو دیکھنے لگا۔

اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ سو نہیں سکے گا۔ اس کی نگاہیں نادنی سے بھرے ہوئے کمرے میں آہستہ آہستہ گھومنے لگیں جیسے وہ اجنبی جہان کی طرح آج پہلی بار اس کمرے میں داخل ہوا ہو اور یہ سازوسامان اور شاہانہ فرنیچر جو اُس نے اپنی آسائش کے لئے خریدا تھا جیسے اس کا اپنا نہیں تھا اور نہ اس کو اس کمرے میں رہنے کا ہی کوئی حق تھا حالانکہ گذشتہ آٹھ برس سے وہ اس میں رہ رہا تھا اور زاہدہ کے روکنے اور منت سماجت کے باوجود یہاں شراب پیتا اور پی کر آتا تھا۔

وہ آج کی سحر کسی چیز کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی نگاہیں اسے سب کچھ دکھا رہی تھیں۔ وہ سامنے قدِ آدم آئینہ اور سنگار میز جو بنانے والے نے تو عورتوں کے لئے بنایا تھا۔ لیکن اس نے ساڑھے تین سو روپوں میں اپنے لئے خرید کے رکھا ہوا تھا۔ یہ دو پلنگ ساڑھے پانچ سو کی مالیت کے تھے۔ تپائیاں اور ان کے اوپر گلدان جن پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ نائیلون کے پردے دیواروں کے ساتھ آویزاں نیم برہنہ عورتوں کی تصویریں اور فرش کے پورے سائز کا نہایت قیمتی قالین۔ صرف چھت کی گلکاری پر اُس نے دو ہزار روپیہ صرف کیا تھا۔ یہ اس کے سونے کا کمرہ تھا جو کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا۔ اس کی نگاہیں بند دروازے سے نکل کر کوٹھی کے تمام کمروں اور غلام گردشوں میں گھومنا چاہتی تھیں لیکن اُس نے انہیں بمشکل روک لیا اور انھیں پلکوں میں بند کر لیا۔ اُس نے پلکوں کے اندھیرے میں پناہ ڈھونڈی تھی لیکن اس اندھیرے میں سے کچھ خیال محسوس پیکر اور تلخ حقائق بن کر اس کے سامنے آ گئے اُس نے سٹپٹا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ چاند جو اسے ابھی ابھی اچھا لگا تھا اور اسے شبِ عروسی یاد دلا گیا تھا اب اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ تھکے ہوئے دماغ میں خیالوں کا سیل امڈ آیا۔ پھر وہی خیال، پھر وہی باتیں، جنہیں وہ رات ڈیڑھ بجے نیند میں ڈبو چکا تھا جوں کی توں موجود تھیں:

وہ اٹھ بیٹھا۔ جیسے ہارا ہوا بادشاہ زخمی ہو کر غار میں آ چھپا ہو۔
وہ آج بیس پچیس روز سے اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ گیارہ برس پہلے کا دور اور آج کا وقت اسے چکی کے پاٹوں کی طرح پیس رہا تھا۔ اسے کوئی راہِ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے صرف اسی قدر اطمینان تھا کہ وہ نئے قانون کی زد سے بچ گیا ہے لیکن اس کی لاکھوں کی دولت ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت صرف دس ہزار روپیہ تھا۔ باقی تمام اُس نے اپنے ایک حصہ دار کو پیشگی ادا کر کے باہر بھیج دیا تھا لیکن مال کراچی کی بندرگاہ سے پچاس میل دور سے ہی واپس چلا گیا تھا۔ مال بھی گیا اور حصہ دار بھی مع رقم لاپتہ! اسے معلوم تھا یہ دولت ناجائز اور غیر قانونی تھی وہ کسی عدالت میں اس نقصان کا دعوےٰ نہیں کر سکتا تھا۔ حصہ دار وقت کا فائدہ اٹھا گیا تھا۔ ۲۸ اکتوبر کی صبح ہی بحیرۂ عرب کے اس کنارے کے بیوپاریوں نے اُس پار کے کاروباریوں کو اطلاع بھیجی

تھی کہ مال روک لو، خطرہ ہے۔

خطرہ تو ٹل گیا تھا لیکن اس کا تین لاکھ روپیہ جو اس نے اس امید پر حصہ دار کو دے دیا تھا کہ چھ لاکھ ہو جائے گا، بحرِ عرب پر تیرتا ہوا عرب کی ریت میں مل گیا تھا۔ اب اس کے پاس دس ہزار روپیہ، ایک کوٹھی کراچی میں اور ایک لاہور میں رہ گئی تھی۔ ایک کار تھی۔ دونوں کوٹھیوں پہ اُس نے لکیر پھیر دی کیونکہ دونوں متروکہ جائداد تھیں اور دونوں کی تعمیر غیر قانونی۔ نئی حکومت نے متروکہ جائداد کے ظاہر کرنے کے احکام اور احکام کی خلاف ورزی کی سزاؤں کا اعلان کر دیا تھا۔ کار اسے اب سفید ہاتھی کی طرح دکھائی دے رہی تھی، وہ آسمان سے گر پڑا تھا لیکن کس بے ڈھب طریقے سے۔

اُس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے سر گھٹنوں پہ رکھ لیا اور اپنے آپ کو حقائق کے سپرد کر دیا۔ لمحات نہایت آہستہ آہستہ گذر رہے تھے۔ اخباروں کی ہر روز نت نئی خبریں اور اس کے اپنے خیالات کی تلخیاں سنسناتی ہوئی گولیوں کی طرح اس کے وجود سے پار ہوتی جا رہی تھیں۔ اُسے اخباروں پہ غصہ آنے لگا جو اس قسم کی خوفناک خبریں شائع کر رہے تھے۔ اُس نے سوچا کیا خوب زمانہ تھا کہ کسی وزارت کے ٹوٹنے کی خبر آتی تھی۔ آئے دن نئے وزیر بنتے تھے۔ وہ انہیں دوست بناتا ایک آدھ کو اپنے کاروبار کا حصہ دار بناتا۔ پھر کیا مجال جو کراچی کی بندرگاہ پر کوئی اس کے مال کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے۔ لیکن یہ انقلاب! وہ تڑپ اٹھا جیسے اس کے سارے جسم میں درد کی ٹیس اٹھی ہو۔ کمرے میں ایسا سکوت تھا کہ نائلون کے پردوں کی لرزش بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ پلنگ سے اٹھا، ہاری ہوئی سی ایک انگڑائی لی۔ اور کھڑکی کے قریب جا کر باہر اس انداز سے جھانکا، جیسے کوئی قیدی لوہے کی سلاخوں میں سے اُس دنیا کو دیکھ رہا ہو جو اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی کتنی دور ہو جاتی ہے۔

وہ شب بیداری، تفکرات سے بوجھل دماغ اور گناہوں سے بوجھل ضمیر کو سنبھالتا ہوا پیچھے گھوما اور قالین پہ بے آواز پا خراماں خراماں چلتا ہوا زاہدہ کے سرہانے جا رکا۔ وہ سو رہی تھی ۔۔ گہری نیند اُس نے سوئی ہوئی نسائیت اور اس کی معصومیت کو برسوں بعد محسوس کیا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ زاہدہ کے بھولے بھالے چہرے پہ وہی برسوں پہلے کی رونق ہے لیکن آنکھوں کے گرد اور ہونٹوں کے کونوں میں شکوے تڑپ رہے ہیں: "میں نے غربت میں تیرا ساتھ دیا ہے۔ تجھے دولت ملی تو غیر ہو گئی!" اُسے یوں لگا جیسے زاہدہ کی لطیف سی سانسیں اُسے بآواز بلند کہہ رہی ہیں "کیا تیری محبت کو جیتنے کے لئے میں بھی خود فروش بن جاؤں؟ تو کار لے کر میرے دروازے پر آئے اور میں تیرے ساتھ چل پڑوں؟ تو غیر عورت کی راہ میں دولت بچھاتا ہے۔ میں نے تیری راہ میں آنکھیں بچھائی ہیں۔ جن راہوں پہ تُو ہر شام نکل جاتا ہے میں اُن پر آنسو چھڑکتی ہوں۔ تو نے سچ کہے ہیں میں نے تیرا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کی ہے کہ سچ اکبر ہے۔ مگر پہلے تو مجھ سے کچا کچا رہنے لگا، اب دو سال ہوئے میرے ساتھ کلام کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

وہ سوئی ہوئی زاہدہ کو دیکھتا رہا۔ اس کا ایک ہاتھ لاشعوری طور پر اس کی پیشانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رات کا سکوت ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے لرز اٹھا۔ وہ چونکا اور لرز کر پیچھے ہٹ گیا۔ راوی کے پُل پر مال گاڑی گزر رہی تھی۔ اُس نے بکھرے ہوئے خیالوں کو پھر چُن لیا اور دونوں ہاتھ زاہدہ کے پلنگ پر رکھ کر ذرا سا جھکا۔ ہوا کے جھونکوں نے جیسے اسے کہا "تجھے دولت ملی تو زاہدہ تجھے بُری لگنے لگی۔ کہاں گئی وہ دولت؟ آج تیرے پاس دولت نہیں رہی۔ اسمگل کیا ہوا سونا بحرِ عرب اور شراب کی لہروں میں بہہ گیا ہے۔ دولت کراچی اور لاہور کی ہوس رانیوں نے چوس لی۔ کچھ رشتے کے بھائی اور ماں باپ جسے تیری زوجیت میں دینے کے فریب میں کھا گئے۔ تیرے پاس آج کیا رہ گیا ہے؟ ۔۔ جرائم۔ گناہوں کا بوجھ تیری روح کو کچی شاخ کی طرح توڑ چکا ہے۔ پہلے تو نے دولت کو سمیٹا تھا، اب گناہوں کو سمیٹ لے۔ یہی تیری پونجی ہے!"

اس کے اپنے ضمیر کی آوازیں اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ مار رہی تھیں۔ اُس نے چاہا زاہدہ کو جگائے، اس کے قدموں پر سر رکھ کر گناہوں کا اعتراف کرے۔ اس سے کہے "تو ہی میری پناہ ہے، تو ہی میری ہم سفر ہے۔ میں تھک گیا ہوں۔ ہار گیا ہوں مجھے تھام لے" لیکن اُس میں اقبال جرم کی ہمت نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ لاہور کے ہنگامے سونے ہو گئے تھے۔ راوی جاگ رہا تھا۔ لہروں کا ہلکا ہلکا شور فضا میں خنک سا ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں ہی سڑک پہ چلنے لگا اور منڈی کی طرف چل پڑا۔ تصور میں اسے چھوٹی سی ایک دکان نظر آئی۔

جس میں چند کنستر اور بوریاں رکھی ہوتی تھیں۔ دال، مرچ، مصالحہ، چاول اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزیں۔ چند ایک سگریٹ، بیڑیاں اور ماچسیں ہوتی تھیں۔ اڑھائی تین روپے کی روز آمدنی ہوتی تھی۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ بڑا سارا گھر تو دراصل کے اس پار رہ گیا تھا۔ اسے یہی چھوٹا سا گھر اچھا لگنے لگا تھا۔ پھر زاہدہ اس گھر میں داخل ہوئی تو اسی محدود سی چار دیواری میں کس قدر وسعت پیدا ہو گئی تھی! زندگی، شگفتگی اور ٹھہرے ہوئے تلے سے رومان کی لہروں پر تیرتی جا رہی تھی۔

اُسے وہ دن بھی یاد آیا جب اس کا ایک عزیز دوست اس کے پاس دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے ایک گاہک کو گولڈ فلیک کا پیکٹ ساڑھے آٹھ آنے میں دیا۔ یہ نو برس پہلے کا واقعہ تھا۔ گاہک چلا گیا تو دوست نے کہا تھا "نیک بخت! کیوں روزی کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہو۔ یہ سگریٹ آج چودہ آنے میں بک رہا ہے۔ دو بھی سو منتوں کے بعد۔ اور تم؟" اور دوست نے اسے ایسا ہنر سکھا دیا تھا کہ تمام سگریٹ، کنستروں اور بوریوں کے نیچے غائب ہو گئے۔ پھر چودہ آنے اور کچھ منت سماجت کے بعد ایک ایک پیکٹ نکلنے لگا۔ اس سے پہلے وہی پچاس ڈبیوں کا پیکٹ جس میں سے وہ بمشکل دو روپے منافع کماتا تھا۔ اب اسے پچیس کے بدلے پچیس روپے دینے لگا۔ اسی دوست نے اسے سفید چینی بلیک کرنے کا ہنر سکھا دیا تھا اور ڈپلیکس کارڈوں پر ایک روپیہ ایک آنے سیر خریدی ہوئی چینی دو روپے سیر بکنے لگی۔ چھوٹا سا گھر بڑا ہونے لگا۔ اور دکان چھوٹی نظر آنے لگی۔ ایک سال کے اندر اندر دکان غائب ہو گئی، زمین کے اندر چلی گئی، پھر زمین کے اندر ہی اندر کراچی تک جا پہنچی اور کراچی سے عرب تک! پھر حج کے لئے پاسپورٹ بنے۔

پہلے حج کے لئے وہ اکیلا گیا تھا اور باقی دو حجوں میں اس کا سارا کنبہ ساتھ گیا تھا۔ کراچی کی ایک رسوا عورت اس کی "اہلیہ"، ایک اور اس کی "بیٹی" اور دو جرائم پیشہ لڑکے اس کے "بیٹے" بنے۔ جعلی پاسپورٹوں پر ان حجوں نے لاکھوں روپوں، ایک کار اور دو کوٹھیوں کو جنم دیا۔ پھر حج کی ضرورت نہ رہی کیونکہ سمندر کے اُس پار زمین دوز ایجنسی قائم ہو چکی تھی اور دولت تیرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ زاہدہ نئی دولت کی بھول بھلیوں میں اپنے خاوند کو تلاش کرنے لگی لیکن خاوند اس سے دور ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آج کراچی تو کل لاہور

ہوتا۔ دوپہر گھر میں اور رات ــــ اگر وہ کبھی کبھار بھولے بھٹکے رات گھر میں گزارتا بھی تو زاہدہ سے قریب ہوتے ہوئے بھی اُس سے بہت ہی دور رہتا۔ اس کی نظر میں زاہدہ ایک دو سالوں میں ہی پرانی ہو چکی تھی۔

زاہدہ نے شکوے کئے، روئی بھی۔ اُن دنوں کی معصوم اور بھولی بھالی محبت کے واسطے بھی دیئے جب وہ اسے دکان پر روٹی دینے جایا کرتی تھی اور دروازے میں کھڑی اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن وہ کوسوں دور نکل گیا تھا۔ نئے ماڈل کی کار کی رفتار بہت تیز تھی، اور دولت کا نشہ اس سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ زاہدہ آخر تھک ہار کر چپ ہو گئی اور اس انتظار میں گھر کے ایک کونے میں پھینکی ہوئی بیکار شے کی طرح بیٹھ گئی کہ اس کا خاوند ایک نہ ایک دن اُس کی دنیا میں واپس آ جائے گا لیکن اسے بہت کم اُمید تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ابھرتے ہوئے محلات چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کو اجاڑ دیا کرتے ہیں۔ اُس نے کتنی ہی پاکدامن بیویاں دولت کے انباروں میں دفن ہوتے دیکھی تھیں اور ان انباروں میں سے نئی سے نئی بیویوں کو اُبھرتے دیکھا تھا۔

وہ راوی کی طرف چلا جا رہا تھا اور گزرتے ہوئے وقت کے لمحات اس کے سر کے اوپر شہد کی بھڑکی ہوئی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ وہ سر جھکائے جا رہا تھا کہ لاشعوری طور پر اس کی گردن بائیں طرف گھوم گئی۔ اسے چھوٹا سا کوٹھی نما مکان نظر آیا۔ اس کے قدم ایک عادت کے تحت رکنے لگے۔ یہ رعنا کا گھر تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی نوجوان اور شوخ رعنا جس کا رشتہ اس کے بھائی اور ماں باپ اچھی قیمت پر دینا چاہتے تھے۔ اس نے اس کی خاطر آٹھ دس ہزار روپیہ لٹا دیا تھا اور ایک کار کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس کے بھائی اور ماں باپ کھاتے جا رہے تھے اور بھائی درپردہ کسی اور بڑے گاہک کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ رعنا بھی ان سودے بازیوں سے واقف تھی اور وہ اُسے خوب بنا رہی تھی۔

اُس نے اس گھر کو دیکھا تو غصّے کا ایک شعلہ اس کے سارے جسم کو جلا گیا۔ اُس نے سوچا ۲۸ ر اکتوبر کے بعد حالات نے کیسا پلٹا کھایا ہے کہ چند روز ہوئے وہ رعنا کے ہاں اسے پکچر پر لے جانے کے لئے گیا تو اس نے بے رُخی سے کہہ دیا "میری طبیعت خراب ہے" اور اس کے دونوں بھائیوں نے بھی اسی بے رُخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ غصّے میں ان پر برس پڑا تھا اور کہا تھا "تم لوگ میرا آٹھ دس ہزار روپیہ کھا چکے ہو۔

اور تم نے اپنی بہن کا رشتہ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ میں چاہوں تو ..... "

جانے وہ کیا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رعنا کا بڑا بھائی، جو بلیک مارکیٹنگ میں ماہر تھا، نہایت احترام سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بول پڑا تھا۔ "حاجی صاحب! آپ کو تو خود علم ہونا چاہئے کہ آپ حاجی نہیں ہیں۔ آپ اسمگلر ہیں اور اب بھاگے ہوئے مجرم! کون جانے آپ کو کس وقت مارشل لاء والے پکڑ کے لے جائیں۔ سی آئی ڈی والے گھر کے بھی چکر کاٹ چکی ہے۔ فوجی کسی کو بخشیں گے نہیں۔ ہم اپنی بہن کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتے۔" اور وہ باقی باتیں سنے بغیر وہاں سے لوٹ آیا تھا۔

اور آج؟ دولت گئی، رعنا ہاتھ سے گئی، زاہدہ کو الگ ناراض کیا۔ اب زاہدہ کی پاکیزہ دنیا میں واپس جائے تو کیسے؟ وہ دھتکار نہ دے۔ وہ یہ طعنہ نہ دے بیٹھے کہ تم تو دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ کہاں ہے وہ دوسری؟

اُس کے قدم رک رہے تھے۔ اُسے بہت کچھ یاد آیا اور وہ رکتے ہوئے قدموں کو گھسیٹتا ہوا تیز چل پڑا۔ رعنا کے مکان سے بہت دور اور بہت جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اُس کے بند دروازے کے عقب سے جیسے اس پر کسی نے فقرہ چست کر دیا تھا اور ایک طنزیہ قہقہہ۔ "حاجی صاحب! آؤ شادی کرو گے؟ دس ہزار لگیں گے۔ ہے کچھ پاس پلے؟" وہ اور تیز چل پڑا۔

وہ راوی کے کنارے بیٹھ گیا۔ صبح کی سپیدی پھیلنے لگی تھی۔ پرندے گھونسلوں سے نکل کر دریا کے کنارے پانی پینے بیٹھ رہے تھے، اڑ رہے تھے۔ ماہی گیروں کی دو کشتیاں دور بہتی جا رہی تھیں۔ اُس نے کنارے پر بیٹھ کر پاؤں پانی میں رکھ دیئے۔ اس کا انگ انگ جل رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کی خنکی اس کے دماغ تک پہنچ گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانسیں لیں۔ چڑیوں کا ایک غول اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور گرد و پیش کو نظر بھر کے دیکھا۔ ایک ایک چیز کو اور قدرت کے ایک ایک رنگ کو۔ صبح کی سپیدی کو دیکھا۔ شفق کی مسکراہٹ کو دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک انوکھا سا قرار اس کے ریشے ریشے میں سرایت کرنے لگا۔

نور کی یہ بارش اُس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ پانی کی روانی کو اُس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ سامنے دریا کے اُس پار درختوں کے جھنڈ نکھرتے جا رہے تھے ستارے چینی کے ذروں کی طرح پگھل کر صبح کے نور میں تحلیل ہو گئے تھے۔ لہروں کا جل ترنگ اور پرندوں کی طرح طرح کی بولیاں ایک ہی راگ پہ منظم تھیں۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تھکے ہوئے ضمیر نے کرب آلود انگڑائی لی۔ اس کے جلتے ہوئے سینے سے آہ نکلی۔ ایک ہوک!

"اے صبح کے نور کے خالق! میں نے تین بار تیرے حبیبؐ کی تربت کی بے ادبی کی ہے۔ میں نے تیرے نام پر قوم کو دھوکے دیئے ہیں۔ تو خدا ہے، میں بندہ ہوں۔ میں نے گناہ کئے۔ شاید اس لئے کہ ایک دن راہ پہ آ جاؤں گا اور تو بخش دے گا۔ میرے مالک! اپنی اس صبح کے نور کا ایک ذرہ میرے سینے میں سمو دے۔ صرف ایک ذرہ! میں بھٹک گیا ہوں۔ راہ دکھا دے۔"

سارسوں کا جھنڈ اس کے سر کے بہت اوپر سے چاند کی شکل میں اڑتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال آیا جیسے اندھیرے میں ایک کرن۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اور حقائق کا جائزہ نئے سرے سے لینے لگا۔ اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ نئے قانون کی زد سے باہر تھا۔ کیونکہ پہلا مال فروخت ہو چکا تھا اور دوسرا مال واپس ہو چکا تھا۔ اُس نے دریا کے کنارے کھڑے کھڑے طے کر لیا۔ "کاروبار بیچ دوں گا۔ لاہور کی کوٹھی والا فرنیچر وغیرہ فروخت کر کے دونوں کوٹھیاں حکومت کے حوالے کر دوں گا۔ اور اچھا سا ایک مکان بنوا لوں گا جس میں زاہدہ نئی نویلی دلہن کی طرح آباد ہو گی۔"

وہ بہت تیزی سے واپس آ رہا تھا۔ ضمیر نے ایک جھٹکے سے سارا بوجھ راوی میں پھینک دیا تھا۔ جب وہ کوٹھی میں داخل ہوا تو سورج نکل رہا تھا۔ وہ بیش قیمت فرنیچر اور سامان زیبائش و آسائش سے آراستہ کمروں میں سے گزرتا ہوا سونے کے کمرے میں جا پہنچا۔ زاہدہ کو آواز دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

آج برسوں بعد اس کی آواز میں وہی چاہت اور وہی محبت تھی جو آٹھ نو برس پہلے تھی۔ زاہدہ نے اسی آواز کے انتظار میں یہ لمبے لمبے سال کوٹھی کے ایک کونے میں رو رو کر گزار دیئے تھے۔ وہ بھاگی ہوئی آئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس کے خاوند نے بلایا ہے۔ آج برسوں بعد اس کے منہ سے وہ اپنا نام سن رہی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو اُس نے اُسے اپنے پاس بلایا۔

زاہدہ ایک اجنبی کی طرح اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اُس نے اُسے اشارے سے پلنگ پہ بیٹھنے کو کہا وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ دریا سے واپس آتے وقت اس نے کتنی باتیں سوچی تھیں جو وہ زاہدہ سے کہے گا لیکن وہ سامنے آئی تو کوئی بات منہ سے نکل نہ سکی۔ اس نے زاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی پیشانی پہ رکھ دیا اس ہاتھ کے لمس نے جیسے اس کے وجود کا سارا زہر چوس لیا۔ سینے میں باتوں کا طوفان امڈ آیا جسے وہ سنبھال نہ سکا۔ اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ صرف اسی قدر کہہ سکا۔ "زاہدہ"! اس کے ہونٹ کانپ کے رہ گئے!

زاہدہ چند دنوں سے اس کی گھبراہٹ اور بے تاب کیفیت دیکھ رہی تھی۔ وہ ساری بات بھانپ چکی تھی۔ وہ ملک کے عظیم انقلاب اور نئی حکومت کی سرگرمیوں سے آگاہ تھی اُس نے خاوند کو خفت سے بچانے کے لئے کہا "آپ کہیں باہر چلے گئے تھے؟"

"ہاں" وہ بصد مشکل کہہ سکا۔ "ذرا راوی کی طرف سیر کو نکل گیا تھا"

"کس وقت؟"

"ابھی ابھی" اُس نے بلا وجہ جھوٹ بولا۔ "تھوڑی ہی دیر ہوئی"

زاہدہ کی باتوں اور انداز نے اسے سنبھالا دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھینپ گیا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"آپ کہتے ہیں آپ ابھی ابھی گئے تھے" زاہدہ نے پیار سے کہا۔ "صبح کی سیر اچھی ہوتی ہے۔ آپ اتنی جلدی واپس آگئے۔ ذرا دیر اور......"

"ہاں زاہدہ!" اُس نے بے بس ہو کر زاہدہ کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے دکھ بھری آواز میں کہا "میں واپس آگیا ہوں"

اُس کے آنسو جاری ہوگئے۔ جنہیں زاہدہ نے ڈوپٹے سے یوں پونچھ ڈالا جیسے خدا نے اس کے ضمیر سے گناہوں کی نمی پونچھ ڈالی ہو ٭

★

"ستاروں کی چال" بقیہ صفحہ ۸۶

ظہیر:۔ ہاں زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہیں۔ میرے ساتھ رہتی ہیں۔ تم سے مل کر بھلا انہیں بے انتہا خوشی ہوگی۔ چلو، اٹھو منی۔

صفیہ:۔ (اٹھتے ہوئے) چلو۔ (ظہیر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ دونوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ پھر ظہیر [illegible])

ظہیر:۔ ارے! ہم نے ــــ یعنی افضل صاحب؟

صفیہ:۔ (خشک لہجے میں) تم افضل کی فکر نہ کرو۔ وہ بالکل برا نہیں مانیں گے (طنزاً) بڑے فراخدل ہیں وہ! (اشتیاق سے) ہم دادی سے مل لیں تو پھر تم ہمارے یہاں چلے چلنا۔ امی بیچاری کل ہی ناگپور ــــــ!

(باتیں کرتے ہوئے اسٹیج سے باہر چلے جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہونے کے چند لمحوں بعد افضل تیار ہو کر اسٹیج پر آتا ہے۔ اسٹیج خالی دیکھ کر خاصا پریشان لگتا ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر چیختا ہے)

افضل:۔ صفیہ! صفیہ؟ کہاں ہو بھئی تم دونوں؟

(پردہ اچانک گرتا ہے)

"فریاد کی لے" بقیہ صفحہ ۹۶

سجاد کی انگلیاں ستار پر چلنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا عروس بہار کی اجنبی نگاہ فریاد کی لے کے ساتھ اٹھ رہی ہے۔ اس کے منہ سے نکلا "معلوم نہیں ستار کس کے لئے رو رہا ہے؟"

میرے تصور میں بیگم اشفاق اور عیسٰی فاروق کے چہرے خلط ملط ہو رہے تھے اور ان پر ثروت اور سجاد کے چہرے اپنے نقوش اجاگر کر رہے تھے۔

نیگرو لڑکی نے اٹھ کر کونے میں پڑی ہوئی ردوینا اٹھا لی اور اسے رومال سے صاف کرنے لگی۔ پھر وہ بک شیلف کی کتابیں رومال سے صاف کرتے ہوئے انہیں سجا کر رکھتی چلی گئی۔ بار بار اس کی نگاہ سجاد کی طرف اٹھ جاتی تھی جن کے سر کے بال ثروت کے انتظار میں آدھے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے اور انگلیاں گرد سے اٹے ہوئے اس کمرے میں ننھے سے پھول کھلا رہی تھیں ٭

فکاہیہ

"موت آتی ہے پر نہیں آتی"

سعید احمد رفیق

نقل کفر کفر نباشد۔ مشہور مقولہ ہے 'ایک دن مہمان' دوسرے دن مہمان تیسرے دن ___' سنا تو یہ آپ نے بھی ہوگا اور آپ کی طرح ہم نے بھی سن رکھا تھا۔ لیکن سوچتے تھے، مہمان کی یہ تعریف کیسے ہو سکتی ہے۔ یا وہ خدا نخواستہ "بے ایمان" کیسے بن سکتا ہے، دانے دانے پر مہر ہوتی ہے، جو آتا ہے اپنی قسمت کا کھاتا ہے۔ کچھ دن رہتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ وہی بات کہ

ع
زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوشنوا
آ کے بیٹھا شاخ پر کچھ چہچہایا، اڑ گیا!

ایک عرصہ بعد ملنے اور ساتھ رہنے سے جو خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ لیکن صاحب اب تو ہم بھی ایمان لے آئے کہ یہ مقولہ سو فیصدی صحیح ہے۔ بس ذرا سی تصحیح کی ضرورت ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ 'ایک دن کا مہمان عذاب جان۔ دوسرے دن کا بے ایمان اور تیسرے دن کا ___' لاحول ولا قوۃ۔

ہمارے ایک نامور ادیب دوستوں سے بڑے پریشان تھے اور ایک ادیبہ بچوں سے۔ لیکن یقین کیجئے اگر ان میں سے کسی کو بھی اس جنس سے واسطہ پڑ جاتا تو دوست اور بچے بسا غنیمت معلوم ہوتے ___ بھلا دوست بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ "مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"۔ دوست کا کیا۔ کبھی آئے کبھی نہ آئے۔ اور آئے تو آکر چلا جائے۔ نہ ہوئے مہمان جو آنا تو جانتے ہیں، جانا نہیں جانتے۔ اور رہے بچے۔ بچے تو خدا کی ایسی نعمت ہے جو ہو تو مصیبت اور نہ ہو تو ارمان۔ مگر بچہ اور مہمان کا کیا مقابلہ؟ ایک کے جانے کا ڈر اور دوسرے کے تشریف لے جانے کی تمنا۔ ڈر تو کبھی کبھار سامنے آ ہی جاتا ہے۔ لیکن تمنا تو کبھی بھی پوری نہیں ہوتی۔ وہ تمنا ہی کیا جو پوری ہو جائے، جو حسرت نہ بن جائے۔ اور وہ مہمان ہی کیا جو آکر چلا جائے۔ نہ مہمان کو عقل آتی ہے کہ چلا جائے ___ نہ ملک الموت کو کہ اس بلائے بے درماں کو لے جائے۔ اور بیچارہ میزبان کہ "موت آتی ہے پر نہیں آتی"۔

کوئٹہ کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ہل اسٹیشن کہلاتا ہے۔ ویسے تو یہاں ہلز یعنی پہاڑیاں بھی بہت سی ہیں، اور ایک اسٹیشن بھی ہے۔ لیکن ایک کو دوسری چیز سے کوئی واسطہ نہیں۔ پہاڑیاں الگ ہیں اور اسٹیشن الگ۔ بہرحال ہے کوئٹہ ہل اسٹیشن۔ ہو یا نہ ہو بہرحال کہلاتا یہی ہے، اور کیوں نہ کہلائے۔ صرف تین چار مہینے تو دن میں زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ گھنٹے درجۂ حرارت تقریباً سو رہتا ہے۔ یہاں موسم گرما اکیلا نہیں آتا بلکہ اپنے ساتھ مہمان بھی لاتا ہے۔ خدا کی اس مخلوق کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ بعض مہمان خطرہ کی گھنٹی بجا کر آتے ہیں۔ دوست اور رشتہ دار اپنی تشریف آوری کی اطلاع تار سے دیتے ہیں اور اپنے دوستوں کی آمد کا مژدہ خط کے ذریعے سناتے ہیں۔ بعض حضرات تو اس قسم کے بیکار تکلفات کے بھی قائل نہیں۔ وہ اپنی آمد کی اطلاع دینے خود ہی تشریف لے آتے ہیں۔ آپ نہایت آرام سے گھر میں بیٹھے ہیں، لیٹے ہیں، کھانا کھا رہے ہیں یا گھر والی سے گھرکیاں۔ وہ آپ سے ناراض ہیں یا آپ ان سے خوش۔ بہرحال بچوں کو گھرک رہے ہیں، مار رہے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کر ہی رہے ہیں کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور مہمان صاحب موجود! غالب کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ جب موت کے لئے دن کا وقت معین ہے تو پھر رات کو نیند کیوں نہیں آتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں لاشعوری طور پر اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔

ہم سو رہے ہوں اور موت ہماری اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر چپکے سے آجائے۔ اور جب ہم بیدار ہوں تو معلوم ہو کہ ہم غائب۔ ہم تو مر بھی چکے۔ نہ معلوم موت کے بعد اس قسم کی باتیں سوچنے کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن مہمان کی آمد کے بعد تو سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور بڑی مشکل یہ ہے کہ موت کے لئے بقول غالب دن کا وقت معین ہے (اگر آپ کو غالب کے شعر کے معنی صحیح نہیں معلوم تو میرا کیا قصور؟ کسی اسکول ٹیچر سے پوچھ دیکھئے۔ وہ ایسی تشریح کرے گا کہ نہ آپ زندہ رہیں گے نہ موت آسکے گی۔ عالم برزخ اسے ہی تو کہتے ہیں نا) لیکن مہمان کے لئے وقت کی بھی کوئی قید نہیں۔

یہ وقت کا مسئلہ بھی بڑا عجیب ہے۔ ایک مرتبہ ہمیں فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا۔ اپنے خیال میں پڑھا اور خوب خوب پڑھا۔ فلسفہ کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ سمجھ میں آجائے۔ وہ فلسفہ ہی کیا جو سمجھ میں آجائے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ مادّہ اور ہیولیٰ کیا ہوتا ہے لیکن یہ زمان کا مسئلہ، یقین کیجئے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ زماں، مکاں، دوراں، لامتناہیت، قدیم، حادث، اور پھر فارابی، غزالی، ہیگل، برگساں، اقبال اور آگے آیت! لیکن یہ مسئلہ اب حل ہو گیا ہے۔ مہمانوں کی آمد نے اس مسئلہ لاینحل کو اس طرح سمجھا دیا ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ مہمان کا جب جی چاہے آئے۔ اور اگر کبھی نہ جائے۔ بلکہ آنے کا سوال ہی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ وہ ازلی اور ابدی ہے موت صرف ایک مرتبہ آتی ہے۔ اور مہمان اس وقت تک آتے رہتے ہیں۔ جب تک موت نہیں آتی۔ نہیں صاحب وہ تو موت کے بعد بھی آتے ہیں۔ اور سنا ہے بہت آتے ہیں۔ خیر آتے رہیں، ہمیں کیا، کبھی تو انہیں بھی ...

مہمان خدا کی رحمت ہے۔ بے شک، بلکہ اس سے بھی ایک نقطہ زیادہ۔ قلیل آمدنی، چھوٹا سا مکان، ماشا اللہ، کئی کئی بچے اور ایک سے ایک تمیزدار۔ ویسے تو بچے کبھی کبھار غلطی سے کہنا مان بھی جاتے ہیں۔ لیکن کوئی مہمان آیا اور بچوں کو پورن سوراج ملا۔ جانتے ہیں، اب کوئی کچھ کہہ تو سکتا نہیں۔ یہاں چڑھ وہاں چڑھ۔ یہ لے وہ پھینک۔ کشتی، مار پیٹ۔ آپ خاموش ہیں نہ کچھ کر سکتے ہیں نہ کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لال پیلی آنکھیں کئے بیٹھے ہیں، لیکن بیوقوف ہیں بچے جو آپ کی طرف دیکھیں۔ انہیں جو موقع ملا ہے اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ مہمان صاحب شروع میں دو چار دن تو بچوں سے کچھ لاڈ پیار کرتے ہیں اور جب بچے لاڈ پیار شروع کرتے ہیں تو گھبرانے لگتے ہیں۔ اب بھلا اس کا کیا علاج؟ ان سے پوچھئے آپ نے شروع ہی میں بچوں کو سر کیوں چڑھایا تھا کہ اب ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک صاحب تھے تو "فارغ البال"۔ نوکر پر بہت خفا ہوئے، کہنے لگے تم بہت سر چڑھ گئے ہو۔ یہ حضرت تھے حقیقتاً سر چڑھے۔ (یقین کیجئے حضرت سعدی کی نصیحت کا اس سے کوئی تعلق نہیں) معصومیت سے کہنے لگے "صاحب مجھے پھسلنا تو نہیں ہے"! پھر تو یہ مہمان صاحب ایسے گئے، جیسے خود ان کے سر سے سینگ۔ اور اب تک تو ہم ان سے محفوظ ہیں۔ دیکھئے کب تک محفوظ رہتے ہیں اور وہ صاحب کب تشریف لاتے ہیں۔ خیر مجھے اس نوکر کا پتہ معلوم ہے۔ ذرا آنے تو دو انہیں۔

آپ کہیں گے یہ قلیل آمدنی کا کیا ذکر —— دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ مہمان آتا ہے اپنی قسمت کا کھاتا ہے پھر بھلا کیا فکر، میں بھی قسمت کا قائل ہوں۔ قائل نہ ہوں تو کیا کروں، مجبوری کا نام صبر ہے۔ مہمان اپنی قسمت کا کھاتا ہے۔ اور دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ لیکن ان مہر شدہ دانوں تک رسائی اور انہیں اپنے گھر لانے میں جو خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے، نہ معلوم یہ ہماری قسمت میں کب اور کیوں لکھا گیا منکر نکیر اس کا حساب بھی رکھتے ہیں یا نہیں، اور صرف دانوں ہی پر تو مہر ہوتی ہوگی۔ یا باقی تمام چیزوں پر بھی۔ ہمیں تو خطوط وغیرہ کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ گھر کی کونسی ایسی چیز ہوتی ہے جو مہمان صاحب اپنے لئے وقف نہ کر لیں۔ بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ گھر اپنا گھر نہیں۔ یہاں کی کوئی چیز اپنی نہیں۔ ہر چیز پر قبضہ غاصبانہ کر لیا گیا ہے۔ نہ معلوم ان مہمانوں کو کتابوں اور رسالوں سے کیوں اتنا بیر ہوتا ہے کبھی یہ کتاب اٹھاتے ہیں اور کبھی وہ رسالہ۔ تمام کتابوں اور رسالوں کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر اس پر ستم ظریفی کہ نئی نئی

تجاویز۔ آپ نے سلیم صاحب کا "کبوتر" دیکھا۔ ابن۔ اکرم کا "مغرور" پڑھا۔ "چراغ" کتنا پیارا رسالہ ہے۔ اور "فلم ڈکٹیٹر" کیا کہنے ہیں اس کے۔ آپ بھی یہ کیا خشک اور بیکار کتابیں اور رسالے پڑھتے ہیں جی چاہتا ہے ان حضرات پر تو بس نہیں، اپنا ہی سر پھوڑ لیں۔ نہ قلم کا پتہ نہ پیڈ کا۔ دوات پنسل غائب۔ ڈاکخانہ کا پتہ نہیں معلوم حضرت کو، اس لئے لفافے اور ٹکٹ بھی ختم۔ غرض ایک مصیبت عظمیٰ ہے یہ جنس جسے لوگ مہمان کہتے ہیں۔ خدا بچائے اس بلائے بے درماں سے اور اگر وہ بھی نہ بچا سکے تو! ارے ایسے کفر کے کلمے زبان پر نہیں، لاحول، توبہ توبہ!

مہمان کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے کم خطرناک وہ ہیں، جو صرف سیر و تفریح کی غرض سے کوئٹہ آتے ہیں۔ بعض مرتبہ اکیلے ہوتے ہیں لیکن اکثر دوستوں کے ساتھ اور کبھی کبھار مع اہل و عیال۔ ان میں سب سے اچھی بات یہ ہوتی ہے کہ آکر جانا نہیں بھول لیتے۔ ہفتہ عشرہ تک ان پر سیر و تفریح کا دورہ پڑا رہتا ہے صبح ہوئی اور یہ گھر سے نکلے۔ اور رات کو پھر آن موجود! شروع میں ایک دو دن ہمراہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں اور پھر ناامید ہو کر کتابوں کے کیڑے، کا خطاب دے کر جان بخشی کر دیتے ہیں۔ لیکن رات کو سیر سے واپس آنے کے بعد تمام دن کی روئیداد سنائیں گے اور داد کے متمنی ہوں گے نصیحتیں کرنا تو مہمان کا پیدائشی حق ہے، لیکن اس قسم کے مہمان زیادہ نصیحتیں نہیں کرتے۔ انہیں وقت ہی نہیں ملتا! جلد ہی چلے جاتے ہیں۔ گھر کو مسافر خانہ سمجھتے ہیں اور صرف رات کو قیام کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ مہمان ہوتے ہیں جو گرمی سے بچنے کے لئے وادیٔ شال میں پناہ لینے آتے ہیں اور صرف دو ایک مہینے قیام کرتے ہیں۔ یا عموماً دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور صرف اس بنا پر مہمان بننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ "فی الحال ہوٹل میں انتظام نہیں ہو سکا" روزانہ کسی نہ کسی ہوٹل کا نام لے کر اطمینان دلاتے رہتے ہیں کہ کل اس میں کمرہ ضرور خالی ہو جائے گا۔ اور یہ ... لیکن وہ کبھی نہیں آتی۔ گرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ مہمان تشریف لے جاتے ہیں۔ چلتے ہوئے بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہیں، اور یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ سال ہوٹل میں قیام فرمائیں گے۔

اگلے سال پھر آتے ہیں۔ مہمان بن کر ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہماری قسمت میں وہی گردش لیل و نہار!

مہمان کی تیسری قسم بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو بیمار کہتے ہیں۔ کسی ڈاکٹر کے مشورے سے صحت کی تلاش میں کوئٹہ آتے ہیں۔ اور اس وقت تک قیام کرتے ہیں جب تک میزبان میں ذرا سی بھی سکت باقی رہتی ہے۔ اس کی موت کا انتظار غالباً اس لئے نہیں کرتے کہ آئندہ سال کہاں دوسرے میزبان کو تلاش کرتے پھریں گے اور بیکار پریشان ہوں گے۔ یہ آتے ہیں اور اس طرح آتے ہیں کہ تمام گھر کو ہسپتال بنا دیتے ہیں اور گھر والوں کو مریض! اور خدا کی شان خود ڈاکٹر بن بیٹھتے ہیں۔ یہ نہ کرو۔ وہ مت کرو۔ وہ نہ کرو۔ یہ مت کرو۔ یہ صرف نہ اور مت جانتے ہیں اور ہر وقت ان کی گردان کرتے رہتے ہیں۔ نفی کی دنیا میں رہتے ہیں۔ نصیحتیں تو سب ہی مہمان کرتے ہیں لیکن اس قسم کے مہمان تو نصیحتوں کے سوا اور کچھ کرتے ہی نہیں ہر وقت نصیحتیں، ہر کسی کو نصیحتیں۔ اور پھر ہر موقع پر اپنی مثال۔ "دیکھئے آپ رات کو اتنی دیر نہ پڑھا لکھا کیجئے۔ ورنہ میری طرح آپ کو بھی عینک لگانی پڑے گی"۔ اب ان حضرت کو کون بتلائے کہ پڑھ لکھ کون مسخرا رہا تھا۔ حساب لگا رہے تھے کہ اس مہینے گزر کس طرح ہو گی۔ "آپ کا یہ شاقب تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ جالب بہت نٹ کھٹ ہے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھتا پڑھاتا کچھ نہیں۔ اور دیکھئے، آج پوچھ رہا تھا، کب جائیں گے آپ؟" جی چاہا کہہ دو بچہ ہے، جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا، دل کی بات زبان پر آ گئی۔ لیکن اگر اتنی ہمت ہوتی تو پھر یہ مہمان آتے ہی کیوں؟ "آپ کی شہلا کا تلفظ بہت غلط ہے۔ ذرا خیال رکھئے"۔ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن ادھر بھی ہنسی۔ بلکہ ہنسی کا دورہ۔ اور بچے پوچھ رہے ہیں۔ "امی کیا بات ہوئی؟ ہنس کیوں رہی ہو اتنی؟" اب کیا بتائیں کہ ہنس نہیں رہے، اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ کاش ہماری قسمت بھی ایسی ہوتی کہ کسی کے مہمان بن سکتے!

اس مرتبہ ایک نئے قسم کے مہمان سے واسطہ پڑا۔ زندگی

میں بہت سی تمنائیں ہیں۔ بہرحال ان میں سے ایک یہ بھی ہے
کہ خدا اس قسم کے مہمان سے سابقہ نہ ڈالے ! دوپہر کا وقت تھا
کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا۔ تو ایک صاحب عجیب و غریب
حلیہ میں موجود، سر پر تنکوں کی ٹوپی، قمیص اور پاجامہ بوسیدہ،
جوتے ندارد۔ "آپ نے مجھے پہچانا؟" — "معاف کیجئے نہیں"۔
"دیکھئے میں نے آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا"! "شکریہ"
"تو کیا آپ مجھے حقیقتاً نہیں پہچانے؟" "میں صرف ضرورتاً
جھوٹ بولتا ہوں۔ ہمیشہ نہیں"۔ "دیکھئے آپ سے بہاولپور
میں ملاقات ہوئی تھی"۔ اور اس کے بعد انہوں نے رشتہ جو
بتایا تو میں صرف اتنا سمجھا کہ اگر حضرت نوحؑ تک نہیں تو حضرت
آدمؑ تک ہمارا ان کا شجرہ نسب ضرور مل جاتا ہوگا۔ اور پھر
اس رشتہ پر "آپا" کی تصدیق چاہی۔ "آپا" ہم سے بھی زیادہ
جاہل۔ لیکن صاحب وہ مہمان ہی کیا جو ٹل جائے۔ آئے اور
اس طرح آئے کہ کپڑے اور جیب خرچ تک ہمارے ذمے!
فرمانے لگے۔ "جیکب آباد کے اسٹیشن پر گاڑی تبدیل کرنی تھی
(نہ معلوم کونسی گاڑی؟) گاڑی کے انتظار میں آنکھ لگ گئی۔
کھلی تو دیکھا کہ بستر اور سوٹ کیس سب غائب! بمشکل تمام
یہاں پہنچا۔ بہاولپور بھائی کو بھی خط لکھ دیا ہے۔ جلد ہی وہاں
سے منی آرڈر آجائے گا۔ بس دو ایک دن کی بات ہے"۔

لیکن یہ منی آرڈر نہ آنا تھا نہ آیا۔ قدرت کی ستم ظریفی
دیکھئے یہ حضرت شاعر بھی تھے۔ شعر کے معاملے میں میرا ذوق
اس قدر بلند ہے کہ میر، غالب اور اقبال تک کے اشعار بھی
بغیر تصحیح کے نہیں پڑھتا۔ اور پھر پڑھتا اس انداز سے ہوں
کہ آپ کیا کوئی شخص بھی اس پر شعر ہونے کا گمان تک نہیں
کر سکتا! میرے ایک دوست ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ ہاتھ
جوڑ کر مجھ سے استدعا کی تھی کہ خدا کے لئے میں شعر نہ پڑھا کروں۔
وگرنہ وہ خودکشی پر مجبور ہوجائیں گے! خون ناحق کا میں قائل نہیں۔
اس لئے اب شعر نہیں پڑھتا، صرف کہتا ہوں۔ ہاں تو یہ صاحب شاعر
بھی تھے۔ اور سنانے کے مرض میں گرفتار۔ اور سناتے تھے گا گا کر۔
شاعری اور اس پر موسیقی۔ کس کس کی تعریف کی جائے۔ انشا کو تو
عظیم بیگ سے صرف یہ شکایت تھی کہ۔ "بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل
چلے" — لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ۔ بحر ظلمات میں دوڑا دیئے
گھوڑے ہم نے۔ سنئے اور سر دھنئے۔ ان حضرت کا نہیں اپنا۔
ان کے صرف دو کام تھے! شعر سنانا اور نصیحتیں کرنا۔ نہیں صاحب
ایک اور بھی کام تھا۔ منی آرڈر کا انتظار! اور چونکہ منی آرڈر
آہی نہ چکتا تھا، اس لئے تار بھیجنے کے لئے روپے بھی دینے
پڑتے تھے۔ نجات کی صرف ایک صورت تھی۔ کہ کسی بہانے اسٹیشن
پر لے جا کر بہاولپور کا ٹکٹ ان کے حوالے کیا جائے اور جب
تک گاڑی روانہ نہ ہو جائے، پلیٹ فارم سے نہ ہٹا جائے۔
بہرحال خدا خدا کر کے وہ مہمان صاحب تشریف لے گئے۔ اس
کے بعد کئی مرتبہ وہ مختلف سڑکوں پر نظر پڑے۔ لیکن اس ڈر
سے کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لیں میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔
جان بچی لاکھوں پائے۔

اب پھر گرمیاں آرہی ہیں۔ دیکھئے اس مرتبہ کیا گزرتی
ہے۔ گزرنی کیا ہے، جب تک مہمان نہیں گزر جاتے ہمیں
خوب معلوم ہے کہ ہم پر کیا گزرے گی —

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر! +

ہڑپے کا کتبہ

مجید امجد

ہڑپے ۔ زمانۂ قبل از تاریخ کے جو نوادر کھدائی میں دریافت ہوئے ہیں ان میں ایسے کتبے بھی ہیں جن پر رقم شدہ پُراسرار تحریریں اور تصویریں آج تک پڑھی نہیں جا سکیں۔ حال ہی میں چند کوششیں جو اس بارے میں ہوئی ہیں، ان کو قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ چند کتبوں پر بیلوں کی تصویریں ہیں، جن کے معانی فکرِ شاعر پر یوں اجاگر ہوتے ہیں:

بہتی راوی! تیرے تٹ پر،
کھیت اور پھول اور پھل!
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کی چھل بَل،
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی،
اک ہالی، اک ہَل!

سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان،
"مٹی کاٹے، مٹی چاٹے،
ہَل کی اَنّی کا مان!
آگ میں جلتا پنجر ۔ ہالی ۔ کاہے کو انسان!"

کوئی مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ!
ہل کو کھینچنے والے جنوروں ایسے اس کے لیکھ،
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں ۔ تین ہیں، ہیں، دیکھ![1]

---

[1] ہاری کا ماضی خواہ کچھ بھی رہا ہو، اس کا حال اور مستقبل "انقلاب نو" کی بدولت اتنا ہی درخشاں ہے جتنا اس کا ماضی تاریک تھا۔ (مدیر)

براقِ شاہیں[1]

شیر افضل جعفری

یہ شاہیں کلب کے پری چال کوتل
یہ جن پہ ہوں قربان غزلوں کے چھل بل
یہ بُراق خمرے، یہ مصری کی ڈلیاں
یہ نقرے فرشتے، یہ طوبےٰ کی پھلیاں
یہ سیماب زادے، یہ لرزاں بتاشے
یہ گورے نچنتے، یہ ابرق تراشے
یہ چمکیلے چمکیلے سلمہ ستارے
یہ جلووں کے ٹکڑے یہ بجلی کے پارے
یہ ناچیں تو موروں کو بھی رشک آئے
یہ ٹہلیں تو بادِ صبا غار کھائے
یہ دوڑیں تو دورِ زمیں ہار جائے
یہ ابھریں تو قدموں تلے چاند آئے
یہ جوبن کی جھیلوں کے چرپائے گھلے
انہیں دیکھ کر ہنس بیلے بھی سنبھلے
قطاراں کی جیسے ہو گوٹا کناری
حسیں، بھاگونی، دلربا و پیاری
یہ نخریلے، گھڑ دوڑ میں دندنائیں
تو بانکے ہرن چوکڑی بھول جائیں
کبھی موج میں آکے یہ ہنہنائیں
تو نیزے بھی ساتھ ان کے ملہار گائیں
خمیں گردنیں، ریشمیں گانیاں ہیں
فدا ان پہ شیروں کی سلطانیاں ہیں

---

[1] "شاہین حیدری کلب" سرگودھا میں حسین و براق گھوڑوں کی انجمن ہے "براقِ شاہین" اسی کے سفید براق اور "شیر مست" نقروں کی طرف اشارہ ہے ۔ "شیر مست" وہ جانور ہوتا ہے جس نے ماں کا پورا دودھ پیا ہو۔ (مدیر)

غزل

ضمیر اظہر

ایسا بھی کوئی دل ہے کہ قیدِ الم نہیں
اِس دامِ رنگ رنگ سے امکانِ رم نہیں

جلتا ہے سارا جسم تفکر کی آنچ سے
سوزِ حیات سوزِ محبت سے کم نہیں

قُربِ ستم سے یوں ہوئے سارے ستم عزیز
میرے لئے جہاں میں کوئی اب ستم نہیں

امید و یاس و بیم کی منزل عجیب ہے
رُکنے کی تاب ہی نہیں چلنے کا دم نہیں

آسان ہیں ابھی مری گنجان مشکلیں
ان گیسوؤں کے ان میں ابھی پیچ و خم نہیں

یوں کھو گئے غبار میں چُپ چاپ کارواں
جیسے کہ ان کا کوئی بھی نقشِ قدم نہیں

راضی رضائے یار پہ ہر حال میں ہیں ہم
اک گونہ بیخودی ہے غمِ عیش و غم نہیں

اظہرؔ حیات و موت کا رشتہ عجیب ہے
اب تک یہ ایک راز ہے ہم ہیں کہ ہم نہیں

قمر جمیل

طائرِ جاں کی خبر لاتی ہے
کوئی آواز اگر آتی ہے

جانے کس سمت ہوا کی زنجیر
کھینچ کر مجھکو لئے جاتی ہے

قالبِ جاں میں زمانے کی بہار
آئینہ دیکھ کے شرماتی ہے

شام ہوتی ہے تو پھر کاہشِ جاں
رات کے روپ میں لہراتی ہے

کیسا عالم ہے کہ تنہائی بھی
در و دیوار سے ٹکراتی ہے

کائنات اپنے خدا کے مانند
ایک ذرے میں سمٹ آتی ہے

ہمنشیں میرے قریب اور نہ آ
یہ کلی سائے سے کمھلا تی ہے

کبھی ہم پر بھی جمیلؔ آئی تھی
وہ قیامت جو گذر جاتی ہے

غزل

احمد ظفر

چاند نے مجھ سے چپکے چپکے کچھ تو کہا ہے
رات نے جیسے پیار سے تیرا نام لیا ہے

تو اک بھولی بسری بات ہے اس دنیا میں
وقت نے جانے مجھ سے کیا کیا چھین لیا ہے

جب بھی تیرے درد نے دل میں کروٹ لی ہے
میں یہ سمجھا شاید کوئی پھول کھلا ہے

پہلے چپ کی آگ میں دل نے جلنا سیکھا
اب جو بات کروں تو میرا دل جلتا ہے

سنگ اٹھاتے ہیں کیوں مجھ پر دنیا والے
میرا دل تو جنبشِ لب سے ٹوٹ گیا ہے

میرا اندھا پن بھی میرے کام نہ آیا
دل کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھ لیا ہے

میرے زخم تو رفتہ رفتہ بھر جائیں گے
تیری سوچ کو جانے کیا انداز ملا ہے

دل کو ظفر یہ کس کی آہٹ سی آتی ہے
ویرانے میں جیسے کوئی ساز چھڑا ہے

شیدا گجراتی

گلوں کے لب پہ تبسم کا نام بھی تو نہیں
بھرے چمن میں کوئی خوش خرام بھی تو نہیں

کسے خبر کہ دلِ مضطرب پہ کیا گزری
نگاہِ دوست کا مفہومِ عام بھی تو نہیں

نئے جہاں کے تقاضے نئے سہی لیکن
برائے دل کوئی تازہ پیام بھی تو نہیں

ہم اپنی تشنگیٔ بیکراں کہاں لے جائیں
بقدرِ شوق و طلب اہتمام بھی تو نہیں

حدیثِ درد کہیں بھی تو کیا کہیں ان سے
بہت دنوں سے پیام و سلام بھی تو نہیں

بہ ایں خلوصِ دل و جاں، بہ ایں جنونِ وفا
پیامِ شوق، طرب کا پیام بھی تو نہیں

بقدرِ لذتِ سوز و گداز دل کے لئے
متاعِ درد متاعِ دوام بھی تو نہیں

حیات محرمِ اسرارِ عشق کیا ہوگی
دل و نگاہ میں وہ ربطِ تام بھی تو نہیں

جنوں شریکِ غمِ کائنات ہے شیدا
خرد حریفِ غمِ صبح و شام بھی تو نہیں

غزلیں

مشتاق مبارک

وہ بیقرار نہیں جلوۂ قمر کے لئے
ترس رہے تھے جو رعنائیٔ سحر کے لئے

نہ زلفِ شام نہ رنگینیٔ سحر کے لئے
تڑپ رہا ہوں ترے حسنِ معتبر کے لئے

بہ فیضِ عشق ہوں اب اس مقام پر کہ جہاں
قدم قدم پہ ہیں رنگینیاں نظر کے لئے

دل و نگاہ نے کیا کیا فریب کھائے ہیں
رہِ حیات میں اک خضرِ دیدہ ور کے لئے

وہ پیچ و خم بھی ہمارا نصیب ہو کے رہے
جو وقف تھے کبھی اس زلفِ منتشر کے لئے

خود اپنی ذات کا عرفاں نہ ہو سکا اس کو
تڑپ رہا ہے جو تسخیرِ بحر و بر کے لئے

ہر ایک منظرِ بزمِ جہاں ہے خوب مگر
خلش ہے دل میں بدستور خوب تر کے لئے

نہ جانے دیدہ و دل فرشِ راہ ہیں کب سے
کسی کی ایک نظر، صرف اک نظر کے لئے

یہ التفات کہ ہر چند مختصر ہی سہی
یہ التفات بھی کافی ہے عمر بھر کے لئے

تو اپنے دل کی بصیرت کو رائیگاں نہ سمجھ
یہی تو آئینہ ہے فرقِ خیر و شر کے لئے

ہماری لغزشِ پا کس قدر مبارک ہے
کہ راہ ہو گئی آسان راہبر کے لئے

جگن ناتھ آزاد

باغباں کا شکوہ اب کیا کریں زمانے سے
ہم کہ خود نکل آئے اپنے آشیانے سے

کس طرح بیاں ہو گی حالِ دل سُنانے سے
جو گذر گئی دل پر تیرے مسکرانے سے

حیف اُس مسافر پر جس کو یہ نہیں معلوم
کس نے اُس کو لوٹا ہے اور کس بہانے سے

یہ تو ناصحِ مشفق آگ ہے محبّت کی
یہ تو اور بھڑکے گی اس طرح بجھانے سے

قطعہ

وقت کے تقاضے سے ہم چمن کے شیدائی
آشیاں کو چھوڑ آئے گرچہ اک زمانے سے

مانگتا ہے دل اب تک خبر آشیانے کی
اتنا ربط ہے باقی دل کو آشیانے سے

★

فن:

دورِ انقلاب کا مرقع نگار - صادقین

حق نواز حیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ دورِ انقلاب کی فضا ادب و فن کیلئے بہت خوشگوار ثابت ہوئی ہے۔ وہ گھٹا گھٹا ماحول جس نے ہم سب کے اعصاب اور دل و دماغ پر بڑا بھاری دباؤ ڈال رکھا تھا، ایسے اٹھا ہے کہ ہمیں اپنے جسم و جاں میں یکایک فرحت بخش تازگی کا احساس ہوتا ہے جیسے یک بیک کتنے ہی روزن کھل گئے ہوں، اور ان کے ذریعہ دل و جاں کو بشاشت بخشنے والی ہوا اور پیاری پیاری سہانی سی روشنی اندر آگئی ہو اور ہماری رگ رگ اور ریشے ریشے میں رس بس گئی ہو۔

یہ کیف زا احساس ایک دو لوگوں تک ہی محدود نہیں بلکہ سب میں علی العموم نظر آتا ہے۔ اور پھر شاعروں، ادیبوں، فن کاروں کا تو کہنا ہی کیا وہ تو عام انسانوں سے کہیں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ شدت سے گرد و پیش کی فضا میں خفیف سی خفیف تبدیلی کو بھی آناً فاناً محسوس کر لیتے ہیں اور اس کی طرف شدت و تیزی کے ساتھ ردِ عمل بھی کرتے ہیں۔

جب ماحول میں گھٹن ہی گھٹن ہو تو طبیعتوں میں ترنگ کیسے پیدا ہو اور ذہن کیسے کشادہ ہوں؟ یہی حادثہ تو تھا جس سے ہمارے شاعر، صورت گر، افسانہ نویس مدتوں دو چار رہے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے فیضان کے سوتے بند ہو گئے، اہلِ فن اپنے اپنے گوشۂ خلوت میں گم ہو گئے اور انہوں نے اپنے ارد گرد کی دنیا سے بہت کم سروکار رکھا۔ آخر ان کے لئے اس بیرونی دنیا میں ایسی کشش ہی کیا تھی کہ وہ اس کی طرف خوشی سے اعتنا کرتے اور کوئی شاعر اپنا قلم یا مصور اپنا موقلم ہاتھ میں لے کر زندگی کے کسی اہم واقعہ یا کسی مایۂ ناز ہستی کی تصویر کھینچتا؟

لیکن جونہی دورِ انقلاب طلوع ہوا، سارا قوم کے ساتھ اہلِ فن کی دنیا بھی بدل گئی اور یہ کیفیت ہو گئی کہ

پھر بہار آئی قفس کا در کھلا

اس نئی بہار کی دل خوش کن فضا میں سب اپنے ماحول میں دلچسپی لینے لگے۔ فنکاروں نے بھی محسوس کیا کہ:

خلوت کی گھڑی گذری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے دامانِ سحاب آخر

اور فی الحقیقت بجلی سے دامانِ سحاب چھوٹ گیا۔ اہلِ فن نے دورِ انقلاب کی عکاسی میں دلچسپی لینا شروع کی اور ایک جواں سال مصور صادقین نے تو بڑے وسیع کینوس پر اس کے بعض اہم پہلوؤں کو رنگ و روغن کے روپ میں پیش کیا اور اس اہتمام سے کہ ان پر حقیقت کی بجائے شوخ و رنگین خوابوں کا گمان ہو۔ اس کامیابی کا سہرا جہاں مصور کے سر ہے وہاں دورِ انقلاب کی کارفرمائیوں کو بھی کچھ کم دخل نہیں جو فن کار کے ذوق و شوق کے لئے تازیانہ ثابت ہوئیں۔ اور ایک صادقین ہی نہیں کتنے ہی باکمال اور بھی ہیں۔ مصور، مغنی، اداکار۔ جو اپنے اپنے طور پر نئی فضا سے متاثر ہو کر فن کی دنیا میں ایک نئی ہما ہمی، ایک نئی ہلچل پیدا کر رہے ہیں۔ اسقدر کہ پچھلے دنوں جو آرٹ سنٹر کراچی میں قائم کیا گیا تھا، اس کی عمارت ابھی سے

دامانِ نظر تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

کی مصداق معلوم ہوتی ہے۔

صادقین کوئی ایسا مصور نہیں جس نے ابھی ابھی سر ابھارا ہو۔ وہ ایک مدت سے مصوری کر رہا ہے اور اپنے ہم چشموں میں کافی امتیاز حاصل کر چکا ہے۔ دیکھنے میں شاید اس تیس سالہ نوجوان

میں کوئی بڑی بات نظر نہ آئے۔ ایک چھوٹے قد کا دھان پان، چپ چاپ، سیدھا سادا شخص، شاید آپ اسے لڑکا ہی خیال کریں۔ لیکن اس کی مصوری جیسے مشکل فن میں مہارت اتنی ہی زیادہ ہے۔ اور پھر اس کا دوسروں سے مختلف اپنا ہی ایک انداز ہے جو خاصا نمایاں اور واضح بھی ہے۔ وہ جس شوق و مستی سے اپنے کام میں منہمک ہوتا ہے، وہ اس کے قد و قامت اور مریضانہ وضع کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز ہے۔ اسے فن کے ساتھ وہی لگن ہے جو ایک حساس اور پر خلوص فن کار کو ہونی چاہیئے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ بعض مشاہیر کی طرح جنہیں قدرت نے عمدہ صحت سے محروم رکھا تھا، عمر گریزپا کے احساس نے اسے اور بھی اہمیت کے ساتھ سرگرم کار کر دیا ہو۔ بہر حال یہ محض قیاسات ہیں۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس نوعمر نقاش نے تھوڑی ہی مدت میں ایسی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے جن کی توقع بالعموم زیادہ پختہ عمر کے ارباب فن سے کی جاتی ہے۔ اس نے آرٹ کے ایسے متنوع اور اہم نمونے پیش کئے ہیں جو پاکستانی مصوروں کی تخلیقات میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اچھی شراب مدتوں میں جاکر تیز ہوتی ہے۔ اسی طرح اچھا فن کار بھی برسوں کے ریاض کے بعد فی الجملہ ٹیکنیکی مہارت پیدا کرتا ہے اور صادقین کو ابھی عمر کی کتنی بہاریں دیکھنا نصیب ہوئی ہیں کہ اس سے غیر معمولی مشاقی کی توقع کی جا سکے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ اس اعتبار سے جو بھی کمی ہو اسے یہ ہونہار مصور اپنے ذوق و شوق، اپنے والہانہ پن سے پورا کر لیتا ہے۔ اور یوں فن کے تقاضے بڑی حد تک پورے ہو جاتے ہیں۔

صادقین ایک بہت تیز مصور ہے۔ بے حد زود قلم جتنی تیزی سے اس کا ذہن سوچتا ہے اتنی ہی تیزی سے وہ نقوش پر نقوش بنائے جاتا ہے۔ اور ہم اس کی تیز دستی سے حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسے تصویریں بنانے میں زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کا موقلم ہوا کی طرح سبک ہے اور اسی کی طرح سبک سیر بھی۔ چند تیز تیز جنبشیں اور نقش تکمیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور سال سوا سال سے تو جیسے دور انقلاب نے اس کے جسم ناتواں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ وہ دھڑا دھڑ تصویریں کھینچے چلا جاتا ہے۔ جن سے ایک نہیں کئی نگار خانے آراستہ ہو سکیں۔

اگر دور انقلاب کے کارناموں میں ایک یہ بھی شمار کیا جائے کہ اس نے اس شوخ فکر و تیز دست نقاش کو اس کے بعض کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے کی تحریک دلائی تو بے جا نہیں۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ انقلاب اپنے جلو میں کیا کچھ لایا ہے۔ اور ملک و ملت اس باب میں افواج پاکستان کے کس قدر ممنون ہیں تو یہ کچھ محل تعجب بھی نہیں۔ درحقیقت یہ ساری قوم کا جذبۂ تشکر ہی ہے جس نے اس کے ایک حساس فرد کے تاثرات کی راہ سے تین نقوش میں راہ پائی ہے۔ جن کا اس کے دیگر نقوش کے برعکس یہاں خصوصیت سے ذکر لازم ہے۔ کیونکہ صدر پاکستان کا انتخاب افواج پاکستان کے حسن کارکردگی اور مقبولیت پر پوری طرح مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔

ان نقوش کی نوعیت دو وجہ سے منفرد ہے۔ اول ان کا پیرہن کاغذی نہیں۔ اسی لئے یہ مصور کی شوخیٔ تحریر یا اپنی ناپائداری کے فریادی بھی نہیں۔ نقاش نے ان میں سے دو کے لئے ٹھوس گتے کی دیوار نما زمین تلاش کی ہے۔ اس لئے ان کا کینوس بھی بہت وسیع ہے اور یہ ناظر کے دیدہ و دل پر اتنا ہی کشادہ اثر بھی مرتب کرتے ہیں۔ دوسرے ان میں کچھ نئے طریقے برتے گئے ہیں۔ جن سے نقاش کی اپچ ظاہر ہوتی ہے اور وہ اعجاز فکر بھی جو فن کار کو نادر حالات میں نادر تدابیر اختیار کرنے کی تحریک دلاتا ہے۔ جہاں تک زیر بحث نقوش کا تعلق ہے فن کاری کی بدیع الاسلوبی کے ساتھ ہی ساتھ ایجاد کی ندرت بھی نمایاں ہے۔

دور انقلاب سے پہلے ناجائز درآمد برآمد نے ہماری قومی زندگی میں کیا کچھ آشوب و ابتری پیدا نہیں کی۔ اس نئے انقلابی حکومت کا ایک اہم بالشان کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے اس فتنۂ عظیم کا سر کچل دیا۔ مصور کے ذہن نے اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح اس کارنمایاں کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ صادقین نے مارکیٹ دکراچی کی "سنٹرل اکسائز اور لینڈ کسٹمز کلب" کے لئے ایک داستانی یا ڈرامائی قسم کی تصویر تیار کی ہے جس میں انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کی صورت حال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بعض حلقوں میں ناجائز درآمد برآمد کرنے والوں کو "قابوچی" کہتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں یہ نام اس نقش کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے۔

دراصل "اسمگلر" کی تصویراں متعدد فنکاریوں میں سے ایک ہے

مزار حضرت سید احمد شہید رح

مزار حضرت سید شاہ اسماعیل شہید رح (دہلوی)

پرانی بستی

مسجد: (حضرت سید احمد شہید رح کا فوجی مستقر)

مشہد بالاکوٹ

برصغیر میں اسلامی نشاۃ الثانیہ کے مفکر و مجاہد شاہ اسماعیل شہید رح (دہلوی) اور حضرت سید احمد شہید رح (رائے بریلوی) کے مزارات

دریائے کنہار (جو بالا کوٹ کے وسط سے گذر رہا ہے)

۱ :

۳ :

۴ :

دیہی تعمیر و ترقی

۱— گھریلو صنعتوں کے گر

۲— تعلیم کا بڑھتا ہوا شوق

۳— اپنے گاؤں میں صفائی کا کام

۴— اچھی شہریت کا آغاز

جو صادقین نے مذکورہ کلب کے لئے تیار کی ہیں۔ اور اس کے وسیع و عریض اور نہایت خوبصورتی سے آراستہ ہال کی زینت ہیں یہ تصویر مذکورہ محکمہ کی کارگذاریوں کو نہایت موثر و برجستہ پیرایہ میں پیش کرتی ہے۔ دائیں ہاتھ، عرض کی طرف، کشادہ دیوار پہ ۱۸۔ ۲۰ فٹ لمبا، سات آٹھ فٹ چوڑا پینل ہے۔ اور جب وہ اجلی چادر اٹھائی جاتی ہے جو اس کو گرد و غبار سے بچاتی ہے تو ناجائز درآمد برآمد کرنے والوں کی کارستانیوں سے پردہ اٹھتا ہے۔ اور تجریدی و واقعیت تمثیل اور رنگ و روغن کی زبان میں جسے ہم کچھ تو فی الفور ہی سمجھ جاتے ہیں اور کچھ کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے ہیں، سماج دشمن انسانوں کی "زیر زمین" کارروائیوں کا کچا چٹھا بھی سامنے آجاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں لیدہ بھلے مانس شہریوں کی آسودہ اور خوشحال زندگی بھی سامنے آجاتی ہے۔ یہ تصویر بھی مرکب ہے، مفرد نہیں۔ کئی الگ الگ کڑیوں کا سلسلہ جس کے متعلق یہاں چند جستہ جستہ اشارے ہی کئے جاسکتے ہیں۔

درمیانی حصہ یا نقش میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطنت کس طرح کھل کھیل رہی ہے۔ اسمگلر کا کالا پیسہ کس طرح برے کاموں پر ہی ضائع جاتا ہے۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت! اس کے پیچھے شیطانوں کی لین ڈوری نظر آتی ہے۔ جن کے سروں پر سینگ ہی سینگ ہیں۔ کالے بھجنگے دیو ایک کے پیچھے دوسرا، جو انسان کو برائی پر اکساتے ہیں۔ ناجائز طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت۔ نوٹ کے نوٹ، ہاتھ بڑھا کر کسی عصمت فروش عورت کو پیش کئے جا رہے ہیں۔ نیچے تاش کے بکھرے ہوئے پتے بتا رہے ہیں کہ یہ ٹھکانہ جوا ریوں کا اڈہ ہے۔ اوپر سے شاید کوئی انسان کی خطاؤں اور لغزشوں پر رحم کھانے والی شفیق ہستی برائی کے اس افسوسناک منظر کو دیکھ رہی ہے۔ تجریدی آرٹ سے انسان نما شکلوں اور لباسوں کا اشتباہ پیدا کرنے میں بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے۔ اور ذہن کبھی ایک ترتیب پیدا کرتا ہے کبھی دوسری۔ پرے، دروازے کے پاس، ملت کے نگہبان فوجی اور محکمہ اکسائز و کسٹم کے کارکن بھی دکھائی دیتے ہیں جو ایسے قوم دشمن لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں۔ دائیں پہلو میں غالباً ایک اچھے شہری اور اس کے کنبے کی تصویر ہے۔ جو محنت و مشقت اور حلال کی کمائی پر تنگی ترشی سے گذر اوقات

کرتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں سکون و اطمینان کا دور دورہ ہے۔ صحن میں کبوتر دانہ چگ رہے ہیں، بچہ کھیل رہا ہے، لڑکی ہاتھ میں سیب لئے ہوئے ہے۔ اور اس طرح کی مطمئن فضا دوسری اشکال سے بھی جھلکتی ہے۔

دوسرے نقوش کی نوعیت اور بھی مختلف ہے۔ ان میں سے ایک "منگلا ڈیم پروجکٹ" کے لئے منگلا (مغربی پاکستان) میں بنایا گیا ہے۔ دیکھتے ہی ایک انوکھے رقص کا منظر دل و نظر پر چھا جاتا ہے۔ اور ہم خود بخود ترقی کا احساس کرنے لگ جاتے ہیں جس سے اس کو موسوم کیا گیا ہے۔

تیسرا نقش۔ اگر اسے نقش کہا جاسکے کیونکہ "ترقی" کی طرح اس میں بھی تراش خراش کی تکنیک برتی گئی ہے جس کی میں ابھی تشریح کروں گا: "مردوں نز کلب کراچی" کے لئے اس کے دار المطالعہ میں تیار کیا گیا ہے۔ وہ طلسمی سے گھوڑے اور ان کے سوار ان کے آگے بڑھنے کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ یہ لوگ حدیث شریف اطلبوا العلم ولو کان بالصین کے مصداق چار دانگ عالم میں تلاشِ علم کے لئے رواں دواں ہیں۔ اور ان کی یہ تلاش ایک تلاش جاودانہ ہے۔ گھوڑوں کے پاؤں اٹھانے کا طمطراق آمیز انداز ہی بتلائے دیتا ہے کہ وہ ہوبہو "تیز ترک گامزن" کی روح سے سرشار ہیں۔

شاید اس ضمن میں مذکورہ حدیث کا حوالہ محض ایک فقرہ یا زیب داستاں معلوم ہو لیکن غور کرنے پر اس کے کچھ وسیع تر قرائن بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مصور محض مشرقی ہی نہیں بلکہ اس کا ذہن اسلامی روایات میں رچا ہوا ہے۔ جیسے تجریدی آرٹ کی شکل میں چغتائی کی روح سرایت کر گئی ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا تمثیلی اور علامتی انداز بھی۔

تلاش کا تصور جری، باساز و یراق، نیزہ بردار شہسواروں اور ان کے طلسمی حقیقی ہوائی گھوڑوں سے ظاہر کیا گیا ہے جیسے ان میں کچھ کچھ براق کی شان پیدا ہو۔ لہذا تلاش علم محض مجازی و دنیاوی علم ہی کی تلاش نہیں بلکہ سماوی علم کی تلاش بھی ہے۔ جیسے صوفیائے کرام کی "طلب" ہو یعنی جامع ترین علم و عرفان اور الہیت کی تلاش۔ (منزل ما کبریاست) گھوڑوں کے آگے ہاتھ بڑھا کر اٹھائی ہوئی بڑی کعب قسم کی کتاب ہے۔ آپ اسے کتاب علم کہہ لیجئے یا قرآن مجید۔

کیونکہ اس میں معارف کونین پنہاں ہیں اور اسی کی روشنی میں انسان کی تلاش علم عہد بہ عہد اور دور بہ دور آگے بڑھتی رہی ہے۔ اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ آسمان کی بلندی پر کوئی سری و تمثیلی شکل کلید زر پیش کر رہی ہے۔ یہ شاید آسمان کی کلید ہے یا تمام علوم و اسرار کی۔ اسکی ہر طرح توجیہہ کی جا سکتی ہے۔

اس اہتمام کے ساتھ کچھ عجب نہیں کہ یہ شہسوار کوئی معمولی شہسوار نہ ہوں بلکہ ادبیات قدیم کے مرغوب پیرایہ بیان میں "غازیان بیشہ حکمت" اور "مجاہدین بادیۂ عرفان" ہوں۔ جو ذوق جہاد میں "ہفت قلعہ افلاک یا اسرار پر حملہ کناں ہوں"۔ ایسے فارسان عرصۂ شہود و وجود، جو مکاں سے گذر کر لامکاں کی حدود تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہوں۔ ان کی غائیت نہ شان ان کے تیر کشا دست کے علاوہ مضبوطی و اولوالعزمی سے تولے ہوئے نیزوں سے بھی ظاہر ہے۔ تصویر سکونی نہیں، حرکی ہے۔ ایک مسلسل حرکت کی آئینہ دار۔ اس تلاش مسلسل میں انسان کو ہر لمحہ ہوشیار و متحرک رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے تیر والے سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اب چھوٹے کے چھوٹے اور انہوں نے اپنے صید کو جا لیا۔ کیسا صید! یہ نہ تصویر میں واضح ہے اور نہ ایسا ہونا ہی چاہیئے۔ کیونکہ عشق کی طرح علم کی کون انتہا لایا؟ کائنات کا راز تو ہمیشہ راز ہی رہے گا اور انسان اس کی تلاش میں سرگرم — براؤننگ اور اقبال کے تصور کے مطابق — "تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے"۔ اس لئے تیر و سناں، دونوں ہتیاروں کا رخ ایک پُر اسرار شخصیت کی طرف نظر آتا ہے جو کہیں دھندلکوں میں روپوش ہے۔ اس گوشہ میں جہاں کلید زر کسی مرغ ہوائی کے پنجے میں نظر آتی ہے۔ یہ کلید کا تصور بھی قدامت کا طلسمی انداز لئے ہوئے ہے کیونکہ اس کا تذکرہ مشرق و مغرب کی باستانی داستانوں میں بار بار نظر آتا ہے۔ اور سرّی اہمیت رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ رہرو راہ طلب کی جدوجہد کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایک مقام طے ہوا تو اس کی جگہ دوسرا موجود ہے۔ ایک حریف پنجہ فگن زیر ہوا تو اس کی جگہ دوسرا تیار ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہی وجہ ہے کہ دور دور تائیں کو نے میں ایک فاختہ کا نقش دکھائی دیتا ہے۔ جو سکون کی علامت ہے۔ فرض کیجئے علم کی راہ میں سیارہ بہ سیارہ پرواز کرنے والا انسان کسی وقت چاند تک پہنچ جائے۔ پھر بھی اس کا سفر ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ "ان ستاروں کے پرے اور بھی دنیائیں ہیں"۔ نامعلوم! اور انہیں کی طرف انسان کی سعی تلاش کا رخ ہے۔ تصویر میں پرواز کرنے والوں کو چاند سے گذرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کیونکہ انسان اسپوٹنک کے ذریعہ چاند تک پہنچ چکا ہے۔ اور یوں اس نقش کی تاریخ بھی متعین ہو جاتی ہے۔ گویا ایلیٹ کے الفاظ میں مصور کو پورا پورا "معاصرانہ شعور" حاصل ہے۔ اور اس نے قدیم روایات اور جدید حقائق و مشاہدات کو آپس میں آمیز کر کے ایک خالصتہً جدید شاہکار تخلیق کیا ہے۔ صریحاً یہ نقش اٹیمی دور ہی کی پیداوار ہے۔ اور بالکل بائیں طرف جو اٹیمی وضع کا ڈیزائن ہے وہ اس کی مزید تصدیق کرتا ہے۔ جیسے یہ ایک یادگار تاریخی مہر ہے۔ اور وہ مشعل جو پہلے سوار نے دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر اٹھائی ہوئی ہے، تلاش کی نوعیت اور خود ذوق تلاش پر روشنی ڈالتی ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَار کی مفصل تشریح۔

ان امور سے فکر و خیال کے دیگر متلازم سلسلے خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے حکیم ملت علامہ اقبال[2] نے زمان کے متعلق کیا کچھ کہا ہے۔ لاتسبو الدهر ..... کی حدیث مشہور ہے۔ کیونکہ اسلامی تصور کے مطابق خدا خود دھر ہے۔ اسی تصور سے کام لیتے ہوئے گھوڑوں کے چہرے گھڑیال جیسے بنائے گئے ہیں۔ اور "مسلسل حرکت زماں" کا تصور پیش کرتے ہیں۔ اور انسان خود کیا ہے؟ "شہسوار اشہب دوراں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصور کا اسلام کے ساتھ ہی تخیلات اقبال میں کسقدر گہرا ڈوبا ہوا ہے۔

کبھی کبھی فن کاروں کی ذہنی پرواز حیرت انگیز طور پر ایک ہی مقام پر جا نکلتی ہے۔ ڈاکٹر خالد کی نظم "راہ دیکھی نہیں" ہو بہو اسی تصویر کا لفظی روپ معلوم ہوتی ہے یا پھر صادقین کا نقش اس نظم کا تصویری روپ:۔

"راہ دیکھی نہیں اور دور ہے منزل میری
کوئی ساتھی نہیں، میں ہوں مری تنہائی ہے
دیکھتی ہے مجھے حیرانی سے تاروں کی نگاہ:
دور، ان سے بھی کہیں دور مجھے جانا ہے

اس بلندی پہ اڑا جاتا ہے تو سن میرا
کہکشاں گرد سی دیتی ہے دکھائی مجھ کو
رفعتِ عرش ہے مٹتا ہوا مبہم سا شرار
مری منزل ہے کہاں یہ کبھی سوچا ہی نہیں
اس کی فرصت ہی کسے دل میں مگر رہتا ہے
درد۔ وہ درد کہ ہے جس سے تمنا جیتا ہے
چاند کچھ راہ مرے ساتھ ہوا تھا لیکن
رہ گیا دور کہیں ہار کے ہمت اپنی
زہرہ کہنے لگی، اے بزمِ فلک کے قاصد
زرد رو پہلی ہی منزل میں ہوا تو کیونکر
جب کہ وہ خاکیٔ بے مایہ بڑھے جاتا ہے
پست ہر ایک بلندی کو کئے جاتا ہے"

اب تراش خراش کے بارے میں کچھ سنئے۔ بقول مصور یہ نادر تکنیک ایجادِ بندہ ہے۔ اولاً تو نقاشی برتی گئی ہے یعنی روغن پر روغن تہ بہ تہ، تو بہ تو۔ لیکن اس کے بعد ایک اور عمل شروع ہوتا ہے جو اسے نقاشی کی بجائے کچھ اور بنا دیتا ہے۔ روغن تراشی۔ کیونکہ نقاش کوئی تیز لکیلی دھار کی چیز لے کر بعض جگہوں پر رنگوں کو چھیل دیتا ہے۔ اس طرح جو رنگ وہ جس جگہ چاہتا ہے اس کو برآمد کر لیتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے نقش رنگین پنسل سے بنائے گئے ہوں۔ جیسے رنگوں میں جان پڑ گئی ہو، وہ بول اٹھے ہوں۔ ان میں ایک جنبش، ایک حرکت، نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ چمک دمک، نزاکت اور بلور نما شفاف وضع بھی۔ دارالمطالعہ کی پرسکون فضا کے حسب حال اس نقش میں بھی ایک سکون آفریں کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جیسے اس کے رنگ اور روغن چپکے ہی چپکے دل پر سکوت کا افسوں پھونک رہے ہوں۔

یہ نقش محض تجریدی نہیں۔ خطوط اور اشکال کا معجون مرکب ہے جو بسا اوقات روکھا پھیکا اور غیر خوش آیند معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں ایک غیر معمولی دلکشی نظر آتی ہے۔ یہ حقیقت، واقعیت اور تصوریت سب کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اور سب کے مخصوص اثرات بھی۔ جو اس کی جامعیت کے ضامن ہیں۔ ان کے ذریعہ مصور کچھ کہنا چاہتا ہے جو اس کا اولیں مقصود ہے۔ اور تجریدی انداز میں بدلی ہوئی حقیقی اشکال سے اس کا فسوق اظہار بھی ظاہر ہوتا ہے اور رسمی اظہار بھی۔

ظاہر ہے کہ جہاں فن کی نوعیت تمثیلی ہو وہاں ہر قسم کی توجیہوں اور تشریحوں کے لئے میدان کھلا ہوتا ہے۔ ہم چاہیں تو اس کو بہت وسیع معنی عطا کر دیں اور چاہیں تو دائرہ کو تنگ کرتے کرتے ایک ہی نقطہ پہ لے آئیں۔ چونکہ یہ نقش ہمارے زمانے، یعنی دورِ انقلاب میں بنایا گیا ہے۔ اور وہ بھی "سرد سنز کلب" کے لئے، اس لئے بعض نے اس کو ہماری انقلابی حکومت کی مہم سے تعبیر کیا ہے جو اس نے شروع ہی سے تاریک عناصر کے خلاف جاری کر رکھی ہے۔ اور وہ بھی خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جن کی علامت قرآن مجید ہے۔ اس لحاظ سے اس کا ہدف وہ پُراسرار ہستی ہے جو کلیدِ زر کو اپنے پنجے میں پکڑے ہوئے ہے۔ اور کچھ چمگادڑ جیسی بھیانک اور ڈراؤنی معلوم ہوتی ہے۔ جب یہ چیز تیر کا شکار ہو جائے گی تو انسان کی ترقی کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ اس طرح تصویر کی معنویت محدود ہو جاتی ہے۔ اور مبصرانِ فن کی حیثیت سے ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم توضیح و تشریح کا دروازہ کھلا رہنے دیں۔

جب ہم سفید گتے کی زمین پر کھینچے ہوئے نقش پر آخری بار مجموعی نظر ڈال کر رخصت ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کیا یہ سارے متفرق اجزا جو کچھ حقیقی ہیں اور کچھ تمثیلی، وحدت کے رشتے میں منسلک ہو گئے ہیں یا نہیں۔ اور وہ تناسب کے اصول پر بھی پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ ممکن ہے بعض اذہان وحدت کی بجائے کثرت سے زیادہ متاثر ہوں اور ان کا یہ احساس بے جا بھی نہ ہو کیونکہ فن جب بھی مرکب اور پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس میں یہی سوال پیدا ہوتا ہے، رہا تناسب کا سوال تو اس وضع کی مصوری میں اس کو چنداں ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔

بایں ہمہ یہ امر موجب تشفی ہے کہ ان نقوش کو دیکھنے کے بعد ہم غم ہائے روزگار سے بوجھل دل لے کر رخصت نہیں ہوتے بلکہ ہمیں اپنے ارد گرد امید ہی امید اور شادمانی ہی شادمانی کی روشن فضا دکھائی دیتی ہے۔ ہمارا دل آغازِ بہار کی ہری ہری کونپل کی طرح لہرا اٹھتا ہے یا اس کلی کی طرح جھوم جھوم اٹھتا ہے جس میں پُرکیف آفریں رُت پہلے پہل اپنی روح پھونکتی ہے۔

سلاطین بنگالہ:

خلجی دور

(۱۱۹۵ء تا ۱۲۲۷ء)

سید فیضی

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نویں صدی عیسوی میں بنگال نے عالم اسلام سے کافی ربط و ضبط پیدا کر لیا تھا۔ اس تعلق کی باہمی کڑیاں اُن عرب تاجروں کے ہاتھوں استوار ہوئی تھیں جو سمندر کے ساحلی علاقوں کے ساتھ تجارتی مراسم رکھتے تھے۔ ان عرب تاجروں کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جنہیں سیر و سیاحت کی زندگی عزیز تھی اور ان میں اکثریت صوفیا اور مبلغین حضرات کی ہوا کرتی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے لوگوں نے عام طور پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور یہیں خلق خدا کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر ڈالی تھی۔ بنگال کی سرزمین اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ دور افتادہ ہونے کے باوجود اسلامی اثر و نفوذ یہاں بہت تیزی سے سرایت کرتا رہا۔ یہ صوفیا حضرات کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ بنگال میں شجرِ اسلام کی آبیاری ہوتی رہی اور سیاسی فتوحات کا دور شروع ہونے سے قبل ہی مسلمانوں کا تہذیب و تمدن یہاں جڑیں پکڑ چکا تھا۔ اصل میں ۱۲۰۰ء سے بنگال مسلمانوں کے قبضے میں آتا ہے لیکن تین سو سال کا یہ درمیانی عرصہ جس میں بنگال مسلمان تاجروں اور درویشوں کے لئے سیاحانہ آمد و رفت کے اسباب فراہم کرتا رہا۔ مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت کا وہ شاندار دور ثابت ہوا ہے، جو آج بھی سرزمینِ بنگال کے لئے آئینہ ہے۔ غالباً یہی وہ تبلیغی جذبہ تھا جس کے تحت بنگال نے مسلمان حملہ آوروں کو اپنی جانب متوجہ کیا اور ان میں اولیت کا سہرا ایک ایسے غیر معروف شخص کے سر رہا جو ہندوستان سے دور سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد تن تنہا یہاں پہنچا اور اپنی بہادری، عزم، جدوجہد اور مستقل مزاجی کی بدولت تاریخ میں ملک اختیار الدین محمد بختیار خلجی کے نام سے مشہور ہو کر فاتحِ بنگال کہلایا۔

سلطان محمود غزنوی کو آنکھیں بند کئے ابھی ڈیڑھ سو سال ہی گذرے تھے کہ اسلامی فتوحات کا رُکا ہوا سیلِ بے پناہ ایک دفعہ پھر بہہ نکلا اور دریائے سندھ کی مشرقی جانب رُخ کئے تیرہویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان تک پھیل گیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی موجیں اُسی وقت کناروں سے آشنا ہوئیں جب بختیار خلجی نے جنوبی بہار کے مشرقی علاقوں میں پرچمِ توحید کو بلند کر کے بھاگیرتی اور کراتویہ دریاؤں کے کنارے تک اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ کون جانتا تھا کہ خلجی نسب کی یہ پژمردہ شاخ جو سرسبزی و شادابی کے نام کو ترس رہی تھی ایک دن خود چمنستانِ بنگال کی شگفتگی کا باعث بنے گی اور وہ محمد بختیار جو بے سروسامانی کی حالت میں گھر سے غریب الدیار ہو کر نکلا تھا ایک دن سلطان الدنیا والدین کے لقب گرانمایہ سے نوازا جائے گا لیکن وقت کی بوڑھی آنکھیں گواہ ہیں کہ ۱۱۹۵ء میں بھی غیرت مند انسان جب اپنے آبائی وطن گرم سیر کے علاقے پر حسرت و یاس کی نگاہیں ڈالتے ہوئے نکلا تو اس کے قدم خود بخود ہندوستان کی طرف اٹھنے لگے۔ تلاش معاش کی سرگردانی نے کچھ عرصہ بعد اسے شہاب الدین غوری کے لشکر میں پہنچا دیا لیکن قد و قامت کی غیر موزونی اور شکل و صورت کی بدنمائی اُسے افواجِ سلطانی میں کوئی جگہ نہ دلا سکی۔ دل برداشتہ ہو کر دلی کا رُخ کیا کہ شاید قطب الدین ایبک کے دربار میں گوہرِ مقصود ہاتھ آئے۔ یہاں بھی نصیب نے یاوری نہ کی ؎

ملک خدا تنگ نیست — پائے گدا لنگ نیست

کے مصداق سیر و سیاحت کرتا ہوا بدایوں پہنچ گیا۔ یہاں کے سپہ سالار ملک ہژبر الدین نے اس پر رحم کھا کر تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے پاس رکھ لیا۔ بختیار کی مطلق العنان طبیعت اس ننگ کو کب گوارا کر سکتی تھی۔ چٹانوں میں بسیرا کرنے والا شاہین قصرِ سلطانی کے گنبد کو نشیمن نہیں بنا سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں سے علیحدہ ہو کر وہ اودھ پہنچا جہاں کے حاکم ملک حسام الدین نے اپنی فراست نظری سے بختیار کی قدر و قیمت کو بھانپ لیا اور اُسے

موجودہ مرزاپور کی جنوب مشرقی جانب دو پرگنے بطور جاگیر عنایت کر کے اپنے صدر مقام سے کافی فاصلے پر متعین کر دیا۔ ان حدود میں ابھی تک کسی اسلامی لشکر کا گذر نہیں ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ بختیار کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی جگہ موزوں نہ ہو سکتی تھی جہاں وہ اپنی طبیعتِ آزاد کے پوشیدہ جوہر دکھا سکتا۔

اپنی جاگیر کو محفوظ رکھنے کے خیال سے بختیار نے پہلے وہیں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو مطیع کیا اور بعد ازاں منیر اور بہار کے اضلاع پر دست درازی شروع کر دی۔ اس کی بڑھتی ہوئی جنگجویانہ ناموری نے بہت جلد ان خلجی اور ترکمان سپاہیوں کو اس کے پرچم تلے اکٹھا کر دیا جو طلبِ معاش کی خاطر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آوارہ و پریشان پھرا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ قطب الدین ایبک کے کانوں میں بھی بختیاری فتوحات کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ سلطنت دہلی بھی اس ابھرتے ہوئے ستارے کی چمک دمک کو دیکھ رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ افقِ بنگال پر یہ ستارہ اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ چمک کر رہے گا۔ چنانچہ بختیار کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اُسے خلعت و آفریں سے نوازا گیا۔ قرب و جوار کے علاقے تو پہلے ہی سے اُس کے زیرِ نگیں آ چکے تھے۔ اب اس کی فتح جو طبیعت نے اور بڑی وسعتوں کو ناپنا شروع کیا۔ حصارِ بہار نظروں میں تھا یہی طے پایا کہ اس سرزمین کفر کو نورِ ایمان سے جگمگایا جائے۔ بختیاری لشکر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح بہار کی طرف بہنے لگا اور آن کی آن میں اس کے چاروں طرف پھیل گیا۔ بہار کے رہنے والے سر منڈے بھکشو مقابلے کی تاب نہ لا کر اس آتشِ حرب کا ایندھن بننے لگے اور اسلامی لشکر نے کسی روک ٹوک کے بغیر یہاں پرچم اسلام نصب کر دیا۔ بعد میں جب مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوا کہ حصارِ بہار در اصل "وہار" یعنی مدرسہ تھا اور وہ بھکشو جنہیں لقمۂ شمشیر بنایا گیا تھا، یہاں کے طالب علم تھے تو انہیں بہت افسوس ہوا اور آئندہ نیک سگالی کے جذبے کے ماتحت اس تمام مفتوحہ علاقے کو بہار کا نام دے دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ بہار میں اس وقت کئی ایک بودھ عبادت گاہیں تھیں جو بیک وقت مکاتب و مدارس بھی کہلاتی تھیں اور یہ قلعہ جس پر بختیار نے ۱۱۹۹ء میں اپنا پرچم لہرایا تھا اسی قسم کی ایک عبادت گاہ تھا جسے مرکزی حیثیت حاصل تھی اور جس کا نام "اودنتاپورہ وہار" تھا۔ ۱۲۰۰ء میں بہار پر حملہ کرنے کی دوبارہ ضرورت محسوس ہوئی۔ اس دفعہ پورے بہار کو بزورِ شمشیر قبضے میں لایا گیا اور خلجیوں نے مضبوطی سے وہاں اپنے پاؤں جمانا شروع کر دئے۔

اودھر بنگال راجہ لکشمن سین کی راجدھانی بنا ہوا تھا۔ کفر و الحاد کی یہ سرزمین بختیار کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔ چنانچہ وہ بہار سے فارغ ہو کر اپنی فوجیں لئے سیدھا بنگال پہنچ گیا۔ راج محل پر قبضہ کرنے کی یہ تجویز ہوئی کہ فوج کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے یکے بعد دیگرے شہر میں داخل ہوں اور راجہ سینا کا مقابلہ کر کے اسے شکستِ فاش دیں۔ اس کام کے لئے بختیار نے خود پہل کی اور ۱۹ سواروں کو ہمراہ لئے ندیہ شہر میں داخل ہو گیا۔ جون ۱۲۰۱ء کی گرمیاں اپنے شباب پر تھیں۔ سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ندیہ کے ساہو اور بیوپاری آرام سے اپنی اپنی جگہ فروکش تھے کہ بیس منچلوں کا یہ مختصر سا قافلہ اس جھلستی ہوئی گرمی میں راج محل کی طرف مثلِ شعلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ مزاحمت کرنے کے لئے جو بھی آگے آیا، تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان اجنبیوں کی آمد سے چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ راج محل کی دیواروں سے فضائیں گونج رہی تھیں لیکن حملہ آوروں کی تلواریں میان سے باہر نکل چکی تھیں اور زیادہ وقت گذرنے نہ پایا تھا کہ راج محل اور راج سنگھاسن پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ تازہ دم بختیاری فوجیں دستہ دستہ پیچھے چلی آ رہی تھیں، اور لکشمن سین جان بسلامت کشتی میں سوار ہو کر راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔ راج محل پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا اور سچ پوچھئے تو مسلمانوں نے راج بختیار کی سرکردگی میں وہ شاندار فتح حاصل ہوئی تھی جس نے بنگال پر ہندوؤں کی خود مختاری کا طلسم توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ندیہ کو فتح کرنے کے بعد بختیار نے خلجی امرا کو یہاں متوطن کیا اور خود گوڑ کو مسخر کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ تاریخ وہ تفاصیل پیش کرنے سے قاصر ہے جن سے یہ معلوم ہو کہ بختیار نے کب اور کس طرح گوڑ پر فتح پائی۔ البتہ یہ سچ ہے کہ گوڑ فتح کر کے جو کچھ مالِ غنیمت ہاتھ لگا اسے لیکر بختیار یہاں سے نکلا اور بہار کے راستے ہوتا ہوا ملک قطب الدین کی خدمت میں زمین بوس ہوا۔ قطب الدین نے ابھی ابھی کالنجر، مہوبہ اور بدایوں کی فتوحات کو مکمل کیا تھا۔ چنانچہ قطب الدین کو نذرانہ پیش کر کے وہ اپنے مفتوحہ علاقوں کو واپس ہوا اور ۱۲۰۳ء سے ۱۲۰۵ء تک یہاں انتظامی معاملات کو سدھارنے میں مصروف رہا۔ اس دوران میں بختیار نے بت شکنی بھی کی، مسجدیں بنوائیں، مکاتب و مدارس قائم کئے اور تبلیغِ مذہب کے کاموں میں بھی پیش پیش رہا۔

تبت کی مہم بختیار کا آخری معرکہ تھا جس کی ناکامی سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ یہ مہم اس نے کیوں اختیار کی۔۔ تاریخ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ کیا ہندوستان کی وسیع سرزمین اس کی فتح مندیوں کے لئے ناکافی تھی؟ کیا مہاراجہ لکشمن سین کی حریفانہ سرگرمیاں دب چکی تھیں؟ کیا شمالی ہند کے میدانوں میں ہندو راجدھانیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔۔ نہیں!! تو پھر بختیار کی نگاہوں میں تبت، چین اور ترکستان کے مناظر کیوں گھوم اٹھے؟ ان سوالوں کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی معرکہ پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھا ؎

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ نہ ہو جس کی گھات میں صیاد

اس کے کانوں نے یہ داستانیں سنی ہوئی تھیں کہ ان پہاڑی علاقوں میں سونے کی کانیں موجود ہیں۔ وہ ان قیمتی ذخائر کو حاصل کرنا چاہتا تھا ۔۔ نہیں! وہ اپنی متجسس طبیعت کے باعث مشتاق تھا کہ ترکستان پہنچنے کا چھوٹے سے چھوٹا راستہ معلوم کر لے۔ بہرحال تبت کی مہم اس کا سوچا سمجھا ہوا اقدام تھا۔ اہل بنگال کے لئے یہ کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جس کے نام سے وہ ناواقف ہوں بلکہ اس کے برعکس پال خاندان کے راجاؤں کے زمانے سے تبت نے پیشواؤں اور دھرم پرچارکوں کی بود و باش کے سبب مذہبی مقام ہونے کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور تبت کے تجارت پیشہ لوگ دارجلنگ کے راستے جنوبی بنگال کے سالانہ میلوں ٹھیلوں میں اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۲۰۶ء کے اواخر سرما میں بختیار ایک لشکر جرار لئے جس میں دس ہزار گھڑسوار تھے، دیوکوٹ سے تبت کی مہم پر روانہ ہوا۔ راستے کی دشوارگزاریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بردھان کوٹ سے نکل کر پہاڑی سفر شروع ہوا اور اسے طے کر کے بختیاری لشکر سولہویں دن ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں پہاڑی باشندوں سے مقابلہ ہوا۔ وہ غضب کا رن پڑا کہ بختیاری لشکر نے پہاڑی حملہ آوروں کے چھکے چھڑا دئے لیکن رسد ختم ہو جانے اور دشمن کے ہر وقت گھات میں لگے رہنے کی وجہ سے سلطان کی فوجوں کو ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا اور اتنی بڑی مسلح فوج میں سے معدودے چند سپاہی سلطان کے ساتھ جان بچا کر خستہ و خراب حالت میں دیوکوٹ پہنچے۔

بختیار کی اس ناکامی نے نصف صدی بعد تک بنگال کی تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس دوران میں ہندو راجاؤں کو اپنی کھوئی ہوئی قوت جمع کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ گوڑ میں کئی سپاہ کے باعث دامان سلطنت کی وسعتیں بھی رکی ہوئی تھیں اور بہار کا علاقہ جہاں سے بختیار کو بہ آسانی لشکری مل جایا کرتے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بنگال سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اندرونی خلفشار کا یہ عالم تھا کہ اخلاقی قدریں روز بروز زوال پذیر ہو رہی تھیں اور مرے کو مارے شاہ مدار ادھر بنگال کی سرزمین میں فتنہ و فساد کی آگ مشتعل ہو رہی تھی۔ یہی وہ دکھ تھے جن کا احساس بختیار کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ شرم و ندامت کے باعث وہ بہت کم باہر نکلتا تھا اور کسی کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا اندیشہ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ ان خطرات نے اسے صاحب فراش بنا رکھا تھا۔ آخر ایک روز جبکہ بنگال کا یہ فاتح مرگ و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھا، علی مردان خلجی نے اپنے خنجر کے ایک ہی وار سے، اس کے دیوکوٹ پہنچنے کے صرف تین ماہ بعد ۱۲۰۶ء میں اسے عذاب زیست سے نجات دیدی۔

●

ملک اختیار الدین محمد بختیار خلجی بنگال کے قرون وسطیٰ کا وہ معمار گردانا جاتا ہے جس کے ہاتھ کی چنی ہوئی دیواروں نے آج سارے مشرقی پاکستان کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ اس نے آزادی کی فضاؤں میں پرورش پائی تھی، آزاد رہ کر زندگی بسر کی اور ایک عظیم فاتح کہلاتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ موت نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ اپنی فتوحات کو مستحکم کر لیتا اور ان کے در و بست میں اپنی منصرمانہ قابلیتوں کا اظہار کرتا۔ یہ واقعہ ہے کہ بختیار اپنے ہم عصر فاتحوں میں بے جگری، جاں سپاری اور دلاوری کے لحاظ سے بے نظیر تھا اور اگر اس میں کچھ ذاتی کمزوریاں تھیں تو ان کا سبب ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور پے بہ پے کامیابی کا حصول تھا۔ اس کے عہد میں ملکی انتظام کا طریقہ قبائلی جاگیرداری پر مشتمل تھا اور اس کے تحت ملک کے بیشتر علاقے ترک یا خلجی افسروں کی تحویل میں رہا کرتے تھے۔ ہر افسر اپنے علاقے کا خود مختار سردار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان نے سرحدوں پر بڑی بڑی صوبیداریاں قائم کر رکھی تھیں جو خلجی خاندان کے تین بڑے سرداروں یعنی علی مردان، حسام الدین اور محمد شیران کے سپرد تھیں۔ اس طرح پورے بنگال پر خلجیوں کی حکومت کا جھنڈا لہراتا تھا اور اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مابعد کی تاریخ

بنگال پر بالعموم اس کا بہت گہرا اثر ہوا ہے۔

بختیار خلجی کے سانحۂ قتل کے بعد ایک عرصے تک بنگال خانہ جنگیوں کا گہوارہ بنا رہا اور یہ بھڑکتی ہوئی آگ کہیں ۱۲۱۲ء میں جا کر علی مردان کے خون کے چھینٹوں سے ٹھنڈی ہوئی۔ ادھر محمد شیران کو جب اپنے ولیِ نعمت سلطان بختیار کے قتل ہو جانے کی خبر پہنچی تو وہ فوراً تحور سے اپنے لشکر سمیت دیوکوٹ آ گیا کہ علی مردان کو اس کے کئے کی سزا دے۔ علی مردان اس وقت اپنی جاگیر گھوڑا گھاٹ میں پناہ گزیں تھا۔ بختیار کے مراسمِ عزا سے فارغ ہو کر محمد شیران نے علی مردان پر چڑھائی کی اور گرفتار کر کے اسے زندان میں ڈال دیا۔ امرائے خلج نے متفقہ طور پر محمد شیران کو لکھنوتی کا حاکم منتخب کر لیا اور ۱۲۰۸ء میں وہ ملک عز الدین محمد شیران خلجی کے نام نامی سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ زمانہ داخلی اور خارجی خلفشار کا زمانہ تھا۔ بنگال سے باہر اہم واقعات رونما ہو چکے تھے۔ سلطان معز الدین غوری کا قتل، قطب الدین ایبک کی تاجپوشی اور دریائے سندھ کے اس پار غزنی، فیروزکوہ اور خراسان کے حاکموں کی باہمی چپقلش —— ان تمام حالات نے رفتارِ وقت کو اور بھی تیز بنا رکھا تھا۔ کہنے کو تو شیران لکھنوتی کے تاج و تخت پر متصرف تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر خلجی امیر کے دل میں اس وقت خود سلطان بن جانے کی لگن موجود تھی۔ شیران ایک مردِ جنگجو، کارآزمودہ سپاہی اور دانش پژوہ انسان ہونے کے باوجود امرائے خلج کی ریشہ دوانیوں کے سامنے اپنے آپ کو مجبورِ محض پاتا تھا۔ ایک طرف اپنے امیروں کی سازشیں تھیں تو دوسری جانب سلطنت دہلی کی طرف سے خوف و ہراس تھا۔ بہرکیف اپنے ذاتی وقار کو قائم رکھنے کے لئے اس نے تمام امراء کے مناصب برقرار رکھے اور علی مردان کے حامیوں سے بھی کسی قسم کی بازپرس نہ کی۔ نتیجتاً سلطان کے اس غیر دانشمندانہ فعل کی وجہ سے بہار کا سارا مفتوحہ علاقہ خلجیوں کے دائرۂ اقتدار سے نکل کر سلطان قطب الدین کے ممالکِ محروسہ میں شامل ہو گیا۔

گھوڑا گھاٹ میں علی مردان کے فرار ہو جانے سے بنگال کے امن و سکون میں پھر اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔ علی مردان نے دہلی پہنچ کر سلطان ایبک کے دربار میں پناہ ڈھونڈلی اور اسے ملک عز الدین کے خلاف لشکرکشی پر آمادہ کیا۔ قطب الدین نے اپنے صوبیدار اودھ قیماز رومی کو لکھنوتی پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ بظاہر امرائے خلج کے باہمی منافقات کو دور کرنے کی کوشش کرے اور بباطن بنگال کو سلطنت دہلی سے منسلک کر دے۔ قیماز رومی دریائے کوسی عبور کر کے بنگالہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ گنگا رال کے خلجی حاکم حسام الدین نے بڑھ کر اس کا شاہانہ استقبال کیا اور جملہ مراسمِ خدمات بجا لایا۔ ملک عز الدین کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ دیوکوٹ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ قیماز نے دیوکوٹ پر قبضہ کر لیا اور اسے حسام الدین کے تصرف میں دے کر خود اودھ کو واپس ہوا۔ اس انتظام کی رو سے خلجی جاگیریں بھی دیوکوٹ کی عملداری میں شامل تھیں جہاں سلطان دہلی کا گماشتہ برسرِ حکومت تھا۔ قیماز کو اودھ جاتے ہوئے راستے میں علم ہوا کہ ملک عز الدین نے خلجی امیروں کو جمع کرتے پھر دیوکوٹ پر حملہ کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ راستے ہی سے واپس لوٹا اور ملک عز الدین کو شکست دے کر سنتوش (ضلع بوگرہ) کی طرف مار بھگایا۔ ملک عز الدین کو اپنی فرمانروائی کے سال بھر کے مختصر عرصے میں مسلسل مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے دوبارہ دیوکوٹ پر حملہ آور ہونے کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ چنانچہ زندگی کے باقی ماندہ ایام سنتوش ہی میں گزار کر وہ رہگرائے عالمِ بقا ہوا۔

حسام الدین ۱۲۰۸ء سے ۱۲۱۰ء تک سلطانِ دہلی کا باجگذار حاکم بن کر لکھنوتی اور اس کے گرد و نواح پر حکومت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سلطان قطب الدین نے علی مردان کو ترکوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ لکھنوتی کا گورنر بنا کر بنگال روانہ کیا۔ علی مردان کسی مزاحمت کے بغیر ۱۲۱۰ء میں بنگال وارد ہوا۔ حسام الدین نے امرائے خلج کی معیت میں اس کا استقبال کیا اور عنانِ حکومت اس کے سپرد کر کے خود لکھنوتی میں گوشہ گزیں ہو گیا۔ علی مردان اب بلاشرکتِ غیر بنگال کا مطلق العنان حاکم تھا۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ اس کے ولیِ نعمت سلطان قطب الدین ایبک نے سفرِ آخرت اختیار کر لیا ہے۔ سلطان کی وفات حالات کی ابتری کے لئے ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی کیونکہ معزی اور قطبی امیروں میں سلطان کی جانشینی کے لئے جھگڑے شروع ہو چکے تھے۔ لاہور اور دہلی ان جھگڑوں کا مرکز بنے ہوئے تھے جہاں آرام شاہ اور التمش کو ہندوستان کے تخت و تاج کا وارث سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملتان اور سندھ میں ناصر الدین قباچہ نے علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ بنگال میں علی مردان خلجی نے جملہ اختیارات سنبھال لئے تھے۔ اس طرح "منہاج سراج" کے بیان کے مطابق

ہندوستان چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور لکھنوتی کے علاقے پر خلجی ملک اور سلاطین پوری طرح قابض تھے۔

علی مردان اب سلطان علاء الدین کے لقب سے بنگال کی قسمت کا مالک بنا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہترین سپاہیانہ قابلیتیں رکھتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بہت خونریز اور قتال تھا۔ سینکڑوں خلجی امیر اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بن چکے تھے۔ راجی کے خوف سے رعایا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ باجگذاری اور خراج کی رقمیں بن مانگے وصول ہو رہی تھیں اور سرکاری خزانہ روز بروز معمور ہوتا جا رہا تھا۔ حکومت اور دولت کے اس نشے نے علی مردان کا دماغ خراب کر دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو عالم اسلام کا فرماں روا سمجھنے لگ گیا تھا۔ خوشامدی اور دھوکے باز لوگ اس کے اس خبط سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ رعایا علیحدہ تشدد کا شکار بن رہی تھی۔ آخر خلجیوں کی رگِ حمیت پھڑکی اور انہوں نے اپنے سردار حسام الدین کی سرکردگی میں سازشی طریقے سے علی مردان خلجی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس طرح بختیار خلجی کا خونِ بیگناہ رنگ لا کے رہا ؎

تمہارے کشتوں کا خونِ ناحق چھپے گا کیونکر بروزِ محشر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

حسام الدین نے اپنے خلجی امراء کے اصرار پر سلطان غیاث الدین کا لقب اختیار کر کے زمامِ سلطنت کو سنبھالا اور اپنی پہلی توجہ اس جانب منعطف کی کہ لکھنوتی میں اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرے اور علی مردان کے ساتھ دہلی سے جو ترک سپاہی آئے تھے، انہیں اپنے ساتھ ملائے رکھے۔ اس دوران میں اسے ہندو راجاؤں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جس میں اسے شکست ہوئی۔ ۱۲۱۴ء میں سلطان نے لکھنوتی کو ہندو تغلب سے واگذار کر دلانے کی کوشش کی اور بڑے شدید محاصرے کے بعد یہ علاقہ سلطان کی تحویل میں آگیا۔ یہیں سے سلطان کی آئندہ فتوحات کی ابتدا ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت کے ساتھ بہت سے نئے علاقے بھی مل جاتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قوت مجتمع کر کے سلطان نے پورے بنگال کو زیرِ قبضہ لانے کی کوشش شروع کر دی اور اس منصوبے کے لئے اپنے پایۂ تخت کو دیوکوٹ سے لکھنوتی لے جانا بہتر سمجھا۔ چنانچہ ۱۲۱۹ء میں سرکاری طور پر لکھنوتی کو حکومت کا صدر مقام قرار دے دیا گیا۔ یہاں سلطان نے کئی ایک نادر تعمیری اصلاحات نافذ کیں جن سے اس علاقے کی مقامی حیثیت میں قابلِ قدر اضافہ ہو گیا۔ سلطان کے زمانے میں لکھنوتی اور بہار بارہ سال تک امن و امان کا گہوارہ بنے رہے یہاں تک کہ ۱۲۲۵ء میں سلطان التمش نے بنگال پر پہلا حملہ کیا۔ لکھنوتی سے سلطنت دہلی کے تعلقات تو علی مردان کے عہد ہی سے منقطع ہو چکے تھے۔ التمش تخت و تاج سنبھالتے ہی جالیوں، بنارس، قنوج اور اودھ کی طرف متوجہ ہوا۔ بنگال اور بہار پر بھی اس کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ راستے میں کچھ ایسے حالات کا سامنا ہوا کہ لکھنوتی کے حاکم کو اپنا باجگذار بنا کر صلح کر لی۔ ادھر بہار میں ملک علاء الدین جانی کو حاکم بنا دیا جسے غیاث الدین نے شکست دیدی اور وہ بہار کو پھر اپنے قبضے میں لے آیا۔ سلطان التمش کو خبر ملی تو وہ غیاث الدین کی بدعہدی پر مصلحتاً خاموش رہا۔ کچھ عرصہ بعد التمش نے اودھ کی تسخیر کے لئے اپنے خلف اکبر شاہزادہ نصیر الدین محمود کو ایک بڑی فوج دے کر روانہ کیا تو اسے غیاث الدین کو بدعہدی کا مزا چکھانے کی تاکید بھی کر دی۔ چنانچہ نصیر الدین محمود نے پہلے لکھنوتی پر حملہ کیا۔ غیاث الدین اس وقت ہندو راجاؤں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ یہ خبر ملتے ہی فوراً لکھنوتی کی طرف واپس ہوا لیکن شاہزادے کا لشکر پہلے ہی سے شہر میں داخل ہو کر باسن کوٹ پر قبضہ کر چکا تھا۔ غیاث الدین نے بڑی بے جگری سے شاہی افواج کا مقابلہ کیا لیکن تقدیر غنیم کا ساتھ دے رہی تھی۔ بالآخر وہ اپنے سپہ سالاروں سمیت گرفتار ہوا اور ۱۲۲۷ء میں شہزادے کے حکم سے ان سب کو تہِ تیغ کروا دیا گیا۔

غیاث الدین کا ۱۴ سالہ عہدِ حکومت سلطنت اور رعایا کے لئے امن و خوشحالی کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چنگیز خان خراسان اور ماوراء النہر کے اسلامی مرکزوں کو پامال کرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور بمصداق ع خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد، ہندوستان کی اسلامی ریاستیں روز بروز قوت حاصل کر رہی تھیں کیونکہ ترکمانی دستوں کے دستے نقل مکانی کر کے مغرب کی سمت ایشیائے کوچک میں اور جنوب مشرق کی سمت بنگال تک پھیلتے چلے آ رہے تھے۔ اس طرح نہ صرف اسلامی ہندوستان کی عسکری قوتوں میں اضافہ ہو رہا تھا بلکہ یہ ایک اسلامی تہذیب و تمدن کا اہم مرکز بن رہا تھا جو حملۂ مغول سے خوف کھائے ہوئے لوگوں کو جمنا اور مہا ندی کے ساحلوں تک

(باقی صفحہ ۱۴۴ پر)

مشہد بالاکوٹ

عارف حجازی

چاروں طرف گہری کہر چھائی ہوئی تھی اور شہر بالاکوٹ وہاں کے
پُراسرار پہاڑ، خاموش وادیاں نگاہوں سے ابھی تک اوجھل تھے۔ دور سے
دریائے کنہار کے بہنے کی مترنم آواز تنگ گھاٹی اور کہستانی وادیوں میں
گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی جیسے کسی نے زندگی کے خوابیدہ تاروں کو
چھیڑ دیا ہو۔ زندگی کا یہ سیلِ رواں، خاموش دھندلی صبح اور ایسے
میں بالاکوٹ کی خونیں آشام تاریخ کے بارے میں سوچ کر دل میں جیسے ایک
ہلچل مچی ہوئی تھی اور میرے قدم تیزی سے مسجد کی جانب اٹھ رہے تھے۔

مسجد تک پہنچنے میں کافی لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ راستہ بھر ذہن
میں جیسے تاریخ کا ایک ایک ورق کھلتا چلا گیا۔ اسلام جب ایران اور افغانستان
کے راستے برصغیرِ ہند میں پہنچا تھا تو وہ اپنی بہت کچھ تازگی اور زندگی کھو چکا تھا۔
ترک، پٹھان، مغل فاتحین کے اسلام میں کوئی شبہ نہیں لیکن مذہب اور تہذیب
فتح کرنے کے لئے ان کی روحانی قوت ناکافی تھی اور ان کی حالت ایسی تھی
کہ ان کی دینی اصلاح کی جاتی لیکن یہ فاتحین اپنی کامرانی اور فتحمندی کے
نشے میں چور بتکدۂ ہند کو برباد و تاراج کرکے عظیم الشان سلطنتیں قائم
کرنے میں مصروف ہو گئے اور اپنی ضرورت کے مطابق احکام اور قوانین
نافذ کرتے رہے۔ ان میں سے چند ہی ایک ایسے تھے جنہوں نے نفسِ اسلام
کے مطابق اپنی حکومت قائم کی ہو۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ مذہب
حکومتِ وقت کی سرپرستی اور حمایت سے محروم ہو گیا۔ عہدِ اکبری میں تو
کفار برملا کفر اور الحاد پھیلاتے رہے۔ اگر ہندوستان میں اس زمانے میں
اسلام کے دو عظیم المرتبت پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد
سرہندی علیہ رحمۃ اور شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ (دہلوی)
پیدا نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ اسلام یا تو فنا ہو جاتا یا پھر اس کی اتنی
بگڑی ہوئی صورت ہوتی جیسے اور مذاہب کی ہے۔ ان بزرگانِ دین
کی خیر و برکت نے اسلام کے قدم سرزمینِ ہند میں اتنی مضبوطی سے جما دیئے
تھے کہ آئندہ کی راہیں ہموار ہو گئی تھیں۔ پھر آگے چل کر اسلام کے احیاء
میں ہندوستان کے ایک جلیل القدر فرمانروا اور خدا ترس دین دار
بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر مرحوم نے بھی بہت شاندار کام انجام
دیا لیکن اس کی موت کے کچھ عرصہ کے بعد سلاطینِ تیموریہ صرف خانقاہ
نشین ہو گئے۔ ان کا سنبھلنا دشوار ہو گیا اور اس طرح اسلام کی
مرکزیت میں پھر شگاف پڑ گئے۔ مسلمانوں کو کمزور پا کر بیسیوں فتنوں
نے سر اٹھایا۔ دکن سے لے کر دہلی تک مرہٹے چھا گئے تھے۔ پنجاب میں
افغانستان کی حدود تک سکھوں کا راج تھا۔ اور ہندوستان کے
ساحلوں پر یورپی قوموں خصوصاً انگریز کا قبضہ تھا اور ان کا کافی اثر و
رسوخ قائم ہو چکا تھا۔ ان حالات کے مقابلے کے لئے اگر کوئی باقی
رہ گیا تھا تو وہ ترکشِ اسلام کا آخری خدنگ سلطان ٹیپو شہید تھے لیکن
یہ ترکش بھی ۱۷۹۹ء میں ناپید ہو گیا تو اسلام کی شیرازہ بندی کے سارے
امکانات ختم ہو گئے۔ اور ملک کے گوشے گوشے میں اسلام بہت کمزور
ہو گیا۔ کہیں قوت کے آثار باقی نہ رہے۔ ہر جگہ جمود طاری ہو گیا۔ مسلمان
قوم ہر شعبۂ زندگی میں تنزل پذیر ہو گئی اور زراعت اور تجارت بھی تباہ ہو گئی۔
دین کے راستے مسدود ہو گئے۔ مسجدیں ویران ہو گئیں۔ بد اعتقادی نے
جاہل مسلمانوں کو اسلامی نظریۂ حیات اور تعلیمات سے کوسوں دور کر دیا
اور وہ تعویذ، گنڈے، فقیروں اور دیوانوں پر اعتقاد کرنے لگے چنانچہ
جہاں ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی قوت فنا ہو چکی تھی وہاں دوسری طرف
معاشرتی و تمدنی انحطاط نے انہیں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا عادی
بنا دیا تھا۔ خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی حالت سب سے بدتر ہو چکی تھی۔
رنجیت سنگھ اور دوسرے سکھوں کے گھرانوں میں مسلمان اور افغان عورتیں
لونڈیوں اور باندیوں کی خدمات انجام دیا کرتی تھیں۔ اذان و گاؤ کشی
سخت ممنوع تھی اور بات بات پر مسلمانوں کے گھر، جائداد اور املاک
ضبط کر لی جاتی۔ انہیں کسی قسم کی مذہبی و تمدنی آزادی نہ تھی۔ مساجد کی
کھلے عام بے حرمتی کی جاتی تھی۔ لاہور کی بادشاہی مسجد سکھ پلٹن کا اصطبل

تھی۔ ان حالات۔ اور ذہنی غلامی نے انھیں اتنا اخلاقی طور پر گرا دیا تھا کہ بقول علامہ اقبالؒ ؎

خالصہ شمشیر قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

مسلمانوں کے اس زوال و انحطاط کے زمانے میں قدرت نے حضرت سرہندیؒ اور حضرت مجدد دہلویؒ کے فضل و کمال کے دو آتشہ سے رائے بریلی کے خمکدہ میں ایک ایسا سہ آتشہ تیار کیا جس نے مسلمان قوم کے تنِ بے جان میں پھر سے اسلام کی روح پھونک دی تھی اور یہ مردِ مقدس حضرت سید احمد شہیدؒ (رائے بریلوی) تھے جنہوں نے اسلام کی حفاظت اور تجدیدِ دین کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں کو ذلت اور پستی سے نکال کر پھر انہیں ان کے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ اور شاہ سید اسمٰعیل شہیدؒ (دہلوی) جیسے بندگانِ دین نے سید صاحبؒ کی تحریکِ اسلامی کو ایسے چار چاند لگائے۔ اور یہ تحریک اس شان و شوکت سے ابھری کہ سارے ہندوستان میں اس کا عام چرچا ہو گیا۔ حضرت سید صاحبؒ کی اس تحریکِ اسلامی کے بارے میں ایک انگریز مؤرخ ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر (جو اس تحریک کا سب سے بڑا دشمن تھا) اپنی تصنیف "مسلمانانِ ہند" میں لکھتا ہے ؎

"یہ لوگ ..... بے لوث بے غرض تھے
ان کا طریقِ زندگی ہر شے سے بالاتر تھا ....
ان کا اصل کام تزکیۂ نفس اور اصلاحِ دین تھا۔
میرے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں ان کی عزت و تعظیم کئے بغیر ان کا ذکر کروں۔ ...... یہاں تک مجھے اس تحریک کا علم ہوا ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہابی مبلغین بہت بڑے روحانی پیشوا تھے اور کم سے کم خود غرض لوگ تھے۔ ان کی تحریک بڑی منظم اور ہمہ گیر تھی۔ ان جیسے دین دار اور خدا ترس رہنما تھے جنہوں نے اپنی علمی اور عملی زندگی بہترین نمونہ پیش کر کے بہت تھوڑے عرصے میں اپنی تحریک کو ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلا دیا اور لاکھوں مسلمان ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔"

ایک اور جگہ ایک دوسرا متعصب مؤرخ جیمس رکینیل بنگالی مسلمانوں کے بارے میں لکھتا ہے۔

"وہ کمزور اور بزدل بنگالی مسلمان خونخواری
اور جوشِ جہاد میں افغانوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔"

ان غیر ملکی مؤرخوں کے تاریخی حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تحریک میں کتنی جان تھی اور اس زمانے میں ایک ایسی ہی تحریک کی سخت ضرورت تھی۔ خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ سید صاحبؒ کی ساری توجہ انہیں غلامی اور پستی سے نکالنے کی طرف مرکوز ہو گئی۔ اور سب سے پہلے اس وقت اسی کی ضرورت بھی تھی کہ "مردے از غیب برون آید و کارے بکند" ۔ یہ سعادتِ ازلی سے پشاور سے راس کماری تک چھ کروڑ مسلمانوں میں رائے بریلی (یوپی) کے ایک اولوالعزم سیدؒ کی قسمت میں تھی کہ وہ کفر اور ظلم کے خلاف جہاد کرے۔ اگرچہ اس تحریکِ اسلامی کے بانی حضرت سید احمد شہیدؒ کو اور ان مسلمانوں کو جو ان کے ہمرکاب تھے لاکھوں دشواریاں جھیلنے کے بعد بھی کامرانی نصیب نہ ہوئی اور قوم کے غداروں نے سینکڑوں سازشیں کیں لیکن یہ تحریک ختم نہ ہو سکی۔ اور اسی بالاکوٹ کے مقام پر یہ بزرگان دین اسلام کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)

مگر بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور یہ بات یہاں بھی صادق آئی حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ سید اسمٰعیل شہیدؒ اور ہزاروں شیدایانِ اسلام کے شہید کئے جانے کے بعد بھی اسلامی تحریک اور قومی آزادی کی جدوجہد کی بنیادوں کو پھر بھی کوئی غدار سے غدار شخص ہلا نہ سکا۔ اس قومی جہاد اور آزادی کا آخری معرکہ اسی بالاکوٹ کی تنگ وادیوں میں ہوا تھا۔

میں نے چلتے چلتے جب تاریخ کی اس خونیں داستان کے بارے میں سوچا تو جیسے میرا دل جوشِ حریت سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور میں اس پر غور کرتا ہوا جب مسجد میں داخل ہوا تو نماز ہو چکی تھی۔ لوگ واپس ہو رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی میں لوگوں کی کالی کالی اور سفید داڑھیاں اور عمامے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں مسجد سے ہوتا ہوا آگے بڑھ کر دریا پہ پہنچا جہاں ٹھنڈے پانی سے وضو کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر کا

سویا ہوا مجاہد جاگ اٹھا ہے۔ پھر میں تیزی سے مسجد کے اندر آیا جس کے فرش پر سوکھی ہوئی نرم نرم گھاس بچھی ہوئی تھی اور میرا ملاقاتی غریب شاہ ایک کونے میں بیٹھا ہوا تلاوت میں مصروف تھا۔ میرے نماز سے فارغ ہونے تک اس نے بھی فرصت پائی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سلام کر کے مسجد سے باہر نکلے اور ٹہلتے ہوئے دریا کے ایک اونچے کنارے پر آ گئے۔ جہاں سے لوہے کے رسوں کا تنگ پل صاف نظر آ رہا تھا اور دریائے کنہار کسی آزاد اور منچلے جانباز کی مانند پتھریلے کناروں سے زور آزمائی کرتا ہوا، سنگ ریزوں اور گول گول پتھروں سے کھیلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اور اس کے صاف و شفاف دھاروں پر سورج کی ارغوانی کرنیں پڑتے ہی جیسے قوس قزح کی رنگینیاں جھلکنے لگی تھیں۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک دریا کے کنارے کھڑے پُر کیف مناظر میں محو رہے اور پھر باتیں کرتے ہوئے سید احمد شہیدؒ کے مزار کو جانے والے راستے پر روانہ ہو گئے۔

دریا سے تھوڑی ہی دور پر مزار تھا۔ مزار پر جانے کیلئے ایک تنگ گلی سے ہو کر ہم ایک چار دیواری میں داخل ہوئے جہاں کئی قبریں تھیں۔ ان میں سب سے اونچی قبر سید صاحبؒ کی تھی۔ قبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پھر مجاہدِ کبیر کی پاکیزہ زندگی کی یاد تازہ ہو گئی۔ چاروں طرف گہری خاموشی اور سکوت تھا نہ وہاں کوئی مجاور تھا نہ چادر تھی نہ بجھے ہوئے چراغ رکھے تھے لیکن درختوں اور جھاڑیوں میں سرخ جھنڈیاں لٹک رہی تھیں۔

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

پھر ہم دونوں وہاں سے سید شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا مزار دیکھنے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک بھٹیار خانے میں ناشتہ کیا۔ اور قدیم بالاکوٹ کے سامنے ایک پہاڑی ندی کو عبور کیا جس میں چاروں طرف سے چشموں کا پانی بہہ کر آ رہا تھا۔ اسی کے کنارے ایک کھیت میں حضرت سید شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی پختہ قبر تھی جس کے چاروں طرف دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ ہم شاہ صاحبؒ کے مزار کی زیارت کر کے ندی کے کنارے تھوڑی دیر سستانے کی غرض سے بیٹھ گئے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ غریب شاہ بڑا سنجیدہ اور سمجھدار نوجوان تھا اور اسے ان شہیدانِ ملت سے بڑی عقیدت تھی۔ گفتگو کے دوران میں بار بار اس کی آواز جیسے بھرا اٹھتی اور وہ خاموش ہو جاتا اور اس طرف دیکھنے لگتا جدھر اونچے اونچے پہاڑوں میں کاغان روڈ بل کھاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اس کے آگے برف پوش

پہاڑوں کی سربلند چوٹیاں دھوپ سے جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ غریب شاہ نے سب سے اونچی چوٹی کی جانب اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ جہاں پہاڑوں میں سب سے اونچی چوٹی نظر آ رہی ہے وہ "موسیٰ کا مصلّٰی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے متعلق روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس برف پوش چوٹی پر مصلّٰی بچھائے مصروفِ عبادت ہیں اور انسان کی نجات کے لئے خدا سے دعا کرتے رہتے ہیں۔

یہ سنا تو میں مسکرا دیا۔ میں نے کہا "یہ روایت بھی خوب ہے!"

اور پھر ہم دونوں قدیم بالاکوٹ میں آئے جہاں ایک نانبائی کی دکان پر دوپہر کا کھانا کھایا اور وہیں تھوڑی دیر بیٹھے اخبار پڑھا اور اس کے بعد اس سمت نکل آئے جہاں میدانِ جنگ تھا۔ یہ مٹی کوٹ کے دامن میں ایک چھوٹی سی وادی تھی اور اس کے پیچھے فلک پیما پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ وادی ختم ہوتے [illegible] اور چیڑ کے گھنے جنگل تھے جن سے یہ پہاڑ ڈھکے ہوئے تھے۔ [illegible] مقام سے تھوڑی دور پر ایک مسجد تھی جس میں سرو کے دو درخت لگے ہوئے تھے۔ یہ وہی تاریخی مسجد ہے جہاں مجاہدین کا مرکزی دفتر تھا اور فوج کشی کے احکامات

یہیں سے جاری کئے جاتے تھے۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ سے وادی کو دیکھا جو پہاڑوں کے دامن میں بڑی تنگ ہو گئی تھی۔ اسی تنگ وادی میں مجاہدِ کبیر اور سکھ فوجوں میں آخری خونریز جنگ ہوئی تھی یہی وہ میدان تھا جہاں حق اور باطل فیصلہ کن جنگ کے لئے صف آرا ہوئے تھے۔ اس وادی کو پھر ایک بار اچھی طرح دیکھ کر جنگ کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھنچ گیا۔

راجہ شیر سنگھ نے دوسرے مقامات سے اپنی تمام فوجیں اور توپیں ہٹا کر بالاکوٹ میں جمع کر دی تھیں اور تبھی کوئی [illegible] اپنی لشکرگاہ بنائی تھی بالاکوٹ تک پہنچنے کے لئے دو راستے تھے ایک پہاڑی راستہ تھا بڑا خطرناک تھا اور گھنے درختوں اور خودرو جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا تھا اور یہ راستے مقامی لوگوں کے اس سے کوئی دوسرا واقف نہ تھا اور دوسرا راستہ ایک چھوٹے سے پل پر سے ہو کر آ مسجد جاتا تھا۔ سید صاحبؒ نے ان دونوں راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی لیکن دشمن کے مقابلہ میں ناکہ بند فوج بہت کم تھی۔ اس کے باوجود شیر سنگھ کی اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ وہ ان دونوں ناکوں پر حملہ کر دے۔ آخر کئی روز کے محاصرے کے

بعد وہ بالاکوٹ کی تسخیر سے مایوس ہوکر لاہور واپس جانے ہی والا تھا کہ ناکوں کے محافظ دستے میں سے کسی غدار نے اس پہاڑی راستے کا پتہ بتا دیا۔ چنانچہ راجہ کی ہمت بندھی اور اس نے ایک دن پچھلی رات سے تیاری کرکے اچانک دونوں ناکوں پر زبردست یلغار کر دی۔ ادھر سید صاحبؒ کو خبر ہوتے ہوتے مہاراجہ کا لشکر پہاڑوں پر چھا گیا اور وہ اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر لڑتے رہے، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جوشِ جہاد سے سرشار بڑی مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ حضرت سید احمدؒ بھی فوج میں نہیں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے شہید ہوتے ہی تمام مجاہدین نے اور زیادہ جوش و خروش سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ آخر غنیم کی بھاری فوج اور توپخانے کے آگے مٹھی بھر فوج زیادہ دیر مقابلہ نہ کرسکی اور وہ تمام لوگ ایک ایک کرکے شہید ہوگئے جو ہر حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے [illegible] ترک تھے۔ آج بالاکوٹ کی اس تنگ وادی میں ہزاروں [illegible] ہدین خاک میں مل کر خاک ہو چکے ہیں۔ سکھوں نے روایت کے مطابق حضرت شاہ شہیدؒ اور سید صاحب شہیدؒ کے جسدِ مبارک کو شناخت کراکے نہایت احترام سے اسلامی طریقے پر دفن کروا دیا۔[1]

اسلامی تاریخ کے اس خونیں باب کا سارا منظر نگاہوں کے سامنے اجاگر تھا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش میں بھی ان مجاہدین میں شریک ہوسکتا۔ پھر خیال آیا کہ تیرہویں صدی میں اس تحریک نے جو تنظیم اور سیاسی اثرات چھوڑے تھے پھر وہ کسی طرح نہ مٹ سکے بلکہ باوجود مسلمانوں کے اپنے مقصد میں شکست کھانے کے ان میں بھی اصلاحی اور سیاسی شعور اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ ان بزرگانِ دین کی شہادت کے بعد سے لے کر قیامِ پاکستان تک کی تاریخ اور اس کے سیاسی پہلوؤں کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہماری آزادی کی جد و جہد اور تحریک اسلامی کی ساری کڑیاں سید صاحبؒ شہید کی تحریک سے جا ملتی ہیں یہی وہ تحریک تھی جس نے مسلمانوں میں نیا سیاسی شعور پیدا کر دیا تھا اسی اجتماعی احساس نے ۱۸۵۷ء میں بھی اپنی جولانیاں دکھلائی تھیں اور پھر اس سیاسی شعور کا میدان اتنا وسیع ہوگیا کہ ٹھیک نوے سال کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء میں جاری تحریکِ اسلامی اور آزادی کی جنگ نے پاکستان کی عظیم الشان مملکت کی بنا ڈالی اور جس مشن کو حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ لے کر اٹھے تھے اسی مشن کو آخر قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے پورا کرکے ان بزرگانِ دین کے اسمائے گرامی کو ہماری قومی تاریخ میں اور زیادہ اجاگر کر دیا۔

گو آج ہم میں یہ بزرگانِ دین موجود نہیں ہیں لیکن ان کی قومی خدمات اور کارنامے ایسے ہیں جن کی وجہ سے ان کے مبارک نام تاقیامت ہماری قومی تاریخ میں قائم و دائم رہیں گے۔!!

★

[1] سوانح احمدی

علمی دور: —— بقیہ صفحہ ۱۲۰

کھینچ کر لا رہا تھا۔ لکھنوتی کو اس وقت علوم و فنون میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور سرزمینِ بنگال کو قدرت نے علی مردان جیسے ظالم کی جگہ غیاث الدین ایسا حلیم، منصف مزاج اور عالم دست سلطان دے رکھا تھا۔ وہ ظاہر و باطن بادشاہانہ خصائل کا مالک تھا۔ بنگال کا یہ پہلا خود مختار فرماں روا تھا جس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا، علم و فن کی سرپرستی فرمائی اور رفاہ عامہ کے کاموں میں حصہ لیا۔ اس نے جنوبی بہار کو دوبارہ اپنی قلمرو سے ملحق کیا اور اس کی سرحدیں دہلی اور اودھ کو چھوتے ہوئے شمالی بہار سے ہم آغوش ہونے لگیں۔ غیاث الدین نے فتح بنگال کی بنیادوں کو اس طرح مستحکم کیا کہ اس کی وفات کے سو سال بعد انہی بنیادوں پر بلبن کے خاندان نے بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں کھڑی کرکے صفحاتِ تاریخ میں اپنے لئے باعزت جگہیں وقف کرا لیں۔

"میری سنو!"

(سید آفاق حسین)

(کارٹون - ریحان)

جو گونس نصیحت نیوئس ہے - اگر چہ میں کہا کہاں اور غالب کہاں - اور نہ میں حالی ہوں جو مصلح قوم بن کر یہ طرز خطاب اختیار کر

رنگ کولے کا ھیٹ سولے کی!

سکوں : اے ماؤ، بہنو، بیٹیو - اور بھائیو! گو میرا خطاب آپ ھی سے ھے - اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی عزت آپ ھی کے دم سے ھے - اور آپ جانیں عزت یعنی تعظیم کا مسئلہ اور سب مسئلوں سے بڑھ چڑھ کر ھے - اور پھر آجکل کے زمانے میں! کسی نے ٹھیک ھی تو کہا تھا کہ :-

میر صاحب زمانہ نازک ھے
دونوں ھاتھوں سے تھامئے دستار

اور پھر میر صاحب یا شیخ صاحب پر کیوں جائیے - قوموں کا بھی یہی حال ھے - اگر ان کا دنیا میں وقار ھے تو سب کچھ ھے ورنہ کچھ بھی نہیں - اللہ بخشے! شہنشاہ ظرافت، لسان‌العصر اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا تھا :

"واہ کیا دھج ھے میرے بھولے کی
رنگ کولے کا ھیٹ سولے کی!"

آج بھی رنگ کولے سے بھی بڑھ چڑھ کر سہی - ھیٹ تو ضرور سولے کی ھوگی - یہ باھر کی چیز

ھی تو ھے - اپنے وطن کی تو نہیں - اور پھر بات بھولوں اور سولوں تک ھی نہیں رھتی - جہاں بھولے ھوں وھاں بھولیاں بھی ھوں‌گی - اور ھیٹ کی جگہ اسکارف وغیرہ لے لیتے ھیں اور یہ چیزیں بھی تو محض نام لینے ھی کیلئے چن لی گئی ھیں - ورنہ بقول حکیم ملت رح :

،،چمن اور بھی آشیاں اور بھی ھیں،،

یہ مسئلہ ایک بہت بڑے مسئلے کا جزو ھے — اپنی صلاحیتوں، اپنے ساز و سامان، اپنی پیداوار، اپنے وسائل سے منہ موڑ کر دوسروں کی طرف رخ کرنا - اپنے قومی ذرائع کو ترقی دینے سے پہلوتہی - آئیے ھم تھوڑی دیر سولہ ھیٹ اتار کر دماغ کو ذرا ٹھنڈی ھوا لگنے دیں اور سکون دل سے کچھ کام کی باتیں کریں -

نہ ملا کھیپ کو کچھ روز جو پانی نہ سہی !

ھم مشرق کے مسکینوں کا دل واقعی مغرب میں بری طرح جا اٹکا ھے - حضرت اکبر کے زمانے میں بوٹ تھا تو ڈاسن کا اور اب جانے اس کی جگہ کون کون سے جوتے چلتے ھیں ! قماش ھے تو بدیسی - مشینیں ھیں تو غیر ملکی - اور تو اور ملکی بلیڈ کی وہ دھار کہاں جو ولایتی کی ھے - جو ھیں تو ''بارلی موتیوں،، کی شکل میں - گندم ھے تو ''فلیکس،، کے روپ میں - گھڑیوں کا بدیسی میک کہاں اور دیسی مال کہاں - صاف بات ھے جب ھماری نظروں میں بدیسی کپڑے ھی جچیں تو یہاں کے کارخانے اچھا مال کیوں اور کیسے تیار کریں ؟

یہ جو میں نے کھانے پینے کا ذکر کیا تو خدانخواستہ ! اس سے میری یہ مراد نہیں کہ میں آپکو فاقوں سے دیکھنا چاھتاھوں یا یہ کہ آپکو '' تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس ،، کی تعلیم دوں - بلکہ سچ پوچھئے تو فاقوں اور تن کی عریانی کا جتن تو آپ خود کرتے ھیں
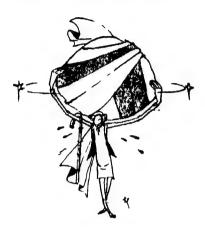
دونوں ھاتوں سے تھامئے دستار !

کہ دھڑادھڑ پرایا مال خریدے چلے جاتے ھیں اور اپنے ملک کی دولت اندھادھند باھر دھکیلتے جاتے ھیں - اس طرح زر مبادلہ کی بچت کا پلہ تو ھمیشہ دوسروں ھی کی طرف جھکا رھے گا -

اس سب سے بڑی نعمت کو لیجئیے جو قدرت نے ھمیں عطا کی ھے — ھمارے وطن عزیز کی پیاری مٹی - اتنا سونا اگلنے والی - وہ سونا جو پیداوار، معدنیات، آبی وسائل کتنی ھی شکلوں میں سامنے آتا ھے - مگر ھم اسے لفظاً ومعناً ٹھکرا دیتے ھیں - اور اسکا سبب محض ھماری لاعلمی ھے ، بے حسی ھے - ہر سال دھنواں دھار بارشیں ھوتی ھیں اور اس اکسیر جیسی مٹی کو بہا لے جاتی ھیں - نیچے بیکار، بانجھ مٹی، کھردری چٹانیں رہ جاتی ھیں جن سے کچھ بھی تو نہیں نکلتا - بڑے بڑے کھیت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ جاتے ھیں - جن میں کھیتی باڑی بھی مشکل اور محنت و مشقت کا نتیجہ بھی برائے نام - پھر جوں جوں پودے کم ھوتے جاتے ھیں، پانی کے ریلے زور شور سے آتے ھیں - پھر ھم اپنی نادانی سے اس مصیبت کو کچھ اور بھی بڑھا لیتے ھیں - غم نداری بز بخر - جہاں بکری پالنا خود ایک درد سر ھے - وھاں یہ

ایک اور خطرے سے بھی خالی نہیں - جو بھی ہری چیز ہو، یہ جانور اسکے حق میں بلا ہے - اور انجان دیہاتی اسے کم خرچ جان کر اسکے ریوڑ کے ریوڑ پالتے جاتے ہیں - چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہری بھری جگہیں صاف ہوجاتی ہیں - سیلاب اور بھی زور شور سے آنے لگتے ہیں اور دریا اتنے چڑھتے ہیں کہ گاؤں کے گاؤں' شہر کے شہر بہا لے جاتے ہیں - یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں زمین کی ٹوٹ پھوٹ کی رفتار دنیا میں سب سے زیادہ ہے - اور اس سے بے اندازہ نقصان ہوتا ہے جو برابر بڑھتا ہی چلا جارہا ہے - ہم نے نادانی سے جنگلوں کے جنگل صاف کر ڈالے ہیں - اور انکی جگہ کوئی درخت نہیں اگائے - اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں - کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ جنگلات جیسی اہم قومی دولت کو محفوظ رکھیں، اسے ترقی دیں - ہم زمین سے طرح طرح کی فصلیں اگاتے ہیں تو اس کی طاقت بھی بڑھانی چاہئیے اور اسکے لئے کچی یا کیمیاوی کھاد برتنی چاہئیے - رہی بی بکری، تو اگر ہم اسکی جگہ بھیڑیں پالیں تو گوشت، اون، دودھ، سب کچھ ملے گا - اور قومی دولت بھی بڑھے گی -

"دونوں جہاں ہیں اب تو مرے اختیار میں"

دنیا میں جو بھی چیز ہے اس کا ذخیرہ لامحدود نہیں - غذا، ایندھن، پانی، تیل، دھاتیں وغیرہ جتنا ہم ان کو برتتے چلے جاتے ہیں اتنی ہی یہ چیزیں کم ہوتی جاتی ہیں - یہاں تک کہ ان کا قحط پڑنے لگیگا - اور ہم چیخنے لگیں گے کہ چائے کم ہوگئی، چاول نہیں رہے، گندم نہیں، لکڑی نہیں، کوئلہ نہیں، وغیرہ وغیرہ - ہم صنعتیں چلاتے ہیں، کارخانے بناتے ہیں - یہ بے شک بڑی فائدہ کی بات ہے - لیکن اس میں اس طرح کی چیزیں ہی تو کام آتی ہیں - اور پھر قدرتی طور پر کچے سامان کا توڑا پڑتا ہے - یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ بعض لوگ اپنا شوق پورا کرنے کیلئے رات دن شکار کھیلتے ہیں - اسکے لئے ایک تو گولیاں، کارتوس باہر سے لانے پڑتے ہیں - دوسرے جنگلات کی دولت- جانور اور پرندے بھی کم ہوتے جاتے ہیں -

ہم نے دن رات ات گت کھانے کی قسم کھا رکھی ہے اور وہ بھی گوشت - لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اسطرح ہماری ایک بڑی قیمتی قومی دولت کم ہوتی جا رہی ہے - جس سے اب سچ مچ ہمارے لئے ایک مسئلہ پیدا ہوگیا ہے -

یہ شوقینی بعض اوقات بڑی عبرتناک ثابت ہوتی ہے - لیجئیے ہم یہاں کسی بڑے ٹھاٹھ‌دار ہوٹل میں بیٹھے ہیں، شراب ارغواں کا دور چل رہا ہے اور کسی دوسرے ملک سے مہ جبین رقاصاؤں کا ایک حشر آفریں طائفہ آیا ہوا ہے - جس کی جیبیں کیا کچھ نہیں بھری گئی ہوں گی - ہم نے اپنا شوق پورا کرنے کے لئے یہ جنس تو درآمد کرلی - لیکن ادھر ہسپتال میں ایک مریض دم توڑ رہا ہے - اور اسکے لئے کوئی نہایت ضروری، جان بچانے والی دوا موجود نہیں - اسلئے کہ ہم نے اسکو فضول سمجھکر درآمد ہی نہیں کیا - اگر ہم نے ایسی چیزیں منگوائی ہوتیں تو ہزاروں لاکھوں جانیں ضائع نہ جاتیں - بے شک ہم یہاں پی رہے ہوتے ہیں اور بڑی بڑی مہنگی لیکن ادھر کوئی شخص

بھوکا مر رہا ہوتا ہے ! پھر سوڈا اور سگریٹ ہیں تو بڑی معمولی چیزیں - سگریٹ سے غم غلط ہوتا ہے ، دل بہلتا ہے - اور سوڈے سے چھوٹے چھوٹے نفیس بلبلے پیدا کرنے والی میٹھی گیس پیدا ہوتی ہے - لیکن اسکو تیار کرنے کے لئے مشینی سامان اور سرمایہ کہاں سے آتا ہے اور ان کی شکل میں ہمیں کتنی قومی دولت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے ؟

آپ کہیں گے ہم بھی کیسی فضول باتیں کرنے لگ گئے - ہم صاحب لوگ ٹھہرے اسلئے ہزاروں ٹن ٹائلٹ پیپر درآمد کرتے ہیں - آپ جانتے ہی ہونگے کہ یہ شۓ لطیف کیا ہے - پھر فلموں کو دیکھئے - یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے آنکھیں تو خوش ہوتی ہی ہیں لیکن ہمیں اپنی پونجی دوسروں کو نذر کرنی پڑتی ہے -

ہم طرح طرح کی مشینوں ' فریجیڈیئر ، اور کاروں وغیرہ کے دیوانے ہوتے چلے جاتے ہیں - جن کیلئے ہمیں دوسروں کا زیر بار ہونا پڑتا ہے -

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ دنیا میں کارکن اور سرمایہ برابر بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں - اور انکو کام میں لگائے رکھنا ضروری ہے - جس کے

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی !

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں !

لئے قدرتی وسائل لازمی ہیں - وہ کہاں سے آئیں ؟ ہماری زمینی دولت، معدنی دولت، جنگلاتی دولت وغیرہ وغیرہ کب تک ہمارا ساتھ دے سکتی ہے ؟ لہذا ہمیں ان دولتوں کو صرف کرنے میں

''گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی
کتنی اونچی ہے بات بکری کی''

احتیاط سے کام لینا چاہئے، ان کی حفاظت کرنا چاہئے، جیسے بھی ہو سکے انہیں بڑھانا چاہئے -

ہمارے دیہاتی بھائی بھی اس دوڑ میں کچھ پیچھے نہیں - گاؤں میں شادی بیاہ ، مرنے جینے اور دوسرے موقعوں پر رسموں ریتوں کے سلسلے میں کیا کچھ نہیں ہوتا - پھر کتنے ہیں جو سال کا ایک تہائی حصہ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے گذار دیتے ہیں - چوپال میں دن رات چوکڑی جمی رہتی ہے اور دے غپوں پر غپیں لڑائی جاتی ہیں - اسطرح قومی وقت بھی، جو ایک نہایت اہم قومی دولت ہے ، ضائع ہو جاتا ہے - پیسہ بچےگا تو اس سے امداد باہمی کی انجمنیں چلائی جاسکیں گی، گھریلو دستکاریوں کو مدد دی جاسکے گی ، صنعتی ترقی کے نئے نئے امکانات پیدا ہونگے - قومی دولت کچھ روپے پیسے، صنعت و حرفت ہی تک محدود نہیں - ہمارے طور طریق، پوشاک تہذیب ، روایات ، علوم و فنون - یہ بھی تو بڑا اہم قومی سرمایہ ہیں - اسکو بھی تو سنبھالنے سنوارنے، بڑھانے کی اتنی ہی ضرورت ہے - مگر یہاں سوال ذرا عمرانی نوعیت کا بن جاتا ہے - اور سچ پوچھئے تو یہ ناچیز نہ اکبر الہ آبادی ہے نہ اقبال اور نہ ٹوائن بی جو اس موضوع کی داد دے سکے - اسلئے بہترین داد یہی ہے کہ جو کچھ میں اپنی دانست میں دوسری دانائی کی باتیں کہہ چکا ہوں ، انہیں پر اکتفا کروں *

دوسرا کنارہ — بقیہ صفحہ ۸۱

"لوگ کہتے ہیں چوہدری نے شاداں کا رشتہ طے کر لیا۔"

"چوہدری نے؟" شاداں نے حیران ہو کر کہا "اس نے مجھ سے کوئی بات نہ پوچھی؟"

"شاہ دین کے لڑکے شریف کے ساتھ۔"

"چوہدری کی غیرت کو کیا ہوا ہے؟ میں اگر زندہ رہی تو یہ رشتہ کبھی طے نہیں ہو سکتا۔"

"بی بی! تیری بات کون پوچھے گا؟ چوہدری ایک کھیت اور رہن رکھ رہا ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں شاداں کے ہاتھ پیلے کر کے وہ اپنا گھر بھی بسا لے گا۔"

"مجھے چوہدری کی دوسری شادی پر کوئی دکھ نہیں رحمتے! پر شاداں میری بیٹی بھی تو ہے۔"

"بی بی! میں نے جو کچھ سنا تجھے بتا دیا۔" رحمتے نائن نے کہا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نائن کے جانے کے بعد سیداں چند لمحوں تک یوں کھڑی رہی جیسے زمین کے ساتھ چپک گئی ہو۔ اس کا جسم بت کی طرح بے حس و حرکت تھا۔ اس کی آنکھوں میں بیس سال کا سارا دکھ منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر شاداں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "ماں! تجھے کیا ہو گیا ہے؟" سیداں نے دکھ بھری ایک نظر شاداں پر ڈالی اور یہ نظر شاداں کے جسم کو پار کر گئی۔ اس نے تھرتھرا کر ماں کا بازو چھوڑ دیا۔

"شاداں! کیا تو چناب کے اس پار جانا چاہتی ہے؟"

"ماں!" شاداں نے تڑپ کر کہا۔

"دیکھ میں نے تجھے وقت پر بتا دیا ہے۔ سوچ لے اگر چناب بپھر گیا تو تجھے دوسرا کنارہ نہ مل سکے گا۔"

"ماں!" شاداں کا جسم کانپا اور ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے!

نزلہ ؟
کھانسی ؟
اس کا فوری علاج
لیکوفروٹا
آج ہی
ایک شیشی
خریدئیے
یہ بچوں کیلئے بھی نہایت مفید ہے
تجارتی تفصیلات کے لئے: ایس۔ جے اینڈ جی فضل الٰہی لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۴۹۱۳ کراچی

ترقی اور خوشحالی
کی شاہراہ
سادگی ہمارا قومی شعار ہے
مستقبل کیلئے روپیہ بچایئے
قومی ترقی کیلئے روپیہ بچانے کے چار طریقے
سیونگ سرٹیفکٹ
ڈاکخانے کا سیونگ بینک
سیونگ سٹامپ

حکومت نے حال ہی میں دوسرے پنج سالہ منصوبہ کا
خاکہ عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ منصوبہ ملک کی
غربت اور ناداری کو ختم کرنے کی مہم میں پہلا بڑا قدم ہے۔
اس منصوبہ کی تکمیل پر تقریباً ۱۹۰۰ کروڑ روپے خرچ
ہونگے۔ عظیم الشان کارخانے اور ورکشاپ، نئی نہریں، بند اور نئے ادارے، اسکول
کالج اور ہسپتال، اس نئے منصوبہ کے تحت بڑی تعداد میں تعمیر کئے جائیں گے۔ ان تعمیری
منصوبوں کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک سیمنٹ پر ہے۔ زیل پاک سیمنٹ فیکٹری
آج ملک کی ترقی کیلئے بڑی مقدار میں سیمنٹ تیار کر رہی ہے۔
ZEALPAK
زیل پاک پاکستان کی مایۂ ناز صنعت
زیل پاک سیمنٹ فیکٹری لمیٹڈ۔ حیدرآباد
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

صحت طاقت توانائی
ایک مرکز پر
آپ کے کنبے کی صحت کا دار و مدار اچھے کھیل و تفریح بہتر خوراک اور مناسب پرورش پر ہے۔
انہیں خوش و خرم رکھئے اور رسوئی بناسپتی سے نفاست کے ساتھ تیار کئے ہوئے
لذیذ کھانے کھلایئے۔ اس طرح آپ انکی صحت
بحال رکھیں گے اور ان کی توانائی میں
اضافہ بھی کرینگے۔ رسوئی میں وٹامن
اے اور ڈی دونوں شامل ہیں اور اسمیں
پکے ہوئے کھانے نہایت طاقت بخش
اور مزیدار ہوتے ہیں۔
رسوئی بناسپتی
استعمال کرنیوالے کنبے صحت اور مسرت
کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔
Rassoi
BANASPATI
تیار کردہ:-
مقبول کمپنی لمیٹڈ (مشہور "ایگل وناسپتی" کے بنانے والے) منٹگمری روڈ - کراچی
واحد تقسیم کنندگان:-
آدم لمیٹڈ جوڑیا بازار - کراچی
NATIONAL

شاندار نئی کتابیں

جمال زندگی (مصور ایڈیشن)
مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی فرماتے ہیں:
خواجہ بدرالاسلام فروغی ایک تعمیری ذہنیت رکھنے والے صاحب دل ہیں اور ملی و اسلامی مفکر۔ یہ انتہائی دلچسپ کتاب انہی کے عمر بھر کے مشاہدات و محسوسات کا عکس جمیل اور علم و حکمت اور خلوص و محبت کا شگفتہ اور مہکتا شاہکار ہے۔ ایک ایسی مشعل جس سے ذہن و دماغ کے تمام گوشے روشن و منور ہو جاتے ہیں اور زندگی کامیابی و مسرت سے بھر جاتی ہے اچھوتے اور نادر عنوانات پر یہ خیال افروز کتاب شروع کرتے ہی آپ جھومنے لگیں گے۔ قیمت چار روپے۔

نشان محفل
الطاف فاطمہ ایم۔اے کی تحریر میں بلا کی دل کشی اور غضب کا تیکھا پن ہے ان کا یہ حسین و جمیل اور پیچیدہ دلچسپ ناول دنیائے ادب میں ہلچل ڈال دے گا۔ خواتین کے تمام ناولوں کا سرتاج اور سال رواں کا بہترین ضخیم ناول۔ قیمت دس روپے۔

بچوں کی نفسیاتی تربیت (با تصویر)
سید ابوالحسن نغمی نے وسیع مطالعہ اور گہرے ذاتی تجربے کی بنا پر کئی سال کی محنت سے یہ پیچیدہ مفید کتاب لکھی ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

ہجر و وصال مولانا ابوالکلام آزاد کے عظیم الشان مقالات کا نادر مجموعہ قیمت چار روپے

نغمہ : ایم۔اسلم کا انتہائی دلچسپ نیا ناول جو ان کے تمام ناولوں کا سرتاج ہے قیمت ۹ روپے

ایم۔اسلم کے دیگر حسین و جمیل ناول / فنی کتب

ایم۔اسلم کے دیگر حسین و جمیل ناول	قیمت		قیمت	فنی کتب	قیمت
تیز نگاہ	۴/۸	ساون	۵/-	طبیب مرغی خانہ	۴/-
صبا	۴/۸	در توبہ	۳/۸	تجارتی مرغی خانہ	۳/-
حنا	۷/-	چراغ محفل	۶/-	کامیاب مرغی خانہ	۳/-
ممتاز	۱۰/-	فاتح مکہ	۴/-	مطلع فیل مرغ	۳/-
دیوانہ	۶/-	معرکۂ بدر	۶/-	طبیب مویشی	۴/-
دوشیزۂ پاکستان	۶/-	خونی سفر	۵/-	گلۂ بھینس یا ڈیری فارمنگ	..
سوز عشق	۴/-	غزالۂ صحرا	۷/۸	رموز باغبانی	۴/-
آخری رات	۴/۸	خون شہیداں	۴/۸	غذائی اجناس	۲/-
خفی مزدور	۴/-	تیغ ابدالی	۵/۸	قیمتی فصلیں	۲/-
میری کہانی	۴/-	فاتح قسطنطنیہ	۵/-	روغنی بیج اور دالیں	۲/-
خواب جوانی	۴/-	فتنۂ تاتار	۵/-		
سیدھی لکیر	۶/۸	پاسبان حرم	۴/-		

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

دارالبلاغ۔ لاہور ۵

پاکستان آرٹس کونسل

کراچی
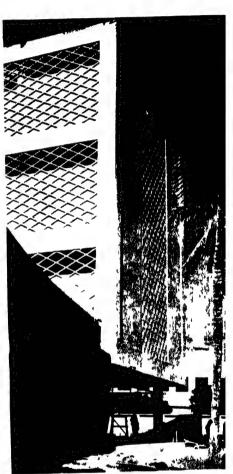
(پاکستان میں فنی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز)

سامنے کا رخ

زیریں منزل میں ایک کشادہ ایوان

بالائی منزل پر ایوان نمائش (بیرونی منظر)

ادارہ
مطبوعات پاکستان
کی
تازہ پیشکش

ضخامت ۱۲۰ صفحات
قیمت ۱ روپیہ ۸ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان ،
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳
کراچی

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس بیکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

ماہِ نو

جنوری ۱۹۶۰ء
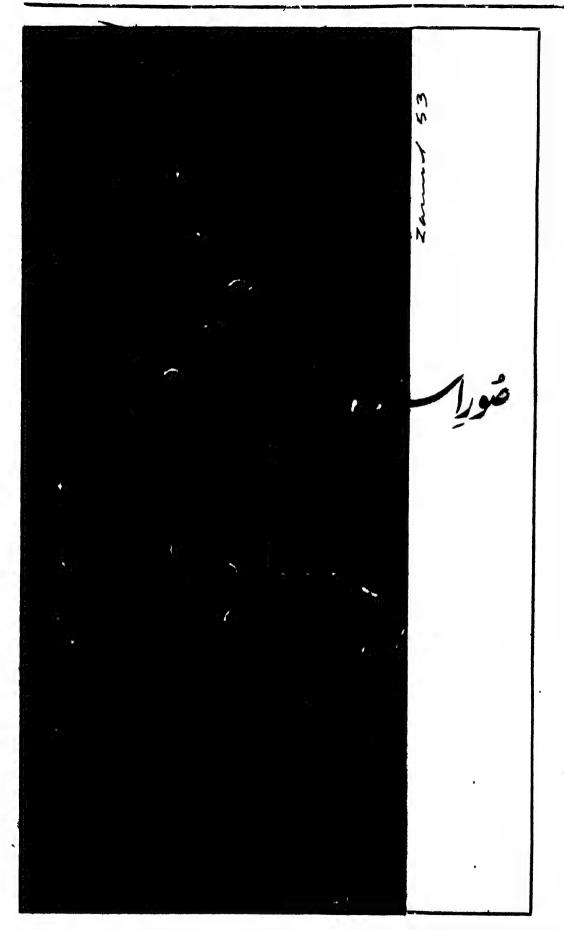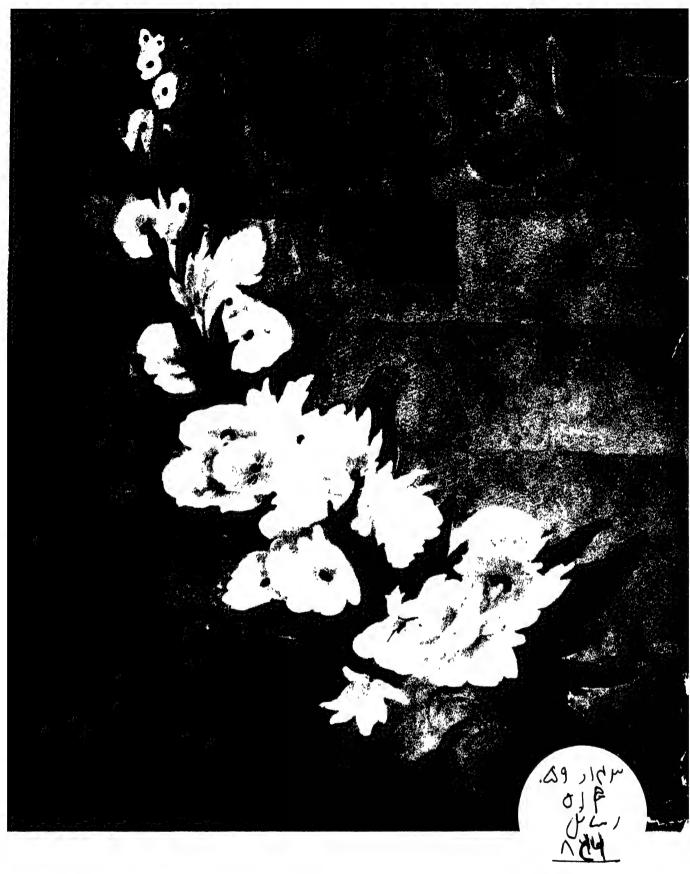
قیمت ۸ ـر

پاکستانی رقص

(صدر آئزن ھاور اور امریکی مہمانوں کے اعزاز میں رقص کے چند مظاہرے)

۱ :

۲ :

۳ :

۵ :

۶ :

ک (سرحد کا ولولہ انگیز رقص)

ں دوری

ک سمع رہ گئی تھی....''

ں

ھو جمالو''

ر

سب ایک دوسرے
سے پوچھتے ہیں!
"کہئے مزاج کیسا ہے؟"
یہی وہ الفاظ ہیں جو ملاقات کے وقت سب سے پہلے زبان پر آتے ہیں۔ مگر کیا سچ مچ اس کا جواب ہمیشہ درست اور حسبِ دلخواہ ہوتا ہے؟ صحت کی طرف تھوڑی سی توجہ ہماری بہت سی عام شکایات کا خاتمہ کر سکتی ہے۔
ماء اللحم کا استعمال خصوصاً اس موسم میں ہماری صحت اور توانائی کی ضمانت ہے۔ جدید طبی تحقیق کی مدد سے اس کے خواص اور خوبی کو کمال تک پہنچا دیا گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک بن گیا ہے جو صحت اور شباب کو قائم رکھتا ہے۔
ماءُ اللحَم دو آتشہ
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

فارہنس، خاندان کے لئے ٹوتھ پیسٹ !
مضبوط اور صحتمند
مسوڑوں کے معنی ہیں
چمکدار اور سفید دانت !
فارہنس استعمال کیجئے۔
آپکا دنداں ساز آپکو بتائیگا کہ مسوڑوں کی حفاظت ہی دانتوں کی صحیح حفاظت ہے، مضبوط مسوڑے صحتمند دانتوں کی بنیاد ہیں۔ ہر روز فارہنس سے برش کے ذریعہ اپنے دانتوں کو صاف کرتے وقت مسوڑوں پر بھی برش ملنے کی عادت ڈالئے۔ فارہنس آپکی سانس میں خوشبو اور مسکراہٹ میں دلکشی پیدا کر دے گا۔
بڑے سائز کا ٹیوب۔ قیمت ۲ روپے ۲ر آنے۔ چھوٹے سائز کا ٹیوب۔ ایک روپیہ ۶ر آنے ۶ پائی۔
اِس سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے۔
تیارکنندگان
ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
ویسٹ وھارف۔ کراچی۔
DS 1002
J W T

ماہِ نو

جلد ۱۳ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

مقالہ:	ڈرامے کی فنی اور ادبی قدریں	سید وقار عظیم	۶
بہ یادِ رفتگاں:	"سرودِ رفتہ" مولانا محمد علی کی ایک قدیم تحریر	اکبر علی خاں	۱۳
	اک فرد، اک دور (مولانا سالک مرحوم) (نظم)	جگن ناتھ آزاد	۲۰
	اک شمع رہ گئی تھی ... (اسد ملتانی مرحوم)	جمیل نقوی	۱۷
افسانہ، ڈراما، فکاہیہ:	وہ لوگ (ڈراما)	ہاجرہ مسرور	۲۱
	کہی اَن کہی (افسانہ)	دیوندر ستیارتھی	۳۳
	کیا زمانہ آلگا ہے! (مصور فیچر) (فکاہیہ)	تسلیم عارفی	۵۰
نظمیں:	"اے سوار اشہب دوراں بیا!"	مولانا محمد سعید عثمانی مرحوم	۳۷
	بتانِ وہم و گماں	یوسف ظفر	۳۸
	جنتِ تعبیر (کورنگی کے کنارے)	اثر علیلی	۴۵
غزلیں:		سراج الدین ظفر	۳۹
		اختر احسن	۴۰
ثقافت:	مشرقی پاکستان میں خطاطی	اے۔ کے۔ ایم عبدالعلیم	۵۷
فن:	ہمارے عوامی رقص	شفیق بریلوی	۴۱
تعارف:	پولان کی وادیوں میں	رفیق خاور	۴۷
	فتح باغ کے ویرانوں میں	عارف حجازی	۴۴
اقوامِ متحدہ:	مہاجرین کا عالمی سال	فضل حق قریشی دہلوی	۵۱
سرورق:	نقش چغتائی		

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

ڈرامے کی فنی اور ادبی قدریں

وقار عظیم

ادب میں جو چیزیں مختلف زمانوں میں بحث و تمحیص اور اس لئے ادبی اور فنی اختلاف کا موضوع رہی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ڈرامے کو ادب کہا جائے یا فن۔ جن لوگوں نے ڈرامے کو ادب کی ایک صنف تسلیم بھی کیا ہے، ان کا انداز عموماً ایک طرح کی معذرت کا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ادبی اوصاف ڈرامے کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ اس کے حسن میں البتہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف سوچنے والوں کا ایک گروہ تو ایسا بھی ہے کہ وہ ڈرامے کے لئے کسی طرح کے ادبی سہارے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور اس لئے اسے ادب کہنے کے بجائے فن کہتا ہے۔

اس بدیہی طور پر دلچسپ اور ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے اہم مسئلے کی صحیح حیثیت کے متعلق کسی ایسے نتیجے تک پہنچنے کے لئے جسے معقول بھی کہا جا سکے اور قابلِ قبول بھی، تجزیے کے مراحل کاطے کرنا ضروری ہے اور تجزیے کی منطق کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے یہ سوچے کہ ڈراما جس خاص شکل و صورت میں اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے وہ اسے کس طرح ملی، اس کا آغاز کیوں اور کیسے ہوا؟ اور آغاز کی ابتدائی منزل میں وہ کون کون سی باتیں تھیں جنھیں اس کی امتیازی خصوصیات سمجھا گیا۔

جدید تحقیق نے انسان کی تہذیبی زندگی کے آغاز اور اس کے گوناگوں مظاہر کے متعلق جو نتائج ہمارے سامنے پیش کئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ انسان نے اپنے تجربات کے اظہار و ابلاغ کے جو وسائل و ذرائع اختیار کئے ہیں ان میں سب سے پہلی شکل ڈرامے کی ہے۔ ابتدائی انسان نے اپنے ان تجربات کی کہانی کو جو روپ دیا اور اپنے ہمسروں کے سامنے اپنی زندگی کے جو کارنامے بیان کئے ان میں اشاروں اور حرکات و سکنات سے لفظوں کو موثر اور دل نشیں بنانے کا کام لیا گیا اور اس طرح گویا عہدِ عتیق کی ہر کہانی ایک ڈراما ہے۔

انسان کہانی کے ذریعے اپنے تجربات کا اظہار کرتا ہے تو اظہار کے اس عمل کے پیچھے اس کی یہ خواہش اور یہ آرزو کام کرتی دکھائی دیتی ہے کہ وہ اپنے باطن کو ظاہر کی شکل دے اور اپنے چھپے ہوئے آپ کو ظاہر کی نظر کے سامنے لائے۔ اپنے باطن کو ظاہری روپ دینے کی یہ خواہش جس طرح بچوں میں ہوتی ہے اور طرح طرح کی حرکات اور مختلف قسم کے اعمال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اسی طرح ابتدائی انسان کے دل کو بھی بے چین رکھتی تھی یہی بے چینی اظہار و ابلاغ کا وسیلہ تلاش کر کے بیان کا پیکر اختیار کرتی اور کہانی بنتی ہے۔ لیکن اس کہانی میں لفظ اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنے اشارے اور حرکات۔ کہانی کی یہی ابتدائی صورت حقیقت میں ڈراما ہے اور آج بھی غیر مہذب اور غیر متمدن قبیلوں میں اسی صورت میں موجود ہے۔ آج بھی ان کے ناچ گانے اور کھیل تماشے، جو ان کے تجربات اور مشاہدات اور اندرونی کیفیات کی ظاہری صورتیں ہیں، تاثیر اور دل نشینی کے لئے لفظوں کے زیادہ محتاج نہیں۔ تاثیر اور دل نشینی کی صفات ان میں حرکات اور اشارات سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی لئے ڈرامے کے آغاز و ابتدا کے متعلق کسی کا یہ فقرہ مزے دار بھی ہے اور معنی خیز بھی کہ ڈرامے کی زندگی کا نقطۂ آغاز کہانی کہنے والا نہیں بلکہ اداکار ہے۔ یوں گویا، ڈرامے میں حرکت اور عمل کی بنیادی حیثیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی خیال کو ایک مغربی مبصر نے یہ کہہ کر ادا کیا ہے کہ "ڈرامے کا فن ڈراما نگار کا نہیں بلکہ اداکار اور ہدایت کار کا فن ہے"۔

ڈرامے کے آغاز اور اس کی ابتدائی شکل صورت کے متعلق یہ چند بیانات جن باتوں کی طرف اشارے کرتے ہیں انہیں اگر مرتب کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شخصی تجربے کے اظہار کے وسیلے کی حیثیت سے کہانی جب سب سے پہلے دوسروں کے سامنے آئی تو اس کا انداز وہی تھا جس نے آگے چل کر ڈرامے کی

شکل اختیار لی۔ یعنی ایک شخص نے اپنے تجربات دوسروں کے سامنے پیش کئے اور انہیں پیش کرنے کے لئے کچھ تو الفاظ سے اور اس سے زیادہ اشارات و حرکات سے مدد لی اور یوں کہانی سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ بیان کی ہوئی اس کہانی کا جو نقشہ ہماری نظر کے سامنے آتا ہے اس میں بعض چیزوں کا وجود ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کہانی ایک شخص بیان کر رہا ہے جو اپنی کہانی میں دلچسپی اور اثر پیدا کرنے کے لئے الفاظ، حرکات اور اشارات استعمال کرتا ہے۔ یہ کہانی سننے والوں کے ایک گروہ کے سامنے بیان کی جاتی ہے، جو ایک خاص وقت میں کسی ایسی جگہ جمع ہیں جو بعض اسباب کی بنا پر کہانی سننے اور سنانے کے لئے ایک موزوں جگہ ہے۔ یہ خاص جگہ جہاں کہانی سنائی جا رہی ہے اور کہانی سننے والے ایک خاص انداز سے بیٹھے ہیں وہی جگہ ہے جسے آگے چل کر ڈرامے اور تھیٹر کے فن میں اسٹیج کا نام ملا اور جس کی نوعیت مختلف زمانوں میں حالات اور مذاق کے مطابق بدلتی رہی۔ کہانی سننے والا جو کہانی سناتے وقت حرکات و اشارات کا استعمال ضروری سمجھتا ہے، اس اسٹیج کا ایکٹر ہے اور جن سننے والوں کو یہ کہانی سنائی اور ساتھ ساتھ دکھائی جا رہی ہے، وہ تماشائی ہیں جن کے وجود کے بغیر کسی ڈرامے کے وجود کا تصور ممکن نہیں۔ یہی اسٹیج، یہی اداکار اور یہی تماشائی ہیں جو آگے چل کر ڈرامے کے فن کے بنیادی عناصر بنے اور یہی عناصر ہیں جن کے الگ الگ اثرات نے مل جل کر وہ چیزیں پیدا کیں جنہیں ہم ڈرامے کے فن، اور یقیناً عظیم فن، کی روایات کہتے ہیں۔

ان روایات میں سے بعض کا تعلق اسٹیج سے ہے، بعض کا ایکٹر سے اور بعض کا تماشائیوں سے۔ لیکن ڈراما نگار کو ڈراما لکھتے وقت چونکہ زیادہ خیال اس بات کا رکھنا پڑتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھے گا اسے اسٹیج پر پیش کیا جائے گا اور تماشائیوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اس لئے ایک طرف تو اس کا فنی مقصود یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تماشائیوں کے سامنے آئے وہ ان کے لئے دلچسپ ہو اور انہیں اپنی طرف متوجہ رکھ سکے اور دوسری طرف یہ کہ سب کچھ ان حدود کے اندر رہ کر اور ان پابندیوں کا لحاظ رکھ کر کیا جائے جو اسٹیج نے اس پر عائد کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامے کی روایات کی تشکیل میں ان دو چیزوں نے زیادہ نمایاں حصہ لیا ہے اور اس کے اصول و ضوابط کی تعیین طور پر بدرجہ اتم اثر انداز ہوتی ہیں۔ البتہ ان اثرات میں سے بعض اہم ہیں اور بعض غیر اہم اور اس لئے ان اثرات کے تحت وجود میں آنے والی روایات کی نوعیت بھی اہم اور غیر اہم، فروعی اور اصلی، ضمنی اور بنیادی ہے۔

مثال کے طور پر اگر ہم ان روایات پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ڈرامے کی بے شمار ایسی روایات ہمارے سامنے آئیں گی جنہیں ڈرامے کی نشو و نما کے مختلف دوروں میں اہم تر سمجھا گیا ہے لیکن انہیں بنیادی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی حیثیت البتہ ایک طرح کے سمجھوتے یا مفاہمت کی ہے جو فنکار اور اس کے مخاطب یا ڈراما نگار اور تماشائی کے درمیان قائم اور استوار ہوتی ہے اور اسی مفاہمت کی بنا پر ڈراما نگار کی پیشکش تماشائی کے لئے دلچسپ اور پرکشش بھی بنتی ہے اور ذہنی لطف و انبساط کا سرمایہ بھی مہیا کرتی ہے۔ ڈرامے کی یہ روایتیں حقیقت اور صداقت کے نقطۂ نظر سے تو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوتیں لیکن اسٹیج، تماشائی اور ڈراما نگار کے باہمی رشتے کے پیدا کئے ہوئے حدود انہیں جواز کی سند دے دیتے ہیں اور اس لئے انہیں وہی مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو حقائق کو۔ ڈرامے کے کردار نثر کے بجائے نظم، یا سیدھی سادی روزمرہ کے بجائے مقفیٰ اور مسجع اور رنگین باتیں کرتے ہیں، بستر مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لیتا ہوا انسان بھیرویں کی تانیں لگاتا ہے، عرب، ایرانی، افغانی، چینی، جاپانی اور ہندوستانی سب آپس میں ایک ہی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، کردار جو کچھ اپنے دل میں سوچ رہا ہے یا کسی دوسرے کردار کی سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا ہے اسے اجازت ہے کہ ایسی آواز میں کہے کہ تماشائی اس کی بات سن سکیں۔ کردار جنگل کی تنہائیوں میں گانا گائے تو اسے سازوں کی پوری سنگت ہے، وہ رات کی بھیانک تاریکی میں کسی عمل میں مصروف ہو تو اس پر اتنی روشنی ڈالی جائے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی تماشائیوں کی نظر سے پوشیدہ نہ رہے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں ہم عام حالات میں ہرگز قابلِ قبول نہیں سمجھتے لیکن اسٹیج کے تقاضے اور تماشائی کی طلب نے انہیں اس حد تک جائز بنا دیا ہے کہ ان پر کسی طرح کا اعتراض وارد کرنے کے بجائے ہم انہیں ڈرامے کی تاثیر کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

اسٹیج کی مجبوریاں اور ان مجبوریوں کے پیدا کئے ہوئے تقاضے ہیں جنہوں نے ڈرامے کے فن میں اس چیز کی تخلیق کی ہے جسے ہم ڈرامے کی وحدتیں کہتے ہیں۔ ڈراما نگار کو اسٹیج کی حد بندیوں اور پابندیوں

کی وجہ سے ڈرامے کے عمل کو وقت اور مقام کے لحاظ سے اُس حد کے اندر رکھنا پڑتا ہے جو آسانی سے اسٹیج پر بھی پیش کی جا سکے اور جس سے تماشائی کی توجہ بھی ایک ہی نقطہ پر مرکوز رہے۔ اس کی اس فنی کوشش کو وحدتِ زماں، وحدتِ مکاں کے فنی نام دئے گئے ہیں اور ان کی اہمیت پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ جب تک ڈراما نگار تماشائی کے سامنے وقت اور مقام کا کوئی واضح تصور نہ پیش کر سکے اور جب تک وہ ڈراما دیکھتے وقت یہ نہ محسوس کر سکے کہ اسٹیج پر کردار جس عمل میں مصروف ہیں اور جس پر حقیقت میں ڈرامے کی دلچسپی کی ساری بنیاد قائم ہے، وہ کس مقام اور کس وقت پر پیش آیا ہے، وہ اس عمل میں کوئی براہِ راست دلچسپی نہیں لے سکتے۔ ان کا اپنے آپ کو اس عمل کا ایک حصہ سمجھنا (خواہ ناظر ہی کی حیثیت سے سہی) صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ ان کی نظر کے سامنے وقت اور مقام کی ایسی تصویر موجود ہو کہ انہیں ڈرامے کے کرداروں کا عمل حقیقی معلوم ہو۔ یوں گویا ان دو وحدتوں کے فنی تصور پر اس تیسری وحدت کے موثر وجود کا انحصار ہے جسے ڈرامے کے فن کی اساس کہا گیا ہے۔ اس وحدت کا نام وحدتِ عمل ہے۔ عمل اور حرکت کے وجود کے بغیر فنی حیثیت سے کسی ڈرامے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ڈراما نگار کے فنی منصب اور فنی چابک دستی کا امتحان اسی میں ہے کہ وہ کس طرح ڈرامے کو عمل کے راستے پر ڈالتا اور اسے مختلف مدارج و مراحل سے گزارتا ہے۔

ڈراما نگار کے فنی عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ڈراما نگار کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ عمل کا آغاز کس طرح کرے کہ اس کے سفر کی اگلی منزلیں بغیر کسی رکاوٹ کے طے ہوتی چلی جائیں اور ایک مرحلہ دوسرے مرحلے کی طرف رہنمائی کرتے کرتے بالآخر عمل کو منطقی انجام تک پہنچا دے۔ عمل کی ابتدا ہو جائے اور واقعات ایک معین رُخ اختیار کر لیں تو ڈراما نگار کا کام یہ ہے کہ وہ عمل کے مختلف مرحلوں اور منزلوں میں تماشائی کی توجہ اس عمل کی طرف سے نہ ہٹنے دے۔ یوں گویا ڈرامے کے عمل اور تماشائی کی دلچسپی اور توجہ میں ایک لازمی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ڈرامے کا عمل واقعات کی شکل میں آگے بڑھتا رہتا ہے، اور عمل کو وہ کردار جن کی زندگی ڈرامے کے واقعات کا موضوع ہے اپنی گفتار و رفتار سے آگے بڑھاتے رہتے ہیں اور جوں جوں عمل کبھی دھیمی اور ہموار اور کبھی تیز اور ڈرامائی رفتار سے آگے بڑھتا اور ابھرتا رہتا ہے تماشائی کی دلچسپی اور توجہ ایک مرکزی حیثیت حاصل کرتی رہتی ہے۔ عمل کی حرکت کی اسی رفتار کے انداز سے تماشائی کے جذبات میں مد و جزر کی بدلتی ہوئی کیفیتیں نمایاں ہوتی رہتی ہیں اس کے دل کی دھڑکن کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہوتی رہتی ہے۔ گویا تماشائی کے دل کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے جس فنی عمل کا آغاز ڈراما نگار نے ڈرامے کے ابتدائی حصوں میں کیا تھا اس کی کامیابی اسی بات پر منحصر ہے کہ ڈرامے کا عمل ایک موزوں اور مناسب رفتار سے حرکت کرتا اور آگے بڑھتا رہے اور کسی ایک جگہ بھی اتنی دیر تک رک کر نہ رہ جائے کہ تماشائی کو اپنے خیال اور جذبے میں رکاوٹ اور ٹھیراؤ محسوس ہونے لگے۔ اس لئے ڈرامے میں خیال اور جذبے کا یہ ہلکا سا ٹھیراؤ یا معمولی سی رکاوٹ بھی اس کے لئے گھٹن بن جاتی ہے۔ تماشائی کو گھٹن کے اس احساس سے محفوظ رکھنا ڈراما نگار کا فنی منصب ہے اور یہ بات ڈرامائی عمل کے متحرک رہنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ڈرامے کے عمل کے متحرک رہنے اور اس کے برابر آگے بڑھتے رہنے پر فنی اعتبار سے جو زور دیا جاتا ہے وہ ڈرامے میں اس چیز سے پیدا ہوتا ہے جسے فن کی اصطلاح میں تصادم یا کشمکش CONFLICT کہا گیا ہے جس چیز کو ہم ڈرامائی عمل کہتے ہیں وہ کسی کردار کی عملی حالت میں ظاہر یا نمودار ہونے کا دوسرا نام ہے۔ کردار کی اس عملی حالت میں تماشائی کے لئے اس وقت تک کوئی دلچسپی ممکن نہیں جب تک اسے کسی الجھن، اور کشمکش میں مبتلا نہ دکھایا جائے یہی الجھن اور کشمکش ہے جو حقیقت میں عمل کو آگے بھی بڑھاتی ہے اور اس میں اتار چڑھاؤ کی وہ کیفیتیں بھی پیدا کرتی ہے جن سے تماشائی کی توجہ ایک نقطے پر مرکوز رہتی یا اس نقطے کے محور پر گردش کرتی ہے یہ الجھن یا کشمکش ڈرامے میں مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے۔ کبھی اسکی شکل دو افراد کے درمیان ایک تصادم کی ہوتی ہے، کبھی یہ کشمکش حالات اور تصورات کے اختلاف اور تصادم سے پیدا ہوتی ہے، کبھی خود انسان کے اپنے جذبے کی متفرق اور متضاد کیفیتوں سے۔ اسی کشمکش اور تصادم سے پلاٹ بنتا اور اس کے مختلف مدارج قائم ہوتے ہیں۔ ابتدا کے بعد اضطراب (بحران) نقطۂ عروج اور انجام اسی تصادم کی مختلف منزلیں ہیں۔ ڈراما نگار ان مختلف مرحلوں اور منزلوں کو وحدت کے ایک رشتے میں جوڑتا اور اس طرح تماشائی کی توجہ کے سفر کے لئے

ایک راستہ معین کرتا ہے تاکہ وہ اِدھر اُدھر نہ بھٹکے، ڈرامے کے شروع میں اس نے تماشائی کے جذبۂ تحیر کو روشن کیا اور آہستہ آہستہ اس کی لَو کو ابھارا تھا اسے برابر زندہ رکھنا اور بالآخر اس کی تسکین کا سامان مہیا کرنا اس کے فن کی کامیابی ہے اور یہ کامیابی حقیقت میں اس بات پر منحصر ہے کہ اس نے ڈرامے کے اس عمل کو کس طرح اور کس حد تک اپنے فکر، تخیل اور جذبے کی آنچ سے پختہ کیا ہے جس پر ڈرامے کی اساس قائم ہے اور جسے فنی حیثیت دینے میں ڈرامانگار اور تماشائی بہ یک وقت برابر کے شریک ہیں۔ اس ڈرامائی عمل میں اگر کشمکش کا رنگ موجود ہے اور ڈرامانگار نے اس کشمکش کو پوری طرح کرداروں کی زندگی سے مربوط کیا ہے تو اس کی حرکت اور رفتار میں بھی تسلسل اور موزونی ہوگی، اور تماشائیوں کی توجہ کا مرکز بھی قائم رہے گا اور وہ ڈرامے کو شروع سے آخر تک دلچسپی کے ساتھ دیکھیں گے۔ اس چیز کا نام ڈرامے کے فن میں اشتیاق، تذبذب یا SUSPENSE ہے۔ ڈرامانگار ایک طرف تو یہ کرتا ہے کہ تماشائی کی نظر و توجہ اس عمل کی طرف رہے جو اس وقت اسٹیج پر پیش آ رہا ہے اور دوسری طرف اس سے بھی زیادہ یہ کہ اُن کا ذہن برابر آنے والے واقعات اور ہونے والے عمل کا منتظر رہے جو کچھ اس وقت اسٹیج پر ہو رہا ہے وہ اس کے لئے کشش انگیز ہے لیکن اس سے بھی زیادہ کشش اس خیال اور احساس میں ہے کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہو! یہی خیال، یہی احساس اور یہی اشتیاق ہے۔ جس سے تماشائی کے لئے ڈراما ایک نشاط آور تجربہ بنتا ہے۔

ڈرامائی تجربے کو تماشائی کے لئے مسلسل دلچسپی، کشش اور انبساط کی ایک چیز بنانے کے لئے، ڈرامے کے فن میں تنوع اور تضاد کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور ڈرامانگار کبھی واقعات کی رفتار میں، کبھی کرداروں کے مکالمے کے لہجے میں، کبھی عمل کی کیفیت میں اور کبھی بیان کے اسلوب میں شدت و خفت اور کبھی واقعات کی نوعیت کرداروں کے عمل اور خود اظہار کے لہجے اور اسلوب میں تضاد کی کیفیتیں نمایاں کر کے تماشائی کے جذباتی ہیجان میں توازن اور نرمی پیدا کرتا ہے اور اسی لئے ڈرامائی عمل کی پیش کش اور ڈرامائی صورتِ حال کی تعمیر و تشکیل میں ان دونوں وسائلِ فن کو بھی کم و بیش وہی دخل حاصل ہوتا ہے جو اشتیاق یا SUSPENSE کو اور یوں ڈرامے

کو ایک ایسی صنف ادب سمجھا جاتا ہے جس کے ادبی مرتبے کا تعین کرتے وقت ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی پڑتی ہے کہ ڈراما ڈراما نگار کا نہیں بلکہ اسٹیج اور تھیئٹر کا فن ہے اور ہم اسے ناول، افسانے، رزمیہ نظم اور انشا کی طرح محض ادبی قدروں سے نہیں جانچ سکتے۔ چونکہ ڈرامانگار ڈرامے کی تخلیق یہ بات پیش نظر رکھ کر کرتا ہے کہ ایکٹر انہیں اسٹیج پر تماشائیوں کے دیکھنے کے لئے پیش کریں گے اس لئے ان کی اچھائی برائی کی کسوٹی یہ خیال ہے کہ وہ اسٹیج پر کامیاب رہا یا نہیں۔ ڈرامے اور اسٹیج کو لازم و ملزوم قرار دینے کی یہ روایت دنیا کے ڈرامے کی پوری تاریخ کا بنیادی عنصر ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کے بعض بڑے بڑے ڈرامانگاروں نے جن میں مولیئر اور شیکسپیر بھی شامل ہیں، کبھی اس خیال کو اہمیت نہیں دی کہ ان کے ڈرامے چھاپے بھی جائیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی عام مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ بعض ایسے ڈرامے جو اسٹیج پر حد درجہ کامیاب سمجھے گئے تھے جب چھپ کر پڑھنے والوں کے سامنے آئے تو ان کی ساری تاثیر اور کشش ختم ہو گئی۔

ان سب باتوں سے جو بدیہی نتیجہ نکلتا ہے اور جس کی تائید ڈرامے کی پوری تاریخ کو دیکھ کر ہوتی ہے یہ ہے کہ ڈرامے کی تخلیق میں اصل بنیاد اس کے فن کو بنایا گیا ہے اور اس کے ادبی پہلو کو محض ضمنی حیثیت دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عموماً دنیا کے دو عظیم ڈرامانگاروں کے بیانات پیش کئے جاتے ہیں اور ان کے بیان کو اس خیال کی تائید میں استعمال کیا جاتا ہے کہ ڈرامے میں ادبی اقدار کی باری فنی اقدار کے بعد آتی ہے SCRIBE کہا کرتا تھا کہ "میرے ڈرامے کا موضوع اچھا ہو اور میں اس کا ایک واضح اور مکمل خاکہ بنالوں تو اسے لکھنے کا کام اپنے ملازم کے سپرد بھی کر سکتا ہوں۔ ڈرامے کی مجموعی فضا اس کے لکھنے کا کام کروانے کی اور ڈراما اسٹیج پر کامیاب رہے گا" یونانی ڈرامانگار مینانڈر سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آپ کا نیا ڈراما، اب کس منزل میں ہے تو اس نے جواب دیا۔ "ڈرامے کی موسیقی مرتب ہو چکی ہے اور وہ بالکل تیار ہے۔ اب صرف اسے نظم کرنا باقی ہے" ان دونوں بیانات میں سے پہلے پر یقیناً مبالغے کا گہرا رنگ ہے لیکن مجموعی حیثیت سے دونوں میں واضح طور پر یہ اشارہ موجود ہے کہ ڈراما لکھنے میں اصل چیز اس کی فنی تشکیل و ترتیب ہے۔ ادبی تہذیب اس کے مقابلے میں

محض ایک ثانوی اور فروعی چیز ہے اور حقیقت میں ڈرامے کی کامیابی کا انحصار اس دوسری چیز پر نہیں بلکہ پہلی پر ہے۔ ڈرامے کو ایک فن سمجھنے والوں کے اس دعوے نے (جس کی بنیاد یقیناً ڈراما نگاروں کا عمل ہے) کہ ڈرامے کی کامیابی میں بیان کے حسن کو کوئی دخل نہیں ڈرامے کی ادبی اہمیت پر حد درجہ اثر انداز ہوئی ہے اور ڈرامے کی قدر و اہمیت کا تعین کرنے وقت اس کی فنی اور ادبی حیثیتوں میں امتیاز کیا جانے لگا ہے اور اس امتیاز میں فن کو ادب پر تفوق دینے کا رجحان عام ہو گیا ہے۔ اور یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ایک اچھے ڈرامے کی تخلیق لفظوں کے اس سرمائے کی طرف سے بے اعتنائی برت کر بھی ہو سکتی ہے جو ادب میں اظہار کا واحد وسیلہ بھی ہیں اور حسنِ اظہار کا موثر ذریعہ بھی۔ اس میں شک نہیں کہ ڈراما نگار بھی اپنے خیال کے اظہار کے لئے الفاظ ہی کا محتاج اور دست نگر ہے لیکن ناول نگار اور افسانہ نگار کی طرح وہ لفظوں کے نازک اور لطیف صرف اور استعمال کا پابند نہیں۔ اس کے استعمال کئے ہوئے لفظوں کی نزاکت اور لطافت اسی وقت مکمل نہیں ہو جاتی جب وہ اس کے قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر وارد ہوتے ہیں۔ یہ ادھورا کام اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اسٹیج پر اداکار اسے اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور اس لئے لفظوں کی اپنی حیثیت کے علاوہ انہیں زبان سے ادا کرنے والے اداکار کی شخصیت، آواز، لہجہ، حرکات و سکنات، اشارے بھی ان کے لطیف اور نازک تصور کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔

ڈرامے کی تاریخ کے ہر دور میں اس رجحان کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے اور ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ بے شک ڈرامے کا مکمل وجود تھیٹر اور اسٹیج کے بغیر ممکن نہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ تھیٹر کا مکمل وجود بھی ڈرامے کے بغیر ممکن نہیں، اور دوسری طرف اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس کے باوجود کہ ڈراما نگاروں نے ڈرامے اسٹیج کے لئے لکھے عظیم ڈراما نگاروں کا عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے ڈرامے کو ایک عظیم فن سمجھتے ہوئے بھی یہ بات کبھی فراموش نہیں کی کہ وہ ادب بھی ہے اور یہی ادب ہے جس کی بدولت ڈرامے کو حیاتِ جاوداں ملتی ہے۔

ڈرامے پر فنی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو اس بدیہی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ چونکہ ڈراما نگار، ڈراما فوری تاثر پیدا کرنے کی غرض سے لکھتا ہے اس لئے اس کی نظر فن کے آن وسائل پر ہوتی ہے جو اسے اس مقصد کے حصول میں مدد دیں اور جن کی مدد سے وہ طلسم و فریب کی ایک عارضی دنیا کی تشکیل کر سکے۔ ڈرامے کی پوری دنیا عارضی طلسم کی یہی دنیا ہے اور اس دنیا کی قدروں پر تصنع اور تکلف کا سایہ ہے۔ تصنع اور تکلف کی انہیں قدروں کا نام ڈرامے کا فن ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ایک سچا اور حقیقی فن کار فریب و طلسم کی اس دنیا میں خوش نہیں رہ سکتا اور اپنے تصور تخیل اور فکر کو اس کی محدود قدروں کی زنجیروں کا پابند نہیں رکھ سکتا۔ حقائق کی کشادہ و فراخ سرزمین کو ترک کر کے تکلفات کی اس گھٹن پیدا کرنے والی دنیا کا مکین بننا اس کے فن کارانہ مزاج کے منافی ہے۔ اسی لئے اچھا ڈراما نگار، اس کے باوجود اپنے فن کی بنیاد تکلفات و طلسمات کی عارضی قدروں پر رکھتا ہے اپنے آپ کو انہیں کے اندر مقید اور محصور نہیں رکھ سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی فنی تخلیق کا جائزہ اسی محدود دنیا کے ضابطوں کے مطابق لیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی فنی تخلیق کا سرچشمہ اس دنیا سے باہر کی حقیقی دنیا اور زندگی ہے اور اس لئے اگر ہم ڈرامے کی پوری تاریخ کا مطالعہ ذرا دقت نظر سے کریں تو یہ حقیقت ہماری نظر کے سامنے آتی ہے کہ دنیا کے سب عظیم ڈراما نگاروں نے تھیٹر اور اسٹیج کے حدود میں رہ کر بھی، اور ان کی فنی قدروں کو اپنے تخلیقی فنی عمل کا رہنما بناتے وقت بھی ان قدروں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیں جو زیادہ مستقل، زیادہ پائدار اور اس لئے ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں — یہ قدریں روحانی حقائق، انسانی صداقت اور ادبی حسن کی قدریں ہیں۔ اور چیزوں سے قطعِ نظر ادبی حسن کی یہی قدریں ہیں جن کی بدولت ڈرامائی ادب کے شاہکاروں کو ہمیشگی ملی ہے۔ ادبی قدروں کی اسی اہمیت کا احساس ہے جو ڈراما نگاری کے مختلف کرداروں میں مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا ہے یا اس احساس کا اظہار سب سے زیادہ لفظوں کے فن کارانہ اور حسن آفریں استعمال کی شکل میں ہوا ہے۔ اور جن ڈراما نگاروں نے اس جمالیاتی احساس کو ڈرامے کے تخلیقی عمل کی شکل دی ہے انہوں نے گویا اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ

ڈرامے کے حسن اور تاثیر میں الفاظ کے موزوں استعمال کو کوئی دخل نہیں۔ حالانکہ اس بحث سے قطع نظر کہ ڈراما اسٹیج کے لئے خاص ہونے کی وجہ سے کوئی ادبی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں عام ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس بات سے انکار ممکن ہی نہیں کہ ڈراما فن ہونے کے ساتھ ساتھ ادب بھی ہے۔ ادب تخیلی تجربے کے اظہار اور ابلاغ کا دوسرا نام ہے جس میں لفظوں کی ایک خاص ترتیب و تنظیم سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ڈراما بھی ادب ہے کہ وہ الفاظ کی موزوں ترتیب و تنظیم کے ساتھ تخیلی تجربے کے اظہار کی ایک خاص صورت ہے۔ چونکہ الفاظ کی اس ترتیب و تنظیم میں ڈراما نگار کے فنی اور جمالیاتی ارادے، احساس اور عمل کو دخل ہے اس لئے یہ بھی ادب کی دوسری اصناف کی طرح ادب کی ایک صنف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ الفاظ کی اس ترتیب و تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ انہیں کوئی کردار یا کئی کردار اسٹیج پر ادا کریں گے اور اس طرح اپنی ادائیگی سے ایک تخیلی تجربے کو دوسرے تک پہنچائیں گے لیکن اس مقصد کی تکمیل میں الفاظ ابلاغ کا واحد وسیلہ ہیں اس لئے اُن کی حیثیت محض ثانوی یا جزوی ہونے کے بجائے بنیادی ہے۔

ڈرامے کو طلسم و فریب کی ایک دنیا کہا گیا ہے اور طلسم و فریب کی اس دنیا میں کرداروں کے حرکات و سکنات اور اس سے بھی زیادہ مکالمے سے جان پڑتی ہے، اس لئے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ طلسم و فریب کی اس دنیا کی تشکیل و تعمیر لفظوں کی ایک خاص طرح کی ترتیب و تنظیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور لفظوں کی اس ترتیب و تنظیم کا نام ادب ہے۔ یہ بات لفظوں کے اس استعمال پر بھی صادق آتی ہے جس میں مکالمے کو زندگی کی عام سطح پر رکھا جاتا ہے اور اس نظم و ترتیب پر بھی جس میں شاعر بقول شخصے انسانوں کی زبان کے بجائے "دیوتاؤں کی زبان" استعمال کرتا ہے پچھلی ایک صدی کا مغربی ڈراما اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے کہ عام بول چال کی زبان اور بیان کے حسن اور رنگینی میں کتنا قریبی اور ایک حد تک لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔

ابسن ____ IBSEN کے ڈرامے اس لحاظ سے سادگی و پرکاری اور بہ یک وقت فنی اور ادبی حسن کے شاہکار ہیں کہ اس نے سیدھی سادی روزمرہ زبان کو نازک سے نازک تخیلی تجربے اور پیچیدہ سے پیچیدہ انسانی کیفیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں ڈرامے میں زبان و بیان کی حیثیت کو مُسلّم بنایا ہے۔ یہ الفاظ اسی کے ہیں کہ "میں ڈرامے کے ذریعے انسانی زندگی کی مصوری کرنا چاہتا ہوں اس لئے ان سے دیوتاؤں کی زبان میں گفتگو نہیں کرواتا"۔ ابسن نے جس زبان کو دیوتاؤں کی پر تکلف اور پُرشکوہ زبان کہا ہے اس کے مقابلے میں انسانوں کی بے تکلف اور سادہ زبان لکھنے کا فن کہیں زیادہ دشوار ہے اور اس سے کہیں زیادہ فنی اور ادبی کاوش اور عمل کا طالب ہے۔ بحیثیت ڈراما نگار کے ابسن کی تخلیقی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان چار ادوار میں سے تیسرا دور نثری ڈراموں کا وہ دور ہے جس میں اس نے اپنے ڈرامے A DOLL'S HOUSE اور GHOST لکھے۔ ان دونوں ڈراموں کو جہاں ایک طرف ڈرامائی فن کے نقطۂ نظر سے شاہکار سمجھا گیا ہے، دوسری طرف ان کے ادبی محاسن کی بنا پر پچھلی صدی کے چند منتخب ڈراموں میں جگہ دی گئی ہے۔

ڈرامائی فن کی ادبی اہمیت کے متعلق اس دور کے عظیم ڈراما نگار برنارڈ شا کا نقطۂ نظر بھی ابسن کے نقطۂ نظر سے ملتا جلتا ہے۔ اپنے ایک بہت مشہور ڈرامے کے متعلق (جو نظم معریٰ میں لکھا گیا ہے) شا نے یہ بات لکھی ہے کہ "میں نے یہ ڈراما نظم معریٰ میں اس لئے لکھا کہ مجھے فرصت کم تھی"۔ گویا شا کے نزدیک ادنیٰ درجے کی نظم کا لکھنا اعلیٰ درجے کی نثر لکھنے کے مقابلے میں آسان ہے۔ شا نے ایک اور جگہ تھیٹر اور ڈرامے کے رشتے کے ضمن میں ڈرامے کی ادبی اہمیت کی بڑی پرزور وکالت کی ہے۔ وہ کہتا ہے تھیٹر ڈرامے کی بدولت زندہ ہے نہ کہ ڈراما تھیٹر کی بدولت وہ اسٹیج کے سہارے سے نہیں بلکہ اس قوت سے زندہ اور قائم ہے جو اس کی فطرت کا جزو لازم ہے"۔ ڈرامے میں ایک نیا انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا ہے ڈرامے کو ایک بار اس کا ادبی مقام ملنا چاہیئے۔ ڈرامے کو دوسروں کے سہارے سے نہیں بلکہ اپنے ادبی اوصاف کی قوت سے ایک نئی زندگی مل سکتی ہے B. SHAW کے بیان کی تائید انگریزی کے شاعر اور نقاد W.B. YEATS کے ایک معنی خیز جملے سے ہوتی ہے "ڈرامے کو اس کی عظمت لفظوں کی بدولت ملی۔ اور اب اسے شاہانہ مقام صرف لفظوں ہی کی بدولت

مل سکتا ہے۔"

لفظوں کی یہی عظمت اور ان کا یہی شاہانہ مقام ہے جسے پہچان کر عہد الزبتھ کے ڈراما نگاروں اور خصوصاً شیکسپیئر نے ڈرامے کو ادبی عظمت بھی دی اور اس کی ادبی حیثیت میں وہ شاہانہ شکوہ بھی پیدا کیا جس کی طرف ایلیٹ اور برنارڈ شا نے اشارتاً اور ییٹس نے واضح لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔ عہد الزبتھ کے ڈراما نگاروں نے ڈرامے کی فنی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے بھی اس کی ادبی اہمیت کو اس پر قربان نہیں کیا اور زبان و بیان کے حسن کو بھی ڈرامائی فن کے لازمی عناصر میں سے ایک جانا اور اسی ادبی احساس کا نتیجہ ہے کہ شیکسپیئر کے ابتدائی ڈراموں کے متعلق مبصروں نے یہ حکم لگایا ہے کہ انہیں محض ان کے حسن بیان کی وجہ سے حیات جاوداں ملی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کی انہیں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے برنارڈ شا نے دو باتیں لکھی ہیں جن سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ فنی اقدار سے زیادہ اپنی ادبی اقدار کی وجہ سے زندہ اور قائم ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شیکسپیئر بحیثیت ایک خوش فکر اور نغز گو شاعر، ایک ولولہ انگیز خطیب، ایک سحر طراز فسانہ گو اور دل نواز مطرب کے بے مثل اور لاثانی ہے اور اپنے ڈراموں میں اپنے ان سب اوصاف سے سحر و طلسم کی کیفیت پیدا کرتا ہے کسی ایسے ڈرامے کا خالق نہیں بن سکا جسے ڈرامے کے فن کے لحاظ سے ایک مربوط اور مرتّب وحدت کہا جا سکے یا جسے ڈرامائی فن کے علمی تقاضوں کا بہترین مظہر سمجھا جا سکے۔ دوسری بات یہ کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کے مطالعے کے بعد سوائے چند سطروں کے (جو یقیناً ادبی لحاظ سے بھی زیادہ اہم نہیں ہیں) باقی سب جسے آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور اس کے مقابلے میں عہد جدید کے زیادہ ڈرامے، جنہیں اسٹیج پر انتہائی کامیابی حاصل ہوتی، ایسے ہیں کہ انہیں اسٹیج کے باہر لا کر سمجھنا بھی مشکل ہے — اور یہ سب کچھ شا کے نزدیک اس لئے ہے کہ ان ڈراما نگاروں نے ڈرامے کی ادبی قدروں کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو فنی قدروں کا پابند اور حلقہ بگوش بنا لیا ہے — یعنی ڈرامے میں لفظوں کی جو بنیادی حیثیت ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

ڈرامے کی فنی قدروں کے مقابلے میں اس کی ادبی قدروں کا جو مقام ہے اس کا اندازہ ایک طرف یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ دنیا کے عظیم ڈراما نگاروں نے ڈرامائی فن میں لفظوں کو یا بیان کے حسن کو کتنی اہمیت دی ہے اور دوسری طرف یہ دیکھ کر کہ ان مختلف چیزوں کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اور انداز فکر کیا ہے جنہیں ڈرامے کے فن کی اساس یا اس کی فنی قدروں کا بڑا اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ ہم بحیثیت مجموعی ادبی تخلیق کے عمل کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ادب کی سطح خواہ کچھ بھی ہو ادیب، افسانہ نگار یا ڈراما نگار کی بنیادی دلچسپی کہانی سے، کہانی کے کردار سے یا کردار کے عمل سے نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقت میں وہ ان چیزوں کو مختلف وقتوں میں یا کبھی کبھی بہ یک وقت اپنے احساس اور جذبے کے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ ڈراما نگار کے دل میں زندگی کے مشاہدے سے کسی خاص تاثر کے ماتحت ایک جذبہ پیدا ہوا ہے اور اس نے ایک خیال یا فلسفے کی صورت اختیار کی ہے۔ اسی جذبے، خیال یا فلسفے کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے وہ کہانی سے، کردار سے، اس کے عمل سے کام لیتا ہے اور یوں گویا یہ چیزیں تو اس کے تجربے کے اظہار کا ایک وسیلہ اور علامت بنتی ہیں۔ ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ڈی۔ ایچ لارنس نے ان فنی مظاہر کو انسانی شعور کی علامتی تخلیقات یا مخلوق کہا ہے۔ ان کی حیثیت محض شاعرانہ تخیل یا تصور کی علامتوں کی سی ہے جن ڈراما نگاروں نے ان علامتوں کو علامت کے بجائے حقیقت سمجھا انہوں نے ڈرامے کی ادبی حیثیت کو اس کی فنی حیثیت پر قربان کیا لیکن چونکہ بڑے فن کاروں نے ہمیشہ حقیقت اور علامت کا یہ امتیاز قائم رکھا ہے اس لئے ان کے ڈراموں نے ڈرامے کی ادبی قدروں کو زندہ رکھا ہے۔

ڈرامے کی ان ادبی قدروں نے اپنی حیات کو مستحکم بنانے کے لئے ڈرامائی فن کے ہر شعبے میں علامتوں سے مدد لی ہے اور ابسن اور چیخوف جیسے ڈراما نگاروں نے اس احساس کے تحت کہ لفظ اپنے روزمرہ کے لغوی مفہوم میں گھرے اور لطیف معانی اور مفاہیم کے حامل نہیں ہو سکتے انہیں علامتی سطح پر استعمال کرنا شروع کیا اور لفظ کو تصویر کی جگہ دے کر ہر طرح کی نزاکت اور لطافت کے اظہار کے لئے آسانی پیدا کر لی۔ عام ڈراما نگاروں نے کردار اور عمل کو مقصود بالذات بنا کر ان دونوں چیزوں کی علامتی حیثیت میں جو غیر ضروری اور غیر معمولی مفہوم پیدا کر دیا تھا، ابسن اور چیخوف نے اسے حقیقت کی فطری سطح پر

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

سرودِ رفتہ: مولانا محمد علیؒ کی ایک قدیم تحریر

اکبر علی خاں

مولانا محمد علی صرف ہندوستان کی تحریک آزادی و حریت کے رہنما ہی نہیں تھے بلکہ تعلیم کے معاملے میں بھی ایک باغی اور انقلابی سوچ رکھتے تھے۔ انہیں ایک کامیاب ماہرِ تعلیم کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ سے مایوس ہو کر جامعہ ملیہ کا جو عملی نقشہ مرتب کیا وہ ان کے بھرپور خلوص توجہ اور لگن کی وجہ سے ہندوستان کے تعلیمی تجربات میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ وہ ہمارے سیاسی رہنماؤں میں اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت کو سختی سے محسوس کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ آزادی کی تڑپ کے ساتھ ساتھ نئے ذہنوں کو ذہنی اور روحانی غذا بھی میسر آتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ان کی رہنمایانہ زندگی میں بے باک جذباتیت کا کوئی نشان نہیں۔ وہ شاید اس حیثیت سے بھی منفرد قرار دئے جائیں گے۔

خود ان کے ذہن کی تشکیل میں بی اماں کا ہاتھ برائے نام نہیں تھا۔ ان کی سوجھ بوجھ، ان کے انداز فکر اور ان کی تربیت کا اقرار مولانا نے بھی سرسری طور پر نہیں کیا ہے۔ وہ پوری شدت سے بی اماں سے متاثر ہوئے۔ ان کی تعلیمی زندگی ختم ہونے کے بعد قومی مصروفیتوں میں بھی ان کا بہت بڑا سہارا بنی رہیں۔ وہ بڑی روشن دماغ اور پیش بین ہستی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے قدامت پرست خاندان کی شدید مخالفت کے باوجود محمد علی کو مغربی تعلیم کے سپرد کر دیا۔ شاید ان کا یہ اقدام ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کے لئے ایک بیش قیمت انعام تھا جس نے محمد علی کو وہ کچھ بنا دیا جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھا۔

محمد علی کی قومی تحریکات اور مشغولیتوں میں جو رخ بی اماں نے اختیار کیا تھا اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے محمد علی کی دنیاوی زندگی ہی کا سدھار نہیں تھا بلکہ وہ اپنے بیٹے کو قوم کے سپرد کرنے کے لئے تیار کر رہی تھیں۔ "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" صرف لفظی اور کھوکھلا نعرہ نہیں ہے، اس کے ذریعے بی اماں کے سارے جذبات اور ان کی بزرگ ہمدرد اور وطن دوست شخصیت مجسم ہو کر سامنے آ جاتی ہے اپنے تمام انقلابی ولولوں کے ساتھ۔

محمد علی بھی اپنے بچپن ہی سے تنگ و تاریک روایات کے حبس بیجا سے باہر نکلنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں اور ان کی قائدانہ شان کے نقوش بہت واضح طور پر مل جاتے ہیں۔ وہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود نہ رہ سکے۔ اور بچپن میں ان کے ذہن نے جس روشنی کا انتخاب کیا وہ زندگی کے چپے چپے پر پھیل کر رہی۔

جو تحریر ہم آگے چل کر پیش کرنے والے ہیں اس سے اس محمد علی کا سراغ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی جو مغربی تعلیم کو فقط [illegible] نہیں کرتا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس دولت بیدار کو عام کرتا چلا جس کا وہ خود سرمایہ دار ہے۔ اس تحریر سے تنگ [illegible] زندگی کی نفی بھی ہوتی ہے اور وسعتِ خیال کا پتہ بھی چلتا ہے۔

یہ تحریر مولانا محمد علی کی عام شاعرانہ بے کیفی کو پرکھنے میں بھی مددگار ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مجاز سے جو فرار اختیار کیا ہے اس کے لئے ان کے ذہن میں بچپن ہی سے زمین ہموار ہو چکی تھی اور وہ "[illegible]" کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پاکبازی و سادگی کا رجحان اور شاعرانہ رندی و بیباکی سے دوری کا اظہار یہ دونوں باتیں اسی تحریر میں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ وہ کسی بھی شعریت کو زندگی میں درکنار صرف شاعری میں بھی داخل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجئے۔ وہ تو امیر مینائی بھی نہ بن سکے۔ اسی نشان کے

ہاں شاعرانہ تاثرات، رنگ، رنگ احساسات اور بالغ و بہار خیالات کا فقدان ملے گا۔ ان کی شاعری صرف وہیں جاندار نظر آتی ہے جہاں انہوں نے اپنے انسانی خلوص کے تحت شاعری کی ہے۔ اس میں سیاست بھی شامل ہے اور مذہب بھی، قوم بھی موجود ہے اور قوم پر سب کچھ نچھاور کر دینے کا جذبہ بھی۔

یہ تحریر رام پور کے اسٹیٹ گزٹ کی اشاعت دوشنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۹۰ء مطابق ۸ صفر ۱۳۰۸ھ جلد ۲ نمبر ۳۸ صفحہ ۱۰ پر درج ہے۔

مولانا محمد علی نے اپنی نامکمل خود نوشت سوانح میں یوں لکھی ہے:

"جس خالق نے مجھے ۸ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ میں میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کر لئے۔"

یہ ہجری تاریخ پیدائش عیسوی حساب سے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء ہوتی ہے۔ گویا مذکورہ بالا تحریر لکھتے ہوئے وہ اپنی عمر کے بارہویں سال میں تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا اس ۱۸۹۰ء میں انہیں مڈل کلاس کا طالب علم ہونا چاہئے۔ لیکن مولانا محمد علی کے کسی سوانح نگار اور خود مولانا نے بھی رامپور کے کسی اسکول میں طالب علم کا ذکر نہیں کیا۔ "حیات جوہر" میں عشرت رحمانی کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

"ابتدا میں مولانا کو قرآن کریم کی مکمل تعلیم دلائی گئی اور جب اس کی تکمیل ہو گئی تو جدید اصول کے مطابق ضروری درسیات سے فراغت ہونے کے بعد ان کو بریلی ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ابنائے وطن نے عموماً اور تمام اعزا و احباب نے خصوصاً یہ طریقۂ تعلیم پسند نہ کیا اور انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے خوف دلایا گیا اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہوا مگر دھن کی پکی جبل العزم روشن دماغ خاتون نے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کی اور اپنی رائے کے مطابق اپنے بچوں کی تعلیم جاری رکھی۔

کچھ عرصے بریلی اسکول میں رہنے کے بعد علی گڑھ محمڈن اسکول میں داخل ہو گئے اور وہاں نہایت شاندار کامیابی کے ساتھ اسکول سے فراغت کر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں اعلیٰ تعلیم پانے لگے۔ اس وقت تک یونیورسٹی کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی جو اعلیٰ کامیابی اسکول میں حاصل ہوئی تھی اس سے زیادہ اپنی خاص ذہانت اور طباعی کا ثبوت کالج میں دیا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔"

(صفحہ ۳۵ کتاب مذکور)

رئیس الاحرار کے مشہور سوانح نگار رئیس احمد جعفری کی عبارت بھی دیکھتے چلئے۔

"بچپن کی وہ بہاریں دیکھی تھیں کہ داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا لیکن خوبی قسمت سے آغوش مادر سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ بی اماں مرحومہ نے جس بے مثال عقل و تدبر اور ایثار سے کام لے کر اپنے صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم دلائی وہ یقیناً تاریخ نسائیات کا ایک اہم باب ہے۔ پہلے اردو فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی پھر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے۔" "سیرت محمد علی" ص۳۳

گھر اور بریلی ہائی اسکول کے درمیانی وقفہ کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ان بیانات کے پیش نظر تو یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ گھر کی تعلیم سے فارغ ہو کر وہ بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے۔ اس طرح رام پور کی کسی باقاعدہ درسگاہ میں ان کی موجودگی کا علم ابھی تک کسی کو نہیں۔ جو تحریر میں یہاں پیش کر رہا ہوں وہ اس راز سے بھی پردہ اٹھاتی ہے اور عظیم رہنما کی پرخلوص، پرمحبت اور پرعزم، باشعور زندگی کی داستان کی پہلی کڑی اس شکل میں سامنے آتی ہے کہ بچپن کا محمد علی اپنی غور و فکر کی پہنائیاں بھی واضح اور نمایاں طور پر آشکار کر دیتا ہے۔

گزٹ کے اسی شمارے میں انسپکٹر مدارس کی ایک رپورٹ بھی شریک اشاعت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"مارچ ۱۸۸۹ء میں انگریزی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ شہر میں کھولا گیا اس مدرسے نے اس وقت تک جو ترقی کی ہے بہر وجہ باقاعدہ اور قابل اطمینان ہوئی ہے۔"

رپورٹ میں آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

"ابتدا میں یہ مدرسہ جماعت ششم تک تھا۔ پھر ۱۸۹۰ء میں درجۂ مڈل بھی قائم کر دیا گیا۔" (مذکورہ رام پور گزٹ صفحہ ۱۴)

اسلئے ۱۸۹۰ء میں مولانا محمد علی کا اس مدرسۂ انگریزی کے درجۂ تنزل میں ہونا قرین قیاس ہے۔

مبینہ نتیجے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد علی گڑھ چھوڑ کر مولانا محمد علی رامپور آئے ہیں جب انگریزی اسٹیٹ ہائی اسکول کے پرنسپل مقرر کئے گئے تھے در اصل اُسی کے وہ اولڈ بوائے بھی تھے اور اس نے بھی اپنے لائق منتظم کی تعمیر میں ایک رول ادا کیا تھا۔

یہ مضمون مولانا محمد علی کی ذہنی اور سادی زندگی کے دو رخ پیش کرتا ہے۔

۱- انگریزی تعلیم کے لئے فراخ دلی اور ذہنی وسعت۔

۲- گھریلو دینی تعلیم کے بعد اور بریلی ہائی اسکول میں داخلے سے پہلے درمیانی وقفہ کی تعلیمی مشغولیت کا حال اسکول کے باقاعدہ طالب علم کی صورت میں۔

مولانا نے اپنی اس تحریر میں انگریزی تعلیم کی جس شد و مد سے تائید کی ہے اسے کورانہ فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مضمون مولانا حالی اور سر سید احمد خاں کے قلم سے نکلا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ انہیں کی بازگشت ہو۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لئے بھی مولانا محمد علی کی عملی زندگی کو دیکھنا چاہیئے جس کے بعد یقیناً یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر خالص مشرقی عادات و خصائل کے آدمی تھے۔ اپنے لباس میں بھی کسی حد تک اپنی عمر کے ہر حصے میں انہوں نے مشرق و مغرب کو برقرار رکھا ہے۔ وہ ان لوگوں میں کبھی نہ تھے جو مغربی ماحول کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہوں اور احساس کمتری کا شکار اس انداز میں ہوتے ہوں کہ اپنی مادری زبان بولنا بھی انہیں گناہ معلوم ہو۔ انہوں نے خود سپردگی کی وہ روش بھی اختیار نہ کی جس میں قومی مزاج کی نفی اور مذہبی احترام سے بے پروائی ثابت ہوتی ہو۔ وہ جذباتی ضرور تھے لیکن بگڑے ہوئے ذہن میں سمٹے ہوئے افراط و تفریط سے دور۔

اصل تحریر سے پہلے یہ بات ذرہ تامل طلب ہے کہ انسپکٹر مدارس کی رپورٹ اور طالب علم محمد علی کے مضمون کی تاریخ ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں مدرسۂ انگریزی کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھیں۔ اس لئے گزٹ میں دونوں پر ۱ اگست ۱۸۹۰ء اندراج ہے۔

مولانا محمد علی کا یہ مضمون اس لئے قابل قدر ہے کہ یہ ایک ذہنی انقلاب کا نمائندہ ہے اور ایک تعلیمی انقلاب کی یادگار ہے جو آگے چل کر ہندوستان کی سرزمین خصوصاً مسلمانوں کی دنیا میں آیا۔ لیکن یہ اس لئے بھی مزید قابل قدر اور اہم ہو جاتا ہے کہ یہ اب تک کی قدیم ترین معلومہ تحریر ہے جسے رئیس الاحرار مولانا محمد علی سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس ایک چراغ سے ابھی کئی اور چراغ جلائے جا سکیں اور امید ہے کہ ابطالِ حریت کی یہ قدیم ترین تحریر اپنی افادیت اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر ملک کے ثقافتی سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہوگا:

مضمون محمد علی خاں طالب علم مدرسۂ انگریزی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جب ہم غور سے دیکھتے ہیں ایک بڑا حصہ ہماری ابتدائی عمر کا افسوسناک نمونہ دکھاتا ہے۔ ہماری ابتدائی تعلیم محض ناقص اور ادھوری بلکہ خطرناک مرحلہ ہے۔ ایک مدت بغیر معنی الفاظ کے تعلیم پاکر فقط قوتِ حافظہ کو کام میں لاتے ہیں، فکر و غور کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ خوض کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ فکر و تامل کے معرکے میں ہماری عقل غیر مفید اور فکر نارسا ثابت ہوتی ہے۔ وہی ابتدائی زمانہ عجب زمانہ ہے جس میں دل و دماغ صاف اور غیر مکدر ہوتے ہیں۔ فکر و غور کرنے کی عمدہ اور مضبوط بنیاد اسی وقت قائم ہو سکتی ہے۔ اس قوت کے پیدا ہو جانے سے شائستگی، تہذیب، علم و ہنر انواع اقسام کی دولت پر ثابت قدمی سے تصرف کر سکتے ہیں۔ اور جو باقی زندگی کہ ہم کو اس دنیا میں بسر کرنا ہے نہایت فارغ البالی سے بسر

[illegible] ہم جیسے اقبال مند کہاں تھے جو یہ دولت ہم سے ہاتھ آتی۔ ہم کو تو اوّل ہی حسن و عشق کی سوسائٹی میں شامل ہونا پڑا۔ قیس و فرہاد کی آشفتہ حالی کا نقشہ لیلیٰ و شیریں کے خوبی و جمال کی تصویر ہماری تعلیم کا جزو سمجھی گئی اول جب ہی مکتب میں قدم رکھا کسی کے یہ شعر بر زبان تھا:

اے داغ بر دل از غم حال تو لالہ را
شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را

اور کوئی یہ شعر از بر پڑھتا:

ما مقیمان کوئے دلداریم رخ بدنیا و دیں نمی آریم

یہ پرانے فشن کی (دقیانوسی) تعلیم ہے۔ جس تعلیم میں حکایاتِ عشق آمیز اور فسانہ ہائے جنوں خیز داخل ہوں اس سے بہتر نتیجے کی اُمید رکھنا محض فضول خیال ہے۔ بلکہ سادہ اور صاف طبیعت کو بڑے خطرناک رنگ میں رنگتی ہے۔

ہر تعلیم کے واسطے قدیم ہو یا جدید طبیعت کا یکسو ہونا بہت ضروری بات ہے۔ شاعرانہ خیال کی پابندی یا عشقیہ شعر و سخن کا مطالعہ طالب علم کے واسطے خراب اثر پہنچاتا ہے جیسے ردارت موسم، ہوا کو اور ہوا طبیعت کو اور طبیعت جسم کو اور جسم جان کو۔ تعلیم جدید کی جو ایشیائی رنگ سے بالکل سادہ اور جس کے اُصول نہایت قیمتی اور قابل قدر ہیں ہمارے واسطے نہایت ضرورت ہے جیسے نابینا کو بینائی کی۔ باوجود کسی قدر تعلیم قدیم پانے کے ہنوز نامبارک لقب نیم وحشی انسان کا ہم سے واپس نہیں ہوا ہے۔ لیکن اب زمانہ بدل چلا ہے، زمانہ پہلے سے غیر ہے۔ مگر بیشتر ہم کو اپنی عادت کی اصلاح کرنا فرض ہوگی۔ ہماری رفاہ اور صلاح کا سارا سامان مہیا ہے، ہماری حالت کبھی بدل جائے گی، ترقی کے زینے پر قدم جمائیں گے اور انشاء اللہ ضرور ترقی مدارج کو طے کریں گے۔

خدا کے فضل سے عالی جناب جنرل محمد اعظم الدین خاں صاحب بہادر وائس پریذیڈنٹ نے ان ضرورتوں کو ملاحظہ فرماکر یہ مدرسۂ علوم جدید نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ قائم کرایا۔ جناب ممدوح کی دلی توجہ اس مدرسے کی سرپرستی میں مصروف ہے۔ یہ ہونہار و تعلیم یافتہ نوجوان کا فرض ہے کہ اپنی عمدہ کوشش سے اپنی اعلیٰ لیاقت کا ثبوت جناب محتشم الیہ کے حضور میں پیش کرے۔ اس روز عالی جناب اپنی خاص توجہ کا آخری نتیجہ ملاحظہ فرماکر کس درجہ اظہار خوشنودی فرمائیں!

اے خدا جلد وہ مبارک دن دکھلا۔

محمد علی طالب علم مدرسۂ انگریزی رام پور اسٹیٹ

۱۸ راگست ۱۸۹۰ء

★

رضا شاہ پہلوی کے مزار پر

شاہی محافظ دستہ کی سلامی (ایران)

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں:

(دورہ ایران و ترکی)

فیلڈ مارشل اپنے شاہی میزبان ، شہنشاہ ایران کے ساتھ

اتاترک کو خراج عقیدت
(مزار کی طرف روانگی)

ترکی دستہ کی سلامی

۱ :

۲ :

صدر آئزن ہاور پاکستان میں

۱ : صدر پاکستان کے خیر مقدم کا جواب
۲ : شاہی سواری
۳ : فضا سے کورنگی کی وآبادی کا نظارہ

۳ :

۴ :

۵ :

۴ : محافظ دستہ صدر پاکستان (مظاہرہ تیر باری)
۵- ''آل لائنک ائمک''
۶ : ''خوش آمدید''

اک شمع رہ گئی تھی ....

جمیل نقوی

بزمِ سخن آج پھر ماتم میں ہے۔ آسد ملتانی جن سے حالی، اکبر اور اقبال کے دور کی یاد تازہ تھی ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس تمہید کو جہاں اقبال ہی کے الفاظ میں، بزمِ ہستی کے سب مسافر ہم نشیں تھیں۔ مرحوم کو ماہِ نو کے ساتھ ایک ربطِ خاص تھا اور وہ ہمیشہ بعد شوق اسے اپنے رشحاتِ قلم سے مستفید فرماتے رہے۔ ہم آج اپنی محرومی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں جو تمام دنیائے ادب کی محرومی بھی ہے۔ ہم ذیل میں آسد ملتانی کے متعلق ایک مختصر نگارش پیش کر رہے ہیں جس میں ان کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے خدوخال اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے (مدیر)

محمد اسد خاں آسد ملتانی ۱۳ ردسمبر ۱۹۰۲ء کو کوٹلی افغانان ملتان شہر میں پیدا ہوئے ـــــ نومبر ۱۹۵۹ء بمقام راولپنڈی داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے والد خان غلام قادر خان قوم افغان شیرانی سے تعلق رکھتے تھے۔ اسد ملتانی مرحوم نے مشن اسکول ملتان اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا سیکریٹریٹ میں ملازم ہوئے۔ فارن اینڈ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور سپرنٹنڈنٹ رہے۔ پاکستان بننے کے کچھ دن بعد وزارت ریاستہائے سرحدات میں اسسٹنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، اور آخر وقت تک اپنے فرائض منصبی کو بڑی دیانت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

آسد مرحوم بڑے مرنجان مرنج اور ملنسار بزرگ تھے۔ ان کی نظر اردو اور فارسی شاعری پر بہت وسیع تھی۔ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور اکثر اچھے شعر نکال لیتے تھے۔ کراچی آنے کے بعد ہی، غالباً ۱۹۴۹ء میں، میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے خواہ ان کا مقام کچھ ہی ہو لیکن بحیثیت ایک انسان انہوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ ان کی خاکساری کم سخنی، بزرگانہ شفقت اور ایک ایسا خلوص جو عام طور پر میسر نہیں آتا، ان سب خصوصیتوں نے مل کر ان شخصیت کو بڑا پرکشش اور محبوب بنا دیا تھا۔ اس پر خدا ترسی اور اسلام دوستی مستزاد تھی۔

مرحوم آسد ملتانی آج کی دنیا میں اگلے وقتوں کے بزرگوں کا ایک عمدہ نمونہ تھے۔ مغربی تعلیم نے انہیں مشرقی تصورات اور اسلامی معاشرت کا اور بھی زیادہ گرویدہ کر دیا تھا۔ انہیں اسلام اور مسلمان سے عشق تھا۔ قرآن اور حدیث پر انہیں کامل ایمان تھا۔ اور اس سلسلہ میں وہ کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتے تھے حتیٰ کہ ان کے ایک دیرینہ عزیز دوست نے ایک مشہور رسالہ میں جب اس مسئلہ پر ایسے خیالات کا اظہار کیا جن سے آسد مرحوم کو اختلاف تھا تو مرحوم نے اپنے مکان پر ہفتہ وار جلسوں کا انتظام کیا اور ایک مشہور عالم دین کو اس "فتنہ" کو دبانے کے لئے مواعظ کی دعوت دی۔ پند و موعظت کا یہ سلسلہ اُن کے راولپنڈی جانے تک جاری رہا۔

خود اسد ملتانی صاحب کے بیان کے مطابق انہوں نے تو دس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن کالج میں پہنچنے کے بعد باقاعدگی سے شاعری کرنے لگے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں کالج میں نظم گوئی کا ایک مقابلہ ہوا تھا جس میں ان کی نظم کو اول قرار دیا گیا تھا اور انعام بھی ملا تھا۔ مقابلہ میں داخل کرنے سے پہلے انہوں نے اپنی نظم علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پیش کی تھی جس پر انہوں نے از راہِ کرم اصلاح فرما دی اور نظم کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اور انعام کی مستحق قرار پائی۔ زمانہ طالب علمی میں سخن وری اور سخن فہمی کالج کی چار دیواری تک ہی محدود رہی لیکن یہی وہ زمانہ تھا جبکہ آسد ملتانی نے مشق سخن بہم پہنچائی اور فن شعر پر عبور حاصل کیا۔ تعلیمی مشاغل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے باقاعدہ شعر کہنا شروع

کر دیا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اکثر نظمیں لکھیں جنہیں افغانستان کے رسائل میں بھی اکثر نقل کیا گیا روزنامہ "زمیندار" اور "انقلاب" میں بھی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ نیرنگ خیال، ہمایوں اور دوسرے ادبی رسائل میں بھی بالالتزام لکھنا شروع کیا۔ لیکن ۱۹۲۵ء سے زیادہ تر نظمیں رسالہ معارف اعظم گڑھ میں ہی چھپتی رہیں۔ یا پھر تقریباً ۱۹۳۸ء سے رسالہ "طلوع اسلام" میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ "ماہِ نو" میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ لیکن بجز "مرثیۂ اقبال" اور "بانگ حرم" کے جنہیں مرحوم نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا، ان کا مجموعۂ کلام ابھی تک اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ سنا ہے وہ عرصہ سے اپنے کلام کو مجموعہ کی شکل میں مرتب کر رہے تھے مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

یوں تو اسد ملتانی نے صنف غزل کو بھی بہت کچھ نوازا ہے لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے۔ فی الحقیقت، وہ بنیادی طور پر نظم ہی کے شاعر تھے اور ان کا بیشتر ادبی سرمایہ نظم ہی کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن ان کی نظمیں جدید شعرا کی نظموں سے باعتبار مزاج اور باعتبار انداز بیان یکسر مختلف ہیں۔ ان کی نظموں کو مذہبی، سیاسی، وطنی، اور اصلاحی وغیرہ عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اسد ملتانی کی نظموں میں اکبر کا طنز، حالی کے پند و نصائح قومی درد اور اقبال کا تفکر اور حب الوطنی کا ایک نہایت عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ موجودہ دور میں وہ واحد شاعر تھے جس نے حالی اور اقبال کی روش شاعری کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ برتا بلکہ اس کو آگے بڑھایا اور اس کی مصلحانہ شان برقرار رکھی۔ قومی شاعری جدید انداز میں بھی کی جاتی ہے لیکن وہ دل سے زیادہ دماغ کی شاعری ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں جو بات ہے وہ جدید قومی شاعری میں نہیں ملتی۔ حالی اور اقبال براہ راست قلب و روح کو متاثر کرتے ہیں۔ اسد ملتانی بھی اسی ڈگر پر چلے ہیں اور انہوں نے بھی اپنی شاعری کی بنیاد خلوص اور حب الوطنی پر رکھی ہے۔ انہوں نے سچی باتیں بڑی سادگی اور سلاست کے ساتھ بڑے مخلصانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ خواہ غزل ہو یا نظم ان کے یہاں دونوں کا مزاج یکساں ہے۔ وہی اصلاح کی کوشش، اسلام اور مسلمانوں کی بہبودی و بہتری کے مضامین، مذہبی اور سیاسی مسائل کا بیان۔ قومی اور ملی عظمت کے ترانے اخلاقی اور اجتماعی قدروں کا پرچار۔ حسن عمل کی تلقین، بنی نوع انسان کا درد، یہ تمام موضوعات یوں دیکھنے میں تو بہت آسان نظر آتے ہیں مگر انہیں شعر کے قالب میں اس طرح ڈھالنا کہ شاعرانہ وقار بھی قائم رہے اور عام فہم انداز میں بات ناظر پورے طور پر ادا ہو جائے بلکہ قاری اور سامع کے دل و دماغ پر وہ تاثر بھی پیدا کر سکے جو اس کا اصل مقصود ہو۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر شاعری صنعت گری ہو جاتی ہے۔ اور اگر شاعر کا خلوص کارفرما نہ ہو اور اس کے اپنے دل و دماغ پر موضوع کلام کا بھرپور موجود نہ ہو اور اس کی تمام جزئیات پر اسے عبور حاصل نہ ہو تو ایک مصرعہ ترتیب دینا بھی مشکل ہوگا۔ اکبر، حالی اور اقبال کی طرح اسد ملتانی نے بھی یہ ہفتخواں بڑے اہتمام سے طے کیا ہے اور اکثر و بیشتر وہ خاطر خواہ طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

یوں تو اسد ملتانی نے غزلیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں اور عام روش سے ہٹ کر اچھے اچھے شعر نکالے ہیں لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے جہاں ان کے فطری جوہر پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں خصوصاً مسائل حاضرہ پر ان کی بعض نظمیں بڑی کامیاب ہیں۔ مثلاً جب شہید ملت مرحوم کی قیادت میں قرارداد مقاصد منظور ہوئی تھی تو اسد ملتانی نے اس بنیادی اقدام کا بڑے لطیف انداز میں خیر مقدم کیا تھا۔

اب پھر کسی کے حسن کا چرچا ہوا تو ہے
اس دور میں بھی عشق کا دعویٰ ہوا تو ہے
تو مضطرب کہ جلوہ ابھی عام کیوں نہیں
میں اس پہ مطمئن کہ تقاضا ہوا تو ہے
پھر ہو چلی ہے جرأت پروانہ کی امید
روئے نگاہ سوئے ثریا ہوا تو ہے
آثار سربلندی اسلام ہیں عیاں
دنیا و دیں کا سلسلہ یکجا ہوا تو ہے
انجام کے لئے بھی خدا کارساز ہے
آغاز کار حسب تمنا ہوا تو ہے
افرنگ سے حجاز کی جانب پھرا ہے رخ
قبلہ بنائے قوم کا سیدھا ہوا تو ہے

ایک اور موقع پر انہوں نے کیسی اچھی بات کہی تھی ؎

ملت کی عمارت ابھی تیار نہیں
سامان تو موجود ہے معمار نہیں
ترشی ہوئی اینٹوں کے کچھ انبار تو ہیں
اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں

اسد ملتانی کی ملی نظموں میں مجھے ان کی نظم "آئینِ نو" سب سے زیادہ پسند ہے۔ جو ۱۹۵۶ء میں انہوں نے نیا دستور جاری ہونے پر لکھی تھی اس کا ایک ایک لفظ کیف و اثر میں ڈوبا ہوا ہے ؎

سبز ہوئی شاخ شاخ پھول بنی ہر کلی
باغ ہوا باغ باغ، بادِ بہاری چلی
تاکہ عروسِ بہار اس پہ ہو گرمِ خرام
سبزۂ نورستہ کا فرش بچھا مخملی
صحنِ گلستاں میں پھر ذکرِ محبت چلا
دل کے شبستاں میں پھر شمعِ مسرت جلی
تھی افقِ شرق پر چھائی جو کالی گھٹا
اس کی سیاہی ذرا رنگِ شفق میں ڈھلی
دورِ تذبذب گیا ختم ہوا اضطراب
دل کو سکوں مل گیا، دور ہوئی بیکلی
آج ہوئی رونما حریتِ کاملہ
سایۂ اغیار کی سر سے مصیبت ٹلی

اقبال کو تو اپنا امام تصور کرتے تھے انہوں نے اپنی شاعری کا نصب العین ہی اس بات کو قرار دے رکھا تھا کہ اقبال کے "نورِ بصیرت" اور "سوزِ عشق" کو عام کریں۔ ان کی کامیاب ترین نظمیں وہی ہیں جہاں انہوں نے روحِ اقبال سے فیض حاصل کیا ہے۔

قائد اعظم کے متعلق یہ اشعار تمام تر حقیقت ہی کے آئینہ دار ہیں:

قائد اعظم نے ملت پر یہ احسان کر دیا
عقل و تدبیر و سیاست کو مسلمان کر دیا
ہے کمی کوئی تو کوتاہی ہماری ہے اسد
اس نے تو آزادیٔ کامل کا ساماں کر دیا

شاعرِ مشرق نے پاکستان کا دیکھا تھا خواب
قائد اعظم نے ساماں کر دیا تعبیر کا

اگرچہ اسد ملتانی نے اپنی نظمیں ایک اضطراری کیفیت اور وقتی تاثر کے ماتحت لکھی ہیں، اسکے باوجود ان کی ایک مستقل حیثیت بھی ہے۔ وہ آج بھی اتنی ہی نئی ہیں جیسی وہ تخلیق کے وقت تھیں۔ مجھے یقین ہے ہماری ملی شاعری میں انہیں ایک باوقعت مقام حاصل رہے گا پھر وہ نظمیں جو مذہبی مسائل پر مبنی ہیں۔ ان کی دائمی افادیت سے کسی وقت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"سفینۂ عرب" کے عنوان سے حاجیوں کی پاکستان سے روانگی کا سماں کتنے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

وہ دن بھی آخر آگیا　　کہ جس کا انتظار تھا
ادھر حرم کا قافلہ　　ادھر عزیز و اقربا
دلوں میں خیر کی دعا　　سلام شوق برملا
یہی تھا سلسلہ کہ جب
چلا "سفینۂ عرب"
وہ دوستوں کی انجمن　　وہ ہم نشیں وہ ہم سخن
وہ دلبرانِ سحر فن　　وہ گھر وہ کشت وہ چمن
عزیز خطۂ وطن　　لگی دلوں میں کیا لگن
کہ چھوڑ کر یہ سب کے سب
چلا "سفینۂ عرب"

ایسے ہی اردو کو قومی زبان بنانے کی کس خوبصورتی کے ساتھ وکالت کرتے ہیں ؎

ہر چند کہ اردو میں محاسن ہیں جبلی
اغیار سے جو داد اُسے ملنی تھی مل لی
کیا رنج کی بات اس سے اگر چھٹ گئی دلی
ہے اب بھی ہمارے لئے سرمایۂ ملی
ارباب وطن ہمدم و ہمراز ہیں اس کے
یک دل ہیں اگر دیں سے ہم آواز ہیں اس کے

اور آگے چل کر نظم کو اس طرح ختم کرتے ہیں ؎

واپس وطن آئی ہے مسافر نہیں اردو
اس ملک کی مالک ہے مہاجر نہیں اردو

حالانکہ اسد ملتانی بنیادی طور پر میدانِ نظم کے ہی یکہ تاز ہیں لیکن غزل بھی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے کافی فیضیاب ہوئی

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

اِک فرد، اِک دَور

(مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی یاد میں)

جگن ناتھ آزاد

پھر اُن سے اردو کے گلستاں میں خزاں آج
پھر ہے لبِ افکار و حوادث پہ فغاں آج
پھر سینۂ الفاظ سے اٹھنے لگا دھواں آج
پھر دیدۂ معنی سے ہوا خون رواں آج

پھر نالہ و زاری ہے صحافت کی زباں پر
ماتم کا ہے اک شور ظرافت کی زباں پر

اے بزمِ وفا! کون تجھے چھوڑ چلا ہے
ہر لب پہ جو فریاد ہے نالہ ہے بکا ہے
دُنیائے سخن کون الگ تجھ سے ہوا ہے
اے شعر و ادب! تم پہ یہ کیا وقت پڑا ہے

ماتم ہے یہ آزاد! نئے دَور کا ماتم
اک فرد کا ماتم ہے کہ اک دور کا ماتم

محفل کو گیا چھوڑ کے محفل کا وہ محبوب
ہر بات رہی جس کی پسندیدہ و مرغوب
جس کی نگہِ فیض سے ناخوب ہوئے خوب
کہتے تھے جسے اہلِ نظر کعبۂ مطلوب

اب کعبۂ مطلوب وہ پائیں تو کہاں ہم
بے وحشتِ دل بول کہ جائیں تو کہاں ہم

جس بزم میں تازہ تھا تجھ ری کا ابھی غم
اختر کا الم، حسرت و [illegible] شیر کا ماتم
کیفی کی جہاں یاد ہوئی تھی نہ ابھی کم
جس بزم میں اک دردِ مسلسل کا تھا عالم

اس بزم سے سالک بھی ہوئے آج روانہ
یا بزم سے ہے بزم کا سرتاج روانہ

وہ پیار کا شفقت کا عنایت کا خزینہ
اخلاص و محبت کا مودّت کا خزینہ
وہ مہر و وفا کا وہ مروّت کا خزینہ
مٹتی ہوئی دیرینہ شرافت کا خزینہ

آخر کو لُٹا گردشِ ایام کے ہاتھوں
یا صبح کی تنویر مٹی شام کے ہاتھوں

کتنوں کو شرابِ سخن و شعر پلا کر
کتنوں کو حسیں نثر کے جادے پہ لگا کر
کتنوں کو نشانِ منزلِ مقصد کا بتا کر
کتنوں کو غمِ عشق کے آداب سکھا کر

ہر راہ میں نقشِ کفِ پا چھوڑ گیا ہے
قندیلِ محبت کی ضیا چھوڑ گیا ہے

اے وقت! خبر ہے کہ وہ کیا دے کے گیا ہے
کیا شے وہ تجھے مردِ خدا دے کے گیا ہے
اک دل وہ تجھے درد بھرا دے کے گیا ہے
اک روشنیٔ مہر و وفا دے کے گیا ہے

جو دردِ ازل اُس کی زباں پر تھا ترانہ
وہ درد ہے اب تیرا گراں مایہ خزانہ

سالک کے حسیں طرزِ بیاں، طرزِ ادا سے
اک سوز میں ڈوبی ہوئی پُر کیف نوا سے
جو دے کے گیا ہے تجھے اس درسِ وفا سے
اے نسلِ نوی اس کے تفکر کی ضیا سے

ممکن ہو تو کسبِ ادب و کسبِ ہنر کر
تاریکیٔ شب ہائے غمِ دل کی سحر کر

اے خاکِ وطن! منزلِ مقصودِ محبت
قرباں ترے ذرّوں پہ مرے اشکِ ارادت
مانا کہ ہے ناچیز بہت میری عقیدت
پہلے بھی کچھ آسان نہ تھی تیری زیارت

اس راہ میں اب ایک رکاوٹ سی پڑی، اور
اک ٹوٹ گئی رشتۂ الفت کی کڑی اور

ڈرامہ:

وہ لوگ

ہاجرہ مسرور

کردار:

بابا خیرو: لمبی سفید داڑھی، سیاہ رنگت، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے۔ سیاہ تہمد اور کھدر کی آستینوں والی صدری جسم پر ننگے پاؤں۔ گلے میں کپڑے سے منڈھا ہوا تعویذ۔

اماں: خیرو کی بیوی۔ ادھیڑ عمر کی دبلی پتلی عورت۔ ماتھے پر سیاہ کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی۔ میلے، ڈھیلے ڈھالے چوڑی دار پاجامے اور لمبے کرتے میں ملبوس۔ سر پر دوپٹہ جس میں سے کندھوں پر پڑے ہوئے کھچڑی بال جھانکتے ہیں۔ گلے میں موٹے منکوں کی تسبیح۔

زینب: ان کی بڑی بیوہ بیٹی۔ عمر تیس سال۔ کالے دوپٹے لمبے کرتے اور چھوٹے پائنچوں کی سیاہ شلوار پہنے ہوئے ہے۔

جنت: چھوٹی بیٹی۔ عمر بیس سال۔ جسم پر سستے ریشم کی قدرے میلی شلوار اور قمیص۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں اور ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں۔

رجو: زینب کی بارہ تیرہ سال کی لڑکی۔ اٹنگی شلوار اور ڈھیلی سی قمیص پہنے۔ سر پر گز بھر کا میلا کپڑا، ننگے پاؤں، بکھرے ہوئے بال، ہر بات ہنس کر لاپروائی سے کرتی ہے۔

ممدو: زینب کا لڑکا۔ عمر دس سال تہمد اور بنیان میں ملبوس۔ پاؤں میں کینوس کا پرانا جوتا۔ جلدی جلدی اور بے حد جوش سے بولتا ہے۔

گلو: بابا خیرو کا بیٹا۔ عمر سترہ اٹھارہ سال۔ نئی نئی پھوٹی ہوئی داڑھی مونچھیں جسم پر پاجامہ اور کرتہ، سر پر کپڑے کی گول ٹوپی۔ پاؤں میں جوتا۔

ننھا: جنت کا ڈیڑھ سالہ بچہ

مقامی: ایک جرا قصبہ

زمانہ: ہو چاہے سمجھ لیجئے۔

منظر:

(پردہ اٹھتا ہے تو ایک جھونپڑا نظر آتی ہے۔ جس کا صرف سامنے کی طرف ایک دروازہ ہے۔ جھونپڑی کے اگلے حصے پر پھونس کا چھپر ہے اس چھپر تلے ایک طرف ہٹ کر مٹی کا چولھا بنا ہوا ہے جس میں بے تحاشہ راکھ بھری ہوئی ہے اس کے قریب ہی کچھ بلی سے توڑی ہوئی چند سوکھی ٹہنیاں، دو چار اُپلے اور سوکھے پتے ڈھیر ہیں۔ ساتھ ہی چند المونیم کے برتن اور مٹی کا گھڑا پڑا ہوا ہے۔ دائیں بائیں مٹی کی نیچی چار دیواری پر اُپلے سوکھ رہے ہیں۔ صحن میں ایک طرف مٹی کے بدھنے اور ڈبے ڈھیر ہیں۔ یہ ہلکی سردیوں کی ایک شام ہے، سورج ابھی غروب نہیں ہوا اس لئے زرد ہوتی ہوئی دھوپ سے چھپر کا کچھ حصہ اور بائیں ہاتھ کی دیوار روشن ہے۔ اس دیوار سے ٹیک لگائے اماں حقہ سامنے رکھے بیٹھی اونگھ رہی ہے۔ چھپر تلے کھاٹ پر جنت کنگھی کر رہی ہے کنگھی سے زیادہ وہ اپنے چہرے کی طرف متوجہ ہے۔ بار بار چھوٹے سے شیشے میں جھک کر اپنا چہرہ دیکھتی ہے، کبھی ناک کی کیل گھماتی ہے۔ اور کبھی گریبان کے چاندی کے بٹن کو گھورتی ہے۔ اس دوران میں اکثر وہ نظر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھتی ہے جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ زینب چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی ہوئی ٹہنیاں توڑ کر لکڑیاں لگا رہی ہے اور بار بار غصے اور حقارت سے جنت کی طرف دیکھتی جاتی ہے — چند لمحے بعد اماں گھبرا کر جاگ جاتی ہے اور حقے کی نے ہونٹوں میں دباتی ہے اور پھر کھانسنا شروع کر دیتی ہے۔)

اماں: (کھانسی سے نجات پا کر لمبا سانس لیتے ہوئے) اری جیب زینب، چلم میں آگ ڈال دے جراسی۔

زینب: اتی دیر ہوئی جنت سے کہا تو نے کہ چولھا سلگا دے۔ اب سی

سے آگ مانگو۔ گھنٹے بھر سے بیٹھی مانگ پٹی کر رہی ہے۔

جنت: (ہاتھ پھیلا کر لڑنے کے انداز سے) ابھی سسر چولھا سلگا دوں جیسے بڑے پلاؤ قورمے پکنے ہیں۔

زینب: (منہ بنا کر) ہنہ تیری سسرال میں تو روز (روز) پلاؤ پکتا ہے نا!

جنت: لے، پھر میری سسرال کا نام لیا!۔ دیکھ لے اماں [illegible] کوئی کہتی ہوں میرے گھر روج (روز) پلاؤ پکتا ہے؟ ہاں جب کوئی مہمان آئے تب تو جرور (ضرور) پلاؤ پکتا ہوا۔ (کنگھا رکھ کر آئینے میں منہ دیکھتی ہے اور چوٹی گوندھنے لگتی ہے)

اماں: اور کل دال نہیں پکوائی تھی؟ اس کھیال سے کہ تیرا میاں آتا ہوگا۔

زینب: اور گھی سے بگھار بھی تو لگا یا تھا۔۔ کیسی منت کی تھی بابا نے فضلو پرچونئے کی تب اُدھار دال اور گھی اس نے دیا تھا (جلدی جلدی آٹے پر مکھیاں لگاتی ہے)۔

جنت: (گندھی چوٹی پشت پر پھینک کر) ہاں تیرے تو دل پر لکھ گیا۔ اگر وہ گھی سے بگھاری دال کھالیتا تو جانے کتنے ٹھیکہ (ذکر) کرتی دنیا بھر میں۔

زینب: (ہونٹوں پہ حیرت سے انگلی رکھ کر) ہائے ری جنت تو تو یوں ہی بگڑ جاتی ہے۔ میں نے تو یوں ہی کہا تیری بات پر۔۔ (سر جھٹک کر دوبارہ آٹے کی طرف متوجہ ہو کر) تیرا میاں بچارہ کون روج روج آتا ہے۔ میں نے تو آپ ہی اماں سے کہا تھا کہ دال جیوڑ دیجے، جنت کا میاں ایک دن کو آئے اور روکھی روٹی کھا کر جائے کیسی سرم (شرم) کی بات ہے۔

جنت: (منہ پھلا کر مگر نسبتاً کم غصے میں) کل اس کو روکھی روٹی دینا سرم (شرم) کی بات تھی اور آج؟ آج تو وہ جرور (ضرور) پہنچے گا۔۔ پھر؟

اماں: (تھوڑا سا کھانس کر) تیرے سامنے مہرو کو پرچونئے کی دکان پر نہیں بھیجا تھا؟ اب وہ اُدھار نہ دے تو تیری اماں کیا کرے۔ (کمر پکڑ کر اٹھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر) تیرا بابا کیا کرے؟ اپنے جھے کے رزق پہ تو بھلا جینے والے بابا پر خضر کا سایہ پڑ گیا جیسے۔۔ کتنے دن ہوگئے آج؟ کوئی نہ آیا۔ (کچھ سوچ کر تیز آواز میں) لا، جینب (زینب) وہ المونیم

کی دیگچی اٹھا دے، اسے رکھ کر تو پرچونیا دال دے دے گا۔

جنت: (کھاٹ سے اٹھ کر ایک دم ہنستے ہوئے) لے بھلا اماں کی باتیں دیکھ جینب (زینب) (ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر) دیگچی پرچونئے کے پاس رکھ دے گی تو دال کاہے میں پکائی گی؟

زینب: (سنجیدگی سے) اور کیا۔۔

(جنت ہنستے ہنستے چپ ہو جاتی ہے۔ وہ پھر آئینہ اٹھا کر کوٹھری کے دروازے میں غائب ہو جاتی ہے۔ اس دوران میں بڑھیا اماں چولھے کے پاس بیٹھ کر ٹھنڈا چولھا کرید تی ہے۔ آگ نہ پا کر دیوار میں بنے ہوئے چھوٹے سے طاق پر سے ماچس کی ڈبیا اٹھاتی ہے۔ اسے ہلا کر دیکھتی ہے اور پھر ماچس خالی پا کر اس کے ڈھکنے سے ایک تنکا توڑ کر دوبارہ آہستہ آہستہ چلتی دیوار کے پاس دھوپ میں بیٹھ کر تنکے سے خلال کرنے لگتی ہے۔ جنت کوٹھری سے نکل کر دوبارہ کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے۔)

زینب: (جنت کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے) سوچ فکر سے روٹی کو بھوک لگی۔ شاید کوئی دیا جلا جائے۔ تیرا میاں آگیا تو اس کی روٹی پر تیل چپڑ دیں گے۔

(جنت کوئی جواب نہیں دیتی، صرف اپنی ٹانگیں ہلاتی رہتی ہے اور بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ بڑھیا آنکھیں بند کئے خلال کئے جاتی ہے، اور زینب سر جھکا کر زور زور سے آٹے پر مکیاں لگانے لگتی ہے)

(چند لمحے کے وقفے کے بعد)

(مہرو اندر بھاگتا ہوا آتا ہے، اس کے چہرے پہ ہنسی ہے اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں۔ وہ یہ جیسے تیزی سے اِدھر اُدھر جیسے کچھ نظروں ہی نظروں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے)

زینب: مہرو دال لایا؟

مہرو: وہ۔۔ وہ۔۔ آگیا

جنت: (کھاٹ سے اٹھ کر) آگیا؟ اندر لے آ سے مہرو (سر پہ ڈوپٹہ ٹھیک کرتی ہے)

مہرو: (ٹھٹھک کر پھر ہنستے ہوئے) خالو تو پھر آئے گا۔۔ بابا۔۔ بابا نہیں ہے؟ (بھاگ کر کوٹھری میں دیکھ کر پوچھتا ہے) بابا کدھر ہے؟

اماں: کیا ہے لے کیوں ہر وقت بابا، بابا کرتا ہے — جب سے دوبار بابا کو آکر آدھا جین ملا گیا — بابا کو تو سیل سپالا چاہئے۔ ذرا کوئی بات ہوئی اور بگڑ کر گھر سے نکل گیا۔

مہرو: (خوب غرور سے ہنس کر) ادے بابا کا کام آیا ہے نانی —
(تینوں عورتیں کھل اٹھتی ہیں)

اماں: (آسمان کی طرف منہ اٹھا کر) اللہ! (ایک ہاتھ اٹھا کر مسکراتی ہے)

مہرو: (ادھر ادھر بے تابی سے گھوم کر) ماموں کھڑے گئے موٹر میں بیٹھ کر میں مسجد کے پاس کھڑا تھا۔

اماں: (حیرت اور خوشی سے ہاتھ بڑھا کر) موٹر میں بیٹھ کر گیا ہے تیرا ماموں؟
(جنت اور زینب بھی خوشی سے کھڑی ہو جاتی ہیں)

جنت: اب سب کیا؟

مہرو: ماموں نے چلتے وقت (دوقت) کہا جلدی سے بابا سے کہدے کھودنا شروع کر دے — اور کھودے بڑی۔

زینب: (آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ بڑھا کر جلدی جلدی) ہائے میرے لال تو نہیں جانتا بابا سویرے کا دو بڑھ کر گھر سے نکلا ہے تیرے سامنے ہی — ادھر کیا ڈھونڈنے آیا ہے۔ جا کھو کے اڈے پر دیکھ میرے چاند۔ بابا وہاں ہو تو اسے چپکے سے بلانا الگ اور دیکھ بکتو کے سامنے کچھ دکھیو — نہیں تو —

جنت: (کچھ بے حد بے تابی سے) ہاں وہاں نہ ہو تو پھر چونے کی دکان پر بھی دیکھنا۔ گھگے (جمعے) کی لالچ میں وہاں جمعہ دا یک آدھ بار جائے گا۔ ہائے جلدی کر مہرو۔ کہیں تو جمعہ در ہو گا بابا — (مہرو باہر کی طرف بھاگتا ہے۔ جنت پکار کر) اور دیکھ مہرو یوں ہنستا ہوا نہ جا۔ شاہ دین نہ تاڑ لے پرسوں کی طرح۔

مہرو: (ہاتھ اٹھا کر بھاگتے ہوئے) اچھا — اچھا۔
(جنت لوٹ کر اماں کی طرف آتی ہے جو ابھی تک آسمان کی طرف منہ اٹھائے مسکرا رہی ہے)

جنت: ارے اماں اللہ سے باتیں پھر کر لیجیو — ذرا تو بھی باہر ایک نظر مار کے دیکھ بابا نہیں کہیں پھر رہا ہو شاید۔
(اماں غصے سے سر جھٹک کر تیز تیز چلتی کوٹھری کی طرف جاتی ہے)

زینب: اے اماں ادھر کہاں — (حیرت سے اس کا راستہ روکتی ہے)

اماں: تیز زینب کا ہاتھ جھٹک کر بجلی کی بے تحاشا بجاشنے سے۔ (اندر جا کر دوسرے لمحے پھاؤڑا اٹھا کر کندھے پر اٹھائے بے حد شان سے صحن میں آ جاتی ہے)

زینب: (تقریباً چیخ کر) اماں! (پھاؤڑا ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتی ہے)

اماں: (آنکھیں نکال کر اور لفظ چبا چبا کر) کیا میں تیرے بابا کے انتظار میں بیٹھی رہوں گی؟ اس دن بھی تو تیرا بابا گھر سے روٹھا تھا اور شاہ دین نے اپنی جیب گرم کی تھی — تو چاہتی ہے آج بھی شاہ دین بیٹھے رہیں۔
(بڑے غرور سے بھرا اٹھا کر باہر چلی جاتی ہے۔ جنت اور زینب ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھتی ہیں۔ اور پھر جنت آنکھیں جھپکا کر ہنس پڑتی ہے)

جنت: (کچھ سنجیدہ ہو کر) اماں کھودے گی جینب؟

زینب: (سنجیدگی سے) اماں گھسے (غصے) میں ہو تو کیا نہ کرے۔! (رک کر) شاہ دین کی عورت نے دیکھ لیا تو کیا کیا باتیں نہ بنائے گی

جنت: ہنہ! باتیں بنائے گی تو بنالے۔ ہمیں کچھ دے تو نہ دے گی؟

زینب: (بے دھیانی سے دور دیکھتے ہوئے) کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا بس اللہ میاں دینے والا ہے۔ لوگ تو دوسروں کے منہ کا نوالہ چھیننے کو پھرتے ہیں۔

جنت: (ان سنی کر کے دروازے کی طرف جا کر) بابا تو نظر نہیں پڑتا اماں کیسے کرے گی اتنی جلدی۔ کیوں جینب (زینب) کل بابا نے ادھر ٹیلے پر تھوڑی کھدائی تو کی تھی — اماں بھی وہیں سے مٹی نکالے گی نا؟

زینب: ہاں — کل بابا نے کام پورا کر لیا ہوتا تو کوئی فکر نہ تھی۔ پر اسے کیا پتہ تھا کہ آج جمعہ ہی اللہ رزق بھیجے گا۔ (فکر مندی ہو کر دروازے کے پاس جنت کے قریب آ کر) دو جو بھی گھنٹے بھر سے تیرے ننھے کو لے کر باہر گئی تو اب تک نہ لوٹی — وہ ہوتی تو اس کو اماں کے پاس بھیجتی۔ بے چاری نے کب سے تمبا کو نہیں پی۔

جنت: (بے حد بے چینی سے) موٹر والوں کے سب کام جلدی کے

ہوتے ہیں۔ اماں بیٹھ کر ٹھکّہ (حقہ) پیئے گی تو کام کیسے بنے گا۔
دیکھو نیجو بس جرا (ذرا) میں آپہنچیں گے لے کر ــ میں نے
تو سنا یہ لوگ روتے بھی نہیں جی بھر کے۔ بس جلدی جلدی اٹھا
دیتے ہیں ــ

(جنت اس اضطراری کیفیت میں ہاتھ ملتی دروازے کے
پاس سے ہٹ کر اس جگہ دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے
جہاں پہلے اماں بیٹھی ہوئی تھی۔ دھوپ اب دیوار کے اوپری
حصے پر پہنچ چکی ہے ــ زینب بھی دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی
دوبارہ چولھے کے پاس بیٹھ کر آ نے میں تکیاں مارنے لگتی ہے)

جنت: (منمنا کر جیسے خود سے) بابا کو اتنا کھیال (خیال) نہیں کر میں سسرال
جانے کو بیٹھی ہوں، کیا کھاں ہاتھ جاؤں گی ــ آج ہی کے دن لیے
بھی روٹھنا تھا ــ کسی کو پھر اکھیال نہیں ــ سال بعد مائیکے
آئی، میری ساس نہیں پوچھے گی لا دکھا کیا لائی بابا بھیا کے گھر
سے؟ لے بھلا دیکھو تو ــ

زینب: اری جنت کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ میری بے باپ کی لونڈیا
بارہ برس کی ہو جائے گی اب کے رجب کے چاند۔ اس کے
بیاہ کے لئے تولہ بھر چاندی بھی کسی نے لھرید (خرید) کر نہ رکھی۔
(لمبی سانس لے کر مدھم آواز میں) بابا کے پاس تو اب محنت
کرنے کو ہاتھ پاؤں میں طاکت (طاقت) نہیں ایک زمانہ زمانہ
تھا اس جگہ ایک ایک دن میں دو دو تین تین کو دھرنے کا دھندا
کر لیتا تھا ــ کڑا کے کی سردی ہوتی یا تڑا کے کی گرمی ایسے دن
بابا پر رزق برستا تھا۔

جنت: بھیا کلّو کو جو بابا نے پڑھوا پڑھوا کر حافظ بنوایا تو کس کام کا ــ
نماج (نماز) وہ پڑھائے۔ گسل (غسل) وہ ڈال لے۔ مجید
(مسجد) کے امام صاحب بھی بڑے دل کے نہیں آج بھی دیکھو
آپ نہ گئے بھیا کو موٹر میں بھیج دیا۔ میرے ہوتے دو تین گسل
تو اس نے ڈالے۔ پھر اس کی کمائی کدھر جاتی ہے؟

زینب: (جل کر آنے پر دو ایک تھپڑے لگا کر کونڈی ایک طرف ہٹا کر)
ہٹو ست دیکھ حساب کتاب۔ میری لونڈیا تو سورج چھپے مرنے
ڈھونڈتی پھرتی ہے اور جرا بہت تیل اکٹھا کرتی ہے۔ وہی
تیل بیچ کر تو میں نے ایک شنون کی اوڑھنی کھرید دی۔ وہی تجھے

دیکھی اور اب بیٹھ کر بھائی کی کمائی کا حساب لینے لگی مجھ سے۔
(جھٹکے سے اٹھ کر دیوار پر ٹنگی لڑکوری اتارتی ہے اور آٹے
پر الٹی ڈھک دیتی ہے) اب تو سارے شہر کے لوگ بھی کم
ہی جلاتے ہیں۔ بس موم بتیاں۔ ان جلی موم بتیوں کا کیا
بنے؟

جنت: (نرمی سے) اری تو میں نے کب کہا کہ شنون کی اوڑھنی بھیا
نے لے کر دی ہوگی ــ تیل جوڑ جوڑ کر میں نے بھی چاندی کی
انگوٹھیاں نہیں بنائی تھیں سمجھے کیا پتہ تو تو ابھی جانے (زمانے)
میں اپنی سسرال میں رہتی تھی۔

(باہر سے جنت کے بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے
دونوں بہنیں ادھر متوجہ ہو جاتی ہیں۔ رجو جنت کے ننھے
کو کولھے پر لٹکائے اندر آتی ہے)

رجو: (ایک دم ہنس کر) اماں شاہو چچا کے گھر آج بھی گوشت پک رہا
ہے۔ (بچے کو اتار دیتی ہے)

زینب: اری دیوانی تو وہیں بیٹھی اب تک دو مردوں کی ہانڈی
سونگھ رہی تھی ــ میں نے جو مہرو کے پیچھے بھیجا تھا تجھے
(فضلو کے ہاں سے دال لے آ ــ

رجو: (اٹھلا کر) فضلو دادا نے کہا نہیں تھا مہرو سے پہلے ادھار کے
پیسے دو پھر کچھ اور ملے گا ــ (ایک دم ہنستے ہوئے) اماں
شاہو چاچا آج بھی پھاؤڑا لئے ادھر جا رہا تھا۔ (ہاتھ سے
سمت کا اشارہ کرتی ہے)

(زینب اور جنت چونک پڑتی ہیں اور اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی
ہوتی ہیں۔ زینب رجو کے قریب آکر مدھم آواز میں)

زینب: اری کب جا رہا تھا؟

رجو: ابھی ــ ادھر گیا ہے۔ (ہاتھ سے اشارہ کر کے یوں ہنستی
ہے جیسے خوش خبری سنا رہی ہو)

جنت: (اپنے سینے پر ہلکا سا ہاتھ مار کر) ہائے لٹ گئے ــ بس دیکھو شاہو
تاڑ گیا نا ــ اری جلدی سے جا رجو! بابا کو کہیں سے ڈھونڈ لا۔

رجو: (آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے) آں ــ بابا ــ بابا
کو ڈھونڈوں!

(دونوں بہنیں بھاگ کر اس سے پہلے دروازے پر پہنچ کر

باہر جھانکتی ہیں اور پھر پلٹ کر رجو کو دیکھتی ہیں)

زینب: (رجو کی پیٹھ پہ ایک ٹکہ مار کر) اری جا بھی جلدی سے۔ کیا مریل گھوڑی کی طرح چلتی ہے بدنصیب۔ تو ہی قسمت والی ہوتی تو بابا یوں بیکار رہتا۔

(رجو ہنستی مسکتی باہر غائب ہو جاتی ہے۔ جنت کا بچہ صحن میں بیٹھا رو رہا ہے۔ جنت پلٹ کر اسے گود میں اٹھا لیتی ہے۔)

جنت: بس جی زینب! دیکھ لیجیو آج کا دن بھی گیا۔

زینب: تو صبح صبح بابا کے سامنے اماں سے نہ جھگڑتی تو بابا کیوں گھر سے جاتا۔

جنت: واہ ری! — جھگڑتی نہ تو ویسے ہی! — پھر میں نے کہا ہی کیا تھا۔ بس اتنا ہی تو کہ اماں تو نے میرے لئے اوڑھنی تک نہ بنائی میری ساس تھو کے گی۔ بس اور تو کچھ نہ کہا تھا — اماں ہی نے چلانا شروع کر دیا — !

(مایوسی اور افسوس سے منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے اور چپکے چپکے اوڑھنی کے پلو سے آنکھیں پونچھتی ہے)

زینب: (گلوگیر آواز میں) تجھے نہیں معلوم بابا کے پاس کچھ ہوتا تو وہ تیرا منہ کھلواتے۔

جنت: مجھے کیا خبر (خبر) تھی بابا گمسم ہو جائے گا — ہائے اللہ میاں بابا کدھر گیا — (اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتی ہے اور اس کا بچہ زور زور سے دھاڑنا شروع کر دیتا ہے۔)

زینب: (جنت کو گلے لگا کر) اری تو رونے کیوں لگی؟ — واہ رونے کی کیا بات ہے — بابا یہیں کہیں ہوگا۔ اس کا روٹھنا کوئی نیا ہے — چل آنسو پونچھ — بچے کو دودھ دے۔

(جنت اور زینب چھپر تلے آجاتی ہیں — جنت کھاٹ پر بیٹھ کر بچے کو اپنا دودھ پلانے لگتی ہے۔ اور زینب گھڑے سے پانی انڈیل کر آٹے سے سنے ہوئے ہاتھ دھونے لگتی ہے)

جنت: (ایک دم پریشان سی ہو کر) اماں کھود رہی ہوگی۔ کیوں جنت؟

زینب: ہاں پر اُسے سانس کا دورہ نہ پڑ جائے۔ اس نے کہا ہے کہ ابھی چپہ بھر جمین بھی کھودی ہوگی۔

جنت: مہرو بابا کو ڈھونڈنے گیا اس سے اچھا تھا تو مہرو کو اماں کے ساتھ لگا دیتی۔

زینب: (ایک دم بھبھک کر) جنت کیا کہتی ہے تو؟

جنت: (اسی فکرمندی کے ساتھ) دو مل کر کھودتے تو شاید کام جلدی ہو جاتا۔

زینب: (چیخ کر آنکھیں نکالتے ہوئے) زبان کھینچ لوں گی تیری۔ جو مہرو سے تو نے یہی بات کہی۔ میرا مہرو کبھی اس پھاوڑے کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ سمجھ لے تو۔

جنت: (ہاتھ نچا کر اور منہ بنا کر) کیوں، تو اور تیرے بچے (اسی پھاوڑے کے صدقے وصدقے) میں کما کما کر جئیں۔ میری بڑھیا ماں بھی پھاوڑا اٹھا لے اور تیرا مہرو کانچ کا بنا ہوا ہے۔ وہ [illegible] ہاتھ لگائے گا پھاوڑے کو۔ وہ تو بڑا ڈپٹی ہے۔

زینب: بس جنت۔ بس جبان (زبان) روک لے۔ (یوں لگتی ہے جیسے یہ جنت کو نوچ ڈالے گی۔ مگر پھر ایک دم اپنا پلو آنکھوں پہ رکھ کر بیٹھ جاتی ہے)

جنت: لے بیٹھ کر کیوں ٹسے مار آگر — سچی بات جیو رکہوں گی۔

زینب: (روتے ہوئے) میں کیا کسی کو ماروں — اللہ نے مجھے ماردی۔ میرے دل سے یہ بات کیسے نکلے۔ ہائے مہرو کا باپ یوں [illegible] پھاوڑے سے کھودے گڑھے میں آپ دفن ہو گیا تھا۔

جنت: (قدرے نرم پڑ کر) ٹیلے تلے کی جمین (زمین) پولی [illegible] اوپر سے پانی جو برسا تو بیٹھ گئی — اللہ کی یہی مرجی تھی۔ کسی کا کیا [illegible] اپنے بابا نے عمر بھر یہی کام کیا۔ اور آج تو اماں بھی تیرے [illegible] کا پیٹ بھرنے کو گڑھا کھودنے پہنچ گئی — مگر تیرا بیٹا —۔

زینب: (چیخ کر) مت لے میرے بیٹے کا نام — (مارنے کو اٹھتی ہے)

جنت: (کھاٹ پر سے جلدی سے اٹھ کر پیچھے ہٹتے ہوئے) نہیں جیجوں کی شاہو آج بھی ہمارا رزق اپنے گڑھے میں ڈال لے اور میں نہ بولوں۔ تو نے تو مائیکے کو لوٹ لیا (پیچھے ہٹتی جاتی ہے)

(ایک دم بھاگتا ہوا مہرو ان کے درمیان آجاتا ہے)

مہرو: اماں! خالہ! بابا مل گیا۔ (خوشی سے گھوم کر ہنستا ہے)

زینب و جنت: (یک زبان ہو کر) بابا مل گیا — کہاں تھا۔

مہرو: پہلے فضلو دادا کی دکان پہ نہیں تھا — پھر فضلو دادا کی دکان پر آکر حکہ (حقہ) پینے بیٹھ گیا — بابا کا کام لگنے کی خبر سن کر فضلو دادا نے یہ ڈال دی ہے۔ ذکر تے کے دامن میں بنڑی

ہوئی پوٹلی کھول کر دوڑتا جاتا ہے اور دال ہانڈی میں الٹ دیتا ہے۔ پھر باہر کی طرف بھاگتا ہے)

زینب: (چلا کر) ارے او رے مہرو۔ جرا تو دم لے — بابا کے لئے روٹی تو لیتے جا۔ پتہ نہیں سویرے کا کچھ کھایا بھی اس نے کہ نہیں۔

(مہرو لوٹ کر اندر آتا ہے۔ تیر کی طرح کوٹھری کے اندر جاتا ہے اور ہاتھ میں ایک موٹی روٹی لئے اسی تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پھر اندر آتی ہوئی اماں سے ٹکرا کر غائب ہو جاتا ہے)

اماں: (پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ) ارے مشٹنڈے دیکھتا نہیں۔

زینب: اماں! (قریب جا کر اسے تھامنا چاہتی ہے)

جنت: اماں رجو کہتی تھی تھا ہو پھاوڑا لئے اپنی کوٹھری سے نکلا تھا ابھی۔

اماں: (ہاتھوں سے مٹی جھاڑ کر) اب کھودے گا اپنی اماں کی کبر (قبر)۔ ہاتھ دو ہاتھ مٹی تو میں نے ہٹالی۔ اس وخت (وقت) تیرا بابا ہزار جوان کا ایک جوان ہے آتے ہی جو دو چار پھاوڑے مارے تو کمر تک مٹی ہٹالی۔

(کمر کو اپنے ہاتھوں سے سہارا دے کر تنتے ہوئے۔ اری ذرا پانی تو پلا تیو جنت۔

زینب: اماں لیٹ جا میں تیری کمر دبا دوں۔

(اماں کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے اور زینب اس کی کمر دبانے لگتی ہے۔ جنت پانی کا کٹورا لئے آتی ہے اور اپنے بچے کو زمین پر بٹھا کر پانی اماں کو دیتی ہے۔)

جنت: لا اماں میں تیرے پاؤں دباؤں۔

اماں: رہنے دے تو تو میری چلم بھر دے۔ (جمائی لے کر) کتی (کتنی) دیر سے تماکو نہیں پی۔ (جنت حقے پر سے چلم اٹھا کر چولھے کے پاس جاتی ہے اور چولھا کرید کر واپس آجاتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر ادھر ادھر طاق پر اور کوٹھری میں کچھ تلاش کرتی ہے اور پھر دیا سلائی کی ایک تیلی حاصل کر کے آگ جلا دیتی ہے)

زینب: (کمر دباتے ہوئے) کیسے تو نے پھاوڑا اٹھایا ہوگا اماں!

اماں: ہنہہ! لے بھلا پھاوڑا اٹھانا بھی کچھ مشکل ہے۔

(اماں کھاٹ سے اٹھ کر پھاوڑا اٹھانے کی نقل کرتی ہے)

اماں: یوں پھاوڑا اٹھایا۔ یوں جمین پر مارا — بس اس طرح مٹی اٹھاتی اور ڈلدہ جھینک دیتی۔ آج تو تیرا بابا مجھے دیکھ کر حیران (حیران) رہ گیا۔ اب میرے آگے مرد کچھ کرنے کا بھی ہے

جنت: (چلم لاتی ہے) اماں زکٹو نے ہاتھاہو غصہ مجھے دیکھا تو نہیں؟

اماں: دیکھے تو میرا کیا بنا لے گا۔ عورت جات ہوئی تو کام نہ کروں؟ واہ اب آپ تک تیرے بابا کی انتجاری کرتی تو بس — ابھی ڈکیتو ٹرواڑوں کا کام ہے دم کے دم میں لے کر آجائیں گے۔

جنت: اماں آج تو اچھے پیسے ملیں گے بابا کو اور بھیا کو۔ ایک بار پہلے بھی موٹروالوں کا کام کیا تھا تو بیس نقد پیسے ملے تھے بابا کو

اماں: اللہ مالک ہے۔ (اماں حقے کے جلدی جلدی کش لیتی ہے — اور کھانستی ہے)

زینب: جا نی جنت تو دال چڑھا دے چولھے پہ۔ اتنا وقت ہو گیا۔ بچے بھوکے ہوں گے۔

جنت: جا تو ہی چڑھا دے (کھاٹ پر بیٹھنے لگتی ہے۔)

زینب: پھر کل کی طرح تو کہے گی کہ میرا میاں آنے والا تھا دال میں آٹا (آٹا) پانی ڈال دیا جینب نے — تو آپ ہی ہانڈی روٹی دیکھ۔

جنت: (ٹھنک کر) نہیں کروں گی۔ تو کوئی میرے میاں سے جلتی ہے؟ میں نے ہنسی میں کہی تھی بات۔ (بے حد محبت سے) جا تو ہانڈی روٹی کر لے جلدی جلدی میں اماں کو دباتی ہوں۔

زینب: (ایک دم بگڑ کر) کیوں تو کوئی بڑی لاٹ صاحب ہے۔ میں روج ہانڈی روٹی کروں۔ ایک دن تو کر لے۔ میرے ہاتھوں میں کوئی کانٹے لگے ہیں جو میں اماں کو نہ دباؤں؟

جنت: (تیز ہو کر) میں یہاں کوئی بیٹھی رہوں گی۔ ننھے کا ابا آج پہنچے گا تو کل مجھے لے جائے گا۔ پھر تو اکیلی خوب کھدمت کر لیجیو اماں کی۔

زینب: (چلا کر) چل چل بڑی آئی کھدمت کرنے والی۔ کل بابا اور بھیا کا کام لگا تو تجھے جھٹ آئی اماں کی۔ نرقعہ تو ٹانگ پسارے کھاٹ پر بیٹھی رہتی تھی۔

جنت: (روہانسی ہو کر) [illegible] سہے جنیب۔

سونے کے جھمکے اور سونے کا تعویذ دیا تھا۔ اور پانچ تھان میں سیر بھر چاندی کے کڑے ـــ مجھے تو ماشہ بھر سونا بھی نہ دیا۔

اماں: (زینب کی طرف فریادی انداز سے مخاطب ہو کر) ـــ لے سن جرا ـــ (جنت سے) اری تیرے دولہا کو تولہ بھر سونے کی انگوٹھی نہیں دی تھی۔ اس پہ اللہ مارا کمبخت بھروسنے کے لیے سنار نے روپیہ الگ لیا تھا۔ بول اب بول ذرا ـــ وہ انگوٹھی کیسے بھولے گی وہ تو تیرا دولہا اب تک پہنے پھرتا ہے۔

جنت: (لاجواب سی ہو کر) میرے بیاہ کی انگوٹھی تو جان (زبان) پہ دھری ہے اور جینب کے سونے کے جھمکے اور تعویذ بھول گئی۔
(بچے کو دوپٹے کے اندر چھپا کر دودھ اس کے منہ میں دے دیتی ہے اور ماں کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاتی ہے)

اماں: یہ جینب کی کسمت (قسمت) تھی۔ جب جینب کا بیاہ ہوا تو کتنی کمائی تھی۔ بستی میں بیماری پھوٹی تھی۔ رات دن تیرے بابا کی پکار پڑی رہتی تھی۔ لوگ تیرے بابا کی خوشامد کرتے تھے۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) کیا رزق برسا تھا۔ اپنے ڈاکٹر بابو نے اس کے بعد ہی تو موٹر کھریدی تھی۔ اور ہم نے جینب کا بیاہ کیا تھا ـــ (ٹھنڈی سانس لیتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھتی ہے)

زینب: اور جب تیرا بیاہ ہوا تھا کتنا مندا تھا۔ بابا دو دو دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا۔ بابا تیری کھاتر (خاطر) ڈاکہ ڈالتا!

جنت: (تڑپ کر) بڑی آئی مجھے بدکسمت کہنے والی جبھی تو شاہ دین اور رگھو نے پہلی نئی نئی جھونپڑیاں ڈالی تھیں ـــ رگھو نے میرے بیاہ سے آٹھ دن پہلے اپنے بیٹے کا بیاہ کیسی دھوم سے کیا تھا۔ گیس کے ہنڈے جلے تھے تو کیا رگھو نے ڈاکے ڈالے تھے۔

(اماں ایک دم پھونک کر یوں ہاتھ بڑھاتی ہے جنت کی طرف جیسے مشاعرے میں پرانے لوگ داد دیتے ہیں)۔

اماں: واہ لے اب تو نے آپ ہی جھگڑے کی جڑ پکڑ لی ـــ (ہاتھ پہ ہاتھ مار کر) دیکھ پہلے بابا اکیلا تھا اپنے کام میں ـــ پھر شاہ دین اور رگھو آ گئے۔ رزق بٹ گیا تا۔ اب بتا تیرے بابا کا کیا کسور ہو گئے سونے کے جھمکے نہ دے۔ بول اب!
(جنت لاجواب ہو کر رو پڑتی ہے)

اماں: (جنت کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے) اری دیوانی بالک کے لئے تو اور جینب برابر ہیں۔ اللہ سے دعا کر بابا کا کام چلے۔ بیٹیاں تو سدا ماں باپ سے لینے کا حق رکھتی ہیں۔ اب کی تیرے گھر بیٹا ہوا تو سونے کے جھمکے لیجیو۔

جنت: (بچوں کی طرح مچل کر) آج بھیا موٹر میں گیا ہے گسل ڈالنے۔ اسے ضرور روپے بھی ملیں گے اور کوئی انگوٹھی چھلا بھی۔ پر دیکھ لینا وہ مجھے روپیہ بھی ٹکا دے تو کہنا۔ چھپالے گا اپنی کمائی ـــ میرے ننھے کا ایک نیا کرتہ بھی بننا ہے اور میری اوڑھنی بھی ـــ پر دیکھ لیجیو تو اماں کچھ بھی نہ بنے گا۔ اور میری ساس طعنے مارے گی۔

زینب: (چولھے پر ہانڈی میں ڈوئی پھیرتے ہوئے) بابا کو کیا ملے گا؟ آٹا بھی کل کھتم ہے۔ نفضلو پرچونئے کا ادھار بھی لوٹانا ہے۔ ابھی تو اماں نے کہہ دیا کہ جینب بابا کے پیسے لے گی ـــ لے گی جب تا کہ بچ جائے ـــ میری رجو بارہ سال کی ہو رہی ہے بابا نے اس کے بیاہ کے لئے ایک کرتہ بھی نہ کھرید کر ڈالا۔

اماں: (حقے کا ایک لمبا کش لے کر) اری دیوانیو، اپنی اپنی پھکر میں یہ بھول گئیں کہ کام موٹر والوں کا ہے ـــ اللہ کرے گا تو کل ننھے کا نیا کرتہ اور جنت کی اوڑھنی لیں گے۔ اور رجو کے لئے کرتے کا کپڑا بھی۔

زینب: (گھبرا کر) اور مہرو کے لئے تہمد؟

جنت: (خوشی سے مسکرا کر) اور میرے لئے نئی چوڑیاں بھی اماں
(اسٹیج پر شام کا اندھیرا چھا جاتا ہے ـــ اسی اندھیرے میں رجو دھیرے دھیرے پر اسرار انداز سے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے پہلے اپنا سر کھسوٹتی ہے اور پھر ہاتھ اٹھا کر کے اپنی پیٹھ کھجاتی ہے)

رجو: بابا مل گیا اماں؟ (دھیرے سے ہنستی ہے)

زینب: اری تجھے اب کھبر لگی؟ کہاں پھر رہی تھی اب تک۔

رجو: آج کسی نے دیا نہیں جلایا، پونڈیر تیل بھی نہیں ملا۔

زینب: چل دفع کر دیوں کو ـــ تو بیٹھ کر اماں کو دبا۔
(رجو اسی طرح کھڑی سستی سے اپنی پیٹھ کھجاتی رہتی ہے)
(اندھیرا بڑھ جاتا ہے)
(ایک دم مہرو بھاگتا ہانپتا ہنستا اندر آتا ہے ـــ اور دیوار پر ٹنگی ہوئی سیاہ لالٹین کو اتار کر واپس باہر جانے لگتا ہے

زینب اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔)

زینب: او رے مہرو کدھر چلا۔

مہرو: (ٹھٹھک کر) وہ لوگ آ گئے لے کر۔ مسجد میں بڑا مولوی نماج پڑھا رہا تھا۔

اماں: ان کو تو آنا ہی تھا۔ بابا نے کام ختم کر لیا؟

مہرو: (باہر کی طرف قدم اٹھا کر۔ جرا سی مٹی اور نکالنا ہے۔ اندھیرے میں بابا کو نجر نہیں آ رہا۔

جنت: ارے بتی جلا تو لینے دے۔ (مہرو کے ہاتھ سے لالٹین لیکر اسے روشن کرتی ہے اسٹیج پر ایک لمحے کو روشنی ہوتی ہے اور پھر مہرو کے پھرتیلے پیروں کے ساتھ یہ روشنی غائب ہو جاتی ہے اور اسٹیج پر گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے)۔

[ایک لمحے کی خاموشی اور اندھیرے میں قریب کسی کتے کے رونے کی صدا بلند ہوتی ہے اور پھر اسٹیج پر روشنی ہو جاتی ہے ۔ وہی منظر ہے۔ طاق پر رکھا چراغ مدھم سی روشنی دے رہا ہے۔ چھپر تلے اب تین کھاٹیں بچھی ہوئی ہیں۔ بابا مٹی کے بدھنے سے ہاتھ دھو کر اپنے تہمد سے ہاتھ اور منہ خشک کر رہا ہے۔ مہرو اور رجو کے سامنے کھاٹ پر المونیم کی پلیٹوں میں روٹی پڑی ہے۔ مگر وہ کھا نہیں رہے ہیں۔ زینب چولہے سے آگ نکال کر چلم میں رکھ رہی ہے اور جنت چپ چاپ اپنے ننھے کو میلے لحاف میں لئے کھاٹ پر بیٹھی ہے۔)

رجو: (روٹی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے) شاہو چاچا کے ہاں گوشت پکا ہے آج بھی۔ (ہنستی ہے)۔

مہرو: ہمارے گھر کل پکے گا۔ کیوں بابا؟

بابا: ہوں — ہوں

جنت: (جل کر) ہاں پانچ روپے ملے ہیں بابا کو کل تک سب کر لو اپنے لئے۔

زینب: (چلم اٹھا کر بابا کے قریب آتے ہوئے) سن لے بابا۔

بابا: ہوں — (چلم لے کر کوٹھری میں چلا جاتا ہے)

(چند لمحے کو سب خاموشی سے ایک دوسرے کو شکایت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ باہر کوئی کتا روتا ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں بڑھ جاتی ہے۔ زینب اپنے بچوں والی

کھاٹ پر ٹک جاتی ہے)

زینب: ارے روٹی نہیں کھاتے تم دونوں۔ (رجو بھنکے پن سے ہنستی ہے)

مہرو: نانی آئے گی پھر کھائیں گے۔

زینب: (فکرمند ہو کر) رتی (اتنی) دیر ہو گئی اماں نہیں آئی۔ مسجد اتنی دور بھی نہیں۔

جنت: کیوں رے مہرو تونے اچھی طرح دیکھا تھا تیرا ماموں لوگوں کے ساتھ نہیں آیا تھا؟

مہرو: نہیں۔ بالکل ماموں آیا ہی نہیں

جنت: (اداس لہجے میں) آتا کیسا۔ سمجھا ہوگا گھر گیا تو بہن کو کچھ دینا پڑے گا۔

رجو: (ہنس کر) ماموں آج "سلیما" گیا ہوگا کھالہ۔

زینب: (ڈر کر) شی! — چپ! بابا سن لے گا تو بھیا سے رات ہی کو جھگڑے گا۔ ایک بار پہلے کتا (کتنا) جھگڑا ہوا تھا، مردار، بھول گئی — (اپنے آپ سے) بابا نے سچ تو کہا تھا میں نے تجھے حافج (حافظ) مولوی بنایا اور تو "سلیما" جا کر گندہ ہوتا ہے۔

رجو: سلیما کیسا ہوتا ہے اماں؟

مہرو: ہا — تجھے نہیں معلوم۔ میں بتاؤں تصبیریں (تصویریں) ناچتی اور گاتی ہیں —
(بیٹھے بیٹھے کمر پر ہاتھ رکھ کر تھرکتا ہے) "آجا مورے بالما تیرا انتجار ہے"

زینب: (ہنستی ہے اور مہرو کو دھمکانے کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہے) چپ بے حیا۔ بابا سنے گا تو چمڑی ادھیڑ دیگا تیری۔

جنت: (تھکے ہوئے اداس لہجے میں) جو جس کی مرجی ہو کرے میں اب کے جاؤں تو آ کر منہ نہ دکھاؤں گی کبھی — اماں کہہ رہی تھی آج جیادہ پیسہ ملے گا۔ بابا نے آ کر پانچ دکھائے۔ بھیا نے صورت بھی نہ دکھائی آ کر۔

زینب: کیوں ایسی باتیں کرتی ہے بھیا کوئی برا ہے — دیکھیو لیجیو اس کو جمعہ دار اچھے پیسے ملے ہوں گے۔

آنے دے، اسے کوئی کام پڑ گیا ہوگا جواب تک نہ آیا۔

(دور کسی کے کھڑاؤں کی آواز آتی ہے۔ مہرو دوڑ کر دیوار سے جا لگتی ہے۔ اور شور مچاتا ہے)

مہرو: مائی آگئی۔

(اماں کھڑاویں بجاتی لالٹین جھلاتی ہانپتی اندر آجاتی ہے۔ جنت بے چینی سے لحاف سر سے اتار دیتی ہے۔ سب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہیں۔ اماں کسی کی طرف دیکھے بغیر بیچ والی کھاٹ پر بیٹھ کر اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتی ہے)

بابا: (کوٹھری کے دروازے پر حقہ اٹھائے آکر) آگیا گلو؟

اماں: (ہاتھ سے نہیں کا اشارہ کرتی ہے اور بے حد دل جمعی سے ہانپتی رہتی ہے)

بابا: کیوں نہیں آیا۔ کدھر گیا۔ حرام جادہ مجھے کرنے۔ آنے دو آج ادھیڑ کر رکھ نہ دیا ہو تو خیرو نام نہیں۔

اماں: (سانس ٹھیک کر کے) کیوں ادھیڑے گا میرے لال کو۔ بہت تیرے دس پانچ بیٹے ہیں جو مارے گا میرے گلو کو۔

بابا: (دھاڑ کر) جان نکال لوں گا جو بیٹے کی طرف سے بولی (ماں نے کو بڑھتا ہے)

(زینب اور جنت ایک دم بیچ میں آجاتی ہیں۔ زینب باپ کے ہاتھ سے پٹ جاتی ہے۔ مہرو رونے لگتا ہے اور رجو مہرو کی طرف دیکھ کر منہ پھیر کر ہنستی ہے)

بابا: چھوڑ دے مجھے آج بتاؤں بڑھیا کو بیٹے کی طرفداری کرتی ہے۔

اماں: (بابا کی طرف بڑھنے کی جد و جہد کرتے ہوئے) لے آج دل کا ارمان نکال لے۔ آ مار مجھے۔ مگر خبردار جو میرے بیٹے کو کچھ کہا ــــ ہاں۔ (جنت ماں کو پیچھے ڈھکیلتی ہے)

بابا: (ہوا میں گلے چلا چلا کر) ایک بیٹا ہے یہی سوچ کر میں نے کہا اس سے کیا پھاوڑا اٹھواؤں، آپ محنت کی اور اسے مولبی کے پاس بٹھا دیا۔ اب کسی لائک (لائق) ہوا تو کمائی اپنی جیب میں ڈال کر سیلے دیکھتا پھرتا ہے۔ اور تو اس کی طرفداری کرتی ہے میت کے کپھن (کفن) کا خون تھا۔ جس پر اس نے گسل ڈالا۔ یہ تو نہیں کہ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والا ہو جو گھر والے پہلے سے انگوٹھی چھلے اتار لیں۔

اماں: (بات کاٹ کر) ہاں تو میں کب کہتی ہوں کہ اسے انگوٹھی نہیں ملی ــــ پھر تجھے کیا؟

بابا: مجھے کیا؟ آکر کہہ دے گا کچھ نہیں ملا۔ اچھا میں اس کی ہڈیاں نہ توڑ دوں تو کہنا ــــ بہن سسرال جانے کو بیٹھی ہے اور تو کہتی ہے مجھے کیا؟

جنت: (اماں کو چھوڑ کر بابا کے قریب جا کر ہنستے) بابا، اماں ہی کو کھیال نہیں میرا تو مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

زینب: میرے بچوں کا کسی نے خیال کیا کبھی؟

بابا: (آپے سے باہر ہو کر) بتا تجھے سونا دکھا کر کدھر گیا؟ بتا وہ آیا کیوں نہیں۔

اماں: (بے تعلقی سے) مولبی کے پاؤں دبا رہا ہے۔ مولبی چاہتا تو آپ جاتا موٹر میں بیٹھ کر۔ چاہتا تو دوسرے لڑکوں کو بھیجتا اب میرا بیٹا مولبی کے پاؤں نہ دبائے تو تیرے دبائے۔

بابا: (اور بھڑک کر) میت نہلا کر جب سے پاؤں دبا رہا ہے۔ مجھے بناتی ہے بڑھیا۔ بول کہاں گیا تیرا بیٹا۔

(اماں بڑے غرور سے بابا کی طرف بڑھتی ہے اور بے پروائی سے اس کے ہاتھ سے حقہ لے کر ایک کش لگاتی ہے)

اماں: سنار کے پاس گیا تھا انگوٹھی لے کر سیدھا۔ اس کی دکان بند تھی۔ پھر اس کے گھر گیا کہ تلوا کر کسوٹی پر پرکھوا لے۔ دیر نہ لگتی تو کیا ہوتا؟

(بابا ایک دم کوٹھری کی دھلیز پر بیٹھ جاتا ہے اور لاجواب ہو کر حقہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اماں اسے حقہ پکڑا کر یوں کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے جیسے سارے جہان کی دولت اس کے قدموں تلے پڑی ہو)

جنت: (خوشی سے بمشکل آواز نکالتے ہوئے) اماں! سونے کی ہے؟

زینب: (خوشی سے آنکھیں پھاڑ کر جیسے اپنے آپ سے) اور چاندی ہوتی تو بھیا یوں مارا مارا پھرتا؟

(ہوش میں آکر رجو سے) اٹھ اماں کے پاؤں دبا رجو! اماں مسجد سے چل کر آئی ہے۔ رجو ہنستی ہے اور بیٹھی رہتی ہے)

(باہر کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے، ساتھ ہی جوتوں کی چاپ)

زینب: گلو بھیا آرہا ہے۔

(جنت جھپٹ کر لالٹین اٹھاتی اور دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ اس کے پیچھے زینب اور مہرو بھی دوڑتے ہیں،

جنت: (چلا کر) بھیا مٹی کے ڈھیر دیکھ کر۔ ٹھوکر نہ کھائیو۔

مہرو: (خوشی سے اچھلتے ہوئے) ماموں آگیا۔ ماموں آگیا۔ بابا، بابا!

(گلو بھاری بھاری قدم رکھتا جھومتا جھامتا اندر آتا ہے۔ وہ سب اسے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیتے ہیں۔ گلو چھپر تلے ایک دم کھاٹ پر یوں لیٹ جاتا ہے جیسے بہت تھکا ہوا ہو۔ زینب، جنت سے آگے بڑھ کر پوچھتی ہے)

زینب: بھیا روٹی کھالے گرم گرم دال پکی ہے۔

گلو: کھالوں گا۔ بہت تھک گیا آج تو (ٹانگیں اور ہاتھ اکڑا کر ایک جما ہی لیتا ہے۔ اور پھر کھاٹ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے)

زینب: (ہنستے ہوئے بڑے پیار کے ساتھ) لے بھلا حافظ مولوی ہوگیا۔ جھوٹ بولنے کی عادت نہ گئی تیری۔ کیا مجھے معلوم نہیں موٹر میں بیٹھ کر گیا تھا غسل دینے۔ لا پاؤں دبوانے کو جی کرتا ہو تو دبا دوں۔ (گلو کی طرف جھکتی ہے)

گلو: (پاؤں سمیٹ کر) نہ ــــ نا آپا۔

جنت: مجھ سے دبوالے، بھائی چھوٹا ہو تب بھی بہن سے بڑا ہی ہوتا ہے۔ (جنت گلو کی طرف جھکتی ہے)

اماں: دبوالے میرے لال، کہاں کہاں مارا پھرا ہے تھک گیا ہے۔

بابا: (اماں سے مخاطب ہو کر) ہاں تیرا لونڈا بڑے کنویں کھود کر آیا ہے۔ جو بیٹھا ٹانگیں اینٹھا رہا ہے۔ (دونوں بہنیں سیدھی ہو کر غصے سے بابا کو دیکھتی ہیں۔ اماں کچھ کہنے کی کوشش میں کھانسی کا شکار ہو جاتی ہے)

گلو: (رنجیدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) بابا تجھے اپنا کام دکھتا ہے دوسرے کا نہیں۔ تو قبر کھودتا ہے میں گندے مرے مردے نہلاتا ہوں۔

(جھر جھری لے کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بدلی ہوئی خوفزدہ آواز میں) توبہ الٰہی توبہ۔ کیا بری میت نہلائی ہے آج

مہرو: ماموں موٹر والوں کی میت بھی گندی ہوتی ہے۔

رجو: (ایک دم بے تکے پن سے ہنس کر) کیوں ماموں، موٹر والے تو روز تیل کے دیئے جلائیں گے قبر پر؟

گلو: (دونوں بچوں کی طرف دیکھ کر ایکدم چیخ پڑتا ہے) موٹر والے۔ موٹر والے (آواز دھیمی کر کے) وہ تو موٹر والوں کو خدا کا خوف تھا۔ کل ان کی موٹر تلے آکر کچلا گیا تھا۔ غلطی مرنے والے کی تھی، پھر بھی ان موٹر والوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحم ڈالا انہوں نے پولیس سے کہا سنا اور لاش ہسپتال سے اٹھا لائے کہ ہم آپ کفن دفن کریں گے ــــ ایسے بھی اچھے لوگ ہوتے ہیں دنیا میں۔ (ایک لمحہ رک کر) بابا! قسم ہے اللہ پاک کی منہ تو بالکل پچکی ہوگیا تھا۔ پانی پہ پانی ڈالتا گیا۔ پھر بھی خون ہی خون۔ (جھر جھری لے کر منہ پہ ہاتھ پھیرتا ہے)

بابا: (جھلا کر) جیادہ نقشے (نخشے) نہ کھینچ وہ تو قبر میں آتے وقت کفن پہ خون میں نے بھی دیکھا تھا ــــ یہ بتا تو تھک کیسے گیا۔

اماں: واہ رے بڈھے، میں نے نہیں بتایا کہ سنار کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ لے حقہ پی۔ پھر یاد آجائے گا۔ (حقہ اٹھا کر بابا کے سامنے رکھ دیتی ہے اور بابا غصے میں دو ایک لمبے لمبے کش لیتا ہے)

زینب: ہا ــــ کون تھا مرنے والا؟

گلو: جانے کون تھا۔ موٹر والے صاحب کہتے تھے اس کی جیب سے پانچ روپے اور گڑ کی گجک نکلی تھی۔ گجک اور روپے سے کسی کا کیا پتہ نشان ملتا۔

اماں: (بے حد دانشمندی سے سر ہلا کر) اور کیا ــــ ٹھیک تو ہے۔

جنت: (ایک دم ہنس کر) اور انگوٹھی جو تھی اس کے ہاتھ میں اس کا جکر (ذکر) نہیں کرتا بھیا۔ ڈرتا ہے جنت کو کچھ نہ دینا پڑ جائے۔ اس واسطے نا! (اٹھلا کر گلو کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) لا میں بھی دیکھوں انگوٹھی۔

گلو: (جلدی سے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں چھپا لیتا ہے) چل چل میرے پاس نہیں ہے انگوٹھی۔

جنت: تو میں کھا جاؤں گی تیری انگوٹھی۔ (روٹھ کر بچوں کی طرح ہونٹ لٹکا لیتی ہے لیکن ہاتھ پھیلائے رکھتی ہے)

گلو: (کچھ سنجیدگی اور کچھ ہنسی سے) اماں دیکھو جنت کو — ہر حال آکر یہ لاڈ وہ لاڈ کرنے لگتی ہے۔

جنت: (ایک دم غصے میں آکر) دیکھ لے اماں کیا کہہ رہا ہے بھیا —

اماں: ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ جا کل شگون کی اوڑھنی لا دے گا تیرے لئے — اب بھیا کے بیاہ کے لئے بھی کچھ رہنے دے گی یا نہیں۔

جنت: (آگ بگولہ ہوکر) میں نے کیا لیا تیرے گھر سے — جیب کو سونے کے جھمکے دیئے تھے — میں یہ انگوٹھی لوں گی آج۔ لا مجھے انگوٹھی دے — (گلو کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے) (ایک دم بابا خیرو کوٹھری کی دہلیز سے اٹھتا ہے، سامنے پڑا حقہ ہاتھ سے الٹ دیتا ہے اور پھر گردن اور ہاتھ ہلاتے گلو کی طرف تول تول کر قدم بڑھاتا ہے)

بابا: (گمبھیر آواز میں) انگوٹھی مجھے دے۔

گلو: بابا اس انگوٹھی سے میں —

بابا: (چیخ کر) انگوٹھی مجھے دے (خوفناک انداز سے دونوں ہاتھ گلو کی طرف بڑھاتا ہے — گلو کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی جیب کو بازو سے چھپا لیتا ہے)

بابا: مجھے دے نہیں تو — نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا تیرا۔ (سب دم بخود بابا کو دیکھتے ہیں گلو کے ہاتھ پیچھے گر جاتے ہیں۔ بابا اپنی اکڑی ہوئی انگلیاں اس کی جیب میں ڈال کر انگوٹھی نکال لیتا ہے۔ اماں، باپ بیٹے کے بیچ میں آنے کی کوشش کرتی ہے مگر بابا اسے زور سے دھکا دیتا ہے۔ وہ اس خوفناک اور پر اسرار آہستگی سے لالٹین کی طرف انگوٹھی والا ہاتھ بڑھاتا ہے اور انگوٹھی کو غور سے دیکھ کر زور سے کہتا ہے)

بابا: اللہ (انگوٹھی ہاتھ میں لئے چھپر تلے سے نکل کر صحن میں رینگ آتا ہے)

بابا: (آہستہ آہستہ) اللہ! اللہ!

گلو: (اس کے پیچھے آکر غصے سے) بابا یہ میرا حصہ ہے

بابا: (لاڈ دارانہ طریقے سے) یہ پوری تولہ بھر ہے نا — (گلو اثبات میں سر ہلاتا ہے)

بابا: اور اس پہ اللہ تعالیٰ کا نام کھدا ہوا ہے نا — تو نے اسے نہلایا یہ تجھے مل گئی میں نے کبر کھودی، پانچ روپے میرے حصے میں آگئے۔ اور گجک — اور گجک — (ایک دم پاگلوں کی طرح ہنستے اور چیختے ہوئے) جنت او جنت تیرے ننھے کو گڑ کی گجک لا دوں۔ اس کے حصے کی گجک موٹر تلے آگئی — بابا — (انگوٹھی اوپر اٹھا کر دیکھتا ہے اور پھر اسے زمین پر گرا کر باہر نکل جاتا ہے۔ جنت لالٹین لے کر دوڑتی ہے اور انگوٹھی اٹھا کر دیکھتی ہے۔ اس کے ہاتھ سے لالٹین گر جاتی ہے اسٹیج پر گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے باہر سے بابا کے قہقہوں اور کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سب مل کر روتے ہیں۔ اندھیرے بڑھیا اماں کے بین کی صاف صدا آتی ہے۔

اماں: ارے میرے لال — پڑوس میں ہو! بولو تو ذرا —!

(پردہ)

افسانہ:

کہی، ان کہی

دیوندر ستیارتھی

اس وقت میں آپ کو ایک واقعہ سنانے جا رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے ایک کہانی بھی سمجھ سکتے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اب وہ گوٹے والا بابا میری یاد کی دہلیز پر اسی طرح کھڑا رہے گا۔ آپ بھی اس زندہ کردار کو خوب پہچان لیں۔ شاید کہیں اس سے آپ کی ملاقات ہو جائے۔ سر پر بھاری بھرکم پگڑی، کندھوں پہ چادر، آنکھوں میں اداسی، چہرے پر کسی سے ملنے کا اشتیاق۔

میں نے اس کا نام نہ پوچھا، اس کا تو مجھے کوئی خاص افسوس نہیں۔

اس کا لہجہ بہت سہما ہوا تھا، پھر بھی معلوم ہوتا تھا کہ اب اسے اپنے سامنے ایک نیا مستقبل نظر آ رہا ہے۔ آجکل اسی طرح کے کردار مجھے پسند آتے ہیں، جن کے دائیں بائیں کھڑا ہو کر میں اپنے نظریے کا جائزہ لے سکوں۔

گوٹے والے بابا کو میں نے قد میں اپنے سے بہت بلند پایا۔ حالانکہ ہماری ملاقات پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی نہایت مختصر۔

بجلی کی روشنی لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ یقین کیجیے چودہ برس بعد لاہور کا یہ روپ دیکھنا مجھے میسر ہوا تھا۔ اور میں بہت خوش تھا۔ اپنی کلپنا میں مجھے دور تک دئیے ہی دئیے نظر آ رہے تھے جیسے پرانی یادوں کی گلیوں میں بزمِ چراغاں کا منظر پیش نظر ہو۔ سچ جانیے۔ وہ گوٹے والا بابا بھی کسی چراغ کی لو کی طرح لپک کر سامنے آ گیا۔

میرے ساتھ ایک صاحب تھے، جو کہانیاں لکھتے ہیں۔ اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے لاہور کے ایک کالج کی بزمِ ادب میں ہم اکٹھے ہوئے، جہاں ایک کہانی پڑھی گئی۔ وہ کہانی میری ہی لکھی ہوئی تھی۔ اور بحث کے دوران میں میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کی تخلیق میں میں نے اپنی بڑھیا ساس کو سامنے رکھا تھا جس کی ذہنی الجھن یوں شروع ہوتی تھی کہ بیٹی کے گھر کا تو پانی بھی نہیں پیتے اور وہ ایک پاپن کی طرح سوا سال سے بیٹی کے گھر میں روٹیاں توڑ رہی ہے۔

بحث میں ایک صاحب بولے کہ ایسے کردار تو ہمارے معاشرے سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور اب نئی پود کے سننے اور پڑھنے والے اس طرح کی چیز سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اور اس کے جواب میں میں نے صرف اتنا عرض کیا تھا کہ کسی بھی کہانی کا خاکہ ایک ایسی وحدت ہے جسے تخیل کی مدد کے بغیر مرتب کرنا ناممکن ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ ایک کہانی کا وجود بھی ادراک کی آگہی کی سوگند کھاتا ہے تو پھر اسی ادراک کی آگہی کے بل بوتے پر آپ کسی کہانی کا جمالیاتی حظ حاصل کر سکتے ہیں۔ بزمِ ادب سے اٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچنے تک ہم اسی بحث میں الجھے رہے کہ کیسے ایک کردار یا واقعہ کو لے کر کہانی کا تانا بانا بن ڈالتے ہیں اور پھر کیسے ہمارے کردار ہمارے ساتھ سانس لینے لگتے ہیں۔ اور جناب کچھ ایسی ہی ہماری ذہنی کیفیت تھی، جب گوٹے والے بابا سے ملاقات ہوئی۔

جیسے کسی جانے پہچانے رنگ نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔ اور مجھے یہ احساس ہوتے دیر نہ لگی کہ بلانے اور سننے والے میں سب دوریاں مٹ چکی ہیں — اور لفظوں کو توڑے مروڑے بغیر ہی میں اس رات کی بات کہہ رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرے اور میرے اور میرے دوست کے ذہن میں ان گنت احساسات رچ بس گئے، جب گوٹے والے بابا سے ہماری ملاقات ہوئی۔

یہ پوچھنے کا تو سوال ہی نہ تھا کہ بابا تمہاری تعلیم کہاں تک ہوئی۔

نہ یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ تم نے مٹی میں ہاتھ ڈالا اور وہ سونا ہو گئی۔

لمبا اونچا قد، پاؤں میں دیسی جوتی، گھنی بھر داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، خوش گفتار گوٹے والے بابا کی یہ باتیں تو اب ہمیشہ یاد رہیں گی—

جیسے کوئی گیت جاگ اٹھا۔ بابا کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اور ہاتھوں میں پھولوں کی باس نزدیک آتی گئی۔

اس گوٹے والے بابا کی آنکھوں میں وہ جوت تھی، جو کسی سچے سچے دل کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ یہ بات تو پہلی ہی نظر میں کھل گئی کہ گوٹے والے بابا کو غصہ بالکل نہیں آتا ہوگا۔

ہم دونوں ایسے ملے جیسے دو پربت گلے ملیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا میرا ساتھی بھی گوٹے والے بابا کی شخصیت کی چھاپ محسوس کر رہا تھا۔

اب سنیئے! قصہ یوں ہوا کہ میں نے دور سے دیکھا ایک بوڑھا میری طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھانا چاہا۔ وہ جواب میں مسکرایا۔ لیکن میں نے مسکرانے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی۔ اب وہ بوڑھا میرے قریب آچلا تھا اس نے بازو پھیلائے۔ اب میں بھی جواب میں بازو پھیلائے بغیر نہ رہ سکا۔

اور پھر ہم گلے لگ کر ملے۔

میں نے کہا "پیچھے کہاں سے آئے بابا؟"

"پٹیالے سے؟"

میں دوبارہ بابا سے گلے لگ کر ملا۔ اور میں نے کہا "اچھا تو آپ پٹیالے سے آئے نا بابا! میرا گاؤں بھی تو کبھی پٹیالے میں ہی تھا۔"

"بچھڑے ساتھی مل ہی جاتے ہیں" اس نے ہولے سے کہا۔

اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آواز بزمِ چراغاں بن اٹھی۔

میں نے پوچھا "یہاں کہاں رہتے ہو تم؟"

وہ بولا "سکھر میں۔"

"وہاں کیا کرتے ہو؟"

"رسیاں بانٹتا ہوں۔ اور خدا کے فضل سے روزگار میں فرق نہیں پڑا۔"

میں نے کہا "یہ تو بری بات نہیں، بابا! پیٹ لگا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ اور محنت تو ضروری ہے۔"

بابا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

میرے ساتھی نے کہا "اب چلنا چاہیئے۔" میرے ساتھی کو جیسے اس وقت کسی کہانی کے کردار سے ملاقات کرنے میں ذرا بھی دلچسپی نہ ہو۔

مجھے خاموش پاکر میرے ساتھی نے کہا "تمہاری تو وہ بات ہے کہ چوک گئے تو بس چوک ہی گئے۔ اب گاڑی آنے میں دیر نہیں۔ بابا سے چھٹی لی جائے۔"

"تھوڑا رکو" کہتے ہوئے میں نے اپنے ساتھی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں معذرت کی اور پھر میں نے بابا کے قریب ہو کر کہا:

"وہاں پٹیالے میں کیا کام کرتے تھے بابا؟"

بابا بولا "وہاں اپنا گوٹے کا کام تھا۔"

"اور اب وہ گوٹا کیا ہوا؟" میں خاموش نہ رہ سکا۔

"وہ گوٹا تو وہیں رہ گیا!" اور پھر میں نے بابا کی آنکھوں میں قطرے کو گہر بنتے دیکھا۔

ظاہر تھا کہ یہ کوئی ایسا مصرعہ نہیں جس پر سینکڑوں ہزاروں لوگ نعرہ لگائیں۔ جواب میں میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔

میں بابا سے گلے ملے بنا نہ رہ سکا۔

جناب میں اپنی بات خاموشی میں ہی کہہ پایا۔

میرے ساتھی نے کہا۔ "اب بابا سے اجازت لی جائے۔"

جونہی میں نے اپنی باہیں بابا کے گلے سے ہٹائیں، بابا نے مجھے اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایک نئی دوستی کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "ایسے منحوس دن بھی آتے ہیں بابا، جب کسی کا گوٹا چھن جاتا ہے لیکن ــــ"

معلوم ہوتا تھا، میرے الفاظ کہیں چھن گئے۔ میرا گلا بھر آیا۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے زبان ہلائی لیکن الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔

میرے ساتھی نے کہا۔ "بابا تم یہاں ٹھہرو، ہم لوٹ کر آتے ہیں۔"

"ضرور آؤ گے نا؟" بابا نے آنسو بھری آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ رنگ گھٹا ہوا گندمی، لہجہ خالص پٹیالے والا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس گراموفون ریکارڈ کی یاد آگئی جس کے آخر میں یہ آواز ابھرتی تھی "بھائی چھیلا، پٹیالے والا"۔ اور جب میں نے یہ بات اپنے ساتھی کو بتائی تو اس نے اس کا یہ جواب دیا۔ "بھائی چھیلا" پٹیالے والا کا جواب نہیں۔ بھائی چھیلا پٹیالوی میں یہ رنگ پیدا نہ ہوتا۔"

میں نے بڑے غور سے بابا کے چہرے کے گندمی رنگ کا

جائزہ لیا۔ اور اس کے خالص پٹیالے والے لہجہ کو جھک کر سلام کیا، اور میں نے کہا: "بابا! ہمارے سامنے ایک نیا مستقبل ابھر رہا ہے!"

اور پھر اپنے ساتھی کی بات مان کر میں نے بابا سے سردست اجازت لی۔

"تو آپ لوٹ کر آ رہے ہیں نا!" گوٹے والے بابا نے پوچھ لیا۔

"ضرور۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

پلیٹ فارم پر بدستور بجلی کی روشنی چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔

پتہ چلا کہ گاڑی آنے میں ابھی بیس منٹ رہتے ہیں۔

چند لمحوں کے لئے ایک جگہ میرا ساتھی رکا پھر ایک بک اسٹال کی طرف گھوم گیا۔ مجھے یہ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی کہ آخر بک اسٹال پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لینے کے لئے ہی میرا ساتھی بار بار تاکید کر رہا تھا کہ گوٹے والے بابا سے اب چھٹی لی جائے۔

بک اسٹال کے قریب کھڑے کھڑے میں سوچ رہا تھا کہ آخر گوٹے والے بابا نے کیسے یہ پتہ لگا لیا کہ میں بھی پٹیالے والا ہوں۔ آخر کیسے اس نے پتہ چلا لیا کہ میں بھی ایک بھٹکی ہوئی منزل کا مسافر ہوں۔

جناب مجھے بیحد کوفت ہو رہی تھی۔ اور میرا ساتھی یونہی بک اسٹال پر اچھے بُرے میگزینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور بار بار جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ گویا سوچنے لگتا کہ ادمنی بس کے ٹکٹ کیلئے بچا کر رکھے ہوئے پیسے یہاں کیسے خرچ کئے جا سکتے ہیں۔

اس سرد ماحول میں میرے دل و دماغ ٹھٹھر رہے تھے۔ اور مجھے اپنے ساتھی پر بری طرح غصہ آ رہا تھا۔ جسے کہانیوں کے لئے نئے سے نیا موضوع تلاش کرنے کی ہمیشہ دھن رہتی تھی لیکن آج اس نے ایک زندہ کردار میں دلچسپی دکھانے میں بری طرح کنجوسی سے کام لیا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی میرے دل و دماغ کی بے بسی سے گلے مل رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی کا سنگ چھوڑ کر گوٹے والے بابا کے پاس چلا جاؤں اور اس سے کہوں کہ اب پچھلی باتیں یاد کر کے سسکتے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چاندی کی طرح بچھی ہوئی روشنی بھی یہی بات کہتی معلوم ہو رہی تھی کہ ہماری آنے والی خوشیوں کی باگ ڈور تو ہمارے اپنے ہاتھ میں رہنی چاہیئے۔

میں گوٹے والے بابا سے یہ بھی تو نہ پوچھ سکا کہ اس کے گھر والے کتنے آدمی ہیں۔ کم سے کم مجھے یہ تو پوچھ لینا چاہیئے تھا کہ کبھی دینا لے کر پٹیالے کا وہ گوٹے والا بازار دیکھنے کا اس کا ارادہ کب دوستی کے گل بوٹے کاڑھے گا!

میں گوٹے والے بابا کے حضور میں جھک کر کہنا چاہتا تھا کہ انسان ابھی زندہ ہے اور دوستی کی بزم چراغاں کے لئے ہم انتظار کر سکتے ہیں، جب روٹھے ہوئے دل گلے مل کر کہیں گے — آؤ ہم چند باتوں میں مل کر چلنے کا تجربہ کریں۔

میرا ساتھی بک اسٹال کی دنیا میں گم ادھر اُدھر ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ متواتر جیب میں پیسے گن رہا تھا۔

میں نے اس کا کندھا جھنجوڑ کر کہا:

"یہاں کیا رکھا ہے؟ چلو گوٹے والے بابا سے دو باتیں اور کر لی جائیں۔"

"ارے یار تم بھی کیسے کہانیاں لکھتے ہو گے؟" میرا ساتھی جھنجلایا۔ "ارے بابا کے پاس جاؤگے تو خود بھی بور ہو گے اور اسے بھی بور کرو گے۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہی کہ کہانی کو پیاسی رہنے دو۔"

"تو دوبارہ گوٹے والے بابا کے پاس نہ چلا جائے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"لیکن ہم اس سے وعدہ کر کے آئے ہیں۔"

"وعدے کی ایسی تیسی!"

میرا ساتھی بدستور بک اسٹال پر جھک گیا۔

میں بڑی الجھن میں تھا۔ میرے ساتھی نے میرے جذبات کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی روشنی سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ بیچ بیچ میں میرا ساتھی میری طرف یوں دیکھنے لگتا جیسے وہ گھوڑے کا سائیس رہا ہو۔ جیسے میں انسان نہ تھا، اس کے تانگے میں جتا ہوا گھوڑا تھا۔

اچانک اس نے بک اسٹال سے دور ہٹ جانے کا فیصلہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف چل پڑا۔

میں نے کہا: "ہم ایک بار بابا کے پاس ہو آئیں۔ تاکہ وہ

ہمیں جھوٹا تو نہ سمجھے ؟"

" وہ ہمیں جھوٹا سمجھے گا تو ہمارا کیا لے گا ؟ " میرے ساتھی نے ہنس کر کہا: " میاں کہانی کو پیاسی رہنے دو "

گاڑی میں ایک منہ زور گھوڑے کی طرح تانگے سے چھوٹ کر دوبارہ بوڑھے بابا کے سامنے جا کھڑا ہوتا لیکن میرا ساتھی تو میرے کندھے پر بازو رکھے زبردستی مجھے دوسری طرف لئے جا رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر طرح طرح کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں دوبارہ بوڑھے بابا کے پاس جا کر پوچھنا چاہتا تھا۔ بابا، تم یہ تو سمجھ گئے ہو یا نہیں کہ تمہارے ووٹ کی بہت قیمت ہے۔

بس اتنے میں گاڑی کے پہیوں کی دندناتی آواز ہمارے کانوں پر طبلہ سا بجانے لگی۔

میں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی کا ہاتھ چھڑا کر دوڑتا ہوا اس بوڑھے بابا کے پاس جا کر اسے ڈبے میں سوار کرانے میں مدد دوں۔ لیکن میری بھی تو ایک مشکل تھی۔

راولپنڈی کی طرف سے آنے والی اس گاڑی پر کراچی جانے والے ایک صاحب سے میرا ساتھی مجھے ملانے لایا تھا جس کی مدد سے کراچی میں میری رہائش کا انتظام ہو سکتا تھا۔

گاڑی ٹھیک وقت پر لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکی۔ میرا ساتھی مجھے اپنے دوست سے ملا کر یہ وعدہ لینے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کراچی میں میری مدد کرے گا۔

اس گونگے والے بوڑھے سے دوبارہ نہ مل سکنے کا مجھے بہت افسوس تھا۔ جب بھی مجھے کسی کردار کی ضرورت پڑی میں نے اسے یاد کی دہلیز پر کھڑے پایا۔ او زور اور وہ کہانی کے کردار کہیں بے موسم کے پھلوں کی طرح کسی مداری کے تھیلے سے تو نہیں نکلتے سو گو پھانس نہ لگنے دو، پیارے!

ہاں تو اب سنئے سارا قصہ، گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ جونہی ہم دروازے کی طرف بڑھے یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی کہ گونگے والا بابا بدستور کھڑا ہمارا انتظار کر رہا ہے ◆

ڈرامے کی فنی اور ادبی قدریں —— بقیہ صفحہ ۱۲

لائے اور اس کے ساتھ ساتھ "علامتوں" کو خیال کے وسیع تر اور عمیق تر اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں ایک بار پھر ڈرامے کی فنی اور ادبی قدروں میں صحیح توازن پیدا ہوا اور ڈرامے کو محض ایک فن سمجھنے کے بجائے اسے ادب سمجھنے کے رجحان کو محض ایک محدود اور مخصوص گروہ کا رجحان نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا کا رجحان سمجھا جانے لگا۔ چیخوف نے گستر اور ابسن نے ایک وسیع تر پیمانے پر حقیقت پسندی اور رمزیت کے لطیف اور مکمل امتزاج سے ڈرامے کو پھر اپنی وہی ادبی حیثیت حاصل کرنے میں مدد دی ہے جو اس میں فطرتاً موجود تھی، لیکن فکر اور عمل کے غلط اندازنے اسے نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ اور اب ڈرامے کو جس طرح ایک خاص طرح کا فن سمجھا جاتا ہے اسی طرح ادب کی بھی ایک خاص صنف تصور کیا جاتا ہے۔ اسٹیج کے ڈرامے اور ادبی ڈرامے کو دو الگ الگ چیزیں تصور کرنے کے بجائے بجا طور پر ایک ہی فنی حقیقت کے دو رُخ سمجھا گیا ہے، جس کی ترتیب، تشکیل، تنظیم اور تعمیر ایسی قدروں کے امتزاج سے ہوتی ہے جن میں سے بعض کو ہم آسانی کے خیال سے "ڈرامے کی فنی قدریں" کہتے ہیں اور بعض کو "ادبی قدریں" — حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے "ڈرامے کو اسٹیج سے الگ کر کے محض ایک ادبی صنف کی حیثیت سے دیکھنا اور جانچنا بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ سمجھنا کہ ڈرامے کے لئے ادب ہونا ضروری نہیں ہے" ◆

۱ :

۳ :

۲

مشرقی پاکستان میں خطاطی

۱- خط طغریٰ ("ببر دہان" کا اسلوب عہد مظفر شاہ ، پانڈوہ

۲- نسخ (درگاہ شاہ جلال رحمہ ، سلہٹ)

۳- ثلث (مسجع) (عہد سلطان ناصرالدین محمود شاہ ، اول)

۴- ثلث (عہد محمود شاہ)

۵- کوفی : (محراب مسجد ادینہ ، پانڈوہ)

۴ :

۵ :

وادیٔ بولان

۱- پہاڑی گاؤں

۲- رماری

۳- اونٹوں کے قافلے

۴- شام صحرا

"اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا"

ہم کو حسب ذیل تحریر اور یہ نظمیں دستیاب ہوئی ہیں جن کی اہمیت و افادیت خود واضح ہے اس لئے نذر قارئین کی جاتی ہیں۔ (مدیر)

محمد حسین عفی عنہ دگری گراں بہاولپور
۱۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء
یکم نومبر

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں:
محترم صدر مملکت مدظلہ العالی:
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چند روز ہوئے میں اپنے والد مرحوم مولانا محمد سعید ثانی کا ایک بیاض مطالعہ کر رہا تھا۔ چند اشعار پر میری نظر پڑی جو مرحوم نے ۳۰ مئی ۱۹۵۷ء کو آنجناب کو مخاطب کر کے لکھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی کہ محترم والد مرحوم نے مارشل لاء کے نفاذ سے قریباً ایک سال چار ماہ قبل عجیب انداز سے آنجناب کی توجہ کو ملک و قوم کی بہبودی کی طرف منعطف کیا تھا۔ میں وہ اشعار اس عریضہ کے ساتھ جناب والا کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ پروانۂ تقدیر و قضا کی جانب سے کتنا عرصہ پہلے آنجناب کو عہدہ سنبھالنے کی سعادت تفویض ہو چکی تھی اور محترم والد مرحوم کے یہ اشعار گویا ایک پیشگوئی تھی جو اب تک حجاب اندر حجاب قرطاس بیاض میں مستور رہی۔ اور قبلہ والد صاحب کی وفات کے تقریباً ۲ ماہ بعد حرف بحرف صادق آئی۔

مجھے جو انتہائی مسرت ہوئی ہے جناب والا کو اس سعادت پر جو مجھ سے بیان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی عنایت سے آج پھر ایک دفعہ صمیم قلب سے بارگاہ جناب میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ مجھ جیسے بے بضاعت اور حقیر انسان کی یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب والا کا سایہ پاکستان اور ہم پاکستانیوں پر اس وقت تک قائم رکھے جب تک بتوفیق الٰہی جناب والا پاکستان میں اسلامی حکومت صحیح معنوں میں قائم کر سکیں اور یہ بھٹکی ہوئی قوم صحیح معنوں میں اسلام کا مطلب سمجھ سکے۔ والسلام مع الاحترام

خیر اندیش: احقر
(محمد حسین عفی عنہ)

جناب صدر مملکت فیلڈ مارشل صاحب کو عہدہ جلیلہ قبول فرمانے پر خاکسار تہہ دل سے ہدیہ تبریک پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہے

احقر (محمد حسین)

خطاب بہ رب العزت

اے مالک ارض و سما تو نے جب ملک کیا ہے ہم کو عطا
طارق سا امیر البحر بھی دے خالد سا سپہ سالار بھی دے
پھر علم و عمل اور تیغ و قلم میں رابطۂ باہم ہو عطا
ہو بدر کا سودا ہر سر میں ہو دل کو وہی ایثار بھی دے
دل میں ہو سپاہی کے جو تڑپ دریا میں بھی ہو اس کی جھلک
پھر ولولۂ افکار بھی دے، پھر غلغلۂ کردار بھی دے

گیرم بدل لشکر تو گرمیٔ خون است ... دانی کہ سراسیمگیٔ ملک چگون است
ہم خوف برون است ہم آفات درون است ... بادست و زبان خیز بدل خیز و بجان خیز
از خواب گران خواب گران خواب گران خیز
از خواب گران خیز

بر خلق عیان کن کہ منم مالک و مختار ... بر خلق عیان کن کہ منم مخزنِ اسرار
بر خلق عیان کن کہ منم نائبِ سرکار ... اے خفتہ سبک خیز و چو طوفانِ گران خیز
از خواب گران خواب گران خواب گران خیز
از خواب گران خیز

اسرارِ نہان چیست تو میدانی و ہم من ... یا سود و زیان چیست تو میدانی و ہم من
غم چیست امان چیست تو میدانی و ہم من ... سالارا چو طوفانِ سرِ فوج گران خیز
از خواب گران خواب گران خواب گران خیز
از خواب گران خیز

برخیز کہ تو جلوۂ خورشید جمالی[1] ... برخیز کہ تو جوہرِ شمشیر کمالی[2]
برخیز کہ تو قائدِ افواج ھلالی ... با ہمتِ مردانہ و اسرارِ نہان خیز
از خواب گران خواب گران خواب گران خیز
از خواب گران خیز

[1] جمال الدین افغانی [2] کمال اتاترک

بتانِ وہم وگماں

یوسف ظفر

وقت کی خاک میں صدیوں کی صدائے فردا
بت بنی اپنے تبسم کے سکوں میں گم تھی
مردہ لمحات کے تابوت میں اک عمر یہ بت
اپنے خالق کی تمنا کے تراشیدہ صنم
خاک میں خاک ہوئے مدت سے ہمدوش رہے
موت صدیوں کے جنازوں پہ کھڑی سنتی تھی
کون اِن لاشوں کا اندازِ نظر جانے گا!
کون اِن بگڑے ہوئے چہروں کو پہچانے گا!!

ٹیکسلا! تیرے دفینوں میں بہت کچھ ہوگا
وقت کی ہنستی ہوئی گاتی ہوئی تصویریں
تیری آغوش میں ہیں، تیری فسانہ خواں ہیں،
مردہ ماضی کا صنم خانہ ہے پیکر تیرا،
تیرے سینے کے یہ ارمان، یہ پتھر کے صنم
کتنی تہذیبوں کی میراث ہیں، سرمایہ ہیں۔
موت کی مٹی کے اُگلے ہوئے ہر بت کی نظر
چیخ کر اپنے زمانے کی خبر دیتی ہے
دیکھنے والے کو اک اور نظر دیتی ہے

میں نے دیکھے ہیں وہ بت راہوں پہ چلتے پھرتے
جن کے سینے ہی صنم خانے ہیں، جن کے ارماں
اُن کے چہروں کی لکیروں میں نظر آتے ہیں۔
ہر کوئی ٹیکسلا ہے، اپنے بتوں کا مندر
میرا سینہ بھی دفینہ ہے تمناؤں کا
لیکن اس دور میں ہم لوگ یہی چاہتے ہیں
اجنبی نظروں پہ یہ راز عیاں ہونے نہ دیں
دل کو ہم خون کریں سنگِ گراں ہونے نہ دیں

ٹیکسلا! تیرے صنم خانے میں کیا کچھ ہوگا!
لیکن اک چہرہ مری روح سے کچھ کہتا ہے
اس کو میں دیکھنے لگتا ہوں تو چپ رہتا ہے۔
اس کے چہرے پہ سکونِ دلِ آسودہ ہے
اس کی پیشانی پہ ہیں ثبت محبت کے نقوش
اس کی آنکھوں سے ازل اور ابد جھلکتے ہیں
اور ہونٹوں پہ وہ نوخیز تبسم کی لکیر
جو خدا دے تو دو عالم کو خوشی مل جائے
گلِ آدم کو بتِ سنگ کی ہستی مل جائے

اے بتِ سنگ! اگر تو بھی ہے اک خوابِ سکوں
تیرے خالق نے تجھے اپنی تمنا جانا
اُس کی مایوس نگاہی نے تراشا تجھ کو
اس نے پایا تجھے امیدوں کے گورستاں میں
اس کی حسرت نے ترے رخ کو تبسم بخشا
تو مری روح کو مت چھیڑ کہ مجبور ہیں ہم
اپنے خالق کی تمنا کے تراشیدہ صنم

★

غزل

سراج الدین ظفر

شوق راتوں کو ہے درپے کہ طپاں ہو جاؤں
رقصِ وحشت میں اٹھوں اور دھواں ہو جاؤں

کھو تجھے دوں تو پسِ قافلۂ شام و سحر
اک بھٹکتی ہوئی آوازِ فغاں ہو جاؤں

اب یہ احساس کا عالم ہے کہ شاید کسی رات
نفسِ سرد سے بھی شعلہ بجاں ہو جاؤں

لبِ معجز نفساں کی ہو اگر بخششِ خاص
ناگہاں نے کی طرح زمزمہ خواں ہو جاؤں

لا صراحی کہ کروں وہم و گماں غرقِ شراب
اس سے پہلے کہ میں خود وہم و گماں ہو جاؤں

میں نہیں خضر کہ بس زہدِ اطاعت کے لئے
وقت کے دوش پہ اک کوہِ گراں ہو جاؤں

مجھ کو پیری ہے جو منظور تو اس شرط کے ساتھ
صبح کو پیر تو راتوں کو جواں ہو جاؤں

وہ تماشا ہوں ہزاروں مرے آئینے ہیں
ایک آئینے سے مشکل ہے عیاں ہو جاؤں

یوں جلالے تپشِ سینہ و رخسارِ بتاں
سرمۂ دیدۂ صاحب نظراں ہو جاؤں

بوئے مے آئے گی انفاس سے ورنہ میں تو
حلقۂ زہد کی بھی روحِ رواں ہو جاؤں

ہاتھ اس زلف سے ہیں دور مگر کیا معلوم
کس گھڑی بے خبرِ سود و زیاں ہو جاؤں

شوق کا جب کسی صورت نہ ادا ہو مفہوم
دہن عینِ خموشی میں زباں ہو جاؤں

اس طرح تیز ہوئے گردشِ پیمانہ کہ میں
سینۂ گردشِ دوراں میں سناں ہو جاؤں

ایسی چھلکا کوئی اے پیرِ خرابات نشیں
صبح تک واقفِ اسرارِ بتاں ہو جاؤں

میں ترے بندِ قبا سے کہ ہے بے شرح و بیاں
الجھوں اس طرح کہ بے شرح و بیاں ہو جاؤں

غرق ہو کر بھی ہے برحق ابدیت میری
پھر نہ ابھروں جو زماں سے تو زماں ہو جاؤں

ایسا اندازِ غزل ہو کہ زمانے میں ظفر
دورِ آئندہ کی قدروں کا نشاں ہو جاؤں

★

غزل

اختر احسن

راتیں دیدۂ تر سے پہلے راتیں دیدہ تر کے بعد
منزلیں مجھ سے دو رہتی ہیں میرے سیر و سفر کے بعد

ایک کرن بھی درد کی سرخی توڑ کے دل تک آ نہ سکی
دل میں کوئی رنگ نہ جاگا رنگ شام و سحر کے بعد

دید کا دروازہ نہ کھلا صحرا کی پھیلی وسعت پر
وحشت سایۂ در سے پہلے، وحشت سایۂ در کے بعد

دشت ہے وہ ویرانی کا، شب کو دیس نکالا ہے
نام نہ لوں گا ریگِ رواں کا منظرِ ریگِ سحر کے بعد

یاد کا اک تارا بھی نہیں جو شامِ اُفق پر آن بسے
دھول سی بن کر اُڑ گئی شامیں رحلتِ شمس و قمر کے بعد

چار طرف اب ویرانی کا پانی تھم تھم بہتا ہے
درد میں گھل کر بہہ گئی راہیں قتلِ شام و سحر کے بعد

نالۂ دل جب بیچ میں اُٹھا نالۂ شب بھی ماند ہوا
رات ستارے لے کر بھاگی درد کے اس منظر کے بعد

کوئی ثمر اس دل پہ نہ آیا شاک کے ایک ثمر کے بعد
آنکھ کو کوئی پھول نہ بھایا دل کے غنچۂ تر کے بعد

کوئی بھی پیاری شکل نہ دیکھی دل کی پیاری شکل کے بعد
کوئی صورت دل میں نہ جاگی صورتِ غنچۂ تر کے بعد

دل سے گئے پر ایک اُداسی شام و سحر میں چھوڑ گئے
خامشیوں کی خاک جمی ہے شورشِ شمس و قمر کے بعد

پھول مہنسے تھے لیکن اب دل مدت سے ہے بھول چکا
ہاتھ قلم ہیں شاخوں کے اس قتلِ لعل و گہر کے بعد

آب و ہوائیں خاک کی آخر خاک ہی ہو کر بیٹھ رہا
کوئی الفت دل کو نہ بھائی الفتِ لعل و گہر کے بعد

کیا کیا جھوٹ تھے تو سے بن کر منزلِ دل میں آ کے رہے
نالۂ حسرت دل میں جاگا لمحہ بھر کے بعد

شاخ شاخ پر پھول کھلے ہیں صورتِ غنچۂ تر کے بعد
نخلِ دل بھی رقص میں آیا رقصِ تیغ و تبر کے بعد

ایک گرج سی بن کے اُڑی ہے رات کی پھیلی تنہائی
پُرزے پُرزے خامشیاں ہیں یورشِ شمس و قمر کے بعد

سیلِ نور نے آن دبوچا خاک کو گھول کے پی ہی گیا
نور کا اک طوفان اٹھا ہے قتلِ لعل و گہر کے بعد

رات کہانی بن کر آئی دن بن کر اک افسانہ
رنگ میں سارے منظر بھیگے منظرِ شام و سحر کے بعد

صبح نئی اک آن کے پھر سے آئینۂ دل میں اُتری
کیا کیا پھیلے منظر جاگے وحشتِ دیدۂ تر کے بعد

کونہ کونہ صحراؤں کا نقشِ قدم سے آگ ہوا
چار طرف اک گلشن دہکا میرے سیر و سفر کے بعد

اک اک شاخ پہ ایک عجب سی صورت آن کے بیٹھ گئی
باغ تھا حیرانی کا عالم میرے ذوقِ نظر کے بعد

فن :

ہمارے عوامی رقص

شفیق بریلوی

مجھے ذوقِ تماشا اکثر کہیں نہ کہیں لے ہی جاتا ہے — جہاں سانولی سلونی شامیں فن کی گوناگوں جلوہ آرائیوں سے جگمگ جگمگ کرتی ہیں اور بھیگی ہوئی سرشار راتیں رقص و نغمہ کی سحر کاریوں سے وہ جنت نگاہ "یہ فردوس گوش ہے!" کا سماں پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور اور ان کے ہمراہ آنے والے امریکی مہمانوں کے اعزاز میں جن تفریحی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا تھا، میں بھی ان میں شریک تھا۔ بزمِ حرب جہاں بھی ہو بزم طرب ہے۔ اور پھر ہوٹل میٹروپول کی مدہوش کن سراپا بہار فضائیں۔ ان نغمہ ہائے دلنشیں اور رقص ہائے دلنواز نے بے اختیار پاکستان کے گوشے گوشے کی یاد تازہ کردی۔ خواہ وہ مشرقی پاکستان ہو جہاں ہم چاروں طرف خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں۔ یا مغربی پاکستان جس کے کوہسار، میدان، ریگ زار سب ایک انوکھی، ایک دلآویز فضا لئے ہوئے ہیں۔

ہمارے عوامی ناچوں کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ جیسے زندگی خود رقص کے سانچے میں ڈھل گئی ہو۔ جیسے ہر مقام کے باشندوں کی روح نے ایک نرالی وضع اختیار کرلی ہو جیسے دھرتی خود جی اٹھی ہو اور ایک عجیب شان دلربائی کے ساتھ انگڑائیاں لے۔ اور اس کا انگ انگ اس کی ہر ادا، ہر حرکت دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ان رقصوں کی دلآویزی اور فنی نفاست اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ سچائی، تازگی اور قدرتی وضع۔

دلبری بے قاہری جادوگری است — یہ ایک حقیقت ہے۔ اسی طرح دلبری با قاہری پیغمبری است۔ اور اس کا بین ثبوت سرحد کا سنگلاخ ماحول ہے۔ سرحد کی چٹانوں کے فرزند جن کی رگ رگ میں ایک بہادر اور جنگجو قوم کا خون گرم موجزن ہے۔ یہ لوگ صدہا سال سے رزم و پیکار کے دھنی ہیں۔ اور ان کے لئے شمشیر و سناں ہی زندگی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس روح اور اس زندگی کی عکاسی خٹک، لختہ اور اتنی سے بہتر اور کیا کرے گا؟ یہ رقاص نہیں سرحد کے جیالے جنگجو، شمشیر زن ہیں۔ اور ان کا والہانہ رقص تیزی سے گھومنے، اعضا کے پُرزور جھٹکوں اور ولولہ و جوش کا ایسا پُرجلال مظاہرہ ہے۔ جس میں قاہری ہی قاہری ہے — جس سے نرم رگ انسان دہم ہوجاتے ہیں۔ اور بزمیہ وضع کے تفریحی مشاغل کے شوقینوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ یہ قاہرانہ جمال ایک ایسا قوی اور پُرزور اثر دکھاتا ہے جو ناظر کے دل و دماغ پر مدت العمر چھایا رہتا ہے۔ خٹک ناچ کی حرکات تمام تر زندگی ہیں۔ اور ان میں خالصتاً اجتماعی روح کارفرما ہے۔ کیونکہ ڈھول کی گرجتی کڑکتی آواز، رقاصوں کے پاؤں کی دھمک ہی سے نہیں دھڑکتے دلوں کی شورش سے بھی ہم آہنگ ہوتی ہے — اور ڈھول کی سنگت رقص و مستی کی شان اور اٹھان کو دو بالا کرتی ہے۔

خٹک اور لختہ، زندہ دلان سرحد کی قومی شجاعت کا بھرپور عکس ہیں اور یہاں کے گرم خوں نوجوانوں کے پسندیدہ اور محبوب ناچ ہیں جن میں رزم کا پہلو زیادہ نمایاں ہے تو اتنی رزم و بزم اور مردانگی و نسائیت کا ایک لطیف مجموعہ ہے۔ کیونکہ اسے مرد اور عورتیں مل کر ناچتے ہیں۔ اور گو اس میں بھی ورزش کا انداز پایا جاتا ہے۔ پھر بھی صنف نازک کا لطیف پرتو جلال کو جمال سے نرم و سبک، لوچدار اور نشیلا بنا دیتا ہے۔

بلوچستان — یہ جری بلوچوں، شتربانوں، چرواہوں، جفاکش دہقانوں کا مسکن جن کی زندگی پہاڑوں، ریگستانوں اور وادیوں ہی کی زندگی ہے — سرحد سے دور نہیں اور نہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ اس لئے یہاں کے لوگ ناچ بھی سرحد کے مردانہ لوک ناچوں کے ہم وضع بھی ہیں اور حریف بھی۔ لہٰذا یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ وہ لوگ جن کے متعلق حکیم ملت علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ — بھاتی ہے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا — ان کے عوامی رقصوں

میں ان کی پوری زندگی جھلکتی ہے۔

لڈی۔ وہ پنجاب انتخاب ہفت کشور۔۔۔ اس کے جیالے جاٹ، بلند ہمت اور بلند قامت کسان شیشم اور دھریک (شاہ بلوط) کے پیڑوں کی طرح فضا میں ابھرتے ہوئے۔ اور انہی کے ساتھ وہ سرو ہی کی طرح بلند اور خوبصورت جاٹنیاں اور مٹیاریں ان کا رقص بے تحاشا گھومتا ہوا، والہانہ رقص نہیں۔ بلکہ اچھلتا کودتا ہوا چونچال رقص ہے۔ متوازی اور متقدار نہیں بلکہ عمودی۔ جب پری وشوں کا کوئی جھرمٹ دن کے بھولے اجالے یا رات کی مسحور کن سیماب چاندنی میں حلقہ باندھ کر یہ ناچ ناچتا ہے تو بھی گھومنے سے زیادہ یہی اچھلنے کودنے کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اپنی توانائی کی شدت سے اچھل کر ہوا میں نکل جانا چاہے۔ جو ہے یہ کسی دلی خوشی کی لہر یا فتح و کامرانی کے محرک انگیز جذبہ کا نتیجہ ہو۔ اب وہ پری وش ایک ہو یا البیلی پری وشوں کی ٹولی، وہ اپنی گھریلو زندگی اور باہر کھلے کھیتوں کی زندگی ہی کی عکاسی کرتی ہے۔۔۔ شاید یہی باتیں تھیں جن سے لعبتان چین کا وہ طائفہ جو کچھ عرصہ ہوا ہمارے یہاں آیا تھا محظوظ ہوا اور اس کی نظر انتخاب اسی چلبلے بہت ہی چلبلے ناچ پر پڑی۔ ناچنے والیاں باہوں کو لہراتی، بڑی ہی مستی و بیخودی کے عالم میں ناچتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ناچتے ناچتے صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے کوئی منچلا نوجوان شیخ سعدی کی اس تعلیم کے برعکس کہ "۔۔۔ مرداں بکوشید تا جامۂ زناں نپوشید" بڑی بے باکی سے عورتوں کا لباس پہن لیتا ہے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دہقانوں کی اس سرزمین کو دیکھنے ایک بار پھر آسمان سے ہیر اتر آئی ہو اور پھر نہ جانے کتنے رانجھے اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔

بھنگڑا ۔۔۔ جاٹوں کے اس مقبول ناچ کی آن بان ہی کچھ اور ہے۔ جہاں گیہوں کی بالیاں گدرائیں اور پیلی ہو ہو کر لہرانے لگیں، دیہات کے لوگ خوشی سے مست بلکہ بدمست ہو کر بے اختیار بھنگڑا ناچنے لگتے ہیں۔ اف اس کی بے پناہ دھمک اور ہڑبونگ کا سا عالم! اور جب شور شر اور مستی اس قدر عام ہو جائے تو بچوں، بوڑھوں جوانوں کا امتیاز کیا۔ سبھی ایک ہی موج میلے میں ڈوب جاتے ہیں۔ ایک شخص گلے میں ڈھول ڈالے اس کو زور شور سے بجاتا رہتا ہے اور ناچنے والے رنگین لنگیاں اور لانبے لانبے کرتوں میں ملبوس اس کے گرد حلقہ سا بنا کر ڈھول کی تال پر قدم اٹھاتے، تالیاں بجاتے گھنٹوں ناچتے رہتے ہیں۔

جھمر ہو یا جھومر بات تو ایک ہی ہے۔ اس میں جھوم جھوم کر لہرانے کی سی ادا ہے۔ وہی سوز، وہی نرمی، وہی لوچ اور بانکپن جو سابقہ مغربی پنجاب یعنی ملتان اور بہاولپور وغیرہ کے علاقوں میں ہے۔ اور لہندا اور مرکزی علاقہ میں فرق پیدا کرتا ہے۔ نوجوان ڈھول پر جھومر کی تال سن کر مدہوشی کے سے عالم میں اس کے گرد ناچتے ہیں۔ جیسے فانوس کی گردش کرتی ہوئی شکلیں لندہ جلتی ہوئی شمع کے گرد۔ اور اگر مردوں کی جگہ یہاں کی البیلی لانبی لانبی ڈھیلے ڈھالے لباس والی جادوگرنیاں ہوں تو پھر کیا کہنے۔

سمّی، گدّا اور کلکلی ۔۔۔ ان ناموں ہی میں شوخی و شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ سمّی یا سماع شاید ایک ہی چیز کے دو روپ ہیں۔ اس دیہاتی ناچ کا سلسلہ ملتان اور سندھ سے ہوتا ہوا شاید عرب تک پہنچ جاتا ہو۔ سمّی کیا ہے؟ نوجوان البیلی دیہاتی لڑکیوں کا ناچ جب ان کے ولولے اور امنگیں چند گھنٹوں کے لئے سماج کی چادر ہٹا کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اور اُن کے چہرے ایک دلی خوشی کی لہر سے کھل اٹھتے ہیں۔ اس ناچ میں جب لڑکیاں مٹکتی تھرکتی، آنچل لہراتی، چوڑیاں اور پازیب بجاتی مستی کے عالم میں کھوئی ہوتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس سمّی یا سہیلی کی یاد میں یہ ناچ ناچا جا رہا ہے وہ ابھی کہیں سے نکل کر آ جائے گی اور ان مہ جبینوں میں شامل ہو کر ناچنے لگے گی۔

گدا یعنی تالی ۔۔۔ یہ بھی دلی ترنگ اور کیف و مستی کی ایک پُر لطف علامت ہے۔ اس میں لڑکیاں تو لڑکیاں بچے اور لڑکے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب اس ناچ کا سماں بندھتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ستارے آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

کلکلی کلیر دی ۔۔۔ یہ ہیں ایک پنجابی لوک گیت کے الفاظ جیسے کوئی کلی چٹک رہی ہو یا طبیعت میں گدگدی ہو۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کا چست اچھلتا کودتا ناچ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تیزی سے اچھلتی کودتی گاتی گھیر ڈالیں۔ جہاں "کلکلی کلیر دی" کے الفاظ زبان پر آتے ہی آنکھوں کے سامنے ایک معصوم الھڑ اور رنگینیاں ہی رنگینیاں ابھرتی ہیں۔

وہ محفلِ رنگا رنگ جس کا شروع ہی میں ذکر کیا گیا ہے سندھی دیہات کا شوخ اور نظر فریب رنگ بھی دامن میں لئے ہوئے تھا۔ رقص اور گیت دونوں کا موضوع وہی عورت کے دل کا ازلی و ابدی موضوع تھا۔ اپنے پیارے محبوب، اپنے سائیں کی آمد پر بے اندازہ خوشی اور مسرت کا اظہار گیت کے بولوں میں سندھی اور پنجابی زبانوں اور روحوں کے ڈانڈے آپس میں ملتے نظر آتے ہیں اور عجیب کیف پیدا کرتے ہیں۔

کشمیر کو کہنے والوں نے "ایرانِ صغیر" کہا ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اہلِ کشمیر کی کاریگری اور نفاست ذوق سے کون انکار کر سکتا ہے اور پھر جو سرزمین جہانگیر، نورجہاں اور شاہ جہاں کا بھی چہیتا رہی رہا ہے۔ اس لئے یہاں کے لوک ناچوں میں ایرانی طرز اور مغلیہ مذاق دونوں کا گہرا رچاؤ نظر آتا ہے تو کچھ عجب نہیں۔ ان میں صوفیانہ کلام اور حافظ بہت مشہور ہیں۔ اس کے برعکس نچہ آنگز بحیثیت کشمیری چیز ہے۔ جو شہنائی اور ڈھولک کے ساتھ ناچا جاتا ہے۔ اور دیہات کے لوگوں میں کافی مقبول ہے۔ فصل کاٹنے کے بعد جگہ جگہ خالص کشمیر راؤ ناچ کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ روف کشمیری عورتوں کا ناچ ہے اور تہواروں کے موقع پر یا فصل کی کٹائی کے زمانے میں اس کا خوب رنگ جمتا ہے۔

مشرقی پاکستان کی ہری بھری فضا حسبِ موقع اپنے آغوش میں بسنے والوں کا طبیعت کو کیا کیا کیف و مستی نہیں پیدا کرتی۔ سیلی سیلی ہری ہری دھرتی پر تھرکتے پاؤں اور جھومتے لہراتے بدن کبھی زیرِ گان اور کبھی ایک پرفسوں رقص اور کبھی دوسرے کی مست کن صورتیں اختیار کرتے ہیں اور اپنے انوکھے حسن سے دل کو لبھاتے ہیں۔

کھیتوں اور کھلیانوں کے ناچ جیسے مغربی پاکستان میں ہیں ویسے ہی مشرقی پاکستان میں بھی ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ ان کا برجستہ جواب ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کے لوگ ایک، ان کی روح ایک، ان کے احساسات ایک ہیں۔ فصل کی کٹائی کے موقع پر ان ناچوں سے عجیب گہما گہمی پیدا ہو جاتی ہے اور خود دھرتی بھی پاؤں کی دھمک سے تھرکنے لگتی ہے جیسے ان کا ازل ہی سے سنگ ساتھ ہو۔ نوجوان عورتیں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرہ سا بنا لیتی ہیں اور اپنے سانولے سلونے جسموں کو ہر سمت حرکت دیتی ہیں۔ مرد پکھراج کی قسم کے انوکھے ہلکے پھلکے ڈھول لئے جنہیں "کھولی" کہتے ہیں، بجاتے اور پھر ایک رند منش شاعر کے الفاظ میں۔

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے۔ جب تال اور ناچ کی سنگت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو ناچ میں حصہ لینے والے ہوں یا دیکھنے والے، سبھی محسوس کرتے ہیں گویا پوری کائنات گھوم رہی ہے، ناچ رہی ہے۔ اور منی پوری وہ دیارِ حسن و نغمہ جس کی سحر آفرینی اپنے رنگین و طرحدار رقص میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ہماری باکمال رقاصاؤں نے اسے بھی ہزاروں میل کی حدیں پار کر کے ہماری نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ یہاں کے رقص کا سب سے جاذبِ نظر پہلو مہ پارہ حسیناؤں کا عجیب و غریب لباس ہے۔ ریشمی سایوں کی تیاری میں کچھ ایسی حکمت برتی جاتی ہے جیسے وہ خوب پھیلے ہوئے فانوس ہوں یا جیسے برقی قمقموں کا بہت ہی نفیس موی و شمع کا پلاسٹک۔ شیڈ۔ اس پھیلے ہوئے زریں لباس سے رقاصاؤں کے ابھرتے ہوئے سرخ و سفید جسم ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کتنی ہی روشن شمعیں بہت فانوس سے باہر نکل کر دیکھنے والوں کی نگاہوں کو مسحور کر رہی ہوں اسی لئے ان کا کیف دیکھنے کے بعد مدت تک دل و دماغ میں رسا بسا رہتا ہے۔

اسی صحبت کی ایک اور دلآویز یادـــ "ہما" کی ہنر دوست خواتین کی طرف سے غالب کے اس شاندار قطعہ کی ڈرامائی پیشکش جو زندگی کے ہنگاموں اور عیش و طرب کی محفلوں کی ایک زندۂ جاوید تمثیل ہے ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ÷ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

اگرچہ یہ نظاہر حرفی تصوف کے قول میں تمہیں آتا لیکن یہ تھا تو پاکستانی فن کاروں ہی کی ایک منفرد پیشکش، غزل کہاں اور ڈراما کہاں، یہ تو خلوت کو جلوت میں لانے کی بات ہے لیکن ان نسائی فن کاروں کی داد دینی چاہئے کہ وہ واقعی خلوت کو جلوت میں لے آئیں اور گو ان کی پیشکش میں ڈرامائی حرکت نہ پیدا ہو سکی اور نہ ہو سکتی ہے پھر بھی یہ اپنی جگہ ایک کیفیا ایک ندرت کی حامل تھی۔ اور اس بزمِ نشاط کا ایک بہت ہی موزوں و مناسب تکملہ مرزا غالب اپنے نورانی چہرے اور سفید براق داڑھی کے ساتھ سراسر نمونۂ عبرت۔۔ وہ کم سن نصیحت نیوش سب کے سب چپ مہر بلب۔ پس منظر یہ موسیقی اس کیفیت کو پوری طرح نمایاں کرتی ہوئی۔ اور حرف حرف سننے والوں کے دل میں اترتا ہوا۔ جب ساقی نو خیز مرحلی لئے بزم میں آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے صبح مے خانہ فضا میں تیر گئی۔ اور لطفِ خرام پر واقعی جنتِ نگاہ اور وہ۔ جھنک پر ہو بہو نوائے سروش کا گمان ہوتا ہے۔ دامانِ باغبان اور کفِ گلفروش کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اسی محفل میں نظر آیا وہ بہت ہی پر لطف۔ اندازہ آخری بند جو سارے قطعہ اور ساری تمثیل کی روح ہے۔ شمع جو جلتے جلتے گھلتے گھلتے آخر بے ہوش ہو جاتی ہے اور گھومتے ہوئے پھیلے ہوئے اندھیرے کو اور بھی تاریک اور سنسان کر دیتی ہے۔ یہ ہر ناظر کو ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ یہ ساری پیشکش ایک کبھی نہ بھولنے والی کیفیت عطا کر دیتی ہے۔ اور رقص و فن کے حلقۂ رنگین کے تمام نقطے ہمیشہ کے لئے آپ ہی آپ دل کو حلقۂ سحر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

نبود وفائے عہد دمے خوش غنیمت ست
از شاہداں بناز شس عہد وفا برقص
ذوقیست جستجو چہ زنی دم ز قطعِ راہ
رفتار گم کن و بصدائے درا برقص
در عشق انبساط بپایاں نمی رسد
چوں گرد باد خاک شو و در ہوا برقص

(غالب)

رپورتاژ:

فتح باغ کے ویرانوں میں

عارف حجازی

دوپہر کے گہرے سناٹے میں ویران، اداس ٹیلوں پر جیسے موت کی دہشتناک پرچھائیاں چل پھر رہی تھیں۔ آس پاس ہو کا عالم طاری تھا لیکن جب نیم گرم ہوا کے جھکڑ سرسراتے ہوئے چلنے لگتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سینکڑوں زخموں سے نڈھال انسان تپتے ٹیلوں کے درمیان پڑے سسک رہے ہیں۔

میں بڑی دیر تک فتح باغ کی خاک و خون میں ڈوبی ہوئی داستان کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کوئی انوکھی داستان نہ تھی بلکہ ان قدیم تاریخی روایات کی آئینہ دار تھی جن سے دنیا کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اپنے گرد و پیش ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور دل میں کہا "قرطاجنہ، الحمرائے، بابل اور نینوا جیسے قدیم شہروں کو تو فنا ہوئے ہزاروں برس بیت چکے ہیں۔ مگر فتح باغ کو مٹے ابھی کونسی اتنی صدیاں گزری ہیں کہ زمانہ اسے یکسر بھلا بیٹھا؟"

یہ سوچ کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور مدفون شہر کے ٹیلے پر بسنے والوں پر غصہ بھی آیا لیکن جب میں نے اپنے ملاقاتی گندو فقیر کو اپنے قریب بیٹھے پایا تو جیسے دل کا غبار آپ ہی آپ چھٹ گیا۔ اب اس ٹیلے پر جہاں کسی زمانے میں پُر رونق شہر ہوگا، گھاس پھونس کے صرف چند گھر بنے تھے اور ان کے چاروں طرف ویران ٹیلے! ایک طرف یہ منظر اور دوسری طرف اذیت ناک افسردگی چھائی ہوئی۔ میں نے یہ سناٹا توڑ کر گندو فقیر سے باتیں چھیڑ دیں: "گندو سائیں! تمہیں فتح باغ کے اجڑنے کی کہانی یاد ہے؟"

یہ سن کر حبشی نژاد سو سالہ بڈھے کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ "میرے نوجوان مسافر! آج تم نے بڑی بھولی بسری یاد تازہ کردی۔ خدا کی شان دیکھئے، جہاں ہم آج بیٹھے ہوئے ہیں یہاں کسی زمانے میں بڑا خوبصورت شہر آباد تھا۔ یہی دو سو سال پہلے کی بات ہے۔"

میں نے فوراً کہا۔ "اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس کی تباہی کے اصل اسباب کیا تھے؟"

بڈھا پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔ "آہ! اس شہر کی تباہی کے اسباب پوچھتے ہو۔ وہی انسانی ہوس اقتدار اور لوٹ کھسوٹ جس کی مثالیں تاریخ میں بھری پڑی ہیں۔" گندو نے ایک لمبی سانس لیکر کہا۔ "کلہوڑہ کا آخری حکمراں میاں عبدالنبی جو نواب سندھ کے نام سے مشہور تھا۔ اسی کے زمانے میں یہ شہر تباہ ہوا۔ نواب بڑا بزدل تھا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے اس کی مملکت پر چڑھائی کردی اور لہنائی کے مقام پر دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر نواب شکست کھاکر کابل بھاگ گیا۔"

"کابل؟"

"ہاں۔ کابل پہونچکر اس نے والئ افغانستان سے مدد حاصل کی اور افغان جرنیل عزت یار خاں کے ہمراہ ایک بڑی فوج لیکر سندھ آیا۔ عزت یار خاں نے اس کی کھوئی ہوئی حکومت بحال کردی لیکن ابھی اسے کابل واپس ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے ہونگے کہ بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے نواب کو پھر ملک بدر کردیا۔ آخر نواب کو پھر شاہ افغانستان کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

"یہ وہ زمانہ تھا جب مغلوں کے عروج کا چراغ دم توڑ رہا تھا۔ ہر سو ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر سندھ پر افغانوں کا دبدبہ بڑھ گیا تھا چنانچہ

اس دفعہ شاہ افغانستان نے نواب عبدالنبی کی اس شرط پر مدد کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ اسے بھاری خراج ادا کرے گا۔

"نواب کیلئے اب کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس شرط کو تسلیم کرلے۔ چنانچہ افغان بادشاہ نے اپنے ایک آزمودہ جرنیل، مدد خاں کو نواب کے ساتھ بھاری فوج دیکر روانہ کیا۔ مدد خاں نے سندھ پہونچکر نواب کو بڑی آسانی سے اس کی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ دلوا دی لیکن ادھر مدد خاں کی آمد کی خبر پاکر فتح علی خاں تالپور تمام قیمتی ساز و سامان اور خزانہ لیکر فرار ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب مدد خاں واپس کابل جانے لگا تو اس نے نواب سے خراج طلب کیا۔ اس پر نواب بڑا اشپٹایا۔ خزانہ پہلے ہی خالی ہوچکا تھا اور کوئی دوسری صورت ایسی نہ تھی کہ وہ مدد خاں کو ٹال سکتا۔ آخر کئی روز انتظار کرنے کے بعد مدد خاں کی فوج رسد کی کمی کی وجہ سے فاقہ کرنے لگی۔ اس پر مدد خاں بہت بگڑا۔ یہ دیکھکر خودغرض اور بزدل نواب نے مدد خاں کو مشورہ دیا کہ وہ ملک کے پُرامن اور نہتے عوام کو لوٹ کر خراج وصول کرلے۔ مثل مشہور ہے 'اندھا کیا چاہے دو آنکھیں'۔ مدد خاں کے لئے نواب کا اتنا اشارہ بہت کافی تھا۔ چنانچہ اس کی ٹڈی دل فوج شہر، گاؤں، بستی جو سامنے آیا، تخت و تاراج کرتی چلی گئی اور لوٹ مار، قتل و غارتگری کا ایک ایسا ہولناک کھیل شروع ہو گیا کہ ہزاروں بے گناہ عوام موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ ان کی عزت و آبرو، مال و دولت غرضیکہ سب کچھ لوٹ لیا گیا اور اس طرح وادیٔ سندھ کے کئی خوبصورت، پُررونق شہر جن میں فتح باغ، جُون، بدین، چھاچھرو اور نامور پور قابلِ ذکر ہیں، سب نذر آتش کر دیئے گئے اور اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا!"

گدّو فقیر نے پھر ایک لمبی سانس لیکر چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "آج فتح باغ کی خوبصورتی کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ کسی زمانے میں یہ مقام سندھ کا نہایت مشہور صنعتی مرکز تھا۔ اس کی خوشحالی، دلکشی، سرسبز باغات، رسیلے پھل، مہکتے ہوئے پھول اور مصنوعات دُور دُور تک مشہور تھیں۔ اس زمانے میں دریائے سندھ، جو اب یہاں سے دس کوس پر ہے، شہر کے دامن سے لپٹ کر بہا کرتا تھا۔ دریا کے کنارے مال بردار کشتیاں لنگر انداز رہتی تھیں جن کے ذریعہ یہاں کی بنی ہوئی سینکڑوں چیزیں دور دور مقامات کو بھیجی جاتی تھیں۔ تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے لوگ بڑے خوشحال تھے اور پُرامن زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر آج اس پُررونق شہر کی بجائے اینٹوں اور ملبے کے ڈھیر رہ گئے ہیں جہاں اب دن کے وقت بھی حسرت برستی ہے۔ یہ ہے شہرِ فتح باغ کی تباہی کی کہانی!"

اتنا کہکر گدّو سائیں اپنی لاٹھی کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنی جگہ خاموش تھا اور میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ میں نے کھڑے ہوکر سامنے نگاہ اٹھا کے دیکھا تو ویرانوں سے پرے دھان کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ کہیں کہیں آم کے پُرانے درختوں کے دو چار جھنڈ بھی تھے۔ جن کے گہرے سائے پر حیات آفریں طمانیت اور سکون طاری تھا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک مسجد کے کھنڈر کی طرف نکل آئے۔ اس کے صدر دروازے کی نصف کمان باقی رہ گئی تھی جو اینٹ اور چونے کے ایک مضبوط ستون کے سہارے کھڑی تھی۔ کمان کا اتنا حصہ نہایت بھڑکیلا تھا اور اس پر چمکیلی ٹائلیں جڑی ہوئی تھیں۔ گدّو نے اس شکستہ کمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہاں اکبری عہد کی ایک یادگار مسجد تھی جس کے ایک سو گنبد تھے۔ میں نے اپنی اٹھتی ہوئی جوانی کے زمانے میں جب اس مسجد کو دیکھا تھا تو یہ تقریباً ٹھیک حالت میں تھی لیکن اب تو یہ بھی زمانے کی چکی میں پس کر خاک کا ڈھیر بن چکی ہے۔"

گدّو سائیں کا یہ جملہ سنکر مجھے ہسپانیہ کی مسجد قرطبہ یاد آگئی اور علامہ اقبالؒ کی نظم میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں نے مسجد کی شکستہ کرسی اور کھنڈر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جہاں اب چاروں طرف اینٹوں اور ٹائلوں کے اونچے ٹیلے کے سوا کچھ باقی نہ تھا اور اس کے کھنڈر کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جس کے ابھرتے ہوئے نشانات اس کی شان و شوکت کی کہانی دہرا سکتے۔ ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے جن پر ریت کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔

مسجد کے کھنڈر سے ہوتے ہوتے ہم اس ویرانے کی طرف نکل آئے جہاں کسی زمانے میں راجہ بیربل کا گھر تھا۔ گدّو نے بڑے یقین سے بتایا کہ اکبر کے نورتنوں میں راجہ بیربل، تان سین اور گاگ بھٹ، فتح باغ کے دلکش ماحول میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یہیں پرورش پائی تھی۔ پھر گھومتے گھامتے

ہم مدفون شہر کی ایک ویران شاہراہ پر نکل آئے جو سنسان ٹیلوں کے بیچوں بیچ سیدھی سپاٹ تقریباً ایک میل تک چلی گئی تھی۔ اسی شاہراہ پر مغل حاکم کی محلسرا تھی جس نے بے رحم حملہ آوروں سے فتح باغ کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اور خود بھی دوسرے مظلوم انسانوں کی طرح فنا کی گود میں سو گیا تھا!

اس شاہراہ کے درمیان کھڑے ہو کر جب میں نے فتح باغ کے ماضی کا تصور کیا تو جیسے سچ مچ نگاہوں کے سامنے شہر کی خوبصورتیوں کا سماں کھنچ گیا۔ بہت سال سے کچھ پہلے اس شہر کے پُر رونق گلی کوچوں، بازاروں، دلکش باغات، ڈیوڑھیوں اور حویلیوں کی چہل پہل کا خیال آتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں جنت کے کسی گوشے میں آگیا ہوں لیکن پھر یکایک ان ویرانوں کو دیکھتے ہی جیسے میرے کان دردناک چیخ پکار سے معمور ہو گئے۔ تلواروں کی کھٹا کھٹ، بندوقوں اور توپوں کی دل ہلا دینے والی آوازوں کے درمیان عورتوں، بچوں اور مردوں کی دردناک آہوں، سسکیوں اور رونے پیٹنے کی درد بھری صداؤں سے زمین و آسمان میں ایک کہرام مچ گیا۔ نگاہوں کے سامنے آگ کے سربلند شعلے رقصاں تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آن کی آن میں ساری دنیا ہوس، لوٹ اور ظلم کی آگ میں جل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھسم ہو جائے گی۔

اس خیال کے آتے ہی جیسے کسی نے مجھے زور زور سے جھنجھوڑا لیکن جب میں نے گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھا تو چاروں طرف خاموشی تھی، ویرانے تھے، اداس ٹیلے کھڑے تھے اور سرسراتی ہوائیں جیسے کوئی گنگنا رہا تھا سے

کتنے شب رنگ خیالوں کے منقش محراب
گرمیٔ وقت کی رفتار سے کجلا سے گئے
کتنے گلنار تصور کے سحر تاب محل
ان حوادث کے گراں تیشوں سے مسمار ہوئے!

کوئی خاموش فضاؤں میں گنگناتا ہوا جیسے میرے قریب سے گزر گیا۔ اب جو میں نے نظر دوڑا کے دیکھا تو گدّ و سائیں مجھ سے کافی دُور ایک ویرانے کے پاس کھڑا میری راہ تک رہا تھا!

جنتِ تعبیر

(کورنگی کے کنارے)

آثر جلیلی

کراچی کے نواح میں بے خانماں مہاجرین کی آبادکاری کے لئے کورنگی کے پرفضا مقام پر نئی اور دلفریب بستی کی تعمیر رفاہی سرگرمیوں کی ایک شاندار مثال ہے اور اس دور کی خبر بھی دیتی ہے جس میں حقیقی آزادی اور جمہوریت کا دور دورہ ہوگا۔ اس نظم میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

زندگی مسئلۂ قالب و جاں،
زندگی ہمہمۂ سیلِ رواں
زندگی غلغلۂ تاب و تواں
گرچہ ظاہر میں ہے اک بارِ عظیم
لیکن، ادنیٰ سی نگاہِ غلط انداز سے یہ بارِ گراں
غیرتِ دولتِ کونین بھی بن سکتا ہے۔
بادۂ حُسن و لطافت سے ہو پُر صبح کا رنگین ایاغ،
حجلۂ ناز سے اٹھلا کے چلے
میکدہ ہے اپنے جلو میں لے کر
بادۂ کوثر و تسنیم کو چھلکاتی ہوئی
ایک دوشیزۂ پروردۂ آغوشِ جمال
جس کا ہلکا سا اشارہ پاکر
نکہت و رنگ کا سرمایہ لٹا دیں غنچے
اور جنت کے دریچے کھل جائیں
زیبِ دوشِ گلِ نورستہ ہو مشکیں کاکل
زیست کا بارِ گراں

○

زندگی زمزمہ سازِ تمنا بھی ہے
ازازل تابہ ابد زخمہ ورِ تارِ رگِ ابرِ بہار
آتشیں نغمہ زنِ جلوہ گہِ لیل و نہار۔
یہ حقیقت تری نظروں میں فقط خوابِ پریشاں ہی سہی
لیکن افسونِ نگاہِ غلط انداز سے یہ خوابِ پریشانِ حیات
رو کشِ جنتِ تعبیر بھی ہو جاتا ہے
اعتبارات بدل جاتے ہیں، صدیوں میں سہی
دشت شائستۂ تعمیر بھی ہو جاتا ہے!

★

بولان کی وادیوں میں

رفیق خاور

بولان ہو یا بلوچستان - ان کا نام سنتے ہی مجھے اپنے ایک بہت ہی قریبی عزیز یاد آتے ہیں جن کی جغرافیہ دانی قابلِ رشک ہے۔ اردو ہو! کچھ اسی قسم کی معلومات وہ بہم پہنچاتے ہیں اللہ سے کون ہے جو محظوظ نہ ہو؟ یقین جانئے آپ ان کو سن کر ملا نصیر الدین کے سب لطیفے بھول جائیں گے۔ مثلاً اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ کوئٹہ کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے تو وہ جواب دیں گے [illegible] ایک خاصا بڑا گرم مرطوب علاقہ ہے جہاں اتنا بینا ہی اتنا بینے پائے جاتے ہیں۔ کوئی گھر ایسا نہیں جہاں ایک دو نابینے نہ ہوں۔ اور اپنے اس بیان کو تقویت دینے کے لئے وہ حوالے دینے [illegible] ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں [illegible] وہاں [illegible] کو [illegible] کی طرح یہ جانور بھی سواری اور باربرداری کے کام آتا ہے۔ اور جہاں ہاتھی نہیں جا سکتا یہ آناً فاناً پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے لوگوں کو خود اس [illegible] کا حوالہ دیتے ہیں ورنہ اگر وہ:

کیوں نہ دوزخ میں بھی جنت کو ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کے مصداق مزید [illegible] جغرافیہ دانوں ادریسی، بلاذری وغیرہ کو بھی گواہوں کی فہرست میں شامل کرنا شروع کر دیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔ خیر، جہاں سوال [illegible] وہاں سو گیا [illegible]۔ اگر یہاں حضرت سے پوچھا جائے کہ [illegible] کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے۔ تو وہ فضا میں بازو پھیلا کر ایک خاص سمت میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں [illegible] ایک برِ عظیم ہے جس کے [illegible] بہت بڑا شہر ہے۔ اس میں ایک چڑیا گھر، ایک عجائب گھر اور ایک ریڈیو پاکستان ہے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو پاکستان سے ان کی مراد محض ریڈیو ہی ہے اور چڑیا گھر اور عجائب گھر تو ہر مسالے [illegible]، جس شہر کے متعلق بھی، پوچھا جائے ان کا ذکر لازمی ہے۔ لاہور کیوں مشہور ہے؟ اس لئے کہ اس میں ایک چڑیا گھر ہے اور ایک عجائب گھر۔ کراچی کیوں مشہور ہے؟ اس لئے کہ یہاں بھی ایک چڑیا گھر ہے اور ایک عجائب گھر اور کوئٹہ۔ اس کی [illegible] ان کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ کوئٹہ بلوچستان میں ہے مگر خود بلوچستان کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے؟ ظاہر ہے کہ اس میں چڑیا گھر اور عجائب گھر تو ضرور ہوں گے لیکن بلوچستان، یہ ہے ایشیائے کوچک کے وسط میں ایک بہت بڑا تاریخی ملک بلکہ جزیرہ۔ کسی زمانے میں یہاں اژدہے بہت تھے لیکن انگریزوں نے مشین گنوں سے اڑا دئے۔ شاید ایک آدھ چڑیا گھر یا عجائب گھر میں یادگار کے طور پر رکھا ہو۔ بڑا ہی سرسبز و شاداب جنگلاتی علاقہ ہے۔ اور بولان؟ یہ ہندوستان کی سرحد پر ایک بہت بڑا درہ ہے جہاں سے چینی ہندوستان میں گھس آتے ہیں۔ ایک بہت ہی دلچسپ اطلاع جس سے اہلِ ذوق پھڑک ہی تو اٹھے یہ تھی کہ بلوچستان کی سب سے مشہور چیز مرغ ہے جس کے مور جیسے بڑے بڑے چکنے چکنے پر ہوتے ہیں۔ اتفاق سے ہمارے جغرافیہ داں کے اپنے بال بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔ اس لئے ہم نے ان کو بھی کسی قدر گستاخی سے اسی نوع میں شمار کر لیا تھا۔ اور مرغ کے لئے "کاک" سے بہتر مترادف اور کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان حالات میں کون ہے جسے کوئٹہ، بلوچستان اور بولان میں دلچسپی نہ ہوگی۔ اس لئے ہمیں بھی غائبانہ طور پر [illegible] کے ساتھ بے حد انس پیدا ہو گیا تھا مگر کہاں ہم کہاں یہ دور دراز مقامات۔ یہاں خواب و خیال تو کیا اس طاؤسی مرغ کے پر بھی مل جاتے جو بلوچستان میں عام ہے تو ہم شاید ہی یہاں پہنچ سکتے۔ ہماری معلومات میں اتنا اضافہ ضرور ہوا تھا کہ کوئٹہ میں ایک بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اور اس کا منظر ایک فلم میں

بھی دیکھا تھا۔ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ بلوچوں کا دیس ہے۔ جن کو سسی کے محبوب، مرد بلوچ اور سسی کے محبوب پنوں نے غیر فانی حیثیت عطا کر دی ہے۔ بلوچ اور ڈاچی والے پنجابی گیتوں کا چہیتا موضوع ہیں۔

ڈاچی والیا موڑ مہار وے

تیری ڈاچی دے گل وچ ہار وے

(اے ڈاچی والے! اپنی مہار موڑ دے۔ تیری اونٹنی کے گلے میں ہار)

وے جی اڑیا ڈاچی والے دے نال

(ارے میرا دل اونٹنی والے کے ساتھ جا اڑا)

بلوچا ظالما نہ مار سیٹی

(ظالم بلوچ! خدا کے لئے سیٹی نہ مار)

غرض مضبوط، تنومند، جیالے بلوچوں سے جھنگ سے لے کر سندھ اور کچھ تک کا علاقہ بھرا پڑا ہے، تاریخ میں جابجا ان کے بہادرانہ کارناموں کا ذکر آتا ہے اور خود ہماری بلوچ رجمنٹ کے کارہائے نمایاں کس کو معلوم نہیں! اس لئے یہ بے تاب خواہش ہمیشہ دل ہی دل میں پرورش پاتی رہی کہ جب بھی موقع ملے اس علاقہ اور اس کے کوہ و صحرا کو دیکھا جائے جو ان کا حقیقی وطن ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ قیام پاکستان نے ان دور دراز علاقوں کا جن کا ذکر ہم تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے اور عجب نہیں کہ ان کے متعلق خیالی گھوڑے دوڑانے میں اپنے آن عزیزوں سے بھی بازی لے جاتے، اب اس قدر قریب آگئے ہیں جیسے کسی غیر معمولی طاقت کی دوربین نے معجزہ کر دیا ہو۔ اور یہ امکان بھی پیدا کر دیا ہے کہ ہم پشاور سے اڑیں تو کراچی جا پہنچیں، کراچی سے اٹھیں تو مری جا دھمکیں یا ادھر نہیں تو کوئٹہ، زاہدان کی طرف جا نکلیں۔ یہی احساس تھا جس کے ماتحت ہم نے تہیہ کیا کہ —— آؤ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی۔ اور کوئٹہ، بلوچستان، وادیِ بولان سب کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ خواہ یہ سیر زیادہ تر کوئٹہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقائی مشاہدات ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو۔

اگرچہ کراچی اور کوئٹہ میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے اور سفر کرتے وقت زمین ہے کہ آپ ہی آپ کہیں سے نکلتی ہی چلی آتی ہے لیکن بلوچستان کی ریگستانی فضا کی جھلک سبی سے نظر آنی شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے وادیِ بولان کا دروازہ کہتے ہیں۔ خود سبی نامی شہر میں بلوچ سردار میر چاکر خان رند کا قلعہ بلوچوں کی گزشتہ عظمت کا آئینہ دار ہے۔ علاقہ کیا ہے۔ لق و دق صحرا میں ریت کے تودے کے تودے اور ان چھوٹے تودوں میں کچھ کچھ فاصلے پر بڑے بڑے تودے جنہیں پہاڑ کہتے ہیں۔

انہی دنوں باران رحمت کے نزول کا نتیجہ تھا کہ سبی کا ردیتی جہنم بھی اعراف سا لگتا تھا۔ اور پھر سبی سے پار ہوئے تو سمجھئے وادی مہرنٹ سے نکل کر وادی بولان میں داخل ہو گئے۔ پہاڑوں کا چپ چاپ سونا سونا ماحول لحہ بہ لحہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اور پیلی پیلی فضا برابر سنہری آنچل پھیلائے ہی جاتی ہے۔ کیا یہ اس لئے ہے کہ یہاں کی ریت گندمک ملی ہے؟ اس لئے اینٹیں تک زرد ہیں۔ اور ان سے بنی ہوئی جو چھوٹی بڑی عمارت بھی نظر آتی ہے وہ ایک بڑا سہانا کندنی اور کہیں کتھئی رنگ لئے ہوئے ہے۔ جہاں تھوڑی تھوڑی بوٹیاں اگی ہوں وہاں ہلکی ہلکی ہری ہری جھلک نظر آتی ہے۔

ان سنہری، کتھئی، ہری ہری راہوں اور پہاڑی نالوں کی پتھریلی گذرگاہوں سے ہوتے ہوتے ہم بہت دور ہی نکل آئے۔ آب گم، مچ، سیر آب عجیب نام ہیں مچ یا مچھ بہت پیاری جگہ ہے۔ یہیں سے کوئٹہ اور اس کے گرد و پیش کا حقیقی ماحول جھلکنے لگتا ہے۔ اسقدر صاف ستھری نکھری نکھری فضا۔ وہ مقام جہاں چڑھائی اور بھی بڑھنے لگتی ہے اور سرنگوں پر سرنگیں، چھوٹی لمبی، بے شمار تیزی سے آنے لگتی ہیں۔ ریل ایک پُراسرار جیتے جاگتے دو منہ والے سانپ کی طرح کیونکہ اس کے آگے پیچھے دو انجن کوئلہ پھانکتے اور دھواں پھینکتے ہوئے لگے رہتے ہیں، پہاڑوں کے گرد چکر پر چکر کاٹتی ہی جاتی ہے۔ جس طرح ریل کی پٹری چٹانوں کا جگر کاٹ کاٹ کر بنائی گئی ہے وہ واقعی انجینئرنگ کا بہت بڑا کمال ہے۔ چاروں طرف اونچے پہاڑ، کچھ سنگلاخ، کچھ بھُربھُرے، بے اندازہ شکلیں اور صورتیں اختیار کرتے ہوئے، سلیٹی، بھوسلے، کتھئی، پیلے ملگجے، کالے بجنگے جیسے یہ زمین نہیں ایک دیو زاد ہے، کولپور وادی بولان کا بلند ترین ریلوے اسٹیشن ہے اس کی ڈھلان میں ایک نہایت خوشنما بستی، دامن کا یک نما چھوٹے چھوٹے گھروندوں سے بھرا پڑا، اور کہیں پہاڑوں میں کھود کھود کر بڑی استادی سے بنائے ہوئے ٹھکانے یا خانہ بدوشوں کے خیمے ہی عجب نظر سے

کہیں دور سفید بل کھاتی سڑک کوئلے کی خوفناک تاریک کانوں میں گھستی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں زندگی کا پیوند کٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

تاریخی جغرافیہ اور نسلوں کے گورکھ دھندوں سے قطع نظر سپیزنڈ نامی جنکشن اسٹیشن سے ایک اور بات بھی ابھرنے لگتی ہے۔ صدہا سال قدیم طرزِ زندگی۔ کاروانوں پر کاروان چلتے ہوئے۔ خانہ بدوش رہن سہن، اونٹوں کے ذریعہ چھوٹی موٹی کھیتی باڑی کشتن گذران۔ گداں یعنی خانہ بدوشوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے دور دور بکھرے ہوئے کبھی گرنچ یعنی سرد زمہریری ہوا اور کبھی لوار یعنی بادِ سموم کے شکار۔ شاید یہ اس بکھرے بکھرے غیر مربوط رہن سہن ہی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کی شاعری بھی آزاد ہے۔ یعنی قافیہ و ردیف کی بندشوں سے آزاد۔ ایران جانے والے سپیزنڈ ہی سے زاہدان کا رخ کرتے ہیں۔ اس خطے کا بین الاقوامی محل وقوع یہیں سے واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے جیسے ہم روس، افغانستان، مشرقی ترکستان، ایران اور اس سے بھی پرے بغداد، انقرہ، روم اور لندن جانے والی شاہراہ پر ہوں۔

زندگی کے ساتھ زبان میں بھی ایک خاص وضع نمایاں ہوتی ہے۔ میرآب، آب گم۔ خالص فارسی۔ یہ دو اسٹیشنوں کے نام ہیں۔ "میرآب" کی وجہ تسمیہ یہی ہو سکتی ہے کہ بستی کسی ندی نالے کے کنارے واقع ہوگی۔ وہ ندی نالے جو کبھی تو بالکل خالی نظر آتے ہیں اور کبھی آناً فاناً ایک گونجتا گرجتا اژدہا بن جاتے ہیں۔ "آب گم" شاید کاریز کا دوسرا نام ہو۔ پانی تو ان خشک پہاڑوں میں ہے ہی نایاب۔ اس لئے برسات کا جو پانی جمع ہوتا ہے وہ زیرِ زمین نالیوں سے گزر گزر کر کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور جہاں جہاں پانی ہو وہ جگہیں باغ و بہار اور گلزار در گلزار بن جاتی ہیں۔ یہ کاریز بڑی دلچسپ چیز ہے۔ ایران میں بھی بکثرت ہیں۔ چنانچہ وہاں کا مشہور بادشاہ بہرام گور گھوڑے سمیت زیرِ زمین دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ یہ کاریز تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھلے ہوتے ہیں بالکل کنوؤں کی طرح اور ان کے ارد گرد کنوؤں جتنی ہی بڑی بڑی مینڈھ باندھ دی جاتی ہے۔

کوئٹہ کے تیور۔ شہری، تہذیبی، قدرتی اس کی آمد سے پہلے ہی ابھرنے لگ جاتے ہیں۔ کارخانے، باغات، وادیاں، مکانات۔

کوئٹہ ایک پشتو لفظ کواٹ سے ماخوذ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں۔ کہتے ہیں سکندرِ اعظم کا ایک جرنیل وادیٔ مہران میں داخل ہوا تھا۔ یہ سطحِ سمندر سے ۵۵۰۰ فٹ بلند ہے۔ کوئٹہ کا ریلوے اسٹیشن بجائے خود شہر کا آئینہ دار ہے۔

آپ آتے ہی پانی کے بڑے بڑے نلکوں پر بکریوں کے گچھلک بالوں جیسے سیاہ ریشے لپٹے پائیں گے۔ یہ جاڑوں کی پیش بندی ہے جب روس سے آنیوالی سرد ہوا اور برف باری کے باعث نلکوں کے اندر پانی جم جاتا ہے۔ اور بعض اوقات وہ پھٹ بھی جاتے ہیں جیسا کہ امسال ہو بھی چکا ہے۔ برف باری کے زمانے میں کوئٹہ کے برف پوش پہاڑوں کا نقشہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مری اور ایبٹ آباد کا حریف۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھروں اور گلی کوچوں میں برف ہی برف نظر آتی ہے اور دروازے تک بند ہو جاتے ہیں۔ تب برف کھودنے والے برف کھود کھود کر راستے کھولتے ہیں اور گھروں میں بند لوگوں کو باہر نکلنے کا موقع دیتے ہیں۔ اتنا عرصہ بھنے ہوئے گوشت پر گزارہ ہوتا ہے جسے سجی کہتے ہیں۔

سارا شہر قدرتی طور پر صاف ستھرا ہے۔ نیچی نیچی چھتیں، چھوٹے چھوٹے ڈھیلے جیسے گھر، شاذ و نادر کوئی عمارت دو منزلہ یا اونچی۔ اینٹیں تمام پیلی پیلی، گندھک جیسی۔ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ اور کوئٹہ ایک خوشنما قطعے کی طرح ان کے درمیان گھرا ہوا۔

سڑکوں کے دونوں طرف بادام کے پیڑ ہی پیڑ، بیریوں سے بھی زیادہ عام اور جنگلی گلاب کے پودے جھکتے ہوئے پھولوں سے بھرے ہوئے اور باہر نکل جائیے تو یہی گلاب کے پودے انار، سیب، نارنگی، آڑو، گردالو، بہی وغیرہ کے پیڑ جھاڑیوں سے بھی زیادہ۔ گہرے سرخ رنگ کے گدرائے ہوئے سیبوں سے تو سارے پیڑ انگاروں کی طرح لال سرخ گیندوں کا پٹارہ معلوم دیتے ہیں۔ میلوں میل تک یہی نقشہ اور جہاں یہ نہیں وہاں بلا کی خوشبودار نفیس جھاڑیاں۔ انگور کی بیلیں جابجا پھیلی ہوئیں اور ان میں ہر قسم کے انگور لگے۔ جتنی گرمی ہو اتنا ہی انگور پکتا اور رسیلا بنتا ہے اور پک کر کھجور کی طرح مٹھاس دیتا ہے۔ ہر قسم کا بڑا انگور تو گویا شہد ٹپکاتا ہے۔ اور اتنا نازک کہ باہر نہیں جا سکتا۔ اور کسی کی طرف نکل جائیے یا کوئی پینتیس چالیس میل راستے ہی میں رک جائیں، جہاں ایک بہت بڑا

اقوامِ متحدہ:

مہاجرین کا عالمی سال

فضل حق قریشی دہلوی

عالمگیر نوعیت کے بعض مسائل پر غور و خوض کرنے اور بین الاقوامی سطح پر ان کو حل کرنے کا طریقہ کچھ عرصے سے مقبول ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں اقوامِ متحدہ کے ممبر ملک پیش پیش رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ارضی طبیعیات کا بین الاقوامی سال، جس کی مدت اٹھارہ ماہ تھی، نہایت کامیاب نتائج کے ساتھ حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ شاید اسی اندازِ فکر کے بموجب مہاجرین کا عالمی سال منانے کا خیال برطانیہ کے چند نوجوانوں کے دل میں پیدا ہوا جنہیں مہاجرین کی بحالی سے خاص دلچسپی تھی۔

کچھ دن بعد اقوامِ متحدہ کے مہاجر فنڈ کی مجلسِ انتظامیہ کے سامنے یہ خیال ایک تجویز کے پیرائے میں پیش ہوا جسے تبادلۂ خیالات کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۹۵۸ء کو منظور کر لیا گیا۔ پھر اقوامِ متحدہ کے دس ممبروں کی تحریک پر یہ موضوع اسی سال ۵ دسمبر کو جنرل اسمبلی کے تیرہویں اجلاس کے سامنے آیا اور ۵۹ موافق، ۱۰ مخالف اور ۹ غیر جانبدار ووٹوں سے منظور ہونے والی ایک نئی قرارداد کے ذریعہ اقوامِ متحدہ اور اس کے مخصوص اداروں کے ممبر ملکوں پر زور ڈالا گیا کہ وہ مہاجرین کا عالمی سال منانے میں پوری طرح تعاون کریں اور دامے، درمے، قدمے، غرض ہر صورت میں اعانت کر کے اس تحریک کو کامیاب بنائیں تاکہ ساری دنیا میں انسان دوستی کے نقطۂ نظر سے جملہ مہاجرین کی زیادہ سے زیادہ امداد اس طرح ہو سکے کہ پھر کوئی مہاجر اپنے آپ کو مہاجر نہ سمجھنے پائے۔

اس تجویز میں اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل مسٹر داگ ہامر شولڈ سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال کو فروغ دینے میں ایسے اقدامات سے کام لیں جو ان کے نزدیک معقول اور مناسب ہوں۔ اس تجویز کے مطابق سال منانے کی کارروائی جون ۱۹۵۹ء سے شروع کی جا چکی ہے۔

مہاجرین کے عالمی سال کی نوعیت، اہمیت اور افادیت کا بھرپور جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ مہاجرین کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

مہاجرین کا مسئلہ پچھلے بارہ سال میں صرف پاکستان ہی کے لئے پریشان کن نہیں رہا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے ساری دنیا میں اس نے تشویشناک صورت پیدا کر رکھی ہے۔ اسے قومی اور بین الاقوامی انداز میں حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے لیکن منزل ہر جگہ ابھی دور ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد درپیش ہوا لیکن یورپ اور مشرقِ بعید میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اور مشرقِ قریب میں تنازعۂ فلسطین کے بعد سے اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد عالمگیر پیمانے پر تعمیرِ نو کی غرض سے اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو اربابِ حل و عقد نے سیاست کے میدان سے ذرا ہٹ کر معاشرت و ثقافت اور انسان دوستی سے تعلق رکھنے والے بہت سے پہلوؤں پر بھی غور کیا اور ترقی کی مناسب تدابیر اختیار کرنے کے لئے چند ایسے ماتحت ادارے قائم کئے جن کے عملی دائرے الگ الگ رکھے گئے۔ ان میں سے ایک ادارہ یورپی مہاجرین سے بھی متعلق تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ لڑائی کے باعث بے گھر ہو جانے والوں کو یا تو وطن واپس بھیجا جائے یا نئے سرے سے نئی سرزمین پر اس طرح بسایا جائے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر کسی کے محتاج نہ رہیں۔ یہ بین الاقوامی ادارۂ مہاجرین اقوامِ متحدہ کے دوسرے مخصوص اداروں میں سے ایک تھا۔ لیکن پھر اقوامِ متحدہ نے اسے براہِ راست اپنے زیرِ انتداب کر لیا اور وہ مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے ہائی کمشنر کا دفتر کہلانے لگا۔

کچھ عرصے بعد ہنگری کے فسادات رونما ہوئے اور ہزاروں باشندگان ملک وطن چھوڑ کر آسٹریا اور یوگوسلاویہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ مہاجرین کے ہائی کمشنر نے ان کی آبادکاری وغیرہ کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا۔

اس سے بہت پہلے مشرقِ قریب میں اسرائیل کے ہنگاموں اور اس کی ہلاکت آفرینیوں سے تنگ آ کر بہت سے باشندگانِ فلسطین ترکِ وطن کے لئے مجبور ہوئے اور پڑوسی ملکوں میں چلے آئے تھے۔ ان کی آبادکاری اور بحالی کی ذمہ داری بھی اقوامِ متحدہ نے اپنے سر لے لی تھی۔ اس مقصد کے لئے

جو ادارہ قائم ہوا، وہ مہاجرینِ فلسطین سے متعلق اقوامِ متحدہ کا ادارۂ بحالیات و امور یا مختصر الفاظ میں "انروا" کہلاتا تھا۔

یہ دونوں ادارے ہنوز قائم ہیں اور تیزی سے کام کر رہے ہیں۔ البتہ کوریا کی تعمیرِ نو سے متعلق اقوامِ متحدہ کا ادارہ (انکرا) کسی نہ کسی طرح اپنا فرض ادا کر کے بند ہو چکا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد دونوں حصوں کے کچھ کچھ باشندے ایک علاقے سے ترکِ وطن کر کے دوسرے علاقے میں پہنچ گئے۔ ان کی آبادی کا کام اقوامِ متحدہ کے سپرد نہیں کیا گیا لیکن دونوں جگہ کے مسائل اس کے لئے باعثِ تشویش ضرور رہے۔

ایک اندازے کے مطابق دوسری عالمگیر لڑائی ختم ہونے کے بعد سے تقریباً چار کروڑ مرد، عورتیں اور بچے ترکِ وطن کر کے دوسرے علاقوں میں پناہ لیتے رہے۔ ان میں وہ مہاجرین بھی شامل ہیں جو سرزمینِ چین سے ترکِ وطن کر کے ہانگ کانگ اور تائیوان چلے گئے۔ آبادکاری کی انتہائی کوششوں کے باوجود ۱۹۵۸ء کے آخر تک شاید ڈیڑھ کروڑ انسان پھر بھی ساری دنیا میں پناہ گزیں کی حیثیت سے عارضی طور پر آباد تھے جبکہ اقوامِ متحدہ نے مذکورہ بالا قرار داد منظور کی تاکہ یہ مرحلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ ان ڈیڑھ کروڑ میں سے بیس لاکھ کے قریب مہاجرین کسی نہ کسی صورت میں اقوامِ متحدہ کی امداد کے محتاج تھے۔

مہاجرین کا عالمی سال شروع کر کے کوشش کی جانے لگی کہ دنیا میں ہر جگہ اس مسئلے پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، حکومتوں، رضاکار اداروں اور عوام سے مزید مالیاتی چندے جمع ہوں اور ایسی صورتیں پیدا ہوں کہ خالص انسان دوستی کی بنیاد پر مہاجرین کا باہمی تبادلہ برضا و رغبت عمل میں آسکے، ان کو دوسرے علاقوں میں الگ آباد کیا جا سکے یا مقامی باشندوں میں مدغم کر دیا جائے۔

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور اس کی تیسری کمیٹی میں بحث و تمحیص کے وقت اور پھر قرار داد کے الفاظ میں بات واضح کر دی گئی تھی کہ ہر ملک اپنی ضرورت، امکانات اور وسائل کے بموجب یہ سال منانے میں شریک ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ امید بھی ظاہر کی گئی کہ وہ ملک جن کو بذاتِ خود مسائل مہاجرین کا سامنا نہیں ہے۔ مختلف طریقوں سے اس اسکیم کی حمایت کریں۔ اور حیثیت مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے اس کنونشن کی توثیق کریں جو ۲۲ اپریل ۱۹۵۴ء سے نافذ ہے۔

اس سال جنرل اسمبلی اور اس کی تیسری کمیٹی میں جو معاشرتی، ثقافتی اور انسان دوستی کے امور سے تعلق رکھتی ہے، مہاجرین کا عالمی سال منائے جانے کا موضوع زیرِ بحث آیا تو مہاجرین کے ہائی کمشنر ڈاکٹر لنٹ نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ۱۹۵۸ء کے موسم خزاں تک یورپ میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار غیر آباد مہاجرین ایسے تھے جن کا تعلق ان کے دفتر سے تھا۔ ان میں سے چالیس ہزار اشخاص آسٹریا، وفاقی جمہوریت جرمنی، یونان اور اٹلی کے کیمپوں میں پڑے تھے۔ تاہم نئی کوششوں کی بدولت پچھلے سال نومبر کے شروع میں غیر آباد مہاجرین کی تعداد گھٹ کر ایک لاکھ دس ہزار رہ گئی جبکہ کیمپوں کی آبادی میں بھی اٹھارہ ہزار کی کمی ہو گئی۔

انہوں نے بتایا کہ ہنگری کے مہاجرین میں سے جو مختلف ملکوں میں پناہ گزیں تھے ستر ہزار چھ سو کا رضاکارانہ طور پر تبادلہ ہو چکا ہے۔ اب آسٹریا میں دس ہزار کے قریب باقی ہیں۔ ان میں سے ڈیڑھ ہزار کسی اور ملک میں چلا جانا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ بہت جلد ان میں سے ۸۰۰ ریاست ہائے متحدہ، ۱۹۶ آسٹریلیا، ۱۰۲ کینیڈا، ۳۷ جنوبی افریقہ، ۲۶ نیوزی لینڈ اور باقی یورپ کے چند دوسرے ملکوں میں چلے جائیں گے۔ جنہوں نے ان کو آباد کرنے کی حامی بھر لی ہے۔

الجزائر کے ایک لاکھ اسی ہزار مہاجرین تیونس اور مراکش میں عارضی طور پر مقیم ہیں۔ ایک خاص فنڈ سے جو مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے ہائی کمشنر کے ماتحت قائم ہے، ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جا رہی ہیں۔ ان ضروریات میں بعض اشیائے خوراک، لباس اور کمبل شامل ہیں۔ لیکن اس فنڈ کو قائم رکھنے کے لئے مزید چندے درکار ہیں۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان مہاجرین کو خود کفیل بنانے کے لئے مناسب تربیت دی جائے تاکہ سیاسی حالات سدھرنے کے بعد ان کے لئے وطن واپس جانے کی صورت پیدا ہو تو نئے سرے سے ان کی آبادکاری میں دقت نہ ہو اور وہ حکومت کے لئے بار نہ بنیں۔

ڈاکٹر لنٹ نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ۱۹۵۹ء کے لئے بین الاقوامی امداد کا جو حسبِ معمول پروگرام بنایا گیا تھا، اس پر ۴۷ لاکھ ڈالر خرچ ہونے تھے، لیکن پوری رقم جمع نہیں ہو سکی۔ اب مہاجرین کے عالمی سال کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو پروگرام ۱۹۶۰ء کا بنایا گیا ہے، اس پر ساری دنیا میں ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر خرچ ہونے کا اندازہ ہے۔ اس دوران میں کوشش کی جائیگی کہ یورپ میں مہاجرین کے تمام کیمپ خالی

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

فکاہیہ:

کیا زمانہ آلگا ہے!

تسلیم عارفی

بھائیو! زبان نہ کھلواؤ۔ سچ نہ بلواؤ۔ کیوں دار پر کھنچواتے ہو۔ دیکھیے نہیں کیا زمانہ آلگا ہے۔ وہ بھی زمانہ تھا جب ہر طرف چہل پہل، ہر سو گہما گہمی تھی۔ قدم قدم پر خوشیوں کے سوتے پھوٹتے تھے۔ اب یہ بھی زمانہ ہے کہ .... بھائیو! ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لوں، کوئی ہماری باتیں نہ سن رہا ہو!— دیکھ لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ابھی تک اپنی امان میں رکھا ہوا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا— کیا کہہ رہا تھا۔ اب تو اتنا بھی ہوش نہیں رہا۔ توبہ اللہ— کیا زمانہ آ لگا ہے۔ ہاں تو بھائیو! اس سنہری دور کو یاد کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کیا کیا نیک کام کئے تھے ہم نے۔ حج مبارک کے نیک فریضہ ہی کو لے لیجئے۔ ہر سال اپنی نیک کمائی سے حج کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ بیگمات بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ واپسی پر سونے سے لد کر آتی تھیں۔ کچھ جاہل لوگ اعتراض بھی کرتے تھے۔ مگر بھائیو! کیا عورتوں کیلئے سونا پہننا ہمارے مذہب میں ناجائز ہے۔ نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا فرض ہے۔ کیونکہ سونے کے زیور عورتیں نہیں پہنیں گی تو کیا مرد پہنیں گے؟ مگر بھائیو! اب تو آتے جاتے تلاشیاں ہوتی ہیں۔ تلاشیاں تو پہلے بھی ہوتی تھیں۔ مگر اب اور تب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو ہم جیسے الحاج حج مبارک کا فریضہ ادا کرنا ہی چھوڑ دیں گے۔ اور روز قیامت اس گناہ عظیم کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکومت کے سر ہوگی۔ موجودہ حکومت! سبحان اللہ۔ یہ نئے لوگ نجانے کس مٹی سے بنے ہیں۔ صرف تنخواہ پر کام کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو انکے بیوی بچے ہیں ہی نہیں یا پھر یہ انھیں بھوکا ننگا رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بھائیو! اولاد کی محبت بڑی چیز ہے۔ مگر یہ خاندانی منصوبہ بندی کرنے والے اولاد کی محبت کیا جانیں۔ یہ تو یہی جانیں کہ زیادہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔ کیونکہ آبادی اگر ملک کے ذرائع پیداوار سے اتنی بڑھ جائے کہ توازن قائم نہ رہ سکے تو

قوم مفلسی اور تباہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اخبار میں یونہی لکھا تھا۔ حالانکہ بھائیو! حقیقت یہ ہے کہ فوجی حکومت، جسے یہ جاہل قوم انقلابی حکومت بھی کہتی ہے۔ لوگوں سے صرف تنخواہ پر گذارہ کرانا چاہتی ہے .... ہمارے سنہری دور میں تو یہ مسئلہ کبھی پیدا نہ ہوا۔ ہم ہر کام کرانے کے بعد مساوات اور اخوت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے تمام متعلقہ افسران اور کارندوں کو اپنی نیک کمائی میں سے حصہ دیتے رہے۔ یوں ایک طرح ہم خیرات دینے کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے اور

طرہ باز خاں

اللہ ــ حالات کیا ٹھیک ہوں گے۔ کیسا زمانہ آ لگا ہے۔ کب اس پاگل حکومت سے جان چھوٹے گی۔ پاگل نہیں تو اور کیا۔ نہ اسے زر و جواہر سے محبت، نہ رشتہ داروں کا لحاظ، نہ دوستوں کا پاس۔ اور تو اور کسی کاروبار میں یہ فوجی لوگ اپنا حصہ تک مقرر نہیں کرتے۔ کیا پاگلوں کے سر سینگ ہوتے ہیں۔ بھئی جو اپنے فائدے تک کی نہ سوچے وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے۔ اسمگلنگ، چلیئے مان لیتے ہیں بری بات ہے۔ مگر اس جرم میں دوستوں تک کو جیل بھیج دیا ــ کہاں کی عقلمندی ہے

ثواب دارین بھی ملتا رہا۔ فوجی حکومت کی منطق ہی نرالی ہے۔ یعنی یہ کیا تک ہے کہ چیزیں سستی ہو جائیں تو تنخواہ میں گذارہ ہو سکتا ہے۔ بھئی! چیزیں سستی ہو جائیں گی تو دکاندار غریب ہو جائیں گے۔ اور اگر دکاندار ہم جیسوں سے سستے داموں خریدیں تو ہمیں نقصان ہو گا۔ ایک کروڑ کے پچاس لاکھ رہ جائیں گے۔ پچاس لاکھ کا نقصان! ہائے مر گئے

بھائیو! تم نے دیکھا ہوگا ان پاگلوں نے ہمارے کیسے کیسے بزرگوں کو ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں ہمارا تصور تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔ اب تو کسی غیر کے سامنے لب تک نہیں ہلا سکتے۔ آپ کے سامنے اس لئے زبان کھول رہا ہوں کہ آپ بھی میری طرح فلک کج رفتار کے ستائے ہوئے ہیں۔

سلطانیٔ جمہور

اگر ہم ایک دوسرے کے آنسو نہیں پونچھیں گے تو کیا آسمان سے فرشتے اتر کر ہمارے آنسو خشک کرینگے ؟ بھائیو ! آپ سوچ رہے ہونگے کہ فلک کج رفتار کے معنی کیا ہیں ؟ اس لفظ کے معنی تو میں خود بھی نہیں جانتا مگر مجھے یقین ہے کہ میں نے اسکا استعمال صحیح کیا ہے - کیونکہ میں نے اسے دو موقعوں پر استعمال ہوتے سنا ہے - ایک تو اس وقت جب میرے ایک مولوی دوست کو، جو ہوٹل کا مالک تھا ، صفائی کی مہم کے تحت فوجیوں نے جالی لگانے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت اسنے آسمان کی طرف دیکھکر یہ لفظ استعمال کیا تھا - اور دوسرا اس وقت جب ایک بہت بڑے افسر کو جو میرا دوست تھا سرکاری ملازمت سے الگ کر دیا گیا تھا - یہ فوجی کام زیادہ چاہتے ہیں - اور باتیں کم - تو بھائیو! اب اگر میرا دل باتیں کرنے کو چاہے - تو کیا کروں - ظاہر ہے ہونٹ سی لوں - منہ کو تالا لگالوں تا کہ اس حکومت کی خوشنودی حاصل کرسکوں - جی ، خوشنودی - دیکھا آپ نے کیا زمانہ آ لگا ہے -

ایں دفتر بے معنی۔۔۔۔

اللہ تبارک تعالیٰ اس پرانے زمانے کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جس میں محکموں کے بڑے بڑے افسر ہم ایسے شریفوں اور رئیسوں کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور انتہائی تپاک سے مصافحہ کرتے تھے - دفتر کے کام کاج چھوڑ کر ہماری خاطر مدارات کرتے تھے - مگر اب تو کلرکوں تک کو ایسی ہوا لگی ہے کہ ہمیں پہچاننے کی بھی کوشش نہیں کرتے - اگر ہم سے ایک ذرا سی بھول نہ ہوتی تو یہ جاھل عوام اس فوجی حکومت کو خوش آمدید نہ کہہ سکتے - وہ یہ کہ ہم شریفوں اور رئیسوں کا طبقہ دو تین گروہوں میں بٹ گیا - اور انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھکر فائدہ اٹھانے کی خاطر مختلف سیاسی جماعتیں بنا ڈالیں - جو آپس میں جھگڑ پڑیں - اور لوگوں کو بےاطمینانی کے اظہار کا موقع مل گیا - اگر ہم میں اتحاد رہتا تو سیاسی جماعتوں میں بھی اتحاد رہتا - اور یوں ساری عمر یہ کمینے اور بھوکے ننگے لوگ ہم جیسے شریفوں کے سامنے سر اٹھاکر نہ چل سکتے اور فوج کو کبھی موقع نہ ملتا کہ انکی رہائی کیلئے میدان میں اترتے - مگر افسوس ہماری یہ ذرا سی بھول ایک بہت بڑی خطا ثابت ہوئی - جسکا خم — خم — وہ کیا لفظ تھا - ھاں ھاں — خمیازہ ہمیں آج بھگتنا پڑ رہا ہے - مگر بھائیو! غیب کا علم کون

ہم خرما و ہم ثواب!
(حج بیت‌اللہ سے واپسی)

'' مہاجر کو بھیجہ.... ''

جانتا ہے ۔ عالم الغیب تو بس اللہ ہی کی ذات ہے ۔ لیکن فوج میں ذرا بھی ایمان کی رمق ہوتی تو وہ ہماری صلح کرادیتی ۔ مگر بھائیو! وہ تو ہمارے خدا واسطے کے دشمن ہیں ۔ اسے ہم خاندانی شریفوں کا سکھ چین سے رہنا کب گوارہ تھا ۔ بھلا یہ کوئی شرافت ہے کہ زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر کے بقیہ ان کمینے اور کنگال کسانوں کے حوالے کر دی جائے جن کے باپ دادا نے بھی کبھی ملکیت کا تصور نہ کیا ہو ۔ جن لوگوں کو ہم سبز باغ دکھاتے تھے اب تو سچ مچ ان باغوں کے مالک بن رہے ہیں ۔ فوجیوں کے کھیل سچ مچ نیارے ہیں ۔ یعنی تیرے نام کی خاطر جو لوگ گھر بار چھوڑ کر پاکستان آئے اور مہاجرین کہلائے انہیں اب آباد کر کے مہاجرین اور انصار کی تمیز ہی ختم کر دی جائیگی ۔ دیکھا بھائیو! مہاجرین کے خلاف کیسی کیسی سازشیں ہو رہی ہیں ۔ گو میں خود انصار ہوں مگر سوچئے تو یوں بھی کسی کو مٹایا جاتا ہے ۔ بھائیو! ایک نئی بات سنی آپ نے ۔ میری مراد بنیادی جمہوریتوں کے قانون سے ہے ۔ آپ حیران نہ ہوں ۔ پہلے میری سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا کہ یہ کیا بلا ہے ۔ مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے شروع ہی سے علم حاصل کرنے کا شوق رہا ہے ۔ اسلئے معلوم کر ہی لیا کہ اس قانون کے تحت دیہات میں انتخابات ہونگے ، پنچایتیں بنینگی ۔ مگر ہم لوگ انتخابات میں ، جیسے کہ امید ہے ، حصہ نہیں لے سکینگے ۔ صرف غریب اور جاہل دیہاتی اپنے نمائندے چنینگے ۔ اور یوں دیہات کے اکثر ضروری معاملات وہیں طے ہو جایا کرینگے ۔ یعنی آپ سن رہے ہیں ۔ ننگے بھوکے چھوٹے پیمانے پر حکومت کرینگے! ہم شریفوں اور رئیسوں سے پوچھے بغیر اپنے نئے سکول ، ہسپتال اور کھیلوں کے میدان تیار کریں گے ۔ بھائیو! ہنسی نہ آئے تو کیا آئے ۔ ہر روز ایک نیا اور عجیب تماشہ لگ رہا ہے اس ملک میں ۔ یہ رائٹ ٹو فٹ کرنے والے کیا جانیں کہ سیاست کیا شے ہے؟.......... کیا کہا ؟ آپ سمجھائینگے مجھ کو ؟..... عدالت میں لے جا کر ؟ تو کیا آپ میرے ہم خیال نہیں ہیں ۔ بھائیو! انہیں کچھ سمجھاؤ ۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ آپ کی طرح میرے ہم خیال ہیں ۔ میری ہی طرح فلک کج رفتار کے ستائے ہوئے ہیں ۔ کیا تمہا ہوش ٹھکانے لگ جائینگے؟ .... یہ میں کیا سن رہا ہوں ۔ توبہ ! یا اللہ توبہ ۔ کیا زمانہ آ لگا ہے !!

جائیں تو جائیں
کہاں؟
ان فوجیوں نے
تو زمین کا بھی
راشن کر دیا!

دونوں ہی جگہ لوح وقلم کی پرورش بڑے انہماک سے ہوتی رہی۔ بنگال کی
خطاطی کا مطالعہ اپنی جگہ ایک علمی و [illegible]
میں اسی پر [illegible]

بنگال میں خطاطی [illegible] مساجد اور تاریخی عمارتوں
کی کتبات [illegible]
موضوع پر [illegible]
میں ان چیزوں [illegible]
[illegible] INDO - MOSLEM [illegible]
تاریخ نے بڑی [illegible] کے ساتھ [illegible]
ہیں۔ پاکستان کے اس حصے میں [illegible]
یہ عمدہ نمونے کہاں کہاں موجود ہیں ان کا کوئی مبسوط مطالعہ کبھی کیا گیا ہے نہ
مواد ہی میسر ہے۔ پھر بھی بعض علمائے تاریخ و آثار نے اس طرف توجہ ضرور کی ہے
مثلاً ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ دانی نے ۱۵۳۸ء تک کے کتبات بنگال کی ایک فہرست
مرتب کی ہے۔ لیکن انہوں نے بھی پاکستان کے اس حصہ میں فنِ تحریر پہ کوئی خاص
روشنی نہیں ڈالی ہے اور مطالعہ کا یہ پہلو ہنوز تشنہ ہے۔

عجائب خانہ ڈھاکہ کے چند اہم ذخیرے: اس وقت
ڈھاکہ کے عجائب خانہ میں مشرقی پاکستان کے کوئی بیس کتبات محفوظ ہیں۔ ان میں
سے کوئی چھ الیاس شاہی اور حسین شاہی دور کی یادگار ہیں اور باقی عہدِ
مغلیہ کے۔ "ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" کے جرنل (۱۹۲۲-۵۲ء) میں
ان کتبات کے نمونے طبع ہوتے رہے ہیں۔ نیز "ڈھاکہ ریویو" اور کتاب [illegible]
(ANTIQUITIES OF DECCAN) (سید اولاد حسین) میں بھی کچھ
نمونے موجود ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں بھی فن خطاطی، اس کی خصوصیات اور
خوبصورتیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔

ضیاء الدین نے اپنی کتاب "اے مونوگراف آن مسلم کیلیگرافی"
"A MONOGRAPH ON MUSLIN CALLIGRAPHY"
میں مشرقی پاکستان کے فن خطاطی پر بیشک ایک معقول نظر ڈالی ہے۔ ایک
جگہ وہ لکھتے ہیں: "عہد انگریزی سے قبل بنگال میں آرائشی طغریٰ
نگاری کے جو اسلوب نظر آتے ہیں اس کی بہترین مثالیں ہمیں ۱۵ ویں
صدی کے [illegible] میں نظر آتی ہیں۔" لیکن مشرقی اور مغربی بنگال میں طغریٰ
کے علاوہ دیگر خطوں کی پرورش کس طرح [illegible] پیمانہ پر ہوتی رہی
اس بارے میں یہ کتاب بھی خاموش ہے۔ مگر میں اس مقالہ میں یہ بات

پیش کرنے کی کوشش کروں گا کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے یعنی مشرقی
پاکستان [illegible] دوسرے
[illegible] مثلاً کوفی، نسخ اور [illegible] نہیں کہ
[illegible]

قدیم ترین نمونہ ہائے کتابت: کتابت کے سلسلے
میں سب سے پرانا نمونہ جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے رکن الدین
کیکاؤس (نبیرہ غیاث الدین بلبن) کے عہد (۱۲۹۱ – ۱۳۰۱ء) [illegible]
کا ہے جو تریبنی اور گنگا رامپور کے کھنڈرات سے دستیاب ہوا ہے۔
رسم عربی ہے اور نسخ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ شمس الدین الیاس شاہ
(۱۳۴۲ – ۵۷ء) کے عہد کا بس ایک ہی نمونہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ نمونہ
آج کل کی ایک مسجد سے ملا ہے، یہ عام اینٹ کی بنی ہوئی مسجد ہے اور کلکتہ
کے پاس "بنیاپوکور" میں بنی ہوئی ہے۔ یہ کتبہ دو سطروں میں ہے
رسم عربی اور خط طغریٰ ہے اور "طرہ تحریر" یعنی اردگرد کی جدول یا حاشیہ
کے خط سادہ ہیں۔ اسے بنگال کی خطاطی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔
حروف کے کھڑے حصوں کو ایسی خوبصورتی کے ساتھ سجا کر مرتب کیا گیا ہے
جیسے نیزوں کی قطاریں چلی گئی ہوں۔ سکندر شاہ کے عہد (۱۳۵۸ – ۸۹ء)
میں نسخ، ثلث اور کوفی کا رواج بڑھا۔ طغریٰ کو بھی اپنی جگہ مقبولیت
حاصل رہی۔ اس وقت بنگال میں خط کوفی کا ایک ہی نمونہ رہ گیا ہے اور
وہ مسجد آدینہ میں پایا گیا ہے، جو پانڈوہ کے مقام پر ہے۔ پیش امام
کی محراب میں ایک پتھر پر یہ کتبہ کندہ ہے۔ اور قابل دید نمونہ ہے۔
خط کوفی کو قرآن مجید اور سکوں کی کتابت کے لئے عرصۂ دراز سے مخصوص
رکھا گیا ہے۔ ابتدا میں یہ بالکل سادہ ہوتا تھا۔ مگر بعد کو اس میں پیچیدگی
اور طرح طرح اضافے اس طرح کئے گئے کہ خط کوفی سے نمائش و زینت اور آرائش
و نگارش [illegible] کا کام زیادہ لیا جانے لگا۔ اور بارھویں صدی کے
پہنچتے پہنچتے خط کوفی [illegible] گنجلک [illegible] ہو گئی کہ اس کو پڑھنا سوائے

مشاق کاتب دمشق ہی کے اور کسی کے بس کا نہ رہا۔

ہندوستان میں خطِ کوفی کی کمیابی: اس رجحان کے خلاف ایک ردِ عمل بھی ہوا اور ۱۳ ویں صدی کا آخری عشرہ بدلی شروع ہو گئی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اسلامی ہندوستان سے اس خط کا رواج ہی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف بنگال بلکہ پورے برصغیر میں خطِ کوفی کے قابلِ قدر نمونے بہت ہی کمیاب ہیں۔ ہندوستان کی بعض کافی قدیم عمارتوں میں بیشک کچھ نمونے محفوظ رہ گئے ہیں۔ جیسے مسجد قوۃ الاسلام " (دہلی: ۱۱۹۱ء)، مقبرہ سلطان التمش (دہلی: ۱۲۳۵ء) اور مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا (اجمیر: ۱۲۰۰ء) مجھے مشرقی اور مغربی پاکستان میں کسی جگہ بھی خطِ کوفی کا کوئی ایسا نمونہ نہیں ملا جسے کوفی کا "طرفہ اسلوب" کہہ سکتے ہیں۔ اس اسلوب میں یہ رعایت برتی جاتی ہے کہ افقی اور عمودی خطوں کو جزئیے یا جالی کی شکل میں مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی کا نمونہ گولکنڈہ (دکن) میں دکھائی دیتا ہے (مزار محمد امین۔ ۹۷۶ھ) اسی طرح کا ایک نمونہ بنگال میں بھی بمقام گنگا رامپور، موجود ہے۔ یہ بھی ایک مزار ہے (مزار شاہ، عہد سکندر شاہ) ۔ اس کتبہ میں بھی چار سطریں قائم کی گئی ہیں۔ رسم عربی اور فارسی ہے۔ خط صاف ثلث ہے۔ یہ نمونہ بڑا ہی نفیس اور پختہ کاری کی اچھی مثال ہے اور ابھی تک ثابت و سالم ہے۔

خطِ ثلث میں ایک اور نادر نمونہ: جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جلال الدین محمد شاہ (۱۴۱۰-۱۴۳۲ء) کے عہد کا ایک ہی نمونہ دستیاب ہے۔ یہ ایک کتبہ ہے جو ڈھاکہ کے پاس مندرہ نامی جگہ سے ملا ہے اور اب ڈھاکہ میوزیم میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ کتبہ پتھر پر ہے۔ رنگ سیاہ ہے۔ ایک رخ کندہ کاری سے ہے پشت پر کسی ہندو [illegible] مورتی کی نمود، مسخ حالت میں، دکھائی دیتی ہے۔ صرف تین سطریں پوری [illegible] ہیں اور چوتھی سطر (جزواً) پچی کاری کے [illegible]

ایشیاٹک [illegible]

بتایا گیا ہے کہ [illegible]

ہے۔ وجہ یہ [illegible]

جن میں نکالے [illegible]

عروض کے [illegible]

ان کے مقابلہ [illegible]

ملی ہیں۔ [illegible]

کہ ثلث ایسا خط ہے کہ اس میں [illegible]

[illegible] کا عہد

اور اگر خطوط صاف مستقیم ہوں ثلث جلی ہو گا اور نسخ خفی۔ ثلث میں حروف کی قامت و ہیئت مثلِ خنجر ہوتی ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ثلث ایک تزئینی روش ہے مگر خط فی الاصل نسخ ہی ہے۔

ثلث کا ایک اور نمونہ: ڈھاکہ کی میوزیم میں ایک اور کتبہ بھی محفوظ ہے جو اس شہر کی "ناس والا گلی" کی کسی مسجد سے حاصل کیا گیا تھا۔ سید اولاد حسین نے اپنی کتاب NOTES ON THE ANTIQUITIES OF DECCAN میں اس پر نظر ڈالی ہے مگر انہوں نے بھی اس کے فن پر گفتگو نہیں کی ہے۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ناصر الدین محمود شاہ اول (۱۴۵۸ء) کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی تحریر دو سطروں میں ہے اور رسم عربی ہے۔ ہر دو سطور کے درمیان افقی تحریک آرائش کی گرہوں میں ہم آہنگی دکھائی گئی ہے خط ثلث ہے۔ کتبہ کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ اسی بادشاہ کا ایک اور کتبہ پانڈوا کے مقام پر ملا ہے۔ اس کتبہ میں تیکھے عمودی خطوط کی آرائش بہت بہار دیتی ہے۔ مد و حروف کی بیٹھک میں قلم گھٹتا ہوا لگایا گیا ہے۔

رکن الدین باربک شاہ (۱۴۵۹-۱۴۷۴ء) کے زمانہ کا ایک کتبہ بشیرہاٹ میں ملا ہے جو "چوبیس پرگنہ" کا علاقہ ہے۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس اعظم نے ۸۷۰ھ میں کوئی مسجد تعمیر کرائی تھی یہ اس پر نصب تھا۔ کتبہ پر چار سطریں ہیں اور معمولی روش میں خط نسخ لکھی گئی ہیں۔

بنگال میں خطِ طغریٰ کا دورِ زریں: بنگالہ کا بادشاہ علاء الدین حسین شاہ اپنے وقت میں بہت مقبول حکمراں گزرا ہے اور اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی۔ اس کے دور کو بنگالہ میں خطاطی کا دورِ زریں کہا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کو فنونِ لطیفہ سے خصوصی لگاؤ تھا اور خطاطی کو بطورِ خاص پسند کرتا تھا۔ بہت سے نادر نمونے اس کے عہد کے کتبات شائع [illegible] انہیں دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا [illegible] عہد (۱۵۳۸-۱۴۹۳ء) خطاطی کے عروج کا زمانہ [illegible]

[illegible] (مزار [illegible] گولکنڈہ، دکن)

ڈھاکہ کی میوزیم میں ایک اور نادر کتبہ محفوظ ہے۔ یہ حاجی بابا صالح کی مسجد سے ملا تھا۔ یہ مسجد ڈھاکہ کے پاس نرائن گنج میں ہے اور اس جگہ جسے "بندر" کہا جاتا ہے۔ سید اولاد حسین نے اس کتبہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر یہ کس روش میں لکھا گیا ہے اس کی نشان دہی نہیں کی جا سکی ہے۔ کتبہ سے اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد حاجی بابا صالح نے علاء الدین حسین شاہ کے زمانہ میں تعمیر کروائی تھی چونکہ اس سنگی کتبہ کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر چکا ہے۔ اس لئے صحیح سنِ تعمیر معلوم نہیں ہو سکتا۔ کتبہ کی زبان عربی ہے اور تحریر کا خط ثلث ہے جسے پیچیدہ آرائش سے مزین کیا گیا ہے۔ حروف کی قامت بلند ہے اور پٹیاں نہایت نفاست کے ساتھ قائم کی گئی ہیں۔ مگر مقابلۃً دائری گردشیں ناقص العمل ہیں۔

فتحِ سلہٹ کا تاریخی کتبہ: "ڈھاکہ ریویو" اور "جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۲ء میں ایک بہت عجیب دو رخہ کتبہ طبع ہوا ہے جو آج کل ڈھاکہ میوزیم میں موجود ہے۔ اس کے خط کا بھی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ یہ کتبہ شاہ جلال سلہٹی کے مزار سے حاصل ہوا ہے اور اب تین ٹکڑوں میں ٹوٹ چکا ہے۔ ایک رخ پر جو عبارت درج ہے اس سے سلہٹ کی فتح کا سن معلوم ہو جاتا ہے یعنی یہ مسلمانوں نے ۷۰۳ھ میں فتح کیا جو شمس الدین فیروز شاہ کا عہد تھا۔ خط نسخ ہے اور عربی رسمِ عربی ہے۔ کتبے کے دوسرے رخ کو پڑھنا مشکل ہے کیونکہ تحریر بہت ہی گنجلک ہے اور قلم کو اس طرح گردش دی گئی ہے کہ سرتا سر ایک لہریا بنتا چلا گیا ہے اور حروف کی نشست کا سمجھنا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ موسم نے اس "پتھر کی لکیر" کو بھی چاٹ لیا ہے!

اب میں کچھ طغریٰ کی بابت عرض کرنا چاہتا ہوں۔ عام طور پر طغرے کا خیال ہے کہ طغریٰ علیحدہ کوئی خط نہیں ہے بلکہ آرائشی نمود ہے جس میں حروف کو اس طرح تانے بانے میں الجھایا جاتا ہے کہ اس کا پڑھنا بڑا مشکل کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ کسی بھی روش تحریر کو ایک اچھے ڈھانچے میں سمو دیا جاتا ہے۔

خطِ طغریٰ کے ابتدائی نمونے: بنگال اور مشرقی پاکستان وغیرہ میں اس خط کو مغلوں کے عہد سے پہلے بڑا فروغ نصیب ہوا۔ مگر اس بات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بنگال میں اس کی مقبولیت کیوں زیادہ ہوئی۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس خط کو پتھر پر منتقل کرنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں قدرتاً موجود ہیں یعنی راج محل کے علاقہ میں پتھر کی چٹانیں۔ یہ پتھر کھدائی کے لئے نرم بھی ہے اور چکنا بھی۔ اس میں دانہ بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے حروف کی نشست بہت خوبصورت آتی ہے۔ یہ پتھر کافی پائیدار بھی ہوتا ہے۔

خطِ طغریٰ کی تین منازل: دورِ مغلیہ سے قبل بنگال میں یہ خط تین منازل سے گذرا۔ دورِ اول میں افقی خطوط کھینچے اور سیدھے تھے اور نیزوں کی باڑھ کی طرح ایستادہ رکھے جاتے تھے۔ اندازِ نگارش ثلث کا ہے یعنی افقی خطوط میں خم اور نیم دائروں کی گردش شامل ہے۔ دوسرے دور میں ایسا لگتا ہے کہ خاردار نیزوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ تیسرے دور میں ن، ص، ق، ی اور بعض دوسرے حروف جو تقریباً مدور ہوتے ہیں، ایک ہی جھٹکے پر لائے گئے۔ یہ خم قوس نما ہوتا تھا بلکہ کمان کی مثال، اوپر کے مستقیم خط ہیں جو نیزوں کی انیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اسی مماثلت کی وجہ سے یہ اسلوب "تیر کمان" کہلایا۔ یہ طغریٰ کا خاص عمل

طغریٰ۔ "تیر کمان" اسلوب (عہدِ علاء الدین حسین شاہ) سا گرہ کی موجود ہجو)

تھا جو بہت مقبول ہوا، بالخصوص خود مختار سلاطین بنگالہ کے عہد میں۔

دکن میں طغریٰ کی روش : بنگالہ کے ساتھ ساتھ دکن میں بھی طغریٰ کو قبول حاصل رہا۔ بالخصوص سولہویں صدی میں۔ چنانچہ قطب شاہی حکمران محمد امین (گولکنڈہ) کے مقبرہ پر سنگی لوح کو دیکھئے (سن ۱۰۴۴ھ)۔ اس کا خط بھی طغریٰ ہے اور بڑا نفیس۔ ایک اور کتبہ حیدرآباد شہر میں ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسجد پر نصب تھا اور یہ مسجد ۱۰۳۲ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کا خط بھی طغریٰ ہے۔ میرا خیال ہے کہ دکن کا فن خوشنویسی غالباً بڑی حد تک مشرقی پاکستان کی روش سے متاثر تھا۔ مشرقی پاکستان میں ایک اور روش طغریٰ بھی دکھائی دیتی ہے جس کا "نفیری" کی شکل سے تعلق ہے۔ یہ جلال الدین محمد شاہ (سلطان بنگالہ) کے سکوں پر دیکھئے۔ جونپور کے سلاطین شرقی نے بھی اس خصوصی روش کو بہت برتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نفیروں کی قطار بندی دور تک چلی گئی ہے۔ یہ عجیب طرز جونپور میں بنگالہ سے پہنچی۔

طغریٰ کے چند اور نادر نمونے : سلہٹ میں ہاٹ کھولا کے مقام پر ایک مسجد خورشید خاں نے بعہد رکن الدین باربک شاہ (۱۴۵۹-۷۴ء) تعمیر کرائی تھی۔ اس پر ایک سطری کتبہ بزبان عربی ملا ہے۔ خط طغریٰ ہے، مگر خوبصورتی کم ہے۔ لیکن ایک اور کتبہ کلکتہ کی میوزیم میں رکھا ہے۔ جو شمس الدین مظفر شاہ کے عہد کا ہے یعنی (۹۳-۱۴۹۰ء) کا۔ اس نقش میں دو سطریں ہیں۔ زبان عربی ہے۔ ہر سطر [illegible] افقی خط گزرتا ہے اور روش وہی تیر کمان کی رکھی گئی [illegible] میں خط طغریٰ میں کچھ اور بھی گل بوٹے لگائے [illegible] اور پیچیدہ اشکال کی طرف رجحان بڑھ گیا۔ [illegible] سطریں ماند پڑ گئیں۔ اسی طرح مرشد آباد کے مقام پر بارگرام [illegible] ایک کتبہ ملتا ہے یہ علاء الدین شاہ (۱۴۹۳-۱۵۱۸) کے زمانہ کا تھا۔ یہ بھی ایک مسجد کی تعمیر کو ظاہر کرتا ہے۔ جو کسی امیر ملک عطا نے بنوائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مشرقی پاکستان میں اس سے بہتر طغریٰ کہیں نہیں ہے۔ اس کی طرز بھی تیر کمان کی ہے۔ [illegible] میں [illegible] الدین حسین شاہ کے زمانہ کا ایک [illegible] کتبہ بھی قابل ذکر ہے [illegible] طغریٰ ہے۔ [illegible] قدیم طغرہ [illegible] ہے۔ [illegible] خطوط [illegible] کی طرح بہت [illegible] اور [illegible] مرتب [illegible] ہیں۔

[illegible] الدین نصرت شاہ کے زمانہ (۱۵۱۸-۳۲ء) کا ایک کتبہ [illegible] ملا ہے۔ یہ بھی مسجد کی تعمیر سے متعلق ہے۔ [illegible] نے تعمیر کرایا تھا۔ دو سطریں ہیں۔ خط

طغریٰ ہے، بیچ میں سے خط لہریا بناتا ہوا گزرتا ہے۔ قلم بہت معمولی ہے اور فنی آب داری سے معرّیٰ ہے۔ اسی بادشاہ کے زمانے کے دوسرے کتبوں میں بڑی نفاست نظر آتی ہے۔ ڈھاکہ کی میوزیم میں سلطان نصرت شاہ کا ایک کتبہ محفوظ ہے اور مشرقی پاکستان کے چند بہترین کتبات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ انصار خاں (اشرف بعد بطلے پور پولیس سٹیشن) کے مکان سے دستیاب ہوا تھا۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک مسجد کی تعمیر کے لئے بنا تھا۔ سن تعمیر مسجد ۹۳۰ھ ہے۔ یہ پتھر کی سل [illegible] موٹی ہے اور دو سطروں میں بزبان عربی تحریر ہے۔ خط طغریٰ بیلدار [illegible] کمان کے تیر لگا کر حروف کا ڈول بنایا گیا ہے اور بہت عمدہ [illegible] تیار ہوا ہے۔ حروف کی قامت، دوائر اور جوڑوں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ہر لفظ کے بیچ میں خوبصورت بیلیں لپٹتی ہوئی چلی گئی ہیں۔

یہ بات تعجب کی ہے کہ خود مختار سلاطین بنگالہ کے عہد میں قریباً قریب سب کے سب کتبے صرف عربی میں ہیں اور فارسی میں، یا عربی فارسی میں ملے جلے، کم ہیں۔ میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ زبانِ عربی اور علوم عربی کا بنگالہ میں چونکہ بڑا چرچا رہا ہے اس لئے زبان اور خطِ عربی کی طرف رجحان بھی زیادہ رہا ہے۔

خطاطی کے [illegible]

پاکستان کے علاقے میں خطاطی کے فن کا عروج عہد مغلیہ سے قبل [illegible] پر رہا۔ مگر مغربی پاکستان کے علاقوں اور شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں جو روش تھی اس [illegible] کچھ بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ بنگالہ میں تیر کمان اور نفیر کی طرزیں مقبول رہیں۔ دہلی میں جو روش تھی اس کو دیکھئے تو توانائی شکوہ اور شوکت کا احساس ہوتا ہے بنگالہ کی روش میں نفاست اور نادرہ کاری کی طرف میلان زیادہ ہے۔

نستعلیق کی ابتدا : بنگالہ کے مسلمان حکمرانوں نے جب [illegible] سلاطین کی بالادستی تسلیم کر لی [illegible] بہت سی باتیں بھی اثر انداز ہوئیں۔ خط کے باب میں [illegible] نستعلیق [illegible] اسی وجہ سے شروع ہوا۔ مغربی پاکستان میں نستعلیق کا رواج دور [illegible] ہوا اور مشرقی پاکستان بھی اسی اثر کے دائرے میں آ گیا [illegible] نستعلیق [illegible] چلا کر دوسرے خط معدوم ہی ہو گئے [illegible] کے عہد میں بقول ابو الفضل نستعلیق کے [illegible] چاند لگ گئے [illegible] بنگالہ کی میوزیم میں عہد مغلیہ کے کئی کتبے [illegible] ہیں مگر یہ خط نسخ میں ہیں۔ ان کی طرزیں دیکھنے سے معلوم ہوتا

ہے کہ دوائر اور قلم کی گردشوں پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ نستعلیق خط میں حروف کے دوائر کو بیضوی رکھا جاتا تھا۔ نرائین گنج سے کوئی پانچ میل دور جنوب کی جانب واقع دیوان گنج میں ایک خشتی پل ہے جس پر ایک کتبہ نصب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لالہ راج مل نے ۱۱۰۴ھ میں تعمیر کرایا تھا یعنی عہد اورنگ زیب میں۔ چار سطریں ہیں۔ ایک شعر فارسی کا مسلسل چلا گیا ہے۔ روش نستعلیق ہے۔ ایک اور کتبہ کمبتی خانہ (ڈھاکہ) کی ایک مسجد میں سے ملا ہے۔ یہ مسجد ۱۸۹۷ء کے زلزلہ میں تباہ ہو گئی تھی۔ سن تعمیر ۱۱۱۷ھ معلوم ہوتا ہے۔ عبارت فارسی۔ بانی کا نام مسعود ہے۔ طرز خط نستعلیق ہے۔ مگر معمولی۔ "قدم رسول" کی زیارت گاہ نرائین گنج کے بالمقابل بنی ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر نوغلام نبی خاں نے ۱۱۹۱ھ کرائی۔ اس کا کتبہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس زیارت گاہ کی بنا کسی شخص معصوم خاں کابلی نے رکھی تھی۔ اور قدم رسول کا نقش یہاں زیارت گاہ عام ہو گیا۔ سید حسین نے اس کتبہ کی صرف عبارت دینے پر اکتفا کیا ہے۔ زبان فارسی ہے، خط نفیس نستعلیق۔ نستعلیق کا ایک اور نمونہ باقر گنج کی ایک مسجد میں ملا جو سلطان کوڑی نام کے گاؤں میں واقع تھی۔ اس مسجد کی بنا کسی صاحب غلام محمد نے ڈالی تھی اور یہ ۱۵۱۱ء میں مکمل ہوئی۔ غالباً اس سے بہتر اور نفیس خط نستعلیق پورے مشرقی پاکستان میں کہیں نہیں ملا۔

دورِ مغلیہ میں نستعلیق کو رواج عام ہوا مگر نسخ بھی نظر سے اوجھل نہ رہا۔ خود بہادر شاہ ظفر تک کی ایک وصلی خط نسخ میں ملی ہے۔ ملکہ نور جہاں کے اکثر فرامین خط طغریٰ میں لکھے گئے ہیں۔

برصغیر میں بالعموم اور مشرقی پاکستان میں بالخصوص فنِ خط کی جو روش رہی ہے اس کا مختصر تعارف ان چند سطروں میں پیش کیا گیا۔ اس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلاطین وقت، امراء اور اشراف وقت نے فنِ خط کو بہت قدردانی کی نگاہ سے دیکھا اور فنکاروں کی ہمت افزائی کی۔ ان فنکاروں نے اپنے جو جوہر دکھائے ہیں ان سے نہ صرف پرورشِ لوح و قلم ہوتی رہی ہے بلکہ تاریخ بھی محفوظ ہو گئی ہے۔ اگر یہ کتبے، کتابے، اور وصلیاں نہ ہوتیں تو عمارتیں اور احوال و واقعات سب گونگے ہوتے اور ان کی خاموشی کی وجہ سے ان کی تاریخی اہمیت کم ہو جاتی ◆

اک شمع رہ گئی تھی

بقیہ صفحہ ۱۹

ہے۔ باوجودیکہ موضوعات کے اعتبار سے ان کی غزلیں بھی اصلاحی اور ملّی مضامین کی حامل ہیں اور بعض موقعوں پر وہ خالص فلسفیانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں لیکن انہوں نے غزل کے فطری مزاج اور اس کی روایتی دلکشی اور رکھ رکھاؤ کو حالی کی طرح بڑے فن کارانہ طور پر قائم رکھا ہے۔

ابھی تک کافری سے عقل ایماں تک نہیں پہونچی
کہیں دیر و حرم کے درمیاں معلوم ہوتی ہے

زاہد شعورِ حسن سے بیگانہ ہی رہا
حسنِ نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
خود اپنے لئے اور زمانے کے لئے اور

ہمت ہے تو پیدا کر فردوسِ حیات اپنا
بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

مندرجہ بالا اشعار خالصتاً اقبالؔ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ خصوصاً وہ مسلسل غزل جسے انہوں نے "خطیب سے خطاب" کا عنوان عطا کیا ہے:

ذوقِ ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

شاید یہ اقبال کی اس نظم کی صدائے بازگشت ہو کہ:

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من

انہوں نے اپنی غزل کے بارے میں ایک جگہ کہا ہے ؎

تعریف ہو کہ طنز یہ تھا ان کا تبصرہ
پہونچائی ہے اسد نے کہاں سے غزل کہاں

اسے شاید ہی تعلّی کہا جا سکے۔ جب بات غزل کی چل نکلی ہے تو آئیے، غزل کے کچھ اور موتی بھی رول لیجئے:

خلافِ موج بھی اکثر اسے رواں پایا
ضرور کشتیٔ دل میں سوار ہے کوئی

دلِ بے تاب کہے کیوں نہ طوافِ منزل
ہے سفر ختم مگر شوقِ سفر باقی ہے

اسی سے جلتی ہے شمع اور اسی سے بجھتی ہے
خبر نہیں یہ ہوا دوست ہے کہ دشمن ہے

ترکِ الفت کا بہانہ مری حالت سے ملا
مشکل اربابِ ہوس کی ہوئی آساں مجھ سے

وہ بوالہوس بھی جنہیں جرأتِ گناہ نہیں
ادب میں ڈھونڈ رہے ہیں علاجِ تشنہ لبی

آگیا حضرتِ واعظ کی زباں پر بھی اثر
یاد تھے اہلِ محبت کے جو افسانے چند

خیال کو بھی اسیرِ نگاہ کرتا ہے
مری نظر میں مصور گناہ کرتا ہے

حضرتِ ناصح کے چہرہ پر جو ہیں آثارِ کیف
پندِ ترکِ مے میں بھی شاید سرورِ بادہ ہے

جو کہتے یار کو جاتے ہیں ہوشیار رہیں
کہ غلط راہ میں پڑتا ہے امتحاں کے لئے

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اسد ملتانی کے کلام میں زبان و بیان کی طلسم کاریاں نظر نہ آئیں گی۔ ان کے کلام میں بیشک [illegible] بھی ملیں گی لیکن شدتِ احساس اور خلوصِ مقصد ان کے کلام کی جان ہے جس سے ساری کوتاہیاں خود بخود نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اپنے ہم وطن پیشرووں، حالی اور اقبال کی طرح اسد ملتانی کے کلام کا بیشتر حصہ روایتی تفریحی عنصر سے مبرا ہے۔ ان کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح ملت کے روحانی اور ذہنی جمود کو دور کر کے زندگی کے صحیح اور صالح عمل کے راستے پر گامزن کر دیں۔ وہ بالطبع صلح جو اور امن پسند ہیں اس لئے ان کے یہاں جوشیلے انقلابی تاثرات کا فقدان ہے۔ وہ "ستائش کی تمنا" اور "صلہ کی پروا" کئے بغیر اپنے حقیقی تاثرات عوام تک پہونچانا چاہتے ہیں اسی لئے وہ ظاہری شاعرانہ طمطراق کو نظر انداز کر کے موضوع کی جزئیات کو بڑے سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ سارا زورِ کلام جذبات کی عکاسی پر صرف کرتے ہیں:

مہاجرین کا عالمی سال — بقیہ صفحہ ۵۲

کرائے جائیں گے۔ اس اہم کام کے ساتھ ساتھ ان مہاجرین کی آبادکاری کو ترجیح دی جائیگی جو یورپ سے ترکِ وطن کر کے مشرقِ بعید میں پڑے ہیں۔ ان کی واپسی کے لئے تین ہزار آٹھ سو ویزا تیار کر لئے ہیں اور مصارف سفر کے لئے ساڑھے بائیس لاکھ ڈالر جمع ہو نے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے جنرل اسمبلی نے ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کی قرارداد میں اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل سے بھی یہ درخواست کی تھی کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال کو فروغ دینے میں ایسے اقدامات سے کام لیں جو ان کے نزدیک معقول اور مناسب ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر کلاڈ ڈی کیمو لاریا کو اپنا خاص نمائندہ مقرر کر کے ہدایت کی کہ وہ ساری دنیا کا خصوصاً ان ملکوں کا جہاں مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ درپیش ہے، دورہ کرتے ہوئے حکومتوں کو مشورہ دیں کہ وہ عالمی سال میں شریک ہو کر اس دشوار کام کو جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صورت پیدا کریں۔

مسٹر کیمو لاریا اس غرض سے ایشیائی ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے پچھلے سال ماہِ اگست میں پاکستان میں آئے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے بحالیات اور وزارتِ آبادکاری کے اعلیٰ افسروں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ان کو بتایا گیا کہ پاکستان میں یہ مسئلہ کچھ عرصہ پہلے یقیناً دشوار معلوم ہوتا تھا اور کسی طرح اس کا آخری حل نظر نہیں آتا تھا لیکن نئی حکومت نے روزِ اوّل سے اس مسئلہ پر خاص توجہ دینی شروع کی۔ نہایت تیزی سے مکانات تعمیر ہو رہے ہیں اور مہاجرین کی مستقل آبادکاری عمل میں آ رہی ہے یہاں تک کہ چند ماہ بعد یہ مسئلہ باقی نہیں رہیگا۔ تاہم اربابِ حکومت نے مسٹر کیمو لاریا کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال میں پاکستان کی شرکت کا اعلان کر دیں۔

مسٹر کیمو لاریا دنیا بھر کا دورہ کرنے کے بعد اقوامِ متحدہ کے صدر مقام پر واپس پہنچ گئے ہیں۔ ان کے ایک تازہ ترین اعلان سے پتہ چلتا ہے کہ اس عالمی سال کی تقریب میں چونسٹھ ملک اور پانچ علاقے شرکت کر رہے ہیں۔ ان چونسٹھ ملکوں کے نام یہ ہیں: پاکستان، افغانستان۔ ارجنٹائن۔ آسٹریا۔ آسٹریلیا۔ بلجیم۔ بولیویا۔ برازیل۔ برما۔ کمبوڈیا۔ کینیڈا۔ سیلون۔ چلی۔ جمہوریتِ چین۔ کولمبیا۔ کوسٹاریکا۔ کیوبا۔ اسرائیل۔ اٹلی۔ جاپان۔ اردن۔ جمہوریت کوریا۔ لے اوس۔ لبنان۔ لائبیریا۔ لکسمبرگ۔ میکسیکو۔ موناکو۔ مراکش۔ نیدرلینڈ۔ ناروے۔ ڈنمارک۔ ڈومینکن ریپبلک۔ ایکوے ڈور۔ وفاق ملایا۔ فن لینڈ۔ فرانس۔ وفاقی جمہوریت جرمنی۔ گھانا۔ یونان۔ گواٹی مالا۔ ہیٹی۔ ہولی سی۔ ہونڈورس۔ آئس لینڈ۔ ایران۔ آئرلینڈ۔ پاناما۔ پیرو۔ فلپین۔ پرتگال۔ سویڈن۔ سوئٹزرلینڈ۔ تھائی لینڈ۔ تیونس۔ ترکی۔ متحدہ عرب جمہوریت۔ برطانیہ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ اروگوئے۔ وینی زوئیلا۔ جمہوریتِ ویت نام اور یوگو سلاویہ۔ ان کے علاوہ شرکت کرنے والے پانچ علاقوں کے نام یہ ہیں: برٹش ہونڈورس۔ گامبیا۔ ہانگ کانگ۔ سنٹ لوسیا (ویسٹ انڈیز) اور ٹنگانیکا ہیں۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔

Regd No S 1086

مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ ۔ کراچی
مدیر : رفیق خاور

خدیجہ مستور　قتیل شفائی　صہبا اختر　رفعت شفیع

تابش دہلوی　رضی ترمذی　یوسف بخاری　قدرت نقوی

احسان ملک　احمد سعدی　اکبر علی خان　شاہد عشقی

فروری ۱۹۶۰

قیمت ۸ آنہ

ومن یؤت الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیراً
جس کو حکمت ملی اُسے بڑی عظیم نعمت ملی
ہم پر الزام ہے کہ ہم اہلِ تحقیق نہیں
آئیے اسے باطل کر دکھائیں
ہمارے پاس علم و حکمت کے ایسے بیش بہا دفینے موجود ہیں جن کی تحقیق و تلاش
میں ہمارے اسلاف نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں لیکن پوشیدہ ہونے کی
وجہ سے وہ انسانیت کے کسی کام نہیں آرہے۔ ان کا چھپائے رکھنا انسان دشمنی
کے برابر ہے۔ آئیے انہیں ظاہر کر کے ثابت کر دیں کہ ہم اب بھی دُنیا کو
بہت کچھ دے سکتے ہیں۔
آپ یا آپ کے جاننے والوں میں سے کسی کے پاس کوئی مجرب نسخہ یا
جڑی بوٹیوں کے متعلق کسی قسم کی معلومات محفوظ ہوں تو انہیں
تفصیلاً لکھ کر ہمیں بھیجئے۔ ہم اُن پر خود بھی تحقیق و تجربات کریں گے اور
دوسروں کو بھی اُنہیں پرکھنے کی دعوت دیں گے۔
بھیجنے والوں کے نام سے سب نسخوں کی بجنسہٖ اشاعت کا زیادہ سے
زیادہ انتظام کیا جائے گا تاکہ طبی ادارے اور عوامی صحت سے
دلچسپی رکھنے والے اہلِ تحقیق ان پر مزید کام کر سکیں۔
یہ پوشیدہ طبی نوادر قوم کی امانت ہیں آئیے انہیں جمع کر کے انسانیت کے نام پر عام کریں۔
وقت کا تقاضا ہے کہ قومی صحت کی حفاظت کیلئے ایک جامع کوشش
کی جائے۔ اس تقاضے کو پورا کیجئے۔
انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرن میڈیسن
ہمدرد منزل۔ نیوٹاؤن کراچی ۵

فارہنس، خاندان کے لئے ٹوتھ پیسٹ۔
اپنے بچوں کو فارہنس
کے ذریعہ دانتوں اور
مسوڑوں کی حفاظت
کرنا سکھائیے۔
فارہنس استعمال کیجئے۔
اپنے بچوں کو خواہ وہ چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں، فارہنس کے ذریعہ اپنے دانت صاف کرنا اور ساتھ ہی
مسوڑوں پر بھی برش ملنا سکھائیے۔ آپ کا ڈاکٹر آپ کو بتائے گا کہ مضبوط مسوڑے صحتمند
دانتوں کی بنیاد ہیں۔ دانتوں کو صاف کرنے کی صحیح عادت بچپن ہی میں سیکھی جاتی ہے جو آپ کے
بچوں کی مسکراہٹ میں دائمی دلکشی کا باعث ہوتی ہے۔
اب پاکستان میں آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔
بڑے سائز کا ٹیوب دو روپے دو آنے۔ چھوٹے سائز کا ٹیوب ایک روپیہ چھ آنے چھ پائی۔
اس سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے۔
تیار کنندگان۔
ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
ویسٹ وھارف۔ کراچی۔
JWT
DS 1033

پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر "ادارۂ مطبوعات پاکستان" نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا تھا - جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے - یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور انکی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی اہم صنعتوں پر مختصر، مگر مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق، عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں -

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی تصاویر سے مزین ہے- ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن نشین ہوجاتی ہے -

ہر کتاب میں جدید ترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں - جن سے ہر ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آجاتا ہے -

استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف چار آنے رکھی گئی ہے - یہ کتابچے ابتک شائع ہوچکے ہیں :

* کپڑے کی صنعت
* چائے کی کاشت اور صنعت
* بن بجلی کی صنعت
* اشیائے صرف
* کاغذ کی صنعت
* سیمنٹ کی صنعت
* کپڑے کی صنعت
* ماہی گیری
* ذرائع آبپاشی کی صنعت
* غذائی مصنوعات
* شکر سازی

ملنے کا پتہ : ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

جلد ۱۳ شمارہ ۲

فروری ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

بہ یادِ غالب:	مثنوی "ابرِ گہربار"	سید قدرت نقوی	۶
	غالب کے درباری اعزاز اور منصب	اکبر علی خاں	۱۳
	جانشینیٔ غالب کا مسئلہ	سید یوسف بخاری	۲۱
	"افسانہ ہائے غیر مکرر کنیم طرح" (نظم)	عبدالرؤف عروج	۲۶
نظمیں:	بھول	قتیل شفائی	۲۰
	پامال	صہبا اختر	۲۸
	دشتِ بے وفائی میں	سید رضی ترمذی	۲۸
افسانے:	ماضی	خدیجہ مستور	۲۹
	دھوپ چھاؤں (بنگلا افسانہ)	ابوالکلام شمس الدین، مترجمہ احمد سعدی	۳۴
	سوکھے پتے	رفعت شفیع	۳۹
فن:	مشرقی پاکستان کا ایک مصور: حمید الرحمٰن	جلال الدین احمد	۵۵
علاقائی ادب:	عبدالقادر خٹک	یونس سیٹھی	۴۷
نیا دور:	(مصور فیچر) ملت کے پاسباں	احسان ملک	۴۹
غزلیں:	تابش دہلوی ★ مشتاق مبارک		۵۳
	محب عارفی ★ شاہد عشقی		۵۴
نقد و نظر:			۵۸
سرورق:	"پاک جمہوریہ اسپیشل" (مغربی پاکستان) کے آخری مقام (پشاور) میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا عوام سے خطاب		

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

مثنوی ابرِ گہربار

سید قدرت نقوی

مرزا غالب کو اردو نظم و نثر میں سنگ میل کا مرتبہ حاصل ہے اور فارسی نظم و نثر میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اگر اقبال اپنے فلسفہ کے اظہار کے لئے فارسی زبان کو ذریعہ نہ بناتے تو غالب ہندوستان میں فارسی زبان کے آخری شاعر ہوتے۔ قدیم طرز کا دور ان پر ختم ہو گیا اور جدید دور کے لئے انہوں نے ایک راستہ کی نشاندہی کی۔ اسی راستہ پر چل کر علامہ اقبال اردو اور فارسی شاعری میں اپنے موجودہ مرتبہ پر پہنچے۔ اسلوب بیان اور مضمون آفرینی، دونوں میں غالب ہی کی روش ان کے سامنے رہی بلکہ بعض امور کا سرچشمہ بھی غالب کا کلام ہے۔

غالب نے اپنا زورِ بیان، غزل، قصیدہ، رباعی اور مثنوی غرض ہر صنفِ سخن میں دکھایا ہے اور اتنا بلند درجہ حاصل کیا کہ ہندوستان کے علاوہ ایران میں بھی ان کو بلند مرتبہ شاعر تسلیم کیا گیا۔ بلکہ کلکتہ میں ایک ایرانی فاضل مرزا کوچک نے بھری مجلس میں غالب کے متعلق کہا کہ اس درجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں[۱]۔ غالب کے فارسی کلام میں سے قصیدہ و غزل وغیرہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا۔ اس صحبت میں ان کی سب سے بڑی اور اہم مثنوی "ابرِ گہربار" پر کچھ لکھا جاتا ہے۔

مرزا غالب کے کلیات میں صرف گیارہ مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ ان سب میں مثنوی "ابرِ گہربار" طویل بھی ہے اور زیادہ وقیع بھی۔ مرزا اس مثنوی میں شاہنامہ فردوسی کی طرح غزوات نبوی بیان کرنا چاہتے تھے لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا کیونکہ تاریخ نگاری غالب کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ جب وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں تاریخ نویسی پر مامور ہوئے تو حکیم احسن اللہ خاں اردو میں تاریخ کا خلاصہ لکھ کر بھیج دیتے اور غالب اس کو اپنی طرز خاص میں ادا کر دیتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

"میں فن تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازان دفتر شاہی خلاصۂ حالات از روئے کتب اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں میں اس کو فارسی کر کر حوالہ کرتا ہوں[۲]"

یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی محض تمہیدی عنوانات تک لکھی گئی۔ اس کے ناتمام رہنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب کو وہ فراغت نصیب نہ ہوئی جو مثنوی گوئی کے لئے لازمی ہے۔ کیونکہ مثنوی کے لئے تسلسلِ بیان انتہائی ضروری ہے اور اس تسلسل کے برقرار رکھنے کے لئے بے فکری اور فارغ البالی لازمی۔ غالب ۱۸۲۶ء سے بہت زیادہ پریشانیوں کا شکار رہے ہیں۔

غالب نے یہ مثنوی کب لکھنی شروع کی اور کب ختم کی، اس کا سراغ ان کی تصانیف میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ غالب کے متعلق تحقیق کرنے والے حضرات بھی اس سلسلہ میں کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ سب سے پہلے اس مثنوی کا ذکر سر سید احمد خاں کی کتاب "آثار الصنادید" میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستۂ بزم احباب ہوگی۔"[۳]

"آثار الصنادید" بقول شیخ محمد اکرام ۱۸۴۵ء میں چھپی[۴]۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مثنوی ۱۸۴۵ء تک لکھی جا چکی تھی۔ سر سید نے اس کی ضخامت پندرہ سولہ جزو لکھی ہے اور اب بھی اس سے زیادہ نہیں۔ مولانا حالی نے آخری زمانہ کی تصنیف بتایا ہے[۵]۔ مولانا مہر اور مسٹر مالک رام نے مثنوی کے زمانہ تصنیف کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے

---

[۱] غالب از مہر حاشیہ صفحہ ۱۲۳

[۲] نادرات غالب ۲۹ [۳] ماہِ نو فروری ۵۰ء صفحہ ۲۳ [۴] جمیل نقوی نے "ماہِ نو" فروری ۵۰ء میں خلاصہ احوال غالب از "آثار الصنادید" طبع کرایا تھا۔ سن تصنیف ۱۸۴۷ء لکھا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں ۱۸۴۶ء تا ۱۸۵۰ء کی تصنیف بتایا ہے۔ میرے خیال میں بھی ۱۸۴۷ء کو ترجیح دینی چاہئے۔ [۵] آثار غالب صفحہ ۱۰۱ یادگار غالب ۲۳۲

اپنی تصنیف "غالب" میں لکھا ہے:

"۱۸۵۹ء کے بعد کبھی غالب اردو میں نئے شعر لکھنے کی طرف مائل نظر نہیں آتا۔ اس دور کی سنجیدہ کوشش صرف اس کی فارسی مثنوی "ابرِ گہربار" ہے۔"[۵]

ڈاکٹر عبداللطیف کا یہ بیان حقیقت کے خلاف ہے۔ نہ معلوم انہوں نے کس بنا پر اس کو ۱۸۵۹ء کی تصنیف قرار دیدیا کیونکہ جب غالب کی زندگی کو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے تو ایک دور ۱۸۵۷ء سے وفات تک قائم کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۵۹ء اسی دور میں واقع ہوتا ہے۔ یہ مرثیہ کے بیان کی موجودگی میں کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی ڈاکٹر عبداللطیف کے بیان کردہ دور کی تخلیق ہے۔

شیخ محمد اکرام نے "آثارِ غالب" میں اس مثنوی کو ۱۸۲۷ء تا ۱۸۴۷ء کے دور میں شامل کیا ہے اور زمانہ تصنیف ۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۵ء متعین کیا ہے[۶]۔ لیکن میرا احساس یہ ہے کہ یہ مثنوی ۱۸۳۸ء سے پہلے لکھنی شروع کی جا چکی تھی۔ شیخ محمد اکرام نے دیوان منقولہ ۱۸۳۸ء یعنی "میخانۂ آرزو" میں اس کے شامل نہ ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ اس منقولہ و مرتبہ دیوان کے بعد کی تصنیف ہے اور اگر سر سید "آثار الصنادید" میں اس کا ذکر نہ کرتے تو غالباً یہ ۱۸۴۵ء کے بعد کی تصنیف قرار پاتی کیونکہ ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ دیوان میں بھی یہ مثنوی شامل نہیں۔ ایسا معلوم دیتا ہے کہ غالب اس مثنوی کی اشاعت تکمیل سے پہلے خلافِ مصلحت سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے اس کا ذکر ۱۸۴۷ء سے پہلے نہیں ملتا۔

غالب نے یہ مثنوی ایامِ شباب میں لکھنی شروع کی تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء کی مطبوعہ مثنوی جب صوفی منیری کو بھیجی تو لکھا:

"ایامِ شباب میں کہ بحرِ طبع روانی پر تھا۔ جی میں آیا کہ غزواتِ صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیئے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستاں طرازی کی توفیق نہ پائی ناچار آٹھ نو سو شعر کو چھپوا لیا۔"[۷]

غالب جوانی کے زمانہ میں دو قسم کے خیالات مستولی تھے۔ اولاً مذہبی رجحان زیادہ تھا۔ دوم وہ شاعری میں ایسا بلند مقام حاصل کرنا چاہتے تھے جو ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ ہوا ہو۔ غزل و قصیدہ میں کمال حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مثنوی کی طرف توجہ کی ہو گی کہ جس طرح وہ غزل و قصیدہ میں اساتذۂ سلف کی صفِ اول میں در آئے ہیں، اسی طرح مثنوی میں بھی فردوسی و نظامی کے ہم پلہ شمار ہونے لگیں۔

مثنوی لکھنے کے متعلق جب غور کیا ہو گا تو ایرانی تاریخ کے سلسلہ میں شاہنامہ اور سکندر نامہ موجود تھے اس موضوع پر قلم اٹھانا بے سود خیال کیا ہو گا۔ خاندان مغلیہ کی منظوم تاریخ لکھنے میں انہیں کسی قسم کی امید نہ تھی کیونکہ اولاً بادشاہ برائے نام تھا جس سے کسی خاص مالی منفعت کی توقع نہ تھی۔ دوسرے ذوق استادِ شاہ تھے۔ غالب کو اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اس طرح شاہی دربار سے متعلق ہو جائیں گے کیونکہ مرزا نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور گزرانا۔ ممکن ہے کچھ انعام مل گیا ہو۔ لیکن حسب توقع عزت و حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر کی مدح میں بھی درباری تعلقات سے پیشتر کئی قصیدے لکھ کر نذر کئے جا چکے تھے۔ جن کے صلے میں صرف تحائف و انعام ملتا رہا، باریابی نہ ہو سکی۔ ان حالات میں فردوسی و نظامی کا مقابلہ مثنوی میں صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا تھا کہ غزواتِ نبوی نظم کریں۔ کیونکہ یہ موضوع کسی نے نہ اپنایا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام سے ان کی عقیدت محبت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اسلام کی ابتدائی لڑائیاں بیان کریں جن میں اہم کردار حضرت علی علیہ السلام کا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر انہوں نے مثنوی "ابرِ گہربار" لکھنی شروع کی۔ میرا احساس ہے کہ غالب کی اس مثنوی کا آخری حصہ یعنی ساقی نامہ ۴۷-۱۸۴۵ء کے زمانہ ہی میں لکھا گیا ہے۔ بعض اشعار اس خیال کے مؤید ہیں جن میں پیری کا ذکر پایا جاتا ہے یہ آگے پیش ہوں گے۔ ۱۸۵۰ء سے پہلے کے ایک قلمی دیوان کے آخر میں اسی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مثنوی موجود ہے (بشکریہ مولانا عرشی) یہ نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں دیوان کی طباعت کے بعد غالب نے مثنوی کی تکمیل کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اس کو دیوان میں شامل کر لیا تھا۔

یہ مثنوی ۱۸۶۳ء کے مطبوعہ کلیات میں طبع ہوئی لیکن حکیم غلام رضا کے اصرار پر اس کو الگ چھاپنے کی اجازت دے دی۔ اس کے

---

[۵] غالب اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۔ [۶] آثارِ غالب صفحہ ۲۳۰۔ [۷] "آثار الصنادید" ۱۸۴۷ء ہی کی تصنیف ہے کیونکہ غالب نے مولوی رجب علی ارسطو جاہ کو خود "آثار الصنادید" بھیجی تھی۔ جس خط میں اس کا ذکر ہے وہ غیر مطبوعہ ہے۔ "درین زمانہ" کے الفاظ قرینِ زمانہ پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ خط ۸ دسمبر ۱۸۴۷ء کا لکھا ہے۔ [۸] خطوطِ غالب جلد دوم مرتبہ مولانا مہر صفحہ ۳۸۴۔ غالب نے تعداد اشعار اندازہ سے لکھی ہے۔ صحیح تعداد ۱۰۹۸ ہے۔

ساتھ دو قصیدے، چند قطعے اور کچھ رباعیاں بھی شامل کر دیں۔ اس کی اشاعت[1] ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ غالب نے خود دیباچہ ورنہ تو کمیلہ شاہ تقب سالک، رضوان، سیف یزداں اور کامل نے قطعات تاریخ لکھے۔ اس کا ایک نسخہ مولانا مہر کے پاس موجود ہے۔ یہ نسخہ اس وجہ سے اہم ہے کہ دیباچہ و خاتمہ کی عبارت کلیات نثر میں شامل نہیں ہے۔

اسی مطبوعہ مثنوی کے متعلق علاء الدین خاں علائی نے غالب کو شکایتاً لکھا ہوگا کہ مثنوی نہیں بھیجی۔ ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء کو غالب نے جواباً لکھا:

"اے میری جان! مثنوی "ابر گہر بار" کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا، کلیات میں موجود ہے۔ لہٰذا شہاب الدین خاں نے بھیج دی، میں مکرر کیا بھیجتا"۔[2]

غالب نے کسی تذکرہ کے لئے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ یہ خود نوشت حالات رسالہ "اردو" (دکن) بابت جولائی ۱۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔ اس تحریر کا عکس بھی چھپا تھا۔ اب "احوال غالب" میں دوبارہ ان حالات کی مع عکس تحریر اشاعت عمل میں آئی۔ ان حالات کے ضمن میں غالب نے حاشیہ پر مثنوی کے ذکر کا اضافہ کیا ہے:

"اور ایک مثنوی موسوم بہ غزوات رسالت پناہی میں بہت عمدہ، بہت طویل لکھی جس کے اشعار حد سے زیادہ ہوں گے"۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اظہار الحق ملک نے اس بیان کو نستعلیق کرتے وقت بالکل نظر انداز کر دیا۔ اس تحریر کو ۱۸۶۳ء سے متعلق بتایا ہے۔ تحریر میں لاہور کے دربار میں شرکت نہ کرنے پر اظہار افسوس کیا ہے جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تحریر اس دربار کے بعد کی ہے۔ دربار اکتوبر ۱۸۶۴ء میں ہوا تھا۔ البتہ صوفی منیری کو یہ مثنوی ۱۸۶۶ء کے اوائل میں بھیجی گئی تھی۔

مرزا صاحب نے اس مثنوی کے ایک شعر کی شرح منشی نبی بخش حقیر کے استفسار پر بیان کی ہے:

تو گوئی مگر مہر زیرِ زمیں ‏ ‏ ‏ ‏ فروزاں فرو بود پشتِ نگیں[3]

یہ شعر شبِ معراج کی توصیف میں ہے کہ وہ شب ایسی روشن تھی کہ بہ سبب روشنی کے زمین ایسی چمکتی تھی جیسے ڈانک سے نگینہ چمک جاتا ہے۔ آفتاب رات کو تحت الارض ہوتا ہے اور ڈانک بھی نگینے کے تلے لگاتے ہیں اور نگینہ بقدر ڈانک کی حقیقت کے چمکتا ہے۔ پس جس نگیں کے نیچے آفتاب ڈانک ہوگا وہ نگیں کتنا درخشاں ہوگا۔ فروہ فارسی لغت ہے بمعنی ڈانک کے"۔[4]

غالب کی یہ مثنوی خود غالب کی نظر میں بہت وقیع تھی۔ اس کے اشعار آخر عمر تک خطوط و تصنیفات میں تمثیلاً استعمال کرتے رہے ہیں۔ میر جان جاکوب نے نہایت جانفشانی سے دیوان حافظ کی صحت کی اور اس کو چھپوانا چاہا تو غالب سے دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی اور دیباچہ میں اپنی تحقیق وغیرہ بیان کرنے کے متعلق لکھا لیکن پورے نتائج تحقیق غالب کے پاس نہ بھیجے۔ غالب نے دیباچہ نہ لکھا بلکہ تقریظ لکھ کر بھیج دی۔[5] اس تقریظ کا ذکر جس خط میں ہے وہ میر جان جاکوب کے نام پہلا خط ہے۔ اس کے بعد کا خط جس میں مکان کی منظوم تاریخ لکھی ہے، ۱۸۴۲ء کا ہے۔[6] اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالب نے سب سے پہلے اسی تقریظ میں اشعار مثنوی تمثیلاً لکھے ہیں۔[7] ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

دوئی بے کفن مردہ در رہش

خودی داد گر شحنہ در گہش

میاں محمد نجف کو ایک خط میں تین شعر تمثیلاً لکھے ہیں۔[8] یہ شعر مناجات کے ہیں اور ترتیب بدلی ہوئی ہے:

ز نا سازی و ناتوانی بہم ‏ ‏ ‏ ‏ دم اندر کشاکش ز پیوند دم

ایک خط میں نواب ضیاء الدین کو ایک شعر لکھا ہے۔[9] یہ شعر بھی مناجات کا ہے:

نہ رقص پری پیکراں بر بساط ‏ ‏ ‏ ‏ نہ غوغائے رامشگراں در رباط

اردو کے چار خط ہیں جن میں اس مثنوی کے اشعار تمثیلاً لکھے ہیں۔ میر مہدی مجروح اور غلام غوث خاں بیخبر کو یہ شعر لکھا ہے:[10]

افق ہا پر از ابر بہمن مہی ‏ ‏ ‏ ‏ سفالینہ جام من از مے تہی

نواب علاء الدین خاں کو دو شعر لکھے ہیں،[11] جن میں دوسرا شعر وہی ہے جو ضیاء الدین خاں کو لکھا ہے۔ پہلا یہ ہے:

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ ‏ ‏ ‏ ‏ نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ

---

[1] اردوئے معلیٰ ص ۲۶۲، خطوط غالب جلد اول ص ۲۵۲ [2] کلیات میں "تو" کی جگہ "کہ" ہے۔

[3] نادرات غالب ص ۴۸ [4] کلیات نثر ص ۱۲۷ [5] کلیات نثر ص ۲۵ کلیات نظم ص ۱۴۲ [6] کلیات نثر ص ۱۵۸ کلیات نظم ص ۱۳۳ [7] نثر ۹۸، نظم ۱۴۳ [8] خطوط غالب جلد اول ۳۵۳ [9] خطوط غالب جلد دوم ۳۰۳، نظم ۱۴۳ [10] خطوط جلد اول ۳۰۳، نظم ۱۴۴۔

ایک خط میں نواب انوار الدولہ شفق کو یہ شعر مناجات کا لکھا ہے[۱] ؎

دریں خستگی پوزش از من مجوئے — بود بندۂ خستہ گستاخ گوئے

۱۸۵۰ء میں جب غالب خاندانِ مغلیہ کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے اور "پرتوستان" کا پہلا حصہ "مہرِ نیمروز" لکھنا شروع کیا تو حسبِ موقع اسی مثنوی کے اشعار کام میں لائے۔ حمد کے سلسلہ میں پانچ شعر نقل کئے ہیں[۲] جن کی ترتیب بدلی ہوئی ہے اور اس شعر کے مصرعے مقدم و مؤخر کر دیئے ہیں ؎

اگر مومناں در پرستاریش — وگر کافرانند در نہاریش

نعت کے موقع پر دو جگہ مثنوی کی نعت کے اشعار کام میں لائے ہیں پہلی جگہ چار شعر مسلسل اور دو شعر بہت آگے سے نقل کئے ہیں اور اس شعر کے مصرعے آگے پیچھے کر دئے ہیں ؎

بہ پیوند پیرایۂ خاکیاں — بہ دم حرز بازوئے افلاکیاں

نعت کے خاتمہ میں دو شعر تمثیلاً لکھے ہیں[۳]۔ آخری شعر یہ ہے ؎

کہ تا گردشِ چرخِ نیلوفری — بود سبز جا کش بہ پیغمبری

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ "ساقی نامہ" ۴۷-۱۸۴۵ء کے زمانہ میں لکھا گیا کیونکہ پیہم صدمات کی وجہ سے غالب کی صحت گر چکی تھی۔ جوانی کا زمانہ ختم ہونے لگا تھا۔ "ساقی نامہ" میں اس حالت کو بیان کیا ہے۔ "مہرِ نیمروز" میں اپنی حالت بیان کی تو "ساقی نامہ" ہی سے نو اشعار نقل کر دئے[۴] ؎

دریغا کہ در روزشِ گفتگوئے — بہ پیری خود آرائی آورد روئے

"مہرِ نیمروز" میں جب ظہیر الدین بابر کا حال لکھنا شروع کیا تو "ساقی نامہ" کے چھ ابتدائیہ شعر نقل کئے۔ ساتواں شعر ایسا ہے کہ ساقی نامہ میں موجود نہیں۔ اسی وقت موزوں کیا ہوگا جو درج ذیل ہے ؎

نہ ہر کس فزوں مے بمن دہ کہ من — نشاید مے آشام را تم سخن

امیر قزعن نے توران کے چغتہ قاآنی سردار سلطان پر حملہ کیا۔ اس کی کامیاب بازگشت کے موقع پر دو شعر نقل کئے ہیں[۵]۔ آخری شعر یہ ہے ؎

کہ جنبش از چرخ آرام یافت — زداد و سپہر ند گر کام یافت

---

۱ خطوط جلد ۱ صفحہ ۲۹۳ نظم ۷۳ ۲ نثر ۲۵۰ نظم ۱۱۵ ۳ نثر ۳۱ نظم ۱۱۶ ۴ نثر ۳۱ نظم ۱۱۲ ۵ نثر ۳۳ نظم ۱۵۰ ۶ نثر ۳۳ نظم ۱۲۳ - یہ شعر قلمی نسخہ مہرِ نیمروز مملوکہ سید آغا حسین صاحب اسلوبی میں نہیں ہے جسے نسخہ غالب نے خود مسطورہ کو بھیجا تھا۔ ۷ نثر ۳۲۹ نظم ۱۲۰

--

... نصیر الدین ہمایوں کے حالات لکھنے شروع کئے تو "مغنی نامہ" کے ابتدائیہ اشعار تمہیداً لکھے ہیں[۱] ؎

مغنی دگر زخمہ بر تار زن — گل از نغمہ بر تربت تار زن

جب آگرہ کے قریب آتش فتنہ و فساد بھڑکی تو اس کی سرکوبی کے لئے ہمایوں نے لشکر بھیجا اس موقع پر مثنوی کے تین شعروں کو استعمال کیا ہے۔ یہ شعر مناجات کی ضمن میں بیان کردہ حکایت سے متعلق ہیں[۲] ؎

گزیں شہسواراں عناں بر عناں — ہمیں نیزہ داراں سناں بر سناں

جب ہمایوں ہندوستان سے بھاگ کر ایران پہنچا اور شاہ طہماسپ صفوی سے امداد کا طالب ہوا تو شاہ طہماسپ صفوی نے ازراہِ مہمان نوازی ہمایوں کا شاندار استقبال کیا۔ اسی کی کیفیت میں مثنوی کی حکایت سے بارہ شعر نقل کر دئے[۳] ؎

خود آہستہ رو بود در رہ ز پیش — فرستاد فرماں بہ دستور خویش

کہ فرماں دہد تا بہر کو نہ بہر — بہ بندند آئین شادی بہ شہر

سر سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس مثنوی کا ذکر کیا اور رائے قائم کی۔ ان کے بعد مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں اس مثنوی پر اپنی رائے کا اظہار سرسری طور پر کیا۔ زیادہ تحقیق و جستجو سے کام نہ لیا۔ اشعار کی تعداد ۲۸۰ لکھی حالانکہ صحیح تعداد ۱۰۹۸ ہے۔ اس کو آخری زمانہ کی تصنیف قرار دیا جو سر سید کے بیان کے ذریعہ ۴۷-۱۸۴۵ء سے پہلے کی تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ خود غالب نے بھی اس کو ایامِ شباب سے وابستہ بتایا ہے۔ اس لئے مولانا حالی کا بیان باور کرنے میں تامل ہے مگر مولانا حالی نے غالب کو بحیثیت مثنوی نگار بلند مرتبہ بتایا ہے[۴] چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے۔ اس نے اس صنف کو چھوا تک نہیں۔ عرفی نے بے شک چند مثنویاں لکھی ہیں مگر صاحب "آتشکدہ" نے ان میں سے ایک کی نسبت لکھا ہے کہ "بد گفتہ است" اور باقی کی نسبت اس کا یہ قول ہے "بسیار بد گفتہ" حکیم ہمام کا بیٹا حکیم ثنائی عرفی کی نسبت لکھتا ہے ؎

شور لیش طرز و فصاحت نداشت — کان نمک بود و ملاحت نداشت

---

۱ نثر ۲۵۲ نظم ۱۲۷ ۲ نثر ۲۵۶ نظم ۱۲۰ ۳ نثر ۲۶۰ نظم [illegible] ۴ [illegible] ۳۳۲ ۵ یادگارِ غالب ۲۲۸ - ۲۲۷ [illegible]

البتہ ظہوری کے "ساقی نامہ" نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے مگر اس کا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا۔ بخلاف مرزا کے اس کو مثنوی پر بھی تقریباً اسی قدر قدرت حاصل ہے جیسی قصیدے اور غزل پر۔[۱]

آگے چل کر بطور نتیجہ تحریر فرمایا ہے:

"الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی و نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا۔ مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالاتر۔"[۲]

مولانا حالی نے موازنہ صرف عرفی، نظیری اور ظہوری سے کیا ہے۔ کاش وہ فردوسی یا نظامی کی مثنویوں سے موازنہ کرتے۔ مرزا کی مثنوی "ابرِ گہربار" اس قابل ہے کہ بعض مقامات کا "شاہنامہ" اور "سکندرنامہ" سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا اور غالب کے کمال اور بلند پروازی کا درجہ قائم کیا جا سکتا تھا۔

مولانا مہر نے "ابرِ گہربار" اور مثنوی گوئی پر کافی لکھا ہے۔ ایک جگہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں:

"جو شخص قصائد میں عرفی کا ہمسر اور غزل میں نظیری کا ہم پلہ تھا جو مثنوی میں فارسی کے بہترین مثنوی نگاروں سے ٹکر کھا تا تھا۔"[۳]

مولانا مہر نے مثنوی کے اشعار گیارہ سو سے زائد بتلائے ہیں۔[۴]

مولانا کو سہو ہوا۔ صحیح تعداد ۱۰۹۸ ہے جن کی تفصیل یہ ہے: حمد ۱۱۴۔ مناجات معہ حکایت ۲۲۴۔ نعت ۵۷۔ معراج ۲۸۰۔ منقبت ۱۲۸۔ مغنی نامہ ۱۴۰۔ ساقی نامہ ۱۵۵۔ کل تعداد = ۱۰۹۸۔

شیخ محمد اکرام نے "آثارِ غالب" میں مثنوی پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ مثنوی "ابرِ گہربار" کے عام تعارف کے بعد لکھا ہے:

"ساقی نامہ میں انہوں نے بیچارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے ..... لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے۔ اور مناجات و معراج کے آخری حصہ میں شاعری کا جو بلند معیار انہوں نے قائم کیا تھا اسے وہ بالعموم نباہ نہیں سکے۔"[۵]

"ساقی نامہ" ایسے زمانہ کی تصنیف ہے جب کہ غالب ہجومِ غم سے نڈھال ہو گئے تھے۔ ان کے قویٰ میں انحطاط آنے لگا تھا۔ جوانی ختم ہو رہی تھی۔ پیری کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن ابھی ہمت باقی تھی چنانچہ اس کا اظہار "ساقی نامہ" میں کیا ہے:

دریغا کہ در روزِ ش گفتگوئے — بہ پیری خود آرائی آورد روئے
بہ برنائیم روئے پیری سیاہ — زموبود بر فرقِ مشکیں کلاہ
کنوں نیست ظلّ ہمایم بسر — بہ پیری فتاد ایں ہوایم بسر
ننالم ز پیری جو انم ہمائے — ہنوزم بود طبع زور آزمائے

ایسی حالت میں اگر "ساقی نامہ" پھیکا ہو بھی تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ مقام بھی بہت مشکل ہے کیونکہ یہ مثنوی کسی شاہ میخوار کے حالات میں نہیں لکھی جا رہی تھی بلکہ سید المرسلینؐ کے غزوات نظم ہونے تھے اس لئے ساقی سے اس طرح کھل کر باتیں نہیں ہو سکتی تھیں جس طرح کسی اور مثنوی میں کی جا سکتی ہیں۔ یہاں ادب مانع ہے۔ غالب نے جو کچھ اور جس انداز میں کہا ہے وہ نہایت مناسب ہے۔ نظامی نے سکندر کے حالات لکھے ہیں۔ وہاں ہر طرح کی گنجائش ہے۔ کوئی امر مانع نہیں۔ شیخ محمد اکرام نے اس نکتہ کو ملحوظ نہ رکھا اور "ساقی نامہ" کو پھیکا بتا دیا:[۱]

بہ اقبالِ ایمان و نیروئے دیں — سخن رانم از سیدِ المرسلیں

بتقاضائے ادب و احترام جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے۔

آگے چل کر شیخ محمد اکرام نے مثنوی نا مکمل رہنے کی وجہ یہیں بیان کی ہیں۔ ایک مضمون کی مشکلات دوسرے واقعہ کے اثرات۔[۲] پہلی وجہ ایک حد تک قابلِ تسلیم ہے کیونکہ غالب نے خود مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"نیافتن توفیق داستاں طرازی سببے دارد عام کہ در قلمروِ ہند از شہری و روستائی و دانا و نادان و پیر و جوان کم کسے باشد کہ آن را نداند۔"[۳]

مضمون کی مشکلات ہر ایک پر نا مینہ ہیں۔ غالب تاریخ سے بالکل

---

[۱] یادگارِ غالب ۲۲۵ - ۲۲۰ [۲] یادگارِ غالب ۲۲۹ [۳] غالب از مہر ۱۹۴ [۴] غالب ۲۰۴ [۵] آثارِ غالب ۱۰۳ - ۱۰۲

[۱] مضمون نگار کی یہ رائے یقیناً صحیح ہے۔ غالب کے ساقی نامہ کے لئے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے ساقی نامہ کا جس انداز سے تصور کیا ہے وہ دوسروں کے ساقی ناموں سے صریحاً ممیز ہے اور اسی کے مطابق اس کا حق بھی ادا کیا گیا ہے۔ خاص ساقی نامہ کے رندانہ اشعار جتنے بھی ہیں نہایت خوب اور برجستہ ہیں۔ درحقیقت نہ صرف غالب کے ساقی نامہ بلکہ ساری مثنوی "ابرِ گہربار" کے بسیط مطالعہ کی ضرورت ہے تاکہ ہم غالب کے نقش ہائے رنگ رنگ کا اندازہ کر سکیں۔ (مدیر)

[۲] آثارِ غالب ۱۰۳ [۳] دیباچہ مثنوی ابرِ گہربار۔

نابلد تھے۔ واقعات کی صحت اور حقیقت کا استنباط ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اسلامی تاریخ میں بعض واقعات ایسے ہیں کہ جن کا بیان کرنا مشکل کام ہے کیونکہ ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان اختلافی مسائل میں پڑ کر غالب الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ محبت اہلبیتؑ ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی اور اس پر ان کو ناز بھی تھا۔ چنانچہ مثنوی میں بھی حضرت علی علیہ السلام کا ذکر گہری عقیدت سے کیا ہے اور کسی کا ذکر کرنا گوارا بھی نہیں کیا۔ اگر تاریخی واقعات بیان بھی وہ ان حقائق کو بیان کرتے جو اکثر مورخ نظر انداز کر جاتے ہیں یا پردہ پوشی سے کام لیتے ہیں تو یقیناً ایک گروہ کثیر ان کا مخالف ہو جاتا۔ غالب تھے صلح جو۔ وہ احباب و عوام سے اس سلسلہ میں مخالفت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا شبلی نے نظامی کے "سکندر نامہ" لکھنے کا سبب یہی قرار دیا ہے کہ ایرانی تاریخ فردوسی لکھ چکا تھا۔ غزوات نبوی میں شاعری کی گنجائش کم تھی۔ کیونکہ اصلیت سے بال برابر بھی ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے۔[۱] مرزا غالب کے سامنے بھی یہی دشوار مراحل تھے جنہوں نے اس مثنوی کی تکمیل سے باز رکھا ہوگا۔

دوسری وجہ قابل قبول نہیں کہ غالب نے مثنوی لکھنے کا ارادہ قید ہونے کی وجہ سے ترک کیا ہوگا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، غالب یہ ارادہ ۱۸۴۵ء کے بعد ترک کر چکے تھے۔

مولانا عرشی نے راقم کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے کہ مثنوی کلیات مطبوعہ ۱۸۶۳ء سے پہلے علیحدہ کبھی طبع ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اگر یہ طباعت عمل میں آئی ہوگی تو ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۰ء تک ہوئی ہوگی۔

غالب اپنے کلام کے خود مرتبہ شناس تھے۔ انہوں نے ہمیشہ زمانہ کی قدر ناشناسی کی شکایت کی ہے۔ غزل و قصیدہ کے سلسلہ میں وہ خود کو شیخ علی حزیں، طالب آملی، عرفی، ظہوری اور نظیری کے ہم پلہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ کلیات کی تقریظ میں اس ہمسری کو عجب انداز میں بیان کیا ہے:

"تا ہمدساں ہنگام پویش خراماں راہ خجستگی اندیش
ہمقدمی کہ در من یا فتند مہر بجنبید و دل از آزرم ہیدہ
آمد۔ اندوہ دار گیہائے من خوبعند آموزگارانہ
درمن نگرستند۔ شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بیراہہ
روی‌ہائے من بمن در نظر جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب
آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے
نارو ادر پائے رہ پیمائے من سوخت، ظہوری بسرگرمی
گیرائی نفس حرزے ببازوئے و توشہ بکمرم بست
و نظیری لاابالی خرام بہ ہنجار خاصہ خودم بچالش آورد۔
اکنوں بہ یمن فرۂ پرورش آموختگی ایں گروہ فرشتہ
شکوہ، کلک رقاص من بخرامش تدرواست و بنوائے
موسیقار، بجلوہ طاؤس است و بہ پرواز عنقا"[۲]

مثنوی "ابر گہر بار" کے دیباچہ میں فردوسی و نظامی کی ہمسری کو اسی نوعیت سے بیان کیا ہے۔ پہلے قصیدہ و غزل کے سلسلہ میں عرفی و نظیری وغیرہ کا ذکر کر کے مثنوی کے متعلق لکھا ہے:

بسیج نبشتن مثنوی دلنشیں افتاد۔ فردوسی طوسی را بہ رہنمائی و نظامی گنجوی را بہ نیرو فزائی گماشتند[۳]

اگر غالب کی یہ مثنوی مکمل ہو جاتی تو یقیناً "شاہنامہ" اور "سکندر نامہ" کے ہم پلہ ہوتی۔ اب بھی بعض مقامات ایسے ہیں کہ قدیم شعراء کا کلام ان کا حریف نہیں بن سکتا۔ مناجات کا انوکھا اور اچھوتا انداز بیان اس کا بیّن ثبوت ہے جس میں تصورِ جنت کے متعلق عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں۔ خرد و دانش کی ستائش میں ان کا مدِ مقابل کوئی نہیں۔ مقابلہ و موازنہ کے لئے حمد، نعت، منقبت، مغنی نامہ و ساقی نامہ کے علاوہ اور بھی مقامات قائم کئے جا سکتے ہیں مثلاً لشکر کشی، استقبال بادشاہ، آرائش شہر، بیان نامرادی و ناکامی، حسرت و یاس جوانی و پیری، خرد و دانش وغیرہ۔

حمد میں وہ بہت بلندی پر پہنچے ہیں۔ مناجات کے انداز کا مقابلہ ہو نہیں سکتا۔ نعت میں معراج کا بیان منفرد ہے۔ دیباچہ میں مناجات و معراج کے متعلق خود لکھتے ہیں:

"و شیوۂ مناجات بہ شیوۂ ابداع بداں ساں رندانہ و قلندرانہ سخن سرودہ شد کہ مرد شان بہشتی را لب از شور ہا یا ہوئے تبخالہ زد و عبادت معراج عروج فکر آں پایہ یافت کہ سخن از جائیکہ معرفت بدانجا رسید"[۴]

غالب نے جتنا کچھ لکھا ہے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی مثنوی گو سے پیچھے نہیں رہے اور یہ بہت بڑا کمال ہے کیونکہ ایسے باکمال بہت کم ہوتے ہیں جو ہر صنف سخن میں یکساں دستگاہ رکھتے ہوں۔

۱؎ شعر العجم جلد اوّل ۲۵۹

۲؎ کلیات نظم ۲۱۵ نثر ۶۸ ۳؎ دیباچہ مثنوی۔ ۴؎ دیباچہ مثنوی ۲۹۴

غالب کا درباری اعزاز اور منصب

(چند نئی اطلاعات کی روشنی میں)

اصغر علی خاں

غالب نے اپنی معاشرتی سربلندی کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے اپنا نسب نامہ تور سے جا ملایا ہے اور زادِ شم و افراسیاب کی بات کرتے ہوئے انہیں ہمیشہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ جب کبھی خاندانی شجرے کا ذکر آجاتا ہے تو خواہ مخواہ ان کا جی تفصیلات میں جانے کو چاہتا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو تشرگانِ قوم سے ہم پیوند کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اس حکایت کو دراز تر کر کے لذت کام و دہن کا اہتمام کیا ہے۔ سپہ گری کو سو پشت سے پیشہ آبا بتلاتے ہوئے جو فخریہ لہجہ وہ اختیار کرتے ہیں اس کے دور رس اثرات پڑھنے والے سے چھپے نہیں رہتے۔

قندِ مغش کا دیانی، دستنبو، او وطن کے لباس کا ایک جزو کلاہ پاپاخ یہ سب کچھ ایرانی النسل ہندوستانی کی شخصیت کے اظہار کی مختلف راہیں تھیں جو شعوری اور غیر شعوری طور پر تمام عمر نمایاں ہوتی رہیں۔ ان کی انفرادیت نے کوئی مقام ایسا نہ چھوڑا جہاں اپنے آپ کو خوش اسلوبی سے پیش نہ کر دیا ہو یہی وجہ ہے کہ وہ زمانے کے ایک بہت مشہور آدمی رہے ہیں۔ انہوں نے ایک خاص تہذیب کی نمائندگی بڑی خوبصورتی سے کی ہے جس میں لاکھ زوال کے نشانات ہوں مگر مٹتے مٹتے بھی ایک آن بان تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ غالب کا بچپن اور جوانی کا بھی ایک حصہ آسودہ و خوش حال رہا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے جوانی تک دادِ عیش دی اور خوب رنگ رلیاں منائیں۔ پھر سر بازی اور شراب نوشی کی عادتیں انہیں ابتدا ہی سے تھیں جو اس خیال کی مزید تائید کرتی ہیں۔ باپ اور چچا کے انتقال کے بعد وہ اپنی ننھیال میں رہے جو کھاتے پیتے لوگ تھے۔ اس لئے ان کی ناز برداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی تھی۔ انہوں نے آغاز میں شاعری بھی جس انداز کی، سو وہ ذہنی اطمینان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ معمے اور پہیلیاں بھجوانا اور چیستاں بنانا وقت کی افراط اور دل و دماغ کے یک گونہ سکون پر دلالت کرتا ہے۔

غالب تمام عمر ٹیڑھی چال چلتے رہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو کبھی بے طرح مست نہیں بنایا۔ نہ وہ کبھی اتنے نیچے گئے کہ پھر ابھرنا مشکل ہو جائے۔ وہ سدھ بدھ سے بے خبر ہو کر کبھی نہیں رہے یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں جذباتیت کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہ دل کی لگی میں نہ گریبان چاک پھرے اور نہ آوارہ و رسوا سربازار ہوئے۔ یہاں بھی شاید انہیں ان کی حسِ برتری بچا لے گئی جس کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے کہ مغل بچے جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ اپنی انگشت نما موقعوں اور چھچھورے رنگ پر بھی وہ اپنے آپ ہی مٹے ہوئے تھے۔

غالب کی اس انفرادیت نے اُن میں جو انانیت پیدا کی تھی وہ بلند اور مقدس نہیں کہی جا سکتی۔ اُس سے نہ تو مورخ کو کوئی نیا رُخ ملا اور نہ غالب کو قرار۔ اگر اسی ایک نکتہ کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکال لینا مشکل نہ ہوگا کہ اپنے نام و نسب کی برتری و بلندی کی داستانیں سناتے ہوئے وہ ایک کرب اور تکلیف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جوانی کی پہلی منزل گزر جانے کے بعد جب وہ اپنے خاندان کے ذمہ دار آپ ہو گئے اور اُن کے اوقات سخت اور آلام شدید ہوتے گئے تو اُن کے اُن مردہ احساسات نے کتنی اذیتیں پہنچائیں۔ ماضی کے تابناک تصور اور مستقبل کے ہولناک خوف نے اُنھیں عجیب کشمکش میں الجھائے رکھا جس سے الگ ہو جانا اُن کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ اس احساس کے ریشے اُن کے دماغ میں اس طرح جاگزیں ہو گئے تھے کہ اُن کو جدا کرنے کی ہر کوشش کے معنی یہ تھے کہ غالب کے ذہن کے پردوں کو ایک ایک کر کے آسودگی سے صاف کیا جائے جو اس لئے

ممکن نہیں تھا کہ ہر تہہ میں محبوب تصورات، خوبصورت تمنائیں اور حسین آرزوئیں چراغانِ دیوالی کی طرح صف بصف روشن تھیں جن کے بجھائے بغیر علاج ممکن نہیں تھا۔ لیکن غالب سے یہ روشنی چھین لی جاتی تو تسکین کا ایک موہوم آسرا بھی ٹوٹ جاتا۔

انہیں جذبات و عوامل کے تحت دولت انگلیشیہ سے غالب کے تعلقات پر غور کیجئے۔ غالب کسی قیمت پر بھی اس کے لئے راضی نہ تھے کہ انگریزی حکومت انھیں بے تعلق سمجھے۔ انگریزوں سے اُن کے تعلقات کی ابتدا اُن کے چچا، مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ مرہٹوں کے زمانے میں اکبر آباد کے صوبے دار تھے۔ لارڈ لیک نے جب اس علاقے پر چڑھائی کی تو نصر اللہ بیگ خاں نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنی عملداری کو حملہ آور کے سپرد کر دیا۔ اس حسنِ سلوک کے صلے میں لارڈ لیک نے انھیں چار سو سوار کا رسالدار بنا دیا اور سو روپے تنخواہ مقرر کی گئی۔ نصر اللہ بیگ خاں دلیر آدمی تھے۔ انھوں نے اتنے ہی پر قناعت نہیں کی اور سونک سونسا کے دو زرخیز پرگنے ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے ہتھیا لئے، جو تاحیات ان کے قبضے میں رہے اور انگریزوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

غالب اپنے باپ کے مرنے کے بعد چچا کی زیرِ سرپرستی آ گئے تھے۔ لیکن ۱۸۰۶ء میں اُن کے چچا کا انتقال ہو گیا تو لارڈ لیک نے اُن کی جاگیر واپس لے لی، رسالہ توڑ دیا اور وفادارانہ سلوک کے بدلے میں متعلقین کے لئے ۵ ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کر دی۔ اس رقم میں سے غالب کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ یا ساڑھے ۶۲ روپے ماہوار ملنے کا حکم ہوا۔ غالب کی خاندانی فارغ البالی کے مقابلے میں جو انہیں ننہیال اور ددھیال دونوں طرف سے میسر تھی یہ بڑی معمولی رقم ہے۔ لیکن پہلی جنگِ آزادی میں انگریزوں نے جو رستخیز بیجا مچا رکھی تھی اس کی زد میں آ کر غالب کی یہ موروثی پنشن بھی ختم کر دی گئی۔

غالب فطرۃً حکومت دوست تھے۔ یا یوں کہیئے اُن کی ضرورتوں نے اُن کو ایسا بنا دیا تھا۔ انھوں نے ہر موقع پر اسی میں عافیت سمجھی کہ انگریزوں کا ساتھ دیا جائے۔ اسی حکومت دوستی کا صلہ تھا کہ اُن سے اس ہنگامۂ آتشیں کے فرو ہو جانے کے بعد کوئی باز پرس نہ کی گئی لیکن جب انھوں نے پنشن کا مطالبہ کیا تو یہ جواب دیا گیا کہ:

"ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" (اردوئے معلی۔ بنام [illegible] ۲۱) اب کہ اُن ہزاروں روپے کی آمدنی کا سوال تھا جو وہ اپنی امیرانہ طبیعت کی تسکین کے لئے نہیں، زندگی گزارنے کو قرض لیتے رہتے تھے اور دام آپ کی آمدنی کے سوا کوئی ذریعۂ معاش نہیں رہ گیا تھا ایسے موقع پر انگریزی حکومت کی طرف سے یہ اطلاع پا کر اُن کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو بے قصور اور بے جرم ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مدّاحانِ حکومت انگلیشیہ میں اپنا نام درج کرا کے وزرائے سلطنت اور دربان کے دو سارٹیفکٹ حاصل کئے۔ رامپور سے اُن کے شاگرد، نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم چاہتے تھے تا کہ اُن کے دکھ کا کچھ ازالہ ہو سکے۔ لیکن غالب کے لئے معاملے کو ناتمام چھوڑ کر دلی کھا بہ جانا مناسب نہیں تھا۔ اور وہ اسی لئے اپنی جگہ سے نہ ہلے اور خون کھائے جینے کی مشق کرتے رہے۔ اس معاملے نے خاصا طول کھینچا۔ ۷ر نومبر ۱۸۵۹ء کو انھوں نے ناظم کو لکھا ہے:

"اب تک میں اپنے آپ کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بیگناہ ہوں یا گناہ گار مقبول ہوں یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم کرے۔ بہر حال راہ چارہ مسدود اور دکھ موجود۔" (مکاتیب غالب۔ متن ص۳۱)

غالب کی ان اطلاعات کا مقصد یہ تھا کہ وہ نواب صاحب کو اپنا سفارشی بنائیں، اس لئے کہ ۱۸۵۷ء کی وفاداری سے نواب صاحب کا انگریز حکام میں خاصا رسوخ اور اثر تھا۔ نواب صاحب کے دل میں بھی غالب کے لئے بڑی قدر و منزلت تھی جس کا ہلکا سا اندازہ اُن عطیات سے ہو سکتا ہے جو غالب کو وقتاً فوقتاً پہنچتے رہتے تھے وہ مختلف مواقع پر غالب کی برأت اور "نیک چلنی" کا افسرانِ بالا کو یقین دلاتے رہے اور اُن مدارج کے لئے جو قدیم سے غالب کو حاصل تھے کوشاں رہے تا آں کہ اُن کی سفارش بار آور ہوئی۔

پنشنداروں کا نقشہ جن میں غالب کا نام شامل تھا وصول پا کر غالب نے نواب صاحب کو لکھا:

"عالم دو ہیں ایک عالمِ شہادت ایک عالمِ غیب جس طرح عالمِ شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں عالمِ غیب میں آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے ..." (مکاتیب۔ متن ص۳۱)

اور اس کے بعد ۴ر مئی ۱۸۶۰ء کو پنشن کی واجب الادا رقم وصول کر لی۔ لیکن ابھی غالب معاملے کے صرف ایک حصے (پنشن) کو سلجھا پائے تھے۔ دربار میں باریابی اور خلعت کے اجرا کا سوال باقی تھا۔ درباری حیثیت کے بارے میں غالب کے بیانات مختلف ہیں۔ مناسب ہو اگر یہاں ہم غالب کی متعلقہ تحریروں کے اقتباسات سامنے رکھیں۔ انھوں نے اپنے محسن نواب یوسف علی خاں ناظم ہی کو ایک بار لکھا تھا:

"میں انگریز سرکار میں علاوہ ریاست [illegible] کا رکھتا ہوں معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں دس نمبر اور سات پارچے اور جیغہ سرپیچ مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔" (مکاتیب۔ متن ص۱۵)

۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی سے پہلے دہلی میں صرف گورنر جنرل

کی آمد پر دربار ہوتا تھا۔ ۱۸۴۴ء میں غالب کو پہلی بار دربار میں حاضری کی اجازت ملی۔ دہنی صف میں دسویں نمبر کی نشست کا اعزاز دیا گیا۔ یہ دربار لارڈ ہارڈنگ نے کیا تھا۔ لارڈ ایلن برا کے عہد میں خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر [illegible] قرار دی گئی۔ ۱۸۴۵ء میں لارڈ ہارڈنگ کے دربار میں بھی غالب شریک ہوئے۔ لارڈ ڈلہوزی ۱۸۴۸ء میں بغیر دربار کے واپس چلے گئے۔ غالب نے ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل کے ذریعے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں ایک مدحیہ قصیدہ پیش کیا اور یہ درخواست بھی کی کہ انھیں خطاب عطا کیا جائے نیز پنشن کی رقم میں اور خلعت کے اعزاز میں اضافہ کیا جائے۔ لیکن اضافہ در کنار، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اُن کی موجودہ پنشن اور خلعت دونوں کو یک قلم ختم کر دیا۔ جب ۱۸۵۹ء میں لارڈ کیننگ نے میرٹھ میں انعقادِ دربار کا اعلان کیا تو غالب کو خلعت فاخرہ پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی اس لئے کہ وہ بقول خود نہ مقبول تھے نہ مردود نہ مخبر تھے نہ مفسد۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ حاکم نے اُن کا نام دربار کے فرد میں نہیں لکھا ہے تو اس کے مرافعے کی سوچنے لگے۔ یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو مجروح کو لکھا ہے:

"پنجشنبہ ۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے، کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اُس وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو گیا۔ میر منشی سے ملا، اُس کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔" (خطوط: ۱۔ ۲۰۶)۔

اس کے بعد وہ مختلف اشخاص کو بتلاتے رہے کہ حکام متعلقہ نے انھیں باغیوں سے اخلاص رکھنے والا جانا ہے، حالانکہ یہ اخلاص مظنونہ محض ہے۔ چنانچہ انھوں نے حکومت سے تحقیقات کی درخواست بھی کی تاکہ ان کی صفائی اور بے گناہی ثابت ہو جائے۔ لیکن یہاں بھی ناکامی نے پیچھا نہ چھوڑا اور غالب کو یہ جواب مل گیا کہ تحقیقات نہیں کی جائے گی۔ اس طرح غالب اس نتیجہ پر پہنچ کر دربار و خلعت بند ہو گئے اور اب مدت العمر کی مایوسی ان کے حصے میں آئی۔

لیکن وہ ایسے جلدی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ قصائد اور خطوط مسلسل بھیجنے میں انھوں نے کبھی کمی نہ کی۔ جنوری ۱۸۶۲ء میں لارڈ ایلگن کے گورنر جنرل مقرر ہونے پر انھوں نے پھر یہ درخواست دی کہ میری پنشن کا اجرا میری بے گناہی کا ثبوت ہے۔ [illegible] کا حق کیوں چھین لیا گیا ہے۔ انھیں اپنے اقربا سے یہ آزردگی [illegible] شکوہ تو تھا ہی۔ اس خلعت اور پنشن

کے قصیدے میں [illegible] انصاف سے داد چاہتے ہوئے [illegible]۔ ۱۸۶۳ء سے حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور توقعات کی نئی کرنیں طلوع ہوئیں۔

فروری ۱۸۶۳ء میں گورنر پنجاب نے دلی میں دربار کیا تو انھوں نے اس کے بارے میں تفتہ کو ۲ مارچ ۱۸۶۳ء کے مکتوب میں لکھا:

"اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر جنرل آئے ہیں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں اُن اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہو گا۔ تم بھی انبالے جاؤ۔ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔

بھائی کیا کہوں کہ میرے دل پر کیا گزری [illegible] اٹھا۔ نذرِ معمولی میرا قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر ادھر سفر کی تدبیر حواس ٹھکانے نہیں ....." (اردوئے معلیٰ ص۱۱۱)

اسی واقعے کا مجروح کے خط (اردوئے معلیٰ ص۲۸۱) میں بھی تذکرہ کیا گیا ہے:

"اواخر ماہ گذشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلی آئے۔ اہالی شہر سب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنا نام لکھوا آئے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرودِ حکام تھا، جگہ سے نہ ہلا، کسی سے نہ ملا، دربار ہوا، ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ ۲۸ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ مہربان پا کر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔

جملہ معترضہ: میر منشی لفٹنٹ گورنری سے سابقہ تعارف نہ تھا۔ وہ بطریق حسن طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا۔ جب حکام انگریز استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف سے حسن طلب بایمائے حکام ہو گا۔ [illegible] الطاف خفیہ۔

بقیہ روداد یہ ہے کہ دو شنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر میں خیمہ [illegible] گورنری ہوا۔ آخری روز میں اپنے شفیق و کریم جناب مولوی اظہار حسین صاحب بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیر ہو کر پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ یہ حضرت نے کہا

کہ حاکم نے ولایت سے آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذات انگریزی و فارسی دیکھے اور اجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسداللہ خاں کا دربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا ہے؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ نہیں معلوم بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھا کر چودہ دن یا پندرہ دن ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ کارساز کا بندگی کا ربنا۔ شنبہ ۳ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلا کر خلعت عطا فرمایا اور ارشاد ہوا کہ لارڈ صاحب کے یہاں کا دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا۔ حضور کے قدم دیکھے خلعت پایا لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا نہال ہو گیا۔ اب انبالے کہاں جاؤں جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہور ہوں گا۔"

(اردوئے معلیٰ۔ ۲۸۰)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو سکرتر صاحب کے دفتر میں بلایا نہ گیا تھا، بلکہ یہ از خود گئے تھے۔ وہاں جا کر سکرتر صاحب کے پاس اپنا کارڈ بھیجا اور جب انھوں نے طلب کیا تو ملاقات کی۔ بہر حال اس موقع پر غالب انبالے نہیں جا سکے اور اس مبارک تقریب میں شریک نہ ہو سکے جس کی وہ مدت سے آس لگائے بیٹھے تھے۔ ۲۶ مارچ ۱۸۶۳ء کو میر سرفراز حسین کو لکھا ہے:

"رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پہ ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہو گئی، پھوڑا پھٹ کر زخم ہوا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا اب بقدر یک کف دست سے گوشت مردار ہو گیا۔ انبالے نہ جانے کی یہی وجہ ہوئی۔" (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۹۳)

اسی کے بارے میں ۳ مئی کے خط میں شفیق نے ان کو لکھا:

"... اس پھوڑے کی وجہ سے انبالے نہ جا سکا۔"

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۲۸)

[illegible] کو بھی یہ اطلاع ان الفاظ میں دی ہے:

"[illegible] صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی [illegible] اور خلعت پہ قناعت کی کہ انبالے جانا موقوف کیا اور نہ گورنر کا دربار اور خلعت اکبر دستور ہوتا۔ [illegible] [illegible] ایک زخم کیا تھا وہ [illegible] کیا اب [illegible] کیا [illegible]۔" (خطوط [illegible])

اس کے علاوہ [illegible] بطور [illegible] برداشت کرنا بھی غالب کے لئے آسان [illegible] [illegible] آرزو کے [illegible] [illegible] شریک ہو [illegible] کی اس [illegible] نواب [illegible] خاں کے نام [illegible] [illegible] ظاہر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۸۶۳ء میں غالب کا خلعت دوبارہ جاری ہو گیا تھا اور انبالے کے دربار میں وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ جا سکے۔

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔ غالب کا کہنا ہے کہ جب وہ کسی دربار میں شریک ہوتے تھے تو نقد رقم کی جگہ بطور نذر قصیدہ یا مدحیہ قطعہ یا کوئی نظم گزرانتے تھا۔ وہ انہیں دربار کی سیدھی صف میں دسویں نشست، سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ غالب کے اپنے الفاظ ایک بار پھر سامنے رکھئے:

"نذر معمولی میرا قصیدہ ہے" (مکتوب بنام تفتہ۔ اردوئے معلیٰ ۔۔۔)

"دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا....." (مکتوب بنام قدر بلگرامی۔ خطوط ۱۹۴/۱)

لیکن سرکاری اندراجات میں نہ یہ نذر درج ہے جو غالب نے بیان کی اور نہ یہ خلعت ہے جس کے غالب دعویدار ہیں۔ خوش قسمتی سے کتب ریاست لوہارو (موجودہ علم پور ہوتا لائبریری) میں ایک ایسا مجموعہ محفوظ ہے جس میں دو درباروں کے دستور العمل اور چند متعلقہ فہرستیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان مشمولات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ "دستور العمل حضور اسٹار آف انڈیا برٹش سماہند ۔۔۔ ۴ صفحے مطبوعہ مطبع پنجابی لاہور۔

۲۔ دستور العمل دربار خاص نواب مستطاب معلی القاب وایسرائے و گورنر جنرل بہادر کشور ہند[1] جو بمقام لاہور بروز شنبہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو منعقد ہوگا ۔۔۔ ۴ صفحے از طرف سی یو ایچنس ۔ انڈر سکرتری گورنمنٹ ہند شملہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۴ء مطبوعہ کوہ نور۔

۳۔ "فہرست معززین جو دربار خاص النواب وایسرائے و گورنر جنرل بہادر کشور ہند میں باریاب ہوں گے" ۔۔۔ ۴ صفحے سی یو ایچنس انڈر سکرتری گورنمنٹ ہند مطبوعہ کوہ نور لاہور۔

۴۔ "پروگرام یعنی دستور العمل دربار عام نواب صاحب مستطاب معلی القاب وایسرائے و گورنر جنرل کشور ہند جو بتاریخ ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۴ء

---

[1] وہاں لارڈ لارنس (JOHN LAIRD MAIR LAWRENCE) مراد ہیں [illegible] ۱۸۶۴ [illegible] پہنا [illegible] ہے: ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی [illegible]

یوم سہ شنبہ بمقام لاہور منعقد ہوگا"۔ ۳ صفحے دستخط سی یو ایچیسن انڈر سکرٹری گورنمنٹ ہند مقام شملہ ۲۳ ستمبر ۱۸۶۴ء

۵۔ "فہرست نمبروار رؤسا و عمائد پنجاب و مضافات پنجاب سولئے کوہستان شملہ جو دربار عام نواب مستطاب نائب السلطنت و گورنر جنرل بہادر کشور ہند میں باریاب ہوں گے"۔ ۳۶ صفحے، مطبوعہ مطبع کوہ نور لاہور۔

۶۔ "نمبر ۹۹۵ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء دربار نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک پنجاب[1] ذخیرہ معسکر دہلی واقع ۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء"۔ ۳ صفحے

مشمولہ نمبر ۵ کے صفحہ ۳۴ پر مندرجہ ذیل تفصیل غالب کے بارے میں ملتی ہے:

قسمت	نمبر	تعداد ہمراہیاں	نام	نذرانہ	خلعت
دہلی	۵۵۸	×	مرزا نوشہ	۵ [illegible]	[illegible]

اس طرح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دربار میں غالب ۵۵۸ نمبر کی نشست اور ۵۰ روپے کا خلعت پاتے تھے اور نذر میں ۵۰ روپے گزرانتے تھے۔

ان اطلاعات کی موجودگی میں غالب کا یہ دعوی کہ وہ نذر معمولی قصیدہ پیش کیا کرتے تھے اور اُن سے دام و درم کی صورت میں کچھ نہیں لیا جاتا تھا۔ مشکوک ہو جاتا ہے یہ بات بھی قابل قبول نہیں رہتی کہ اُن کی دربار کی نشست سیدھی صف کے "دسویں" نمبر میں تھی۔ غالب نے میکلوڈ بہادر لفٹنٹ گورنر پنجاب کے لئے ایک قصیدے میں شکایتاً یہ لکھا ہے:

میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر
حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام
اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ کا نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے کلیجہ لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام
اس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشیب میں، از روئے اہتمام

. . . .

. . . .

خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام
امر جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال
بارے قدیم قاعدے کا چاہئے قیام
ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

(دیوان غالب اردو۔ نسخۂ عرشی)

متذکرہ اشعار سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس غالب کے اعزاز میں کوئی کمی کی گئی تھی۔ عرشی صاحب نے میکلوڈ کے نام اس قصیدے کی تاریخ کا تعین کرنے کے بعد یہ لکھا ہے:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف الذکر نے کسی سال ۱۳ جنوری کو لب دریا خیمے کھڑے کرا کے دربار کیا تھا۔ مرزا صاحب کا نام دربار کی فہرست میں غلط لکھا گیا تھا۔ اور بوقت ضرورت شرکت نمبر نذر اور خلعت کا پچھلا انتظام برقرار نہ رکھا گیا تھا۔ یہ طرز عمل ۷۰ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے لئے بہت جگر خراش ثابت ہوا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ کسی اخبار نویس نے اخبار لودھیانہ میں لودھیانہ دربار کے اندر اُن کا نامناسب الفاظ میں ذکر کیا۔ مرزا صاحب کو اپنی دربار کی چشمک کا ہی کافی صدمہ تھا۔ اس سے اور زیادہ دکھ پہنچا وہاں اژدحام کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ گویا کہ اس قصیدے کے ذریعے پچھلے مراسم کی برقراری کی استدعا کی۔ میکلوڈ صاحب نے منٹگمری کے ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء کو مستعفی ہونے کے بعد گورنری کا عہدہ سنبھالا تھا۔ ۱۳ جنوری ۱۸۶۵ء کو دربار کرنا اور فہرست شرکا کا جاری ہو کر سب کو پہنچ جانا محال ہے۔ ۱۳ جنوری ۱۸۶۷ء کو بھی دربار کرنا ناممکن ہے۔

---

[1] سر ڈونالڈ میکلوڈ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی داغ بیل انہوں نے ہی ڈالی تھی۔ "مکاتیب غالب" حواشی ص ۱۸۰۔

نہیں سکے کہ اس سے ۲۸ دن پہلے ۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء کو ان کا دربار دلی میں ہو چکا تھا۔ جس میں میرزا صاحب بھی شریک ہو کر خلعت پہن چکے تھے۔ ۱۳؍جنوری ۱۸۶۷ء کو میرزا صاحب کی شرکت کو عقل نہیں مانتی۔ اس لئے کہ ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ دسمبر ۱۸۶۶ء میں بغیر آشوب کے سہارے کے دربار میں چل پھر نہ سکتے تھے تو مرنے سے ایک ماہ قبل کب اس قابل ہوں گے۔ اب جنوری ۱۸۶۷ء اور جنوری ۱۸۶۸ء رہ جاتے ہیں۔ ان کے متعلق اس سوال کا جواب کیا ہوگا کہ جب میکلوڈ انہیں دسمبر ۱۸۶۶ء میں خلعت دے چکے تھے تو اب کیوں نہ دیا۔" (مکاتیب غالب، حاشیہ دیباچہ)

اسی قصیدے کے بارے میں ایک اور مقام پر انہیں کی یہ تصریحات بھی ملتی ہیں:

"مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ' کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اخبار الہلال میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ لارڈ کیننگ کے دربار آگرہ منعقدہ ۱۳؍جنوری ۶۰ء کے موقع پر میرزا صاحب نے لکھا تھا لیکن میری دانست میں یہ تاریخ درست نہیں ہے۔ اول اس بنا پر کہ اس میں میکلوڈ صاحب کو فرمانروائے پنجاب بتایا ہے اور وہ ۱۰؍جنوری ۶۵ء کو مسٹر منٹگمری کے مستعفی ہونے کے بعد فنانشل کمشنری پنجاب کے عہدے سے ترقی پا کر لفٹنٹ گورنر پنجاب ہوئے تھے۔ (تاریخ پنجاب از منشی دیبی پرشاد، ۱۹۷ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۲ء) دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کے ۱۹ ویں شعر میں ریل کے کھلنے کا ذکر ہے اور اس کا واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۵ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتے سے رانی گنج تک جو ۱۲۰ میل کا فاصلہ ہے جاری تھی۔ تعمیر کا کام برابر دلی تک جاری رہا۔ پہلے آگرے سے جمنا کے غربی کنارے تک داغ بیل ڈالی گئی۔ غدر کے بعد اس کی جگہ ٹونڈلا جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی جمنا کے مشرقی کنارے تک کا حصہ سنہ ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا اس وقت جمنا کا پل بن رہا تھا۔ سنہ ۱۸۶۶ء کے آخر میں یہ پل بن کر تیار ہوا اور یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو پہلی بار اس پر سے ریل گذری (واقعات دارالحکومت دہلی ۱: ۴۳۳، ۲: ۲۲۲)۔ تیسرا اس وجہ سے کہ تیرھویں شعر میں میرزا صاحب نے اپنی عمر ۷۰ برس کی بتائی ہے چونکہ ان کا سال پیدائش ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) ہے اور ان میں ۷۰ کا اضافہ کیا جائے تو ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۷ء) ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ قصیدہ جنوری ۱۸۶۷ء سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ اس کے ۱۴ ویں شعر میں ۱۳؍جنوری کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس تاریخ کے بعد کا ہونا چاہیے۔"

(دیوان غالب، عرشی)

ان تمام پیچیدہ اطلاعات کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس نئی اطلاع اور قصیدے میں اعزاز کی کمی کی شکایت دونوں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ عرشی صاحب کی متعینہ تاریخ کو اگر صحیح مان لیا جائے (اور اس کے غلط ماننے کے لئے ہمارے پاس شواہد میں بھی نہیں) تو یہ ماننا پڑے گا کہ غالب کے اعزاز کی کمی کی اطلاع پہلی بار انہیں دربار لاہور کے موقع پر نہیں مل سکی ورنہ وہ ۱۳؍جنوری کے بجائے دربار لاہور کی تاریخ ۱۸؍اکتوبر کی طرف اپنے قصیدے میں اشارہ کرتے۔ غالبیات میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ غور طلب اور دلچسپ بات ہے۔

اسی سلسلے میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ غالب کے دربارِ لاہور میں شریک ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

مشمولہ نمبر ۵ سے بھی غالب کے سلسلے کی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جدوجہد آزادی کو مٹانے میں انگریزوں نے جو سختیاں برتی تھیں اور تہذیبی و تمدنی نشانات کو مسخ کرنے کی جو کوشش شد و مد سے کی گئی تھی وہ حکومت کرنے کی حکمتِ عملی کے قطعاً خلاف تھی اس لئے حکام انگلشیہ کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس افراتفری کے دور کے مذموم اور مسموم اثرات کو معتدل بنایا جائے۔ چنانچہ کالج، اسکول سوسائٹیاں قائم کر کے اور ان کی زور و شور سے سرپرستی کر کے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی گئی تھی جن کو مشمولہ ایک ایسے ہی دربار سے متعلق ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ دیسی شرفا کو لوٹاتے ہوئے ان کی علمی و ادبی مشاغل کی سرپرستانہ تعریف و توصیف کر کے دلوں کو غلامانہ اظہار وفاداری اور جذبات تشکر سے چھید کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے "جرنال اردو" تقریر فرمائی۔

اس دربار کی روداد کو مختصراً نقل کیا جاتا ہے:
فہرست شرکا میں سے جو اہم لوگ تھے ان کے نام بھی لکھے جاتے ہیں۔

ان میں پیارے لال غالب کے عزیز شاگرد ۔ ماسٹر پیارے لال آشوب مراد ہیں اور بدر الدین دلی کے مشہور مہر کن تھے۔ انہوں نے ملکہ وکٹوریا کی بھی مہریں تیار کی تھیں ۔

" تاریخ ۱۷ دسمبر یوم دوشنبہ کو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے ہندوستانی رئیسوں اور شریفوں کی باریابی کے واسطے مکان انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ایوان میں دربار منعقد فرمایا۔

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بمعیت اپنے مصاحبین کے چار بجے شام کے وقت داخل ایوان مذکور ہوئے اور . . . . . بہت سے صاحبان سررشتہ ملکی اور فوج اور دیگر صاحبوں سے ملاقات کی ۔

ہندوستانی رئیسان اور عمائد مفصلہ ذیل حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر میں پیش ہوکر شرف یاب ملازمت ہوئے ؛

مختار حسین خاں رئیس پاٹودی ۔ مرزا الٰہی بخش از خاندان شاہی دہلی ۔ مرزا سلیمان شکوہ خلف مرزا الٰہی بخش آنریری مجسٹریٹ ۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں از خاندان لوہارو ۔ مرزا علاء الدین احمد خاں خلف رئیس لوہارو ۔ نواب سید احمد خاں صدر الصدور علی گڑھ ۔

——— مرزا نوشہ ۔ شاعر ۔ مرزا موصوف کو بہ سبب اون کی مشہور و معروف لیاقت علمی کے اور بہ جلد وی امداد کے جو سرکار کو اوس نے افسران سررشتۂ فوج کے امتحان کے واسطے نئی کتابیں طیار کرنے میں دی ۔ خلعت نو پارچہ کا عطا ہوا ۔

بدر الدین مہر کن

پیارے لعل ہیڈ ماسٹر مدرسۂ تعلیم المتعلمین دہلی

مولوی ضیاء الدین اسسٹنٹ پروفیسر عربی دہلی کالج

حکیم احسن اللہ خاں طبیب

جب حاضرین دربار کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے حضور میں پیش ہونا ختم ہوا تو پیارے لعل آنریری سکریٹری نے ایک درخواست انجمن علمی دہلی کی طرف سے بدیں مضمون کہ نواب ممدوح الوصف انجمن مذکور کا مربی ہونا منظور فرما دیں پیش کی ۔

اوس کے بعد نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے حاضرین جلسۂ دربار کی طرف مخاطب ہوکر زبان اردو فرمایا کہ اے رئیسان و سکنائے دہلی آپ کو اس شہر میں دربار عام میں مجتمع کرنے کا یہ موقع اولین حاصل ہوا ہے اور آپ کے شہر اور بہت مشہور شہر کی کتنی عالیشان عمارتوں کو دیکھ کر اور کتنے ہی دلکش مقامات اور ترقی کی علامتوں کے ملاحظہ کے بعد جو آپ سے ملاقات کرنے کا حاصل ہوا میں نے بہت خوشی سے جلسہ کا اس عمدہ ایوان میں قرار دیا ۔

اس بات کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے کہ دہلی مدت مدید سے مشہور رہی ہے نہ فقط اس واسطے کہ پے در پے ہندو، پٹھان، اور مغل بادشاہوں کی دار السلطنت رہی ہے بلکہ نیز اس واسطے کہ علم اور ہنر کا مخزن رہی ہے اور تجارت کی ایک ایسی بڑی چھاؤنی کی جگہ کہ ہندوستان شمالی میں کوئی اور جگہ پینٹھ کی اوس کے برابر نہیں یہ بات بخوبی مشہور و معروف ہے اور اس کا خاص ذکر کرنے کی ضرورت نہیں لیکن جو اب حکمراں ہیں ان کو آپ کے ذہنوں میں یہ بات منقوش کرنی مناسب اور واجب ہے کہ زمانہ گذشتہ کے امتیاز فخریہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینا اور اس کو برقرار رکھنا اور اس بات میں کوشش کرنا کہ اگر ممکن ہو تو جو ترقی اور جو رونق دہلی کو کبھی پہلے حاصل ہوا ہے اوس سے زیادہ حاصل کیا جاوے آپ کے واسطے فرض ہے علم و ہنر کے باب میں البتہ وہ انعام اور وہ ترغیبیں نہیں رہی ہیں جو شاہنشاہوں کے دربار میں تھیں ۔ لیکن ایک نئی حالت ایسی پہلی حالت کے جا بجا آگئی ہے کہ جس سے آئندہ کے واسطے بہت امید معلوم ہوتی ہے۔ ایک کالج جو کلکتہ کی یونیورسٹی سے متعلق ہے اس جگہ مقرر ہوا ہے اور یہ کالج مسٹر ولیمنٹ صاحب اور ان کے مددگاروں کے اہتمام کے سبب سے جو لیاقت اور جستی کے ساتھ کیا جاتا ہے سرعت کے ساتھ درجہ فائق کامگری کا حاصل کرتا جاتا ہے شہر کے یعنی ٹون TOWN اسکولوں اور ایسا ہی اور جگہ کے مدرسوں میں بھی انگریزی پڑھائی جاتی ہے طلبا کی تعداد کثیر ہے اور انگریزی زبان اور مغربی قوموں کا علم حاصل کرنے کی خواہش شائستگی کے ساتھ عام ہوتی جاتی ہے کہتے ہیں کہ کالج کی جماعتوں میں سے سولہ طلبا نے اس سال میں بشرح مواجب نوکریاں سرکار کی یا بیس روپیہ غیر سرکاری حاصل کی ہیں اور امید ہو سکتی ہے کہ جو علم یکہ دنیا کو اس طرح حاصل ہوتا ہے اخلاق و عقل میں بڑی ترقی ہوتی جاتی ہے اور ملک کی حقوق کے علم و ہنر سے اعلیٰ قسم کے آدمی پیدا ہو جاتے جاتے ہیں ۔

سلہ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ملاحظہ [illegible] صاحب [illegible] دہلی [illegible] غالب [illegible] احوال غالب [illegible]

مجھے خصوصاً اس بات کے یقین ہونے کی خوشی ہے کہ جیسے انگریزی کی تحصیل ہوتی جاتی ہے اس کے ساتھ یہ بھی امر ہے کہ اپنے اپنے ملک کی زبانوں اور علم کی تحصیل کو ترک نہیں کر دیا ہے۔ دہلی کی اردو بولی اب تک جملہ اور بولیوں سے جو ہندوستانِ شمالی میں جا بجا بولی جاتی ہیں نہایت شستہ اور فصیح ہے۔ چنانچہ اس کی شہادت آپ کے مشہور شاعر مرزا نوشہ کے کلام سے جن کو ابھی خلعت دیا گیا ہے ظاہر ہے اور آپ کی انجمن کے مقرر ہونے سے جس کے ممبروں کی درخواست آپ کے روبرو پیش ہوئی ظاہر ہے کہ آپ اپنے ملک کے علم کی تحصیل کی ترغیب دینے کو اور اپنے ملک کی زبانوں میں ممالک مغربی کے علم کو جمع کرنے کی ضرورت اور خوبی کو سمجھتے ہیں۔ میری رائے میں یہ امر ہندوستان کی بہبود آئندہ کے واسطے بہت عظمت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے مجھے ایسی ایسی انجمنوں کی ترقی کا جیسی دہلی اور لاہور میں مقرر ہوئی ہیں اور جیسی علی گڑھ میں آپ کے نامی ہم وطن سید احمد خاں صدر آمین علی گڑھ نے مقرر کی ہے۔ اس جلسے میں شریک ہو کر ہم سب کو ممنون کیا بہت خیال اور شوق رہتا ہے ......"

اس کا حال حوال نواب کلب علی خاں خلد آشیاں والی رامپور کے انتقال دربار کے دوسرے ہی دن غالب نے لکھا لیکن وہ مندرجہ بالا رپورٹ کے اقتباسات سے کہیں کہیں مختلف بھی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسے بھی نتیجہ نکالنے کے لئے نقل کیا جائے۔ لکھتے ہیں:

"پیشِ لفٹنٹ گورنمنٹ کے دربار میں، پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید تین رقمیں بجواہر کی ملتی تھیں بعد غدر اگرچہ پنشن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل ۱۲ بجے دربار تھا حکم سب درباریوں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا خیال نہیں کہ ملاقات ہو گی، ایک رباعی کاغذ مذہب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا کہ احتیاط ہے۔ یہاں آنا کا دیکھا احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر ... بعد ملاقات تعظیم معمولی اور مصافحہ کر کے لارڈ صاحب ... جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا اور فرمایا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔" مالائے مروارید بھی منشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے:

دوشالا ۱، کمخواب کا تھان ۱، بنارسی تھان سنہری بوٹے ۱، بنارسی سیلا ۱، الوان کی چادر کنارہ کلابتون ۱، کنا وین کا تھان ۱، الوان کی چادر سبز کنارہ ۱۔

میں اس عطیے کو آپ کی بخشش معنوی سمجھتا ہوں اور دوسری بخشش یعنی اس خط کے جواب کے جلد حاصل ہونے کا متوقع ہوں..."

(مکاتیب - ۶۴)

اس خط سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ زیر بحث دربار میں شرکت کا علم نہ تو غالب کو تھا اور نہ صاحب کمشنر بہادر وغیرہ کا جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ۱۸۶۳ء میں غالب نے اپنی خلعت کی بحالی کا جو ذکر نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم اور دوسرے احباب سے کیا ہے وہ خوش فہمی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالب نے خلعت کی بحالی کی خبر کسی اپنی مصلحت سے اڑا دی ہو۔ یہیں یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ وہ غدر کے بعد اپنی پنشن اور دربار کے بند ہو جانے پر ان کی پریشانی اور دوبارہ اجرا کے لئے ان کے بحال رہنے کا ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتِ حال اس کے بالکل خلاف ہے اور غدر کے بعد پنشن اور دربار کے دوڑ دھوپ کی مرگذشت تفصیل سے اوپر گزر چکی ہے۔

متذکرہ بالا ۱۸۶۶ء کے دربار کی روداد کے اندراج کے مطابق غالب کو خلعت کا اعزاز کسی خاندانی سربلندی کے پیشِ نظر نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ غالب نے فوجیوں کی تعلیم کے لئے کتابیں تیار کرنے میں حکومت کی جو مدد کی تھی اس کے صلے میں اس اعزاز کے وہ مستحق قرار دئے گئے تھے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ خود غالب نے کہیں ان کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہیں خاندانی اعزاز کے طور پر خلعت زیادہ عزیز تھا اپنے کارناموں اور خدمات علمی کے صلے میں نہیں ورنہ وہ ان لوگوں میں تھے کہ بصورت پسندیدگی کسی نہ کسی پہلو فوجیوں کے لئے کتابوں کی تصنیف اور اس کے صلے میں خلعت پانے کا ذکر ضرور کرتے۔

اس روداد کے مطابق غالب کو نو پارچہ کا خلعت عطا ہوا تھا جب وہ مذکورہ مکتوب بنام کلب علی خاں میں سات پارچہ کا اقرار کرتے ہیں اور اس کی تفصیل بھی دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نو پارچہ کا اندراج روداد میں کاتب کے سہو کا نتیجہ ہے اس لئے کہ اپنے اعزاز میں کمی غالب تو کیا کسی کے لئے بھی خوش آئند بات نہیں ہے۔

ان تمام اطلاعات کی روشنی میں اگر ہم یہ فیصلہ کریں کہ غدر کے بعد پہلی بار ۱۸۶۶ء میں غالبؔ کو خلعت سے نوازا گیا تو غلط نہ ہوگا اس لئے کہ اس کے علاوہ اور کوئی مستند ثبوت اس سے پہلے ہمیں نہیں ملتا نیز غالبؔ کے بیانات سے ہر جگہ اتفاق نہ ممکن ہے اور نہ درست۔

ان حالات میں صاف ظاہر ہے غالبؔ کے ان دعاوی کو بڑی ٹھیس پہنچتی ہے جو "الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا" یا ع ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ۔۔۔ کہہ کر کئے گئے تھے۔

یہاں ہمارا وہ عظیم شاعر جیسے یہ احساس ہے کہ:

غلیم وسلے نوازِ چشمِ محیطم
غریم وسلے روشناس جہانم

اپنے ہی ہاتھوں اپنا شیشۂ خودی پاش پاش کرتا نظر آتا ہے وہ ہر قدم پر اپنی عظمتِ رفتہ کا نوحہ خواں ہے۔ وہ آپ اپنے ناموس کی لاش کا مقبرہ تیار کرتا ہے اور مجاور بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس نے خودی کا ایسا مضبوط حصار اپنے ارد گرد بنا لیا تھا کہ وہ خود بھی اسے توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تو یہ بے حد مشکل تھا۔

جو کچھ بھی ہو غالبؔ اس طرح خود اپنے منکر بن گئے تھے، اس لئے کہ جن بزرگوں سے انہوں نے اپنا رشتہ جوڑا تھا ان سے نسبت کے بعد احساسِ خودداری کو اپنے ہی ہاتھوں مجروح کرنا کسی طرح زیب نہیں دیتا تھا۔ غالبؔ "دوستوں" کے لئے تسلی کا ایک ہی راستہ ہے بقول غالبؔ:

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا!

★

بھول

قتیل شفائی

میں فقیرانہ ترے در پہ چلا آیا تھا
یہ سمجھ کر کہ مرے عہد کی فنکار ہے تو
میں نے سوچا تھا کہ احساس ہے بیدار ترا
مجھ سے بس نقدِ محبت کی طلبگار ہے تو
مجھ کو اس بات کا خود تو نے دلایا تھا یقیں
اپنے ماحول کے دستور سے بیزار ہے تو
مال و زر، جاہ و حشم، کچھ بھی نہیں تیرے لئے
پیار کی راہ میں ایثار ہی ایثار ہے تو

میں نے سوچا تھا تری محفلِ رسوائی میں
دل مرا کاکلِ عصیاں کا اسیر اچھا ہے
اصل میں کچھ بھی نہیں سلسلۂ نام و نسب
وہی اچھا ہے یہاں جس کا ضمیر اچھا ہے

ایک تسکین تو ملتی ہے ہر اک ٹھیس کے ساتھ
تو نے جو مجھ پہ چلایا ہے وہ تیر اچھا ہے
جو کسی کو نہیں حاصل وہ ہے مجھ کو حاصل
بادشاہوں سے کہیں مجھ سا فقیر اچھا ہے

آج لیکن ترے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ
طعنے دیتی ہے مری شانِ فقیرانہ مجھے
بے زری جرم ہے اس محفلِ رسوائی میں
لاکھ سمجھاتے رہے شیشہ و پیمانہ مجھے
کیسے آیا مجھے مستقبلِ زرّیں کا خیال
یاد تھا جب ترے ماضی کا بھی افسانہ مجھے
میں بہر حال ترے پیار کا دم بھرتا ہوں
غور سے دیکھتی ہے جراتِ رندانہ مجھے
آج کچھ ہوش میں آیا ہوں تو میں سوچتا ہوں
اب تو دیوانہ بھی کہہ سکتا ہے دیوانہ مجھے

★

جانشینیٔ غالب کا مسئلہ

یوسف بخاری

ماحقہ تاریک تھا، روایات غیر مستند تھیں، شاہی اقبال اثر انداز تھا، بعض ملکی و غیر ملکی متعصب مؤرخین نے ناجائز تصرف سے کام لیا۔ انفرادی یا اجتماعی نفع و نقصان کی خاطر تحریف کی گئی۔ بظاہر یہ چند نمایاں وجوہات ہیں جن کے نتیجہ میں ہماری تواریخ میں متعدد ایسے واقعات پائے جاتے ہیں جو سر تا پا غلط اور بے بنیاد ہیں۔ مثلاً شاہ علاء الدین خلجی اور پدمنی کا واقعہ، جہانگیر کے متعلق انار کلی اور نور جہاں کے عشق کی حکایتیں۔ ہم تیر کا شاہزادی جہاں آرا کے بارے میں حضرت شاہجہاں پر بہتان، زیب النساء مخفی اور عاقل خاں کا افسانہ، حضرت عالمگیر کی عالمگیر ناانصافی اور ظلم و ستم وغیرہ وغیرہ۔

سیاسی تاریخ سے قطع نظر ہماری ادبی تواریخ میں بھی اس قسم کا غلط مواد موجود ہے حضرت داغ ہی کو لیجئے تمام ادبی تواریخ اور تذکروں میں درج ہے کہ وہ نواب احمد بخش خاں والئی فیروزپور جھرکہ ولوہارو کے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کے فرزند تھے لیکن خاندان لوہارو کے بیشتر مرحوم اور زندہ افراد کا یہ قول ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں مرحوم اولاد نرینہ سے محروم تھے لہٰذا یہ محض غلط ہے کہ ان کے فرزند حضرت داغ تھے وہ حضرت داغ پر بھی حیرت زدہ ہیں کہ وہ کس بنیاد پر اپنے آپ کو فرزند لوہارو کہتے تھے۔

نوابین لوہارو کے پاس اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ اگر یہ فرزندی کوئی امر واقعہ ہوتا تو نواب شمس الدین کی وفات کے بعد فیروزپور جھرکہ کی جائیداد حضرت داغ کے حق میں منتقل ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو قتل فریزر کی پاداش میں پھانسی ہوئی تھی اور ریاست جھرکہ بحق سرکار ضبط ہو گئی تھی تب بھی داغ کا دامن تو بے داغ تھا منجانب سرکار اُن کی بسر اوقات کے لئے کم از کم کوئی وظیفہ ہی مقرر ہوتا جس طرح حضرت بہادر شاہ ظفر کے بعد ان کی اولاد کے لئے سرکار نے وقف قائم کیا تھا۔ دلیل معقول ہے، داغ کا کوئی وظیفہ یا منصب سرکار کی طرف سے مقرر نہ تھا لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ نواب احمد بخش خاں کے عقد میں علاوہ دیگر بیگمات کے مُدّی بیگم عرف بہو خانم نامی میواتن ایک غیر کفو کی عورت تھی اس لئے نوابین لوہارو بپاس حرمت خاندان اپنی اس کمزوری کو مخفی رکھنا چاہتے تھے اور اسی باعث وہ داغ کو خلف شمس الدین تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا غالب اور شمس الدین کے مابین ہمیشہ کشمکش اور مقدمہ بازی رہی لیکن اس کے باوجود مرزا غالب نے نواب شمس الدین کے ناموس کو اپنی نظم و نثر میں کبھی عریاں نہیں کیا اور یہ یقیناً مرزا غالب کے کردار کی ایک اعلیٰ تصویر ہے اور ناقابلِ فراموش۔ البتہ حضرتِ داغ اگر وہ فی الحقیقت فرزند شمس الدین تھے تو ظاہر ہے کہ اس باب میں وہ بچارے قطعاً مجبور اور معذور تھے۔

لیکن اس وقت ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں، اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھئے۔ فی الحال ہمیں یہ تحقیق اور ثابت کرنا ہے کہ مرزا غالب کا جانشین کون تھا؟ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں فرزند نواب احمد بخش خاں یا ان کے بھتیجے نواب علاء الدین احمد خاں تخلص بہ علائی فرزند نواب امین الدین احمد خاں اوّل، یا دونوں، بصورت خلیفۂ اوّل اور خلیفۂ ثانی؟

عام طور پر تمام ادبی تذکروں میں نیر کو خلیفۂ اوّل اور علائی کو خلیفۂ ثانی بتایا گیا ہے، اس کے ثبوت میں غالب کے اُس خط کو اساس بنایا گیا ہے جو ۱۶ اپریل ۱۸۶۱ء کو علائی کے نام لکھا گیا تھا اس خط کا ضروری خلاصہ یہ ہے:-

> "تم کیوں خفا ہوتے ہو، ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے آئے ہیں۔ اگر نیر خلیفۂ اوّل ہے تو تم خلیفۂ ثانی۔ اس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے سو جانشین دونوں مگر ایک اوّل ہے اور ایک ثانی ...... تم سخن ہو گئے جس قدر طبع خداداد رکھتے ہو ...... تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی میرا ممدوح جیتا نہیں ...... نہ صاحب دو ہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

اور اخلاص تھا اور غالب کی نظر میں نیر و علائی دونوں کی ادبی قابلیت کس قدر متوازن تھی لیکن ادبی دنیا میں نیر نے اپنے زمانۂ حیات اور بعد وفات دونوں اوقات میں اپنے علم و قابلیت کی بناء پر علائی سے زیادہ عزت اور شہرت پائی۔ اس ادبی اور تاریخی پس منظر کے پیش نظر فارسی اور اردو کی سند کے حقدار علائی سے زیادہ نیر تھے تو پھر وہ ان کو کیوں نہیں ملی۔

اس سوال کا ایک جامع اور مسکت جواب تو یہ ہے کہ علائی اپنی ذات سے ایک انجمن ہوتے ہوئے بھی ادب کے ایک خاموش اور ٹھوس خدمت گزار تھے۔ انہیں ادبی دنیا کی وقتی و ہنگامی واہ واہ کا کوئی ارمان نہ تھا، نہ داد خواہی کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ دوم یہ کہ قابل باپ نے لائق فرزند کے جوہر قابلیت کا اندازہ لگا کر ۱۸۶۳ء میں کہ محض ولیعہد تھے ریاست کا نظم و نسق ان کے حوالہ کر دیا تھا۔ ان کی یہ مصروفیت و ابتلا ان کے ادبی شوق کے تقاضوں میں ایک مستقل سنگ راہ تھی۔ سوم یہ کہ لوہارو دلی سے کالے کوسوں دور نہ سہی پھر بھی وہ ایک ایسا دور افتادہ مقام تھا کہ دلی کا سفر طے کرنے کے بعد بھی ۵۰ میل کی طویل مسافت کٹھی کٹنی بے آب و گیاہ منزلیں شتر، اسپ، رتھ اور بہلی کے ذریعہ سر کر کے منزل مقصود حاصل ہوتی تھی۔ جب ہی تو غالب جیسا علائی کا عاشق زار جس کو "دم واپسیں بر سر راہ" کی نوبت تک علائی کی دھن لگی ہوئی تھی لیکن سفر آخرت تک لوہارو نہ جا سکا۔ خود علائی کو صرف ایک یا دو بار سے زائد دلی جانا نصیب نہ ہوا۔ ہمارے علم و اطلاع کے مطابق وہ ۵ مئی ۱۸۶۶ء میں مسٹر میکا ہن ڈپٹی کمشنر دہلی کے ایماء پر دلی سوسائٹی کے جلسہ میں شریک ہوئے تھے جہاں انہوں نے اردو زبان پر اپنا تحقیقی مقالہ پڑھا تھا۔ یہ مقالہ اپنی تاریخی معلومات کا ایک خزانہ تھا اور اس وقت بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ (مطبوعہ "ماہ نو" تاریخ ۲۵۹)

الغرض حضرت علائی اپنے کاشانۂ ادب کی خود ہی شمع تھے جو ایک مدت تک حصار لوہارو میں روشن رہی اور جب وقت آیا تو دنیا کی بے ثباتی پر بھڑکی اور ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو خاموش ہو گئی لیکن اس انجمن خاموش میں یہ شمع جب تک خنداں اور گریاں رہی ادب کے پروانے دور دور سے آ کر اس کے گرد جمع ہوتے۔ اس وقت یہ مختصر سا گاؤں لوہارو چند دنوں تک کے لئے دلی، آگرہ، لکھنؤ، رامپور، لاہور اور کلکتے جیسا ادب کا مرکز بن جاتا جہاں شعر و ادب کی محفلیں گرم ہوتیں، علم و ادب کی تحقیق، اصلاح و ترقی کے لئے غور و فکر ہوتا، آنے والے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے علائی کے اس عظیم الشان کتب خانہ سے خوش کام ہوتے جس میں کتب دینیات، طبیعات، فلسفہ، تاریخ، سیر، لغات اور مختلف تذکرہ و دواوین سے لے کر کھٹک کی تا تھئی اور مداری کی شعبدہ بازی کے رسائل تک موجود تھے۔ غالب کے فارسی اور اردو کلام کی دولت بھی اسی امین کے گھر میں پلتے۔ ان ۴۴ بیاضوں کو پڑھتے جو ۱۳ برس کی عمر سے آخر عمر تک نت نئے انداز اور پیرایوں میں لکھی گئی تھیں جن میں ۵۰۰-۶۰۰ کے قریب طلوع و غروب کے دلکش مناظر کے قلمی مرقعے بھی شامل تھے۔

یہ علائی ہی کا شوق تھا کہ "فخر المطابع" کے نام سے لوہارو میں ریاست کا ایک پریس قائم کیا۔ سب سے پہلی کتاب "مثنوی حلوائے ہمایوں" جو ایران کے مشہور شاعر بے بدل خواجہ کرمانی کا ایک دل پسند افسانہ تھا، اسی پریس سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں غیاث الدین اصفہانی کا مشہور اخلاقی شاہکار "دانش نامہ" بھی مخزن سے نکل کر منظر عام پر آیا۔

نواب صاحب نے عربی اور اس کی صرف و نحو مولانا اخوند عزیز سے پڑھی جن کا قائم کردہ مدرسہ محلہ اخوند جی فراش خانہ دلی میں اب تک موجود ہے۔ علم تفسیر، تجوید، قرأت اور حدیث و فقہ کے اسباق مولوی حبیب اللہ نے دئیے۔ منطق و معقولات کا درس مولانا فضل حق خیرآبادی سے لیا۔ انگریزی ایک پادری سے اور سنسکرت ایک پنڈت سے بقدر ضرورت پڑھی۔ علوم متداولہ اور شعر گوئی میں مرزا غالب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ حقیقی کے کلام فارسی اور اردو کی مجموعی تعداد لہ اور شعر [illegible] کسی طرح کم نہیں۔ کلام کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے اور اس میں بھی قصائد، غزل، شہر آشوب، نظم [illegible] شمسی ہے کا عنصر زیادہ ہے۔ سب سے بڑا شاہکار "حدیقۂ عشاق" آب و گل کا قصہ ہے جس کے دو نسخے پہلے "فخر المطابع" میں آخر وقت منتشر و بے چھپا ہوا پڑا رہا۔ مگر کبھی چھپنے کی نوبت نہ آئی۔

خوشی اور حیرت کا مقام ہے کہ یہ شمع جس کی روشنی اپنے ہی کاشانہ میں [illegible] محدود ہو کر رہ گئی تھی پھر بھی اس کی کرنیں بلاد اسلامیہ [illegible] سے گزر کر یورپ تک پہنچیں۔ ۱۸۷۰ء میں جب حکومت ہند نے علائی کو ان کے خاندانی خطابات سے [illegible] کیا [illegible] فرانس کا مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے خطبات تک میں علائی کے ذکر اور خطابات نے نمایاں جگہ پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب خطابات لٹتے اور بکتے نہ تھے بلکہ اٹھتا

تقاضا یہ تھا کہ ہر آدمی کو جب تک وہ صاحبِ علم نہ ہو "صاحب" بھی نہ کہا جائے یا کم سے کم بھی ایک سرکاری خطاب قرار دیا جائے۔

اِن امثالِ تاریخی سے قارئین کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ نیّرِ اصغر بھی آسمانِ ادب پر اسی طرح "درخشاں" تھا جس طرح نیّرِ اعظم۔ اس کی تابانی کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہوگا کہ غالب جیسی شخصیت جو شاذ و نادر ہی کسی کو خاطر میں لاتی تھی تحقیقِ لغات کے وقت صرف علائی سے مشورہ و استفسار کرتی تھی۔ بلاشبہ غالب کی نگاہ دوربین میں نیّر و علائی کی ادبی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا۔ نیّر، غالب کی جان تھے اور علائی ان کی روح۔ غالب کو جان اور روح دونوں پیاری تھیں لیکن شعر و ادب کے معاملہ میں وہ نہایت محتاط، حق پسند، صاف گو اور بیباک تھے۔ اس باب میں وہ کسی دوست کی دوستی اور قرابت دار کی قرابت کو بھی نظر انداز کر جاتے تھے۔ تقریظ نگاری کے نازک مواقع پر وہ اپنی تقریظ کا بیشتر حصہ مصنّف کے باطنی کمالات اور وفاقی محبت و دوستی کے بیان میں صرف کرتے اور آخیر میں اصل کتاب پر دو تین جملے اس طرح لکھ جاتے کہ کتاب کی صحیح صحیح تعریف ہو جائے اور مصنّف بھی خوش ہو جائے۔ لہٰذا روابطِ خاندانی کی رعایت سے اور تقدیمِ زمانی کے لحاظ سے غالب نے نیّر کو صرف ایک بار خلیفۂ اوّل تحریر کر کے ان کا سرِ افتخار بلند کیا اور ان کی دلجوئی کی۔ دوسری جانب بہ اعتبار تقدمِ رتبہ و علم علائی کو خلیفۂ دوم ٹھہرایا۔ لیکن اس تحریر کا درجہ زبانی اظہارِ خیال اور گفتگو سے ہرگز زیادہ نہ تھا۔

اگر اب بھی آپ کے دل میں علائی کے خلیفۂ اوّل و آخر ہونے میں شک و شبہ باقی ہے تو ہم آپ کو ایک دو اور پتے کی باتیں بتاتے ہیں۔ حق وراثت اور مسند نشینی سے کوئی قابل اور ذی ہوش شخصیت خاموشی کے ساتھ دست بردار نہیں ہوتی۔ کوشش کے باوجود اگر کام نہ بنے تو تحریر و تقریر کے ذریعہ احتجاج اور اپنے حق کا اعلان کیا جاتا ہے۔ نیّر جب اپنے حقیقی برادرِ بزرگ، نواب امین الدین خاں اوّل سے اپنے ریاستی و امارتی حقوق کے لئے مقدمہ بازی میں مبتلا ہوئے تو خلافتِ سخن اور مسئلۂ جانشینی کے معاملہ میں وہ بخیالِ خود مستحق ہوتے ہوئے بلا وجہ کیسے کنارہ کش ہو جاتے۔ اگر فی الحقیقت اس قسم کا کوئی تنازعہ چچا اور بھتیجے کے درمیان ہوتا تو نیّر اپنی کثرتِ قربت اور اپنے ذاتی تعلقات سے کام لیکر جو اس وقت ان کو علائی کی بہ نسبت بہ وقت حاصل تھے، اپنے حق کو غالب سے ضرور حاصل کر لیتے۔

ہمارے اس خیال کو اس سے اور بھی تقویت حاصل ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت نیّر نے ٹکسالی اور ننھیالی مغل ہوتے ہوئے ایک مرتبہ اپنی اصل ملکی و قومی نسبت بلاسی و چغتائی کو چھپا کر خاندانی خواجگی کے پردے میں اہلِ سادات ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے آپ کو خواجہ احمد یاسوی کی اولاد سے ظاہر کیا۔ اہلِ سادات ہونے کی اس فرضی اختراع کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ اپنے فرزند نواب احمد سعید خاں طالب کی شادی تحصیل ہوڈل ضلع میرٹھ (یو۔پی) کے ایک امیر سیّد زادہ کی بیٹی سے بیاہنا چاہتے تھے جو ۱۸۴۲ء میں کابل سے جلا وطن کیا گیا تھا۔

جانشینی سے بے نیاز رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بہ اعتبارِ علم و فضل اور شہرت نیّر، نیّرِ زمانہ تھے۔ اس لئے اس باب میں انہوں نے بزعمِ خود خلافتِ غالب سے اپنے آپ کو مستغنی تصور کیا ہو۔ اور عطائے اعزاز کے وقت قیل و قال کو غیر ضروری سمجھا ہو۔ لہٰذا اب تحفظِ حقوق کی آخری تدبیر صرف یہ رہ جاتی ہے کہ غالب اور علائی دونوں کی وفات کے بعد ان کے سامنے میدانِ خلافت بالکل صاف تھا۔ لہٰذا وہ مرزا غالب کے ۱۴ اپریل ۱۸۶۱ء کی تحریری اساس پر اپنے آپ کو غالب کا خلیفۂ اوّل یا کم از کم خلیفۂ آخر مشہور کرتے۔ اس وقت بھی کچھ نہ کیا اور ۱۸۸۵ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

باپ کی وفات کے بعد نواب احمد سعید خاں طالب نے اپنے باپ کے حالات اور تبرکاتِ کلام پر مشتمل ایک مجموعہ "صحیفۂ زریں" کے نام سے شائع کیا تو انہوں نے بھی نیّر کو صرف غالب کا شاگرد عزیز اور پیر طریقت میں ظاہر کیا۔ ان کی خلافت اور جانشینی کا کوئی تذکرہ اور شکوہ زبان پر نہیں لائے۔

ان تاریخی واقعات اور دلائل کی روشنی میں ہم بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ نیّر کی بجائے فارسی اور اردو میں جو سندیں غالب نے علائی کو عطا کیں اور ان کو جانشین ٹھہرایا، علائی فی الحقیقت اس کے مستحق تھے اور غالب کا یہ فیصلہ قرینِ قیاس و عقل اور از روئے انصاف بالکل درست اور صحیح تھا۔ اس دور کے اُدبا اور تلامذۂ غالب نے بھی بحیثیت خلیفۂ غالب، نیّر اور علائی کے ہم عصر تھے، بلکہ ان کے ہم صحبت اور ہم مشرب بھی تھے، بالخصوص حالی، شبلی اور آزاد نے کسی جگہ بھی نیّر کو غالب کا خلیفہ تحریر نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت حالی "یادگارِ غالب" میں رقم طراز ہیں:۔

؂ ناقل ہوتی کی بہت سی مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ جا بجا ہر زمانے میں جو شاعر سربرآوردہ ہوتا ہے اس کا نام لیا ہے۔ باقی صفحہ پر

تائیدِ یک نگاہِ کرم آشنا کے بعد
تقدیرِ انقلابِ محبت کو کیا ہوا
رکھے گا کون "گردنِ مینا پہ خونِ خلق"

تمہیدِ صد ہزار فسانہ کہاں گئی
تہذیبِ ارتقائے زمانہ کہاں گئی
وہ انجمن وہ بزمِ شبانہ کہاں گئی

اک ظلم ہے "شگفتنِ گلہائے ناز و رنگ"
ممنونِ "قرضِ دوست" ہیں بادہ پرستیاں
اک دردِ جانگداز اتر تا خمار ہے
شہ کے "وظیفہ خوار ہوئے" "نوکری" بھی کی

اس فصل میں دماغ تماشا کہاں ہمیں
کیا کیا ہوئی ہے عمرِ سبک تر، گراں ہمیں
ملتی ہجومِ یاس سے کب تک اماں ہمیں
"مارا زمانے نے اسد اللہ خاں" ہمیں

"عشقِ نبرد پیشہ" کی ہمت کو دیکھنا
رسوا ہوا "خیالِ معاشِ جنونِ عشق"
"ہم کیا ہیں" داغِ حسرتِ دل کا "شمار" کیا

ہم نذرِ طفلیٔ غم و آفات ہو گئے
کیونکر کہیں کہ "مست مئے ذات" ہو گئے
ہم تو ہلاکِ خنجرِ حالات ہو گئے

مانگو کسی "مغنیٔ آتش نفس" کی خیر
"تا چند باغبانیٔ صحرا کرے" جنوں
دیکھے کوئی ادائے "ستم ہائے روزگار"
کیونکر کریں مشاہدۂ حق کی گفتگو
"سر پر ہوا ہے وعدۂ صبر آزما" سے کون

نغمہ ہے زندگی نہ ترنم ہے زندگی
کلیوں کا رنگ ہے نہ تبسم ہے زندگی
اک نامراد دل کی طرح گم ہے زندگی
پروردۂ فریبِ تکلم ہے زندگی
صیدِ زبونِ دامِ توہم ہے زندگی

"وارستگی بہانۂ بیگانگی" ہوئی
رکھے نہ مفلسی نے کسی سے معاملات
نقد و نگاہِ شعر کے اثبات کے لئے
دنیا کو جس کی "بات سمجھنا محال" تھا

اک دودِ بے چراغِ شبِ ناؤ نوش ہے
برہم مزاجِ میکدۂ فکر و ہوش ہے
آہنگِ ہر خیال کا آزارِ گوش ہے
یہ تو نہیں کہ وہ سخن آرا خموش ہے

کل بھی "صریرِ خامہ نوائے سروش" تھا
اب بھی "صریرِ خامہ نوائے سروش" ہے

پاتال

صہبا اختر

کتنی راتیں آج اکٹھی ہو کر مجھ پر ٹوٹ پڑیں

خوابوں کے الحمرا جن کی تاریکی میں ڈوب چلے

شعر، کتابیں، تصویریں سب تیز ہوا کے ساتھ گئیں

میرے صنم خانے سے اٹھ کر میرے سب محبوب چلے

موگھو قبیلے کی وہ لڑکی زین کی جو تصویر بنی

وہ پرمیلا جس نے نذرل کو گیتوں کے چنگ دیے

یا وہ ہیر کہ جس نے وارث سے لکھوائی ہیر نئی

یا وہ مغل شہزادی جس نے چغتائی کو رنگ دیے

کب ایسے پاتال مری آنکھوں نے پہلے دیکھے تھے

میں تو ابتک صرف اُجالوں کی شبنم سے کھیلا ہوں

مجھ سے میرے فن کی جوالا چھین رہی ہے یہ تاریکی

کوئی آئے کوئی بچائے رات ہے اور اکیلا ہوں

دشتِ بیوفائی میں

سید رضی ترمذی

تم یہاں مارے مارے پھرو، ہم چلے
تم یہاں یاد کی ایک دہلیز پہ بیٹھ کر سونی راہوں کو تکتے رہو، ہم چلے
سونی راہوں کو تکتے رہو، اور کہو:
"دور، اُڑتی ہوئی گرد کے قافلوں سے اُدھر
اک سبک گام محمل،
مری آرزو کی حسیں رہگذر میں چلا آرہا ہے —"
تمہیں کیا خبر
یہ جو معبد کی دہلیز کے ساتھ اڑتے ہوئے خشک پتے ہیں
کتنے شکستہ دلوں کے فسانے سناتے ہیں
جو چاندنی رات میں
پیاسی شبنموں کے لئے آنسوؤں کے خزانے لٹاتے رہے
اور جب صبح کی سب سے پہلی کرن ایک آہٹ بنی
اُن کے خوابوں کے سب روپ
گیتوں کے سب پھول
بیجان لفظوں کا اک ڈھیر تھے
پیکرِ نازبن کر کھڑی مورتی اُن کی حیرت پہ اک قہقہہ بن کے گم ہو گئی،

تم یہاں مارے مارے پھرو، ہم چلے
ہم تو یہ جانتے ہیں — یہاں
پتھروں کی سلوں میں دھڑکتی ہوئی آبجو
ریت ہی ریت ہے
اور ان بستیوں میں
یہ اُڑتی ہوئی گرد کے قافلے ہی ازل سے ابد کو رواں ہیں،

★

یوم مسلح افواج

اس سال ۱۰ جنوری کو سارے پاکستان میں یوم مسلح افواج بڑے جوش کے ساتھ منایا گیا اور اسی تاریخ کو ہر سال منایا جائیگا۔ اس دن کی اہمیت واضح ہے اس دن ہم اپنی ملک کے پاسبانوں کی سرگرمیوں مشاغل ان کے ساز و سامان اور تربیت و رزم کے مدارج سے براہ راست واقفیت حاصل کر سکتے ہیں اس صفحہ کی تصویریں کراچی کی جشن تقریبات سے متعلق ہیں۔

: ۱

یوم مسلح افواج کے یادگاری ٹکٹ : (ڈیزائن : محمد حنیف قریش

: ۲

: ۴

۱ : پاکستانی بحریہ کا بینڈ (فریئر ہال کراچی)

۲ : عوام دن بھر پاکستانی بحریہ کے جہازوں کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔

۳ : فضائیہ پاکستان کے جہازوں کو دیکھنے کے لئے عوام کا ہجوم (ماری پور)

۴ : طیاروں کے ماڈل بنانے کا مظاہرہ۔

: ۳

۱:

حمیدالرحمان

مشرقی پاکستان کا ایک مصور

(ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۵۵)

۱: نقاش اپنے اسٹوڈیو میں (ڈھاکہ)

۲: کسان (ایک تصویر)

۳: ایک درخت (سیاہ و سفید)

۲:

۳:

ہو جاتی ہے، ان کے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا ۔۔۔ "علوی بھائی چلئے" اس نے پیالی میز پر رکھ دی ۔

"ارے واہ ۔۔۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے ۔۔۔ "عالیہ بٹو، تم بھی میرے ساتھ پیو؟"

"نہیں! مسز ہاورڈ کے ساتھ پیونگی"۔

وہ باہر آ گئی۔ مسز ہاورڈ مزے لے لے کر شامی کباب کھا رہی تھیں اور مرچیں آنسو بن کر ٹپک رہی تھیں۔

"آپ کا لڑکی بڑا ہوشیار ہے، خوب پڑھتا ہے" یہ مسز ہاورڈ نے اس کی تعریف کی تو وہ شرما گئی۔

"جی ہاں، ہماری لڑکی بہت ہوشیار ہے، ویسے یہاں کی لڑکیاں بڑی کوڑھ مغز ہوتی ہیں، پڑھنے کے نام سے بھاگتی ہیں"۔ ہندوستانی لوگ اپنی لڑکیوں کو جاہل رکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اماں پھر ترنگ میں آگئی تھیں۔

"کوڑھ مغز؟" مسز ہاورڈ نے سمجھنا چاہا۔

"لیس ہوتی ہیں"۔

"اور آپ کی اس لڑکی نے کتنا پڑھا؟" مسز ہاورڈ نے ہنس کر پوچھا۔

"دس درجے، پھر یہ بیمار پڑ گئی" اماں نے کہا۔

آپا اس پورے وقت کو خاموشی سے گزارتی رہیں۔ انہوں نے مسز ہاورڈ سے ایک بات بھی تو نہ کی۔

شام ستولا چکی تھی۔ بسیرا لینے والے پرندوں کی قطاریں جانے کس سمت اڑی جا رہی تھیں۔ مسز ہاورڈ ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔

"آپ کا صاحب نہیں آیا، ہمارے کو اس سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ کہیں چلا گیا ہوگا دفتر کے کام کو؟"

"جی ہاں، جی ہاں آج ان کے ایک دوست مر گئے تھے اس لئے ان کے گھر گئے ہوں گے"۔

اماں اس سے بڑا اور کیا بہانہ کر سکتی تھیں۔ ایک انگریز عورت کے ساتھ چائے نہ پی سکنے کی کوئی بڑی وجہ ہی ہو سکتی تھی۔

مسز ہاورڈ کے جاتے ہی اماں جیسے جھنجھلا اٹھیں۔

"دیکھا، چائے پر نہیں آئے نا، وہ تو کہو مجھے اچھا بہانہ یاد آ گیا ورنہ کیا سمجھتیں مسز ہاورڈ، دیکھ لینا یہ اپنی نفرت کے

بیچھے کچھ کر کے رہیں گے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ انگریز سے زیادہ اچھا حکمراں کون ہوگا۔ اپنے لوگ تو ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہیں، اے کون سمجھائے اس شخص کو؟"

"کوئی کام لگ گیا ہوگا" آپا نے ابا کی صفائی پیش کی۔

"کام؟ ۔۔۔" اماں بپھر اٹھیں ۔۔۔ "کوئی کام نہیں ہوگا۔ ارے وہ شخص ۔۔۔"

اماں جانے اور کیا کچھ کہتی رہیں ۔۔۔ وہ جلدی سے علوی بھائی کے پاس چلی گئی۔ چائے کی پیالی اسی طرح میز پر رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ علوی بھائی لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں عجیب سے لگ رہے تھے۔

"علوی بھائی آپ نے چائے نہیں پی"

"ارے تو کیا میں نے نہیں پی" وہ پیالی اٹھا کر پانی کی طرح پی گئے۔

"میں نہیں بولتی آپ سے، اب پی ہے تو کیا؟" وہ کمرے سے نکل رہی تھی، تو علوی بھائی پکار رہے تھے مگر اس نے جواب تک نہ دیا۔

جب کافی اندھیرا ہو گیا تو خانسامن نے میز کرسیاں ہٹا کر پلنگ بچھا دئے۔ خانسامن تھکن سے چور ہو رہی تھیں اور افیون کے نشے سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ان کے ہر مرض کا علاج صرف افیون سے ہوتا تھا۔ ننھی سی کالی گولی نگلتے ہی وہ سارا دن کی دوڑ دھوپ بھول جاتیں، تھکن غائب ہو جاتی اور وہ ملکہ جیسی شان سے سو جاتیں۔

خانسامن بستر لگا کر باورچی خانے میں گئیں تو ابا آ گئے۔ اماں انھیں دیکھتے ہی بگڑ گئیں۔

"اب آنے میں خانصاحب، کیا وہ نہ سمجھتی ہوں گی کہ آپ کو ان کا آنا برا لگا ہے، وہ انگریز ہو کر ہمارے گھر تشریف لائیں اور صاحب بہادر پروا بھی نہ کریں۔ اگر وہ رپورٹ کر دے کہ جناب نے میرے ساتھ بدسلوکی کی ہے تو پھر ہوش ٹھیک ہو جائیں گے" اماں نے اتنے زور سے پاندان بند کیا کہ خانسامن گھبرا کر باورچی خانے سے بھاگ نکلی۔

"اب وہ زمانے لد گئے جب تمہارے انگریز کی ناک سے تھرتھری چڑھتی تھی، یہ ہندوستان آزاد ہے ملک ہے کوئی [illegible] تو کیا

نفرت کبھی نہیں کرسکتا۔ — ابا نے سختی سے کہا — "یہ بدنیت تاجر، یہ حکمراں کیا مجھے تو ان کی ساری قوم سے نفرت ہے۔ اگر میرا دماغ بڑے بھائی جیسا ہوتا تو پھر دیکھتا، مگر میں تو بندھا ہوا ہوں نوکری کرنے پر مجبور ہوں۔"

"ہوں! وہ تو میں جانتی ہوں کہ تم ہر وقت سب کو بھوکا مارنے پر تلے ہوئے ہو۔"

"یہی تو وجہ ہے کہ نوکری کر رہا ہوں ورنہ میں تو بڑے بھائی کی طرح دکان کھول کے بیٹھ جاتا مگر تم تو سب کچھ اپنے بھائی کے پاس رکھ آئیں، وہ بڑا دیانت دار آدمی ہے، اس کی بیوی انگریز ہے۔"

"میں نے دس دفعہ کہا کہ میرے بھائی بھاوج کا نام مت لیا کرو۔" اماں ایک دم سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔

آپا بڑی خاموشی سے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میلی ملگجی چاندنی میں ان کے آنسو کتنے دردناک معلوم ہو رہے تھے۔

"سب رو، سب لڑو، وہ گھر سے بھاگ جائے گی" — اس نے بڑے بوڑھوں کی طرح سوچا تھا۔ لڑائی اور آنسو اس کی روح میں لرز رہے تھے۔

وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹ گئی تھی اور زور زور سے سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"دیکھو بیگم، ان بچوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے، یہ سب تباہ ہو جائیں گے اور —"

ابا کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اماں نے آنسو پونچھ لئے۔

"خانساماں کھانا لے آؤ، عالیہ نہ سو جائے۔" اماں نے آواز دی۔

"میں نہیں کھاؤں گی۔" وہ زور سے چیخی اور پھر رونے لگی۔

کھانا آیا تو اس نے ابا کے نرم نرم ہتھیلیوں والے ہاتھ اپنی پیشانی پر محسوس کئے مگر وہ سوتی بن گئی۔ وہ تو اس دن اعلانیہ سب سے روٹھ گئی تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے، گھر کی فضا دھوپ چھاؤں کی طرح بدلتی رہتی۔ ابا کی شامیں بیٹھک میں گزرتیں، دوستوں کے جمگھٹ میں وہ زور زور سے باتیں کرتے۔ خانساماں چائے بنا بنا کر باہر لے جاتے ہوئے جھکے جھکے بڑبڑاتی رہتیں اور اماں جیسے بڑے اضطراب کے ساتھ

ادھر ادھر پھرتی رہتیں یا کسی کئے ہوئے کام کو پھر سے کرنے لگتیں۔ آپا بدستور خاموش رہتیں اور کسی کتاب کے ایک ہی صفحے کو پڑھے چلی جاتیں۔

خدا جانے آپا اتنا کم کیوں بولتی تھیں۔ کیا محبت لوگوں کو گونگا بنا دیتی ہے؟ کیا محبت کا نام الفاظ کی موت ہوتا ہے؟ پھر لوگ اتنی گھٹیا چیز کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟ آپا تم کتنی معصوم تھیں۔

گھر کے اسی دردناک ماحول سے گھبرا کر وہ بیٹھک کے دروازے پر جا کھڑی ہوتی۔ نہرو جناح گاندھی وغیرہ کے سنے ہوئے ناموں کے علاوہ اس کی سمجھ میں صرف اتنا ہی آتا کہ سب انگریزوں کی برائی کر رہے ہیں۔ اسے کوئی بھی مزے کی بات نہ سنائی دیتی۔ اس پر ابا اسے دیکھتے ہی اندر جانے کا حکم دیتے۔ علوی بھائی اس کے آنکھوں آنکھوں میں کئے ہوئے اشارے سمجھنے سے انکار کر دیتے۔ وہ بھی تو شام کے وقت بیٹھک سے اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔

وہ رنجیدہ ہو کر باہر چبوترے پر جا بیٹھتی اور اسے اپنی پہلی جگہ یاد آنے لگتی۔ کتنی دور رہ گئی تھی وہ جگہ، وہاں سے آتے ہوئے ٹرین کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس نے اتنے درخت گنے تھے کہ سارے حساب نے دم توڑ دیا تھا۔

جیٹھ کا مہینہ تھا۔ سارا دن لو چلتی رہتی، آموں اور پیپل کے درختوں میں چھپے ہوئے پرندے سارا دن شور مچاتے رہتے۔ صحن میں لگا ہوا مہندی کا چھوٹا سا درخت سوکھ چلا تھا۔ خانساماں لاکھ پانی ڈالتیں مگر اس کی پتیوں پر رونق نہ آتی۔ چاندنی راتوں میں ٹھاکر صاحب کے گھر سے کسم دیدی کے ہارمونیم بجانے کی آواز آتی تو آپا اٹھ کر ٹہلنے لگتیں۔ کسم دیدی ان دنوں ایک ہی گیت گائے جاتیں۔

اماں ابا کے انتظار سے تھک کر آپا سے باتیں شروع کر دیتیں، وہی علوی خاندان سے دشمنی کی داستانیں، نجمہ پھوپی کی خود غرضی کے قصے، بھائی اور بھاوج کے محبت بھرے گیت۔ آپا پلکیں جھپکا جھپکا کر سب کچھ سنتیں مگر خود کچھ نہ کہتیں۔ ابا کی بیٹھک جب سونی ہوتی تو وہ کسی دوست کے گھر چلے جاتے اور دس گیارہ سے پہلے واپس نہ آتے۔

رات سونے سے پہلے وہ علوی بھائی کے پاس چلی جاتی۔ باہر چبوترے پر ان کا پلنگ بچھا ہوتا جہاں وہ خاموش پڑے کچھ سوچتے رہتے۔

"علوی بھائی کہانی سنائیے۔" وہ جاتے ہی فرمائش کرتی اور

ان کی کمر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔ علوی بھائی اپنے بچپن میں سنی ہوئی کہانیاں یاد کرنے لگتے اور جب کہانی یاد آجاتی زور سے ہنسنے لگتے۔ وہ ہمیشہ ایک شہزادی اور ایک غریب آدمی سے کہانی شروع کرتے تھے۔ غریب آدمی شہزادی کو نہ پاسکنے کے غم میں مر جاتا تھا۔

"علوی بھائی آپ تو کسی شہزادی سے شادی نہیں کریں گے؟"

ایک بار اس نے بڑی فکر سے پوچھا تھا۔

"لاحول ولا، میں کیوں مروں گا بھئی" وہ اس قدر ہنسے تھے کہ وہ جھینپ کر رہ گئی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ وہ خوش تھی کہ اسکول کھلنے کے دن قریب آرہے ہیں۔ جتنا وقت اسکول میں گزرتا وہ خوش رہتی اور ساری دنیا کو بھول جاتی۔

اس دن دوپہر میں جب وہ سو رہی تھی تو اماں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز نے اسے جگا دیا تھا۔ ابا کی آواز مدھم مگر جھلائی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر دالان میں آگئی جہاں آپا پہلے سے کھڑی تھیں۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر بات کیا ہے۔

ذرا دیر بعد باہر سے شفاء کر صاحب کی آواز آئی اور ابا باہر چلے گئے، آپا ابا کے باہر جانے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اس گھر میں علوی دولہا بنکر اسی وقت آئے گا جب میری لاش نکل جائے گی" ابا نے جاتے جاتے اماں کی بات ایک لمحے کو رک کر سُنی اور پھر چلے گئے۔

ابا جیسے ہی بیٹھک میں گئے اماں نے آکر آپا کو لپٹا لیا۔

"دیکھ لینا میں زہر کھالوں گی جو تم کو اس کمینے علوی کے ساتھ بیاہنے کی سوچ رہے ہیں، ہائے ان کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، یہ اس شخص سے شادی کریں گے جس کے باپ دادا نے خاندانی عزت لوٹ لی، میرا راج پاٹ چھین لیا" ــــ اماں روتے روتے پلنگ پر بیٹھ گئیں ــــ "اب اس کمینے کو پاس کرنے کے لئے علیگڑھ بھیج رہے ہیں، میں آج ہی تمہارے ماموں کو خط لکھوں گی، پھر دیکھوں گی کہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے"

وہ ڈر گئی کہ ماموں میاں جانے کیا کریں گے، مگر پھر یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی کہ اماں تو ہمیشہ ہی ماموں میاں کو خط لکھا کرتی ہیں مگر وہ دو تین مہینے بعد ہی جواب دیتے ہیں۔

"تمہاری دادی بے شرم تھیں جو علوی کے باپ کو دولہا بنا کر اب تک زندہ بیٹھی ہیں، میں تو اسی وقت زہر کھالوں گی"

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، کچھ بھی نہ ہوگا" آپا جیسے کنوئیں کی تہ سے بولیں، ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

اے ہمارے آسمانی باپ تو ہمارے گھر سے لڑائیاں ختم کرادے! علوی بھائی کے کمرے میں جاتے ہوئے وہ چپکے چپکے دعا کر رہی تھی جس مِس کی یاد کرائی ہوئی یہ دعا اسے بہت سے دکھوں سے نجات دلا دیتی تھی۔

کمرے میں جاکر دیکھا کہ وہاں تو علوی بھائی بھی رو رہے تھے۔ کچھ نہیں کرتا یہ آسمانی باپ بھی، وہ آسمانی باپ سے بھی روٹھ گئی تھی اور روتے ہوئے علوی بھائی سے لپٹ گئی۔

"سب رو رہے ہیں۔ اللہ کرے میں مر جاؤں" وہ بہت سنجیدہ ہو رہی تھی۔

"ارے میں تو علیگڑھ جا رہا ہوں نا، اس لئے رو رہا ہوں۔ مجھے اپنی عالیہ بٹیا یاد آئے گی" انہوں نے ہنستے ہوئے آنسو پوچھ لئے۔ تم دس گیارہ سال کی ہو کر کتنی بڑی ہو گئی ہو" انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے معلوم ہے سب جھوٹ بول رہے ہیں"

علوی بھائی صرف ایک ہفتے بعد علیگڑھ جا رہے تھے۔

ایک ہفتہ ماہ پوس کے سورج کی طرح جلدی جلدی ڈوبا جا رہا تھا اور وہ بیتے ہوئے دنوں کو انگلیوں پر گنتی رہ جاتی۔ وہ کتنی رنجیدہ رہنے لگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ابا کے بعد صرف علوی بھائی اس کا خیال کرتے ہیں۔ آپا خاموشی سے محبت کرتی ہیں، مگر علوی بھائی تو اس کے ساتھی ہیں جن سے وہ کھیلتی ہے کہانیاں سنتی ہے۔ وہ چلے جائیں گے تو پھر وہ کیا کرے گی؟

علوی بھائی نے یہ دن اپنے کمرے میں بند ہو کر گزار دئے۔ ان دنوں آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ بھیگی بھیگی ہوائیں چلتی رہتیں۔

اماں نے علوی بھائی کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ آپا نے اماں سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ دس گیارہ بجے رات تک انگریز دشمنی کے زبانی اظہار میں مصروف رہتے۔ آپا کا مطالعہ بہت ترقی کر گیا تھا، جو کچھ پڑھتیں، اسے حفظ کرنے لگی تھیں۔ گھنٹوں گزر جاتے مگر صفحہ الٹنے کی نوبت نہ آتی۔

وہ گھر کے ماحول سے گھبرا کر باہر چھوترے پر جا بیٹھتی جہاں

چپراسی بیٹھا گڑگڑی پیا کرتا۔ وہ چپراسی سے باتیں کرنے لگتی۔

"تم اپنی بیوی کو کیوں مارتے ہو ابا؟" شاید ہی کوئی دن جاتا جب وہ اپنی بھولی بھالی جاپانی سی گڑیا کو نہ پیٹتا ہو۔ کئی دفعہ تو اس کا جی چاہا تھا کہ چپراسی کو اتنا مارے کہ بس مر کر رہ جائے مگر اماں کا حکم تھا کہ کمینوں کے معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔

"بیٹا انی جب تک عورت کو مارو نہیں وہ سیدھی نہیں رہتی۔" وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا۔

"تمہارے ابا تمہاری اماں کو بھی مارتے ہوں گے۔" جب وہ پوچھتی تو وہ ذرا دیر کو چپ رہ جاتا۔

"ہاتھ پاؤں نہ توڑ دیتا اس کے۔"

"ارے تو کیا تمہاری اماں عورت نہیں تھی؟"

"وہ تو اماں تھی۔"

"تمہاری کتنی تنخواہ ہے؟"

"پندرہ روپے۔"

"تم نے اپنا گھر اینٹوں کا کیوں نہیں بنایا؟"

"ہم غریب جو ہیں بٹیا، پکا گھر بنا کر بابو لوگوں کی برابری تھوڑی کر سکتے ہیں۔"

اسے ایک دم علوی بھائی کے ابا یاد آ جاتے جو جیتے جی کسی سے عزت نہ کرا سکے۔ اسے وہ ساری کہانی یاد آنے لگتی جو اماں نے کتنی بار آپا کو سنائی تھی۔ اس کا کلیجہ دکھتا تو وہ اٹھ کر علوی بھائی کے پاس چلی جاتی مگر وہ تو ان دنوں بات کرنا بھول گئے تھے۔

دوسرے دن صبح علوی بھائی علیگڑھ جا رہے تھے۔ ان کا سامان بندھا رکھا تھا۔ کمرہ بالکل اجاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ اماں اس دن بڑی بیتابی سے سارے گھر میں ٹہلتی رہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر خانساماں کو ڈانٹتیں اور آپ ہی آپ بڑبڑاتی رہیں۔

"گھر سے نکالنے کے بجائے اسے پڑھنے کو بھیجا جا رہا ہے، اس مردود کو ہماری دولت سے پڑھا کر، ہمارے سر پر بٹھانا چاہتے ہیں، اللہ اسے واپسی نصیب نہ کرے!

شام کو آپا علوی بھائی کے کمرے میں گئیں اور بڑی دیر بعد باہر نکلے، پھر بیٹھک میں چلے گئے۔ اتنی دیر اماں تلملائی تلملائی پھرتی رہیں۔

وہ رات بڑی اندھیری تھی۔ آندھی بارش کے آثار تھے۔ اس رات دالان میں بستر لگائے گئے تھے۔ کھانے کے بعد سب لوگ لیٹ گئے۔ بڑے طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کی بتی نیچی کر دی گئی۔

سونے سے پہلے اس نے بڑے انہماک سے دعا کی تھی کہ آسمانی باپ علوی بھائی کو روک لے۔ صبح کبھی بھی نہ ہو۔ اس دعا کے بعد وہ سو گئی تھی۔

صبح کے خوف نے ایک بار اس کی آنکھ کھول دی تھی۔ اس نے دیکھا کہ آپا علوی بھائی کے کمرے کی طرف سے دبے قدموں آ رہی ہیں۔ پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ اس نے ان کی دھیمی سی سسکی کی آواز سنی تھی اور پھر سو گئی۔

علوی بھائی صبح تانگے پر بیٹھ کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے وہ اماں کے پاس آئے تھے۔ ذرا دیر کھڑے رہے مگر جب اماں نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں تو خانساماں کی دعائیں لیتے چلے گئے۔

وہ دروازے تک ان کے ساتھ گئی مگر جب تانگہ کچی سڑک پر دھول اڑاتا چل دیا تو وہ ابا کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ ابا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ اور وہ سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے ورنہ ابا کو فرصت ہی کب ملتی جو کسی سے محبت کا اظہار کرتے۔ انگریز دشمنی نے ساری محبتوں کو کھا لیا تھا۔

دوپہر کسیم ڈیڈی آ گئیں جو چپکے چپکے آپا سے باتیں کرتی رہیں۔ شام کو چائے کے بعد ابا نے اماں سے پورے ہفتے کے بعد بات کی تھی۔

"جب وہ بی اے کر لے گا تو وہ کام ضرور ہو گا۔" سمجھ گئیں۔

"ہم بھی دیکھیں گے۔" اماں کی آواز میں چیلنج تھا۔

★

بنگلا افسانہ:

دھوپ چھاؤں

ابوالکلام شمس الدین

ترجمہ: احمد سعدی

ایک روز وہ اچانک وہاں آگیا تھا۔

سردی کی رات تھی اور باورچی خانہ کے سامنے آنگن میں الاؤ جل رہا تھا اور وہ سب الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے۔ قاسم خاں اس کی ماں، بہن اور دو کسانوں نے تھوڑی دیر قبل ہی رات کا کھانا ختم کیا تھا اور اس کے بعد سب الاؤ کے پاس بیٹھ کر آگ سے اپنے اپنے ہاتھ پاؤں سینک رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت یکایک انہیں کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

تھوڑی دیر پہلے کچہری کے مکان کے قریب کتے بھونکتے رہے، ان کے چپ ہو جانے کے بعد رات کا سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا تھا، اس عمارت کے چاروں کونوں میں چار مکان بنے ہوئے تھے، مگر دوسرے اور تیسرے مکان میں رہنے والے سو چکے تھے اس لئے یکایک کسی کی کھانسی کی آواز سن کر سبھی چونک اٹھے؛ تب قاسم خاں کی پندرہ سالہ بہن اپنی ماں کے قریب کھسک کر بیٹھ گئی۔

"کون ہے"؟

پچیس سالہ قاسم خاں مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا اس کی آواز بھی کافی کرخت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے دوبارہ اپنا سوال دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بانس کے گھیرے کے اس پار سے کسی نے نحیف آواز میں جواب دیا "میں ہوں"!

یہ آواز کسی کی بھی پہچانی ہوئی نہیں تھی۔ قاسم خاں سبھوں کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ماں اور بہن کو گھر کے اندر جانے کا حکم دے کر کہا "اس طرف آیئے تو دیکھوں"۔

گھیرے کے پیچھے کا دروازہ دھکیل کر انیس بیس برس کا ایک سیاہ فام نوجوان اندر آکر کھڑا ہو گیا۔ مرجھایا ہوا چہرہ ایک لاٹھی میں بندھی ہوئی گٹھڑی اس کی پشت پر جھول رہی تھی اور آنکھوں سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی، بائیں ہاتھ سے لاٹھی پکڑ کر اس نے دایاں ہاتھ بند کیا اور سہمی ہوئی آواز میں کہا "السلام علیکم"

سلام کا جواب دیتے ہوئے قاسم خاں نے ایک مونڈھا اس کی طرف بڑھا دیا "آپ کو میں نے نہیں پہچانا"!

وہ مونڈھے پر نہیں بیٹھا۔ اس نے پتوں کی ڈھیری سے تھوڑے سے پتے اٹھا کر الاؤ کے قریب بچھا دئے اور انہی پر بیٹھ گیا۔

"میں پردیسی آدمی ہوں، میرا مکان ٹرکا بندر میں ہے، آپ مجھے کیسے پہچانیں گے"؟ اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے سب کی طرف دیکھ کر کہا "بندر رحیم کی سمت پریسیڈنٹ کے مکان کے قریب ہی میرا مکان ہے۔ میرے والد کا نام اصغر علی ہے، چار پانچ سال پہلے ان کا اس طرف آنا جانا تھا، شاید آپ انہیں پہچانتے ہوں"؟

کون اصغر علی جو تالتلا میں احمد شریف کے یہاں کام کرتے تھے"؟ قاسم خاں کے کھیتوں میں ہل جوتنے والے کاشتکار نے پوچھا۔

"ہاں، لیکن ان کا مکان کس طرف ہے، یہ مجھے معلوم نہیں اس سے پہلے میں کبھی اس طرف آیا بھی تو نہیں تھا"؟

"چار پانچ سال سے تو انہیں اس طرف دیکھا ہی نہیں، آپ کے والد سے میری بڑی جان پہچان تھی"؟ تمباکو سجاتے ہوئے اس کاشتکار نے بڑی محبت اور یگانگت کے لہجہ میں نوجوان سے کہا۔ "انہیں آپ کیسے دیکھیں گے جبکہ وہ اس دنیا میں ہیں ہی نہیں"؟ نوجوان نے غمگین مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"نہیں ہیں"؟

"نہیں یہاں سے جو نجانے کر گئے تھے، اسی سے ....."

"لو، تمباکو پیجئے"

"نہیں، نہیں۔ پہلے آپ پیجئے" نوجوان نے لجاجت بھرے انداز سے حقہ قاسم خاں کی طرف بڑھا دیا۔

"قاسم خاں نے دو کش لے کر کہا" جانے دو، اب بیتی باتوں کو یاد

کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ بتاؤ اس طرف کس کام سے آئے تھے۔ کوئی عزیز یا رشتہ دار۔"

"نہیں جی نہیں۔ میرا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں۔ گھر میں صرف ایک بوڑھی والدہ ہے۔ اس طرف کسی کام دام کی تلاش میں آیا ہوں۔ پورا مہینہ ہے۔ اگر کسی کے ہاں کوئی نوکری مل جاتی"۔ اتنا کہہ کر اس نے چکپاتے ہوئے قاسم خاں کے ہاتھ سے حقہ لے لیا۔

وہ سیاہ فام ہوتے ہوئے بھی قبول صورت تھا اور اس کے بات کرنے کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔ باتیں کرتے وقت مسکرانا اس کی عادت تھی۔ اس نے حقہ پیتے ہوئے کہا: "میں نے سوچا تھا، آبائی پیشہ اختیار نہیں کروں گا۔ تین بیگھے کھیت ہے، اسی میں دونوں آدمی کسی طرح اپنا پیٹ بھر لیں گے، لیکن میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا اور آج مجھے بھات کی تلاش میں گھر سے باہر نکلنا ہی پڑا۔ میں شام ہی کے وقت مل چھنیا پہنچ گیا تھا، وہاں سے تالتلہ گاؤں کا نام پوچھتے پوچھتے اپنی راہ چلتا ہوا جب ایک دیہاتی بازار میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ گاؤں پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ وہاں ایک دکاندار کی زبانی آپ کا نام سن کر یہاں چلا آیا ہوں۔ اگر آپ مجھے رات بھر ٹھہرنے کی جگہ دے سکیں تو ......"

قاسم خاں نے کہا "ٹھیک ہے، ہاتھ پاؤں دھو کر آنگن میں آ کر بیٹھو۔ اسحاق تم انہیں تالاب دکھا دو۔ میں کھانے کا انتظام کرتا ہوں، رات بہت زیادہ ہو چکی ہے"۔

اس گاؤں میں قاسم خاں سب سے بڑا گرہست تھا۔ اس کا خاندان کل تین افراد پر مشتمل تھا، لیکن اس کی آمدنی بہت تھی۔ صرف گاؤں میں ہی اس کی پچاس بیگھہ کاشتکاری تھی۔ جنوبی میدانی علاقہ میں بھی ایک بہت بڑا پاٹ تھا جس میں دھان کی بہت عمدہ فصل ہوتی تھی۔ گاؤں کے کھیتوں کو کارندوں کے تعاون سے وہ خود کاشت کرتا تھا اور میدانی علاقہ کی زمین کارندوں کو بٹائی پر دے دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ناریل اور سپاری کے چار پانچ باغ تھے۔ ان کے پھل چوری ہو جاتے تھے، ورنہ یہ باغات بھی معقول آمدنی کا ذریعہ تھے۔ بٹائی کے کھیتوں کے علاوہ خود کاشت زمین میں وہ دو کارندوں کے تعاون سے کھیتی کرتا تھا، لیکن ان میں سے ایک ان باغوں کی رکھوالی کرتا تھا، مگر وہ تنہا اس کام کو اچھی طرح انجام نہ دے سکتا تھا، اس لئے اس نے صادق کو

بھی اپنے یہاں ملازم رکھ لیا اور کھانے کپڑے کے علاوہ دس بوجھ دھان کے عوض وہ بھی قاسم خاں کے یہاں کارندہ کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

کھیت کا تمام دھان آہستہ آہستہ کاٹ کر آنگن میں ڈھیر کر دیا گیا رات رات بھر دوائی ہونے لگی۔ دونوں کارندوں کے ساتھ قاسم خاں خود بھی کام کرتا رہتا اور صادق لطیفے اور مزے دار کہانیاں سناتا رہتا۔ دوسری طرف برآمدے پر تھالی میں پان لئے ہوئے قاسم کی ماں اور بہن، رابعہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ رات بڑھتی رہتی، کام کاج ہوتا رہتا اور جب کہانی ختم ہو جاتی تو رابعہ صادق کے ہاتھ میں پان دیتے ہوئے التجا آمیز لہجہ میں کہتی "کوئی دوسری بڑی سی کہانی سناؤ صادق بھائی"۔

اور صادق پان چبا کر پیک تھوکتے ہوئے بڑے پُر جوش انداز میں کسی شہزادی کی کہانی سنانے لگتا، ایک شہزادی تھی، ڈاکوؤں نے اسے اغوا کر کے سمندر کے نیچے قید کر رکھا تھا۔ جب وہ روتی تو اس کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو موتی بن جاتے۔ ایک شہزادے کو جب اس شہزادی کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنی فوج لے کر اسے قید سے چھڑانے کے لئے چل پڑا۔

کہانی یہیں تک پہنچی کہ ستارے ڈوبنے لگتے اور رابعہ گہری نیند میں بے خبر ہو جاتی، کوئی آنگن میں کھانا بھی تو وہ خراٹے لیتی رہتی اور پھر سبھی لوگ بیلوں کو گویال میں باندھ کر اپنا کام ختم کر دیتے۔

جاڑے کا موسم بیت گیا۔ صادق ناریل کے باغ میں پہرہ دینے لگا۔ وہ باغ میں بنے ہوئے مکان کے پاس ناریل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بانسری بجاتا رہتا اور دوسری طرف تالاب کے کنارے آم کے درخت کے نیچے کھڑی ہوئی رابعہ کا دل بانسری کی آواز پر جھومنے لگتا۔

بانسری سے اُوپا اُو، اُوپا اُو بوت، اُوپا اُو، اُوپا اُو کی بلند ہوتی ہوئی آواز جیسے قیدی شہزادی کے سوگ میں گاؤں کی فضا کو سوگوار بنا دیتی۔ بھری دوپہری میں جب آسمان کی نیلی چھت کی وسعتوں میں چیلیں چلچلاتی ہوتیں اور ہوائیں دھیرے دھیرے چل رہی ہوتیں تو وہ ایسی مدھر اور خوبصورت لے میں بانسری بجاتا کہ اس کی آواز سن کر گاؤں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا دل مضطرب نہ ہو جاتا ہو۔

چیت کا مہینہ اسی طرح گذر گیا۔ بیساکھ کی پندرہ تاریخ کو صادق وہاں سے واپس آگیا۔ اس کے بعد قاسم خاں اسے اپنے ساتھ لے کر میدانی علاقہ میں چلا گیا۔ وہاں سے بیساکھ میں وہ پھر جا علاقہ

دھان لے کر واپس آگیا اور اس طرح پہلا سال ختم ہو گیا۔

اس عرصے میں قاسم کے یہاں صادق کا شمار خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ہونے لگا تھا۔ اس کے کام، اخلاق اور خوش مزاجی نے قاسم کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا، اور دوسرے کارندوں کے مقابلے میں وہ بالکل اپنوں کی طرح رہنے لگا تھا۔

آسن کے مہینہ میں وہ اکیلا ہی میدانی علاقہ چلا گیا۔ اس بار وہ قاسم خاں کا نمائندہ تھا اور دوسرے کارندوں کو بٹائی پر زمین دینے کی ذمہ داری بھی اس ہی کے سپرد تھی۔ آسن اور کاتک کا مہینہ بھی گذر گیا، پھر اگھن آیا، پوس بیتا اور پھر ماگھ میں ان کارندوں نے جو قاسم خاں کے یہاں رہتے تھے آکر دھان پہنچا دیا۔ ماگھ کے آخر میں قاسم کو صادق کی بیماری کی خبر ملی اور وہ اُسے خود جا کر گھر لے آیا۔

صادق کا تمام جسم چیچک سے بھر گیا تھا پھر بھی قاسم خاں نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر اسے اپنے ہی گھر میں رکھا۔

لیکن اس کی اس حرکت پر گاؤں بھر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ قاسم خاں گاؤں بھر کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ چھوت کی بیماری گھر میں لے آیا ہے۔ اس بیماری میں تو کوئی ایک قطرہ پانی دینے والا بھی نہیں ملتا۔ قاسم خاں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اپنی جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔

قاسم خاں کے یہاں لوگوں کا آنا جانا بند ہو گیا اور پڑوسی دور ہی دور سے اسے ہدایتیں دینے لگے۔ یہ بیماری بہت خطرناک ہوتی ہے قاسم خاں! اسے جلدی یہاں سے ہٹاؤ ورنہ سارا گاؤں ویران ہو جائے گا۔ کوئی کہتا، جلد اس کا کوئی انتظام کرو، ورنہ پولیس کو خبر کر دوں گا۔ اسے ہسپتال میں داخل کرا دو۔

ہسپتال! جہاں مریض کو ایک بڑے سے ٹوکرے میں بٹھا کر چاروں طرف سے مچھر دانی میں گھیر کر بانس میں باندھ کے لے جاتے ہوئے لے جاتے ہیں! قاسم خاں نے برسات میں ایک بار دیکھا تھا ان شو گھنٹہ بجاتا ہوا ایک شخص آگے آگے چلا جا رہا تھا اور دو آدمی مچھر دانی سے گھرے ہوئے ایک ٹوکرے کو بانس میں باندھے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ اس طرح تو ہسپتال میں جاتے جاتے مریض کی آدھی جان نکل جاتی ہو گی۔ دوسروں کی ہدایت پر کام کرنے کی عادت قاسم خاں کی نہیں تھی، لیکن خود صادق بھی اپنے گھر جانے کے لئے بار بار

خوشامد کر رہا تھا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہو گی بھائی۔ جب مجھے اتنی دور سے آئے ہیں تو میرے گھر پہنچا دیجئے۔ میری بات مانئے، اس طرح اپنی موت کو دعوت نہ دیجئے، گھر جانے کو میرا دل بہت چاہتا ہے۔ سوچ کر دیکھئے، میرے یہاں رہنے سے آپ لوگوں کا کتنا نقصان ہو گا۔ میری ہی وجہ سے آپ کا تمام کام رک گیا ہے۔ آدمی نہ ملنے کی وجہ سے دھان آ جانے اور رکوٹنے کا کام بند ہے، کھلیان میں دھان پڑا پڑا سڑ رہا ہے، کھیتوں کا کام بھی رکا ہوا ہے۔" صادق کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور وہ ہانپنے لگا۔

قاسم خاں نے بڑے پیار سے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے، میں سوچ کر دیکھتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے، تم کوئی فکر نہ کرو۔"

آخر کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس بات پر رضا مند ہو گیا کہ وہ خود صادق کو کشتی پر چڑھا کر اس کے گھر چھوڑ آئے۔ دوسرا اس کے ساتھ جانے والا کوئی نہیں تھا، دو کارندے دھان چھوڑ کر پہلے ہی بھاگ گئے تھے لیکن اگر وہ ہوتے تو بھی اس کے ساتھ جانے کو ہرگز تیار نہ ہوتے۔ صادق کے پورے جسم کے زخم اب پکنے لگے تھے، اس لئے قاسم کی ماں بھی اسے گھر چھوڑ آنے پر رضا مند ہو گئی تھی۔ صرف ایک رابعہ تھی جو دبے ہوئے لہجے میں اس کی مخالفت کرنا چاہتی تھی، مگر قاسم خاں پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

قاسم خاں چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے ہنستے ہوئے پوچھا "تم منع کرنا چاہتی ہو کیا؟"

قاسم خاں کے اس جملے میں پتہ نہیں کیا اثر تھا کہ وہ چونک کر ماں اور بھائی کا چہرہ تکنے لگی۔ آخر اس نے ہچکچاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ "میں کیا جانوں تم لوگوں کی جو خوشی ہو وہ کرو۔ مگر کہیں وہ راستے ہی میں مر نہ جائے۔"

اتنا کہہ کر وہ کسی کام سے باہر چلی گئی۔

قاسم خاں چند لمحے اسے جاتے ہوئے خاموش تکتا ہوا سا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ ٹھیک ہی کہا ہے۔ اب ڈرنے کی کونسی بات ہے ماں! گاؤں کے لوگ تو بلا وجہ

ہنگامہ کئے ہوئے ہیں۔ میں اسے کیوں نہیں لے جا رہا ہوں، جانتی ہو ماں۔ میرا دل کسی طرح اُسے اپنے سے جدا کرنے کو نہیں چاہتا، کیا کروں؟"

تمام دھان اب بھی ڈھیریوں کی شکل میں پڑا ہوا تھا اور صادق کو لے جانے سے پہلے ان ڈھیریوں کو اٹھا کر گھر میں رکھ دینا ضروری تھا۔ قاسم خان خود ہی ان ڈھیریوں کو اٹھا اٹھا کر کوٹھیوں میں بھرنے لگا۔ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے اس نے اپنی بہن کو بلایا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ماں نے کہا ـ "شاید اس کے سر میں درد ہے، میں نے ذرا ساگ کاٹنے کے لئے کہا تھا ساگ کی بجائے اپنا ہی ہاتھ کاٹ بیٹھی۔"

پڑوسیوں نے پہلے ہی دن سے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور اب تو وہ لوگ آواز دینے پر بھی کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ قاسم خان خود بھی نہیں بلانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ لوگ جان کے خوف سے کانپ رہے ہیں تو کانپتے رہیں۔

پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے صادق کو اس کے گھر پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ صادق خود بھی اپنی دادی کے پاس جانے کے لئے بے چین تھا۔ یکایک قاسم کا چہرہ بھی بڑا عجیب سا ہو گیا تھا۔ خدا نہ کرے اگر کہیں وہ مر گیا تو وہ اس کی دادی کو کیا جواب دے گا؟

دوسرے دن صبح کے وقت قاسم روانہ ہونے والا تھا لیکن کام میں ایسا الجھا کہ نہ جا سکا۔ دھان اٹھا کر گھر میں رکھتے رکھتے دوپہر ہو گئی، پھر بھی کئی ڈھیریاں باقی رہ گئیں، اور اتنی جلدی ان تمام ڈھیریوں کو اٹھا کر گھر میں رکھنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ کام کے دوران میں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد صادق کی مزاج پرسی کر رہا تھا۔ اس دن صادق کی حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ بے رونق ہو گیا تھا لیکن اچانک جب قاسم کی نگاہ صادق کے کمرہ کی طرف گئی تو اس نے دیکھا رابعہ بڑی تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

اس کی اضطراری کیفیت دیکھ کر قاسم خان حیران حیران تھوڑی دیر اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ صادق کے کمرہ میں اپنے سوا دوسروں کو جانے کی ممانعت کر رکھی تھی۔ اس دن وہ اپنی بہن کو صبح سے بے چینی کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے یوں صادق کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کے سامنے ایک حقیقت بے نقاب ہو گئی۔ پھر بھی اپنا شک دور کرنے کے لئے وہ ہوشیاری سے دروازے کی دیوار کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔

کمرہ میں رابعہ بول رہی تھی اور اس کی آواز گلوگیر تھی۔

مجھ پر خفا مت ہو۔ تم ایسے ناسمجھ کیوں ہو۔ تم خود ہی سوچ کر دیکھو، میاں بھائی اور ماں نے میری شادی کسی بڑے گرہست کے یہاں طے کر دی ہے۔ آج اگر میں تمہیں روکتی ہوں تو مجھے بے شرم بن کر تمام بات کھل کر کہنی پڑے گی۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی اور چونکہ میں ایسا نہیں کر سکتی اسی لئے تم دادی سے ملاقات کرنے کا بہانہ بنا کر یہاں سے چلے جانا چاہتے ہو؟ مجھ پر خفا نہ ہو، غصہ نہ کرو۔ تم اگر جانا نہ چاہو تو کوئی بھی تمہیں یہاں سے نہیں لے جا سکتا۔ کہو تم نہیں جاؤ گے؟"

"اس مرض کو لے کر اگر میں یہاں رہوں گا تو تم لوگوں کی جان بھی لے لوں گا! تم تو دیکھ ہی رہی ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتیں؟ مجھے جانا ہی پڑے گا رابعہ ..... لیکن کہیں میں رستے ہی میں نہ مر جاؤں! نہیں، تم جاؤ، تمہیں خدا کا واسطہ، رابعہ تم میرے قریب نہ آؤ، یہ بیماری بہت خطرناک ہے۔"

"ہونے دو، کہو تم نہیں جاؤ گے؟"

"پھر وہی بچپنے کی باتیں مجھے رلائے بغیر کیا تم خوش نہیں رہ سکتیں! تم جاؤ کسی طرف سے کوئی آ گیا تو تمہارے لئے شرم کی بات ہو گی۔ جانے کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں۔ اگر رستے میں مر نہ گیا اور زندہ رہا تو ایک دن ضرور واپس آؤں گا۔ اس وقت تم دیکھو گی کہ اس دنیا کی کوئی طاقت ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے گی"

قاسم خان دھان کی ڈھیری کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے دیکھا رابعہ آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے نکل کر ایک طرف چلی گئی۔ ماں نے اسی وقت اُسے کھانے کے لئے آواز دی۔ اور نہانے کے بعد ماں کے بار بار بلانے پر وہ کھانے کے لئے گئی۔

قاسم خان نے کھانا کھاتے ہوئے کہا: "اب دیر کرنے سے کیا فائدہ ہے ماں؟ صادق کی جیسی حالت دیکھ رہا ہوں، اس میں آج ہی شام کو یہاں سے روانہ ہو جانا بہتر ہے۔"

ماں نے دکھ بھرے لہجے میں جانے کیا جواب دیا، مگر اُدھر دھیان دئے بغیر قاسم نے آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ اس کی بہن نے یکایک کھانا چھوڑ دیا۔

دو چار نوالے کھانے کے بعد قاسم بھی اٹھ گیا۔ "کھانا اچھا نہیں لگتا ...!"

قاسم نے صادق کو گود میں اٹھا کر کشتی میں سلا دیا اور اس کے بعد ماں کے ہاتھ سے تمباکو پینے کا سامان لے کر ایک طرف سجا کر رکھ دیا۔

جب کشتی کھلنے لگی تو صادق نے نحیف آواز میں کہا: "میرا گناہ قصور معاف کر دو گی ناں؟"

قاسم کی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یہ تم کیا کہتے ہو بابا! قصور کیسا۔ اچھے ہو جانے کے بعد پھر چلے آنا۔ مجبور ہو کر تمہیں گھر جانے دے رہی ہوں، ورنہ..."

صادق نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے رابعہ کو مخاطب کیا۔

"میں جا رہا ہوں رابعہ!"

"رابعہ یہاں نہیں ہے"، قاسم نے کشتی پر کھڑے ہو کر لگی اٹھاتے ہوئے کہا۔

قاسم کی ماں نے کئی آوازیں دیں، لیکن رابعہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"نہیں آئی"۔ صادق کی نحیف آواز میں جتنا اشتیاق تھا اس کی آنکھوں میں اتنی ہی مایوسی تھی۔

"نہیں!"

کشتی کھلنے کے بعد قاسم کی ماں نے کہا۔ "تم اسے پہنچا کر لوٹ آؤگے، سمجھے قاسم۔ ورنہ مجھے بڑی فکر لگی رہے گی!"

"اچھا"

نہر کا پہلا موڑ گھومنے کے بعد ہی قاسم کا گھر چھپ گیا۔ اس کے گھر کے قریب ہی نہر تھی اور نہر کے کنارے اسی کا بنایا ہوا رستہ بہت دور تک جانے کے بعد ضلع بورڈ کی سڑک سے مل گیا تھا۔ رستے کے کنارے قاسم نے اپنے ہی ہاتھوں سے بیر، ناریل، جامن اور آم کے درخت لگائے تھے۔

نہر کا پانی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس لئے کشتی کو آگے بڑھانے میں اسے بڑی دقت ہو رہی تھی کشتی پانی کی بیلوں میں بری طرح الجھ گئی تھی اور ان بیلوں کی گرفت سے اس کو چھڑانے میں وہ زور زور سے ڈول رہی تھی۔

بڑی مشکلوں سے وہ تھوڑی ہی دور تک کشتی کو آگے بڑھا کر لے گیا تھا کہ یکایک کسی کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سن کر قاسم نے چونک کر کنارے کی طرف دیکھا۔ جنگلی گابھ کے درخت کے قریب ایک جھاڑی سے نکل کر اپنی آنکھوں کو آنچل سے چھپائے رابعہ تیزی سے گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

قاسم کو ایسا محسوس ہوا جیسے لگی تھامے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ شل ہو گئے ہوں۔ اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کی ماں بھی اس وقت تک کنارے پر کھڑی ہوئی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور رابعہ اس کے قریب سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

قاسم نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کشتی کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا "رہنے دو میں نہیں جاؤں گا۔"

قاسم کی آواز سن کر یکایک رابعہ کے قدم رک گئے اور اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

لیکن جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا، جب قاسم نے اسے گود میں اٹھانا چاہا تو دیکھا کہ وہ مر کر پتھر کی طرح بے جان اور برف کی طرح سرد ہو گیا تھا!

سوکھے پتے

رفعت شفیعہ

الماریوں میں چند روز ہوئے تارکول کا ہلکا سا حاشیہ کروایا تھا تاکہ گئی برسات کی طرح آنے والی برسات میں ورق چاٹنے والے جرثومے نہ پیدا ہوجائیں آج میں نے تارکول پر ہاتھ لگاکر دیکھا۔ وہ بالکل خشک تھا اور میں نے کتابوں کو دوبارہ الماریوں میں بند کرنا چاہا مگر پرانی ترتیب پسند نہ آئی۔ حالانکہ پرانی ترتیب میں میرے ماضی کی داستانیں ہیں اور میں اپنے ماضی سے محبت کرتی ہوں۔ مگر اب شاید ماضی کے تمام نقوش میرے سینے میں اتنے گہرے ہوچکے ہیں کہ اُن کے لئے مجھے کبھی کسی نمائشی نشانی کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ اس لئے سوچا لاؤ آج نئی ترتیب سے رکھوں، اور میں نے گنگناتے ہوئے پیار سے اپنی کتابوں کے چہرے رومال سے صاف کئے اور الماری میں لگانے لگی۔ کتابیں، چھوٹی بڑی کتابیں، رسائل، موٹی موٹی جلدوں کے رسائل۔ جن میں میری نشانیاں تھیں۔ وقت بے وقت رکھی ہوئی پھولوں کی پنکھڑیاں، ٹافی کے رنگین چمکیلے ورق، چرمی فیتے، پلاسٹک کے رنگین ربن، کہیں کاغذی پرزوں پر خود میری تحریر۔ میں انہیں نکالے بغیر جوں کی توں رکھے چلی جاتی یہ چیزیں جو میرے لئے پرانے سکوں کا درجہ رکھتی ہیں، میں اُن کے چہرے پڑھ کر اپنے ماضی کی داستانیں آج بھی دہرا سکتی ہوں مگر انہیں دیکھ کر میرے ہونٹوں پر تبسم لہراتا رہا۔ میرے ہاتھ لرزتے رہے اور ذہن میں ماضی کی چاندنی اور اندھیروں سے جال بُنا سمجاتا رہا..... ہاں میرے ماضی کی چاندنی اور اندھیرے یہ میرے اعصاب کی کمزوری تھی یا تحت الشعور کی کوئی دکھتی ہوئی یاد کہ اچانک یہ گلابی جلد کی کتاب میرے ہاتھ سے پھسل گئی اور اوراق منتشر ہوگئے۔ میں انہیں سمیٹنے کے لئے جھکی تو میرے ہاتھ میں یہ چند سوکھے پتے آگئے اور میں وہیں بیٹھ گئی۔

بظاہر یہ خشک پتے محض بے جان سوکھی فرسودہ چیزیں مگر جانے کیوں مجھے محسوس ہوا گویا یہ کسی مردہ عہد کے چند نوادرات میرے ہاتھ لگ گئے۔ جیسے یہ میرے اُن خیالوں کی تشکیل ہیں جو عرصہ ہوا میرے ذہن میں ابھرے اور پھر برسوں پہلے کا ماضی مجھے اُن پتّوں پر رقص کناں نظر آیا۔ اُن دنوں مجھے پتے سُکھانے کا جنون سا ہوگیا تھا۔ میں ہر سائز کے چھوٹے بڑے پتے اکٹھا کرلاتی، کتابوں میں دباتی، سکھاتی اور اُن پر لکھنے کی مشق کیا کرتی، پہروں بیٹھی اُن پر اپنی پیاری پیاری سہیلیوں کے نام لکھتی یا افسانوں کے عنوان۔ کبھی کبھی اپنا پسند کیا ہوا شعر بھی، یا زندگی کے واقعات پر صرف ایک ایک لفظ اور یہ میرا اچھا خاصا شغل تھا۔ جسے دیکھ کر سب نے اپنی طنزیہ مسکراہٹ بکھیری اور کہا۔ "کتابوں میں خشکی تھی مگر کہیں کہیں ان میں زندگی کا صحت مند احساس تو ملتا ہے، مگر یہ سوکھے پتے..... یہ زندگی کو مرجھانا سکھادیں گے۔ توبہ! یہ بھی کوئی مشغلہ ہے۔ ہوں!"

مگر میں ہمیشہ کی طرح اِن تیز تیز فقروں کو نظر انداز کیا اور اس "ہوں" سے قطعی بے نیاز ہوگئی جو سکڑی ناک، اٹھے ابرو اور ٹیڑھے ہونٹوں نے بارہا مجھ پر اگل دی تھی۔ کیونکہ زندگی میں اتنا کچھ بھرا پڑا ہے کہ یہ "ہوں" میرے لئے بے معنی بن گئی۔ میں نے پتوں پر ایک دن مختلف روغن کئے۔ چمکیلے چمکیلے شوخ شوخ آئل کلر پھر انہیں بلوری جار میں پانی چھوڑ کر اُن میں ڈال دیا۔ اُس دن گھر کے سب مرد آئے، عورتیں آئیں، اور اتوار کو شام گئے تک بچوں نے اس میز کا محاصرہ کئے رکھا جن پر ان کی دانست میں رنگین مچھلیوں بھرا بلوری جار پڑا تھا۔ وہ میز کو ہلاتے اور پھر ہلتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھ کر تالیاں بجانے لگتے۔ اس رات میرے کمرے میں کئی چیزیں بے ترتیب پڑی بچوں کی آمد کی اطلاع دے رہی تھیں۔ مگر اس سے دوسری شام کا

ذکر ہے، میں دریچے میں کھڑی ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک میرے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ دھرا گیا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو آپ بولیں:۔

"میں سمجھا کرتی تھی بے جان کتابوں اور سوکھے پتوں میں ہر وقت کھوئی رہنے والی لڑکی بھی محض ایک سوکھا پتا بن گئی۔ مگر تمہارے ذہن میں تو حسن بھی ہے اور ندرت بھی۔ بٹیا پیاری۔"

تو میں نے آپ کا پلّو پکڑتے ہوئے کہا:

"بھلا آپ سی شخصیتوں میں رہ کر میں حسن و ندرت سے کیسے دور رہ سکتی ہوں فرخ آپا — میری خاموشیوں میں بھی تو دراصل آپ لوگوں کے قہقہے بسے ہوتے ہیں۔"

اور شاید میں کچھ اور کہتی کہ معاً ہمارے آنچلوں پر اڑتی ہوئی سنہری کرنیں مٹ گئیں۔ میں نے گھوم کر دیکھا سامنے کے اونچے پیڑ پر اڑتے ہوئے پرندوں پر قدرے کرنیں باقی تھیں، سورج بالکل چمک کھو کر محض آتشی رنگ کا ایک گولا سا بن گیا تھا اور ہمارے چہروں پر شفق کے سائے گہرے ہو گئے۔ اس وقت میں نے آپ کے چہرے کو بغور دیکھا کیونکہ کچھ عرصہ سے میں محسوس کر رہی تھی کہ آپ کے چہرے پر ایک ایسی شفق بھی پھوٹنے لگی ہے، جس کا آفتاب آپ کے سینے کی دھڑکنوں میں طلوع ہوا ہے مگر آپ پلٹ کر جار کے قریب گئیں اور بولیں۔ "بیٹا! یہ سب خیال تمہارا ہی ہے یا اس میں واجد کا بھی ہاتھ ہے؟"

میں نے آپ کے چہرے پر ابھرتی ہوئی اس اندرونی شفق کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیال تو صرف میرا ہے مگر پتے رنگنے میں واجد بھیا نے بھی ہاتھ بٹایا۔ سچ فرخ آپا، واجد بھیا بھی بالکل آپ کی طرح ہی ہیں۔ پہلے ہر روز مجھ سے باتیں کرتے رہے اور پھر خود بھی برش تھام کر رنگنے لگے۔ اور آپ نے جار میں ہاتھ ڈال کر پتوں کو چھو چھو کر دیکھا اور پوچھا۔ بھلا واجد نے کونسے پتے رنگے تھے؟"

میں آپ کی اس دیوانگی پر بڑی سادگی اور معصومیت سے مسکرائی اور کہا۔ "پتوں پر کوئی خاص نشانی لگائی نہیں تھی ہم نے۔" آپ کے جانے کے بعد میں اور بھی ہنسی۔ پھر بظاہر میں نے ذہن سے آپ لوگوں کا خیال جھٹک دیا۔ مگر جیسے تحت الشعور میں اس شدید کھوج کا احساس اور بھی گہرا ہو گیا جو عسکری نے یہ کہہ کر لگایا تھا کہ:

"۔۔۔ واجد سے فرخ کو بڑی محبت ہے" اور واقعی پھر دو دن بعد جب آپ میرے کمرے میں آکر کہنے لگیں "لو بیٹا ان بلاٹنگ پیپروں میں پتے رکھ کر سکھایا کرو۔ دیکھو نا ان میں رکھ کے اوپر وزن ڈال کر دھوپ میں سکھانے سے اِن کا رنگ نہیں بدلے گا۔" تو مجھے حیرت ہوئی۔ بھلا آپ کو میرے اس بے جان شغل سے کیا دلچسپی مگر مجھے سوچنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ عسکری اور واجد بھیا آئے۔ عسکری سے میں نے اپنے کمرے کے لئے دو پہاڑی مناظر منگوائے تھے۔ میں ان کے ہاتھ سے لے کر انہیں دیکھنے لگی۔ مگر جب اُن سے نظریں ہٹا کر آپ کی طرف دیکھا تو آپ واجد بھیا کو دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت میں نے آپ کی آنکھوں سے وہ کرن پھوٹتی دیکھی، جس میں مسکراہٹیں بھی تھیں اور حسن بھی۔ جس میں ساز بھی تھا اور موسیقی بھی۔ جو بظاہر خاموش تھی مگر جذبات کی ترجمان۔ ہاں فرخ آپا میں نے وہ کرن دیکھی تھی جیسے لوگ زبان سے ادا کرتے ہوئے حرفوں سے بنا کر محبت کرتے ہیں میرا جی چاہا میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے کہوں:

"آپ کی پسند پر آپ کو مبارک باد دیتی ہوں آپا"۔ مگر عسکری نے دریچے کے قریب فاصلہ ناپنے کے لئے مجھے پکار لیا۔

شاید ماضی کی وہ رنگین سی چمکیلی صبح آپ کو یاد ہو، میں اُن دنوں اس بھرے بھرے سبزے پر ننگے پاؤں چلنے کے لئے صبح صبح سبزے بھرے لان میں نکل جایا کرتی تھی۔ اُس دن صبح سورج کی اولین شوخ کرنیں "بائل برش" کے درخت پر اتری ہی تھیں کہ میری نظریں اُن پر جا پڑیں۔ بھیگی سی صبح میں سبز سرخ جھالروں ایسی گیلی گیلی شاخوں والا بائل برش کا نازک پیڑ مجھے اتنا پسند آیا کہ میں بے اختیار سوچنے لگی یہ سرو سے کتنا مختلف ہے۔ عہد قدیم کے شعراء نے جانے سرو پر ہی کیوں لکھا۔ یہ بائل برش اُن سے اوجھل کیوں رہا۔ ورنہ اس میں بھی نزاکت ہے، قدکی

موزونیت ہے بلکہ اس کی لٹکتی ہوئی سُرخ سبز جھالروں نے اس میں کتنا حُسن بھر دیا ہے۔ اور عہد قدیم کے شعراء کا خیال آتے ہی مجھے ان کے خیالی محبوب کا خیال آگیا جانے کیوں جب بھی کبھی اُن کے شعروں کی مدد سے میں ان کے محبوب کا خیالی ہیولا بناؤں میں خود بخود لرز اٹھتی ہوں اور سوچتی ہوں اگر ہماری مصوری کی بنیاد اس محبوب پر رکھی جاتی تو آج تجریدی آرٹ کا کیا بنتا؟ اُف اُن کے خیالی محبوب کی غیر محبوبانہ ادائیں اور سفاکانہ رویہ میرے لئے خواہ مخواہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جاتا ہے اور آج میں نے اس تصوّراتی ہیولے سے فرار پانے کو بائل برش کے نازک گیلے پیڑ سے ٹیک لگاکر اپنے آپ کو اس لٹکتی ہوئی سرخ سبز جھالروں ایسی شاخوں میں چھپا سا لیا کہ آپ میری طرف آتی نظر آئیں۔ آپ مسکراتی مسکراتی یوں چلی آرہی تھیں کہ مجھے آپ کی چال میں بھی مسکراہٹ نظر آئی۔ شاید اس لئے کہ میرے ذہن میں اس وقت شاعری اور محبوب کا خیال بھرا پڑا تھا۔ آپ نے جھک کر ٹہنیوں تلے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "بٹیا! کیوں کسی خیال سے فرار پانے کو یہاں چھپی کھڑی ہو؟"

اور میں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنا سارا خیال آپ کو سنا دیا۔ آپ نے میرے وہم اور خیال پر بڑا زوردار قہقہہ لگایا۔ جانے کیوں آپ اُن دنوں اتنا زیادہ ہنسنے کے موڈ میں کیوں رہتی تھیں۔ اور آپ نے کہا۔ "وہ زمانہ بدل گیا بٹیا، آج کی محبوبہ اتنی سفاک نہیں"۔

اور پھر آپ نے سیمنٹ کے تختہ پر بیٹھ کر مجھے محبت اور محبوب کے بارے میں اپنے اتنے پیارے پیارے خیال سنائے کہ میں پوچھ ہی بیٹھی:

"آپ بھی محبت کرتی ہیں نا فرخ آپا!"

"محبت۔ ہاں بٹیا۔ زندگی، جہاں تک میرا خیال ہے، چند احساسات کا مجموعہ ہے۔ زندگی کے لئے دل، احساس اور محبت کی ضرورت ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میرے پاس احساسات سے بھرپور دل بھی ہے، شوخ شوخ سی مسکراتی محبت بھی اسی لئے تو آجکل مجھے اپنی زندگی بھی اس قدر پسند ہے۔"

اور میرا جی چاہا میں آپ سے لپٹ کر کہوں:

"آپ ذرا اپنے منہ سے میرے سامنے واجد کا نام لے دیں فرخ آپا"۔ مگر اچانک یوکلپٹس کا ایک سوکھا ہوا پتا بڑی بلندی سے ہوتا ہوا میرے ہاتھ پر آن گرا۔ ہم دونوں اس کی آمد پر کانپ اٹھیں، اور پھر مسکرائیں۔ آپ نے پتا اٹھایا۔ پکڑا، توڑا اور پھینک دیا۔ میں لرز اٹھی۔

زندگی کی وہ شام اتنی اداس نہ تھی اور پھر مجھے تو بعض اوقات بہار کی دوپہریں بھی اتنا اداس کر دیتی ہیں کہ خزاں کی شامیں بھی اتنا اداس نہیں کرتیں۔ اور پھر یہ تو گرمی کی ایک شام تھی جس میں حدت تھی، اداسی نہ تھی۔ مگر واجد بھیا نے بتایا کہ آج شام بے حد اداس ہے، کیونکہ وہ پہلی بار ان گنگناتے ہوئے کمروں اور خاموش دریچوں کو چھوڑ کر ملازمت کے سلسلے میں باہر جا رہے تھے۔

اور آپ بھی اداس تھیں فرخ آپا۔ مگر عسکری اور بشیر نے اس شام کو اداسی کی گہرائیوں میں ڈوبنے سے بچا لیا۔ عسکری نے اپنی شاعرانہ آواز میں ایک الوداعی غزل چھیڑ دی اور وہ شام واقعی گیتوں کی محفل بن گئی۔ اس محفل میں غزل سے قوالی تک سب کچھ سنا اور سنایا گیا، اور ابھی پنجابی گیتوں کا آغاز ہوا ہی تھا کہ مجھے یاد آگیا۔

"نی سیو! کونج وچھڑ گئی ڈاروں، تے لبھدی سکھیاں نوں"
(اے سکھیو! کونج اپنی ٹولی سے بچھڑ گئی ہے۔ اور اپنی سکھیوں کو ڈھونڈ رہی ہے)

مگر جونہی یہ گیت بیگم اور شاقبہ نے ختم کیا، ہمیں محسوس ہوا کہ محفل میں چند پلکیں بھیگ چکی ہیں۔ اور میں نے افسردگی دور کرنے کے لئے کہا۔ "واجد بھیا کونج تو اور بھی سکھیاں بنا لیگی جا کر مگر یہ ٹولی جو باقی رہ گئی ہے اپنی جانے والی کونج کو ہمیشہ یاد رکھے گی"۔

اور بیگم نے بڑے دکھ سے کہا "ہاں جب محفل بنا کر بیٹھیں گے تو آپ شدت سے یاد آئیں گے"

مگر عسکری جلدی سے بولا۔ "نہیں نہیں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وعدہ نہ کیجئے گا کیوں انسانی نظریے بدل جاتے ہیں"

میں نے پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ آپ ثمانہ کے کندھے سے لگی بڑی
اداس سی بیٹھی تھیں مگر آپ نے کہا۔ "ہاں اس وقت مستقبل کا خیال
عبث ہے۔ ہمیں آج کا ذکر کرنا ہے اور آج واجد دولہا بنے ہیں"
مگر پھر فرخ آپا واجد بھیا کے جانے کے بعد آپ نے
میری تنہائی اور خاموشی پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ خود پہروں
میرے کمرے کی دھندلاہٹوں میں اپنے جذبات بکھیرتی رہتیں آپ
کا ہر موضوع واجد بھیا پر جا کر ختم ہو جاتا۔ واجد بھیا کے وہ تمام
خطوط میرے تکیے تلے سے نکال کر پڑھ ڈالتیں جو بظاہر میرے
نام ہوتے مگر اس میں پورے گھرانے کا ذکر ہوتا۔ اور پھر دیر تک
انہی خطوط کے اشارے ہمارے موضوع بنے رہتے۔ اور سب کہتے
کہ فرخ اور بینا میں گہری دوستی ہو گئی۔ حالانکہ میرے خلوص اور رویے
میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میرا نظریہ آپ کے لئے وہی تھا۔ میں
چاہت سے ملتی جیسے شروع دن سے ملتی آئی ہوں، اس کے جواب
میں آپ اکثر مجھے خشک پتہ کہا کرتی تھیں۔ آپ کا خیال تھا میں حقیقتوں
کا سامنا کرنے سے گھبرا کر تنہائی میں فرار کرتی ہوں۔ حالانکہ میں نے
تنہائی میں زندگی سے کبھی فرار نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ زندگی کی حقیقتوں
کو جا چھوا ہے، زندگی کے شدید احساس کے ساگر میں غوطے لگا
لگا کر اس کی تہہ میں بچھے ذرے چنے تھے اور انہی ذرات کی ضیا
نے مجھے اتنی بصیرت بخش دی ہے کہ میں آپ کے چہروں کو
ایک نظر دیکھ کر آپ کے جذبات پڑھ لیتی ہوں۔ آپ اسے زندگی
سے فرار کہتے ہیں۔ جو شخص ہمیشہ زندگی کی قدروں اور حقیقتوں کو
سمجھنے اور پانے میں محو رہے، ہاں ہاں میں نے زندگی کی قدروں
کو سمجھا اور حقیقتوں کو ٹٹولا تھا۔ اور آپ، فرخ آپا جو زندگی کا سامنا کرنے
سے گریز کرتے ہوئے دنیا میں الجھ گئی تھیں ــــ یہ بات مجھے یہاں
خواہ مخواہ ہی یاد آ گئی شاید ابھی آپ کو ان خشک پتوں سے کوئی تعلق
نہ نظر آئے ان کا ــــ مگر شاید اس سے آگے مجھے یہ کہنا تھا کہ آپ
کے دلی لگاؤ کی خبر آپ کے والدین تک جا پہنچی تھی۔ اسی لئے دونوں
کے بزرگوں نے اس مقدس رشتے کی اجازت دے دی تھی ہم سب
نے واجد بھیا کو مبارک کے خطوط لکھے تھے۔ ان کے جواب میں واجد
بھیا کے خط سب کے نام آئے اور انہوں نے اپنے جذبات کا
اظہار تو یہاں تک کر دیا تھا کہ " اب میں پردیس میں بڑا رومینٹک
محسوس کرنے لگا ہوں اپنے آپ کو"

مگر ادھر میری نظروں نے بارہا پڑھا کہ آپ کے چہرے
پر اب واجد بھیا کے ذکر سے وہ شفق نہیں پھوٹتی جو ہمیشہ
پھوٹتی تھی، دل نے کہا، شاید یہ بات اب پکی ہوئی۔ مگر ذہن
نے یہ دلیل ماننے سے انکار کر دیا۔ نہیں نہیں۔ فرخ بدل گئی
ہے۔ اور میں نے محسوس کیا واقعی اب آپ میرے کمرے میں کم آتی
ہیں اور خط بھی محض اس لئے پڑھتی ہیں کہ بس یہ پڑھنے کا سلسلہ
جاری رہے۔ ہاں کبھی کبھی آپ اپنے تعریفی فقرے پر اتنا مزہ لیتیں
کہ بے اختیارانہ گنگناتے ہوئے دریچے پر جھک جاتیں۔ اور میں لرز
اٹھتی۔ آپ محبت نہیں کرتیں فرخ آپا۔ آپ وہ عورت ہیں جو
صرف تعریف چاہتی ہیں۔ ایسی عورت ہمیشہ بھٹکتی ہے۔ اور دن
تیز رفتاری سے گزر گئے۔ دنیا کہتی ہے وقت پر لگا کر اڑتا ہے
اور میں نے محسوس کیا وقت کبھی تو پروں کو سمیٹ کر اڑتا ہے
کبھی پر پھیلا کر، پھڑپھڑا کر۔ اور ان دنوں وقت پر سمیٹ کر اڑ رہا
تھا۔ اس میں کوئی پھڑپھڑاہٹ نہ تھی۔

ہاں، اب میں کمرے کی دھندلاہٹوں میں روشن دان سے آنے
والی روشن لکیروں میں اڑتے ذروں کی باتیں سنا کرتی تھی۔ میں
نے ان روشن ذرات سے سنا تھا کہ زندگی تیزی سے بدل گئی ہے
اور انسان نے زندگی کی قدر کو بدل ڈالا ہے۔ "نئی قدریں"۔ میں
مسکرا دی۔ انسان کیا چیز ہے جس پر ہر ذرہ بھی تنقید کرتا ہے قدریں
وہ کیا! ــــ دیوان غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے رک کر، میں نے
تیز رفتار ذرے کو روک کر پوچھا ــــ "پیارے نقاد! میں ہر روز
تمہاری گفتگو سنتی ہوں۔ آخر تمہارا کیا مطلب ہے؛ کیا تم انسانی
ترقی کے مخالف ہو؟"

ذرے نے میری پنسل کی باریک نوک پر بیٹھتے ہوئے
کہا ــــ تم اکیلے میں کیا سوچا کرتی ہو خاموش لڑکی! تمہیں نہیں
پتہ زندگی کتنی بدل گئی۔ تم اپنی خاموشی اور تنہائی کے جال میں
اتنی الجھ چکی ہو۔ تمہیں تنہائی کیا دیتی ہے؟

میں نے پنسل کی نوک کو دیوانِ غالب پر پھیرتے
ہوئے کہا۔ "پیارے ذرے! اس کتاب میں زندگی کی
بڑی حقیقتیں ہیں۔ اس میں غالب نے لکھا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

سمجھے تم کچھ اسے ؟"

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔" انہی کتابوں نے تو تمہیں ایسا بنا دیا ہے۔ یہی خلوت تو آج کل کی سوسائٹی میں دیوانگی پکاری جاتی ہے۔ تم اِس قید سے نکل آؤ۔"

" مگر تمہیں یاد نہیں، میں نے تم سے انسانی قدروں کا پوچھا تھا ــــ تم ناصح مت بنو۔"

" ہاں، مگر بتاؤ کبھی تم نے نغمے سنے ہیں کوئل کے؟" وہ ذرہ نوک پر اور بھی جم گیا۔

میں نے پلاسٹک کے گلابی ربن کو دیوان میں رکھ کر اسے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا ــ" کوئل کے نغمے میری روح کی غذا ہیں۔"

"مگر یہ نغمے آج کل کی زندگی کا سہارا ہیں"؛ اس نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔

" سہارا ؟ اے ننھے دوست ! کیا ساری دنیا دکھی ہے؟"

" نہیں ــــ نہیں۔ وہ میری لرزتی ہوئی پنسل سے مضطرب ہو کر چلّایا۔" سُن اے حقیقتوں کو تلاش کرنے والی خاموش روح! پہلے انسان اِن نعمتوں کو دل میں بسایا کرتا تھا مگر آج صرف کانوں سے سنتا ہے۔"

" کیا مطلب؟" میں اور بھی جھک گئی۔

" آج نمائش ہے اور یہ زندگی کی ایک نئی قدر ہے۔ نمائش۔ ہاں ..."

"میں سمجھ نہ سکی۔ میرے ننھے دوست"۔ مگر دوسرے ثانیہ ہوا کا تیز جھونکا اُسے اڑا کر کہیں دور لے گیا۔ یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔ میں نے ذرے کے اڑ جانے پر چنار کے بلوریں پتے سے چھالیہ اٹھائی اور تیزی سے چبا ڈالی۔

وہ بڑی سہانی رات تھی۔ چاند کی بیسویں تاریخ چاند کہیں دور اندھیروں میں چھپا بیٹھا تھا۔ میں نماز کے بعد دریچے میں کھڑی اپنے ذہنی سکون کے لئے کائنات کو دیکھنے لگی۔ مگر جیسے کائنات تو چاند کی کرنوں کی متلاشی تھی۔ دُور دُور تک اندھیرا تھا۔ دائیں جانب کی بستی میں کہیں کہیں چراغ تھے۔ مگر میں نے اِن ایوانوں سے منہ موڑ کر اندھیری کائنات کو دیکھا جو کرنوں کے لئے تڑپ رہی تھی۔ اور میں نے دل کی گہرائی سے کوئل کو آواز دی۔ " کوئل پیاری! کائنات کی اس بیقراری اور محرومی پر صرف ایک درد بھرا نغمہ گا دے۔ کہ اس کی روح کو سکون ملے"۔ ہاں، اُس وقت میں نے سب کے لئے سکون کی دعا مانگی تھی کیونکہ میں خود سکون چاہتی تھی۔ اور میں دھیرے سے مسکرائی۔ میں بھی کتنی خود غرض ہوں۔ حالانکہ کائنات تو روشنی چاہتی تھی۔ مگر کوئل کی روح تو جیسے اندھیروں میں خود کہیں بھٹک گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر کمرے میں دیکھا، میرے کمرے کی ہر چیز خاموش تھی۔ میں نے روشنی کی مگر روشنی بولی اور پھر خاموشی چھا گئی میں نے کتاب اٹھانے کی سوچی تھی کہ فرخ آپا آگئیں۔ انہوں نے آتے ہی میرے کمرے کی روشنی بجھا دی۔ اور دریچے کے پردے سمیٹ ڈالے۔ وہ اِن اندھیروں میں کوئی راز اگل دینا چاہتی تھیں۔ میں نے خاموشی سے ان کی ہر حرکت برداشت کی اور دریچے میں آگئی۔ ہوا کے خاموش خاموش سے جھونکے میرے بالوں کو بکھیرتے تاریکی میں اضافہ کرتے کمرے میں داخل ہوئے۔ یکایک جیسے کوئل کی روح زبان پر آگئی۔ اور کائنات کے اندھیروں پر ایک دکھ بھرا نغمہ لہرا گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اس نغمے کو روح میں اُتارنا چاہا ہی تھا کہ فرخ آپا نے میرے بالوں کو چھو کر میرے آنچل کو مٹھی میں سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

" یہ پرندہ کیا کہتا ہے، بیٹا؟"

یہ محبت اور موسیقی کی روح۔ میں نے اندھیروں کو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ " فرخ آپا! اس نغمے میں ایک ابدی لگن کا احساس ہے، ایک دکھ کی پکار۔ غمناک موسیقی جس سے احساسات میں تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ آپ نے شاید صرف کوک سنی ہے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ اس میں کونسا درد ہے:

" درد اور احساس سمجھنے کا سارا حق تمہیں جو بخش دیا۔" ہاں فرخ آپا، اِن الفاظ کو ادا کرتے ہوئے آپ کا لہجہ بھی بڑا تلخ تھا۔ مگر میں نے جان بوجھ کر اپنی کہانی جاری رکھی۔ دراصل میں آپ ہی کو سب کچھ سنانا چاہتی تھی۔ اور میں نے کہا،

"جب دنیا بنی تو کائنات بالکل خاموش تھی۔ خالق نے مرد بھیجا مگر وہ اکیلا تھا۔ پھر خالق نے عورت کو تخلیق کیا۔ مگر جیسے کائنات ابھی نامکمل تھی، اس کی زبان لکنت زدہ تھی۔ اور جب عورت نے پہلی بار غلطی کی اور مرد اور عورت کی جدائی پر جنت کی ساری رعنائی ایک دم ہی سمٹ گئی تو سب سے پہلے جس نے مرثیہ گایا وہ یہی پیاری کوئل تھی۔ وہ المیہ موسیقی کا پہلا دن تھا اور غالباً محبت کی تڑپ کا بھی۔ اور یہ کوئل آج بھی اسی لئے روتی ہے۔ ہاں اگر عورت وہ غلطی نہ کرتی تو یقیناً وہ فردوسی بہاریں دنیا پر اتر آتیں بلکہ ابدی ہوجاتیں۔ مگر ہائے عورت۔"

"تو کیا تم اس سیاہ پرندے کے گیت سن کر مراقبے میں کھو کر صرف عورت کی غلطی اور بے وفائی ہی تلاش کرتی ہو؟ ہوں!" مگر میں نے اُس دن بھی اس "ہوں" کی کوئی پروا نہ کی۔ میں نے کہا تاکہ میں ان سے بہت ہی آگے نکل کر بالکل بے نیاز ہو چکی ہوں۔ مگر آپ نے کہا۔ "یاد رکھو، خالق نے عورت کو دلربائی بخشی تھی۔ اور کہا تھا کہ مرد کا دل خوش کر۔ مرد کی بے اعتنائی پر اُس نے کسی اور کے خلوص پر دھوکا کھایا ہوگا، غلطی نہیں کی۔"

میں تڑپ اٹھی۔ یہ یونانی دوشیزاؤں ایسا بھوکا نظریہ مجھے قطعی قابل قبول نہیں۔ ہائے فرخ آپا، آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ عورت بیچاری مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی، اسی لئے اس میں ذہن کی کمی اور دل کا افراط ہے۔ میں نے اُن عورتوں کی اکثریت دیکھی ہے جنھوں نے ازل سے اپنے ذہن کو آدم کی پسلیوں میں چھپا کر دل سے سوچا۔ ورنہ ...

"بیتا جانے دو۔ تم زندگی کا ساتھ کیسے دوگی، زندگی تیزی سے بڑھتے جا رہی ہے۔"

"ہاں اور اسی لئے اس میں احساس کی شدت نہیں۔ اور یہ بھاپ تحلیل ہو جائے گی۔" میرا تحت الشعور جیسے آپ سے مقابلہ ہی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ ایک حقیقت کو بھی اگلوانا چاہ رہا تھا۔

"مگر یہ احساس کی شدت سے رینگتی ہوئی زندگی کم از کم مجھے تو پسند نہیں۔" آپ نے رعونت سے کہا۔

مگر یاد رکھئے، اس رینگتی زندگی میں گھبیرتا ہے شعف ولولہ نہیں۔ اس کے رینگنے سے آپ کو کیا؟"

"اس لئے کہ واجد بھی ابھی تک احساسات کے پرانے بوجھ تلے رینگ رہا ہے۔" آپ کی زبان نے حقیقت اُگل دی۔ ایک کھڑکھڑاتا ہوا پتہ میرے گال پر طمانچے کی طرح لگا اور میری نس نس میں اتر گیا۔ آپ میرے کمرے میں تاریکی کا اضافہ کر کے جانے کس وقت چلی گئیں۔ میں نے جب آنکھیں کھول کر دیکھا تو دریچے سے باہر چاند بالکل زرد اور پژمردہ تھا۔ کوئل نے جیسے ہماری گفتگو سن کر ایک آہ بھر کر گانا بند کر دیا تھا۔ مگر رات کی یہ گفتگو چڑھتے سورج کی کرنوں نے ہر جگہ سنادی۔ اس ہفتہ بھر زندگی بڑی خاموش تھی۔ میری امی مجھے جائے نماز پر محو نماز یا تلاوت میں مصروف پاکر مطمئن ہوکر کہتیں۔ "ہائے پتہ نہیں یہ لڑکیاں بدل کیوں جاتی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔" ثاقبہ اور ثمانہ مضطرب سی ہو کر بے دلی سے ریڈیو کھول لیتیں اور سلیم کیاریوں میں پھرا کرتی۔ عسکری اور بشیر عورت کی بدلتی فطرت پر نئے نئے فقرے سنایا کرتے اور چھوٹی چچی بڑی خاموش ہوگئیں۔ مگر امی اور تائی اماں سر جوڑ کر بیٹھتیں اور نہ جانے کیا مشورے کئے جاتیں۔

دوپہر رنگین تو نہیں تھی جانے کیوں بادلوں نے اس کی سنہری رنگت پر اپنے پلو پھیلا دیئے تھے۔ میں برآمدے میں بیٹھی اپنی کشمیری امبرائیڈری سے دل بہلا رہی تھی کہ چند ذرے اڑتے ہوئے آئے اور میری باسکٹ میں دبک گئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ "آج ایک آندھی اٹھے گی۔" دوسرے نے کہا۔ "شاید کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔" میں نے امبرائیڈری اٹھا کر باسکٹ میں بند کر دی اور آسمان کی طرف دیکھا۔ دُور دُور تک بادلوں کے آنچل تو تھے مگر ہواؤں میں آندھی کے سانس نہ تھے۔ میں نے کمرہ بند کر کے صحن میں دیکھا۔ چیونٹیاں طوفان کی آمد پاکر اپنے انڈوں کو محفوظ مقام کی طرف لے جاتی نظر آئیں مگر فرش اُن کے وجود سے پاک تھے۔ میں امی کے کمرے میں جا کر اُن سے باتوں میں لگ گئی۔ وہاں سے نکلی تو اپنے کمرے میں آکر ادب کی نئی قدریں پر ایک معلوماتی مضمون پڑھنا شروع کیا کہ ثاقبہ اندر آئی۔ اس کے چہرے پر ایک نئی خبر سنانے کا شوق تھا مگر شیلف کے نزدیک آکر اس کے قدم تھم گئے

اُس نے خطوط کی نوکری سے اوپر سے پڑا واجد بھیا کا خط اٹھایا، اور پڑھنے لگی۔ میری نظریں دوبارہ مضمون کی طرف آگئیں مگر میرا ذہن خبر سننے کا منتظر رہا۔ عسکری داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر عجیب و غریب تھکن کا احساس تھا۔ مگر اس نے ثاقبہ کو دیکھا خط کو پہچانا اور مسکرا دیا۔ اگر اس وقت وہ رو دیتا تو شاید میں الجھ جاتی مگر وہ مسکرا دیا۔ تو میں سارا المیہ سمجھ گئی لیعص اوقات انسان دکھ کی کہانی سنانے سے قبل تمہید؟ مسکراتا ہے۔ عسکری کی مسکراہٹ میں دکھ کی تمہید تھی اور پھر اس کی تھکن پہ یہ مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ میں نے رسالہ بند کرکے اپنے آپ کو ہمہ تن گوش بنا لیا۔

اور جو کچھ میں نے سنا شاید ان الفاظ میں آپ سمجھ جائیں:

”ہماری اس ٹولی سے بہت دن ہوئے ایک کونج دور چلی گئی تھی نا۔ مگر اس کی ساتھی کونج اس کے انتظار سے اکتا گیا عقاب سے رشتہ جوڑنے کو اٹھی تھی۔ اور جیسے والدین کی مخالفت کے باوجود یہ رشتہ طے پا گیا۔“

”اور میں جیسے گہرائیوں میں ڈوب گئی جہاں زندگی کے عمیق اندھیرے میں اس بچھڑی ہوئی کونج کی دردناک آواز سنائی دی۔ اس میں اس لا رس کی سی آہوں کا احساس تو تھا جو قافلے کے ساتھ چلتا ہوا اپنے بچھڑے ساتھی کو یاد کرے۔ مگر اس میں نہ تو انتقام لینے والے ناگ کی پھنکار تھی نہ شیر کی دھاڑ۔ میرے واجد بھیا...“

رفتہ رفتہ جب میں اندھیرے سے نکلی تو کمرے میں سب لوگ بول رہے تھے اور جیسے ثمانہ کی کسی بات کے جواب میں عسکری نے کہا۔

”ایک مرد جب کائنات میں لایا گیا تھا اس کے سامنے کائنات کا ٹھوس وجود تھا۔ مگر جب ایک عورت نے آنکھ کھولی تو اس کے سامنے ”ایک مرد تھا۔ عورت نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ مرد نے اُسے دیکھا اور کائنات کو اور خاموش ہو گیا۔“ واجد میں بھی اُسی پہلے مرد کی سی صفات ہیں اور وہ صبر کرے گا۔“ میں عسکری کی اس زہر آلود گفتگو کو وقتی طور پر نگل گئی۔ اور سب کے جانے کے بعد میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر گرم گرم سنہری قہوہ پیا۔ کوئل نے دُور فردوس کی اُس بہار کا نغمہ گایا جو دنیا پر اتر نہ سکی۔ اور میں نڈھال ہوگئی اُس دن میں نے پہلی بار غمناک حقیقت سے فرار پانے کو ریڈیو کا سہارا لیا۔ اور وہ حقیقت میری سمجھ میں آگئی کہ خالق نے روح کو بدن کے تابوت میں داخل کرتے وقت اُسے دلگداز موسیقی کیوں سنائی تھی

واقعی ہم موسیقی میں ڈوب کر ہر غم کو اٹھا لیتے ہیں۔ مگر فرخ آپا میرے رویے میں اب بھی آپ کے لئے کوئی فرق نہ آیا تھا۔ میں نے آپ کو نئے انتخاب پر اُسی طرح مبارک باد دی اور بڑے خلوص سے آپ کے مستقبل کی خوشگواری کے لئے دعا مانگی۔ ہاں، واجد بھیا کے خطوط بڑے سنجیدہ ہوگئے اور جس دن آپ شہنائیوں کے ساتھ نئے گھر جا رہی تھیں مجھے واجد بھیا کا ایک لفافہ ملا جس میں چند سوکھے پتے تھے میں نے اُن پتوں کو ایک کتاب میں بند کرکے کتابوں بھری الماری میں کتابوں کے پیچھے ڈال دیا تاکہ نظر نہ آسکے۔ اور پھر ایک دن جب چچی واجد بھیا کے لئے دلہن تلاش کر لائی تھیں، مہمانوں کے چلے جانے کے بعد۔۔

ثاقبہ نے پوچھا۔“ بنیا آخر فرخ آپا کو قیصر میں نظر کیا آگیا تھا؟ کیا عورت کپڑوں کے اسٹائل کی طرح اپنے احساسات بلکہ محبت کے نظریے بھی بدلتی رہتی ہے؟“

تو میں نے اس کے گال تھپتھپا کر کہا تھا... ”عورت کائنات کی بڑی اہم مخلوق ہے ثاقبہ پیاری! جب وہ پہلی بار کائنات میں آئی تو مرد کی تنہائی کا سہارا تھی مگر رفتہ رفتہ واقعات نے اسے مختلف روپ دیئے اور ہر روپ کی عورت میں فرق ہوگیا۔ ایسی عورت بھی ہے جس کا نظریہ کبھی نہیں بدلتا۔ وہ بھی عورت ہے جو محبوب سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ مگر جب اُسے حاصل نہیں کر پاتی تو اُسے یوں چاہتی ہے جیسے ماں ایک سرکش اور ضدی بچے کو جو اس کا نافرمان بھی ہو مگر اس کے جسم و جان کا ٹکڑا بھی۔ اور وہ عورت بھی ہے جو محبت نہیں کرتی، تعریف چاہتی ہے۔ ایسی عورتیں سانپوں کو گلے لگا لیتی ہیں۔ فرخ آپا بھی اگر ایسی ہوں تو حیرت کیوں ہو؟“

”سانپ کو؟“ ثاقبہ لرز کر میرے نزدیک آگئی اور ثمانہ نے ڈرتے ڈرتے اِدھر اُدھر دیکھا۔

”ہاں، اُسے سانپ ہی کہہ ڈالو۔“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”تم نے وہ مختصر افسانہ نہیں پڑھا۔ تم نے یقیناً نہیں پڑھا ہوگا ثاقبہ کیونکہ کتابیں پڑھنا تمہارے نزدیک ایک ذہنی اور جسمانی بیماری ہے۔ تمہیں وہ افسانہ سناؤں۔ جس میں اسی عورت کی بہترین کردار نگاری کی گئی ہے۔ شاید یونان کے کسی شہر کا ذکر ہے ایک حسین عورت کی خلوت گاہ میں ایک سانپ داخل ہوا۔ عورت کانپی، ڈری اور بولی۔“ اے اشرف المخلوقات کے دشمن! تم میری خلوت میں کیوں آئے۔ چلے جاؤ ورنہ“

سانپ نے پھن پھیلا کر کہا۔ "سنا ہے تمہاری خلوت میں بڑے بڑے عقلمند اور ارباب اقتدار محض تمہارے حسن کی ایک جھلک دیکھنے آتے ہیں۔ ملک کے ماہر موسیقار تمہارے تبسم کی ایک لہر سے اپنے آلاتِ موسیقی سے نئی دُھن تیار کرتے ہیں۔ دانائے راز تمہارے برق پاش حسن کے سہارے اپنے ذہن کو صحت بخشتے ہیں۔ تمہارے تبسم میں موسیقی کا خزانہ ہے۔ اور میں وہ موسیقی سننے آیا ہوں۔۔ اور عورت اپنے تعریفی کلمات میں محو یہ بھول گئی کہ سانپ اس کے نزدیک بڑھ رہا ہے۔ عورت پورے جوش سے مسکرائی اور سانپ نے اُسے ڈس لیا"! کمرے کے ذرے چلاتے رہے۔ "اے عورت! تیرے حسن و تبسم کی تعریف تیری سب سے بڑی کمزوری ہے"۔ ثاقبہ نے آنکھیں بند کر کے کہا "ہاں، عورت تعریف سے بہک جاتی ہے"!

"اگر فرخ بھی بہک گئی تو میں اسے معاف کرتی ہوں"! ثاقبہ نے بڑی فراخدلی سے کہا۔ مگر اس کی ماتھے کی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ آپ سے ہمیشہ نفرت کرے گی۔

زندگی بڑی تیزی سے گزر گئی۔ اور میں نے وقت کے پھڑپھڑاتے آنچلوں کو بڑی بے نیازی سے چھوڑ دیا۔ اور کہا۔ "اسے تیزی سے گزر جانا چاہئے۔" اور میں نے دودھ میں ابلی چھالیا چبا کر اور کہانی کہنے لگی جانوں کہانیوں میں میں۔ نے زندگی سے فرار چاہا تھا یا زندگی کے ساتھیوں کی حقیقتیں اگلی تھیں اور وہ لوگ جو میرے کرداروں کا عکس پہچان لیتے تھے وہ کہتے:

"بیٹیا زندگی کے ساتھیوں کو لوں بے نقاب مت کرو۔ کہ دنیا اِن سے نفرت کرنے لگے"۔ مگر میں نے ان آوازوں کو جھٹک کر پنسل کو باریک کیا اور لکھنے لگی۔ حالانکہ زندگی بڑی چپ چاپ گزر رہی تھی واجد بھیا جب آتے ہنستے مسکراتے اپنی بیوی کی تعریفیں کرتے، بچوں سے کھیلتے۔ مگر ایک دن سرما کی خوشگوار دوپہر میں نمکین چائے پیتے ہوئے تاش کے پتوں سے نظر ہٹا کر انہوں نے مجھے کہا "بیٹیا حقیقت زہر ہوتی ہے۔ اسے ہر کوئی نہیں نگلتا۔ تم جانتی ہو محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک محبت جو ہر روز اپنے محبوب سے خراج چاہتی ہے، وہ ہر روز زبان سے ادا ہوتی ہے اور آخر اس محبت کا سارا اثاثہ باتوں اور تعریفی تبادلوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری قسم محبت روح کی گہرائیوں میں لہراتا جذبہ ہے جو زبان سے اس لئے ادا نہیں کیا جاتا کہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ فرخ کی محبت زبان کا ولولہ تھا اور تبسم کا لمس۔ مگر میری زندگی کی اقدار محبت کی گہرائی۔ فرخ نے تعریف چاہی اُسے مل گئی میں نے زندگی سے محبت کی اور اُسے پا لیا"۔

مگر فرخ آپا، اس رات میں نے نہ تو رمی کی بازی لگائی نہ نماز پڑھی اور دیر تک سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے کیڑوں کی کراہیں سنتی رہی۔ میرے ہاتھ کے یہ سوکھے پتے لرز رہے ہیں۔ جانتی ہیں آپ یہ کونسے پتے ہیں؟ اگر زندگی کی کھوکھلی اقدار نے آپ کے ذہن سے ماضی کو کھرچ نہیں ڈالا تو آپ کو یاد ہو گا، جن دنوں مجھے پتے سکھانے کا جنون سا تھا، آپ نے امتحان کی کامیابی پر مجھ سے ولیسا، دجار مانگا تھا میں نے جار نہیں دیا بلکہ مٹی کے کونڈے کو نیلا رنگ کیا۔ اس میں پانی چھوڑ کر ننھے منے تازہ پھول ڈال کر آپ کی میز پر رکھ دیا۔ اس میں واجد بھیا کے رنگے ہوئے چند پتے بھی تھے۔ آپ اس نیلے کونڈے کو بڑی دیر تک نیلی جھیل کہا کرتیں۔ اس کا پانی بدل کر ہر روز اس میں تازہ پھول ڈالتیں۔ مگر پتے نکال کر اس پر آپ نے اپنے جذبات لکھ کر واجد بھیا کو دیئے تھے۔ جس دن ملازمت کے لئے وہ باہر چلے گئے۔ اور واجد بھیا نے اُس دن مجھے دیئے جس دن آپ ان کی کائنات سے نکل گئیں۔ ان پتوں پر لکھا ہے:

" زندگی۔ دل، محبت اور احساسِ محبت کا نام ہے۔ میرے سینے میں دل بھی ہے اور محبت بھی اور بخدا میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں نے محبت کی۔ مجھ سے محبت کی گئی اور یہ محبت میرے سینے میں یوں محفوظ ہے جیسے میری تحریر اِن پتوں پر۔۔۔ میری محبت اس چاند کی مانند ہے جو ہر دم ابھرتا ہے"۔

اُف یہ سب زندگی کی ٹھوس حقیقتیں مجھے اِن کتابوں سے بھی جھانک رہی ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اردگرد یہ کتابیں نہیں بلکہ آپ لوگوں کی داستانیں ہیں اور میں ان پر زہر آلود کہانیاں لکھتی ہوں میں یہ بھی محسوس کر رہی ہوں جیسے میں کوئل ہوں، میرے اردگرد عورت کی غلطی نے ساری رعنائی کو مرجھا دیا ہے اور میں ان مرجھائی ہوئی بہاروں پر بیٹھ کر مرثیے گا رہی ہوں۔ مگر دیکھنا ذرا فاصلے پر کوئل بھی المیہ راگ گانے لگی ہے۔ وہ میری طرح اُن بہاروں پر آنسو بھرے گیت گا رہی ہے جو آنہ سکیں کوئل کے سینے میں راز ہے اور درد۔ سوکھے پتوں پر لکھا ہوا راز ہے اور زندگی کی حقیقت۔ خود میرے پاس ماضی کی داستانیں ہیں۔ درد اور محبت۔ مگر ہماری زبان میں فرق ہے۔ شاید انہیں کوئی نہ سمجھ پائے۔ مگر مجھے کوئل کی یہ درد بھری موسیقی سننے دو۔ اُف ہم تینوں ایک ہیں۔ کوئل، میں اور یہ سوکھے پتے! ✣

علاقائی ادب:

عبدالقادر خٹک

یونس سیٹھی

مغربی پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کو قدرت نے ہر نعمت اور دولت سے سرفراز کیا ہے۔ دلکش و دلفریب وادیاں اور برف پوش فلک بوس پہاڑ، بل کھاتی اٹھلاتی برفانی ندیاں اور تند و تیز دریا۔ سرسبز و شاداب چمن زار اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے چٹیل میدان غرض ایک طرف حسن فطرت قدم قدم پر دعوت نظارہ دیتا ہے تو دوسری جانب فضاؤں میں "یا قربان" کی گونجتی ہوئی دلنشیں صدائیں اس خطے کو فردوس گوش بنا دیتی ہیں۔ ایسی سنگلاخ مگر رومان پرور سرزمین نے جنگجو سپاہی بھی پیدا کئے اور جفاکش مجاہد بھی۔ نامور صوفیا کو بھی جنم دیا اور عالی مرتبہ شعرا کو بھی۔ جنہوں نے اپنے کمال و کلام سے عوام کے دلوں کو مسخر بھی کیا اور مسحور بھی۔ انہی عظیم مذکروں میں عبدالقادر خٹک کا بھی شمار ہوتا ہے جو پشتو کے مشہور و معروف شاعر خوشحال خاں خٹک کے صاحبزادے تھے۔ آپ ۱۵۶۲ء میں اکوڑہ خٹک کے مقام پر پیدا ہوئے۔ خٹک قبیلہ میں خوشحال کی شاعری کے بعد انہی کے کلام کو قبول عام حاصل ہوا۔

سرحد کے اس جیالے فنکار کو اوائل عمر سے ہی شعر و شاعری سے رغبت تھی۔ ان کا وقت اگرچہ ادبی سرگرمیوں میں ہی صرف ہوتا تھا تاہم آپ اپنے آبائی فن سپہ گری سے بے بہرہ نہ تھے۔

اس مختصر سے مضمون میں عبدالقادر خاں کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ تو نہیں کیا جا سکتا پھر بھی ان کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قارئین کو پشتو کے اس بلند پایہ شاعر کا انداز فکر معلوم ہو سکے۔

بعض محققین نے آپ کے دواوین کی تعداد ۶۰ تک بتائی ہے لیکن آپ کی ان تصانیف میں سے جو چھپ چکی ہیں اور دستیاب ہو سکتی ہیں چند یہ ہیں۔ مثلاً

"دَ اشعار و دیوان": جس میں مختلف موضوعات و عنوانات پر تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار ہیں۔

"گلدستہ": عبدالقادر خاں کا یہ دیوان شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی مشہور تصنیف "گلستاں" کا پشتو میں نہایت موثر ترجمہ ہے۔

"نصیحت نامہ": یہ کتاب مثنوی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

"خلو پسنبت"۔ یہ مجموعہ پانچ سو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔

"آدم خان درخوانئی": وادی سوات کے مشہور و معروف عوامی رومان کو اس کتاب میں نظم کیا گیا ہے۔

"یوسف زلیخا": تقریباً ساڑھے چار ہزار اشعار میں حضرت یوسفؑ کے واقعہ کا منظوم بیان ہے۔

ان چند تصنیفات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عبدالقادر خاں نے تقریباً ہر موضوع پر اپنا زور طبع صرف کیا ہے۔ آپ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شعر میں تخیل کی بلند پروازی، اور اسلوب بیان میں نیاپن ہونے کے باوجود زبان بڑی آسان اور انداز حد درجہ مؤثر و دلنشیں ہے۔ آپ کے اشعار میں حسن و عشق اور ہجر و وصال کے جذبات کے ساتھ ساتھ صوفیانہ نکات اور قومی احساسات کو بھی قاری جابجا محسوس کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اگر کہیں موسم کی رنگینیوں سے متاثر ہوئے ہیں تو بے ثباتی عالم سے بھی ان کی نگاہ حقیقت شناس نے اغماض نہیں کیا۔ جہاں انہوں نے زندگی میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کا راز آشکار کیا ہے وہاں انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ انسان کا منصب کیا ہے اور وہ کیسے صحیح انسان بنے۔ غرض وہ نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ مصلح وقت بھی تھے۔ انہوں نے

شاعری کو ملی فلاح و تعمیر کے لئے اپنے ایک وسیلے کے طور پر برتا ہے۔ نہ اس وسیلہ سے نوعِ انساں کو وحدتِ فکر و عمل پاکیزگیٔ گفتار اور بلندیٔ کردار کی عملی راہیں سمجھائی ہیں۔

عبدالقادر خاں چونکہ خود ایک بہادر شجیع سپاہی بھی تھے اس لئے مستقل مزاج۔ جواں ہمت اور قربانی و ایثار کے جذبات رکھنے والے انسان کو بھی پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ اس جذبہ کا اظہار یوں ہوا ہے:

رہتی ہے اسی مردِ جواں حوصلہ کی یاد — جو شمع صفت جل کے کرے محفلیں آباد

ہر چند کہ خود اس کی قبا خون میں تر ہو — ہنس ہنس کے گزاروں کے دل کو کرتا ہے شاد

اور اس طرح عبدالقادر خاں جہاں اپنی قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں قربانی و ایثار کے جذبات ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں یہ بھی نہیں بھولتے کہ ظلم و تعدی ایک بہت بڑی اخلاقی کمزوری ہے کیونکہ ظالم جب ظلم کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اسے خیر و شر اور اپنے پرائے کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ چنانچہ وہ افرادِ ملت کی توجہ اس معاشرتی برائی کی طرف یوں مبذول کراتے ہیں:

شیوہ ہے ترا دل ہی دکھانا تو ستمگر — اس زیست سے جب درجہ تجھے موت ہے بہتر

کب تک یونہی بھڑکیں گے ترے ظلم کے شعلے — پھونکے گی یہی آگ کسی روز ترا گھر

اور اپنے اشعار کے ذریعے عبدالقادر خاں قوم کو سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل کا پیغام بھی دیتے ہیں اور دلیری و جفاکشی کا درس بھی فرماتے ہیں:

بے تگ و دو کامیابی کس کو ہوتی ہے نصیب — حاصلِ مقصد کی خاطر جہدِ پیہم چاہیئے

شمشیر جس کی خون میں رقصاں رہے وہی — میدانِ کارزار سے آتا ہے سرخرو

عبدالقادر خاں نے اپنے اشعار سے ہمیشہ افرادِ ملت میں صحیح اسلامی روح بیدار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جہاں قوم کو جہد و عزم کی ترغیب دی ہے وہاں وہ حلم و رواداری کے عظیم اسلامی درس کو بھی نہیں بھولے:

برائی کرتے ہیں جو ان سے نیکی کرتا ہوں — اسی لئے تو ہر اک دل میں میں سمایا ہوں

نہیں ہے خوف مجھے ان کا جو ہیں آتش خو — کہ میں مزاج میں مانند آب ٹھنڈا ہوں

ہیں نور و نار مرے ہی لئے کسی کو کیا — مجھے خبر ہے میں پروانہ وار جلتا ہوں

نہیں گلہ مجھے غیروں سے کچھ بھی اے قادر — کہ اپنے قلب و نظر کے سبب میں رسوا ہوں

"گلدستہ" میں حرص و آز کو چھوڑ کر انسانوں کو تھوڑے پر قناعت کرنے کی تلقین ایک جگہ یوں ملتی ہے اور اس زمانہ میں بھی کس قدر اچھی مثال و تلقین ہے:

جب قطرۂ حقیر پہ قانع ہوا صدف — شہرت ہوئی گہر کی زمانے میں ہر طرف

چند ایک استخواں پہ جو قانع ہوا ہما — دنیا کے ہر پرند پہ حاصل کیا شرف

ہمیں عبدالقادر خاں کے کلام میں جہاں اس قسم کے تعمیری اشعار نظر آتے ہیں وہاں حسن و عشق کی چاشنی سے لبریز ہجر و وصال کے غم اور شادمانی کی جھلکیاں موسمی رنگینیوں اور ماحول کی کیف آفرینیوں کے احساسات بھی وافر نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ملاحظے کے لائق ہیں۔ مثلاً ابر و باد و باراں کی کیفیتوں سے متاثر ہو کر آپ نے اپنے دلکش و دلنشیں ماحول کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

بوندوں کی یہ رم جھم یہ طرب خیز فضائیں — ہم رقص ہیں گلزار میں پھول اور ہوائیں

ہر رنگ کا سامانِ مسرت ہے میسر — کب دیکھئے ساقی کے قدم رقص میں آئیں

اس قسم کے اشعار کے ساتھ ساتھ عبدالقادر خاں کے کلام میں ہمیں بیشمار غزلیں اور نظمیں ایسی بھی ملیں گی جن میں تصوف و عرفان کے سرمدی جذبات کو نہایت خوش اسلوبی سے سمویا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس غزل میں آپ نے وحدت الوجود کی گتھیوں کو یوں

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

''تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں'' - اور یہ تیغوں ہی کا سایہ تھا جس میں ۱۰ - جنوری کو تمام پاکستان کے عوام نے اپنے فوجی بھائیوں کے ساتھ مل کر یوم افواج پاکستان منایا - اور اسطرح ہماری تاریخ میں ایک اور یادگار دن کا اضافہ ہوا -

بعض رشتے عزیز ہوتے ہیں اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے وہ اور بھی عزیز ہوتے جاتے ہیں - کچھ ایسا ہی جذباتی و رومانوی رشتہ جمہور پاکستان اور ان پاسبانان قوم کے مابین بھی ہے جنھیں ہم پاکستان کی مسلح افواج کے نام سے یاد کرتے ہیں - بلاشبہ یہ رشتہ ایسا ہے جو مضبوط و مستحکم ہوتے ہوئے روز بروز خوشگوار سے خوشگوارتر ہوتا چلا جا رہا ہے - اور دور دور پھیلی ہوئی فضائیں ہوں یا زمین کی بے پایاں وسعتیں یا سمندروں کا پھیلائے بے کراں ، ہمیں ان پاسبانان قوم ہی کی جولاں گاہیں دکھائی دیتی ہیں جو اپنے اپنے طور پر شب و روز جمہور کے تحفظ کا مقدس فرض سرانجام دینے میں مشغول ہیں - یہ وہ پاسبانان ملت ہیں جن کی یاد ہمارے دلوں سے کبھی محو نہیں ہو سکتی - اور فضائیہ ہو یا بحریہ یا بری افواج ہم ان میں خلوص و صداقت کے وہ مظاہر پاتے ہیں جو ناموس قومی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دفاع قوم و ملت کا دشوارترین فرض بھی انجام دیتے ہیں -

یہ حقیقت ہے کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے افواج پاکستان ہی اس کا واحد صالح عنصر رہا ہے - جو قوم کے لئے سرمایۂ افتخار ہے - ان افواج کا دل حب وطن اور ملک و قوم کی بےلوث خدمت کے جذبہ سے سرشار رہا ہے اور ان کا دامن کبھی ان کثافتوں سے آلودہ نہیں ہوا جو ہمارے خودغرض اور بددیانت سیاست‌دانوں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن کر نمایاں ہوئیں - ہم میں سے کس کو وہ وقت یاد نہیں - ہماری قومی زندگی کا سب سے نازک وقت - جب کہ پاکستان قائم ہوا اور آفات و

مصائب کے ہجوم نے ہمیں چاروں طرف سے اسطرح گھیر لیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا نحوست واقعی پس و پیش منڈلا رہی ہے - اور ہماری اس نوزائیدہ مملکت کا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے - اس وقت بھی اگر ہماری نگاہیں کسی کی طرف اٹھتی تھیں تو وہ یہی قوم کا صالح تریں ، جری اور بے باک عنصر تھا جس نے کبھی کسی سے شکست کھانا نہیں سیکھا تھا - جو حقیقتاً ہمارا بازوئے شمشیرزن تھا اور اس نے شدید تریں مصائب اور یاس و نا امیدی کے عالم میں بھی اپنی بےباکی و بلند حوصلگی کا ثبوت دیتے ہوئے مخالف عناصر کو شکست فاش دی - یقیناً ہمارے وطن اور ہماری قوم کی سلامتی اس نازک تریں زمانے میں بھی افواج پاکستان ھی کی رھین منت تھی -

اس کے بعد ایک سکوت کا دور ، بہت ھی صبرآزما دور آیا جس میں خود غرض اور بددیانت سیاستداں منمانی کرتے رہے اور عوام کو ان کے جائز حق سے محروم رکھتے ہوئے برابر اپنے ھی جاہ و اقتدار کا سامان کرتے رہے، اپنے ھی عیش دوام کےسنہری محل تعمیر کرنے میں مشغول رہے - یہ ہماری تاریخ کا ایک نہایت ھی تاریک اور پرآشوب دور تھا - جو ہمیں آھستہ آھستہ تباھی و بربادی کے مہیب غار کی طرف لے گیا اور کچھ عجب نہ تھا کہ اگر رحمت حق بروقت جوش میں نہ آتی تو ہماری نوزائیدہ مملکت اس اندھیرے غار میں ھمیشہ کیلئے گم ھو جاتی - اس دوران میں ہماری افواج برابر اپنے اندرونی نظم و نسق اور مضبوطی و استحکام ھی میں منہمک رھیں - ان کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا - وطن عزیز اور قوم شکستہ حال کا دفاع - فضائی، بحری اور بری افواج اپنے آپ کو ساز و سامان سے لیس کر کے زیادہ سے زیادہ مضبوط بناتی رھیں تاکہ اگر ، خدا نہ خواستہ ، قوم پر کوئی بہت برا وقت آ جائے تو اسکے توانا، پرخلوص اور کارآزمودہ بازو آگے بڑھ کو اسے سنبھال لیں - ملک میں خودغرض اور وطن‌دشمن تخریبی عناصر جو کھیل کھیل رہے تھے وہ انہیں بخوبی معلوم تھا - لیکن انہوں نے اس ہتیار کو تیار کرنے ھی پر توجہ موکوز رکھی جسے وقت پر قوم کی حفاظت کے لئے کام میں آنا تھا - "ٹائیبنی" کے الفاظ میں انہوں نے اتنا عرصہ عزلت‌گزینی اختیار کئے رکھی اور اندر ھی اندر اپنی صلاحیتوں کو جلا دیتی رھیں - تا آنکہ حالات زمانہ انہیں یہ دعوت نہ دیں کہ :

تو شمشیری ز کام خود بروں آ
بروں آ از نیام خود بروں آ

ہماری افواج کو ، جس کے عوام و خواص ، سب نے حکیم ملت‌رح ھی کے ارشادات اور تعلیمات سے

کسب فیض کرتے ہوئے ذہنی نمو حاصل کی تھی ان کا یہ سبق خوب یاد رکھا تھا کہ :

بانشہٗ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اور یہ نشہٗ درویشی محض چلہ کشی یا مراقبہ نشینی نہ تھی بلکہ چپکے ہی چپکے جمعیت پیدا کرنا تھا جو ہماری افواج کو وقت آنے پر اپنی غیر معمولی توانائی کے ثبوت کا موقع دے۔

ملت کے پاسبان قوم کی زبوں حالی، انسانی اقدار کی پائمالی اور مذہب کی رسوائی کا افسوسناک منظر دیکھتے رہے۔ اور یہ احساس ان کے دل میں خلش کرتا رہا کہ قوم برابر قعر مذلت میں غرق ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور قوم کے دشمن ہی اسکے سیاہ و سفید کے مالک و مختار بنے بیٹھے ہیں - لیکن تا بکے! آخر ان کا پیمانہٗ صبر لبریز ہوگیا اور پھر چشم زمانہ نے دیکھا کہ :

ہوئے احرار مات جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی

پاسبانان ملت نے بےحد جرأت کے ساتھ فیصلہ کن قدم اٹھایا اور ۲۷ - اکتوبر کو وہ انقلاب عظیم پیدا کیا جس سے ہماری تاریخ میں ایک نئے، مہتم بالشان دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور ہماری حیات ملیہ ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہوتی ہے - در اصل یہ محض انقلاب نہ تھا - یہ ہماری قوم کو حیات تازہ کی نوید تھا - اور اس آزادی سے روشناس کرانے کی تازہ کوشش جس سے وہ غاصب عناصر کے ہاتھوں محروم ہوچکی تھی - اس عہد آفریں واقعہ کے بعد افواج پاکستان سے جو کارہائے نمایاں صادر ہوئے ان کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے - یہ ہماری تاریخ ملت کا ایک حیرت انگیز باب ہیں اور ایسی خاموش فتوحات پر مشتمل جن کا سلسلہ ایک سیل بےزنہار کی طرح برابر جاری ہے - فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور ان کے اولوالعزم رفقائے کار کی زیر قیادت افواج پاکستان انقلاب آفرینی کے جذبہٗ بےاختیار سے اس طرح سرشار ہیں کہ انہوں نے نہ صرف قومی مفاسد کو ملیامیٹ کر دیا ہے بلکہ تمام نظام حیات ہی کو بدل ڈالا ہے - اور یہ ذوق و شوق کسی سرسری جذبہٗ عمل یا توانائی کی ہنگامی رو کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مستقل و مسلسل احساس کا نتیجہ ہے - جس کا والہانہ پن آئندہ زیادہ مہتم بالشان کارناموں کی خبر دیتا ہے -

اس عمل تطہیر کے بعد جس نے تمام نظام زندگی کو تندرست و توانا بنا دیا اور ملک میں صحیح فضا پیدا کردی، اگلا نہایت اہم اقدام یہی تھا کہ عوام کو ان کا حق دلایا جائے اور انکی اپنی منتخب کی ہوئی نمائندہ حکومت قائم کی جائے جو بقول صدر پاکستان ہمارے قومی مزاج اور ملکی آب و ہوا سے مطابقت رکھتی ہو- اسکی صحیح شکل ,,بنیادی جمہوریتوں،، ہی میں دکھائی دیتی ہے- جنکا پاکستان بھر میں اہتمام کیا گیا - اور اب نمائندہ حکومت کے قیام کے بعد مناسب دستور کی تشکیل ہی واحد معاملہ رہ گیا ہے جس پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے -

اس وقت جب ملک بھر میں انتخابات ختم ہو چکے ہیں اور بنیادی جمہوریتیں عملی طور پر وجود میں آ چکی ہیں، نیز انقلابی حکومت نے زندگی کے ہر شعبہ میں بنیادی اور نہایت دوررس قسم کی اصلاحات صادر کر کے تمام بڑے بڑے معرکے سر کر لئے ہیں، یہ برمحل موقع تھا کہ افواج پاکستان، جنہوں نے اپنی ساری جد و جہد قومی خدمت اور جمہور کو بر سر اقتدار لانے کیلئے صرف کردی انکو اپنے ان محبوب عوام سے قریب تر لایا جائے - چنانچہ ۲۱ - جنوری کو جو "یوم افواج پاکستان" منایا گیا اس میں در حقیقت یہی احساس کارفرما تھا - افواج نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ ان کیلئے صرف اس وجہ سے مایۂ افتخار ہیں کہ ان کے ذریعہ ہی عوام کو ان کا حق، ان کی برتری، حاصل ہوئی - ان حالات میں خود عوام ان کو کیسے فراموش کر سکتے تھے - وہ کیسے بھول سکتے تھے کہ ان کی افواج نے انہیں کیا کچھ دیا ہے - ان کے دل میں کیسے از خود یہ امنگ نہ پیدا ہوتی کہ وہ پاسبانان ملت سے ملیں، ان کو قریب سے دیکھیں اور یہ اندازہ لگائیں کہ وہ ان کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں کیسے کر رہے ہیں - کس ذوق و شوق اور ولولہ و آہنگ سے کر رہے ہیں - اور کس ساز و سامان کے ساتھ، کیسے کیسے سربراہوں کی زیر قیادت -

لہذا "یوم افواج پاکستان" کا خیال بہت عمدہ اور بہت بروقت خیال تھا - اس نے پاکستانی عوام - چھوٹوں، بڑوں، سب کو اپنے حفاظت کرنے والوں سے ملنے اور اپنے اندر ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ پیدا کرنے کا موقع دیا - عوام مہمان تھے اور فضائی، بحری اور بری افواج ان کی میزبان - دونوں میں یکساں گرمجوشی تھی - جس سے باہمی اعتماد اور محبت کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھ چکا ہے، اور بھی نتیجہ خیز ثابت ہو رہا ہے۔

وہ دن، اسکی چہل پہل، اسکی ہماہمی اور اسکی خوشگوار فضا ہمیشہ یاد رہے گی جب کہ عوام اور فوج ایک دوسرے سے گلے ملے — ادھر مشرقی پاکستان کے گوشے گوشے میں اور ادھر مغربی پاکستان کے ہر حصے میں - ڈھاکہ ہو یا کراچی، پشاور ہو یا راولپنڈی، حیدرآباد ہو یا لاہور ہر کہیں ذوق و شوق اور تپاک کا ایک ہی عالم تھا - جیسے تمام شہروں میں جان پڑ گئی ہو، ان کے رگ و پے میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑ گئی ہو - کراچی میں رہنے والوں نے کراچی سے لیکر ڈرگ روڈ تک کیا کیا ہنگامے مشاہدہ نہیں کئے - گویا یہ بھی عید کا دن تھا - ایک خاص قومی عید کا دن - اور یہ اس لئے اور بھی باعث مسرت ہے کہ عوام اور پاسبانان ملت کی باہمی محبت و یگانگت خود پاکستان کے لئے ایک فال نیک ہے - اور ہم اس میں ایک شاندار مستقبل کے کتنے ہی خوش آئند آثار پاتے ہیں۔

عوام زندہ باد!

افواج پاکستان زندہ باد!

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان زندہ باد!

پاکستان زندہ باد!

[illegible] نصیب میں یہ صدی، یہ دنیا، تجربوں کی برق
رفتار [illegible] ہو گیا ہے [illegible]
کی توقع [illegible] تیار بیٹھے رہتے ہیں! —
"بلکہ ہیئتیں [illegible] تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ادب میں بھی
اگر کوئی "نیا دھماکہ" ہو جائے تو اس کی تقدیم میں لبیک لبیک کہنے لگتے ہیں
— مگر جہاں تک نقش گری [illegible] ہم فن کی [illegible] روح اور
اور اس کے اظہار کے نمونوں پر کچھا [illegible] کی طرف ہی لوٹتے رہتے ہیں بلکہ نئی
ہیئتوں کے ساتھ اپنے ادراک اور فہم کو "ہم آہنگ" کرنے میں متامل
رہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دور عصر کے ان پیکروں کو قبول
کرنے میں یہ ہچکچاہٹ کیوں ہوتی ہے۔

علوم مادی و معاشرتی کے معاملے میں تو ہمارا عالم یہ رہتا ہے
کہ معلوم و معروف تصورات و عقائد اگر نئی دریافتوں اور نظریوں کے
باعث منہدم ہو جائیں تو دیر یا بہ جلد، ہم اپنے آپ کو ان سے متفق
کر ہی لیتے ہیں بلکہ آنکھ موند کر [illegible] ڈالنے پر مجبور رہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی تخلیقی
فنکار حقائق اشیاء کا نیا ادراک نئے زاویوں سے ہمارے سامنے لیکر
آئے اور اس کی تعبیرات کچھ چونکا دینے والی ہوں، اسلوب میں تیکھا پن
ہو تو ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تو لوگوں کو "بنانے" کی کوشش ہے اور بالکل
کھلی ہوئی۔ ہم اس "ہتھکنڈے" کو خوب سمجھتے ہیں اور اس طرح "بے وقوف"
بننے کے لئے تیار نہیں!

حمید الرحمن کو بھی اس مسئلے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ مشرقی
پاکستان کے اس مرنجاں مرنج، نرم گفتار اور کم سخن مصور سے اکثر یہ سوال
کیا گیا ہے کہ آپ آخر بناتے کیا ہیں؟ بلکہ بعض مربی و ہمدرد قسم کے بزرگ
تو اسے یہی سمجھاتے ہیں کہ تم ایسے نقوش کیوں بناتے ہو جن سے
ذہن کو دھچکا لگتا ہے اور ڈراؤنے خواب کی سی کیفیت قلب و نظر پر
مرتسم ہو جاتی ہے۔ تم مناظر قدرت یا خوش نظر بنانے پر خوب قادر ہو،
اچھے اچھے حسین مناظر اور فردوسی چہروں کو آخر کیوں کینوس پر منتقل
نہیں کرتے؟

اپنی یہ تعریف سنکر مصور خوش تو ہو جاتا ہے مگر بہکتا نہیں۔
اس تعریف سے اس کا اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ لوگ اس کی بات کو
پا نہیں سکے۔ وہ بڑی ملائمت سے کہا کرتا ہے کہ فن میں صرف
"شیرینی" اور "تناسب" کا ہی جوہر نہیں ہونا چاہئے۔ فن میں
ہوتا یہ ہے کہ آپ کی نظر ان چیزوں پر جم [illegible] ہیں جنہیں آپ پہلے ہی سے
جانتے ہیں [illegible] ہم اپنی آگاہی اور وجدان کی
سرحدوں کو دور آگے بڑھائیں اور پھر آرٹ میں آپ وہ چیز پائیں
جسے آپ پہلے سے نہ جانتے تھے"!

"بہرکیف یہ تو واقعہ ہے کہ فن عرصۂ حیات کی جادہ پیمائی ہے
اور آپ کے قدم جتنی بھی نئی راہوں پر چل سکیں نئی منزلیں پاتے جائیں گے"
شرح و انکشاف کا نتیجہ علم و دانش کی دنیا میں کاوش کا ہی تقاضہ کرتا ہے
اور جب ادراک معانی ہو جائے تو وہ خود اپنا انعام ہوتا ہے۔
حمید کہا کرتا ہے کہ "ہمارے ملک میں کوئی سو سال سے نرم و نازک
پٹی ہوئی سی جذباتی مصوری تو ہو ہی رہی ہے مگر اب وقت آگیا ہے
کہ اس میں قوت، شوکت اور توانائی لائی جائے۔ اب ہم جو لوگ
نئے اوضاع سے کام لے رہے ہیں، نئے موضوع اور نیا اظہار
کینوس پر لا رہے ہیں وہ صرف اپنے پیکروں کو کسی نہ کسی طرح منتقل
کر دینے کا عمل نہیں ہے بلکہ ہم نئی نئی ہیئتوں کے صنم تراش رہے ہیں
اور ان کا سمجھنا آپ کا تعاون چاہتا ہے"۔

تلخی یا چڑچڑے پن کا شائبہ قطعی نہیں ہوتا مگر وہ مضبوط
لہجے میں یہ ضرور کہتا ہے کہ "آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں اس طرح کے
نقش کیوں بناتا ہوں۔ کیا مجھے قدرت نے وہ بصیرت نہیں دی ہے
کہ میں بنگال کے دریاؤں اور کشتیوں کو ان پہلوؤں سے دیکھ سکوں
جو ان کا "صحیح" روپ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ "صحیح" روپ
کیا ہے؟ کسی شے کا صحیح روپ دیکھنے کے لئے ہم سب کو ہی کئی
چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سب سے بڑی چیز بصیرت کا
وہ شعلہ ہے جو "ذوقِ تماشا" کو صحیح راستہ پر گامزن رکھتا ہے
اور ذہن و فکر کو کام میں لانے کی وہ سعی بلیغ جس کے بغیر آپ کسی بھی
فن پارے کی قدر تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لئے کاوش اور کچھ
تجربہ ناظر کے لئے از حد ضروری ہے"۔

اگر کسی جدید سائنسداں، فلسفی (اور غالباً ناول نگار)
نے بھی یہ بات کہی ہوتی تو ہم دوڑ کر اس کی پذیرائی کرتے اور پھر
اسے مان بھی جاتے لیکن اب جبکہ یہی بات کسی فنکار کے لبوں سے
ٹپکی ہے تو ہم ساکت کھڑے منہ تکتے رہتے ہیں بلکہ مذبذب اور
مشکوک سے رہتے ہیں کہ یہ کیا بات بنی —؟ ہم تو بحث کو یہاں تک

طول دیتے ہیں کہ نقوش اور صورت گری سے اگر تسکین ملے جائے حاصل نہ ہو تو پھر کوئی بات ہی نہیں بنی۔ اسے بہر طور خوش آئند ہونا چاہیئے نہ کہ ذہن کو الجھا دینے اور منتشر کر دینے کا نتیجہ برآمد ہو اور ہمارا ذہن مجہول ہو کر رہ جائے۔

گفتگو اگر اس نہج پر چل نکلے تو حبیب بڑی معذرت کے ساتھ عرض کرے گا:

"مجھے اس کا تو علم نہیں کہ دوسرے جدید فنکار اپنی صفائی میں کیا کہا کرتے ہیں، مگر جہاں تک میری اپنی فہم کا تعلق ہے میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فن اب بھی حیات کے ایک "خود جوش ردِ عمل" کا ہی نام ہے —— حیات بڑی پیچیدہ چیز ہے اور اس قدر گوناگوں کہ ہم کو ہر وقت اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ کون کس طرح منزل تک پہنچا اور اظہار تاثر کے لئے اس نے کیا نیا میدان سر کیا بلکہ جہاں ہم نئے فنکار بھی نہ پہنچ سکیں ناظر خود مضمرات کے پردے چاک کر سکے اور ادراکِ معانی کا معرکہ سر کر لے۔"

وہ کہتا ہے: "اس سے ایک بات تو صاف ہو گئی کہ ہم جدیدئین نہ تو دانستہ "تجریدی" بننے کی کوشش کرتے ہیں نہ حقائق کی طرف سے نظریں ہی چراتے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم کو جو شے جیسی بھی نظر آتی ہے اسے اپنے تصور اور اپنی ہئیت و لہجہ میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے اگر اصطلاحی تعریف کا دائرہ ذرا آگے بڑھائیں تو ہمارے کاموں کی روح تک پہنچنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ گفتارِ عصر ہے۔ اس زبان کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔"

یہ "گفتارِ عصر" اس بیسویں صدی کی "لسانِ فن" ہے —— اس سے زیادہ بلیغ تعریف شاید ممکن نہ ہو کیونکہ اس عہد کے فن کو اسی عہد کے اظہار کی ضرورت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی ایک مصور و نقاش کے کام کو تاثر انگیز یا پردہ کشائے حقیقت نہ بھی پائیں مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ ایسے نقوشِ پا کی رہنمائی میں ہم کئی نئی منزلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ (ترجمہ: ظفر قریشی)

باب مراسلات:

"ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب، رکن عبدالحق اکیڈمی، اردو کالج، اردو روڈ کراچی تحریر فرماتے ہیں:

بابائے اردو کی تصویریں، تحریریں اور مکاتیب۔

عبدالحق اکیڈمی کی طرف سے مئی ۱۹۶۰ء میں بابائے اردو کا نوّد (۹۰) سالہ یوم پیدائش بڑے اہتمام سے منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر دوسری بہت سی تقریبات کے ساتھ ایک علمی نمائش بھی منعقد کی جائیگی جس کا ایک شعبہ بابائے اردو کی ذات گرامی سے متعلق ہوگا۔ اس میں بابائے اردو کی تصویریں اور تحریریں رکھی جائیں گی۔ جن حضرات کے پاس مولوی صاحب قبلہ کی تصویریں اور تحریریں ہوں وہ مندرجہ بالا پتہ پر بھجوا دیں۔ نمائش کے بعد یہ اشیا پوری حفاظت کے ساتھ متعلقہ حضرات کو واپس کر دی جائیں گی۔ اس موقع پر مولوی صاحب کے مکاتیب کا مجموعہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ میں ان تمام حضرات سے جن کے پاس مولوی صاحب قبلہ کے خطوط ہیں، درخواست کرتا ہوں کہ وہ یہ خطوط یا ان کی نقلیں مجھے ارسال کر دیں۔ اصل خطوط کی صورت میں نقلیں رکھ کر خطوط فوراً واپس کر دیے جائیں گے۔"

نقد و نظر

وادیٔ سندھ کی تہذیب

از: محمد ادریس صدیقی
(محکمۂ آثارِ قدیمہ پاکستان)

صفحات: (۲۸۰)

طباعت: نسخ اردو ٹائپ

قیمت: ۸/۸ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبۂ نیا راہی۔ کراچی ۵

ادریس صدیقی صاحب نے یہ کتاب بڑے ذوق و شوق کے ساتھ تلاش و تحقیق کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے لکھی ہے ــــ اس کے بعض حصے کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہونے سے پہلے "ماہ نو" میں شائع ہوئے۔ موئنجو دارو اور ہڑپہ یعنی آج کل کے پاکستان کی سرزمین کی ثقافت کا پہلا گہوارہ جو پانچ ہزار سال پرانا ہے، کی تہذیبیں اب محققین و ماہرین آثار کاوی کی کوششوں سے منظرِ عام پر آچکی ہیں اور ان گمنام بستیوں کی داستان پاستان پر سے صدیوں پرانی گرد و غبار کی تہیں ہٹ چکی ہیں ــــ ایسے علمی اور تحقیقی موضوعات پر کتابوں کی بڑی کمی ہے، بالخصوص قدیم ثقافت اور آثارِ باقیہ کے ادب پر تو شاید "آثار الصنادید"۔ "واقعات دارالحکومت دہلی" اور "غرابت نگار" کے علاوہ چند ہی کتابوں کا ذکر مناسب سمجھا جائے۔ صدیقی صاحب کی یہ کتاب بلا تامل آثاری ادب کے اُن چند بڑے نمونوں کے ہمدوش رکھی جا سکتی ہے۔ مصنف کی یہ کتاب کئی سال کی کاوش کا نتیجہ اور مطالعہ و تحقیق کا نچوڑ ہے۔ ہڑپہ موئنجو دارو اور دیگر نواحی بستیوں کے رہن سہن اور تہذیب و تمدن کی داستان ایک سیرِ گذراں کے طور پر سامنے آتی چلی جاتی ہے جو بیان کی دلکشی اور روانی کا نتیجہ ہے۔ رسم الخط کے باب میں بہت سے پہلو زیادہ بسیط گفتگو کے متقاضی تھے۔ بالخصوص مولانا ابوالجلال ندوی نے اپنی تحقیق اور قرأت رسم الخط کے نتائج کو جن شواہد اور دلائل کے ساتھ "ماہِ نو" کے صفحات میں پیش کیا ہے وہ آسانی کے ساتھ رد نہیں کئے جا سکتے۔ ضرورت تھی کہ جرح و قدح کی خوردبین سے انہیں دیکھا جاتا۔ ممکن ہے وہ قدیم سندھی رسم الخط کا عقدہ حل نہ کر سکیں۔ لیکن قدیم بین الاقوامی روابط پر جو روشنی انہوں نے ڈالی ہے وہ نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اور پھر یہ بات کافی وزن رکھتی ہے کہ اگر ہم ہر جگہ اس رسم الخط کا سراغ تلاش کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں عراق و عرب و شام کی طرف بھی رجوع نہ کریں اور انہیں بالکل نظر انداز کر دینے ہی پر زور دیں؟ حالانکہ قدیم شاہراہوں کا جو نقشہ کتاب کی وصلی پر دیا گیا ہے اور ان علاقوں کے روابط تمام تر اس ہی رجحان کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ بہرکیف، کتاب کی مجموعی افادیت مسلّم ہے۔ طباعت اچھی ہے مگر کئی جگہ املا، انشا اور تصحیح کے نقائص کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ ان سے ذوقِ کتاب بینی مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً 'نذر' کی جگہ 'نظر'۔ 'رجمان' کی جگہ 'رجحان'۔ 'اکسیر' کی جگہ 'اکثیر'۔ 'گھٹیا' کی جگہ 'گٹھیا' 'کاسۂ سر' کی جگہ 'کاسیہ'۔ 'کندہ' کی جگہ 'کنندہ'۔ 'پس منظر' کی جگہ 'پسِ منظر' وغیرہ وغیرہ۔

کتاب پچاس کے قریب خاکوں اور تصویروں سے آراستہ ہے جن سے ایامِ کہن کے خد و خال اور بھی ابھر آتے ہیں اور تخیل اس طرح جاگ اٹھتا ہے کہ ہم ان تہذیبوں اور قوموں کا بخوبی تصور کر سکتے ہیں جنہیں گزرے ہوئے ہزارہا سال گزر چکے ہیں۔ ان حالات میں کون ہے جو مصنف کی اس دعوت پر لبیک نہ کہے کہ

؎ ز دستم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن (ظ۔ ق)

باغ و بہار

(میر امّن دلّی والے کا)

تدوین و ترتیب: ممتاز حسین

ضخامت: تقریباً ۳۰۰ صفحات

ناشر: اردو ٹرسٹ۔ کراچی

قیمت: ۶/۸ روپے

"باغ و بہار" (میر امّن دلّی والے کا) اردو کے ان چند قصّوں

میں سے ہے جس کی داستانی خوبی اور اس وقت کی دلی کی ستھری زبان اسے ہمیشہ ہی "باغ و بہار" رکھے گی۔ اور چار درویشوں کے یہ قصے لوگوں کے تصور اور حیرت فزائی کے لئے ہمیشہ ہی کام کرتے رہیں گے۔ اس کتاب کی خوبی اس سے ہی ظاہر ہے کہ اس کے بے شمار ایڈیشن (اور اکثر غلط سلط یا ایسی ترمیم کے ساتھ جس میں اُس وقت کی املا، انشا تک کو بدلنے کی کوشش کی گئی) شائع ہو چکے ہیں مگر اس کا ایسا نسخہ جو کئی مستند، کئی متداول اور کئی کمیاب، بلکہ نایاب، نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد شائع کیا گیا ہے، اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ اردو ٹرسٹ کراچی کی یہ پہلی کوشش اس کے آئندہ پروگراموں کی جھلک کے ساتھ ادب دوست طبقوں میں بڑی عزت کے ساتھ دیکھی جائے گی۔ ممتاز حسین مرتبِ نسخہ نے اس ایڈیشن میں خصوصی کاوش سے کام لیا ہے۔ جو ایسی تالیف کے لئے از بس ضروری تھا اور انہوں نے ہماری توقعات سے پورا انصاف کیا ہے۔ تالیفِ نسخہ پر بحث و نظر کے ساتھ اردو داستانوں کی مجموعی اہمیت پر ایک جائزہ خاصے کی چیز ہے۔ کلاسیکی ادب کی اس خدمت کو ہر جگہ سراہا جائے گا۔ کتاب میں کئی ابواب مثلاً میر امن کے بیان کے مطابق دلی کی معاشرت اور فرہنگ لغات اور حاشیوں اور حوالوں کا اضافہ اس کتاب کی افادیت کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ کتاب پڑھتے وقت بہت سے محاورے، الفاظ اور اسمائے اشیا غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں مگر اس فرہنگ نے بہت سی دشواریاں حل کر دی ہیں اور پرانے ادب کے بے شمار الفاظ، حوالے اور محاورے جو زبان کی تاریخ و تدریجی صلاحیت کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں، اس طرح محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس فرہنگ اور حوالوں نے کتاب کی تفہیم و توقیر میں بہت اضافہ کر دیا ہے کیونکہ بہت سے لفظ، بہت سی باتیں، بہت سے محاورے معاشرے کے انقلاب کے ساتھ ساتھ یا تو بدل گئے یا اپنی صحیح "بیٹھک" پر نہ رہے۔ اس سلسلے میں مرتب کو کتنے کنوئیں جھانکنے پڑے ہوں گے وہ تحقیقی کام کرنے والوں کے دل سے پوچھئے۔ مثلاً "پھوسوئی"۔ "تالیقہ"۔ "تلپھنا"۔ "تمامی"۔ "ٹنڈیاں کسنا"۔ "چارقب"۔ وغیرہ۔

مقدمہ، فرہنگ اور حواشی ہی اس نسخہ کی اصل روح ہیں اور حسب معمول ممتاز حسین صاحب کی دور بین نظر، تجسس و تحقیق کے ماتحے اور ان کے حسِ نقد کے "سرچ لائیٹ" سے منور ہے۔

کتاب اردو ٹائپ میں بڑے اہتمام و نفاست کے ساتھ طبع ہوئی ہے مگر اتنے بڑے غلط نامے کا کتاب میں شمول ایک تجھالہ جگر کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ امید ہے آئندہ اشاعت کے موقع پر یہ اغلاط درست ہو جائیں گی اور نئی اغلاط سے ایسی ستھری کتاب پاک رہے گی (ظ۔ ق)

مسئلہ تعدد ازدواج

از : مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواری
ناشر : ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان۔ لاہور
قیمت : ۱/۱۲ روپے

مولانا شاہ محمد جعفر ندوی کچھ عرصہ سے اسلامی موضوعات (بالخصوص بعض متنازعہ مسائل) پر جدید فکر و تفحص سے مضامین اور کتابیں تحریر کر رہے ہیں جن میں اس قسم کے مسائل کا ایک عقلی پہلو اور اپنے حاصلِ مطالعہ اور اخذِ نتائج کو پیش کیا جاتا ہے۔ مسئلہ تعدد ازدواج بھی ہمارے معاشرہ کے ان چند اہم مسائل میں سے ہے جس پر خالص علمی، فقہی اور معاشری نقطۂ نظر سے گفتگو کی ضرورت ہے۔ مولانائے موصوف نے ازدواج اور معاشرہ جدید کے تقاضوں کے موضوع پر شرعی نقطۂ نظر سے ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور معاشری مسائل کے حل میں مدد دی ہے۔ (ظ۔ ق)

گاما

از : خواجہ محمد شفیع دہلوی
ناشر : ہمدرد اکیڈمی۔ نیو ٹاؤن کراچی ۵
قیمت : ۲/۸ روپے

یہ کتاب رستم زماں گاما پہلوان کی زندگی اور ان کے ورزشی کارناموں کے تعارف کا مرقع ہے جسے اس فن (کشتی گیری) کے ایک ادا شناس، خواجہ محمد شفیع نے اپنی مخصوص البیلی طرز میں پیش کیا ہے۔ نامور ان ملک خواہ وہ کسی فن و میدان کے ہوں اکثر قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا تذکرہ اور کارہائے نمایاں سے آگاہی اپنی ثقافت کے پہلوؤں سے آگاہی کے مترادف ہے۔ "ہمدرد اکیڈمی" کی یہ پیشکش بہت سلیقہ کے ساتھ پیش کی گئی ہے اور مصنف کے بیان کی خوبی، معلومات کی فراہمی اور ان کی زبان کے ایک مخصوص چٹخارے نے اس حکایت کو اور بھی لذیذ بنا دیا ہے۔ (ظ۔ ق)

نقوش (ظرافت نمبر)

"نقوش" (لاہور) کے ہر شمارہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ نہایت عمدہ

کتابت و طباعت اور دلآویز پیشکش ۔ یہ شمارہ بھی انہی اوصاف کا حامل ہے حسن ترتیب سے قطع نظر اردو کے نامور مزاح نگاروں کے برجستہ کارٹون بھی جابجا زینت افروز ہیں ۔ اور ان کی تیاری میں خاصی ذہانت اور قلم کاری سے کام لیا گیا ہے ۔

حسب معمول یہ شمارہ بھی ایک خاص نمبر ہے جس کو اردو ظرافت اور فکاہیہ نگاروں کے متعلق مضامین کا مجموعہ قرار دینا بے جا نہ ہوگا ۔ قاری کو اس دلچسپ صنف کے ارتقائی منازل سے روشناس کرنے کے لئے ممتاز مزاح نگاروں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے عہد بعہد نمونے اور مظاہر بھی پیش کر دیئے گئے ہیں ۔ جن سے اس کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے ۔ اور ظرافت کا مطالعہ کرنے والوں کو مآخذ کے لئے سرگرداں ہوئے بغیر وہ مواد دستیاب ہو جاتا ہے جس پر وہ اپنے نقد و نظر کی بنیاد رکھیں ۔

ظرافت کے متعلق ہمارے نظریات کا سرچشمہ مغرب ہی کے ارباب نکتہ داں ہیں ۔ اس لئے ان سے جس قدر استفادہ کیا جاتا اسی قدر شمارے کا تنقیدی حصہ زیادہ وقیع ہوتا ۔ لیکن کہیں بھی ہربرٹ سپنسر کی اس موضوع پر نہایت فاضلانہ تحقیق اور پروفیسر تھارن ڈائیک کی دو ضخیم جلدوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا جن میں ظرافت کے متعلق نظریات کا احاطہ کرتے ہوئے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے ۔

بایں ہمہ " نقوش " کے اس شمارے کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

(ر ۔ خ)

شاہ کار

الہ آباد (خاص نمبر) ۔ صفحات ۴۰۰ ، قیمت تین روپے

پاکستان اور ہندوستان میں شائع ہونے والے اردو رسائل و جرائد کی کثرت اور متفرق نوعیت کو دیکھتے ہوئے ایسے رسائل کی اہمیت ظاہر ہے جو قارئین کو ان کے منتخب پاروں سے روشناس کرائیں ۔ پاکستان میں " نقش " اور " جائزہ " اور ہندوستان میں " شاہکار " اب تک اس کے جو شمارے سامنے آچکے ہیں ان سے فراہمی و انتخاب مضامین میں خاصی کاوش اور سلیقہ نظر آتا ہے ۔

یہ شمارہ لازماً ان تخلیقی کوششوں ہی کا آئینہ دار ہے جو متعلقہ دور میں بروئے کار آئیں ۔ مضامین اور افسانوں کی حد تک ان کی سطح نہ زیادہ بلند ہے نہ پست لیکن نظموں اور غزلوں میں ایک اکتا دینے والی یکسانیت ہی یکسانیت نظر آتی ہے ۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہیں صرف ضرورت شعری ہی کے لئے انتخاب کیا گیا ہے ۔ اس سے ابتدا میں ایک تنقیدی جائزہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے ۔

(ر ۔ خ)

"ہم قلم"

صفحات (۸) قیمت ۲ ر

ملنے کا پتہ : ۴۰۴ ، اکسیلسیئر ہوٹل ۔ کراچی

رائٹرز گلڈ کی حیثیت ایک قلمی برادری کی ہے ۔ اور اس کی شاخ کراچی کے اس اولین پرچے میں اس کی جھلک نظر آتی ہے ۔ یہ پرچہ بظاہر اسی وجہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے کہ ہم قلموں کو گلڈ کی کارروائیوں سے باخبر رکھا جائے اور اس کی فی الحال موزوں صورت یہی ہو سکتی تھی کہ یہ اطلاع نامہ ہوتے ہوئے اس کی سرگرمیوں کا عکس بھی ہو ۔ ممکن ہے اہل قلم کی توقعات بلند تر ہوں ۔ لہٰذا گلڈ کی طرف سے بہت جلد ایک وقیع تر اقدام کی امید ہے ۔ (ر ۔ خ)

★

رسید کتب

ریویو کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

کتاب	مصنف / مترجم	ناشر
اذان :	(مجید شاہد)	گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور
جدید طبی ایجادات	(ترجمہ)	اردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی
سرگزشت غزالی	(مولانا محمد حنیف ندوی)	ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان ۔ لاہور
مقاصد تعلیم	(ترجمہ سید محمد تقی مدیر جنگ)	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
تیز ہوا اور تنہا پھول	(منیر نیازی)	مکتبۂ کارواں ۲ ایبک روڈ انارکلی لاہور
انوار انبیاء		شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور
ابو الطیب متنبی	(تالیف : پروفیسر سید جلیل الرحمٰن اعظمی)	ادارۂ تصنیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
نغمۂ کارواں	(نظر حیدرآبادی)	سلطان حسین اینڈ سنز ۔ بندر روڈ ۔ کراچی
اردو دائرۂ معارف اسلامیہ		دانش گاہ پنجاب لاہور
ترجمہ و متن قرآن کریم تقطیع کلاں		تاج کمپنی کراچی
جادو کی کتاب	(رحمٰن مذنب)	
اردو کا دربار (ناول)	(راجہ محمد شریف)	آل پاکستان بزم ترقی اردو ۔ صدر شریف آباد لاہور
نبض دوراں	(شور علیگ)	مکتبۂ افکار ۔ رابسن روڈ ۔ کراچی
زہرا	(حقیقت نورانی)	ماڈرن بک ڈپو سیالکوٹ چھاؤنی
خاندانی منصوبہ بندی	(مرزا بشیر احمد ایم ۔ اے)	ربوہ
نقوش چند مرحوم	(جگن ناتھ آزاد)	ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ
اردو شاعری کا انتخابی سلسلہ	(جگن ناتھ آزاد)	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
خواب و تعبیر		کتاب منزل کشمیری بازار لاہور
شعر و حکمت	حکیم نیر واسطی	بیرون موچی گیٹ لاہور

جانشینیٔ غالب کا مسئلہ: بقیہ صفحہ

اور آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اسلئے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں:

ناظم کہتا ہے ؎

شنیدم کہ در دور گاہِ کہن — شد عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہِ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گزشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل درکشید — سرِ چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فروشد ز کار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

اس کے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اس کو مرزا نے یوں پورا کیا ہے ؎

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بغالب رسید

اب شیپ کا آخری بند یا شعر بھی [illegible] غالب کی وفات کے بعد حضرت علائی نے اپنے فوٹو گراف، خاندانِ لوہارو ۱۸۸۲ء کی پیشانی پر درج فرمایا ؎

علائی چو بر جائے غالب نشست — ورق بر درید و قلم در شکست

گویا ناظم ہروی کی نظم کو علائی نے اپنے نام پر ختم کیا۔ اسی فوٹو کے نیچے علائی نے اپنا یہ شعر بھی تحریر کیا ؎

منم کہ شہرتِ فضلم رسیدہ تا آفاق — منم کہ صیتِ کمالم رسیدہ بر اخراب

علم و ادب کے یہ نیرِ اعظم اور نیرِ اصغر دونوں شاہجہان آباد کے اُفق میں روپوش ہو گئے۔ مہرولی، دلّی کی خاکِ پاک اِن اجسامِ خاکی کی "امین" بنی۔ گنجِ ادب کے یہ مخزن یہ دونوں تودۂ خاک بھی، ۱۸۵۷ء کے خونچکاں انقلاب میں زمین کے برابر ہو گئے لیکن اُن کی کرنوں سے، جو کبھی فضا میں جلوہ گر تھیں، آج بھی دُنیائے ادب بدستور جگمگا رہی ہے۔ نہ خلیفہ اوّل رہے نہ خلیفہ ثانی، سدا رہے نام اللہ کا۔

عبدالقادر خٹک: بقیہ صفحہ ۴۸

سلجھانے کی کوشش کی ہے:

ذرہ میں آفتاب ہیں گل میں بہار ہیں — ہوتا ہے جلوہ گر وہی لیل و نہار ہیں
لیتا ہے دل مرا وہ کبھی ہو کے جلوہ ریز — گیسو و چشم ساقی و رخسارِ یار میں
پرتو ہے اس کے حسنِ فسوں ساز کا تمام — تنویرِ شمع و دلکشیِ لالہ زار میں
قادر وہ ذرے ذرے میں آئے نظر تجھے — ایماں اگر ہو پختہ ترے قلبِ زار میں

پشتو کے ایک تاریخی مشاعرہ میں جسمیں اس دور کے مشہور و معروف شعراء حمزاللہ خاں اشرف خان۔ عثمان خان۔ غفور خان اور اولک خان نے شرکت کی تھی عبدالقادر خان نے بھی اپنی ایک نظم پیش کی جو پشتو شاعری کی صنف "بدلے" کے انداز میں کہی گئی تھی۔ اس نظم کو حاصلِ مشاعرہ قرار دیا گیا ہم کہہ دمہ نے بیحد پسند کیا، اس کے چند اشعار کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

میری طرح الفت میں کوئی نہیں دیوانہ — راحت سے ہوں بے پروا آرام سے بیگانہ
کل وصل سے شاداں تھے اور آج جدا ہم ہیں — بیدرد زمانہ کا شیوہ ہے بدل جانا
دیکھی نہ سنی ہم نے اس درجہ فسوں کاری — نظروں سے تو ترسانا گفتار سے بہلانا
مت پوچھو تو اے ہمدم جینا ہے یہی جینا — ہو ہوش نظر ہر دم جب جلوۂ جانانہ

پشتو ادب کا یہ مایۂ ناز شاعر جس نے زندگی کے ہر پہلو کو گہری نظر سے دیکھا اور اس کا ہر زاویہ سے مطالعہ کیا۔ جس نے انسان کو اس کی خامیوں سے آگاہ کر کے سادہ و پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جس نے اشعار کی صورت میں نہایت لطیف پیرائے میں پند و نصائح کے جواہر پارے لٹا کر دلوں کو اعلیٰ اخلاقی قدریں عطا کیں جس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ ادبی اور اصلاحی سرگرمیوں کے لئے وقف کر دیا جس نے پشتو ادب کو بیش بہا اور بے مثل افکار و اشعار کی دولت بخشی وہ ۱۱۲۳ھ میں اس جہان فانی کو چھوڑ گیا مگر ہمارے لئے عمل، خلوص نیت، جرأتِ مومن اور حیات کی اونچی قدروں کو عملی جامہ پہنانے کا درس دے گیا جسے آج بھی فرزندانِ وطن اپنا آدرش بنا کر تعمیر وطن و ملت کا کام لے رہے ہیں۔

★

یوم پاکستان
۱۹۶۰ء
ماہِ نو
کی
اشاعت خاص
یوم پاکستان کی تقریب سعید پر ماہ نو اپنی سابقہ روایات کے مطابق ایک وقیع اور ضخیم شمارہ
جو معنوی اور صوری اعتبارات سے بہر وجوہ ایک قابل قدر پیشکش کا درجہ حاصل کرے
انقلاب نو کے بعد سے ملک ترقی و اصلاح کی جن راہوں پر گامزن
اس وقت اس کے سامنے ہیں ان کا ایک مکمل جائزہ قارئین کے سامنے لایا جائے گا۔ ادب،
ہر ہر گوشہ نیر انقلاب کی نئی کرنوں سے جس طرح دمک اٹھا ہے اس کی کیفیت دیدنی
بھی۔ اس روداد کو دستاویزی تسلسل و ترتیب اور تزئین و دلکشی کی خوبیوں
لایا جا رہا ہے۔
ملک کے نامور ادیب، شعرا اور فنکار اس
کام میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور امید ہے کہ
اشاعت خصوصی اپنی ادبی و ثقافتی روایات اور
زینت و آرائش کے تقاضوں کو پورا کرنے کے باب
میں ایک یادگار پیشکش ہوگی۔
مشتہرین حضرات اپنی ضرورتوں سے ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں
ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی

عظیم پشتو شاعر ، خوشحال خان خٹک
(۱۶۱۲ء——۱۶۸۹ء)
(خوشحال خان خٹک کے فرزند ، عبدالقادر خٹک کی شاعری پر مضمون صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

وادئی سوات

علاقہ شمال مغربی سرحد

چناروں کی قطاریں

افاغنہ کا مشہور پرجوش "خٹک رقص"

Regd. No. S. 1606

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

ماہِ نو
ڈاکٹر مولوی عبدالحق
حمید کاشمیری
کرم حیدری
ڈاکٹر محمد دین تاثیر (مرحوم)
یوسف ظفر
باقی صدیقی
ڈاکٹر تصدق حسین خالد
حشمت فضلی
آغا ناصر
عبدالرحمٰن فگار
طاہرہ کاظمی
اختر احسن
اپریل ۱۹۶۰ء
۸ر

چھوٹی صنعتوں کا ادارہ (کراچی)
صدر پاکستان ادارہ کے ڈیزائن
سینٹر میں

عوام کے صدر
اظہار اعتماد پر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا قوم سے خطاب

عالمی ادارۂ صحت کے ڈائریکٹر جنرل،
بیورو آف لیباریٹریز (کراچی) میں
(اس ادارہ میں مختلف ادویہ اور
سانپ کے کاٹے کا تریاق تیار ہوتا ہے)

ملک میں قیمتوں کا جائزہ
لینے کے لئے کمیشن

قصوروار ہیں؟
پٹرول کی بچت کرنے کے لئے پہیوں کا سیدھا ہونا ضروری ہے
کے بعد
اور ہر میل پر پیسے کی بچت کے لئے)
موبل گیس
موبل آئل
آئل کمپنی
S V 971

ماہِ نو

جلد ۱۳

اپریل ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

بہ یادِ اقبالؒ:	"بیا بہ مجلسِ اقبال..."	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۶
	اقبال: ایک آفاقی شاعر	ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم مترجمہ: صوفی احمد وحید اختر	۷
	اقبال کا نظریۂ حرکت	عبدالرحمٰن نگار	۱۰
	اقبال اور آئن سٹائن	ضمیر علی	۱۶
	"نغمہ کجا و من کجا"	کرم حیدری	۲۱
	"از بادۂ الاست": اقبال (نظم)	ڈاکٹر تصدق حسین خالد	۲۵
	شمع و شاعر (بحضورِ اقبال) (نظم)	ڈوشن کاک بیرن مترجمہ: شہاب رفعت	۲۵
فکرِ جدید:	سرریلزم: خواب اور حقیقت کا سنگم	دیوندر اسّر	۲۶
افسانے، ڈرامہ:	مکان	حمید کاشمیری	۳۱
	کاروبار (ڈرامہ)	آغا ناصر	۳۵
فن:	سجاد: ایک نیا ستارۂ فن	امیر حسن سیال	۴۵
علاقائی ادب:	بلوچی رزمیہ شاعری	سلیم خاں گمی	۵۳
نظمیں:	ارمان	یوسف ظفر	۴۲
	آخری شکست	طاہرہ کاظمی	۴۲
	گیت	باقی صدیقی	۴۳
غزلیں:	اختر احسن	حشمت فضل	۴۳
سرورق:	عیدِ نظارہ	رنگین عکس: نزہۃ الحسن	

چندہ سالانہ
پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ:
ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

فی کاپی
آٹھ آنے

بیا بہ مجلس اقبال

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے جہاں اور تدبیریں کی تھیں وہاں ۱۹۳۵ء میں میں نے ایک تجویز یہ پیش کی تھی کہ ہر صوبے اور علاقے اور دیسی ریاستوں میں اردو زبان کا جائزہ لیا جائے۔ یعنی اس قسم کی معلومات فراہم کی جائیں کہ وہاں اردو بولنے والوں اور لکھے پڑھوں کی کیا تعداد ہے۔ اردو کی تعلیمی اور دفتری حیثیت کیا ہے۔ کون کون سے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں۔ کس قسم کی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اردو مطبعوں اور اخباروں کی کیا حالت ہے۔ بول چال کی زبان کیسی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ ہمیں صحیح طور سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس برعظیم میں اردو کی کیا حیثیت ہے اور اس کا پھیلاؤ کہاں کہاں تک ہے۔ دوسرے جب ہر مقام کے حالات ہمارے سامنے ہوں گے تو جہاں جیسی ضرورت ہو گی اس کے مطابق کام کا ڈول ڈالا جائے گا۔ اس غرض سے میں لاہور بھی گیا اور اس تجویز پر غور کرنے کے لئے ایک مشاورتی مجلس کی۔ میں اور میرے ایک دو رفیق "ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی ملنے گئے۔ ہم ملنے کے کمرے میں جا بیٹھے۔ کمرے کی دیواریں سب خالی تھیں۔ صرف ایک دیوار پر ایک جانب کوئن وکٹوریہ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ نہ معلوم کس نے لگا دی تھی۔ ہمارے آنے کی اطلاع پر ڈاکٹر صاحب فوراً تشریف لے آئے۔ میں نے اپنی تجویز بیان کرنی شروع کی اور آخر میں کہا میں چاہتا ہوں سارے ہندوستان میں اردو کی اشاعت کا جال پھیلا دوں۔ سن کر فرمایا "صرف ہندوستان میں؟" یہ تین لفظوں کا انتہائی مختصر جملہ بہت پرمعنی تھا۔ یہ ایک حکیم شاعر کے دل کی آواز تھی۔ یعنی وہ اردو کو صرف برعظیم پاک و ہند ہی کی نہیں سارے ایشیا کی ممتاز زبان دیکھنا چاہتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور نے اپنے سالانہ جلسے میں "یوم اردو" بھی رکھا تھا اور اس کی صدارت کے لئے مجھ سے فرمائش کی تھی۔ میں لاہور گیا تو علامہ اقبال مرحوم نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔ مرحوم دن ہی میں کھانا کھا لیتے تھے۔ رات کو نہیں کھاتے تھے۔ میرا معمول اس کے برعکس تھا۔ دن میں نہیں کھاتا تھا رات کو کھاتا تھا۔ مرحوم نے میری خاطر اس روز دن میں کھانا نہ کھایا اور شب کے وقت میرے ساتھ کھایا۔ اس دعوت میں مولانا ظفر علی خاں اور چودھری محمد حسین بھی شریک تھے۔ کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس مضمون کا ایک بیان شائع کریں کہ ہم اردو رسم خط کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ دوسرے صاحبوں نے بھی اس کی تائید کی۔ میں سن کر چپ رہا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان حضرات کو میرے متعلق کچھ شبہ ہے اور یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میں کانگرس والوں سے اتفاق کر کے دیوناگری خط کی تائید نہ کر بیٹھوں۔ کیونکہ اس زمانہ میں ہندی والوں سے میری گفت و شنید بلکہ تنازعہ جاری تھا۔ میری خاموشی سے ان کا یہ شبہ اور قوی ہو گیا۔ جب یہ بات پھر چھڑی تو میں نے عرض کیا کہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ ہمارے حریف بڑے شاطر اور عیار ہیں۔ آپ ان سے معاملہ کرنا جانتے ہیں، نہ مقابلہ کرنا۔ میں ان کو خوب سمجھتا ہوں اور کوئی بات ایسی نہیں کرنا چاہتا جس میں پہل میری طرف سے ہو اور قابل الزام ٹھہروں۔ آپ چند روز صبر کیجئے اور پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہوگا وہی جو آپ کا منشا ہے مگر اس کا الزام ان کے سر رہے گا۔ میری یہ بات کچھ ان کی سمجھ میں آئی اور شبہ بدستور باقی رہا۔

خدا کا کرنا کہ اس کے کچھ ہی دن بعد ناگپور میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا سالانہ جلسہ ہوا۔ میں اس کی مجلس عاملہ کا رکن تھا۔ وہاں مجھ میں اور گاندھی جی میں زبان کے متعلق جو گفتگو ہوئی اس میں قدرے گرمی پیدا ہو گئی تھی۔ اس بحث کو اب تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جب گاندھی جی نے ذرا جھنجھلا کر یہ کہا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ آپ اسے چاہے رکھیں یا نہ رکھیں۔ اس پر میں نے کہا کہ جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں۔ ہم اسے انشاء اللہ زندہ قائم رکھیں گے اور حد کمال تک پہنچا کے چھوڑیں گے۔ اب علامہ اقبال میری مذکورہ بالا گفتگو کی تہ تک پہنچے۔

اس زمانے میں انجمن کا صدر مقام ریاست حیدر آباد دکن میں

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

اقبال — ایک آفاقی شاعر

ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم
مترجمہ: صوفی احمد وحید اختر

اقبال کی نظمیں دُنیا کی بیشتر زبانوں خصوصاً انگریزی، جرمن، اٹالین اور روسی میں ترجمہ کی جا چکی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں فرانسیسی ترکی اور عربی میں بھی ترجمہ کی جا چکی ہیں۔ اقبال نے زیادہ تر اردو اور فارسی میں لکھا۔ اور بعض نقادوں کا دعویٰ ہے کہ نہ صرف ضخامت بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی اقبال کی فارسی شاعری اس کے کلام کا بہترین حصّہ ہے۔ اقبال نے ایران، عرب اور ہندوستان کے میل جول کی اس عظیم روایت کو، جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے معرضِ وجود میں آئی تھی، قائم رکھا۔

مسلمان تقریباً ۷۱۲ء میں مکران پہنچ چکے تھے مسلمانوں کی سلطنتیں اس کے بعد ہندوستان میں قائم ہوئیں۔ اور ان ہی کی وجہ سے ہندوستان مستقل طور پر مغربی ایشیا سے منسلک ہو گیا، عرب، ایران اور ہندوستان کے اس تہذیبی اور تمدنی تعلق نے ایک نئے ادب اور ایک نئی زبان کو جنم دیا۔ یہ ادب "اردو ادب" اور یہ زبان "اردو زبان" تھی۔ یہ زبان عربی اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس کے ذخیرۂ الفاظ میں ہزارہا عربی اور فارسی الفاظ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ڈھانچہ خالص ہندوستانی ہے۔

اقبال نے اس مشترکہ تہذیبی اور تمدنی میراث کو اپنی شاعری کی بنیاد قرار دیا۔ اسی لئے بعض مغربی نقادوں نے (اور مغربی انداز میں سوچ بچار کرنے والے بعض دوسرے نقادوں نے بھی!) اقبال کو محض مسلمان شاعر قرار دیا یعنی ایسا مسلمان شاعر جس کی شاعری کا محور صرف مسلمان قوم ہے۔ اور جو انہی کے متعلق سوچ بچار کرتا ہے۔ بالفاظِ دگر اقبال کی شاعری آفاقی نظریات کی حامل نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی اقبال کی شاعری کو غلط معانی دینے سے پیدا ہوئی اور اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اٹلی کا عظیم شاعر "ڈانٹے" ایک راسخ الاعتقاد عیسائی تھا۔ اس کی شہرۂ آفاق تصنیف "ڈیوائن کامیڈی" کا دوسرا حصّہ "جہنم" غیر عیسائیوں اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں پر متعصبانہ اعتراضات سے پُر ہے۔ اس کے باوجود ڈانٹے کا شمار دنیا کے عظیم ترین شعراء میں کیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اقبال نہ کٹر قسم کا مذہبی انسان تھا اور نہ متعصب اس کی شاعری کسی بھی مذہب کے متعلق توہین آمیز انداز اختیار نہیں کرتی۔ اس کا اعتقاد عالمی اتحاد و یگانگت پر راسخ تھا۔ چونکہ اسلام اسی نظریہ کا حامی ہے، اسلئے اقبال نے اپنے شاعرانہ وجدان کے لئے اسلام ہی کو موزوں و مناسب خیال کیا۔ عالمی اتحاد و یگانگت پر اقبال کا ایمان کس قدر راسخ تھا، اس کا اندازہ ان کے نظریۂ عظمت آدم سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے، لہٰذا اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا خود انسانیت کی بہت بڑی توہین ہے —

آدمیت، احترامِ آدمی!

اقبال اس نظریہ کا حامی ہے کہ ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ اور آزاد انسان کو کسی دوسرے آزاد انسان کا غلام ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ چونکہ ہم آزاد ہیں اسلئے ہم میں امتیاز من و تو ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔

انسانی آزادی سے گہری محبت اور لگاؤ ہی اقبال کی شاعری کو آفاق کی بلندیوں میں بہت اونچا لے جاتا ہے۔ اقبال کی پہلی کتاب "اسرارِ خودی" تھی۔ جسے ڈاکٹر نکلسن نے انگریزی میں "SECRETS OF SELF" کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اسرارِ خودی ایک مثنوی ہے۔ یہ تصنیف جنگِ عظیم اوّل سے قبل ترتیب دی جا چکی تھی۔ اس میں اقبال نے اپنا فلسفۂ خودی پیش کیا ہے، انسان کی شخصی آزادی اور شخصیت کی حفاظت پر زور دیا ہے اور خودی سے متعلق اپنے اصول اور نظریات واضح کئے ہیں۔ اسکا پہلا ہی شعر یہ ہے: —

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

اپنی جگہ پہ یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان چونکہ "مخلوق" ہے۔ اسلئے وہ "خالق" کے تابع ہے لیکن اقبال کا کہنا ہے کہ "خالق" بھی "مخلوق" کا دست نگر ہے۔ اور "مخلوق" کے بغیر "خالق" کا وجود محلِ نظر ہے اور وہ اس طرح کہ "کوئی مخلوق بغیر خالق کے نہیں اور کوئی خالق بغیر مخلوق کے نہیں"

اقبال کہتے ہیں ؎

نہ او را بے نمودے ما کشودے
نہ ما را بے کشودِ او نمودے

اسی نقطہ پہ اس نے دوبارہ ان الفاظ میں زور دیا ہے ؎

نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است!
فراقِ ما فراق اندر وصال است
نہ ما را در فراقِ او عیارے
نہ او را بے وصالِ ما قرارے

یہ خیال بڑی حد تک شیخ اکبر کے اس عربی شعر سے ملتا جلتا ہے ؎

فلولاہ ولولا نا
فما کان الذی کانا

لیکن اقبال ایک صوفی شاعر نہیں کہ وہ اس مابعد الطبیعاتی فکر میں کھو جائے۔ انسان اور خدا کے درمیان یہ روحانی رشتہ جسے "الوھیت" کہا جا سکتا ہے، اقبال کو ایک نیا نقطہ سجھاتا ہے۔ کہ وہ انسان کو اپنی روح کو بلند کرنے کا سبق دے! چنانچہ اقبال یہ کہتے ہیں ؎

اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن
یکتائی و بسیاری، پنہائی و پیدائی

اور یہ کہ انسانی "الوھیت" اور عظمت کسی کٹر قسم کے مذہبی جنون کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اقبال تو یہاں تک کہہ گیا کہ اگر موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ بھی ہو تو بھی زندگی اس طرح گزارنی چاہیئے کہ جب انسان مرنے لگے تو خود خدا بھی یہ سوچنے پہ مجبور ہو جائے کہ میں یعنی خدا نے اُسے حیاتِ جاوید کیوں نہ عطا کی ؎

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

اقبال کے نزدیک زندگی ہر لمحہ بدلتی ہوئی متحرک اقدار سے عبارت ہے ؎

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نہ سازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے
نہ نوائے دردمندے نہ غمے، نہ غمگسارے!

زندگی جدوجہد ہے ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است!

ایک پرانی کہاوت ہے کہ "اگر دنیا تمہارا ساتھ نہیں دیتی تو تم دنیا کا ساتھ دو"۔ اقبال نے اس سے بالکل مختلف نظریہ پیش کیا ہے ؎

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را
نساید پیشِ غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بکامِ او نہ گردد
بکامِ خود بگرداند زمیں را

اقبال کے تمام شعری مجموعوں — "اسرارِ خودی" "رموزِ بے خودی" "پیامِ مشرق" "جاوید نامہ" "زبورِ عجم" "ارمغانِ حجاز" "ضربِ کلیم" اور "بانگِ درا" میں یہی بنیادی تصور ہے۔ اس کی تمام نظمیں زندگی سے محبت اور محبت کی زندگی سے بھرپور ہیں۔ انسانی آزادی اور انسانی عظمت، اقبال کی شاعری کی جان ہیں۔ یہاں میں صرف ایک غزل اور ایک نظم کا حوالہ دینے پر اکتفا کروں گا۔ جن سے فکرِ اقبال کے مختلف گوشے روشن ہو جائیں گے۔ نظم ہی کی طرح غزل بھی مسلسل ہے۔ اور اس میں ایک ہی خیال بیان کیا گیا

ہے۔ غزل کا عنوان ہے "میلادِ آدم" ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے، خود شکنے، خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اس غزل کا بنیادی خیال "تصورِ خودی" ہے۔ انسان خودگر، خودشکن اور خودنگر ہے، اور یہ انسان، یہ خودگر و خودشکن اپنے ماحول کی ناخوشگواریوں پر کبھی قناعت نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ اپنی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ایک نئی آزاد دنیا کا خواہاں ہوتا ہے ایک ایسی دنیا جو ظلم و ستم اور سود و زیاں سے آزاد ہو۔ اپنے حالات سے یہ بے اطمینانی انسان کو اقتصادی دنیا اور اس کی ناانصافیوں سے بھی آگے لے جاتی ہے۔ اور پھر وہ ان تمام پابندیوں کے خلاف بغاوت پہ آمادہ ہو جاتا ہے جو قدرت نے انسان پہ لگائی ہیں۔ وہ انسان کی بنائی ہوئی دنیا اور خدا کی بنائی ہوئی دنیا، دونوں سے بہت اونچا پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان اور خدا کے مابین ایک مکالمہ میں خدا کہتا ہے۔

جہاں را زیک آب و گل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیغ و تفنگ آفریدی!
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

اور اس کا جواب انسان یوں دیتا ہے ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال کی نظمیں اگرچہ فلسفیانہ موضوعات کی حامل ہیں لیکن وہ تغزل کی چاشنی سے بھی محروم نہیں۔ اقبال کے اعتقادات صرف خشک قسم کے نظریات نہیں اور نہ اس کا پیغام محض پند و نصیحت ہے۔ اقبال نے مغربی فکر اور فلسفہ کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اس وقت کیمبرج اور ہائیڈلبرگ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی جب کہ ہائیڈلبرگ کو ایک علمی درسگاہ کا مقام حاصل تھا۔ اور آج کی طرح وہ نازی پروپیگنڈے کا مرکز نہ تھی۔

اگرچہ اقبال نے مغرب کی سائنسی ترقی کو ہمیشہ سراہا اور مغربی یونیورسٹیوں میں خاصی دیر تک تعلیم کی غرض سے رہا۔ پھر بھی اس نے مغرب کی اندھا دھند تقلید نہیں کی۔ وہ بین الاقوامیت کے حامی تھے۔ اسی لئے وہ یورپی ریاستوں کے ان نظریات کی مخالفت کرتے تھے جو قوموں میں تفریق و امتیاز کریں۔ اس کا ایمان انسان کے عالمی اتحاد و یگانگت اور مساوات پر تھا۔ اسی لئے وہ معاشرتی طبقات کی تقسیم کے سخت خلاف تھا۔

علامہ اقبال عربی، فارسی اور ہندوستانی فکر و فلسفہ میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا جامع اور ٹھوس تھا۔ وہ مشرق کی بیداری اور حیاتِ نو کے بے حد خواہاں تھے۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے فکر اور خیالات کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ایک پل کا کام کیا ہے ؛

★

اقبال کا نظریۂ حرکت

عبدالرحمٰن فگار

کائنات کی آفرینش کا راز، انسان کی تخلیق کا مقصد اور اس وسیع کائنات میں انسان کا مقام، یہ ایسے سوالات ہیں جن کا حل تلاش کرنے میں انسانی فہم آج تک سرگرداں ہے اور یہی سوالات فلسفہ کی بنیاد ہیں۔ جس طرح تقریباً تمام علوم کا سرچشمہ یونان ہے اسی طرح ان مسائل پر فلسفیانہ تحقیق و جستجو کی ابتدا بھی یونان ہی سے ہوئی۔

چھٹی صدی قبل مسیح کا فلسفی اینکسی مینڈر غالباً پہلا شخص ہے جس نے ایک لامتناہی حرکت کو کائنات کے وجود کا سبب قرار دیا۔ پانچویں صدی قبل مسیح کے مفکرین ایمپی ڈوکلیز، ہراکلیٹس اور اناکساگورس نے بھی قانونِ حرکت کو کائنات کے وجود کا سبب بتایا اور ذہن کو طبیعی تبدیلیوں کا موجب ٹھہرایا۔ ان کے نزدیک ذہن حرکت کا سبب اور تمام تخلیق اور کائناتی حرکت کا موجب ہے۔ ان کے بعد لیوسیپس اور دیموقراطیس نے نظریۂ جوہر پیش کیا۔ دیموقراطیس ایک خالص مادی مفکر تھا جس نے نظریۂ حرکت کو سائنٹفک بنیادوں پر استوار کیا۔ اس کے نظریہ کی رو سے کائنات جوہروں کا مجموعہ ہے حتیٰ کہ روح بھی جوہروں سے مل کر بنی ہے اور ذہن ایک طبیعی عمل کا نتیجہ ہے۔ کائنات میں کوئی مقصد یا ارادہ کارفرما نہیں ہے۔

ہرکلیدس (۳۸۸ تا ۳۱۵ ق۔م) نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ زہرہ اور عطارد سورج کے اطراف گردش کرتے ہیں اور زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔

ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲ ق۔م) بھی حرکت کے نظریہ کا قائل تھا مگر اس کے نزدیک حرکت کا موجب ایک غیر متحرک علتِ اولیٰ (خدا) ہے۔ ارسطو کے طبیعی نظریات سولھویں صدی عیسوی تک ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کئے جاتے رہے لیکن بعد میں جدید سائنس نے ان نظریات کو ناقابلِ تسلیم قرار دیا۔

سترھویں صدی عیسوی میں جدید سائنس کی بنیاد پڑی۔ اگرچہ اس کی ابتدا کوپرنیکس ہی کے زمانہ سے ہو چکی تھی۔ سترھویں صدی میں گلیلیو (۱۵۶۴ تا ۱۶۴۲ء) نیوٹن، (۱۶۴۲ تا ۱۷۲۷ء) اور کپلر (۱۵۷۱ تا ۱۶۳۰ء) کی تحقیقات اور انکشافات نے قدیم سائنس، خصوصاً ارسطو کی طبیعات کو ناقابلِ فہم بلکہ تقریباً مہمل ٹھہرایا۔ گلیلیو اور نیوٹن کے نظریات نے حرکت کے قدیم تصور کو یکسر بدل دیا۔ نیوٹن کا "پہلا اصولِ حرکت" قدیم سائنس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس سے پہلے حرکت کے موجب بیرونی عوامل کو غیر مادی یا مابعد الطبیعاتی حیثیت کا حامل سمجھا جاتا تھا لیکن جدید سائنس نے ایسے کسی غیر مادی عوامل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کائنات میں انسان کے مقام اور اس کی اہمیت کے بارے میں تصورات بھی بدل گئے۔ اس وسیع کائنات میں کرۂ ارض ایک حقیر ذرہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور زمین پر انسان کے وجود کا کائناتی نظام سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جب کائنات کی آفرینش کے پیچھے کوئی ارادہ کارفرما نہیں ہے تو اس میں انسان کے وجود کی کیا اہمیت رہی۔

جدید مادیت کے نزدیک کائنات ایک وسیع میکانی نظام ہے جس کی بنیاد اصولِ حرکت پر ہے۔ زندگی دورِ ارتقا کا ایک حادثہ ہے۔ ایک اتفاقی واقعہ جس کے دوران مادہ میں شعور پیدا ہو گیا۔ مادہ ہی ایک بنیادی حقیقت ہے

اور زندگی کے تمام مظاہر اسی بنیادی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔
مادہ اصولِ حرکت اور اصولِ سلسلۂ اسباب کا پابند ہے۔ انسان
کی زندگی اور اس کی ہر حرکت اسی قانون پر مبنی ہے۔

سترھویں صدی کا اہم ترین عمرانی مفکر ہابس (۱۵۸۸ تا
۱۶۷۹ء) ہے جس نے گلیلیو کے نظریات پر عمرانی فلسفہ کو
تشکیل دینے کی کوشش کی اور اصولِ حرکت پر ایک مکمل سیاسی
نظام پیش کیا۔ ہابس کے نزدیک معاشرہ نامیاتی نہیں بلکہ ایک
میکانی نظام ہے جس کا وجود قانونِ حرکت پر ہے۔ انسانی زندگی
کی بقا اور تسلسل کا دارومدار کسی مقصد پر نہیں بلکہ ایک سلسلۂ
اسباب پر ہے اور یہ سلسلۂ اسباب ایک نفسیاتی میکانی نظام
ہے۔ انسان میں احساس و شعور ہے مگر یہ بھی ذرات کی
حرکت کا دوسرا نام ہے۔ ہر ذہنی حادثہ (EVENT) اور
ہر انسانی عمل ذرات کے انتقال، ترتیب و بے ترتیبی اور حرکت
کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس حرکت کے پس پردہ تحفظِ ذات کا
جبلّی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔

ان بنیادوں پر ہابس نے وہ سیاسی نظریہ پیش کیا جو
منطقی حیثیت سے تو معقول ہے مگر اس کے نتائج بڑے
خوفناک ہیں۔ اس منطقی ترتیب و یکسانیت کے باوجود ہابس
نفسیات اور طبیعات کو ہم آہنگ کرنے اور مادہ و شعور کو یکساں
قرار دینے میں ناکام رہا۔

مادی مفکرین کے لئے یہی سب سے بڑی دشواری تھی۔
سترھویں صدی کے عظیم مفکر ڈیکارٹ نے اس معمہ کا حل پیش
کرنے کی کوشش کی اور مادہ و شعور کی دوئی کا تصور پیش کیا
مگر زندگی کی یہ گتھی پھر بھی سلجھ نہ سکی۔

فلسفۂ مادیت کے نزدیک کائنات کے پیچھے کوئی
ارادہ کارفرما نہیں ہے۔ زندگی ارتقاء کا نتیجہ ہے اور یہ
عالمِ مادی ایک بے شعور مادی قانون کا پابند ہے۔ انسان
بھی اس بے شعور نظام کا ایک بے بس اور نہایت حقیر پرزہ ہے
انسان کی تخلیق کا بھی کوئی مقصد نہیں اور نہ وہ اپنے اعمال
کے لئے کسی قوت کے سامنے جوابدہ ہے۔

اقبال نے مادیت کی اس ہمہ گیری سے انکار کیا۔ مادی
فلسفہ کی تردید ان ہی بنیادوں پر کی جاسکتی تھی جن پر اس کی
تعمیر ہوئی۔ چنانچہ حرکت کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے
اور اسی بنیاد پر دوسرا مثبت فلسفہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

اقبال کے نزدیک زندگی کی اصل ایک یزدانی وحدت
ہے جو کثرتِ مظاہر میں جلوہ ریز ہے۔ ؎

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر

زندگی مسلسل حرکت کا دوسرا نام ہے۔ یہ ازل سے رواں دواں
ہے۔ یہ ایک سیلِ ہمہ گیر ہے جس کی موجِ بلا میں انقلاباتِ زمان و
مکاں اور گردشِ مہ و سیارہ اسیر ہیں۔ زندگی ایک بے تاب اور
مضطرب قوت ہے جسے سکون و ثبات نصیب نہیں ؎

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

زندگی مسلسل حرکت اور آزاد قوت کی شکل میں، کمال کی جستجو
میں رواں ہے۔ کائنات اسی مضطرب قوت کے ذوقِ کمال
کا تراشیدہ ایک عارضی پیکر ہے مگر اس کا ہر نقش ناتمام اور
ہر پیکر فریبِ نظر ہوتا ہے کیونکہ یہ اُس انتہائے کمال کا آئینہ دار
نہیں ہوتا۔ کائنات میں مسلسل شکست و ریخت اور تبدیلی اسی
لئے ہوتی رہتی ہے کہ یہ ابھی ارتقا کی منزلوں سے گزر رہی ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

دراصل یہ کائنات اُسی ایک قوتِ حیات کے ذوقِ نمود کا ایک
مظہر ہے جسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، جس کے
مظاہرِ تخلیق رنگارنگ اور بوقلموں ہیں اور قانونِ انقلاب و
تغیر کے زیرِ اثر فنا و بقا کے اضافی مدارج سے گزرتے ہوئے
ایک خوب تر پیکر کی تخلیق کے لئے راستہ ہموار کرتے ہیں۔
یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کائنات نقاشِ
ازل کا ایک تخیلی پیکر ہے جو ابھی ناتمام ہے اور اُس کے ذہن
میں کمال کے مدارج طے کر رہا ہے۔

گماں مبر کہ سرشتند درازل گِلِ ما
کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیرِ وجود

اسرارِ خودی میں اقبال نے اِسی خیال کو زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے:

"کائنات ایک مکمل تخلیق نہیں بلکہ اب بھی معرضِ تشکیل میں ہے۔ یہ ایک مکمل نظام نہیں کیونکہ تخلیقی عمل اس میں مسلسل جاری ہے اور اس عملِ تخلیق میں انسان بھی اپنا حصّہ ادا کرتا ہے۔" (دیباچہ اسرارِ خودی)

زندگی ایک متحرک ملکوتی قوت ہے۔ جب اس قوت کو اپنے وجود، اپنی انفرادیت اور عظمت کا احساس ہوتا ہے تو یہ "خودی" کہلاتی ہے اور اس طرح یہ ایک محسوس قوت کی شکل میں مظاہرِ عالم میں ظاہر ہوتی ہے ؂

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

یہ ہنگامۂ بود و نبود اور رستخیزِ حیات خودی کی سیمابی فطرت اور اس کی بے تابی و آشفتگی کا نتیجہ ہے اور اس بے تاب قوت کے وجود و بقا کا انحصار اس کی دائمی حرکت پر ہے۔ خودی مسلسل حرکت اور حالتِ کشاکش کا دوسرا نام ہے لیکن اس قوت کا تعیّن اسی وقت ہوتا ہے جب یہ کسی محسوس اور مادّی پیکر میں موجزن ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے تعیّن اور احصا کے لئے انسانی وجود کا انتخاب کیا اور اس طرح یہ انسانی شعور سے ہم آہنگ ہو کر خودی کہلائی۔ انسانی وجود میں خودی کی جلوہ گری زندگی کا نقطۂ کمال ہے۔ اس طرح انسان خدا کی تخلیق کا شاہکار ہے۔ اب کائنات میں انسان کو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی۔ اب اس کا وجود کسی بے شعور مادی قانون کا پابند نہیں بلکہ کائنات کی آفرینش کا مقصد قرار دیا گیا ؂

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

پہلے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ کائنات میں ایک ہی قوت جاری و ساری ہے اور اس کی حرکت اور کشاکش پر خود اس کے وجود کا انحصار ہے جیسا کہ خود اقبال نے اس بات کو اِن الفاظ میں واضح کیا ہے:

"خودی ایک حالتِ کشاکش کا نام ہے۔ یہ اُسی وقت تک باقی رہ سکتی ہے جب تک اُس میں یہ کشاکش باقی رہے" (دیباچہ اسرارِ خودی)

جب سارے نظامِ کائنات کا دار و مدار اصولِ حرکت پر ہے تو اس کائناتی نظام کا اہم ترین جزو ہونے کی حیثیت سے انسان اس قانون سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ کائناتی نظام اور انسانی نظام میں بھی ہم آہنگی ہو۔

چنانچہ کائناتی خودی کے اظہار کا پہلا مرحلہ انسان کا اپنی عظمت کا احساس و شعور ہے۔ اِس شعورِ عظمت کے بعد کائنات میں انسان کو صرف اپنا ہی وجود دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ اپنے ماسوا ہر موجود سے انکار کرتا اور اس طرح اپنے وجود کا اثبات کرتا ہے۔ انکار انسانی فطرت کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا اقرار و اثبات۔ انکار شعورِ انفرادیت کی علامت ہے۔ انکار سے حرکت پیدا ہوتی ہے اور محض اثبات سے جمود و سکون۔ خود اعتمادی، آزادی اور اپنی قوت کا احساس پیدا کرنے کے لئے انکار ضروری ہے۔ تخلیقی تحریک انکار ہی سے پیدا ہوتی ہے ؂

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست
ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز
تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز
ہر کرا ایں سوز باشد در جگر
ہولش از ہولِ قیامت بیشتر
لا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے
ایں غوِ رعد است نے آواز نے
ضربِ او ہر بود را سازد نبود
تا بروں آئی ز گردابِ وجود

انکار کی تندی سے دل میں سوز و گداز اور تپش و اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ شیطان کے دل کا وہ سوز و گداز جس نے

سجاد۔ ایک نیا ستارۂ فن

(مضمون :ص : ۴۵)

اشکال نگاری

کندہ کاری۔(ہرن)

''گاشے،، کا کام (طائران خوش الحان)

عشق کو شوریدگی اور عقل کو آسماں پیمائی عطا کی جرأتِ انکار
ہی کی رہینِ منت ہے۔ جبریل کے طنز پر کہ ؎

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

شیطان جواب دیتا ہے ؎

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

جرأتِ انکار انسان کو کورانہ تقلید کی بندش سے آزاد کرتی ہے۔ توحید کی حقیقت تک رسائی کا پہلا مرحلہ ماسوا سے انکار ہے یہ ایک براہیمی حرکت ہے۔ اس سے طبیعت میں قوت و ہیجان، بغاوت و جستجو اور سخت کوشی پیدا ہوتی ہے۔ انکار ایک خدائی صفت ہے، یہ ایک کبریائی قوت ہے جس کے شرار کی حرارت خاکِ آدم میں شعلہ زن ہونی چاہئے۔ انکار سے نظر میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبۂ پیدائی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ انسان کے ذوقِ انکار سے بیگانہ ہو جانے پر شیطان بھی اس کمزور اور خام حریف کی نا اہلی کا خدا سے شکوہ کرتا ہے ؎

ای خداوندِ صواب و ناصواب — من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچگہ از حکمِ من سر بر نتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ ابا بیگانۂ — از شرارِ کبریا بیگانۂ

لیکن مطلق انکار بھی اصولِ حرکت کے خلاف ہے کیونکہ حرکت حالتِ کشاکش یا دو قوتوں کی متوازن کشمکش کا نام ہے مطلق انکار شیطانی صفت ہے اور ایسا انکار انسان کو کسی منزل پر نہیں پہنچاتا بلکہ شک و بے یقینی کی تاریکیوں میں گمراہ کرتا ہے۔ اس لئے انکار کے ساتھ اثبات بھی ضروری ہے موجودہ بے خدا مادیت جس نے انسانیت کو دو عظیم جنگوں کی ہولناکی کا نشانہ بنایا اسی مطلق انکار کا نتیجہ ہے ؎

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا اِلّا
پیامِ موت ہے جب لا ہوا اِلّا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اُس ملت کا پیمانہ

انکار و اثبات میں ہم آہنگی اور توازن سے فطرتِ سلیمہ کا ظہور ہوتا ہے اور خودی میں تخلیقی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ انکار کی تخریبی قوت بے لگام ہو کر خود کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور اس کا مقصد دنیا میں صرف تخریب رہ جاتا ہے اور انسان دیوِ بے زنجیر کی طرح شکست و ریخت کی قوت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ع دیوانہ بہ کارِ گرِ شیشہ گر رسید
قوموں کی زندگی اور بقا و عروج کے لئے دونوں قوتوں میں توازن ضروری ہے ؎

در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگِ امتاں — نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نوں — حرکت از لا زاید از اِلّا سکوں

خودی کی بقا اُس کی تخلیقی حرکت پر منحصر ہے اور خودی مسلسل شعوری حرکت کا نام ہے۔ چونکہ وجود سے مراد جوہرِ خودی کی نمود ہے (وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود) اور انسانی وجود کائناتی خودی کی آماجگاہ ہے لہٰذا اس کے لئے بھی تخلیقی عمل ضروری ہے۔ انسان کا تخلیقی عمل اُس کی قوتِ فکر سے ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی فکر کی یہی تخلیقی قوت ہے جو اُسے خدائی صفت کا حامل بناتی ہے۔ انسان اپنی قوتِ فکر سے ایسے جہانِ نو پیدا کرتا ہے جو اس جہانِ ناپائیدار کے مقابلہ میں لافانی، زیادہ حسین اور دلکش ہوتے ہیں ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

لیکن فکر میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے اس میں مسلسل تبدیلی اور ندرت ضروری ہے۔ فکر میں سکون اور ٹھہراؤ اُس کی تخلیقی صلاحیت کو ختم کر دیتا ہے۔ فکر میں جدت اور اُس کی سیمابی فطرت سے زندگی میں حرارت اور بقا و جلا پیدا ہوتی ہے۔ فکر و عمل کی اس حرکت کو اقبال نے "ندرتِ فکر و عمل" کا نام دیا ہے۔ ؎

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

جب انسان میں بلند نظری پیدا ہوتی ہے تو لافانیت کا حصول اس
کا آخری اور انتہائی مقصد ہو جاتا ہے۔ لافانیت سے زیادہ کسی
چیز میں لذت نہیں۔ ہر تخلیقی فکر کے پیچھے یہی آرزو کارفرما ہوتی ہے
فاتح، موجد، ادیب و شاعر، ان سب کی تخلیقات او معجزاتِ ہنر
کا محرک صرف یہی لافانیت کی آرزو ہوتی ہے اور انسانی خودی
کے لافانی بننے کا انحصار بھی "ندرتِ فکر و عمل" پر ہے۔ اسی
بات کو اقبال نے اسرارِ خودی کے دیباچہ میں وضاحت سے
پیش کیا ہے۔ "خودی کی لافانیت ایسا مقصد ہے جس کا حصول
زندگی میں ایسے طرزِ فکر و عمل کے اختیار کرنے پر منحصر ہے جو
خودی کی حالتِ کشاکش کو باقی رکھ سکے۔ اس طرح اگر ہمارا عمل
اس حالتِ کشاکش کو باقی رکھتا ہے تو خودی موت کے صدمہ
سے بھی متاثر نہیں ہو سکتی" ؎

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

لیکن ندرتِ فکر و عمل کے لئے بھی ایک محرک ضروری ہے اور یہ
محرک سوزِ آرزو ہے۔ آرزو سے جمود میں حرکت پیدا ہوتی ہے،
گرمیٔ آرزو سوزِ حیات کی باعث ہے۔ نگار خانۂ حیات کی ساری رونق
اور یہ سارا ہنگامۂ مسابقت گرمیٔ آرزو کی وجہ سے ہے۔ آرزو جذبۂ اظہار
ذوقِ کمال اور خود شناسی و خودنگری پیدا کرتی ہے ؎

زندگی سر آرزو دارد اساس — خویش را از آرزوئے خود شناس
آب و گِل را آرزو آدم کند — آرزو مارا ز خود محرم کند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موجِ بے تابے ز دریائے خودی

لیکن قانونِ حرکت کا تقاضا ہے کہ آرزو میں بھی مسلسل تبدیلی، تغیر و
حرکت و انقلاب ہو ورنہ دیرینہ آرزوئیں سرد ہو کر حسرتوں میں
بدل جاتی ہیں اور خودی کی آب و تاب اور زندگی کی حرارت ختم
ہو جاتی ہے ؎

درگذر از رنگ و بوہائے کہن — پاک شو از آرزوہائے کہن
ایں کہن ساماں نیرزد با دو جو — نقشبندِ آرزوئے تازہ شو

ہر آرزو کے پیشِ نظر کسی مقصد کا حصول ہوتا ہے۔ بے مقصد آرزو بے
معنی چیز ہے۔ مقصد کی لگن آرزوئیں حرارت پیدا کرتی ہے۔ خودی کی
بقا اور اس کی تابناکی کے لئے بھی ایسی خلاق آرزو چاہئے۔ جو ہر لمحہ
بلند مقاصد کی تخلیق کرتی اور ان کے حصول کے لئے بے چین رہتی ہے ؎

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز — از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثلِ سحر تابندۂ — ماسوی را آتشِ سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالاترے — دلربائے، دلستانے، دلبرے
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

"زندگی ایک ترقی پذیر اور جاذب حرکت
ہے جو اپنے راستہ کی تمام رکاوٹوں کو اپنے میں
سمو کر دور کرتی ہے۔ اس کا جوہر آرزوؤں اور مقاصد
کی مسلسل تخلیق پر منحصر ہے"۔ (دیباچہ اسرارِ خودی)

عشق اسی گرمیٔ شوق اور سوزِ آرزو کا نام ہے جو کسی مقصد کی لگن میں
ہو۔ عشق وہ نور ہے جو ایک ذرۂ بے مایہ کو پروانگی سکھاتا اور
زندگی کی شب تاریک کو فروزاں کر دیتا ہے۔ عشق کی تادیب سے
عقل کی سرکشی و ہرزہ گردی دور ہوتی ہے۔ عشق سے وہ جرأت پیدا
ہوتی ہے جو انسان کو خدائی کا رازداں بناتی اور اسے خدا سے
قریب کرتی ہے۔ عشق کائنات میں حسن و جمال تلاش کرتا اور
انسانی فطرت کو کمال پر پہنچاتا ہے۔ جذبۂ عشق انسان اور ذاتِ
مطلق کی انفرادیت کو باقی رکھتا اور دونوں میں ایک لطیف پردہ
حائل کرتا ہے۔ عشق سے جذبہ کی تہذیب ہوتی ہے اور شریعت و
اخلاق کے مقاصد کا تعین ہوتا ہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

"عشق سے خودی کا استحکام ہوتا ہے اور اعلیٰ اقدار و
مقاصد کی تخلیق اور ان کے حصول کی جد و جہد پر عشق کے کمال
کا انحصار ہے"۔ (دیباچہ اسرارِ خودی)

عشق انسان اور خدا کے درمیان فاصلہ اور انفرادیت باقی
رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اور انسانی خودی کے لئے انفرادیت کے تصور
کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انفرادیت ہی بندہ اور خالق کے درمیان
حد پیدا کرتی ہے۔ انفرادیت کی بقا سے اختیار حاصل ہوتا ہے اور
عدمِ انفرادیت یا جذب و کلیت سے جبر۔ "زندگی انفرادی
حقیقت کا نام ہے اور کائناتی زندگی کی کوئی اصلیت نہیں
کیونکہ خدا خود بھی ایک فرد ہے جو انتہائی منفرد حقیقت ہے

انسان کا اخلاقی و مذہبی مقصد نفیِ خودی نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے جس کو وہ زیادہ سے زیادہ یکتائی اور انفرادیت کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے۔" (اقبال)

معاشرہ کی بقا اور ارتقا کے لئے فرد کی آزادی اور انفرادیت ناگزیر ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت کے توازن سے صحت مند معاشرہ ظہور میں آتا ہے۔ لیکن انفرادیت اُسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے جب یہ قانونِ حرکت کے تحت کسی اجتماعی نظام، کسی معاشرہ کا جزو بنے۔ بالکل اسی طرح جیسے مختلف اجرامِ سماوی اپنی جداگانہ حیثیت باقی رکھتے ہوئے ایک نظامِ شمسی کا جزو بنتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص حلقہ میں گردش کرتا ہے۔ اِس گردش اور توازنِ حرکت میں فرق آجائے تو پورا نظامِ شمسی تباہ ہو جائے۔

جس طرح کئی سیاروں کی باہمی کشش اور حرکت سے ایک نظامِ شمسی بنتا ہے اسی طرح افراد کے اجتماع اور باہمی تعاون سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے اور ایک نامیاتی۔ میکانی نظام کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس سے ایک وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اس وحدت کے بغیر کائنات میں توازن باقی نہیں رہتا ؎

برگ و سازِ کائنات از وحدت است
اندریں عالم حیات از وحدت است

"اِس نئی تہذیب (اسلام) میں عالمی وحدت کی بنیاد اصولِ توحید پر ہے اور اسلام ایک نظامِ تمدن کی حیثیت سے انسان کی جذباتی اور فکری زندگی میں اس اصولِ وحدت کو ایک زندہ حقیقت بنانے کا قابلِ عمل ذریعہ ہے۔" (سات لیکچر)

افراد کے اس تعاون اور وحدت سے قوم بنتی ہے۔ اس وحدت یا اکائی کے وجود اور اس کی حرکت کا مقصود ہی یعنی نظام کا قیام ہے جو ابھی ضمیرِ کائنات میں پوشیدہ ہے۔ قوم کی زندگی اور بقا بھی قانونِ حرکت کی پابند ہے۔ لیکن قوم کی زندگی میں یہ قانون کس طرح کارفرما ہوتا ہے؟ قوم کی زندگی میں یہ قانون "تمدنی حرکت" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس تمدنی حرکت کو اسلام کی اصطلاح میں "اجتہاد" کہتے ہیں۔ اجتہاد سے مراد علم و حکمت کی راہوں میں نئے مرحلوں کی دریافت، ایجادات، انکشافات ہیں۔ جب کسی قوم میں تعمیری فکر اور اجتہاد زوال پذیر ہوتا ہے تو اُس کے افراد کا اندیشۂ پست اُس کی شاندار روایات کا مدفن بن جاتا ہے۔

قوم کی بقا اور ابدیت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فکر و تخیل میں جولانی اور خلاّقی باقی رہے بلکہ فکر کی مسلسل تخلیقی صلاحیت سے قوم کی حیات وابستہ ہے:-

"ایک تمدنی تحریک کی حیثیت سے اسلام کائنات کے ساکن تصور کی نفی اور متحرک تصور کا اثبات کرتا ہے۔ زندگی کی بنیاد روحانی اور ابدی اقدار پر ہے اور اِس ابدیت کا دار و مدار تنوع اور تبدیلی پر ہے۔ جس معاشرہ کی بنیاد حقیقت کے اس تصور پر قائم ہوگی وہ یقیناً تبدیلی و انقلاب کے قانون سے ہم آہنگ ہوگا۔ اس کی حیاتِ اجتماعی کی تنظیم کے لئے ابدی اصول ضروری ہیں۔ کیونکہ اس ہر لحظہ تبدیل ہونے والی کائنات میں ہم ابدی قوانین اور اصولوں ہی کے سہارے زندہ رہ سکتے ہیں۔ وہ اصولی حرکت جو زندگی کے ابدی قوانین سے ہم آہنگ ہوتا ہے اسلام کی اصطلاح میں "اجتہاد" کہلاتا ہے۔" (سات لیکچر)

اِسی اصولِ اجتہاد کو اقبال نے مختلف مقامات پر "انقلاب" بھی کہا ہے۔ انقلاب سے مراد کسی قوم کی ایسی ہی فکری ندرت اور تحریکِ عمل ہے ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب ✦

اقبال اور آئن سٹائن

ضمیر علی

بعض ماہرینِ نفس کا خیال ہے کہ علامہ اقبالؒ ایک جدید نفسیاتی اصطلاح کے مطابق "نرگسیت" یعنی "برخود غلطی" کا شکار تھے لیکن یہ رجحان رکھنے والا کبھی دوسروں کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ مکمل طور پر اپنی ہی ذات میں مستغرق ہوتا ہے۔ اقبال نے مغرب و مشرق کے کتنے ہی اربابِ فکر و فن کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے ہیں۔ بلکہ اقبال کے نفسیاتی تجزیہ سے جو شخصیت ان کے فکر و فن سے اُبھرتی ہے ہرگز مکمل "برخود غلطی" کی آئینہ دار نہیں کیونکہ اقبال کے پردۂ تصور پر ہمیشہ ایک مکمل تر اور جمیل تر شخصیت کا نقش چھایا رہا۔ کامل بتلائے خود وہ ہے جس کی چشمِ تصور "بروں از خویشتن" کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔ وہ ایک آئینہ خانہ کا زندانی ہے۔ جہاں کے شش جہات اپنے ہی پرتوِ ذات سے زیادہ نہیں۔

اقبال کے ذہن نے اپنے عہد کے تقریباً ان تمام مفکرین و شعراء سے جو اس کی مخصوص انفرادیت سے ہم آہنگ ہیں، اثر و تحرک حاصل کیا ہے۔ "پیامِ مشرق" میں جہاں اقبال نے گوئٹے، نیٹشے، دانتے اور دیگر افراد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، وہاں آئن سٹائن کی فکری و ذہنی خدمات کا اعتراف بھی بڑے پُر شکوہ الفاظ میں کیا ہے۔ آئن سٹائن عہدِ حاضر کا عظیم ترین سائنس داں تھا۔ امریکہ کے ایک پروفیسر نے مختلف ممالک سے چودہ اکابرینِ سائنس کے نام طلب کئے تھے۔ ان میں سے بہتوں نے نیوٹن اور گلیلیو کے نام لئے۔ لیکن سب نے متفقہ طور پر آئن سٹائن کا نام لیا تھا۔ اس لئے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے۔ کہ آئن سٹائن عظیم ترین سائنس داں تھا۔ اس کے نظریات نے سائنس، فلسفہ اور مابعد الطبیعات تینوں کو کم بیش متاثر کیا ہے۔

اہل الرائے کے نزدیک نظریۂ اضافیت کا سب سے اہم پہلو "مکان۔ زماں" کا انکشاف ہے۔ اس لئے ہماری زندگی کا امتداد اور جو فاصلہ ہم نے زمانے کے وسیع میدان میں طے کیا ہے، بالکل غیر اہم ہو جاتا ہے۔ دو جڑواں بچے اپنے ذاتی اعداد و شمار کے مطابق ممکن ہے ہم عمر ہوں لیکن موت کے وقت اگر وہ ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی عمروں میں حیرتناک اختلاف ہوگا۔ دو مسافر ایک ہی منزل سے آغاز سفر کریں لیکن جب وہ بحالتِ قرار ایک دوسرے کا جائزہ لیں گے تو باوجود ایک ہی جانب سفر کرنے کے ان میں قطعی طور پر غیر متوقع فاصلہ حائل ہوگا اسکی وجہ یہ ہے کہ نظریۂ اضافیت امتداد (DURATION) اور فاصلہ دونوں کے اضافی ہونے پر اصرار کرتا ہے۔ نظریۂ اضافیت سے پہلے زماں اور مکاں دو مختلف خارجی حقائق تسلیم کئے جاتے تھے۔ مکان کا یہ تصور تھا کہ وہ ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور ہمارا ہر طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور زماں ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں صرف چھوکر گذر رہا ہے۔ اس کا تعاقب نہ تو چشم و بصارت کر سکتے ہیں اور نہ گوش و سماعت اس کی آواز پا کو اسیر کر سکتے ہیں۔ ہم مکان کے ابعادِ ثلاثہ میں حرکت کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ اس کے پس و پیش، یمین و یسار اور پست و بالا ہمارے حلقۂ اختیار میں ہیں۔ لیکن زماں ایک ایسی خارجی رو جس کا لمس صرف ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ نہ ہم زماں میں آزادانہ حرکت کر سکتے ہیں اور نہ اس کے مرور میں دخل انداز ہو سکتے ہیں۔ نظریۂ اضافیت کے مطابق فطرت اس زمانی و مکانی تقسیم سے بالکل ناآشنا ہے[۱]۔ یہ ایک دوسرے سے جدا حقیقتیں نہیں۔ بلکہ یہاں ان دونوں کی ایک مربوط شکل پائی جاتی ہے۔ زماں، مکاں کا چوتھا بعد ہے۔ کیونکہ فطرت اشیاء کی بجائے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس لئے کسی واقعہ کو متعین کرنے کے لئے طول، عرض اور عمق ہی کی صراحت کافی نہ ہوگی بلکہ یہ بھی بتلانا ہوگا کہ وہ واقعہ کب ظہور میں آیا۔ اس طرح زماں ایک پُراسرار طریقہ سے مکاں میں مدغم ہو جاتا ہے۔ منو وسکی جو نظریۂ اضافیت کا ایک لائق شارح و مؤید ہے، آئن سٹائن کے اس انکشاف کے متعلق لکھتا ہے۔

" زمان و مکاں اپنی جداگانہ حیثیتوں میں تو محض پرچھائیاں بن کر

---

[۱] MYSTERIOUS UNIVERSE BY SIR JAMES JEANS

رہ گئے ہیں۔ البتہ ان دونوں کا کسی قسم کا اختلاط ہی کچھ حقیقت کا حامل ہے۔[لہ]

مکاں - زماں کے اس سنسنی خیز انکشاف نے ہمارے تصورِ کائنات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ بقول برٹینڈ رسل، نظریۂ اضافیت نے زمانے کو "مکاں، زماں" میں مدغم کرتے ہوئے شے کے روایتی تصور پر جو ٹھوکر لگائی ہے، وہ فلسفیوں کے دلائل سے آج تک نہیں لگی۔

عام نظریۂ اضافیت کا یہ انکشاف اس کا اہم ترین پہلو ہے۔ آئن سٹائن نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر مکاں، زماں کو اس نظریہ سے الگ کر دیا جائے تو وہ محض ایک نام نہاد نظریہ رہ جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر مکاں - زماں کا ابطال ممکن ہے تو عام نظریۂ اضافیت کا اغلب حصّہ سخت تنقید کی زد میں آجائے گا۔

آئن سٹائن کے اس انکشاف نے قانونِ تعلیل کی صحت بھی مشتبہ کر دی ہے۔ زماں کا مستقبل کی طرف بہاؤ علّت و معلول کے رشتہ کی جان ہے۔ لیکن نظریۂ اضافیت کی رو سے زمانہ کا مستقبل کی طرف بہاؤ نمودِ سراب سے زیادہ نہیں۔ چونکہ زمانہ مرور نہیں کرتا بلکہ وہ مکان کا چوتھا بُعد شمار ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے لئے یہ کہنا کہ ان میں سے ایک واقعہ دوسرے واقعہ کا سبب ہے، اسی طرح ٹھیک نہیں ہے جس طرح شاہراہِ عام پر پار کے جو مسلسل کھمبے لگے ہوں ان کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان میں ہر ایک دوسرے کا سبب ہے۔ سترھویں صدی کے علمائے سائنس قانونِ تعلیل کی صحت پر اس قدر یقین رکھتے تھے کہ تقریباً جملہ مظاہرِ فطرت کی تشریح انہوں نے اسی بنیاد پر کی۔ یہ میکانکی طریق تشریح اس قدر ناقابلِ انکار ہوگیا کہ ہلم ہولٹز نے دعویٰ کیا کہ علم طبعیات کا مقصود علم میکانکیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لارڈ کلون نے کہا کہ ان کے لئے ایسی شے کا تصور میں لانا ممکن نہیں جس کا میکانکی نقشہ اپنے ذہن میں نہ لے آئیں۔ انہوں نے کہا کہ نیوٹن اور گلیلو کے دماغ اپنی مشینی ساخت کے اعتبار سے کسی قدر پیچیدہ ہیں۔ اور ایسی مشین بنائی جاسکتی ہے جو نیوٹن کی فکر، باخ کے احساسات اور مائیکل اینجلو کے تخیلات کو پیدا کر سکے۔ اس نظریہ کی رو سے انسان مجبورِ محض قرار پایا۔ کیونکہ اس کی پوری شخصیت قانونِ تعلیل کی پیدا کردہ ہے۔ اس کا پورا وجود توارث اور احوال و ظروف کے درخت پر پھل کی طرح لٹک رہا ہے۔ جتنے مادی مکاتیبِ فکر ہیں وہ سب اس ہی کی پیداوار ہیں۔[ٹہ] آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت اور پلانک کے نظریۂ مقادیرِ برقی (کوانٹم تھیوری) نے فطرت کے اس میکانکی طریق کار کو باطل قرار دیا ہے۔ پلانک نے یہ توجیہ پیش کی کہ تسلسل کو نا پ لینے سے چھوٹے پیمانہ پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ واقعات توانائی کے تغیر پر مبنی ہیں اور توانائی میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ غیر مسلسل ہوتی ہے۔

نظریۂ اضافیت کا دوسرا اہم انکشاف مادہ و توانائی کا ایک ثابت ہوتا ہے۔ اضافیت کے انکشاف سے پہلے بقائے مادہ اور بقائے توانائی دو الگ اور مستقل قوانین کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے تھے۔ مادہ توانائی کی کئی اشکال ہیں۔ نہ توانائی مادہ میں تبدیل ہو سکتی ہے اور نہ مادہ توانائی میں۔ یونانی فلسفیوں سے لیکر پچھلی صدی کے اواخر تک مادہ و توانائی کو دو مختلف آفاقی عناصر کی حیثیت حاصل تھی۔ آئن سٹائن نے سائنس کو جن بہت سے غیر ضروری مفروضوں سے آزاد کرایا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مادہ و توانائی ایک ہی حقیقت کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ رصدی تجربوں نے اضافیت کے اس انکشاف پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

علامہ اقبال آئن سٹائن کے اس انکشاف کو نظریۂ اضافیت کا اہم ترین جزو سمجھتے ہیں۔ ایوانِ فکر و نظر میں کائنات کے مادی نقطۂ نگاہ نے جو نقش و نگار بنائے تھے، بصورتِ خدا وہ سب غائب ہو رہے ہیں۔ ایٹم کے تجزیہ میں اس نے صرف مادہ و قوت ہی کی کارفرمائی نہ دیکھی۔ بلکہ ایک ایسی قوت کا بھی تصرف دیکھا جو ہماری حدودِ ادراک سے بہت دور ہے۔ اور ہم ریاضی محض کی مدد سے اس کا سراغ نہیں لگا سکتے۔

اقبال نظریۂ اضافیت کی فلسفیانہ قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس نظریہ کی دو خوبیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ نظریۂ اضافیت نے اس خیال کی نفی کی ہے جس کی رو سے کلاسیکل طبیعات کو مادیت کا قائل ہونا پڑا تھا اور جس کے تحت جوہر کی حیثیت وقوع فی المکان سے زیادہ نہیں رہتی۔ آئن سٹائن نے فطرت کے خارجی وجود سے انکار نہیں کیا۔ اسی وجہ

لہ MYSTERIOUS UNIVERSE

ٹہ PHYSICS AND PHILOSOPHY BY SIR JAMES JEANS.

سے جدید طبیعات میں جوہر کی حیثیت یہ ہوئی کہ یہ باہمدگر مربوط حوادث کا ایک نظام ہے، شے نہیں کہ انہی متغیر حالتوں کے ساتھ زمانے میں مرور کرے۔ اس نظریہ کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کی رو سے مکاں کا انحصار مادّے پر ہے۔ لہٰذا آئن اسٹائن کے نقطۂ نظر سے کائنات کا یہ تصور درست نہیں کہ اس کی مثال ایک ایسے جزیرے کی ہے جو لامتناہی مکان میں واقع ہے۔ اس لئے کہ مکان بجائے خود متناہی ہے گو غیر محدود۔ بایں صورت اس کے ماورا مکانِ محض کا کوئی وجود ہی نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ اگر مادہ نہ ہوتا تو کائنات بھی سمٹ کر ایک نقطہ پر آ جاتی۔" [۱]

"یہ بھی تاریخ کی کرشمہ سازیوں کا ایک عجیب لطیفہ ہے۔ کہ وہ آئن اسٹائن جس کے امریکہ میں ورود پر وہاں کے مذہبی علماء نے "دہریہ آئن اسٹائن سے بچو" کا امتناعی اشتہار در و دیوار کلیسا پر چسپاں کرنا ضروری سمجھا، آج اس کے انکشافات مذہب کے اس قالب میں شگفتگی و تازگی کی روح پھونک رہے ہیں جو مادیت کی پیہم ترکتازیوں سے نیم جاں ہو چکا تھا۔ اس کی تحقیقات ہمیں اخلاقی قدروں کی صداقت کا یقین دلانا چاہتی ہیں۔ مادہ کے اس تصور پر جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے جملہ مکاتب فکر کی بنیاد ثابت ہوا تھا، اب ضرب کاری لگ چکی ہے اور وہ حدود جن کے اندر ہم مادّے سے واقف تھے، اب غائب ہو رہی ہیں۔ ہمارا علم، فطرت کے عمیق تر طریق کار کا سراغ لگانا چاہتا ہے۔ مادہ و توانائی کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے بقول برٹرانڈ رسل، آئن اسٹائن نے مادہ کو غائب کر دیا۔ اسی لئے سائنس داں بھی کہنے لگے کہ "مادہ غائب ہو رہا ہے"۔ اس سے مقصود یہ نہیں کہ اضافیت نے مادہ کے وجود سے انکار کیا ہے بلکہ وہ مادے کا ایک مختلف تصور پیش کرتا ہے۔ مادہ کی وہ تمام خصوصیات جو تسلیم شدہ حقائق کی حیثیت رکھتی تھیں آج وہ بدل چکی ہیں۔ مادے کے خواص و اعمال کی جگہ مجرد قوت نے لے لی ہے۔ اضافیت کے اس انکشاف نے جو بیشتر محققین کے نزدیک بیسویں صدی کا سب سے عظیم اور انقلاب انگیز انکشاف ہے، عینیت (آئیڈیلزم) اور خارجیت پسندی (ریلزم) کے مابین جو پرانی نزاع تھی اس کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ عینیت کے حق میں ہوا ہے" [۲]

علامہ اقبال آئن اسٹائن کے اس انکشاف کو بہ نظرِ ستائش دیکھتے ہیں۔ انہیں اس امر کا اعتراف ہے کہ آئن اسٹائن نے عینیت کے حق میں فیصلہ دے کر ایک زبردست خدمت انجام دی ہے۔ علم و نظر کی وہ راہیں جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مادہ پرست رجحان نے بند کر دی تھیں اب سرِنو باز ہو چکی ہیں۔

جہاں علامہ نے بیشتر امور میں آئن اسٹائن کے انکشافات سے اتفاق ظاہر کیا ہے، وہاں بعض امور میں انہیں سخت اختلاف بھی ہے۔ "مکان و زماں" کا انکشاف جو عام نظریۂ اضافیت کا اہم ترین کارنامہ ہے، اس سے اقبال کو سخت اختلاف ہے۔ چونکہ اقبال، برگساں کی مانند حقیقت زماں کے قائل ہیں، اس لئے آئن اسٹائن کے اس انکشاف سے جو بظاہر زمانے کا ابطال کرتا ہے، انہیں اتفاق نہیں۔ اضافیت کی رو سے مکان کی حیثیت واقعات کے غیر متحرک حامل (PASSIVE CONTAINER) ہی کی نہیں [۱] وہ حوادث کے وقوع میں اپنا ایک خاص کردار ادا کرتا ہے۔ بلکہ وہ مکاں کو زماں سے زیادہ اساسی بتلانے کا رجحان ظاہر کرتا ہے۔ وقت کو اقبال حقیقت کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ آئن سٹائن نے زماں کو مکاں کا بعد قرار دے کر جبر و اختیار کی پرانی نزاع کو از سرِنو تازہ کر دیا ہے۔ زمانہ کوئی آزاد تخلیقی حرکت کی حیثیت سے باقی نہیں رہتا۔ اضافیت جبریت کی تائید کر کے ہم سے جملہ اختیارات چھین لیتی ہے۔ جبر و بیچارگی کا یہ یاس انگیز تصور ہمیں امید و عمل کی بلندیوں سے قنوطیت و بے عملی کی پستیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں۔

"آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت سے ایک زبردست مشکل رونما ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اگر اس کا نظریہ صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زمانے کا وجود بھی غیر حقیقی ہے۔ کیونکہ جس نظریہ کی رو سے زمانے کی حیثیت بُعد رابع سے زیادہ نہیں، اس سے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ ماضی کی مثل استقبال کا وجود بھی پہلے سے قائم ہے لہٰذا اس لئے متعین۔ لہٰذا زمانہ کوئی آزاد تخلیقی حرکت نہیں۔ وہ مرور نہیں کرتا نہ حوادث رونما ہوتے ہیں۔ ہم ان سے صرف دوچار ہوتے ہیں"
(خطبات مدراس)

---

[۱] "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" مترجمہ نذیر نیازی

[۲] MYSTERIOUS UNIVERSE

[۱] THE WORLD AS I SEE IT: BY ALBERT EINSTEIN

اقبال کی رائے یہ ہے کہ آئین سٹائن نے ریاضی میں محدود ہوکر زماں کی دوسری خصوصیات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا صریحاً حقیقتِ حال کے خلاف ہوگا کہ زمانے کی حقیقت صرف انہی خصائص پر مشتمل ہے۔ جن سے آئن سٹائن نے اس لئے بحث کی ہے کہ عالمِ فطرت کے اُن گوشوں کی تشریح صحیح طریقہ سے ہوتی رہے جو اصولِ ریاضی کا موضوع ہیں۔ علامہ اس کا اعتراف صاف لفظوں میں کرتے ہیں کہ ہم غیر ریاضی دانوں کے لئے آئن سٹائن کے تصورِ زماں کی صحیح ماہیت کا سمجھنا ایک مشکل امر ہے۔ تاہم زمانے کو چوتھا بُعد قرار دینے سے زمانے کی نفی ہو جاتی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ برگساں کا زمانہ جسے وہ استدام (PURE DURATION) سے تعبیر کرتا ہے، اور آئن سٹائن کے زمانے کی ماہیت اور ہے۔

اقبال کامل طور پر کسی سے متفق نہیں۔ وہ برگساں کے نظریۂ زمانِ خالص کے قائل ضرور رہیں۔ لیکن برگساں کائنات کو بے غایت بتلاتے رہے۔ کیونکہ کائنات کو بامقصد مان لینے سے اس کی فکری کاوشوں کا مرکزی تصور بے معنی قرار پاتا ہے اور زمانے کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ اقبال نہ زمانے کی نفی کرتے ہیں اور نہ کائنات کو بے غایت بتلا کے اس کے حسن و خوبی کی روح ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کائنات کا مرور فی الزماں مطلب سے خالی نہیں۔ اس کی غایات اس کے سفر کی نہایات ہیں۔ یہ غایات و مقاصد وہ ہیں جو معرضِ امکاں میں ہیں معرضِ وجود میں نہیں۔ زمانہ کوئی خط کشیدہ نہیں بلکہ ہنوز منت کشِ کشیدن ہے۔ اس سے مقصود وہ ممکنات ہیں جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں یا نہ آئیں۔ کائنات کو بامقصد ٹھہرانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زمانے کے اس عمل کی نوعیت انتخابی ہے۔ وہ ماضی کے تحفظ و اضافہ کے ساتھ اپنی کوئی غرض بھی پوری کر رہا ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن مجید کے مطمحِ نظر سے کائنات کا کوئی تصور اس قدر مہمل و بے معنی نہیں جتنا یہ کہ وہ کوئی پہلے سے سوچا ہوا منصوبہ ہے اور یہ اس منصوبہ کی زمانی نقل ہے۔ قرآن کی رو سے کائنات ایک وسعت پذیر حقیقت ہے۔ وہ پہلے سے مقررکردہ کوئی منصوبہ نہیں جس کو اس کے خالق نے بہت پہلے تیار کیا تھا مگر وہ اب مادے کے ایک مردہ ڈھیر کی مانند مکانِ لامتناہی میں پڑا ہوا ہے جس پر زمانے کا کوئی تصرف نہیں۔ اس لئے اس کا وجود و عدم بے معنی ہے۔

اقبال کے یہاں چونکہ ہر چیز کی قدر و قیمت کا معیار ان کا نظریۂ خودی ہے، اسلئے جو شے بھی خودی کو استحکام بخشتی ہے مستحسن ہے اور جو اس کو مضمحل کرے مستوجبِ مذمت ہے۔ چونکہ نظریۂ اضافیت اپنے چوتھے بُعد کی تعبیر سے زمانے کی نفی کرتا ہے، اس لئے جبریت لازم آتی ہے۔ اس لئے وہ اضافیت کے اس انکشاف کو آئن سٹائن کی ریاضیاتی ذہنیت کا عجز قرار دیتے ہیں۔ جبریت کے حق میں اضافیت کا یہ فیصلہ سازِ خودی کے تاروں کو ڈھیلا کر دیتا ہے اور ہمیں جبر و بیچارگی اور یاس و قنوطیت کی پستیوں میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ اقبال عالمِ فطرت کی اس جبریت کو کسی صورت میں بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ہر فرد کو ذوقِ اختیار کی لذت آشنا بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اقبال جو آدمی کے فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر انسان کے پرشکوہ تصور میں گم رہتے ہیں، جنہوں نے عالمِ انسانیت کو قہاری و جباری کے سبق دئے ہیں۔ اور خودی کی جلوتوں میں مصطفائی اور خودی کی خلوتوں میں کبریائی دیکھی ہو وہ بھلا اضافیت کے پیدا کردہ بے دست و پا انسان کی پذیرائی کس طرح کر سکتے ہیں؟

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ نظریۂ اضافیت سائنس کا نظریہ ہے۔ سائنس داں چونکہ فطرت کا مطالعہ ریاضیاتی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے اور واقعات کا مثالی نمونہ صرف ریاضی کی حدود میں بیان کیا جا سکتا ہے؟ اس لئے نظریۂ اضافیت، جو کہ واقعات کے مشہود نمونہ سے مستخرج ہے، صرف ریاضیاتی علائم و مصطلحات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ اشیا کی پیمائش سے سروکار رکھتا ہے، بذاتِ خود اشیاء سے بحث نہیں کرتا۔ اس لئے یہ زماں و مکاں کی ماہیت کے متعلق ہمیں کچھ نہیں بتلا سکتا۔ ہٰکے باوجود نظریۂ اضافیت، جبریت کی تائید کرتا نظر آ رہا ہے[ے] زمان و مکان کے سلسلہ (CONTINUUM) میں ایک نقطۂ مکاں کو زماں کے ایک لمحہ میں پیش کرتا ہے، کسی تجاذبی کمیت (GRAVITATING MASS) جیسے سورج نے فضا کے ایک مخصوص نقطہ کو کسی خاص زماں کے لمحہ میں گھیر لیا ہو، وہ صرف واحد نقطہ کی حالت میں ہی اس سلسلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لمحہ میں اس کی حالت بتدریج دوسرے نقطوں کی صورت میں بدلتی جائے گی۔ اس طرح ان نقطوں کو آپس میں ملانے سے کائناتی لکیروں کا ایک پورا جال بچھ جاتا ہے جس میں پوری فطرت اور اس کے اعمال اسیر ہیں۔ اگر یہ کائناتی لکیریں واقعی کوئی وجود اس سلسلہ میں رکھتی ہیں تو

ے (PHYSICS AND PHILOSOPHY—P.119)

کائنات کی پوری تاریخ اس کا استقبال و ماضی قطعی طور پر پہلے ہی سے متعین ہے۔ اضافیت نے اشیاء کو منطقی تحلیل کے بعد اس چوکھٹے میں اسیر کر دیا ہے جس سے مادہ کسی حد تک غیر مادی ہو گیا ہے۔ اس سے طبیعیات کا حالیہ میلان عینیت کی طرف مڑ گیا ہے۔ سائنس کو اپنی خارجیت کا جو یقین تھا وہ اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ بقول رسل جب عام انسان سائنس کے انکشافات پر اعتبار کرنے لگا تو تجربہ گاہ کا عامل اپنے اعمال کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جدید طبیعیات عینیت پسند فلسفی برکلے کے ثمراتِ فکر کی تائید کرتی نظر آ رہی ہے۔ برکلے نے انگلی اٹھا کر جن فکری بلندیوں کی طرف اشارہ کیا تھا، بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی سائنس نے اسی جانب پرواز کا آغاز کر دیا۔ اضافیت کا یہ عینی تصورِ کائنات اقبال کے نظریات سے ہم آہنگ ہے۔ اس سے منطقی طور پر شعور کی برتری لازم آتی ہے۔ جتنے مادی مکاتبِ فکر ہیں وہ اس بنیاد پر قائم ہیں کہ مادہ شعور سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ موجودہ طبیعیات کا عینیت کی طرف یہ رجحان دراصل پچھلی دو صدیوں کی مادہ پرستی کے ردِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوا، سائنس اضافیت کے لئے تیار ہو چکی تھی، اسی لئے پائنکارے نے ایک موقع پر کہا تھا کہ وہ بجائے خود اضافیت کے محدود نظریہ کے انکشاف سے بہت قریب تھا آئن سٹائن کی کائنات میں صرف مادہ کی ظلمت ہی چاروں طرف نہیں

پھیلی ہوئی ہے، بلکہ وہ ایک ایسی ہستی کا بھی اثبات کرتا ہے جو اپنی ماہیت میں روحانی واقع ہوئی ہے اور ہم اپنے مادی و ذہنی طریقِ تفتیش سے اس کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ اضافیت کے انکشاف کے ساتھ شبستانِ فکر میں ایک نئی صبح اپنے جلو میں نور و تابندگی لئے طلوع ہوئی۔ ہمارا شاعر ظلمتِ گریزپا اور آفتابِ تازہ دونوں کو دیکھتا ہے۔ اور اس پیکرِ تابش و تنویر کا ان لفظوں میں خیر مقدم کرتا ہے؛ سے

جلوۂ می خواست مانند کلیم ناصبور
تا ضمیرِ مستنیر او کشود اسرارِ نور
از فرازِ آسمان تا چشمِ آدم یک نفس
زود پروازے کہ پروازش نیابد در شعور
بے تغیر در طلسمِ چون و چند و بیش و کم
برتر از پست و بلند و دیر و زود و نزد و دور
در نہادش تار و شید و سوز و ساز و بگذشت
اہرمن از سوز او و ساز او جبریل و حور
من چہ گویم از مقامِ آں حکیمِ نکتہ سنج
کردہ زردشتے ز نسلِ موسیٰ و ہارون ظہور

★

بنیادِ مجلسِ اقبال :— بقیہ صـ

تھا۔ وہ دور کانگریس کی قوت اور عروج کا تھا۔ ہر صوبے میں کانگریس کی حکومت تھی اور ہمیں ان سے اور ہندی کے بڑے بڑے مہاتماؤں سے اردو کے معاملے میں لڑنا جھگڑنا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے ہندی والے اور ان کے اخبار ریاست کو بدنام کرتے تھے۔ اس لئے میں نے انجمن کا مستقر بدلنا مناسب سمجھا۔ تبدیلیٔ مقام اور آئندہ نظامِ عمل کے فیصلے کے لئے ایک کل ہند اردو کانفرنس کی تجویز کی۔ اس کا ذکر میں نے ایک خط میں علامہ اقبال سے بھی کیا۔ انہوں نے لکھا کہ پہلے سے اچھا ہوں مگر افسوس ابھی سفر کے لائق نہیں..... بہر حال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہو گیا تو انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانئے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

اس کانفرنس کا علی گڑھ یونیورسٹی میں ہونا قرار پایا۔ اس میں ہر صوبے کے اکابر شریک ہوئے۔ علامہ اقبال نے میری دعوت کے جواب میں لکھا:

"میں علی گڑھ حاضر ہونے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا۔ مگر افسوس کہ کمر کے درد سے ابھی تک افاقہ نہیں ہوا..... آپ کی تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی:"

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

"نغمہ کجا و من کجا"

کرم حیدری

اقبالؒ کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے کہ ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اسی مضمون کے کئی اور اشعار بھی ہیں جن کے ذریعے علامہ مرحوم اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ ان کی شاعری کی بنیاد لفظ و بیاں پر نہیں، فکر و معنی پر استوار ہے۔ شعر سے ان کا مقصود الفاظ کی تصویر گری نہیں۔ معانی کی نقاب کشائی ہے۔ اس لئے انہیں دعوائے فن نہیں اور نہ وہ اپنے آپ کو خدائے سخن کہتے ہیں بلکہ وہ نغمے سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے متعلق لکھنے والوں نے اُن کے فکر، تخئیل، فلسفہ اور پیغام کے متعلق تو بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کے شاعرانہ فن کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبالؔ کا کلام فکری نادرہ کاریوں کا بے بہا خزینہ ہے اور اس میں اسرار و رموز کے نہایت بیش بہا موتی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ موتی صناعانہ چابکدستی کے آئینہ دار بھی ہیں یا نہیں۔ شاعر بیک وقت غوّاص بھی ہے اور جوہری بھی۔ جب تک وہ فکر و تخئیل کے موتیوں کو فن کارانہ چابکدستی سے جاذبِ نظر نہ بنائے، انہیں مقبولیت حاصل نہیں ہو سکے گی۔

اقبالؔ کے کلام کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اس کے حسن و خوبی کی ایک قوی دلیل ہے۔ اس دعوے پر دو قسم کے لوگ معترض ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سرے سے اقبالؔ کے کلام کی قبولیت عامہ کے منکر ہیں اور دوسرے وہ جو اس کو تسلیم تو کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے نزدیک اس کی وجوہ حسنِ کلام کی بجائے کچھ اور ہیں۔ کہا جاتا ہے ان کے کلام میں فلسفے کی اتنی بھرمار ہے کہ عام آدمی کا ذہن اس کے معانی تک رسا نہیں ہو سکتا۔ بیشک اقبالؔ نے اپنے کلام میں مسائلِ حیات پر زیادہ توجہ دی ہے اور ان کو پیش کرنے کے لئے فلسفیانہ اندازِ بیان بھی اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ نہ تو خشک ہے اور نہ اوسط درجے کے پڑھے لکھے انسان کی رسائی سے باہر ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کلام اقبالؔ کی مقبولیت ہیئت کی رعنائی اور اسلوب کی دلآویزی سے زیادہ اپنی معنوی خوبیوں سے ہے یعنی انہوں نے جن مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، وہ بذاتِ خود اہم اور لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ لہٰذا اس دور کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں اُن کے کلام کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اگرچہ اس دلیل میں بہت وزن ہے لیکن محض موضوعات کی اہمیت کو مقبولیت کی اساس قرار دینا مبالغے سے خالی نہیں۔ موضوعات کی اہمیت بجائے خود مسلّم اور زندگی سے قریبی تعلق کی بنا پر پڑھے لکھے لوگوں کا ان میں دلچسپی لینا درست، لیکن ان مسائلِ حیات پر بیسیوں دوسرے علما نے بھی قلم اٹھایا ہے، اور جہاں تک تجزیۂ مسائل اور اُن کے حل پیش کرنے کا تعلق ہے۔ ان کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ پھر بھی ان کی تصنیفات محض کتب خانوں کی الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں اور بس، اس سے ظاہر ہے کہ حسنِ بیاں کے بغیر موضوعات کی اہمیت سے کچھ نہیں بنتا۔ یہ انسانی ذہن کی خصوصیت ہے کہ وہ کسی نہایت اہم مسئلے کو بھی اسی صورت میں قبول کرتا ہے۔ جب اُس کا بیان دلنشیں انداز میں کیا جائے۔ خود قرآن حکیم جو کلام الٰہی اور سرتاسر دانش و حکمت کا سرچشمہ ہے اس لئے انسان کو براہِ راست متاثر کرتا ہے کہ اس میں حسنِ کلام بدرجۂ کمال موجود ہے۔

عظیم ادب وہی ہو سکتا ہے جس میں افادیت نمایاں ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا ادب ہونا بھی ضروری ہے۔ ادب کی

دوسری اصناف کے لئے بھی ادبیت شرط اولیں ہے۔ پھر شاعری میں تو جب تک شعریت نہ ہو افادیت اور مقصدیت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے جس چیز کو لوگ ادب برائے ادب کہتے ہیں اُس میں بھی ایک مقصد ضرور ہوتا ہے یعنی ایسے ادب کی تخلیق جس میں ادبیت دوسرے تمام پہلوؤں سے زیادہ نمایاں ہو۔ یہ درست ہے کہ شعر و ادب انسان کی بنیادی ضرورتوں میں شامل نہیں۔ ہزاروں لاکھوں انسان ایسے ہیں جنھیں شعر و ادب سے قطعاً کوئی مس نہیں لیکن وہ نہایت مطمئن اور آسودہ زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر اُن کی زندگی ادب سے شغف رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں مطمئن تر اور آسودہ تر ہوتی ہے۔ اگر شعر و ادب بنیادی ضرورت کی چیز ہوتی تو بھی اس میں حسن اور رنگینی کی ضرورت تھی کیونکہ ان سے ہماری بنیادی ضرورتیں بھی احسن طریقے سے سر انجام پاتی ہیں۔

اس سے ہم منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کوئی شاعر جتنا بڑا ہوگا اُس کے اشعار میں لفظ و صوت کا حسن اتنا ہی جامع اور مکمل ہوگا۔ ہمارے تنقید نگار اقبال کو ایک بہت بڑا فلسفی، دانائے اسرار حیات، معلم خودی، مفکر اسلام اور حکیم الامت کہتے ہیں۔ لیکن اگر شاعر اقبال ان تمام حیثیات کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہے، تو لازماً اُن کے کلام میں لفظ و صوت کا حسن بھی اوج کمال پر ہونا چاہیئے۔

اقبال نے جہاں خطبات مدراس میں اپنا فلسفۂ حیات پیش کیا ہے وہاں اس کی جھلکیاں اپنی شعری تخلیقات میں بھی پیش کی ہیں۔ ان کے مطالعے سے جو لذت حاصل ہوتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کا شمار دنیا کے بلند ترین شعرا میں ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں حسن معنی کے ساتھ حسن صورت بھی نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہونا چاہیئے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ ؎

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انسان کو ترا حسنِ کلام آئینہ

اسی لئے انہوں نے شروع سے آخر تک فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔

کلام اقبال کا ایک نہایت دلکش پہلو شگفتہ و مترنم بحروں اور دلآویز و خوش آئند قافیوں اور ردیفوں کا انتخاب ہے۔ انہوں نے بحروں میں کوئی نئے تجربے نہیں کئے اور نہ کوئی نئے زحافات استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ نئے نئے تجربوں کی ضرورت اس لئے محسوس کی جاتی ہے کہ شاعر انفرادیت پیدا کرے۔ اقبال کی انفرادیت زیادہ تر ان کے جدید اور انوکھے موضوعات کی وجہ سے ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے بحروں کے انتخاب میں نہایت فنکارانہ سوجھ بوجھ سے کام لے کر ایسی شگفتہ اور مترنم بحروں میں نظمیں اور غزلیں کہی ہیں کہ کلام میں خود بخود موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ عمدہ قوافی اس موسیقیت میں اور بھی اضافہ کرتے ہیں جو اچھی شاعری کی جان ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ دیکھئے ان میں بحروں اور شگفتہ قافیوں نے کیا سماں باندھا ہے:۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن
گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن
عقل است چراغِ تو؟ در راہگزارے نہ
عشق است ایاغِ تو؟ با بندۂ محرم زن

رخت بہ کاشمر کشا، کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں، لالہ چمن چمن نگر
دخترکے برہمنے، لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او کشا، باز بہ خویشتن نگر

ایں ہم جہانے آں ہم جہانے	ایں بیکرانے آں بیکرانے
ہر دو خیالے ہر دو گمانے	از شعلۂ من موجِ دخانے
ایں یک دو آنے آں یک دو آنے	من جاودانے من جاودانے

صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
آں سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من
در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من
در دیر نیازِ من در کعبہ نمازِ من
زنار بدوشم من، تسبیح بدستم من

شاعری الفاظ کا طلسم ہے اور الفاظ و تراکیب کا حسن اور ان کا فنکارانہ استعمال ہی اس کو سحرِ حلال بنا دیتا ہے۔ حقیقت

کسی زبان میں کوئی دو لفظ پورے طور پر مترادف نہیں۔ کلام میں جہاں ایک لفظ کوئی معنی دے رہا ہے وہاں دوسرا لفظ مکمل طور پر وہی مفہوم ادا نہیں کر سکتا۔ باکمال ادیب ہر لفظ و ترکیب کے مزاج سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔

اقبال کے ہاں الفاظ کی یہ سحر آفرینی اوجِ کمال پر نظر آتی ہے۔ انہیں الفاظ پر اتنی قدرت ہے کہ انہوں نے بہت سے الفاظ کو نئے مفہوم عطا کئے ہیں۔ وہ فارسی محاورہ کا نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ اور ایسی ایسی تراکیب پیدا کرتے ہیں۔ جنہیں سن کر اہلِ ایران بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک غزل کے چند اشعار سنئے:۔

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام
تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچیدمش
شعلۂ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما

یہ غزل حافظ شیراز جیسے مسلم الثبوت استاد کی زمین میں لکھی گئی ہے۔ اور اہلِ نظر جانتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے کس قدر قریب ہیں:۔

اے فروغِ ماہِ حسن از روئے رخشانِ شما
آبروئے خوبی از چاہِ زنخدانِ شما
عزمِ دیدارِ تو دارد جان بر لب آمدہ
باز گردد یا بر آید چیست فرمانِ شما
دل خرابی می کند دلدار را آگہ کنید
زینہار اے دوستاں جانِ من و جانِ شما

حافظ کی غزل کے چودہ قافیوں میں سے اقبال نے صرف ایک قافیہ "جان" استعمال کیا ہے۔ اور وہ بھی "جانِ من و جانِ شما" کی ترکیب لانے کے لئے۔ جس چابکدستی سے اقبال نے اسے استعمال کیا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

نظیری کی ایک مشہور غزل ہے:۔

گریز داز صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست   کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

اس کے جواب میں اقبال کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

زخاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلی دگرے درخورِ تماشا نیست
نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست
غلامِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت
بہ جادۂ کہ دراں کوہ و دشت و دریا نیست

الفاظ کا یہ فصیح اور فنکارانہ استعمال۔ اس کے بعد اُن کے ترنم اور لوچ سے شعر میں موسیقی پیدا کرنا ایسا ہنر ہے جو شعر کے حسن و تاثیر میں بے بہا اضافہ کرتا ہے۔ شعر کا پہلا تاثر اُس کا صوتی تاثر ہوتا ہے جو ہمارے وجدان کو براہِ راست متاثر کرتا ہے۔ اس سے ذہن شعر کے معنوی تاثر کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں الفاظ کا ترنم بھی بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے:۔

شوقِ غزل سرائے را رخصتِ ہاؤ ہو بدہ
باز بہ رند و محتسب بادہ سبو سبو بدہ
شام و عراق و ہند و پارس خو بہ نبات کردہ اند
خو بہ نبات کردہ را تلخیٔ آرزو بدہ
مردِ فقیر آتش است میری و قیصری خس است
فال و فرِ ملوک را حرفِ برہنہ بس است

اسلوب میں اقبال اساتذۂ فارسی سے بہت متاثر ہیں انہوں نے حافظ کے سحرِ بیان کو اپنا سحرِ کلام بنا لیا ہے۔ غزلوں پر غزلیں حافظ ہی کی زمینوں میں ہیں۔ چونکہ ان کا موضوع حافظ کے موضوع سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس لئے جو شخص حافظ کے کلام پر بھی نظر رکھتا ہے۔ وہ اقبال کی غزلوں سے خاص طور پر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اقبال نے حافظ کی بعض غزلوں کی ردیفیں بدل کر ان کی زمینوں کو آسمانوں پر پہنچا دیا ہے۔ حافظ کی ایک مشہور غزل ہے:۔

ایں خرقہ کہ من دارم در رہنِ شراب اولیٰ

اقبال نے اسی زمین میں "اولیٰ" کی جگہ "آخر" رکھ کر اردو میں ایسی غزل لکھی ہے جو صوتی تاثر سے لبریز ہے:۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

قدیم شعرا اپنے کلام میں صنائع بدائع کا اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ یہ لفظی رعایتوں کا گورکھ دھندا بن کر رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ عرفی و نظیری جیسے معنی پرست شعرا بھی ان کا التزام کئے بغیر نہ رہ سکے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاعری میں جذبے کی کمی آجاتی۔ اور شعر حسین الفاظ کا ایک ایسا نگارخانہ بن جاتا جو دیکھنے میں تو آنکھوں کو خیرہ کر دیتا۔ لیکن اس کے اندر کچھ بھی نہ ہوتا۔

اقبال کے ہاں جذبے کی فراوانی ہے، اس لئے صنائع بدائع کا التزام نہیں۔ الفاظ کی موسیقیت اور اُن کی دروبست کا لحاظ انہوں نے ہمیشہ رکھا ہے۔ نئی نئی تشبیہات و تراکیب کے علاوہ وہ محاکات و تلمیحات سے بھی بہت کام لیتے ہیں۔ محاکات کے لئے جس بلندیٔ تخیل کی ضرورت ہے اس سے وہ بدرجۂ اتم بہرہ ور ہیں۔ اور جس خوبی سے وہ قدرتی مناظر اور باطنی واردات کو خارجی پیکر عطا کرتے ہیں۔ اس سے محاکات کا پورا پورا حق ادا ہوتا ہے۔ تلمیحات کے لئے ایک وسیع ذہنی پس منظر کی ضرورت ہے۔ اقبال کی نظر مشرقی و مغربی زبانوں کے ادب کے علاوہ فلسفۂ نفسیات اور تاریخ پر بھی تھی۔ اسی لئے ان کے یہاں تلمیحات کی غیر معمولی فراوانی نظر آتی ہے۔ اور فارسی و اردو کے کم ہی شاعر اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے تلمیحات کو ایسی معنوی وسعت عطا کی ہے کہ یہ ہمارے ادب میں علائم کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

شانِ خلیل ہوتی اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اگر تلخِ کنی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

داخلی محاسن میں سب سے پہلی چیز اقبال کا فنی خلوص ہے کیونکہ وہ شاعری کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ خیال کرتے ہیں ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

وہ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فن کے ذریعے ملک و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

اسی خلوص کی بدولت اقبال کی شاعری ہمیشہ ارتقا پذیر رہی اور ان کی شاعری اُن بلندیوں تک جا پہنچی جہاں اُس کی سرحدیں پیغمبری سے مل جاتی ہیں۔

اسے خلوصِ فن کا نتیجہ سمجھئے یا جبلی صلاحیت کا کرشمہ کہ اقبال کے اندازِ بیان میں بے انتہا نکھار اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ نہایت دقیق اسرار و رموز کی ترجمانی کرتے ہیں پھر بھی ان کے بیان میں کوئی الجھن، پیچیدگی یا ابہام دکھائی نہیں دیتا۔

خلوصِ فن اور جلائے فکر کا لازمی نتیجہ شاعر کے فکر و بیان میں ہم آہنگی ہے جو عظمتِ کلام کا سنگِ بنیاد ہے۔

باقی صـ ۴۱ پر

"از بادۂ الاست": اقبال

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

مرگ نے بھینچ لیا تیرے تنِ خاکی کو،
تو مگر مر نہ سکا،
قبر تیرے لئے آغوش کشا بیٹھی ہے،
مرگ سمجھی تری منزل ہے یہی،
"اِن ستاروں کے پرے اور بھی دنیائیں ہیں"
اسے معلوم نہ تھا،
مرگ خود شہپرِ پرواز بنی،
رُوحِ بیباک نے "خورشید کا سامانِ سفر تازہ کیا"
راہ تکتی ہی رہی قبر کہ اب آتا ہے،
کتنی افسردہ و مایوس ہے قبر!
قبر کی منزلِ تاریک ترا مسکن ہو؟
تو کہ "روشن ہے جبیں" تیری ستاروں کی طرح!
بے خبر تھی ترے جوہر کی تواتابی سے،
گرمئ عشق نے کی تیرے وہ مشعل روشن،
جس کے شعلے کی لپک ہے ابدیت بکنار،
مرگ بیٹھی ہی رہے گی ترے مرقد کے حضور،
تو چمکتا ہی رہے گا سرِ دامانِ سحاب!

پروانہ و شمع

(اقبال کے حضور میں)

ڈوسن کاک برن (واشنگٹن)

مترجمہ: شہاب رفعت

دریا سا دریا!
میں چلتے چلتے
پہنچا ہوں آخر
اس کے کنارے
شاید کہ پالوں
گہرائیوں میں
ہلکا سا پرتو
اُس اک نفس کا
جو ماورا ہے
یوں این و آں سے
یہ ابتدا ہیں
وہ انتہا ہے
یہ عام انساں
وہ دیوتا ہے!

اے مردِ کامل!
ہے تیری ہستی
جلوہ سراپا
میں تیرے آگے
ناچیز سایہ
بے نور آنکھیں
دشتِ طلب کا
بے تاب راہی
مغرب سے آیا
پروانہ آسا
کرنوں کا پیاسا
ہر ایک لمحہ
جلووں کا جویا!

[illegible] کراچی، اپریل [illegible]

افکارِ جدید:

سرریلزم: خواب اور حقیقت کا سنگم

(ایک مغربی فنی تحریک کا جائزہ)

دیویندر اسّر

چند برس ہوئے لندن کے ایک ہال میں کوئی شخص آرٹ پر تقریر کر رہا تھا۔ اس نے سر پر غوطہ خوری کا خود پہن رکھا تھا۔

"آخر یہ ہیئت کذائی کیوں؟"

"میں تحت الشعور میں غوطہ لگانا چاہتا ہوں" مقرر نے جواب دیا۔

یہ مقرر مشہور سرریلیسٹ مصور، سلویدار ڈالی تھا جس کی تصویر "یاد کا دوام" سرریلیسٹ آرٹ اور طرزِ زندگی کا نمائندہ اور نادر نمونہ ہے۔

اس قسم کی ہیئت کذائی اور خود نمائی شاید سطحی، مبالغہ آمیز، طفلانہ اور غیر عادی قرار دی جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈالی نے اس طرح سرریلزم کے فکر و فن کا جوہر پیش کر دیا ہے۔ تحت الشعور میں ڈوب کر تخلیقِ فن ہی سرریلزم ہے۔ ڈالی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرریلزم ایک طرزِ فن ہی نہیں بلکہ طرزِ زندگی بھی ہے۔ چنانچہ اس نے جو وضع اختیار کی وہ سرریلزم کے نظریے کی آئینہ دار تھی۔

تحت الشعور کیا ہے؟ — شعور اور لاشعور کا سنگم جس کی سرحد پر فن کار لاشعور کی گہرائیوں سے اپنے فن کا مواد اخذ کرتا ہے۔ اور اسے شعور کے ذریعہ پیش کرتا ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس پر خارجی دنیا سے تشکیل شعور کا عکس نہ پڑنے پائے۔ سرریلسٹ فن کار کے لئے اعلیٰ تر حقیقت لاشعور کی پہنائیوں میں مستور رہتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ حقیقت شعور یا کسی سطحی اور خارجی معیار سے مسخ ہو جائے، اسے فنی گرفت میں لانا ضروری ہے کسی بھی جبلت یا جذبے کو اخلاقی یا مخربِ اخلاق قرار دینا، اس جبلت یا جذبے پر شعور کے ذریعے غور کرنا ہے جس سے وہ غیر حقیقی ہو جاتا ہے، اس کی اصلیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور ہمیں حقیقت کی مسخ شدہ صورت نظر آتی ہے۔ سرریلزم کے تحت فنی تخلیق عالمِ جذب میں تخلیق کرنے کے مترادف ہے۔ جس میں ادیب یا فن کار کے ذہنی عمل پر کوئی شعوری یا خارجی بندش نہیں ہوتی۔ اس طرح سرریلزم نے انسانی ذہن کے حقائق کو صداقت سے مکمل طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ادب میں لاشعور کو بنیادی اہمیت دی ہے۔

سرریلزم کو منفی تحریک کہہ کر مطعون کرنا صحیح نہیں۔ سرریلزم ذہن انسانی کے اُن سربستہ رازوں کی ترجمانی ہے جنہیں خارجی دنیا کی رسوم و قیود، سماجی اقدار اور ان سے پیدا شدہ اخلاق و ضمیر کے باعث ظاہر ہونے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اور وہ لاشعور کے تہ خانے میں نمو پانے کے لئے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ سرریلزم کا سرچشمہ لاشعور ہے۔ جو حقائق خواب کے ذریعہ تمثیلی انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں، سرریلزم ان میں معنی خیز اور باہم تمثیلوں کی فن کارانہ تنظیم ہے جو بظاہر بے ربط، منتشر، بے ہنگم اور غیر منظم نظر آتے ہیں لیکن جن میں گہرا ربط اور وحدت پائی جاتی ہے۔ سرریلٹی ایک ایسی حقیقت ہے جو ابھی شعور سے ملوث نہیں ہوئی۔ سرریلیسٹ فن کار سمبل یا تمثیل کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اسے وہی چیز سمجھتا ہے جس کا کہ وہ سمبل ہے۔ سرریلزم میں تمثیل حقیقت کے مماثل نہیں بلکہ خود ہی عین حقیقت ہے۔

لاشعور کی غیر ارادی، غیر منطقی اور خود کار (AUTOMATIC) فینٹسی یعنی عجیب و غریب قسم کی خیال آرائی اور آزاد تلازم ایک برتر قسم کی حقیقت (SUPER REALITY) کو پیش کرتے ہیں چنانچہ سرریلزم کے معنی ہی بالائی یا فوقانی قسم کی اصلیت یا حقیقت کے ہیں کیونکہ فرانسیسی میں 'سُر' کے معنی ہیں پر یا اوپر۔ یہ حقیقت روزمرہ کی عملی اور خارجی زندگی اور نام نہاد حقیقت نگاری کی دنیا سے مسخ ہو جاتی ہے۔ سرریلیسٹ فن کار خواب کی اس دنیا کو پیش

کرتے ہیں جن کی تمثیلیں لاشعور سے تشکیل پاتی ہیں۔ اور جن کی تفہیم ناظرین یا قارئین اپنی لاشعوری ساخت کے مطابق خود کرتے ہیں۔ اس لئے وہ خودکار تحریروں اور تلازماتی تخلیقات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ سرریلٹی شعور سے پوشیدہ رہتی ہے، اس لئے وہ خواب، خواب بیداری، پاگل پن اور خودکار تحریروں میں ہی جھلکتی ہے۔ سرریلزم میں اسی ذہنی حالت کی عکاسی کی جاتی ہے۔ جس سے اس کے غیر استدلالی عنصر کو مسخ کئے بغیر تحت الشعور کو شعور میں پیش کیا جاتا ہے۔ سرریلزم میں ہر قسم کی خارجی و شعوری سعی کو مصنوعی اور فن کے لئے مضر قرار دیا گیا ہے۔

سرریلزم دو عظیم جنگوں کے مابین فرانس اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں ایک ممتاز ادبی و فنی تحریک کی شکل میں مقبول ہوئی۔ سرریلسٹ فن کار، لاترے مون (LAUTRE MAUNT) کو اپنا استاد مانتے ہیں اور اپنے نظریات کی مابعد الطبعیاتی منطق کی وضاحت ہیگل کے فلسفے میں تلاش کرتے ہیں۔ لاترے مون کا یہ فقرہ جو کافی مشہور رہا، سرریلزم کی بوجہ احسن نمائندگی کرتا ہے۔ "عمل جراحی کے میز پر کپڑا سینے کی مشین اور چھتری اتفاقیہ ملاقات کی طرح حسین"۔ فرانسیسی ادب میں اپولینئر (۱۸۸۰-۱۹۱۸) نے ۱۹۱۷ء میں اپنے ایک ڈرامہ کو سرریلسٹ ڈرامہ قرار دیا تھا۔ لہٰذا اگر اسے سرریلزم کا بانی نہ تسلیم کیا جائے تو بھی اُس کی شاعری میں سرریلسٹ رجحانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کی شاعری میں الفاظ اور علامات کا آزاد تلازم نہیں تھا پھر بھی اُس نے اِن کا فیصلہ کن استعمال کیا ہے۔ اِس سے قبل الفریڈ جارَی (۱۸۷۳ء — ۱۹۰۷ء) کی تخلیقات سماجی اور ادبی تخریب کو پیش کر چکی تھیں جنہیں سرریلسٹ تکنیک میں پیش کیا گیا ہے۔ آئرش مسالموں نے روسی انقلاب اور یہودیت کے خلاف اپنے خیالات کو سرریلسٹ شاعری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ لیون پول فارگ جو سمبالزم اور سرریلزم کے سلسلہ کی کڑی تصور کیا جاتا ہے شروع شروع میں سرریلزم کو تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا۔

سرریلزم اپنے پیش رَو دادا ازم اور فرائیڈ کے نظریات کا نتیجہ ہے۔ دادا ازم ادبی روایت پرستی کے خلاف ایک تخریب پسند احتجاج تھا جو کسی بھی نظریہ، تصور، یا روایت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے مقولے کے مطابق دادا ازم خود دادا کے خلاف تھا۔ یہ تحریک تمام تر مروجہ منطق، اداروں، اقدار اور نظریات کے خلاف شروع ہوئی تھی۔ جون ۱۹۲۲ء میں پیرس میں دادا ازم کی آخری عظیم کانفرنس ہوئی جس میں دادا ازم کے ممتاز مفسر زارا اور دوسرے اہم رکن آندرے برتیوں میں اختلاف رائے ہو گیا۔ اس نظریاتی کشمکش میں آندرے برتیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ دادا ازم کے بہت سے پیروؤں نے جن میں لوئی آرگوں، پول ایلوار اور فلپ سوپول بھی شامل تھے، آندرے برتیوں کا ساتھ دیا۔ لوئی آرگوں اور پول ایلوار سرریلسٹ تحریک کے باقاعدہ بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بعد میں دونوں مارکسی نظریے کے زیر اثر اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ اگرچہ پال ایلوار نے مکمل طور پر اس تحریک سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ اُس نے سرریلزم کو سہل انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ دادا ازم سے الگ ہونے کے دو سال بعد آندرے برتیوں نے باقاعدہ طور پر سرریلزم کی داغ بیل ڈالی جس میں دادا ازم کے غیر استدلالی طرز فکر اور تحت الشعور کی دنیا کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ۱۹۲۰ء اور اس کے بعد فرائیڈ کے نظریات کا بڑا چرچا تھا۔ فرائیڈ کے نظریات کے بغیر سرریلزم کا تصور ممکن نہیں۔ اس نے خواب کی دنیا دریافت کی اور سرریلسٹ فن کار اسی دنیا ہی کے باسی ہیں۔ برتیوں کو لاشعور کے نظریات اور تحلیل نفسی سے بڑی مدد ملی۔ آندرے برتیوں اور فلپ سوپول کی مشترکہ کاوش "دی میگنیٹک فیلڈز" (۱۹۲۱ء) سرریلزم کا اولین نمونہ ہے۔ انہوں نے کئی آٹومیٹک تحریریں شائع کیں اور سرریلسٹ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے آندرے برتیوں نے کئی پمفلٹ شائع کئے۔ اس نے لکھا ہے:-

> "ہمارا سب سے پہلا فرض روحانی ورثے کو ختم کرنا ہے۔ یہ ہماری جبلتوں پر ثقافتی و روحانی ورثے کا بوجھ ہے اور جب تک ہم اسے ختم نہیں کریں گے ہم اپنی جبلتوں کے مطابق زندہ نہیں رہ سکتے۔"

آندرے برتیوں نے ۱۹۲۴ء میں سرریلزم کا اولین منشور شائع کیا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ:

"سرریلزم خالص نفسیاتی آٹومیٹزم ہے جس کا مدعا زبانی، تحریری یا دوسرے ذرائع سے فکر کے حقیقی عمل کا اظہار ہے۔ ادراک کی کسی آمیزش کے بغیر اور تمام جمالیاتی و اخلاقی اقدار سے آزاد نفسیاتی عمل کو پیش کرنا سرریلزم کا نصب العین ہے۔ یہ تلازماتی اشکال کی برتر حقیقت کے اعتقاد، خواب کی قدرت کاملہ اور فکر کی آزادی عمل پر مبنی ہے۔ اس حقیقت کو ابھی تک نظرانداز کیا گیا ہے۔ سرریلزم ان کے علاوہ تمام دوسرے نفسیاتی پہلوؤں کو نظرانداز کرتی ہے اور ان کے مقام پر زندگی کے اہم مسائل کو اپنا مرکز بناتی ہے۔"

اس منشور سے واضح ہے کہ سرریلزم محض طرزِ فن ہی نہیں بلکہ طرزِ زندگی بھی ہے۔ ڈالی کی مذکورہ بالا —— مشہور تصویر یاد کا دوام میں پگھلتی ہوئی کرم خوردہ گھڑیوں کو پیش کیا گیا ہے جن کے بارے میں خود ڈالی رقم طراز ہے:

"THE TENDER EXTRAVAGANT AND ARBITR-ARY PAR ANIAC-CRITICAL CAMEMBERT OF TIME AND SPACE."

سرریلزم کے مصوروں نے ملاحظہ ہوں دو "باطنی متصوری لکھتے ہیں۔" دیال الوارڈیلم، اپنی ماں کو اس وقت پیٹو جب وہ جوان ہو (کیجان پیریٹ) ا۔ آندرے بریتوں نے تحلیل ہونے والی مچھلی کا تصور پیش کیا ہے۔ سرریلزم کی ایک نظم ملاحظہ ہو:

JAR. DIN SAUVAGE
ALONNE' DE
ONCHETS
ARDIN PAR'TINE! COMME UN CORPODE
FEMME QUE AIME

SIME'ON EST UN JOLI PRE'NOM
IX EST UN JOLI NOM DE FAMILLE
I ME' ON
IX CE NEST PAS LONG

SILENCE EST PLUS LENT ET PLUS LONG
ILENCE
ILE NCE
ILE NCE ET PASSION

ہربرٹ ریڈ نے ان نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہمیں علم ہونا چاہیے کہ اب ہمارا تعلق منطقی نشوونما سے نہیں جس کی کوئی تاریخی مثال ملتی ہو بلکہ تمام روایت سے اچانک علیحدگی ہے۔ ہر اس تصور سے علیحدگی جو یہ بتاتی ہے کہ فنِ مصوری کو کیا ہونا چاہیئے۔ بہت اچھا ہوگا کہ اس حقیقت کے لئے ہم لفظ مصوری کو بالکل چھوڑ دیں۔ لیکن جب تک یہ کینواس اور رنگ کا معاملہ ہے یہ امید کرنا لاحاصل ہے۔ تاہم ہمیں محسوس ہونا چاہیئے کہ خارجی دنیا سے ہمارے تمام رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ اور ٹھوس سے وابستگی، جو صدیوں سے یورپی فن کا خاصہ رہا ہے اور جو تصور سے الگ نہیں ہوسکتا، اس کو دانستہ طور پر خیرباد کہہ دیں۔ اس کے بجائے مصور کو اپنی تمام تر توجہ دی جس صلاحیت کا رخ اندر کی طرف یعنی اپنے داخلی تصورات، خواب بیداری اور قبل از شعور دنیا کی طرف موڑ دینا چاہیئے۔ مشاہدے کے بجائے وجدان، تجزیہ کے بجائے اختراع اور حقیقت کے بجائے تمثیل کی طرف جانا ضروری ہے۔"

سرریلزم کے نقطۂ نظر سے زندگی بالخصوص ذہنی زندگی دو مختلف سطحوں پر وجود رکھتی ہے۔ ایک سطح وہ ہے جس کی تفصیلات واضح اور ظاہر ہیں۔ دوسری سطح غیر واضح ہیجان اور پوشیدہ ہے۔ ذہن کی یہ دوسری سطح ہماری زندگی کا وسیع اور اہم حصہ ہے۔ ذہن کو ایک زیرِ آب برف کی چٹان سے مشابہت

جو بھی سطح جس کی محض بالائی سطح ہی پانی سے باہر نظر آتی ہے۔ لیکن جس کا بیشتر حصہ نظر سے غائب ہوتا ہے۔ نظر آنے والی سطح اصل حقیقت نہیں بلکہ حقیقت وہ حصہ ہے جو پانی میں پوشیدہ ہے۔ جسے ہم بادی النظر میں نہیں دیکھ سکتے۔ انسانی ذہن کا یہ عمل لاشعوری ہے۔ جو ہماری زندگی کا اہم ترین عمل ہے۔ فنی تخلیق کا سرچشمہ لاشعور ہے خاص طور پر لاشعور کی وہ پہنائیاں جنہیں فرائیڈ نے اِڈ کا نام دیا ہے۔ اگر ہم اپنے خیالات کو آٹومیٹک ہونے دیں اور تخیل کو آزاد چھوڑ دیں تو ہم لاشعور کے سرچشمے سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ جس حد تک فن لاشعور سے پروردہ اہم تمثیلات پیش کرتا ہے۔ اسی حد تک وہ اثر انگیز اور جمالیاتی طور پر اعلیٰ ہوتا ہے۔ فن ان تمثیلات کا سلسلہ پیش نہیں کرتا بلکہ ان تمثیلات کی وحدت اور اُن کے ربط کو ایک پُراثر اسطور (MYTH) کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ دراصل سرریلزم میں نئی اساطیر (MYTHOLOGY) کو جنم دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پوشیدہ زندگی کے عناصر اور اعمال کی عکاسی کرنے کے لئے فن کار خوابوں کی تصوریت اور ذہن کی خواب کے مانند حالت کا سہارا لیتا ہے۔ اسی لئے آندرے بریتوں نے کہا ہے کہ حقیقی سرریلٹی دو بظاہر متضاد حالتوں، خواب اور حقیقت، کا باہمی امتزاج ہے۔ خوابوں کو منتشر تمثیلات کے سلسلہ کے بجائے ایک اسطور کے روپ میں دیکھنا ہی وحدتِ خواب ہے۔ اور ایک فنی وحدت کے روپ میں ایک نئی حقیقت ہم پر آشکار ہوتی ہے۔ شاعرانہ فیضان خواب کی تشکیل سے مکمل طور پر مماثلت رکھتی ہے۔ ہربرٹ ریڈ لکھتا ہے:-

> "سلویدار ڈالی بیان کرتا ہے کہ کس طرح
> اس کی طشتری پورے تک چڑھنے سے ایک مسخ شدہ
> کھوپڑی کی شکل ہو گئی جس کا علم اس کے شعوری
> ذہن کو نہیں تھا اور جس کو وہ شعوری طور پر دریافت
> کرنے میں ناکام رہا۔ یہ آٹومیٹزم کا دوسرا پہلو ہے
> اس سے سرریلٹی کی صداقت سے انکار نہیں
> کیا جا سکتا جو کہ شعور سے کچھ زیادہ حقیقت ہے
> جس میں ہمارے تمام اعمال شامل ہو سکتے ہیں"

تو ذہن کے یہ سربستہ راز جنہیں سرریلزم عیاں کرتی ہے تمام انسانوں میں یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن، انہیں فن کار ہی کی تمام جامعیت سے عیاں کر سکتا ہے۔ ذہن کی اس حقیقت کی تشکیل لاشعور سے ہوتی ہے اور جتنا زیادہ ہم لاشعور کا علم حاصل کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ وہ اجتماعی لاشعور نظر آتا ہے۔ اجتماعی لاشعور مشترکہ جذبات اور خیالات کا مجموعہ ہے۔ جو آفاقی صداقت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرریلزم نے نہ صرف فرائیڈ کے نظریات کو ہی قبول کیا ہے بلکہ اس میں ژونگ کے اجتماعی لاشعور کی آمیزش بھی ہے۔ جب سرریلزم میں ایک نئی اساطیر کی تخلیق کی بات کی گئی ہے۔ تو یہ اجتماعی لاشعور اور تمام انسانی ذہن کی مشترک ہئیت اور اُس کی آفاقی صداقت ژونگ کے نظریے کی بازگشت ہے۔ یہ تحریک جہاں فرائیڈ کے نظریۂ خواب اور علامات پر مبنی ہے وہاں جس طرح ابتدائی تہذیب کی اساطیر کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی طرح کا عمل سرریلیسٹ فن کار کا ذہن بھی قبول کرتا ہے۔ اسی لئے سرریلیسٹ فن کاروں کا خیال ہے کہ سرریلیسٹ رجحانات ابتدائے فن سے ہی اس کا اہم عنصر رہے ہیں۔ خاص طور پر قدیم فن اور گیتوں میں سرریلیسٹ رجحانات کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ ابتدائی گیت کسی حد تک اجتماعی تخلیق ہیں۔ اپنے جنم میں نہ سہی لیکن نشوونما میں یہ ضرور اجتماعی لاشعور کے پروردہ ہیں اور کسی حد تک آٹومیٹک تخلیقات ہیں۔ اے. سی. بریڈلے نے اس بات پر صاد کیا ہے حالانکہ وہ سرریلزم سے وابستہ نہیں۔ وہ لکھتا ہے:-

> "اگرچہ شاعروں میں غور و فکر کی غیر معمولی
> قوتیں ہوتی ہیں لیکن شاعر کی مخصوص صلاحیت
> ان میں نہیں بلکہ اس کے تخیل میں ہوتی ہے
> اس لئے اس کی گہری تخلیقی تفسیر تخیل کے
> کے ذریعہ ہوتی ہے اور تخیل کی مخصوص شکل
> شعوری فکر کے ذریعہ پیش کرنے کے بجائے اُسے
> نیم شعوری طریقے سے پیش کرنے میں مضمر ہے۔
> اُس کی تخلیق کے بعد قاری اگر چاہے تو خیالات
> اخذ کر سکتا ہے"

ہربرٹ ریڈ "جدید فن کا فلسفہ" میں لکھتا ہے کہ مندرجہ ذیل الفاظ اب بھی زندہ ہیں جب کہ ان کا خالق مر چکا ہے

اور لوگ اس کا نام تک بھی بھول چکے ہیں:

"اک گلاب رنگ شہر جو سارے زمانے کے بہ قدر نصف قدیم ہے"

شاعر کے سارے کلام میں سے صرف یہی الفاظ زندہ رہ گئے ہیں۔

سرریلزم کے دو بڑے اسکول ہیں۔ فوٹوگرافک اور غیر تشکل۔ پہلے مدرسۂ فکر کی رو سے تصویر کے جزئیات کو عکاسانہ وضاحت سے پیش کیا جاتا ہے۔ چاہے ایسی کسی شے کا وجود بھی نہ ہو، یا دالی کی طرح اِن اشیا کو ایسے مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے کہ ان کو پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ جیسے کہ دالی کی تصویر THE PERSISTENCE OF MEMORY میں ڈھلکی ہوئی گھڑیاں ہیں۔ کئی بار اشیاء کو نئی ترکیب سے پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ ہاتھی کو مکڑی کے پاؤں لگا دینا۔ اس مدرسۂ فکر کے تحت ہر شے عکاسانہ حقیقت پرستی سے پیش کی جاتی ہے۔ سرریلزم کا یہ بنیادی نظریہ ہے کہ حقیقی کو غیر حقیقی مرکب میں پیش کیا جائے عکاسانہ سرریلزم اس کی تفسیر ہے۔ سرریلزم کا دوسرا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ آزاد عمل کے ذریعے خواب کی قدرتِ کاملہ کو پیش کیا جائے۔ فرانسیسی مصوّر آندرے ماسوں اور اسپینی مصوّر جوآن میرو اسی مدرسۂ فکر کے مقلد ہیں ایسی تصویریں آٹومیٹک تحریروں سے مماثلت رکھتی ہیں جن میں فکر کی شعوری ہدایت کے بغیر ہاتھ کو آزادانہ عمل کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے سرریلزم کی رُو سے ادبی تخلیق زیادہ سے زیادہ ادیب کے اولین ذہنی ردِ عمل کے مطابق ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ سرریلزم میں استعجاب پر زور دیا جاتا ہے۔ آندرے بریتوں کی نظر میں تعجب انگیز ہی ہمیشہ حسین ہوتا ہے۔ ہر چیز جو تحیّر پیدا کرتی ہے حسین ہے۔ تحیّر کے علاوہ کچھ بھی حسین نہیں۔

سرریلزم کے تحت ناول، افسانے، ڈرامے اور شاعری کے موضوع، مواد اور تکنیک کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ اس تحریک کا مقصد محض بغاوت اور تخریب ہی نہیں تھا بلکہ انسانی نفسیات کی صحیح اور جاندار ترجمانی کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔ لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر لکھی گئی بعض تحریریں ہمارے ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ بیوتس، میلون، وال پول، ینگ اور سوفٹ کی تحریروں میں بھی سرریلسٹ رجحانات ملتے ہیں۔ سوزیٔ احمد کے افسانے "چھوٹا نواب" اور احمد علی کی تخلیق "موت سے پہلے" اور "قید خانہ" میں اظہاریت پرست رجحان کے ساتھ ساتھ سرریلزم کا عنصر بھی نمایاں ہے۔

سرریلزم کے خلاف کئی نقادوں نے آواز اٹھائی ہے۔ کچھ نقادوں کی رائے میں سرریلسٹ فن کار، فن اور ہیئت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ سرریلزم ہیئت کے مسئلہ کا کوئی تسلی بخش حل پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس اس سے ہیئت غیر منظم اور غیر متوازن ہو گئی ہے۔ ہر تخلیق کی کوئی نہ کوئی ہیئت لازم ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی غیر منظم کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی تحریر وجود میں نہیں آ سکتی ہیئت سے بے پروائی کے باعث سرریلسٹ نثر اور نظم کا فرق بہت کم رہ گیا ہے۔ رمز و کنایہ پر زور دینے سے سرریلسٹ نثر اکثر شاعری نظر آتی ہے۔ سرریلسٹ فن کار فن کو شعوری سطح پر پیش نہیں کرتے وہ استدلالی نقطۂ نظر کے بجائے تخیلی تخلیق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کسی فطری حقیقت یا جامد اور ٹھوس حقائق کو پیش کرنا فن نہیں سمجھتے جس کی ہیئت سے لوگ واقف ہیں کیونکہ وہ خواب اور لاشعور کے حقائق پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے اس کی ہیئت عام ہیئت سے الگ ہو گی۔ سرریلسٹ فن کار جمالیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں جمالیاتی قدر ہمیشہ خارجی اقدار سے وابستہ نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق شخصیت اور ذہنی ساخت سے ہوتا ہے۔ سرریلسٹ فن کار کے نزدیک فن شخصیت کی توسیع ہے۔ رنگ کو استعمال کرنے کا کوئی ایک طریقہ معین نہیں کیا جا سکتا۔ فن کی پرکھ اس بات سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ کس طرح کس میڈیم کا استعمال کرتا ہے بلکہ وہ اپنے محسوسات اور خیالات پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔

سرریلزم کی اخلاقی طور پر بھی مذمت کی گئی ہے سرریلسٹ اخلاق کے خلاف نہیں بلکہ اُن اخلاقی روایات کے خلاف ہے جو غیر فطری ہیں۔ جن میں کوئی اصلیت نہیں۔ بلکہ وہ انسانی ذہن اور شخصیت کی نشو و نما میں سدِّ راہ ثابت ہوئی ہیں۔ وہ اخلاق جو ہماری جبلتوں اور فطری رجحانات کو دبا دیتا ہے جس سے بیمار ذہن کی پرورش ہوتی ہے۔ وہ صحت مند

باقی ص۵۵ پر

ماہِ نو، کراچی، اپریل ۱۹۶۰ء

مکان

حمید کاشمیری

اس مکان کے مل جانے پر میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو تو نہیں آئے البتہ مجھے اپنی قسمت پر رشک ضرور آنے لگا۔ رشک کیسے نہ آتا۔ جو مشکلات مجھے یہ مکان حاصل کرنے سے پہلے پیش آئی تھیں ان کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ سال بھر تو میرا عجیب و غریب قسم کے دلالوں سے سابقہ پڑتا رہا۔ سینکڑوں پیالیاں چائے کی پلائیں اور ہزاروں سگریٹ۔ اس کے بدلے میں انہوں نے مجھے بیسیوں مکان دکھلائے اور پچاسوں ناکامیاں۔ مکان کوئی ڈھنگ کا ملا نہیں۔ اگر ملا تو دام ہیبت ناک۔ یہ مکان جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اگر کسی اور مقام پر واقع ہوتا تو ممکن ہے میں اسے باہر سے دیکھ کر ہی واپس چلا جاتا کیونکہ اس کی چھت کھپریل کی تھی اور دیکھنے میں نہایت ہی خستہ معلوم ہوتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ یہ ایسی سڑک پر واقع ہے جسے ہم اس شہر کا دل کہتے ہیں، جس پر سے ہر آدمی فخر کے ساتھ گزرتا ہے جو بڑے بڑے مہمانوں کی آمد پر سال میں کئی بار دلہن کی طرح سجائی جاتی ہے اور لوگ خوش آمدید کہنے کے لئے دن دن بھر دو رویہ قطاروں میں کھڑے آنے والوں کا انتظار کرتے ہیں۔ اور یہ شہر تو پاکستان کا دل ہے ہی، اس میں آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے مکان کو اندر سے دیکھ لینا بھی مناسب سمجھا۔ اور جب اندر سے دیکھا تو دل کے کنول کھل گئے اور شکر کیا کہ کہیں نیچے سے ہی دیکھ کر واپس نہ چلا گیا۔

اس وقت اس مکان میں ایک ریٹائرڈ جج صاحب رہتے تھے۔ جنہوں نے اسے بڑے اہتمام سے سجا رکھا تھا۔ اگرچہ اس کے تینوں کمرے آگے پیچھے تھے تاہم بہت بڑے تھے۔ اور چونکہ رخ مغربی سمت تھا اس لئے اندر کمروں میں ہوا اتنی تیز تھی کہ کھڑکیوں میں ٹنگے ہوئے پردے تو کیا سر کے بال تک اڑنے لگتے۔ ایسا ہوادار اور اتنا بڑا فلیٹ اس سڑک پر مشکل ہی سے مل سکتا تھا۔ اور پھر طرفہ یہ کہ اتنی گنجان آبادی میں بھی الگ تھلگ! نیچے ایک بہت بڑی قالین کی دکان تھی اور اوپر یہ تنہا فلیٹ۔ ہوادار اور پردے دار!

مکان تو مجھے پسند آگیا مگر اب پگڑی سننے کی ہمت نہ تھی۔ اور جب سنی تو ہمت بھی پیدا ہوگئی۔ قیمت اتنی کم کہ میں اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا، دلال نے مجھ سے کہا یہ تو جج صاحب نے محض اپنی لاگت مانگی ہے۔ اور بات بھی ٹھیک تھی۔ اتنی قیمت پر تو دو دو روپے کے معمولی گھٹیا اور تنگ فلیٹ بھی نہیں مل سکتے تھے۔ میں نے مزید انتظار خود کیا نہ ریٹائرڈ جج صاحب کو کرنے دیا اور نہ دلال کو۔ بس جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ادھر مکان دیکھا اور ادھر سودا کر لیا۔ جج صاحب کی صرف ایک خواہش تھی کہ مکان لینے والی پارٹی شریف ہو۔ یعنی ہم لوگ شریف ہوں۔ تاکہ بعد میں مالک مکان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ میں نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور ذمہ داری دلال نے لی جو سودا کرا رہا تھا۔ جج صاحب کو اطمینان ہوگیا۔ پھر میں نے ویسے ہی ان سے مکان چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ وہ حج کو جا رہے ہیں اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہیں گے۔ پھر ہم مکان میں داخل ہوگئے اور جج صاحب جو حج کو جا رہے تھے خارج۔ ان کا سامان دو گاڑیوں میں لادا گیا لیکن ہم نے جو دعائیں انہیں دی تھیں وہ دس گاڑیوں میں بھی نہیں سما سکتی تھیں۔ میری بیوی کہنے لگیں "پرانے زمانے کی شرافت اب بھی دنیا میں باقی ہے" اور میں نے تائید کی۔ بہرحال جج صاحب چلے گئے لیکن اپنی شرافت کا سکہ ہمارے دلوں پر بٹھا گئے۔

ہم جب اپنا سامان وغیرہ پوری طرح قرینے سے لگا کر

اس گھر میں خوشی و خرم طریقے سے آباد ہو گئے تو اس وقت محسوس ہوا کہ مکان کے پچھلے کمرے میں روشنی نہیں آتی۔ ہم نے روشنی کی خاطر برابر والی کھڑکیاں کھولنی چاہیں لیکن وہ بہت سخت جام ہو گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب سے مکان بنا ہے کھڑکیاں بند ہیں۔ بڑی مشکل سے ہتھوڑے مار مار کے کھڑکی کھولی۔ اس کے کھلتے ہی روشنی تو خیر جو آئی سو آئی لیکن بدبو کے جھکڑ سے چلنے لگے اور مچھروں کی بوچھاڑ اندر آن گری۔ ایک دم ناک سڑنے لگی۔ اور بیوی کی طبیعت بری طرح متلانے لگی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور اوپر سے ہتھوڑے مار مار کے درزیں بٹھا دیں۔

میری بیوی نے جج صاحب کو جو حج پر گئے ہوئے تھے، چند بڑے ہی سنگین کلمات سے یاد کر کے ان کی خرافت کے مجسمے کو توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے جج ان کی وکالت کر کے وقتی طور پر اس مجسمے کو ٹوٹنے سے بچا لیا۔ میں نے بیوی کو قائل کر لیا کہ آخر اس میں جج صاحب کا کیا قصور ہے۔ بدبو اور مچھر باہر سے آئے ہیں۔ کیوں نہ دیکھ لیا جائے کہ اس کے اسباب کیا ہیں۔ پچھلی طرف جو صحن تھا اس کے باہر والے دروازے سے صرف بھنگی آیا جایا کرتا تھا۔ ہم نے اس دروازے کو کھول کر حالات معلوم کرنے چاہے لیکن وہ دروازہ انتہائی تاریک اور گندی گلی میں کھلتا تھا۔ اس لئے ہم نے اسے پھر بند کر دیا اور بھنگی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ بھنگی آیا تو اس نے بتایا کہ اس گلی میں کبھی کسی آدم زاد کا گذر نہیں ہوا اور اس میں صدیوں کی غلاظت اور گندگی کے انبار پڑے سڑ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے فلیٹ سے جو استعمال کا پانی باہر جاتا ہے وہ بھی اس گلی میں گرتا ہے اور نیچے گٹر کا کوئی انتظام نہیں۔ گٹر کا مسئلہ تو خیر دوسرا تھا۔ پہلا مسئلہ جو ہمیں درپیش تھا وہ پانی کا تھا جس کے لئے گٹر کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جج صاحب نے ہمیں بتا دیا تھا کہ مکان میں پانی نہیں ہے۔ لیکن ہم نے مکان کے محل وقوع کے پیش نظر اسے بغیر پانی کے ہی قبول کر لیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ جس طرح جج صاحب گذارا کرتے رہے ہیں اسی طرح ہم بھی کر لیا کریں گے۔ جج صاحب کیسے گذارا کرتے تھے یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ بھنگی نے بتایا کہ وہ صرف دو میاں بیوی تھے اور چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بالٹی پانی کی استعمال کرتے تھے اور یہ بالٹی جج صاحب صبح پانچ بجے ہی سامنے والے کمپاؤنڈ سے بھر کر لے آتے تھے۔ اور جب کبھی غسل کرنا ہوتا دو بالٹیاں لے آتے تھے۔ لیکن ہمیں تو ایک ٹنکی پانی روز درکار تھی۔ اس سلسلے میں جب ہم نے ماشکیوں سے رجوع کیا تو وہ صاف انکار کر گئے۔ دراصل ہمارے فلیٹ میں پانی بھرنے سے انہیں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ ایک تو تینوں طرف سے باہر کا برآمدہ طے کرنا پڑتا اور پھر تین کمرے عبور کر کے پچھلی طرف غسل خانہ آتا تھا جس میں پانی ڈالا جاتا۔ غور سے دیکھنے پر ان تین کمروں کی طوالت ایک ریل گاڑی کی سی لگتی تھی۔ لہٰذا کوئی بھی ماشکی پانی بھرنے کے لئے تیار نہ ہوا اور میں بیٹھے بٹھائے جج صاحب بن گیا یعنی صبح پانچ بجے اٹھ کے سامنے والے کمپاؤنڈ کے نلکے سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے لاتا رہا۔ ایک ہفتہ لگاتار یہ مشق کرنے سے محسوس ہوا کہ مجھے دمے کی بیماری ہو گئی ہے اور اگر نہیں ہوئی تو ہونے والی ضرور ہے۔ اس دن پھر میں نے ماشکیوں کی منت سماجت کی۔ آخر ایک ماشکی کو مجھ پر ترس آ گیا۔ وہ آٹھ آنے فی مشک دینے پر رضامند ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے صدیوں کا لدا ہوا بوجھ سر سے نیچے اتار دیا ہو۔

پانی کا مسئلہ حل ہوا تو ایک ہفتے بعد یہ انوکھی بات محسوس ہوئی کہ جب ہم چلتے ہیں تو مکان ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل جاتا ہے۔ یعنی اس طرح جیسے کوئی ہلکا ہلکا زلزلہ آ رہا ہو۔ یہ بات تو میں نے پہلے بھی محسوس کی تھی لیکن شدت سے اس لئے نہیں کہ ایک تو پانی کی مشکل حل کرنی تھی۔ دوسرے جس دن ہم نے بند کھڑکی کھولی تھی اس دن بدبو کے ساتھ مچھروں کا ایک جم غفیر اندر گھس آیا تھا۔ اور اس دوران میں ہم پانی کا مسئلہ حل کرنے اور مچھر مارنے میں مصروف رہے تھے۔ خیر مچھر تو کسی حد تک ختم ہو گئے اس لئے کہ ادھر ہوا بہت چلتی تھی اور پانی کے لئے ماشکی کا خدا بھلا کرے! چاہے آٹھ آنے مشک ہی پر رضامند ہوا سہی۔ لیکن اب مکان کے لرزنے سے ہمارے دل بھی لرزنے لگے۔ مرد [illegible] تو حوصلہ کر ہی لیتے ہیں لیکن بیوی کا یہ عالم تھا کہ دن میں بیس بیس مرتبہ بآواز بلند کلمہ پڑھتی۔ میں نے کہا [illegible] اسی بہانے خدا رسول کو تو یاد کر لیتی ہیں [illegible]

اور ان کی بجائے جج صاحب کو سو بتروں سے یاد کرنے لگیں پھر رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بیوی نے جج صاحب کے شرافت کے مجسمے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ میں نے بھی جج صاحب کی وکالت کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ کسی حد تک بیوی ہی کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اب جو ہمیں گھنٹے ہمیں بلڈنگ لرزتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ مالک مکان کی حالت مکان سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ بلدیہ سے رجوع کرتے تو مکان کو خطرناک قرار دے دیا جاتا اور ہمیں خالی کرنے کا نوٹس مل جاتا۔ اور ساری رقم ڈوب جاتی۔ لہذا مجبور ہو کر صبر کرلیا اور فرش جو پاؤں کے نیچے تھا اس کا خطرہ سر پر سوار ہو گیا۔ خطرے کا مقابلہ کرنے کی تاب تو تھی نہیں لہذا میں نے پھر دلالوں سے رابطہ قائم کرلیا۔ اور ایک آدھ پارٹی خریدار بن کر روز میرا مکان دیکھنے کے لئے آنے لگی لیکن مکان کم دیکھتی اور باہر بالکونی میں ٹھہر کر نیچے بارونق سڑک کا نظارہ زیادہ کرتی۔ جو ہمیں کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا، اس لئے کہ مکان کی اصلیت جاننے کے بعد نظارے میں ہمارے لئے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔

اسی طرح کئی پارٹیاں آئیں لیکن تھوڑی دیر بالکونی سے نظارہ دیکھ کر چلی گئیں۔ دلال جس نے یہ مکان دلوایا تھا اب پارٹیاں لانے میں بہت سرگرمی دکھا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے مکان فروخت کرنے کی وجہ تک نہ پوچھی۔ البتہ لوگوں کے سامنے مکان کی تعریف اسی انداز سے کرتا تھا جس طرح خریدنے سے پہلے میرے سامنے کیا کرتا تھا۔ ہم مکان فروخت کرنے کی کوشش میں مصروف ہی تھے کہ ایک دن یہ خبر ملی کہ ہمارا پانی بھرنے والا ماشکی مر گیا ہے۔ ہم نے ماشکی کے مرنے کا یوں افسوس کیا جیسے وہ کوئی ہمارا عزیز ہو۔ یہ بھی ہماری خود غرضی کی علامت تھی۔ اس کے بعد کوئی ماشکی ہمارے گھر میں ایک روپیہ فی مشک کے حساب سے بھی پانی لانے کو تیار نہ ہوا۔ ماشکیوں کا خیال تھا کہ مرنے والا ماشکی [illegible] ہو کر مرا ہے۔ [illegible] ہماری سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے [illegible] اور فلیٹ کے ریل نما کمرے [illegible] سے ہوا ہے۔ واللہ عالم یہ کہاں تک سچ ہے لیکن پھر ہمیں کوئی پانی لانے والا نہیں ملا۔ ہم بوند بوند پانی کو ترسنے لگے اور ترس ہی رہے تھے کہ [illegible] اور گھر کے اندر پانی ہی پانی ہو گیا۔

قریباً نصف رات ہوگی کہ ساون کی پہلی جھڑی شروع ہو گئی۔ چھت نے جگہ جگہ سے ٹپکنا شروع کردیا اور سامان بھیگنے لگا۔ ہم سامان کو بچاتے، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے جہاں کہیں بھی ٹپکنے کے آثار نہ ہوتے لیکن کہاں تک۔ تھوڑی ہی دیر میں فلیٹ کے اندر چھ چھ انچ پانی جمع ہو گیا! پہلے تو چھت ٹپک ہی رہی تھی اب پرنالے چلنے لگے۔ جہاں تک چادریں وغیرہ ڈال کے سامان کو بچایا جا سکتا تھا، ہم نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن سب بیکار آخر ناامید ہو کر کوشش ہی ترک کردی۔ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ باہر گھپ اندھیری رات میں بجلی زور شور سے چمک رہی تھی۔ موسلادھار بارش ہو رہی تھی اور اندر ہم سکڑتے سکڑتے درمیان والے کمرے میں ایک چارپائی پر سمٹ کے بیٹھ گئے تھے۔ پانی باہر کم اور اندر زیادہ برس رہا تھا۔ تمام کمرے تالاب کی طرح بھر گئے تھے۔ صرف یہی ایک چارپائی کسی حد تک محفوظ تھی جہاں پانی نسبتاً کم ٹپک رہا تھا۔ اس رات ہمارے گھر میں پانی اتنا تھا کہ سب اگلی پچھلی کسریں نکل گئیں۔ پانی کی قلت کا مسئلہ فوراً ختم ہو گیا۔ ہم نے ماشکی کو بھلا دیا۔ اور اللہ کو یاد کرنا شروع کردیا۔ بیوی زور زور سے کلمہ پڑھ رہی تھیں۔ اور چڑچڑے پن سے جج صاحب کے عزیزوں تک کو نام لے لے کر یاد کرنا شروع کردیا۔ میں نے خطرے کو جب بہت زیادہ قریب دیکھا تو پھر وہ بدبو والی کھڑکیاں کھول دیں اور پانی کی کڑاہیاں بھر بھر کے کھڑکیوں سے باہر پھینکنے لگا۔ اس وقت ہمیں بدبو، سڑاند اور مچھروں کا قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تمام رات میں نے پانی باہر پھینکتے ہوئے اور بیوی نے جج صاحب کو خطابات پیش کرتے ہوئے گزار دی۔

صبح بارش تھمی اور دھوپ نکل آئی تو ہم نے بھنگی کو بلوا کر سارا مکان صاف کروایا اور پھر کئی روز تک گھر کے سامان کو دھوپ میں رکھ کر سکھاتے رہے۔ اس عرصے میں مکان کی اندر سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ آسیب زدہ معلوم ہوتا تھا لہذا ہمارے موقع شناس دلال نے جو اپنے پیشے میں ثانی نہیں رکھتا تھا اس دوران میں کسی پارٹی کو مکان دیکھنے کی دعوت نہیں دی۔ میں نے [illegible] پر ضبط کر کے [illegible] مکان کی اندر سے بہت اچھی ٹیپ ٹاپ کروا دی۔ اس طرح کہ

ٹپکنے کا ایک نشان بھی کہیں چھت یا دیوار پر باقی نہ رہا۔

ایک دن دلال نے بڑے وثوق سے کہا کہ اب جو پارٹی آئے گی وہ سو فیصدی خریدنے والی ہوگی۔ میں نے کہا ایسی پارٹی کو لانے کا ایک دن مقرر کر لو۔ دلال نے دن مقرر کر لیا اور میں نے پارٹی کی آمد سے ایک دن پیشتر ہی تینوں کمروں کو رئیسانہ طریقے سے سجادیا، چاروں طرف کھڑکیوں اور دروازوں پر خوبصورت ریشمی پردے ٹانگ دیئے۔ اور جب پارٹی، جو صرف ایک آدمی پر مشتمل تھی، ہمارا مکان دیکھنے آئی تو ہمارے گھر کی فضا بڑی پُر وقار معلوم ہو رہی تھی۔ ہم نے دلھن کی طرح سجے ہوئے تینوں کمروں میں اگربتیاں سلگا رکھی تھیں۔ اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی عطر کی شیشی نجانے کیسے الٹ گئی تھی کہ ہلکی ہلکی خوشبو تمام کمروں میں پھیل گئی تھی۔ پارٹی اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے مکان کو نہایت ہی سرسری طریقے سے دیکھا جیسے کوئی گاہک معمولی سبزی ترکاری کو دیکھتا ہے۔ ہم لوگ پارٹی کے ساتھ باہر کے ہوادار کمرے میں بیٹھ گئے اور نہایت دوستانہ ماحول میں گفتگو ہونے لگی۔ اسی گفتگو میں مکان کا سودا بھی ہوگیا اور پارٹی نے بیعانہ دے دیا۔ سودا میری لاگت سے اوپر ہی ہوا تھا لیکن دلال اس وقت میری وکالت کر رہا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ پارٹی کو یقین دلا رہا تھا کہ ہم نے منافع نہیں لیا بلکہ صرف اپنی لاگت پر سودا کیا ہے۔ نیز یہ کہ ہمیں منافع سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ پارٹی شریف ہو تاکہ آئندہ مالک مکان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ جواب میں پارٹی نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور دلال نے حسب معمول ذمہ داری لی۔ میں بھی جج صاحب کی طرح مطمئن ہوگیا۔ پھر پارٹی نے مجھ سے مکان چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا۔ "حج کو جا رہے ہیں اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہنے کا ارادہ ہے۔" ہماری یہ گفتگو جس دوستانہ ماحول میں شروع ہوئی تھی اسی میں ختم ہوگئی۔ جاتی دفعہ ہم نے پارٹی سے مکان خالی کرنے کے لئے چار دن کی مہلت مانگ لی۔

چوتھے دن صبح جب ہمارا سامان جا چکا تھا اور مکان کو ہم نے اس طرح صاف کرایا جیسے وہ چٹیل میدان ہو۔ خریدار بھی آگیا اور دلال کے روبرو اس نے بقایا تمام رقم ادا کردی۔ ہم مصافحہ کر کے رخصت ہوگئے۔ اس وقت ہم بہت اداس تھے اور خریدار ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ میری بیوی اس بات سے بہت متاثر ہوئیں۔ چلتے چلتے کہنے لگیں۔ "کتنا شریف آدمی ہے!"

میں نے کہا۔ "جی ہاں، آئندہ سال یہ بھی حج کو جائے گا۔ اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں آکر اترے گا۔"

★

سجاد — ایک نیا ستارۂ فن: بقیہ صہ ۴۸

یہی قرب اسے اپنے ابنائے جنس سے بھی ہے۔ چنانچہ ایک اور خاکے سے پھر ایک گھرانے کا تصور ابھرتا ہے۔ اس میں سب سے نمایاں خاکہ مرد کا ہے۔ کسا ہوا بدن! شاید کوئی جفاکش پردیسی۔ وطن سے دور تصورات میں گم! سامنے عورت اور دو بچوں کے خاکے نسبتہً ہلکے اور چھوٹے۔ مرد بجا طور پر سوچنے والے کے سپنوں ہی کی جھلکیاں ہیں۔ عورت کے چہرے، خصوصاً آنکھوں، نیم وا ہونٹوں اور دیکھنے کے انداز سے۔ بچھڑے ہوئے ساتھی کی یاد جھلکتی ہوئی! ایک بار پھر سایوں اور روشنیوں میں وہی میل اور وہی تضاد کہ یا شاید محض اشکال نگاری ہی کا نمونہ ہو۔

ابھی تک اس ہونہار پاکستانی فن کار کا فن کچھ ان ہی منزلوں تک پہنچا ہے کیا خبر جو جذبۂ بے اختیار شوق اسے یہاں تک لے آیا ہے، اسے اور کن منزلوں تک لے جائے۔ یہ ابھی دیکھنا باقی ہے۔ عنوان بہرحال بہت امید افزا ہیں۔

ڈرامہ

کاروبار

آغا ناصر

پہلا منظر

شہر کے کسی رہائشی ہوٹل کا ایک عام سا کمرہ۔ مالک فخرالدین بیٹھے آج کا تازہ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں بھائی ننھے داخل ہوتے ہیں جو ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود بڑے زندہ دل معلوم ہوتے ہیں۔

ننھے السلام علیکم ملک صاحب

ملک اوہو، بھائی ننھے! ارے بھائی وعلیکم السلام۔ کہو، خیریت سے تو ہو نا؟

ننھے بالکل بالکل۔ بس دعا چاہیئے آپ کی ملک صاحب جی۔ ہم تو خیریت ہی سے ہوتے ہیں ہمیشہ۔ آپ سنایئے کیا حال ہیں۔ ایسے چپکے سے آگئے کہ خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ تو کہئے چار چھ دن ہوئے بالکل اتفاقاً مجھے منشی وزیر احمد کا لڑکا مل گیا بس اسٹاپ پر۔ کہنے لگا ننھے بھائی! پتہ بھی ہے ملک صاحب آئے ہوئے ہیں! میں نے کہا لو اور لو۔ اپنے ملک صاحب شہر میں آئیں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ لعنت ہے بھائی ننھے کی زندگی پر۔ اس دن سے کھوج میں لگا ہوا تھا سو آج ہو ہی گئی ملاقات۔ ورنہ آپ تو بغیر ملے ہی چلے جاتے شاید، ملک صاحب۔

ملک (ہنستے ہوئے) ارے بھئی نہیں۔ ایسا بھی کیا۔ میں تو خود تمہیں ٹھلایا دکر رہا تھا۔ اور سناؤ کیا کر رہے ہو آجکل۔

ننھے کچھ بھی نہیں۔ اپنے کو کرنا کرانا ہی کیا آتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے ملک صاحب (ہنستا ہے) مگر بس شکر ہے۔ اس پاک پروردگار کا کہ کسی کا محتاج نہیں۔ روکھی سوکھی جیسی بھی ہے، مل ہی جاتی ہے۔ دونوں وقت۔

ملک کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔

ننھے آپ سنائیے۔ سنا تھا مستقل طور پر شہر آنے کا ارادہ کر لیا ہے آپ نے۔

ملک ہوں، خیال تو کچھ ایسا ہی ہے۔ بڑے لڑکے نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ اور سہیلہ کا رشتہ بھی شہر ہی میں طے ہو رہا ہے۔ اب ان کی ماں کہتی ہے کہ جب بچے ہی شہر میں ہیں۔ تو ہم گاؤں میں رہ کر کیا کریں۔

ننھے ٹھیک ٹھیک۔ سولہ آنے سچی بات ہے ملک جی۔ پھر یہ کہ گاؤں میں تو کھیتی باڑی کا کام چلتا ہی رہے گا۔ آپ اپنا اطمینان سے شہر میں رہیئے۔ دوسرے تیسرے مہینے جب جی چاہا چکر لگا آئے۔

ملک ہاں بس۔ کچھ اس قسم کا مشورہ دیا اور لوگوں نے بھی۔

ننھے بڑا نیک مشورہ دیا ہے۔ شہر میں ہزاروں سہولتیں ہیں۔ میری بات مانیں تو بس چلے ہی آئیں فوراً۔ مکان میں دلادونگا فسٹ کلاس۔

ملک (ہنستے ہوئے) شکریہ۔ پر ابھی مکان دکان کا کیا کرنا ہے۔ پہلے آنے کا قصد تو کر لیں۔

ننھے اجی قصد تو ہو ہی جائے گا۔ بلکہ بس ہوا ہی سمجھیں اب آپ۔ میں تو کہتا ہوں ملک صاحب جی کہ بس آپ حکم دیں مجھے۔ اور میں آپ کو گھر دلاؤں۔ کچھ تو خدمت کرنے کا موقعہ ملے ہم گنہگاروں کو بھی۔

ملک ہو ہو ہو۔ کیوں نہیں دیکھو میں فی الحال تو کچھ اور کام سے آیا تھا۔ اس کے بعد جب آؤں گا تو تم سے بات چیت ہوگی اس سلسلے میں۔

ننھے: ہاں ہاں، جیسا آپ حکم دیں (خاموشی) پھر ویسے میری نظر میں ایک مکان ہے آجکل۔ بڑے اول درجے کا ایک انجینئر کا مکان ہے۔ حال ہی میں بنوایا تھا بچارے نے۔ اٹھارہ ہزار کی لاگت ہے۔ مکان کیا ہے، سمجھو کوٹھی ہے، اچھی خاصی کوٹھی۔

ملک: لیکن میرا تو ابھی کوئی خیال ہی نہیں ہے بھائی ننھے فی الحال تو........

ننھے: اوہو ہو۔ تو میں کب کہتا ہوں۔ میں تو ایسے ہی بات کر رہا تھا۔ قسمت کے کھیل ہیں ملک جی۔ سچ کہتا ہوں میں ایسے مکان کو بیچنے کے لئے بھی پتھر کا دل چاہیئے۔ کیا مکان ہے صاحب!

ملک: تو پھر فروخت کیوں کر رہے ہیں؟

ننھے: کیا بتاؤں ملک صاحب۔ وقت ہی کچھ ایسا آپڑا قسمت کے ماروں پر۔ انجینئر صاحب کا تو ہوگیا انتقال۔ اب ان کے دو ہیں بچے۔ بیوی بیوہ ہے۔ مکان فروخت نہ کریں تو کیا کریں۔ بچوں کی تعلیم، گھر کا خرچ۔ ایک ہزار ایک پریشانیاں ہوتی ہیں تم جانو ملک جی۔ عورت ہو تو ایسی سگھڑ اور سمجھدار، واہ واہ! مجھ سے کہنے لگی بھائی ننھے، میرا گھر بکوا دو مناسب قیمت پر تو پھر بڑے لڑکے کو کوئی دکان کھلوا دوں۔

ملک: ٹھیک ہی تو کہتی ہے بچاری۔

ننھے: پر مکان کیا ہے ورداں ہے ملک صاحب جی۔ آپ جانیں انجینئر کا خود بنوایا ہوا مکان۔ پھر موقعہ ایسا کہ بس کیا کہوں۔ اول تو بالکل لب سڑک، ڈاک خانہ سامنے، ہسپتال برابر میں، اسٹیشن چار قدم پر۔ میں کہتا ہوں اپنی قسم! بیس ہزار بھی کم ہیں اس مکان کے۔

ملک: اور مکانیت کیا ہوگی؟

ننھے: مکانیت۔ بس سمجھ لیں کہ تین کمرے تو اندر ہیں، ایک بڑی بیٹھک باہر۔ آگے پیچھے دو برآمدے، باورچی خانہ، غسل خانہ اور صحن علیحدہ رہا۔ مکان کیا ہے، پوری حویلی ہے حویلی۔ میری مانیں تو ایک نظر دیکھ ہی لیں ملک صاحب۔

ملک: ارے نہیں نہیں بھئی میں تو بس یوں ہی پوچھ بیٹھا تم سے مکان کے بارے میں ورنہ.....

ننھے: میں سمجھتا ہوں۔ میں نے یہ کب کہا کہ خرید لیں مکان ـــ پر ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ سچ کہتا ہوں طبیعت خوش ہو جائے گی۔ آپ ہی کہیں گے کہ جیسے ہو سودا ہی کرا دو۔

ملک: (ہنستے ہوئے) بہت باتیں بنانا سیکھ گئے ہو بھائی ننھے۔ بھلا میں سودا کیا کروں گا۔ اس وقت تو میرے پاس روپیہ بھی نہیں۔ بس یہی کوئی پندرہ سولہ ہزار روپیہ لایا تھا ساتھ کسی کام کے لئے۔

ننھے: پندرہ سولہ ہزار۔ ارے تو کیا کم ہے۔ اگر اٹھارہ ہزار کا مکان آپ کو پندرہ ہزار میں نہ دلایا تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔

ملک: لیکن ابھی تو میرا کوئی ارادہ نہیں ہے ننھے میاں۔

ننھے: ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ پر میری خاطر ایک نظر دیکھ تو لیں ویسے بھی ثواب کا کام ہے ملک جی۔ بیوہ کا مکان ہے۔ اچھا تو اب چلا میں کل شام کو آؤں گا۔ بس ٹہلتے ہوئے چلئے گا میرے ساتھ ذرا کی ذرا ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ دیکھ لیں۔ پھر انکار کریں تو جانوں (ہنستا ہے) اچھا تو میں کل آؤں گا شام کو خدا حافظ!

ملک: (ہنستے ہوئے) خدا حافظ!

دوسرا منظر

ایک مکان کا کمرہ۔ خالہ چارپائی پر بیٹھی کچھ سی رہی ہیں

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

خالہ: ارے حفیظ! او حفیظ! دیکھنا ذرا کون ہے۔

(قدموں کی چاپ، دروازہ کھلنے کی آوازیں)

حفیظ: (بلند آواز سے) بھائی ننھے ہیں بوا۔

خالہ: ارے بلا لے نہ پھر۔ (قدموں کی چاپ)

ننھے: سلام خالہ۔ او ہو یہ سلائی ہو رہی ہے۔

خالہ: کہو آج کیسے راستہ بھول گئے؟ تم نے تو آنا جانا ہی بند کر دیا بالکل۔

ننھے: ارے نہیں خالہ۔ بس کچھ فرصت ہی نہ مل سکی

خالہ: ہاں بھیا۔ تم ٹھہرے بڑے آدمی۔ ہم غریبوں کے ہاں کاہے کو آنے لگے۔

ننھے: کیسی باتیں کرتی ہو خالہ۔ ہم تو ہمیشہ تمہارے خادم ہی رہیں گے۔ تم جانو ہم دھندے آدمی ہیں۔ رات دن محنت کرتے ہیں تب دو ہفتوں کی روٹی ملتی ہے۔ اور کہو سب خیریت ہے نا۔

خالہ: شکر ہے اللہ کا

ننھے: امین کہاں ہے؟

خالہ: اسکول گیا ہے۔ امتحان ہو رہے ہیں آجکل۔

ننھے: اللہ کامیاب کرے! کونسی میں ہے اب؟

خالہ: اس سال نویں سے دسویں میں چڑھے گا۔

ننھے: اللہ کامیاب کرے! بس ہماری تو یہی دعائیں ہیں کہ خدا جلد از جلد حفیظ کو کسی قابل کر دے (خاموشی) یہ سفیدی پھر کرائی ہے کیا خالہ مکان میں؟

خالہ: نہیں تو، بس جب بنا تھا تب ہی کی سفیدی ہوئی ہوئی ہے۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے۔ اس محرم میں دوسرا برس لگے گا بنے ہوئے۔

ننھے: ہاں مکان کے بننے کے ایک ہی مہینہ بعد تو انتقال ہو گیا انجینئر صاحب کا۔ بچاروں کو مہینہ بھر بھی رہنا نصیب نہ ہوا اس گھر میں!

خالہ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں کس چاؤ سے بنوایا تھا مکان! پر —

ننھے: سب قدرت کے کھیل ہیں خالہ۔ یہ اس کے بھید ہیں، وہی جانے۔

خالہ: ہاں بھیا، اب افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو بس یہی دعا ہے کہ خدا ان بچوں کو لکھا پڑھا کر کسی قابل کر دے۔

ننھے: اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر خالہ ارادہ کیا ہے! امین کیا کرے گا پڑھائی ختم کرنے کے بعد؟

خالہ: ابھی تو کچھ سوچا نہیں بھیا۔ پہلے ساتھ خیریت کے دسویں پاس کر لے۔ پھر کوئی نوکری دیکھئے۔

ننھے: آجکل نوکری میں تو کچھ بھی نہیں رکھا ہے خالہ۔ میری مانو تو تجارت میں ڈالو امین کو۔

خالہ: کہتے تو ٹھیک ہو پر تجارت کے لئے روپیہ کہاں ہے؟

ننھے: روپیہ کا کیا ہے خالہ۔ آدمی کو ارادہ کرنا چاہیئے۔ کونسی بات ناممکن ہے دنیا میں؟ تم ارادہ تو کرو کسی تجارت کا، پھر دیکھو سو راستے نکل آتے ہیں روپیہ حاصل کرنے کے۔

خالہ: تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو بھائی ننھے۔ کوئی چھپر پھاڑ کر تھوڑا ہی مل جائیں گے روپے۔ میں تو آج شروع کرا دوں کپڑے کا کاروبار اگر پیسہ ہو تو۔ میرا چھوٹا بھائی بیکار ہے۔ کپڑے کی دکان کھلوا کر اسے بٹھا دوں۔

ننھے: تو پھر دیر کیا ہے۔ کھلوا دو نا اسے دکان۔

خالہ: پھر وہی بات۔ میں کہتی ہوں آخر پیسہ کہاں ہے؟

ننھے: پیسہ، میری مانو تو مکان فروخت کر دو خالہ انشاء اللہ ہزار سے تو کیا کم کا بکے گا۔

خالہ: نہ بھیا نہ مکان تو میں کبھی نہ بیچوں۔ ایک ہی تو نشانی ہے امین کے ابا کی۔

ننھے: واہ واہ خالہ! تم بھی کیا باتیں کرتی ہو۔ یہ امین اور حفیظ نشانی نہیں ہیں ان کی۔ دیکھو، میں آج ہی ذکر کروں گا۔ کوئی کام کا آدمی مل جائے تو

خالہ: مگر مکان میں ایک لاکھ تک بھی نہ بیچوں گی۔

ننھے: اف وہ! تو میں کب کہتا ہوں کہ آنکھیں بند کر کے بیچ دو — بھئی میں دیکھوں گا۔ اگر کوئی اچھا گاہک ملا تو پھر سوچ لیں گے مل بیٹھ کر۔

خالہ: نہ نہ بس گاہک واہک کی فکر نہ کرو تم۔ میں نہ بیچوں گی مکان

ننھے: اس میں بیچنے کا کیا سوال ہے۔ تمہاری چیز ہے۔ تمہاری مرضی ہے چاہے بیچو چاہے نہ بیچو۔ میں تو یوں کہوں تھا کہ ذرا اندازہ ہی ہو جائے گا۔ سولہ ہزار کی لاگت سے بنوایا تھا انجینئر صاحب نے۔ دیکھیں تو سہی ذرا لوگ کیا لگاتے ہیں اس کا۔

خالہ: پر ایسے بات چیت نہ کرنا کسی سے بھائی ننھے۔ میں نے تم سے کہا نا کہ —

ننھے: حد ہو گئی۔ تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے کوئی ہاتھ سے جھپٹ کر لے جائے گا۔ مکان دیکھو نا۔ تم بھی ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ امین سے بھی بات کر کے دیکھو۔ اب تو ماشاءاللہ سیانا ہو گیا ہے۔ اپنا اچھا برا سمجھ سکتا ہے۔

خالہ: نہ بھیا نہ۔ امین بھی راضی نہ ہوگا۔ مجھے معلوم ہے۔ تم ہی سوچو بھائی ننھے۔ دنیا نہ تھوکے گی ہمارے جنم کرم میں کہ شوہر نے تو اتنے چاؤ سے مکان بنوایا اور بیوی نے اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی بیچ کھایا؟

ننھے: بیچ کھایا؟ کون کہہ سکتا ہے خالہ! بھلا تم کوئی گلچھرے اڑانے کے لئے بیچ رہی ہو۔ آدمی کیا نہیں کرتا اور پھر یوں بھی امین اس روپے سے کپڑے کا کاروبار کرے گا۔ اگر چل نکلا تو اللہ نے چاہا ایسے ایسے چار مکان بنوا لینا۔ اچھا اب میں چلا۔ موقع ہوا تو شام کو آؤں گا کسی وقت۔ امین اسکول سے کب لوٹتا ہے؟

خالہ: چار بجے۔ لیکن اس سے کیا کہنا ہے، وہ تو

ننھے: او ہو! تو کیا اپنے گھر آنے کو بھی منع کرتی ہو خالہ؟

خالہ: ارے نہیں بھیا۔ تمہارا گھر ہے جب جی چاہے شوق سے آؤ۔ میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ —

ننھے: بس بس کچھ نہیں کہہ رہی تھیں تم۔ یہ لو میں چلا اب —

تیسرا منظر

(وہی مکان، وہی کمرہ اور وہی لوگ)

امین: مجھ سے کیا پوچھنا ہے بھائی ننھے۔ جو بوا کہہ دیں وہی میری رائے ہے۔

ننھے: ارے ارے امین میاں! میرا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ تم خالہ کے خلاف جاؤ۔ میں نے تو یونہی اک بات کہی۔ میں بھی کوئی تمہارا برا تھوڑا ہی چاہتا ہوں خدانخواستہ! سوچو نا کہ یوں مکان رکھنے سے کیا فائدہ۔ اگر اس روپے سے کوئی کاروبار کیا جائے۔ تو وارے نیارے ہو سکتے ہیں

امین: ہے تو ٹھیک لیکن جب بوا کی رائے نہیں ہے تو پھر..

خالہ: اے تم تو ہاتھ دھو کے ہی پیچھے پڑ گئے بھائی ننھے

ننھے: مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ ایک نفع کی بات سمجھ میں آئی تھی سو کہہ دی۔ آگے تمہاری مرضی۔ مجھے تو اس لئے اور خیال تھا کہ ہمارے گاؤں کے ایک زمیندار آئے ہوئے ہیں۔ بیچارے بہت ہی پریشان ہیں مکان کے لئے۔ آدمی رئیس ہے اور ضرورت مند بھی ہے۔ شاید زیادہ پیسہ لگا دے۔

امین: بات تو ٹھیک ہے۔ اگر واقعی اٹھارہ ہزار میں فروخت ہو جائے مکان تو ہم چھ سات ہزار سے کوئی کاروبار کر لیں اور دس گیارہ ہزار میں چھوٹا سا مکان بھی لے سکتے ہیں۔

ننھے: یہی تو میں کہتا تھا۔

خالہ: ہاں۔ پر دیکھو تو امین تیرے ابا نے کس محنت سے بنوایا تھا یہ مکان۔

ننھے: اور ایک بات اور کہوں خالہ! مجھے تو یہ بھی وہم ہے کہ یہ مکان کچھ راس نہیں آیا تمہیں۔ جس دن بن کر تیار ہوا اسی دن چوری ہوئی تمہارے یہاں۔ پھر یہاں آنے کے ایک مہینے کے اندر ہی اندر انجینیئر صاحب چل بسے۔ بعض بعض مکان ہوتے ہی ایسے ہیں کہ جو بھینٹ لیتے ہیں۔

خالہ: اچھا تو بھائی ننھے! پھر تم کر کے دیکھو بات، زمیندار صاحب سے، مگر میں یہ بتائے دوں ہوں کہ اٹھارہ ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گی۔

ننھے: میں خود ہی نہیں دینے دوں تمہیں اٹھارہ ہزار سے کم میں تو تمہارا نقصان تھوڑا ہی چاہتا ہوں کوئی۔ اچھا لو اب میں چلا۔ دیکھو اگر ملک صاحب مان گئے تو کل شام کو لے کر آؤں گا انہیں۔

(چلا جاتا ہے)

خالہ: یہ تو ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہے کہ ناک میں دم کر دیا

امین: لیکن بوا بات تو ٹھیک ہے، اگر واقعی کاروبار میں منافع ہو جائے تو۔۔۔۔

خالہ: ہاں اور یہ وسوسہ تو میرے دل میں بھی ہے کہ گھر ہے منحوس سا۔

امین: ارے چھوڑو بوا، یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں۔ پر اگر اٹھارہ ہزار میں بک جائے تو برا نہیں۔

خالہ: دیکھو اب۔ کہہ تو گیا ہے کل شام کو آنے کے لئے۔

چوتھا منظر

(وہی مکان۔ ننھے خان اور ملک صاحب مکان دیکھنے میں مشغول ہیں)

ننھے: اور یہ دیکھئے ملک صاحب جی۔ یہ دو بڑے کمرے، فرش کی ٹائلیں دیکھئے کیا فینسی ہیں! اک [illegible]

ہے۔ اور چھتیں تو شہر بھر میں کسی مکان کی بنی ہوں گی ایسی۔ ارے کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے! ایک نمبر کا بنوایا ہوا مکان ہے۔ بنیادیں آٹھ آٹھ فٹ گہری رکھوائی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ دراصل انجینیر صاحب کا خیال ایک منزل اور بنوانے کا تھا، پر موت نے مہلت ہی نہ دی مرحوم کو اور دیکھیے ملک جی ایک کمرہ وہ اور ہے۔ اس کے آگے برآمدہ۔ اور یہ صحن کا دروازہ ہے جو دوسری طرف نکلتا ہے (دروازہ کھولتا ہے) اسے یہ ......

ملک: او۔ اور وہ کیا سامنے قبرستان ہے اس طرف!

ننھے: ہاں جی (دروازہ بند کر دیتا ہے) اور یہ زینہ ہے اِدھر جانے کا۔ آئیے اِدھر آئیے۔ بیٹھک میں چلیں۔

(وقفہ۔ قدموں کی چاپ)

تو یہ ہے صاحب مکان۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔

ملک: ہوں بس یہی۔ موقع و وقع تو کوئی ایسا خاص اچھا نہیں ہے۔ اب تم دیکھو نا سامنے قبرستان ہے۔ میری بیوی کو تم جانتے ہی ہو کس قدر وہمی ہے۔

ننھے: ارے اس سے کونسا فرق پڑتا ہے ملک صاحب۔ وہ تو صحن کا عقبی دروازہ ہے بھنگن بہشتی کے لئے۔ آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے اسے کھولنے کی۔ اور ایک بات میں بتا دوں ملک جی۔ مضبوطی اور پائیداری میں کوئی مکان اس شہر میں نہیں ہے اس کی ٹکر کا اور موقعہ کی بات تو یہ ہے ملک جی! کہ وہ سامنے ہسپتال ہے۔ اور یہ اس طرف بالکل لگا ہوا ریل کا اسٹیشن ہے۔ اور کیا نہیں ہے بھلا! بس اب تو آپ یہ بتا دیں مجھے کہ کتنے تک کا خیال ہے اس کا۔

ملک: بھئی خیال ویال کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا۔ اس وقت تو سولہ ہزار روپیہ ہے میرے پاس بس۔

ننھے: اسے روپیہ ہونے نہ ہونے کی بات چھوڑیئے اب اتنے ہم بھی گئے گزرے نہیں ہیں اللہ کے فضل سے۔ ہزار دو ہزار تو آپ کا یہ خادم بھی دے سکتا ہے، اگر ضرورت پڑی تو۔

ملک: ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مگر دیکھو نا میرا کوئی خیال ہی نہیں تھا۔ یہ تو تم نے چونکہ کہا تھا۔ اس لئے میں نے حامی بھر لی سولہ ہزار کی۔

ننھے: ہاں وہ تو میں نے کہا تھا پر دیکھئے نا ملک صاحب آخر کو مکان ہے۔ کوئی سگریٹ کی ڈبی تو ہے نہیں کہ چھ آنے میں خرید لو ایک قیمت پر۔ اب اس میں تو یہی ہوتا ہے۔ سولہ ہزار آپ نے کہے، بیس ہزار انہوں نے۔ کچھ آپ بڑھ میں کچھ وہ گھٹیں۔

بس تو بھائی ننھے پھر جانے دو۔ میں تو یہ کہتا تھا کہ آپ مجھے تو بتا دیں کتنا نقد دے سکتے ہیں۔ اللہ سے تو میں یہی کہوں گا کہ سولہ ہزار سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں ملے گا۔

—— (وقفہ) بولئے۔

ملک: کیا بولوں۔

ننھے: آخر مجھ سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔

ملک: بھائی میں نے تو بتا دیا۔ اب آگے جو تم مناسب سمجھو۔ سو دو سو اپنی مرضی سے اور بڑھا دو۔

ننھے: ہاں اب بھی تو ہوئی نہ بات۔ یعنی کہ میں ساڑھے سولہ ہزار تک کر لوں سودا — اچھا تو میں ابھی آیا۔ ذرا خالہ سے بات کر لوں۔

(قدموں کی چاپ)

ننھے: (زینہ میں) دیکھا وہی ہوا نا جس کا مجھے ڈر تھا۔

خالہ: کیا ہوا؟

ننھے: میں پہلے ہی کہا کرتا تھا انجینیر صاحب سے کہ مکان ہی بنوانا ہے تو کسی اچھی سی جگہ بنواؤ۔ یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ ملک صاحب نے وہی کہا کہ چوبیس گھنٹے ریلوں کا شور، انجنوں کی سیٹیاں، گھر کیا ہے ریلوے اسٹیشن کا کوئی حصہ معلوم ہوتا ہے پھر سامنے قبرستان۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا انجینیر صاحب سے۔

خالہ: لیکن قبرستان تو دوسری طرف ہے بھائی ننھے۔ وہ تو عقبی دروازہ ہے کھولنے کی ضرورت ہی کیسے پڑتی ہے؟

ننھے: بیٹا کوئی بات نہ ہوگی خالہ جب انسان رہتا ہے گھر میں

تو ہر طرف جانا ہی پڑتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کس کس کو روکا
جا سکتا ہے۔ (آہستہ سے) اور یوں بھی قبرستان کے قریب
جو مکان ہوتے ہیں نا وہاں لوگ رہنا پسند نہیں کرتے۔
کبھی اثر ہو کچھ۔

خالہ — (افسردہ لہجے میں) ہاں اب تو جیسا ہے یہی ہے۔ بدلا تو
جا نہیں سکتا۔ کیا کہتے ہیں تمہارے ملک صاحب؟

ننھے — دیکھو کر تو رہا ہوں بات۔ اب تم مجھے بس یہ بتلا دو کہ کتنے
تک کر لوں سودا۔

خالہ — سودا کیسا میں نے بتا تو دیا تھا تمہیں کہ اٹھارہ ہزار سے
ایک کوڑی کم نہ لوں گی

ننھے — ہاں ہاں۔ تم نے کیا بتایا، یہ تو میں نے ہی کہا تھا تم سے
لیکن آخر کچھ رعایت تو رکھنی ہی ہوگی نا تم نے

خالہ — پھر کر دیں نا تم نے شروع کاروبار والی باتیں۔ مجھ سے
پوچھو گے تو بس یہی کہوں گی۔ اٹھارہ ہزار آگے تمہاری
مرضی، چاہے سیاہ کرو چاہے سفید۔

ننھے — میں کیوں سیاہ کرنے لگا میرا بس چلے تو پچیس ہزار میں
فروخت کر دوں۔ پر سوچ کر ہی کرنا پڑتی ہے نا بات ——
مجھے تو بس اب یہی فکر ہے کہ کسی طرح امین کو یہ کپڑے کا
کاروبار کرا دوں۔ تم ہی کہو اب اگر سو دو سو کم ہی
رہیں اٹھارہ ہزار سے تو ہرج کیا ہے؟

خالہ — لیکن میں نے کہا نا بھائی ننھے۔

ننھے — تو بھائی تنے کب کہتا ہے تم نے نہیں کہا۔ اور میں کروں گا
بھی وہی جو تم نے کہا ہے۔ پر کچھ تو کمی زیادتی ہوتی ہی ہے۔
میرے خیال میں تو ساڑھے سترہ تک اگر ہو جائے طے تو
کر ہی لوں۔

خالہ — ٹھہرو، میں امین سے پوچھ لوں۔

ننھے — ارے اب امین کوئی تمہارے خلاف جا سکتا ہے۔ اس سے
کیا پوچھنا اور خالہ یہ رخ بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے تمہارے
مکان کا۔ دھوپ کتنی آتی ہے۔ گرمی میں تو پاگل ہو جائے
انسان۔

خالہ — ابھی دکھا لو ملک صاحب کو اچھی طرح، کبھی پھر بعد میں
کہتے پھریں۔

ننھے — ہاں ہاں تو ایسے تھوڑا ہی۔ وہ تو میں ساری بات صاف
صاف کر لوں گا۔ اچھا تو پھر میں پوچھتا ہوں ملک صاحب سے
ساڑھے سترہ تک۔

(قدموں کی چاپ)

ننھے — بس ملک جی کچھ ستارہ ہی چمک رہا ہے آپ کی قسمت کا
ورنہ مجھے تو امید ہی نہیں تھی کہ سودا ہو سکے گا اتنے تک۔

ملک — تو ہو گیا طے؟

ننھے — بس طے ہی سمجھیں۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ بھائی ننھے
نے کوئی کام کیا تھا۔ بس سو دو سو کا پھیر اور رہ گیا ہے۔

ملک — لیکن ساڑھے سولہ ہزار سے میں اب ایک پائی بھی زیادہ
نہیں دے سکتا سمجھ گئے نا۔

ننھے — ساڑھے سولہ آنے سمجھ گیا۔

ملک — دیکھو نا صرف تمہاری وجہ سے خرید رہا ہوں مکان۔
میں نے اب غور کیا، اس کا رخ تک ٹھیک نہیں ہے۔
گرمیوں میں تو بہت ہی دھوپ آتی ہوگی۔

ننھے — وہ تو میں نے بتایا تھا نا ملک جی کہ انجینیر صاحب کا خیال
دو منزلیں بنوانے کا تھا۔ جب اوپر کے کمرے بن جائیں گے
تو نام کو بھی دھوپ نہ آئے گی۔ ایسا کوئی عیب آپ نہیں
نکال سکتے ملک جی (ہنستا ہے) انجینیر کا مکان ہے، انجینیر کا
بولئے اب آپ۔ فقط تین سو روپے کی بات ہے۔

ملک — نہیں جی، اب میں بڑھاؤں گا کچھ نہیں۔

ننھے — حد ہو گئی بھئی۔ ملک صاحب جہاں میری خاطر پورا مکان
خرید رہے ہیں۔ وہاں تین سو اور سہی۔

ملک — نا بھیا نہ

ننھے — ایسے بات نہ بنے گی اب مکان تو لینا ہی ہوگا۔ چاہے میرا
کمیشن نہ دیں۔

ملک — مگر ——

ننھے — اب نہ نہ کیجئے گا ملک صاحب جی۔ ہو گئی بات پکی۔ میں
کہے دیتا ہوں خالہ سے جا کر۔ (قدموں کی چاپ)

ننھے — تو لو خالہ بیانے کے روپے

خالہ — دکھلا تو دیا ہے نا تم نے ملک صاحب کو مکان اچھی طرح۔
کبھی پھر بعد میں شکایت ہو۔

بگٹیوں کی سرزمین (بلوچستان)

جاع، دلیر مند، جفاکش بگٹیوں کا وطن مدتوں بےتوجہی
ا شکار رہا ۔ قیام پاکستان کے ساتھ اس میں بھی ایک
ے دور ترقی کا آغاز ہوا اور اس کے جری باشندے اب اپنی
زمہ صلاحیتوں کے ساتھ خدمت وطن میں پیش پیش ہیں

(مضمون ص : ۵۳)
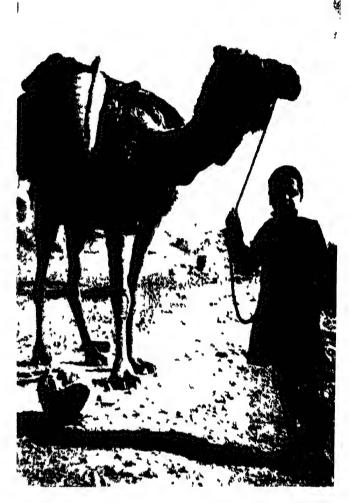
دور انقلاب

پاکستان کی وضع نو

تیز رفتار صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کو غذا میں خود کفیل بنانے کے لئے کاشتکاری کے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر اب مشینی آلات کو کام میں لایا جارہا ہے

ملک (باہر سے) جی دیکھ لیا ہے میں نے

ننھے اب منہ تو میٹھا کراؤ خالہ۔ سترہ ہزار کو اٹھا ہے مکان تمہارا۔

خالہ سترہ ہزار۔ مگر میں نے تو تم سے کہہ دیا تھا کہ ـــ

ننھے بس بس اب کچھ نہ کہنا خالہ۔ بدشگونی ہوتی ہے۔

خالہ نہ بھیا نہ، ایسے تو میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔ میں تو ساڑھے سترہ پر بھی تمہارے کہنے سے راضی ہو گئی تھی ورنہ اٹھارہ ہزار سے ـــ

ننھے ہاں ہاں تو جہاں اتنا میرے کہنے سے کیا وہاں پانچ سو اور سہی۔ اب بیعانے کے روپے لے کر واپس تو میں ہرگز نہ کرنے دوں گا، چاہے کمیشن نہ دو میرا۔

خالہ نہیں خیر، تمہارا حصہ تو تمہارا ہی ہے لیکن یہ بات تم نے ٹھیک نہیں کی بھائی ننھے!

ننھے (ہنستا ہے) ایسا ہی ہوتا ہے سودا کرنے میں خالہ۔ اچھا تو یہ رہے بیعانے کے دو سو۔ باقی پیسے ملک صاحب آ کر دے جائیں گے۔

خالہ لیکن دو چار دن ہم خالی نہیں کریں گے مکان۔ کرایہ کا مکان تلاش کرنے میں ذرا دیر ہو ہی جاتی ہے۔

ملک (باہر سے) آپ جتنے دن جی چاہے رہیئے۔ آپ کا گھر ہے۔ مجھے فی الحال ضرورت بھی نہیں تھی۔ اچھا تو اب چلو بھائی ننھے۔

ننھے اچھا تو اب چلے خالہ۔

(دونوں جاتے ہیں)

ملک خوب ہو تم بھی بھائی ننھے۔ میرا تو خیال تک نہ تھا مکان خریدنے کا مگر تم نے خیر دلا کر ہی دم لیا۔ اور پھر وہ بیچاری فروخت بھی تو نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

ننھے ارے ایسا نہ کریں تو پھر کمائیں کیا ملک صاحب جی؟ کاروبار نام ہی اس کا ہے۔ ویسے اگر سچ مچ آپ کو ناپسند ہو مکان تو فکر نہ کیجئے گا۔ میں رکھوں گا نظر میں۔ اگر کوئی اچھا گاہک ملا تو بیچ دیں گے اسے ـــ اور آپ کو نیا گھر دلا دوں گا ہی ہی ہی! ٹھیک ہے نا؟

(پردہ)

نغمہ کجا و من کجا (بقیہ صفحہ ۲۴)

اقبال کی شاعری میں بلاغت اور ایجاز بھی بدرجۂ اتم کارفرما ہیں۔ یہ دونوں بیان و فن کی روحِ رواں ہیں۔ بلاغت ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے ایسے الفاظ میں کہتا ہے کہ سننے والے فوراً اسکے مقصد کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ جوہر قبول اور لطفِ سخن کی طرح خداداد ہے لیکن غور و فکر اور مشق سے اور بھی نکھرتا ہے۔ اقبال جس طرح اپنے مافی الضمیر کو براہ راست قارئین تک پہنچا دیتے ہیں وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہے۔

ایجاز کے معنی ہیں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب کا اظہار۔ الفاظ وہی ہوتے ہیں جو ہر شاعر استعمال کرتا ہے لیکن ایک باکمال شاعر انہیں اس طرح کام میں لاتا ہے کہ اُن کے معنی میں بے پناہ وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس کا اندازِ بیان ایسا ہوتا ہے کہ بہت کچھ کہے بغیر قاری کے ذہن تک پہنچا دیتا ہے۔ یعنی "تیرے کرنا فگندہ فند کارگر" والا معاملہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بینی جہاں را خود را نہ بینی ۔۔۔ تا چند ناداں غافل نشینی
نورِ قدیمی! شب را برافروز ۔۔۔ دستِ کلیمی! در آستینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند ۔۔۔ آدم بمیرد از بے یقینی

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قُم باذنِ اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قُم باذنِ اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قُم باذنِ اللہ

آخر میں میں ایک بار پھر اسی شعر کی طرف رجوع کرتا ہوں جس سے اس مقالہ کا آغاز کیا گیا تھا ـ

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اس شعر میں نغمہ گری سے یک گونہ لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ سازِ سخن محض بہانہ ہے، مقصد تو صرف یہ ہے کہ ناقۂ بے زمام کو قطار میں لایا جائے۔ نکیل کھینچ کر نہیں بلکہ محض سخن کے جادو سے ائے زندگی کو صحیح راستہ پر ڈال دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب تک سخن انتہا درجہ پر تاثیر نہ ہو گا شاعر اس سے اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے گا۔

ارمان

یوسف ظفر

یہ میں نے دیکھا ہے چاندنی سے دلوں کے ارمان جاگتے ہیں۔
سمندر اپنی تمام چاندی اُچھالتا ہے
کہ جیسے کہسار ڈھالتا ہے
زمین اپنی رگوں کی ساری نمی ہواؤں میں گھولتی ہے
اور اپنے ساز نمو پہ کھیتوں میں بولتی ہے
چمن میں شاخیں نئی زبانیں نکالتی ہیں
اور اپنی آغوش میں شگوفوں کو پالتی ہیں
زمانہ لمحوں کے جسم پر چسپت کرتا ہے چاندنی کی زرہیں
کہ جن سے پھوٹیں خوشی کی کرنیں ــــ
یہ میں نے دیکھا ہے، چاندنی سے دلوں کے ارمان جاگتے ہیں ــــ

دلوں کے ارمان میں نے دیکھے ہیں سرد سکّوں کی روشنی میں
لبوں پہ جن سے کھنکنے لگتی ہے مسکراہٹ
رگوں پہ آتی ہے جن سے آسودگی کی آہٹ ــــ
دلوں کے ارمان میں نے دیکھے ہیں تپتے جسموں کی قربتوں میں
کہ جن کو کل کائنات اِک خوابِ کالعدم بن کے دیکھتی ہے
حیات دھڑکن کی تال پہ ناچ "چھن چھنا چھن" کے دیکھتی ہے
یہ کھیل تو چاندنی بھی پتّوں سے آپ چھن چھن کے دیکھتی ہے
دلوں کے ارمان میں نے دیکھے ہیں مسندوں کے مجاوروں میں
کہ جن کے سینے کے سارے ارمان حلق میں رہتے ہیں خار بن کر
کہ جن کو یہ زندگی ملی ہے شکایتِ روزگار بن کر
کہ جن کی اندھی لگن کو یہ چاندنی بھی ڈستی ہے مار بن کر

میں کب سے اس چاندنی میں بیٹھا ہوں جیسے پتھر کا کوئی بُت ہو

مرے خدا! جیسے میرے سینے میں دل نہیں ہے
مرے لئے جیسے کوئی غم مستقل نہیں ہے
نہ میرے سینے میں کوئی ارماں ہی جاگتا ہے
کہ جس سے میں سُن سکوں کوئی لَے
کوئی ترانہ ــــ طلب کے اُس سازِ بے کلی کا
کہ جس سے کہسار ڈولتے ہیں
کہ جس سے گلزار بولتے ہیں
میں کب سے اس چاندنی میں بیٹھا ہوں، جیسے پتھر کا کوئی بُت ہو!

مرے لبوں، میری سرد آنکھوں، مرے بدن، میرے بازوؤں میں
چبھے چلی جا رہی ہیں کرنیں
کہ جیسے مجھ کو ٹٹولتی ہوں
کہ جیسے غصّے سے بولتی ہوں ــــ

مرے خدا! میرے دل کا ارماں، نہ سرد سکّوں کی روشنی ہے۔
نہ گرم جسموں کی چاندنی ہے
نہ میں کسی مسندِ معلّٰے کا خانقاہی
کہ جس سے حاصل ہو کج کلاہی
مرے لئے جیسے تیری دنیا میں کچھ نہیں ہے
بس ایک یہ چاندنی ہے جس کی ادائے بیگانہ بھا گئی ہے
جو میرے دل پر، مری نگاہوں، مری تمنا پہ چھا گئی ہے
مرے خدا! تو ہر ایک دل کی پکار سُنتا ہے، میری سُن لے
مرے بھی دامن کو اپنی اس چاندنی سے بھر دے
یہ چاندنی لازوال کر دے ــــ

آخری شکست

طاہرہ کاظمی

چند بھولی ہوئی یادوں کا وہ رنگین طلسم
جس نے پہروں مرے احساس کو بہلایا ہے
وہی پُرکیف تصور، وہی نازک سا خیال
آج پھر میری تسلّی کے لئے آیا ہے!

اس کو کیا علم کہ پیمانۂ دل ٹوٹ گیا
اب نہ غم ہے نہ ستم، یادِ ستم تک بھی نہیں
اب کوئی پرسشِ احوال کرے یا نہ کرے
اپنی بربادئ آخر کا الم تک بھی نہیں

لب سے آمادۂ پیکار تھے یہ دیدہ و دل
شورشِ قلب و نظر کھو گئی خاموشی میں
جل بجھے اپنی ہی خاموش تمازت میں نجوم
روشنی ڈوب گئی رات کی تاریکی میں

ایک خاموش سیاہی ہے مسلط دل پر
اب تڑپنے کی خلش ہے، نہ دھڑکنے کی صدا
اب نہ افسردگئ غم، نہ امیدوں کی شفق
دل کو جینے کی ادا آئی نہ مرنے کی ادا!

گیت

(پنجابی لوک گیت کی بحر میں)

باقی صدیقی

(سانوں تاڑ تاڑ چھمکاں نہ ماریں وے
زور جوانی دا کریں نہ
سانوں تاڑ تاڑ.....)

چلے جھوم جھوم قافلہ بہار کا
دنیا پہ رنگ چھا گیا ہے
چلے جھوم جھوم....

زندگی نے راگ چھیڑا کلیوں کے روپ میں
نکہتیں بکھیرتی ہے میٹھی میٹھی دھوپ میں
ذرہ ذرہ جاگ اٹھا ہے خواب سے
راستوں کو ہوش آ گیا ہے
چلے جھوم جھوم...

نور کی پھوار کھیلتی ہے پھول پھول سے
منزلیں ابھر رہی ہیں راستوں کی دھول سے
آرزوئیں لے رہی ہیں کروٹیں
کونسا مقام آ گیا ہے
چلے جھوم جھوم....

ڈالی ڈالی جھومتی ہے پتیاں سنوار کے
کنج کنج کہہ رہی ہیں کوئلیں پکار کے
اٹھو اٹھو غمزدہ مسافرو
موسمِ بہار آ گیا ہے
چلے جھوم جھوم...

غزل

اختر احسن

پیشانیِ سحر پہ ہوائیں جھکی سی ہیں
کچھ انکھڑیاں صبا کی افق پر اٹھی سی ہیں

کیا ہو گیا جو پھوٹ کے نکلی ہے اک کلی
موجیں ہیں درد کی کہ ہوائیں کھلی سی ہیں

کچھ مسکراہٹیں کہ رواں زخمِ لب سے ہیں
کیا رنگتیں کہ سایۂ گل میں جلی سی ہیں

شاخِ چمن پہ آ کے بنیں رنگِ سوختہ
اتریں فضائے دل میں تو جیسے دبی سی ہیں

دل میں رہیں تو بن کے رہیں رشکِ گلستاں
ہونٹوں پہ آ کے خندۂ زیرِ لبی سی ہیں

وہ شوخیاں کہ شاخ پہ وقتِ سحر کھلیں
شبنم سے غم کی بے طرح سہمی ہوئی سی ہیں

کیا کیا دھندلکے بن کے اڑا آرزو کا رنگ
کیا خاک ہو کے حسرتیں گل پر جمی سی ہیں

ڈرتا ہے دل جو دیکھتا ہوں برگ و شاخ کو
کیا کیا کہانیاں ہیں کہ گل پر لکھی سی ہیں

صحنِ خزاں نے آ کے جو کھولا ہے رخت آج
صحنِ چمن کی ساری ہوائیں رکی سی ہیں

وہ نخلِ یاد آج بھی بے برگ و بار ہے
شاخوں پہ سب صباحتیں جیسے جلی سی ہیں

کچھ اشک بن کے پاؤں میں گل سی بکھر گئیں
کچھ شوخیاں کہ شاخ کے اندر دبی سی ہیں

کیوں کھینچتا ہے دل مرا یہ اجنبی دیار
یادیں سی جیسے ذہن میں آ کر رکی سی ہیں

سرخی میں ڈوب ڈوب کے ابھری ہیں کس طرح
شامیں فراقِ یار میں بھیگی ہوئی سی ہیں

تنہائیوں میں اشک کی اپنے سے گم رہا
راتیں سحر کے نور میں کچھ کچھ ڈھلی سی ہیں

برسوں ہوا اس کی یادیں جو چپ سا ہو رہا
صبحیں فراقِ یار میں ڈوبی ہوئی سی ہیں

کیا آرزوئیں بن گئیں پھولوں کے پیرہن
یہ دیکھی بھالی صورتیں جیسے ملی سی ہیں

سوزِ فراقِ یار کی کچھ کم تپش ہے آج
صبحِ بہارِ دل کی ہوائیں چلی سی ہیں

اٹھو کہ اپنے خون کا ملبوس اوڑھ لیں
اس لمحۂ فراق کی شاخیں پلی سی ہیں

حشمت فضلی

اشکوں کے رنگیں پھولوں کی سیج سجائے بیٹھا ہوں میں
امیدوں سے دل کا اجڑا دیس بسائے بیٹھا ہوں میں

کس کو یہ معلوم کہ میرے دل پہ کیا کیا بیت رہی ہے
ہنس بھی رہا ہوں راز بھی غم کا دل میں چھپائے بیٹھا ہوں میں

ترکِ تعلق کہنے کو تو ایک زمانہ بیت چکا ہے
آج بھی تیرے پیار کی لیکن جوت جگائے بیٹھا ہوں میں

پتھر بن کر دیکھ رہا ہوں ہر آتے جاتے راہی کو
سوچ رہا ہوں جان کو کیسا روگ لگائے بیٹھا ہوں میں

جب سے تیرا غم اپنایا دل کو ڈھارس ہے کچھ ایسے
دونوں دنیاؤں کی جیسے دولت پائے بیٹھا ہوں میں

آس کے کتنے سورج ابھرے اک اک کر کے ڈوب گئے ہیں
پھر بھی کس امید پہ جانے آس لگائے بیٹھا ہوں میں

آتشِ غم کے طوفانوں میں نیندیں جل کر راکھ ہوئی ہیں
اب تیری یادوں کے میلے دل میں لگائے بیٹھا ہوں میں

فن:

سجاد — ایک نیا ستارۂ فن

امیر حسن سیال

پچھلے دنوں جب "نامور مستشرق، پروفیسر الیساندرو بوزانی کا وہ مضمون نظر سے گزرا جس میں اس نے ایک پاکستانی فن کار، سجاد کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے تو مجھے قدرتی طور پر یہ دلچسپی پیدا ہوئی کہ پاکستان کا یہ مایۂ ناز فن کار کون ہے اور اس کا فن کن کن منزلوں سے گزر کر اس مرتبہ تک پہنچا کہ ایک دور دیس کے فن شناسوں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا" اور "غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں" کے مصداق اس کا ستارہ پہلے روم میں چمکا اور ہوتے ہوتے اس کی روشنی اپنے وطن میں بھی پہنچی۔ وہ دونوں ملکوں کے افق پر یوں جلوہ گر ہوا جیسے وہ کوئی نیا ستارہ ہو۔ اور میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ "آوارۂ غربت نہ تواں دید صنم را" اس نئے ستارے کی لَو کچھ اور بھی ادھر پہنچنی چاہئے۔

اس میں زیادہ فرحت انگیز بات یہ تھی کہ ہمارے وطن کے ایک جوہرِ قابل کی قدر و منزلت اٹلی جیسی سرزمین میں کی جائے جو ہنر و فن کے لئے افسانہ ہو چکی ہے۔ اور جس کا نام لیتے ہی لیونارڈو ڈا ونچی، رافیل، مائیکل آنجلو اور بوتی چیلی جیسے بڑے بڑے شہرۂ آفاق فن کار یاد آتے ہیں۔ یہ وہ سرزمین ہے جو ہزارہا برس سے فنونِ لطیفہ کا گہوارہ ہے اور آج بھی اس میں گھر گھر ہنر و فن ہی کا چرچا نظر آتا ہے۔ یہاں فن کے جوہر اس قدر عام ہیں کہ بلا مبالغہ ہر فرد فن کار ہے۔ اور اسے بجا طور پر موسیقاروں، سازکاروں، مصوّروں، سنگ تراشوں، معماروں اور اداکاروں کی سرزمین کہا جا سکتا ہے۔ اس تاریخی سرزمین کی دنیا رنگ و روغن، موقلم، سنگِ مرمر، چنگ و رباب اور نغمہ و سرود ہی کی دنیا ہے۔ اور اس کے دارالحکومت روم کا ذکر ہی کیا جس کا چپہ چپہ حسن ہی کی سحر کاریوں کا آئینہ دار ہے۔ اور قدم قدم پہ ماہرِ فن صناعوں کی ندرت کاریوں کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

ایسی سرزمین میں کسی دوسرے ملک، خصوصاً پاکستان جیسے ملک کے فن کار کا فن کی جوت جگانا جو ابھی صغرِ ایام سے ابھرا ہی ہے اور بڑے بڑے ماہرانِ فن پہ اپنی صناعانہ قدرت کا نقش جمانا کارے دارد کا مصداق ہے۔ اس کے لئے ذوقِ خداداد اور غیر معمولی فنی صلاحیت ہی ضروری نہیں بلکہ سال ہا سال کا ریاض بھی درکار ہے۔ بادی النظر میں اس قسم کی کامیابی تقریباً محال معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ایک جواں سال فن کار، سجاد نے یہ کامیابی حاصل کر کے صرف اپنا نام ہی بلند نہیں کیا بلکہ اپنے ملک، پاکستان کو بھی چار چاند لگائے ہیں۔

اگر کسی فن کار کو اپنے ہم وطنوں کی بجائے دوسرے لوگ سراہیں تو یہ حقیقی معنوں میں داد و تحسین ہے۔ اور پھر روم جیسے گہوارۂ فن کے پختہ کار فن شناس! سجاد، جس کا پورا نام سجاد علی خاں ہے، وہ فن کار ہے جس نے یہ بڑی ہی مشکل مہم سر کی ہے۔ اس نے اپنے فن کے جوہر ایسے ملک میں آزمائے جو تمام تر ہنر و فن کا دیس ہے۔ جیسے کوئی ساحر دانستہ ایسے مقام پر سحر آزمائی کرے جو اپنی جادوگری کے لئے مشہور ہو۔

ظاہر ہے کہ جس طرح اٹلی کا مہتم بالشان تاریخی شہر روم ایک ہی دن میں تیار نہیں ہو گیا تھا، اسی طرح اس پاکستانی فن کار کو بھی اس دیارِ فن میں آناً فاناً شہرت نصیب نہیں ہوئی اور اسی کے نامور فاتح جولیس سیزر کی طرح وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ "میں آیا۔ میں نے دیکھا۔ میں نے سر کیا"۔ ظاہر ہے کہ اسے زندگی کے کتنے ہی دن، کتنی ہی راتیں فن کے کرشمے اور فن پر قدرت حاصل کرنے میں صرف کرنے پڑے۔ جوہرِ خداداد

ہی سہی لیکن ان کی جِلا تو بہرحال مشق و مہارت ہی سے ہوتی ہے اور سجاد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فنی صلاحیت ہمیشہ خداداد ہی ہوتی ہے صرف بعض مواقع جنہیں، خبر نہیں ہم کیوں اتفاقات قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں، فن کے خوابیدہ احساس کو ابھارنے کا بہانہ بن جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک موقع سجاد کو بھی حاصل ہوا۔ بڑا ہونے پر اسے علی گڑھ کے مشہور دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اِس کا ایک نگارخانہ بھی تھا جو اٹلی کے بڑے بڑے مسلم الثبوت استادانِ فن کی مشہور تصاویر کے نقوشِ ثانی سے آراستہ تھا۔ سجاد نے ان کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسے کہ اس کے لئے جنبشِ مژگاں بھی بار تھی! دفعتہً اس کے دل کی گہرائیوں میں سویا ہوا فن کار جاگ اٹھا۔ اور اسے یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ بھی ایسے ہی زندۂ جاوید شہ پارے تخلیق کرے۔ اس کا ذہن موقلم کی جنبشوں اور رنگ و روغن کے کرشموں میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے لگا۔ جو بدقسمتی سے اس کے ان عزیزوں کے خوابوں کے خلاف تھا جنہوں اسے یونہی فضول لکیریں کھینچنے کے لئے نہیں بلکہ پڑھنے لکھنے کے لئے علی گڑھ بھیجا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں ہوا کرتا ہے۔ جب وہ چیز جو قاضی الحاجات ہے۔ یعنی زر ہی نہ رہا تو تعلیم کیسی؟ چنانچہ اس ذہن کے بچے نے مادرِ علم کا دامن چھوڑ کر ۱۹۴۳ء میں بمبئی کا رخ کیا جہاں کی فضا فن کے لئے زیادہ سازگار تھی۔ چنانچہ وہ وہاں مصوری کی مشہور درسگاہ جے جے سکول آف آرٹس میں داخل ہو گیا۔

رفتہ رفتہ سلسلہ اور بھی آگے بڑھا اور اسے بمبئی ہی کے عجائب گھر میں مغلیہ مصوری کے بعض شاہکار دیکھنے کا موقع ملا۔ اس نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ لیکن اس کی پہلی محبت تو وہی اطالیہ کے شاہکار تھے۔ جنہوں نے اس کے دل و دماغ کو اسیرِ جاوداں کر لیا تھا۔ اور جن کے ساتھ اس نے ایسا پیمانِ وفا باندھا تھا جس کو وہ کبھی توڑ نہ سکا۔ چنانچہ اس کا روحانی گھر روم ہی رہا۔ جہاں پہنچنے کی تمنا اس کے دل کو روز و شب تڑپاتی رہی۔ اس کے ذہن پر یہ احساس چھا گیا کہ جب تک وہ اس گہوارۂ فن تک نہیں پہنچے گا اس کی زندگی کبھی روشناسِ تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہیں گے۔

لیکن اس کے ذاتی حالات اس خواب کے پورا ہونے میں سدِ راہ تھے۔ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ جو لوگ اس کے اخراجات کے کفیل تھے، انہوں نے اس کے علی گڑھ میں قیام کا رشتہ ہی کاٹ دیا تھا۔ لیکن شوق کے لئے تو رکاوٹیں بھی تازیانہ ثابت ہوتی ہیں؎

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

سجاد اس افتاد سے گھبرایا تو سہی لیکن اس نے جلد ہی وجہ معاش کی صورت پیدا کر لی اور شملہ میں کلرکی کو غنیمت سمجھا۔ برسوں اس کوشش میں گزر گئے کہ کس طرح روم جانے کی سبیل پیدا کی جائے۔ مگر اس کے پاس دعاؤں، وظیفوں اور مناجاتوں کے علاوہ اور تھا ہی کیا۔

آخر پاکستان نے ہی اس کی مشکل حل کی۔ آزادی آئی اور اپنے ساتھ ایک وطن سے دوسرے وطن کو ہجرت لائی۔ اب اس کا قیام کراچی میں تھا۔ چندے یہاں بھی اسی طور گزر ہوئی اور جب کبھی فرصت کے چند لمحات مل جاتے وہ تھوڑے بہت خاکے کھینچ کر اپنا شوق پورا کر لیتا۔ آخر ۱۹۵۰ء میں اس کی امید بر آئی۔ کسی نے اس کا بے اندازہ ذوق و شوق دیکھ کر اسے سفیرِ پاکستان متعینہ روم کے دفتر میں حساب کتاب لکھنے کی نوکری دلوا دی!

روم پہنچ کر سجاد نے جھٹ شبینہ کلاسوں میں ڈرائینگ اور مصوری سیکھنا شروع کر دی۔ اور اس کی نظر رنگ و روغن اور موقلم کے اسرار کی محرم ہوتی گئی۔ اس نے آرٹ اکادمی میں دو سال کا کورس ایک ہی سال میں ختم کر دیا اور اپنی جماعت میں پہلا انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ نقاشی کے ایک مقابلے میں کامیاب ثابت ہوا جس میں اطالوی اور غیر ملکی امیدوار بھی شامل تھے۔ اور اس طرح وِلا میڈیچی (روم) کی اکادمی میں داخل ہوا۔ جو ہر سال ستّر امیدواروں میں سے

پچیس بہترین امید وار چنتی ہے۔ اس کے ساتھ اس نے انٹرنیشنل آرٹ ایسوایشن جیسے مشہور ادارے کی رکنیت بھی اختیار کی۔

۱۹۵۵ء سجاد کے لئے ایک بڑا اہم اور مبارک سال تھا۔ کیونکہ اس سال اطالوی منظر کشی کی ایک بین الاقوامی نمائش منعقد ہوئی۔ جس میں ۴۴ ممالک کے مصوروں نے حصہ لیا۔ اس میں سجاد کی بھی دو تصاویر شامل تھیں اور پہلا انعام اسی کو حاصل ہوا۔ چنانچہ اسے چاندی کے ایک کپ کے علاوہ، ڈپلوما آف آنر بھی عطا کیا گیا۔ اگلے سال ایک اور مقابلہ میں دوم رہنے کے لئے دو تمغے اور اس کے بعد ایک اور تمغہ حاصل ہوا پھر تو نمائشوں میں شرکت ایک عام بات ہوگئی ــ اس نے پوری چالیس نمائشوں میں حصہ لیا اور متعدد انعامات حاصل کئے۔ ان کامیابیوں نے قدرتی طور پر روم کے فنی حلقوں پر اس کی دھاک بٹھادی اور اسے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ اسے حال ہی میں روم کی انٹرنیشنل آرٹ ایسوسی ایشن کے بارہ اراکین میں سے ایک منتخب کیا گیا۔ یہ وہ مشہور ادارہ ہے جس کے تین ہزار سے زیادہ اراکین ہیں اور جو شاعروں، معماروں موسیقاروں وغیرہ ہر قسم کے ارباب فن پر مشتمل ہے۔

وہ کیا بات تھی جس نے سجاد کو یہ قابل رشک امتیاز عطا کیا؟ ذوق وشوق اور جد وجہد سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس میں اُن ذاتی جوہروں کو دخل ہے جنہوں نے ایک مخصوص انداز میں نمو پائی۔ اس سلسلہ میں ہماری نظر دو باتوں پر پڑتی ہے۔ اوّل وہ 'پہلی محبت' جس نے مغلیہ نقاشی کے حسن لازوال کی شکل میں اسے اپنا پرستار بنالیا۔ اس کے لئے مغلیہ روایت ایک زندہ روایت تھی اور اس کی نستعلیق وضع، اس کا توازن، اس کے ذہن میں ایک مستقل قدر بن کر سما گیا۔ اس لئے وہ وطن سے باہر بھی گیا تو اس احساس کو اپنے ساتھ لے کر گیا۔ اور اسے مغرب کی ہوا نہ لگ سکی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ میں نت نئی تحریکیں ابھر رہی تھیں اور فن کار انہی کے خبط میں مبتلا نظر آتا تھا۔ اور مغرب میں جو چیز مقبول ہو وہ ہمارے یہاں فیشن میں داخل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ مکعبیت، تجرید اور سرریلزم کا مغرب میں کیا کچھ چرچا نہیں ہوا اور ان کی پیروی میں آج ہمارے یہاں بھی کم از کم تجریدی فن کو کیا کچھ فروغ حاصل نہیں۔ لیکن سجاد کے دل پر پہلے ہی ایک نقش جم چکا تھا۔ اس لئے فن کے ان اسالیب ومظاہر کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونے کے باوجود وہ کبھی ان کی طرف مائل نہیں ہوا۔ اس کے وجدان نے یہی محسوس کیا کہ مغرب کے قدیم استادان فن میں اس کی رہنمائی کے لئے بہتر سامان موجود ہے۔ اس کے فن کارانہ شعور نے یہ حقیقت بھانپ لی کہ ان کے مرقعات میں نقاشی کے بنیادی عناصر زیادہ خوش اسلوبی سے جلوہ گر ہیں۔ یعنی رنگوں کا آپس میں گھل مل کر نفیس اثر پیدا کرنا، ہیئت کا سجل پن اور اعضاء واشکال کا سڈول پن۔ لہٰذا اگر آج بھی ان عناصر کو بطریق احسن شیر وشکر کیا جائے تو بہت عمدہ نتائج پیدا ہوسکتے ہیں۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اساتذہ شرق وغرب کے نقش قدم پر چل کر وہ کوئی ایسا انداز پیدا کرے جو اس کے ہم وطنوں کے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی پسندیدہ فضا دور کہن ہی کی فضا ہے اور اس نے ایک طرف مغلیہ روایات سے فن کی جوت جگائی ہے تو دوسری طرف بالکل اسی طرح صدیوں کے فاصلے پھلانگ کر مغرب کے استادان فن کے منجھے ہوئے فن کے گُر آزمائے ہیں، اور اپنے نقوش میں اُن ہی کا رچاؤ پیدا کر کے اسے دوآتشہ بنادیا ہے۔

ایسی مصوری کی امتیازی خصوصیت ایک ہی ہے: اصلیت سے لگاؤ جس میں ہم آنکھوں دیکھی چیز کی واقعیت سے دور نہیں جاتے اور پھر ان کو بڑے مانوس پیرایہ میں بڑے سبھاؤ سے پیش کر دیتے ہیں۔ ایسی نقاشی کی اساس ظاہر ہے۔ صحیح خدوخال، صحیح وضع قطع، صحیح شکل وصورت ہی ہوسکتی ہے۔ جس کو ہم خاکہ کشی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ فطرت یا زندگی کو بگاڑ کر ٹیڑھا میڑھا پیش کرنا نہیں بلکہ ایسے رنگ روپ میں پیش کرنا جس سے اس کے تیور صاف صاف پہچانے جاسکیں۔ لیکن عکس خارجی کے ساتھ فن کار کی بصیرت اور تصور کا عکس باطنی بھی نظر آئے۔ اس طرح صاحب فن کے فن کی بات بڑے صاف اور ستھرے پیرائے میں سامنے آجاتی ہے۔ بناوٹ سے

کو سوچ دور جیسی دیکھ سے کہ سجاد کا فن ایک صاف و شفاف
آئینہ معلوم ہوتا ہے جس میں قدرت کے مناظر جیسے نہ بہ یک نظارہ
جیسی چلتے ہی گزرتے سلوٹے روپ میں سامنے آجاتے ہیں۔

خاکہ کشی اس قسم کی مصوری کا ایک بنیادی ہے۔ اور
سجاد میں اس کی خوبی اور سب باتوں سے پہلے اور سب سے
زیادہ ابھرتی ہے۔ لیکن وہ آخر ایک جدید فن کار ہے جس
کا ذہن آج کے مزاجی ماحول میں بسر ہوا ہے اور آرٹ
کے کیا کیا اظہار، دبستان، اسالیب اور تجربات ہیں جو اس
کی نظر سے نہیں گزرے ہوں گے۔ اس لئے اس نے خاکہ
کشی سے آگے بڑھ کر مصوری کے دوسرے طریقوں کو بھی اپنایا
ہے۔ مثلاً آب رنگی، جدوی اور ٹمپرا۔ روغنی مصوری
اس کی راستے میں کچھ ایسی مشکل نہیں۔ یہاں بھی اس کا ذہن
مسلم الثبوت استادوں سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اور ان
کی آراء بھی اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد نتائج پر پہنچتا ہے۔
اس کا خیال ہے کہ مائیکل آنجلو جیسے نابغۂ نظر فن کار نے
یونہی نہیں کہا تھا کہ روغنی نقاشی ایک بڑے فن کار
کے شایاں درخورِ اعتنا نہیں ہے — جدید نقاشی کے
ساتھ سجاد کو گہرا لگاؤ ہے۔ اس کے لئے وہ اپنے ہی رنگ
تیار کرتا ہے اور اپنے موقلم سے رنگوں کے تحت نئے تکمیل
سکھاتے ہوئے وہ رنگ آمیزی کے اسرار تک رسائی حاصل کرتا
ہے اور پھر وہ رنگوں کی بہار رنگوں ہی تک محدود نہیں رہتی
بلکہ چمکتے بجتے اور چہکنے بھی لگ جاتی ہے۔ اور اس سے
خود بخود وجود کے کوندے سے لپکنے لگتے ہیں۔

سجاد بلا وجہ مغل استادوں کا دلدادہ نہیں۔ اس نے
اپنی فنی صلاحیتوں کو اس میدان میں بہت خوش اسلوبی سے
آزمایا ہے۔ مثلاً منقش نے جو ایک سادھن کی تصویر [illegible]
اس کا [illegible] خیال کی عکاسی ہے اور وہ بلا شبہ [illegible]
ہے۔ لیکن سجاد نے ایسے ہی استادوں کے ہنر کو اپنے طور پر
پیش کرتے ہوئے جنگلوں کے ایک جھرمٹ کا نقشہ پیش کیا ہے
موضوع یہ ہے کہ منقش کے تنہا سادھن کے بعد رنگین پرندوں
کا یہ جھرمٹ — "میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد"
کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے مصور نے یونہی
ہی روا روی میں لیکن بڑی استادی سے چند لطیف نقوش کھینچ کر
بکھیر دیئے ہوں اور انہیں بڑی بے تکلفی اور صفائی سے
رنگوں کا جامہ پہنا دیا ہو۔ پھولوں کی رنگ برنگی کیفیت اور پھر
لانبی لانبی بل کھاتی گردنیں شرقی محبوبوں کی صراحی دار گردنوں
سے کچھ کم طرحدار نہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پھول
کی وضع قطع، رنگ روپ، گردوپیش کی فضا۔ ہلکے ہلکے اودے
اودے بادلوں، جامن کے ٹیڑھے میڑھے روکھ۔ اور دور پرے
جو پس منظر دکھائی دیتا ہے۔ ان سب میں کیسا سہانا سنجوگ
پیدا کیا ہے۔

اس فن میں ظاہر ہے سجاد کو خاص ملکہ ہے۔ اس
کے مشاق قلم نے فطرت کے ایک نہیں کتنے ہی شاہکارانہ
نقوش پیش کئے ہیں، مثلاً ایک تصویر میں طائران
خوش الحان کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ سفید پھولوں سے
لدا پھندا ٹیڑھا میڑھا پیڑ۔ ایسے ہی سفید پھولوں سے
آراستہ جھاڑی۔ اور اس پُرکیف، پُرسکون سمے میں گاتے
پرندے اپنے اپنے انداز میں۔ ایک نغمۂ خاموش کے
امیں۔ سیاہیوں اور سفیدیوں کا یہ مطالعہ جو تہوں پھولوں،
پرندوں، درخت، جھاڑی اور پس منظر سب میں جھلکتا
ہے، اجلے اندھیرے کا ایک عجیب طلسم ہے۔ ایک بے نظیر
سنگت۔ اور پھر پرندے یوں لگتے ہیں جیسے وہ ایک ہی گھرانے
کے گھلے ملے افراد ہوں۔

ایسا ہی ایک دلکش گھرانا تین ہرنوں کا ہے۔ جن
کو پیش کرنے میں کندہ کاری سے کام لیا گیا ہے۔ ہرنی اور
بچہ پاس پاس، اور تھوڑی دور پر ہرن، سب اپنے اپنے
انداز میں۔ پیار، سوچ، نجانے کیا۔ ارد گرد بن کا ویران
سماں، بکھری بکھری جھاڑیاں، پرے پرے دھندلکا۔
درمیان میں نکھار، ایک اجالا سا پھوٹتا ہوا۔ سایوں اور
اجالوں کا نفیس سنجوگ۔ اور ساتھ ہی تضاد بھی! اس سے
ظاہر ہے کہ فن کار وجدانی طور پر پرندوں کی طرح ان جانوروں
کے بھی کتنے قریب ہے۔

(باقی ص ۳۷ پر)

لکس میں
دھلی ہوئی!
ساڑھیاں، نرم و نازک
آب و تاب برقرار ہے۔
لکس فلیکس میں اپنے
نازک کپڑے مطمئن ہو کر دھوئیے۔
LUX

رسوئی میں پکے ہوئے
کھانے کے لئے وہ کھیل بھی چھوڑ دیتی ہے!
اِس لڑکی کو کھیل کود کے بعد اگر کوئی چیز مرغوب
ہے تو وہ کھانا ہے۔ اس کی ماں ہمیشہ بڑے اہتمام کے ساتھ
رسوئی بناسپتی میں کھانا پکاتی ہے اور اپنے کنبہ کی صحت کو برقرار رکھنے
کیلئے کھانوں کی تیاری میں رسوئی بناسپتی کا استعمال ضروری سمجھتی ہے۔
رسوئی میں وٹامن 'اے' اور 'ڈی' شامل کئے گئے ہیں تاکہ یہ
آپ کے لئے ایک گونا طاقت کا وسیلہ بنے۔
رسوئی
ہاتھ کے مس سے محفوظ
اصولِ حفظانِ صحت پر تیار کیا ہوا
وٹامن 'اے' اور 'ڈی' سے بھرپور
تیار کردہ:- مقبول کمپنی لمیٹڈ (مشہور ایگل وناسپتی کے بنانے والے)
ڈی۔۵۔ سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ۔ کراچی
سول ڈسٹری بیوٹرز:- آدم لمیٹڈ
جوڑیا بازار — کراچی

بلوچی رزمیہ شاعری

سلیم خان گمی

رزمیہ شاعری سے کیا مراد ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر ہر دور کے صاحبِ نظر لوگ مختلف رائیں ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ارسطو کے نزدیک "رزمیہ نظم وہ نظم ہے جس کا ایک آغاز ہو، وسط ہو اور انجام ہو اس نظم میں کوئی غیر ضروری بات آنے نہ پائے اور ضروری بات رہ نہ جائے۔"

ایبر کرومبی رزمیہ کے بارے میں کہتا ہے کہ رزمیہ نظم میں ایک تو کہانی ہونی چاہئے اور دوسرے اس کہانی کو فنی طور پر بیان کیا جائے یعنی کہانی میں حُسنِ بیان ہو۔ یونان کے عظیم شاعر ہومر رزمیہ شاعری کا مفہوم ایک فقرے میں یوں ادا کرتے ہیں۔ "کسی نسل کے بہادروں اور سورماؤں کے کارناموں کا بیان رزمیہ شاعری کہلاتا ہے"۔ رزمیہ شاعری کی یہ تعریف بلیغ بھی ہے اور قرین حقیقت بھی۔ "شاہنامہ فردوسی" ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس میں قدیم ایران کے بہادروں اور سورماؤں کے کارہائے نمایاں فنی طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ "مہابھارت" بھی خیر و شر کی نمائندہ شخصیتوں کی باہمی آویزشوں کا بیان ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب "جدید اُردو شاعری" میں رزمیہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: "شعری پیداوار میں رزمیہ شاعری سب سے بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ موضوع کی رفعت، اسلوب کی سنجیدگی، بلاغت، رعب اور شکوہ کے اعتبار سے نقاد ہمیشہ اس سے مرعوب رہے ہیں رزمیہ شاعری کے موضوع مہتم بالشان واقعات اور افعال ہوتے ہیں۔ اشخاصِ نظم ہمیشہ سربرآوردہ ہستیاں ہونی چاہئیں"۔

مولانا شبلی رزمیہ شاعری کی شوکت اور کمال میں جن امور کو شامل کرتے ہیں اُن میں لڑائی کی تیاری، معرکہ کا زور و شور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہلچل، شور و غل، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک دمک، نیزوں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا وغیرہ شامل ہے۔ مولانا شبلی کے یہ الفاظ اصل میں رزمیہ شاعری کے ایک عام موضوع جنگ کے بارے میں ہیں۔ جب لڑائی ہو رہی ہو تو حرکت، عمل اور وسعت کا خیال ہمارے ذہن میں آنا عام سی بات ہے۔ جو رزمیہ نگار جنگ کی منظر کشی درست طور پر نہیں کر سکتا وہ رزمیہ تحریر کر ہی نہیں سکتا۔ اگر جنگ و جدل کی منظر کشی کمزور اور پھیکی ہوگی تو رزمیہ کی اولیں شرط — واقعات اور افعال کا مہتم بالشان ہونا — پوری نہ ہو سکے گی۔

رزمیہ شاعری جنگ و جدل اور سنجیدہ مقاصد کی کشاکش کی شاعری ہے۔ اس صنفِ شعر نے ہمیشہ جنگ و جدل اور سنجیدہ مقاصد کے تاریخی عہد میں پرورش پائی۔ جب کسی قوم نے اجتماعی طور پر مادی، روحانی اور فنی رکاوٹوں اور دقتوں کے خلاف جد و جہد اور کشاکش سے کام لیا رزمیہ شاعری نے جنم پایا۔ جب کبھی کوئی قوم لہو و لعب اور عیش و طرب میں گم ہوگئی طربیہ اور غنائی شاعری کو فروغ ہوا جب کسی قوم کی روایات، معاشرت اور اعتقادات توانا، شائستہ اور ترقی پذیر ہوں تو اعلیٰ پایہ کی شاعری تخلیق ہوتی ہے اور جب زندگی کی بنیادی قدریں کمزور اور فراری نوعیت اختیار کر جائیں تو کمتر درجہ کی پھیکی شاعری معرضِ وجود میں آتی ہے۔ چنگ و رباب کا زمانہ غنائی اور طربیہ شاعری کی تخلیق کے لئے ہمیشہ سازگار رہا ہے اور شمشیر و سناں کے عہد میں ہمیشہ رزمیہ شاعری پھلی پھولی ہے۔ "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کی تحریر کا عہد یونان کی علمی، فنی اور مادی ترقی کا عہد ہے یہی بات فردوسی کے شاہنامہ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ حصولِ آزادی سے پیشتر، یوں تو ہندوستان کی تاریخ میں کئی ایک انقلاب آئے لیکن وہ سلبی نوعیت کے تھے اس لئے شاعروں کا رویہ ہمیشہ مجہول سا رہا اور رزمیہ شاعری کی طرف کوئی توجہ نہ دی جا سکی۔ اگرچہ قدیم اردو میں چند رزمیہ نظمیں (غلام علی کا "جنگ نامہ"، رستمی کا "خاور نامہ" اور نصرتی کا "علی نامہ") بھی ہیں تو وہ طبع زاد کم اور فارسی کا ترجمہ زیادہ ہیں۔ انیس اور دبیر کے مراثی میں بعض مقامات پر جنگ و جدل کے عمدہ مرقعے ضرور ملتے ہیں لیکن یہ مرقعے رزمیہ تحریر کرنے کے قصد سے نہیں لکھے گئے اور یہ ہیں بھی ناتمام اور نامکمل۔ اس کے علاوہ یہ مرثیے رزمیہ شاعری کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا نہیں کرتے۔

بلوچی رزمیہ شاعری کا عہد پندرھویں صدی عیسوی کا نصف آخر اور سولھویں کا نصف اوّل ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچوں کے دشت پیما اور صحرانورد قبائل نے مدنی زندگی اختیار کرلی تھی اور باقاعدہ حکومت کی طرح بھی پڑ چکی تھی۔

بلوچوں کا اصل مسکن دجلہ و فرات کی سرزمین ہے۔ جب یزید کی فوجوں نے حضرت امام حسینؓ پر ظلم و ستم روا رکھا تو بلوچوں نے شاہِ مظلوم کا ساتھ دیا اور یوں اپنے آپ کو یزید کی دست درازیوں کا شکار بنایا۔ یزید کے ظلم سے پناہ لینے کی خاطر بلوچ ایران چلے گئے اور کرمان اور سیستان میں گھومتے پھرے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں ایران میں سیاسی انتشار بڑھ گیا اور بلوچوں پر ایک بار پھر دست درازیاں روا رکھی گئیں۔ بلوچ سردار میر جلال خاں جو ایک بہادر اور مہم جو انسان تھا اپنے قبیلے کو لے کر اس سرزمین کی طرف نکل آیا جسے بعد میں "بلوچستان" کا نام دیا گیا۔ سردار میر جلال خان نے مدنی زندگی اختیار نہ کی اور جنگلوں، دریاؤں، پہاڑوں، صحراؤں اور وادیوں میں گھومتا رہا۔ میر جلال خاں کے چار بیٹے تھے۔ رند، لاشار، کرائی اور ہوت۔ میر جلال خاں کے یہ چاروں بیٹے اپنے اپنے قبیلے کے سردار مقرر ہوئے اور انھوں نے علاوہ اپنے اپنے قبیلے کی بنیاد رکھی۔

پندرھویں صدی عیسوی میں میر شہک اپنے قبیلے، رند کا سردار مقرر ہوا۔ میر شہک ایک مدبر اور بہادر انسان تھا۔ اُس نے ناخنِ تدبیر اور قوتِ بازو دونوں سے کام لے کر اپنے ہم عصر دوسرے قبیلوں کو زیرِ نگیں کیا اور مکران پر قابض ہو گیا۔ میر شہک وہ پہلا بلوچ ہے جس نے جہاں گیری کی اور باقاعدہ حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ میر شہک سے پہلے، بلوچ کوہساروں اور وادیوں، صحراؤں اور جنگلوں میں گھومتے رہتے تھے۔ پانی اور خوراک کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے تھے۔ اُن کی زندگی خانہ بدوشوں کی زندگی تھی اور اُن کی طرزِ معاشرت بدوی تھی۔ زمین کی ملکیت کا احساس اُن کے ذہن میں ابھی ابھرا نہ تھا۔

عام تاریخی روایات کے مطابق ۱۴۶۸ء میں میر شہک کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام چاکر خاں رکھا گیا۔ چاکر خاں تیس سال کی عمر میں ۱۴۹۸ء میں اپنے قبیلے رند کا سردار بن گیا اور "بلوچ اعظم میر چاکر خاں رند" کہلایا۔ یہی وہ میر چاکر خاں رند ہے جس کا عہد بلوچ تاریخ کا زریں عہد کہلاتا ہے اور اور اسی عہد میں بلوچی رزمیہ شاعری کے شاہکار تخلیق ہوئے۔

میر چاکر خاں رند بہادر تھا، دلیر تھا، اور مہم جو تھا۔ تیراندازی، شہسواری اور تیغ زنی میں اُس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ مکران کو سیاسی استحکام بخشنے کے بعد میر چاکر خاں رند نے خاران اور لس بیلہ پر قبضہ کیا، قلات پر حملہ کر کے میروانیوں کو شکست دی، قلات کے بعد کچھی کی طرف بڑھا۔ جام ننده کو شکست دے کر کچھی پر قابض ہوا۔ کچھی کے بعد بستی کو زیرِ نگیں کیا ۱۵۵۵ء میں ہمایوں کو دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے میں امداد دی۔

میر چاکر خاں رند کا عہد نہ صرف رزمیہ شاعری کی تخلیق کا عہد تھا بلکہ بلوچ تاریخ کے اس عہد میں بہترین رومان بھی تخلیق ہوئے۔ مثال کے طور پر "بی برگ و گرا ناز"، "حانی و شہ مرید" اور "شاہ دادو ماہناز"۔

اگر میر چاکر خاں رند بلا شرکت غیرے بلوچستان کا حکمراں ہوتا تو شاید آج رزمیہ شاعری کا کوئی نشان نہ ملتا لیکن ایسا نہ ہوا۔ میر چاکر خاں رند کا حریف لاشاری قبیلے کا جواں ہمت سردار میر گواہرام لاشاری تھا۔ میر گواہرام لاشاری بہادر اور صاحبِ تدبر سردار تھا۔ اُس نے تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر میر چاکر خاں رند کی سرداری تسلیم نہیں کی۔ میر چاکر خاں رند اور میر گواہرام لاشاری کا اختلاف نہ صرف سیاسی تھا بلکہ رومان اور محبت بھی اس کے پس منظر میں تھے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ میر گواہرام لاشاری کی ایک محبوبہ تھی جس کا نام گوہر تھا۔ میر گواہرام لاشاری اس سے شادی کرنے کا خواہاں ہوا۔ گوہر نے انکار کر دیا۔ گواہرام نے زور سے کام لینا چاہا۔ گوہر میر چاکر خاں رند کی پناہ میں آگئی۔ گواہرام کے قبیلے کے نوجوانوں نے گوہر کے اونٹ ذبح کر دیئے اور دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو تیس سال تک جاری رہی اور آخر میر چاکر خاں رند کی شکست پر ختم ہوئی۔ بلوچوں کی یہ تیس سالہ جنگ قتل و خوں ریزی، بہادری و دلیری اور شجاعت و شہامت کی ایک الم ناک اور ولولہ انگیز داستان ہے۔ اسی طویل جنگ کے دوران بلوچی رزمیہ شاعری کے عہد آفریں فن پاروں کی تخلیق ہوئی۔ یہ رزمیہ شاعری نہ صرف اعلیٰ پایہ کی شاعری ہے۔ بلکہ بلوچوں کی منظوم تاریخ بھی ہے۔

قدیم بلوچ معاشرے میں ہر قبیلے کا اپنا ایک شاعر ہوتا تھا جسے وہ "ریزوار شاعر" کہتے۔ ریزوار شاعر کے تمام اخراجات قبیلے کے لوگ برداشت کرتے اور وہ پورے خلوص اور فراغت سے اپنے قبیلے کی سرگرمیوں کو رزمیہ شاعری کے قالب میں ڈھالتا رہتا۔ ایسا نہیں تھا کہ رزمیہ نگار گھر میں

بیٹھا رہتا اور فکر شعر میں غرق رہتا۔ وہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان جنگ میں جاتا اور اگر ضرورت پڑتی تو مردانگی کے جوہر بھی دکھاتا۔ عام طور پر وہ جوانوں کو قبیلے کی شاندار روایات۔ بہادری اور دلیری کے قصے سنا کر گرماتا اور اگر عین جنگ میں بعض نوجوان حوصلے ہار دیتے تو وہ اپنے طنزیہ اشعار سے انہیں بے غیرت بننے اور رسوا ہونے سے بچاتا۔ رزمیہ شاعری کے لئے اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہے کہ بلوچی رزمیہ نظمیں مبالغہ آرائی اور دروغ بافی کے عیبوں سے قطعاً پاک ہیں۔ جو بات کہی جاتی ہے سیدھے سادے انداز میں کہی جاتی ہے۔ خلوص اور صداقت کا جذبہ ان رزمیہ نظموں کا امتیاز ہے۔

رند اور لاشاری قبیلوں کی جو جنگ میر چاکر خاں رند اور میر گواہرام لاشاری کی سرکردگی میں لڑی گئی تیس سال جاری رہی اور بلوچ تاریخ میں "اسی سالہ جنگ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

اس سی سالہ جنگ میں رجز کے بعض بہت نادر مرقع بھی تخلیق ہوئے۔ رجزیہ کلام میں جوش بھی ہے اور ولولہ بھی۔ جنگ کے ایک مرحلہ پر میر گواہرام لاشاری اور میر چاکر خاں رند اپنے جوانوں کو لڑنے مرنے کے لئے ابھارتے ہیں۔ میر گواہرام کہتا ہے ؎

شیر دل جان نثارو۔	اپنی مصری فولاد کی بنی ہوئی تلواریں سنہری میانوں سے باہر نکال لو۔
میر چاکر خاں کا نڈر دل لشکر۔	دشمن کے کمزور دل جوانوں پر یوں لپکو جیسے خونخوار بھیڑیا۔
ہمیں فنا کی نیند سلانے ہماری طرف بڑھ رہا ہے،	بھیڑ کے بچے پر لپکتا ہے ـــ خدا تمہارا مددگار ہے۔ پیش قدمی ہو۔

بلوچی رزمیہ شاعری کے بلند پایہ شہپارے کسی نہ کسی کہانی کے تار و پود ہیں۔ کوئی بھی رزمیہ نظم اپنی الگ حیثیت نہیں رکھتی۔ کہانی بلند مرتبہ شخصیتوں اور سربرآوردہ ہستیوں کے گرد گھومتی ہے۔ اُس کا ایک آغاز ہے۔ ایک وسط ہے اور ایک انجام ہے۔

"سی سالہ جنگ" کی کہانی ایک مربوط کہانی ہے۔ ایک ایسی کہانی جو زندگی کی کہانی ہے، کسی خیالی دنیا اور اس خیالی دنیا کے انسانوں کی کہانی نہیں۔ ہم جیسے انسان اس کہانی کے کردار ہیں جو ہماری طرح عقل و دانش اور کمزوریوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ نہ تو فرشتے ہیں اور نہ شیطان کے بھائی ـــ وہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں۔

تیس سالہ جنگ کے علاوہ سمّی کی کہانی ہے۔ سمّی بیوہ ہے اور بلیدی قبیلہ کے سردار بی برگ پُڑ کی زمینوں کے پاس رہتی ہے۔ بی برگ پُڑ اُسے اذیت پہنچاتا ہے تو وہ گورگیج قبیلے کے سردار، دودہ کی پناہ میں آجاتی ہے۔ دودہ اُسے باہوٹ یعنی مہمان بنا لیتا ہے۔ ایک دن موقع پاکر بلیدی سردار بی برگ پُڑ حملہ کرتا ہے اور سمّی کی گائیں ہانک کر لے جاتا ہے۔ سمّی روتی پیٹتی سارا ماجرا دودہ کی ماں کو بتاتی ہے۔ دودہ کی ماں اپنے بیٹے کے پاس جاتی ہے۔ دودہ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ اور دوپہر کو وہ اور اس کی دلہن آرام کر رہے ہیں مگر ماں آکر اُسے کہتی ہے؛ "جو بہادر اپنے مہمانوں کو پناہ دیتے ہیں وہ دوپہر کو بے خبر نہیں سوتے۔"

بلوچ بے حد مہمان نواز ہوتے ہیں۔ وہ مہمان کی عزت اپنی عزت اور مہمان کی توہین اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ مہمان کی خاطر جان لینا یا دینا ایک عام سی بات ہے۔

دودہ ماں سے تمام ماجرا سنتا ہے۔ ماں اُسے حکم دیتی ہے؛

یا تو تمام گائیں صحیح سلامت لاؤ یا بہادری اور شجاعت سے لڑتے ہوئے اپنی جان گنوا دو۔

ماں کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ وہ اپنی خوبرو بیوی کے پاس سے اُٹھتا ہے اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر بی برگ کے مقابلے کے لئے نکل جاتا ہے۔ شام ہونے سے پہلے بی برگ پُڑ اور اُس کے ساتھی بہادر دودہ کو قتل کر دیتے ہیں۔ بہادر ماں اپنے چھوٹے بیٹے بالاچ کو انتقام کے لئے روانہ کرتی ہے۔ مگر بالاچ طوفان بادوباراں میں گھر کر کسی دوسری جگہ جا نکلتا ہے۔ بالاچ مسلسل چودہ سال تک انتقام کی آتشِ فروزاں سینے میں لئے خانقاہوں اور مزاروں پر حاضری دیتا ہے، میلوں میں شرکت کرتا، تیر اندازی، شہسواری اور تیغ زنی سیکھتا ہے اور آخر چودہ سال بعد بلیدی سردار بی برگ پُڑ سے بدلہ لینے کے لئے آتا ہے۔ ایک رات بالاچ اپنے دوست نیکبو کے ساتھ بی برگ کے گاؤں پر حملہ کرتا ہے۔ بی برگ پُڑ بچ جاتا ہے البتہ اُس کا بہنوئی یوسف مارا جاتا ہے۔ بی برگ دن کو بالاچ کو پیغام پہنچاتا

ہے کہ وہ گیدڑ کی طرح حملہ کیوں کرتا ہے شیر کی طرح مقابلہ کیوں نہیں کرتا۔

یلاٹ حملہ کرتا ہے اور برگ ٹُپڑ کو ہلاک کر دیتا ہے بلاچ کی زندگی کی کہانی ایک باعزت اور صاحب عزم کی کہانی ہے۔ یہ کہانی آج بھی ہر بلوچ مرد اور عورت کے سینے میں شمعِ فروزاں کی طرح تابندہ ہے۔

بلوچی رزمیہ شاعری کے کردار افسانوی نہیں ہیں۔ یہ کردار وہ ہیں جن سے بلوچ تاریخ ترتیب پاتی ہے۔ گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان میں سے کسی کے پاس الہ دین کا چراغ بھی نہیں۔ وہ دشمن پر جادو کے اثر سے فتح نہیں پاتے۔ اُن کے قبضے میں جِن نہیں ہیں۔ وہ جیتی جاگتی دنیا کے کردار ہیں۔ وہ ایک عام انسان کی طرح محبت اور نفرت کرتے ہیں۔ اُن سے بہادری اور بزدلی کے مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔ اُن کی عادات اور اطوار عام چلتے پھرتے انسانوں کے سے ہیں۔

میر چاکر خاں رند اور میر گواہرام لاشاری کے درمیان تیس سالہ جنگ کے آغاز میں میر چاکر خاں کا ایک مدبر ساتھی بی برگ میر چاکر کو جنگ کا آغاز کرنے سے روکتا ہے اور اُس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لیتا ہے۔ بی برگ، میر چاکر رند کے کہنے کے باوجود اُس کے گھوڑے کو آگے بڑھنے سے روکے رکھتا ہے۔ آخر ایک تند خو رند جوان، میر حان آگے بڑھتا ہے اور بی برگ کی غیرت کو للکارتا ہے۔

میر حان کا بی برگ پر یہ ایک نفسیاتی حملہ ہے۔ وہ حان کے طنزیہ کلام کو سن کر چاکر کے گھوڑے کی لگام چھوڑ دیتا ہے اور لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

یہاں بی برگ کا ذہنی ردِعمل ایک عام انسان کا ہے۔ اُسے طعنہ دیا جاتا ہے کہ وہ بزدل ہے۔ وہ یقیناً بزدل نہیں اس لئے گھوڑے کی لگام چھوڑ دیتا ہے اور خود بھی جنگ میں شریک ہو کر دادِ شجاعت دیتا ہوا مارا جاتا ہے۔

بلوچی رزمیہ شاعری کے کردار ہمیشہ استوار رہتے ہیں۔ اگر میر چاکر خاں رند نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے تو وہ آخر دم تک لڑتا ہی رہے گا۔ اگر برگواہرام لاشاری کا باپ فیاض ہے تو وہ اپنی فیاضی اور بلند نگاہی کا مظاہرہ عین جنگ کے دوران بھی کرتا رہے گا اور زخمی اور نیم مردہ چاکر کو اپنی "اونٹنی سنجان" پیش کرے گا۔ اگر میر حان نے بہادروں کی طرح لڑنے مرنے کا اعلان کیا ہے تو سینے پر تیر کھا کر ہی مرے گا، یوں نہیں ہو گا کہ وہ پشت پر تیر کھائے۔ اگر بی برگ رند نے میر چاکر خاں کو جنگ نہ کرنے کی درخواست کی ہے تو وہ جنگ بند کرانے کے لئے التجا کرتا رہے گا تا آنکہ اس کے سب ساتھی لقمۂ اجل ہو جائیں۔ وہ دیوانہ وار جنگ میں کود پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچی رزمیہ شاعری میں کرداروں کی یہ استواری ڈراما پیدا کرتی ہے۔ لیکن کرداروں میں لچک اور جھول پیدا ہو جاتا تو جو توانائی اور زندگی آج بلوچی رزمیہ شاعری میں ملتی ہے وہ نظر نہ آتی۔

تمام رزمیہ نظمیں صداقت شعاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ صداقت شعاری کے یہ مظاہرے رزمیہ کہنے والوں کے ہیں۔ عام طور پر دوسری زبانوں کی رزمیہ شاعری میں تخیل زیادہ اور حقیقت کم ہوتی ہے۔ جنگ کے مناظر کھینچتے وقت دوسری زبانوں کے رزمیہ نگار ان بہادروں اور جوانوں کی سرگرمیاں بڑھ چڑھ کر بیان کرتے جن سے وہ ذہنی طور پر وابستہ ہیں۔ اس کے برعکس اُن سورماؤں کی جرأت اور دلیری کو بڑے پھیکے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ جن سے انھیں ہمدردی نہیں۔ لیکن بلوچی رزمیہ شاعری میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں صداقت اور خلوص سے کام لیا جاتا ہے اور دیانت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا جاتا۔

دشمن کے جوانوں کی بہادری اور جرأت کا اعتراف بڑے حوصلے کا کام ہے لیکن اس سے بڑے حوصلے کا کام یہ ہے کہ اپنے جوانوں کی بزدلی کا اعتراف کیا جائے۔ صداقت شعاری کا تقاضہ ہے کہ جو بات کہی جائے جرح و قدح پذیر ہو۔ اگر اپنے قبیلے کے بہادر بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس کا اعتراف ہونا چاہیئے اگر دشمن کے جوان ہمت اور دلیری سے کام لے رہے ہیں تو انصاف کا تقاضہ ہے کہ اُن کی ہمت اور دلیری کو تسلیم کیا جائے۔ صحیح "سپورٹسمین شپ" یہی ہے۔ بلوچی رزمیہ شاعری میں کبھی اور کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے بزدل جوانوں کی تعریف کی جائے اور یوں ان کے حوصلے بڑھائے جائیں۔ اس کے برعکس بلوچی رزمیہ شاعری نے ہمیشہ اپنے کمزور دل جوانوں کا مذاق اڑایا ہے اور ان پر طنز کے تیر برسائے ہیں تاکہ وہ غیرت اور حمیت کے پیشِ نظر دلیرانہ طور پر لڑتے ہوئے مر جائیں۔

مولانا شبلی رزمیہ شاعری کا ایک کمال یہ بھی بتاتے ہیں کہ لڑائی کی تیاری مکمل طور پر دکھائی جائے۔ بلوچی رزمیہ شاعری اس

میدان پر پوری طرح اترتی ہے۔ جنگ سے پہلے جوانوں کی ہر حرکت اور سرگرمی کو واضح کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ ہونے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ دشمن کی تعداد کتنی ہے، وہ کس جگہ پر قابض ہے، اُس کی مورچہ بندی یا صف آرائی کا انداز کیا ہے۔ اگر دشمن پر حملہ کیا جائے تو کس پہلو سے کیا جائے، تاکہ دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے۔ اگر لشکر یا فوج دشمن پر حملہ کرے تو کونسا راستہ اختیار کرے اور اگر حملے اور پیش قدمی کے دوران کوئی غیر معمولی دِقت آجائے تو اُسے کیسے دور کیا جائے۔ یہ تمام تفصیلات وہ جوان فراہم کرتے ہیں جنھیں بلوچی زبان میں "چھاری" کہا جاتا ہے۔ چھاری ایک ہراول دستہ ہوتا ہے جو یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔

چھاری کا فرض اُس قدیم عہد میں وہی تھا جو آج کل (RECONNAISSANCE PATROL) کا ہے۔ دشمن کے بارے میں ضروری معلومات کی فراہمی کے بعد صف بندی کا مرحلہ آتا ہے بہادر جوان ہتھیار سجا کر میدان جنگ میں نکلتے ہیں۔ اُن کا سپہ سالار سب سے آگے ہے، باقی جوان اپنی اپنی جگہ پر رُستم و سہراب سے کسی طور کم نہیں۔

مناظرِ جنگ میں حقیقی فضا قائم کرنا اور درست تاثر پیدا کرنا رزمیہ شاعری کا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اِس غرض کے لئے ایسے جاندار الفاظ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور ایسی تراکیب سے کام لینا پڑتا ہے جو مناسب ہوں اور عمل اور حرکت کی فضا ہماری چشمِ تصوّر میں واضح طور پر آجائے اور قاری یوں محسوس کرے جیسے وہ خود لڑائی میں شریک ہے۔

نہ صرف بلوچی مرد بلکہ بلوچی خواتین بھی شجاعت و شہامت میں مردوں سے پیچھے نہ تھیں۔ وہ خود ہتھیاروں سے سج کر میدان جنگ میں جاتیں اور اپنے بہادر شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کے شانہ بشانہ لڑتیں ان کی موجودگی اُن کے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کے حوصلے بڑھانے کا باعث ہوتی۔ وہ اپنی موجودگی سے انھیں دادِ شجاعت دینے پر اُکساتیں۔ جذبۂ زندگی نہ صرف بلوچ مردوں میں ہی تھا بلکہ زندگی کا احساس و جذبہ بلوچ خواتین میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا اور ہے۔ یہی جذبہ آج پاکستان کے تحفظ و بقا کے لئے ہر بلوچ مرد و زن کے سینے میں موجزن رہتا ہے۔

چھاری کی طرح بلوچی رزمیہ شاعری کی ایک اور اصطلاح "کھوڑی" ہے۔ کھوڑی بلوچی میں تعاقب کو کہا جاتا ہے، رزمیہ شا[illegible] کھوڑی وہ تعاقب ہے جو ہارتے ہوئے اور پیچھے ہٹتے ہوئے دشمن کا کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ دشمن میدان [illegible] شکست کھاتا ہے اور پیچھے ہٹ کر کہیں چھپ جاتا ہے۔ اور جنگ چھاپہ مار شروع کر دیتا ہے۔ [illegible] ہونے کے [illegible] دشمن کا مکمل طور پر صفایا کرنے کے لئے کھوڑی کی کارروائی کی جاتی تھی، دشمن کا پیچھا کیا جاتا اور اسے پکڑ کر ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ لیکن [illegible] دشمن کے اُن آدمیوں کے خلاف کی جاتی تھی جو ہتھیاروں سے لیس ہوتے اور گوریلا جنگ [illegible] ذمہ دار ہوتے۔ دشمن [illegible] ہتھیار ڈال دیتے انھیں معاف کر دیا جاتا۔ بلوچی رزمیہ شاعری بقول ملک محمد رمضان بلوچ "کھوڑی کی [illegible] سے لبریز ہے"۔

کھوڑی کی طرح بلوچی رزمیہ شاعری کی ایک اور اصطلاح "میل" ہے۔ میل وہ پہرہ ہے جو رات کو دشمن کے حملے اور شب خون سے بچنے کے لئے دیا جاتا تھا۔ اسے آج کل غالباً نائٹ گارڈ (NIGHT GUARD) کہا جاتا ہے۔

غرض بلوچی رزمیہ شاعری دنیا کی کسی بھی زبان کی رزمیہ شاعری سے کم تاثر آفریں نہیں۔ یہ آج بھی بلوچ عوام کے سینوں میں صحیفۂ مقدس کی طرح محفوظ ہے۔ بلوچوں کے پیشہ ور موسیقار "لنڈی" رزمیہ شاعری کے امین ہیں۔ وہ آج بھی میلوں، تہواروں اور محفلوں میں دمبورہ اور سرانیدہ پر طویل رزمیہ نظمیں گاتے ہیں اور منہ مانگا انعام پاتے ہیں۔ بلوچی رزمیہ شاعری جواں ہمت اور محبِ وطن، دلیر اور شجاع۔ قوی اور حفاظت طلب روایات اور معصوم [illegible] کی شاعری ہے جس کو محفوظ کرنے اور پاکستان کی دونوں قومی زبانوں میں منتقل کرنے کی بالخصوص ضرورت ہے ●

★

سرریلزم بقیہ صفحہ

ذہن کو روایتی اخلاق پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسا ذہن جو اخلاقی بندشوں کا غلام ہے۔ نہ صرف بیمار ہے بلکہ پست فن کی بھی تخلیق کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بی پلیسٹلی کا یہ خیال کہ سرریلیسٹ فن کار بداخلاق اور جنسی طور پر بدچلن ہیں، ادب اور زندگی دونوں کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ تنقید ہے۔ فن کار کی آزادی صحت مند ذہن کی آزادی کا مطالبہ ہے نہ کہ جنسی بے راہ روی اور فنی تخریب کی کوشش ان میں فن کی ایسی لگن پائی جاتی ہے۔ جس میں وہ کسی بھی طرح پسپا ہونے کو تیار نہیں۔

آخر میں سرریلزم کے جدلیاتی طریقۂ کار کو پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ خارجی دنیا کی عملی و معاشی زندگی اور داخلی دنیا کے خواب اور تصور پرستی کی زندگی ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تضاد ایک طرح کا روحانی تناؤ پیدا کرتا ہے اور فن کار کا کام اس تضاد کو حل کرنا ہے۔ وہ اس کو ایک نئے امتزاج سے ختم کرتا ہے فنی تخلیق ان دونوں دنیاؤں کے عناصر کو یکجا کرتی ہے۔ بدلنے والے پذیر عناصر کو ختم کر کے نئے تجربہ کو جنم دیتی ہے۔ اور یہ امتزاج ترقی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

سرریلزم بیسویں صدی کے اہم رجحانات میں سے ہے۔ لندن، نیویارک، برسلز، وارسا، کوپن ہیگن، پراگ، بارسلونا، بلگریڈ، سٹاک ہوم، ٹینریف اور ٹوکیو میں سرریلسٹ فن کاروں کے کئی گروہ پیدا ہوئے۔ لیکن سیاسی اور ذاتی وجوہ کے باعث بہت سے ادیب اور فن کار اس سے الگ ہو گئے ہیں کچھ اسے خود ہی چھوڑ گئے ہیں اور کچھ کو آندرے بریتوں نے اپنی تحریک سے خارج کر دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرریلزم ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں ختم ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس کے اثرات ابھی تک قائم ہیں اور اس کی روایت نئے ادب اور نئے فن کے لئے اب بھی فیضان کا سرچشمہ ہے ✦

"میں
لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال کرتی ہوں"
جمیلہ رزاق کہتی ہے
فلمی ستاروں کا سفید
اور خوشبودار حسن بخش صابن
LTS 33—

پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر " ادارۂ مطبوعات پاکستان " نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی ان اہم صنعتوں پر مختصر، مگر سیرحاصل، اور مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر سے مزین ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن‌نشیں ہو جاتی ہے۔

ہر کتاب میں جدید ترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں۔ جن سے ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔

استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف ۴ آنے رکھی گئی ہے۔ یہ کتابچے ابتک شائع ہو چکے ہیں :

* پٹ‌سن کی صنعت
* سیمنٹ کی صنعت
* چائے کی کاشت اور صنعت
* کپڑے کی صنعت
* پن بجلی کی صنعت
* ماہی گیری
* اشیائے صرف
* ذرائع آبپاشی کی صنعت
* کاغذ کی صنعت
* غذائی مصنوعات
* شکر سازی : (رنگیں تصاویر، نفیس آرائش : قیمت آٹھ آنے)

ملنے کا پتہ : ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ۔ کراچی۔

اٹگام

اکستان سے
درگاہ چاٹگام
یثیت بہت
تھی مگر اب
و توسیع کے
ے مراحل
رچکی ہے

صُورا

ادارۂ
بوعات پاکستان
کی
تازہ پیشکش

نامت ۱۲۰ صفحات
ت ۱ روپیہ ۸ آنے

مطبوعات پاکستان،
ٹ بکس نمبر ۱۸۳
کراچی